تاریخ لاہور

سیّد محمّد لطیفؒ

تاریخ لاہور

سیّد محمد لطیف

تخلیقات

علی پلازہ، 3- مزنگ روڈ لاہور فون: 7238014
Web Site: http://www.takhleeqat.com
E-mail: takhleeqat@yahoo.com

سید محمد لطیف کی شہرہ آفاق تصنیف

LAHORE IT'S HISTORY ARCHITECTURAL REMAINS & ANTIQUITIES

کا اردو ترجمہ

مصنف: خان بہادر شمس العلماء جج
سید محمد لطیف

- فیلو رائل اسٹرونومیکل سوسائٹی
- فیلو رائل جیوگرافیکل سوسائٹی
- فیلو پنجاب یونیورسٹی
- ممبر ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال
- ممبر ڈی لا سوسائٹی ایشیاٹک پیرس (فرانس)

مترجم:- افتخار محبوب

ناشر: تخلیقات لاہور
پرنٹر: اِن پریس لاہور
سنِ اشاعت: مارچ 2004ء
قیمت: ۳۰۰ روپے

فہرست

مصنّف :- سیّد محمّد لطیف

1845 - 1902ء

سید محمد لطیف

میرے دادا سید محمد لطیف صاحب المعروف جج محمد لطیف ۱۸۴۵ء کے لگ بھگ منشی سید محمد عظیم صاحب کے گھر پیدا ہوئے، جن کا تعلق دہلی کے ایک معروف علمی و مذہبی خاندان سے تھا۔ سید محمد لطیف صاحب کے آباؤ اجداد مدینہ منورہ میں اپنی دینی خدمات اور علم پروری کے باعث ممتاز و اعلیٰ حیثیت کے حامل تھے۔ اس گھرانے کے ایک جید عالم و بزرگ مولانا حاجی محمد عرب صاحب کی شہرت سن کر مغل شہنشاہ شاہجہان نے انہیں ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ مولانا حاجی محمد عرب صاحب دہلی آکر آباد ہوگئے اور اس شہر کے دینی و علمی حلقوں کو رونق بخشی۔ آپ کی بے حد عزت و توقیر کی گئی اور آپ کو شاہی خاندان کا معلم مقرر کیا گیا۔ آپ کی خدمات اور احترام کے پیش نظر مغل بادشاہ آپ کی اور آپ کے جانشینوں کی قدر و خبر گیری کرتے رہے۔

ایک قدیم خاندانی دستاویز کے مطابق سید محمد لطیف صاحب کا سلسلہ نسب ۲۷ ویں پشت میں امام دہم حضرت امام الہادی النقی علی ابن محمد التقی صدق اللہ علیہ سے جا ملتا ہے۔ امام دہم کی چھ اولادیں تھیں، جن میں سے تین بیٹے لاولد تھے۔ ایک بیٹے امام یازدہم حضرت امام حسن عسکری اور دوسرے حضرت سید جعفر جلیل اللہ تھے۔ حضرت سید جعفر، جو زہد و تقویٰ میں یکتا تھے، کے بیٹے حضرت سید علی جمیل اللہ تھے، جنہوں نے اپنے والد بزرگوار کے ہدایت الی الحق کے مشن کو جاری رکھا۔ ان کے بیٹے حضرت سید عبداللہ تھے، جو بڑے زاہد اور اطاعت خداوندی میں نہایت برگزیدہ تھے۔ حضرت سید عبداللہ کے بیٹے حضرت سید احمد مقبول اللہ تھے، ان کے دو بیٹے حضرت سید علی اور حضرت سید محمود مختار اللہ تھے۔

سادات بخاری، حضرت سید محمود مختار اللہ کی اولاد میں سے ہیں۔ حضرت سید محمود کے بیٹے حضرت سید محمد صفی الدین بخاری مسند نشین ہوئے۔ ان کے فرزند شیخ المشائخ قطب

الاقطاب حضرت سید محمد علی ثانی ہمدانی تھے' جنہوں نے اپنے زمانے میں کفر و ضلالت کے بتوں کو پاش پاش کر دیا اور حق پرستوں نے ان کی حمایت و سرپرستی میں حق کا بول بالا کیا۔ ان کے فرزند شیخ المشائخ قطب الاقطاب حضرت سید محمد اسحاق ختلانی تھے۔ ان کے فرزند شیخ المشائخ سید السادات جامع السادات حضرت سید محمد نور بخش تھے جن کے فرزند نور بخش حضرت سید محمد علی تھے۔ ان کے فرزند حضرت سید محمد غیاث نور بخش اعلی اللہ درجاتہ ہوئے۔ ان کے فرزند حضرت سید حسن محمد تھے' جن کے فرزند حضرت سید محمد' ان کے فرزند حضرت سید محمد مکرم' ان کے صاحبزادے حضرت سید پیر محمد اور ان کے فرزند حضرت سید محمد عبدالرشید قادری تھے۔ ان کے جانشین فرزند شیخ المشائخ قطب الاقطاب حضرت سید محمد قاسم تھے۔ ان کے فرزند حضرت سید پیر محمد مکرم ثانی تھے' جن کے فرزند شیخ المشائخ حاجی الحرمین حضرت مولانا سید محمد عرب (وفات ۱۰۵۸ھ) تھے' جو علم اور زہد و تقویٰ میں بہت اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ ان کے رشد و ہدایت کی شہرت اس قدر ہوئی کہ اس زمانے کے بادشاہ بھی ان کے علم و فضل سے نہایت متاثر ہوئے' چنانچہ مغل شہنشاہ شاہجہان نے آپ کو مدینہ طیبہ سے ہندوستان بلایا اور ان کے فیوض و برکات سے بہرہ اندوز ہوا۔ حضرت سید محمد عرب' کے فرزند حضرت حاجی محمد عبدالرحیم (وفات ۱۱۱۸ھ) شیخ المشائخ تھے' جو اپنے والد کی مسند ارشاد پر فائز ہوئے۔ ان کے فرزند شیخ المشائخ حضرت حاجی محمد اکرم (وفات ۱۱۳۱ھ) تھے' جن کے صاحبزادے حضرت سید حاجی محمد ماہ (وفات ۱۱۷۹ھ) تھے۔ ان کے فرزند حضرت حاجی محمد اعظم (وفات ۱۲۵۰ھ) تھے' جن کے فرزند ارجمند حضرت حافظ محمد صالح (وفات ۱۸۵۶ء) تھے۔ ان کے خلف الرشید منشی حاجی سید محمد عظیم صاحب (وفات ۱۸۸۵ء) غفراللہ ذنوبہ تھے۔ ان کے تین صاحبزادے سید محمد لطیف صاحب (وفات ۱۹۰۲ء)' سید محمد شمس الدین صاحب (جج) (وفات ۱۹۲۹ء)' سید محمد سراج الدین صاحب (چیف جسٹس ریاست بہاولپور) (وفات ۱۹۴۹ء) تھے۔ سید محمد لطیف صاحب کے دو فرزند سید محمد غیاث الدین صاحب (وفات ۶ ستمبر ۱۹۰۶ء) اور میرے والد محترم خان صاحب سید محمد عزیز الدین (وفات یکم مئی ۱۹۵۳ء) تھے۔

دہلی میں آپ کے خاندان کے مشہور و معروف بزرگوں میں حاجی محمد عبدالرحیم صاحب' حاجی محمد اکرم صاحب' حاجی محمد ماہ صاحب' حاجی محمد اعظم صاحب اور حافظ محمد صالح صاحب کے اسماء گرامی سرفہرست ہیں۔ یہ سب حضرات اپنے اپنے دور میں دہلی کی بزرگ اور معتبر ہستیوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ سید محمد لطیف صاحب کے برادر صغیر سید محمد شمس الدین صاحب کے مطابق ”نولکھا میں حضرت والد صاحب (سید محمد عظیم صاحب) کے پاس دہلی سے

ہمارے دادا صاحب حضرت حافظ محمد صالح صاحب" کی سناونی آئی' چنانچہ ان کا چہلم وہیں نہایت احترام سے کیا گیا۔ حضرت دادا صاحب کا مزار دہلی میں حضرت خواجہ باقی باللہ" کے مزار پرانوار کی پائنتی سے پانچ سات گز کے فاصلہ پر جانب غرب ایک چبوترہ پر واقع ہے۔ لحد کے سرہانے الفاظ "حافظ محمد صالح" درج ہیں۔ حضرت خواجہ باقی باللہ" کا اصلی نام سید رضی الدین احمد تھا۔ وہ کابل سے تشریف لائے تھے۔ ہندوستان میں انہی کی ذات فیض آیات سے طریقہ نقشبندیہ کو رواج حاصل ہوا۔ دو مزارات ہمارے بزرگوں کے اس چبوترے پر واقع ہیں' جو جامع مسجد دہلی کی غلام گردش میں مسجد کے شمال کی طرف ہے۔ اس چبوترہ کے غربی حصہ میں یہ مزارات ہیں۔ تاریخ وفات حضرت دادا حافظ محمد صالح صاحب بمطابق "پنجابی اخبار" مورخہ ۸ مئی ۱۸۵۶ء ہے"۔

حضرت حافظ محمد صالح صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے حلقہ ارادت میں ہزاروں افراد تھے اور کئی شعرا نے اس موقع پر قطعات کہے۔ فقط ایک قطعہ تاریخ وفات مل سکا جو کہ جناب حضرت انور حسین رسول شاہی ہما کا ہے۔

چوں محمد صالح نیکو سیر بود ممتاز و حلیم و ہم فہیم
کردہ رحلت زیں جہاں بے ثبات شد رواں سوئے مکان مستقیم
در سر تاریخ فوتش انچناں بودہ ام سرگرم کر لطف عمیم
ای ہما ہا کف ز روئے التفات گفت صالح یافت جناب النعیم

"جناب حافظ محمد صالح صاحب" اور ان کے برادر اکبر حضرت حافظ عبدالعزیز صاحب" ایسے اصحاب تھے کہ ان کی زبان میں برکت تھی۔ وہ پیران طریقت اور مجیب الدعوات کہلائے۔ عقیدت مند ان کا طواف کیا کرتے تھے اور اسے فلاح اخروی سمجھتے تھے۔ حضرت حافظ محمد صالح صاحب بڑے خوش پوشاک اور نفاست پسند تھے۔ ان کی خیرو خیرات کا یہ عالم تھا کہ راستہ چلتے اگر کوئی سائل مل گیا اور اس نے سوال کیا تو بسا اوقات اسے تن کے کپڑے بھی اتار کر دے دیتے۔ سادگی اور فروتنی کا یہ حال تھا کہ ایک وقت قیمتی دوشالہ زیب تن ہوتا تو دوسرے وقت پھٹا پرانا کمبل اوڑھ کر بازار میں نکلتے"۔

سید محمد شمس الدین صاحب کے مطابق "جامعہ مسجد دہلی کا ایک حصہ آثار شریف کے نام سے مشہور ہے۔ وہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے تبرکات ہیں۔ ان تبرکات کے محافظ ہمارے خاندان کے افراد ہیں۔ درگاہ آثار شریف پر حافظ محمد صالح صاحب اور ان کے بڑے بھائی حافظ عبدالعزیز صاحب بطور سجادہ نشین متمکن تھے۔ ان دونوں حضرات کی وفات

کے بعد یہ منصب حافظ عبدالعزیز صاحب کی اولاد کو منتقل ہوا اور ان کے خلف اکبر حافظ محمد داؤد صاحب اور خلف اصغر پیرجی عبدالرشید صاحب سجادہ نشین مقرر ہوئے اور آثار شریف والے کہلائے اور یہ منصب انہی اصحاب کی اولاد کو منتقل ہوتا رہا"۔

"درگاہ آثار شریف میں ہر شب کثرت سے چراغاں ہوتا ہے۔ حکومت کی طرف سے پانچ سو روپیہ نذرانہ یہاں خاص مواقع کے لیے مقرر تھا۔ ریاست رام پور سے بھی آثار شریف کے اخراجات کے لیے کچھ نہ کچھ سالانہ مقرر تھا۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر یہاں لوگ سلام کے لیے حاضر ہوا کرتے تھے اور اب تک یہ رسم جاری ہے۔ حضرت والد صاحب کے بقول ہمارے خاندان کی یہ خصوصیت چلی آرہی ہے کہ ہر ایک پشت میں ایک نہ ایک حافظ قرآن ضرور ہوتا ہے"۔

سید محمد لطیف صاحب نے ایک علمی' ادبی اور مذہبی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ یوں تو آپ کے خاندان میں انگریزی تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا تھا' مگر اس روایت کو آپ کے والد محترم سید محمد عظیم صاحب نے توڑ ڈالا' لہٰذا آپ کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ فارسی' عربی اور دیگر مروجہ علوم کی ابتدائی تعلیم کے بعد انہوں نے ہندوستان کی اعلیٰ درسگاہوں سے علم حاصل کیا۔ کٹڑہ تارکشاں (لاہور) میں قیام کے دوران آپ نے فارسی اور عربی منشی اسد اللہ صاحب سے پڑھی۔

نوجوانی کے ایام میں ہی سید محمد لطیف صاحب کا تعلق دہلی کے ایک اور علمی و ادبی خاندان سے ہوگیا' جب ان کی شادی قاضی ولی جان صاحب کی دختر سے قرار پائی۔ قاضی ولی جان صاحب' سرسید احمد خاں صاحب اور خان بہادر مولوی سمیع اللہ جج صاحب کے قریبی عزیز تھے۔ اس نسبت سے سید محمد لطیف صاحب اور سرسید احمد خاں ایک دوسرے کے خاصے قریب ہوگئے اور مختلف ملکی و مذہبی مسائل کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے رہتے تھے۔ دونوں کے درمیان سلسلہ خط کتابت کافی عرصے تک قائم رہا۔ سرسید احمد خاں کے دورۂ پنجاب (۱۸۸۴ء) کے دوران مراد آباد کے اخبار "نیر اعظم" نے ان کے خیالات پر نکتہ چینی کی تو سید محمد لطیف صاحب نے "پنجابی" اخبار میں اس کا مدلل جواب دیا۔

گھریلو علمی ادبی ماحول کے باعث شعرگوئی اور تصنیف و تالیف کا شوق سید لطیف صاحب کی طبیعت میں بہت پہلے سے ظاہر ہونا شروع ہوگیا تھا۔ ان کی پہلی تصنیف ایک شعری مجموعہ "دیوان لطیف" تھی' جو ۱۸۷۰ء میں شائع ہوئی۔ جب ۱۸۶۵ء میں اخبار "پنجابی" دوبارہ جاری کیا گیا تو اس کے مترجم اور ایڈیٹر محمد لطیف صاحب ہی تھے۔ سید محمد لطیف صاحب

۱۸۶۸ء میں پنجاب چیف کورٹ میں بعہدہ مترجم بہ مشاہرہ یک صد روپیہ ماہوار متعین کیے گئے۔ جلد ہی وہ چیف کورٹ کے ریڈر مقرر ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد انہیں ایکسٹرا اسسٹنٹ جوڈیشنل کمشنر کے عہدہ پر ترقی دے دی گئی۔ بعد ازاں انہوں نے کئی اضلاع میں ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے فرائض منصبی سرانجام دیے۔ ۱۹۰۲ء میں ان کا نام پنجاب چیف کورٹ کے جج کے لیے تجویز کیا گیا لیکن تقرری سے پیشتر ہی ۹ فروری ۱۹۰۲ء کو وفات پا گئے۔

سید محمد لطیف صاحب کے گھر کا ماحول چونکہ شروع ہی سے علمی و ادبی تھا' چنانچہ بچپن ہی سے آپ کو علماء' مصنفین اور شعراء کرام کی صحبت حاصل رہی۔ ایسے ماحول میں ان کا تصنیف و تالیف میں دلچسپی لینا ایک فطری امر تھا۔ آپ کے والد سید محمد عظیم صاحب ہر ماہ ایک مشاعرہ منعقد کیا کرتے تھے۔ ان مشاعروں کی رنگینی نے سید محمد لطیف صاحب کو شعرگوئی کی طرف مائل کیا۔ وہ عربی' فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نوجوانی میں ہی دیوان کی اشاعت کے بعد' ان پر نثرنویسی کا شوق غالب آ گیا۔ وہ اخبار "پنجابی" کے عملہ ادارت میں شامل تھے' لیکن جلد ہی ان کی ساری توجہ تاریخ نویسی پر مرکوز ہو گئی۔

۱۸۸۸ء میں انہوں نے "تاریخ پنجاب مع احوال شہر لاہور" کے عنوان سے ایک کتاب تصنیف کی۔ ایک سال بعد شہر آگرہ کی تاریخ مکمل کی۔ ۱۸۹۱ء میں ان کا ایک کتابچہ "ملتان کی قدیم تاریخ" شائع ہوا۔ اسی سال ان کی کتاب "تاریخ پنجاب" (بزبان انگریزی) شائع ہوئی۔ ایک ہی سال بعد ان کی معرکہ الاراء کتاب "تاریخ لاہور" (انگریزی) منظرعام پر آئی۔ یہ کتابیں علم تاریخ میں مستند و معتبر قرار پائیں اور ان کے حوالہ جات دیگر علمی تحقیق کے علاوہ عدالتوں میں بھی دیے جانے لگے۔ اس کے علاوہ سید محمد لطیف صاحب کلکتہ سے شائع ہونے والے "جرنلِ آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال" و "کلکتہ ریویو" کے مستقل قلمی معاون تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کے علاوہ وہ رائل اسٹرونومیکل سوسائٹی اور رائل جیوگرافیکل سوسائٹی کے بھی فیلو تھے۔ نیز ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال اور سوسائٹی ڈی لاء پیرس (فرانس) کے رکن بھی تھے۔ سرکاری عہدوں کی بھاری ذمہ داریوں اور مصروفیت کے باوجود' چند سال کی قلیل مدت میں کئی کتابوں کی اشاعت' سید محمد لطیف صاحب کی غیر معمولی ذہنی استعداد کا بین اور منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان کی نمایاں خدمات کے اعتراف میں حکومت نے انہیں خان بہادر اور شمس العلماء کے خطابات سے نوازا۔

سید محمد لطیف صاحب بڑی ہمہ گیر اور گوناگوں شخصیت کے مالک تھے۔ انہیں اردو' عربی'

فارسی کے علاوہ ہندی، سنسکرت، فرانسیسی اور انگریزی زبان پر بھی زبردست قدرت حاصل تھی۔ انگریزی زبان میں متعدد تصانیف کے علاوہ وہ انگلستان سے شائع ہونے والے انگریزی اخبارات و رسائل کے ہندوستان میں ریذیڈنٹ کارسپانڈنٹ (نامہ نگار) بھی تھے اور مختلف جرائد و رسائل میں باقاعدگی سے لکھتے تھے۔

سید محمد لطیف صاحب کے والد محترم منشی سید محمد عظیم صاحب ۱۸۱۵ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اس کے زمانہ میں انگریزی تعلیم کو شجر ممنوعہ سمجھا جاتا تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے گھریلو تعلیم کے بعد انگریزی پڑھنا شروع کی اور اپنے والدین سے خفیہ 'قدیم دہلی کالج میں داخل ہو گئے۔ کالج کے پرنسپل مشہور عالم مسٹر جے۔ ایچ ٹیلر تھے، جن کے کئی شاگرد ہندوستان میں اعلیٰ مراتب پر فائز ہوئے۔ ۱۸۳۰ء میں سید محمد عظیم صاحب کو انگریزی زبان پر دسترس کی بنیاد پر وظیفے کی سند ملی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد سید محمد عظیم صاحب نے دہلی گزٹ پریس میں بطور کمپوزیٹر ملازمت حاصل کر لی۔ ان کے پرانے کاغذات میں سے بزبان انگریزی ایک چٹھی بھی دستیاب ہوئی، جو انہوں نے پنجاب کے چیف کمشنر کو لکھی تھی۔ اس میں لکھتے ہیں:

"میں نے اپنی تعلیم اپنے استاد مسٹر جے۔ ایچ ٹیلر سے پائی اور مسٹر رابرٹ نیو بھی مجھے گھر میں تعلیم دیا کرتے تھے اور میرے بڑے مہربان تھے۔ سات برس کی تعلیم کے بعد میں مطبع دہلی گزٹ میں ڈاکٹر رینگر صاحب، سول سرجن دہلی کی سفارش پر ملازم ہو گیا اور تب سے میں مطبع کا کام بطور پرنٹر کرتا ہوں"۔

اس زمانہ میں یونیورسٹی کوئی نہ تھی۔ اگر تھی بھی تو دہلی کالج کے طالب علموں سے یونیورسٹی کا کوئی امتحان نہیں لیا جاتا تھا۔ سید محمد عظیم صاحب کا اور سید ہادی حسین خان صاحب بہادر سابق ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر پنڈت جوالا ناتھ صاحب کا زمانہ تعلیم ایک ہی تھا اور ان کے ساتھ بھائیوں جیسی محبت کیا کرتے تھے۔

کالج چھوڑنے کے کچھ عرصہ بعد سید محمد عظیم صاحب نے مسٹر پلیس (جو ایک بہت بڑے سوداگر تھے) کے چھاپہ خانہ میں ملازمت کر لی۔ یہاں ان کا وظیفہ پانچ روپیہ ماہوار مقرر ہوا۔ عظیم صاحب چونکہ بہت محنتی اور نہایت تعلیم یافتہ تھے، اس لیے چند ہی برس میں انہوں نے فن طباعت میں کمال حاصل کر لیا اور کل مطبع کے فورمین ہو گئے۔ نیز انہیں مطبع کی سیاہی اور دیگر ساز و سامان وغیرہ کا ٹھیکہ بھی دے دیا گیا، جس سے آپ نے خاصا روپیہ کمایا۔ اس چھاپہ خانہ کا نام دہلی گزٹ پریس تھا۔ یہاں سے دہلی گزٹ اخبار بھی نکلتا تھا۔ لاکھوں روپیہ کا کارخانہ تھا۔ سید محمد عظیم صاحب کی رائے کی قدر کی جاتی تھی۔ قدر و منزلت ان کی عروج پر
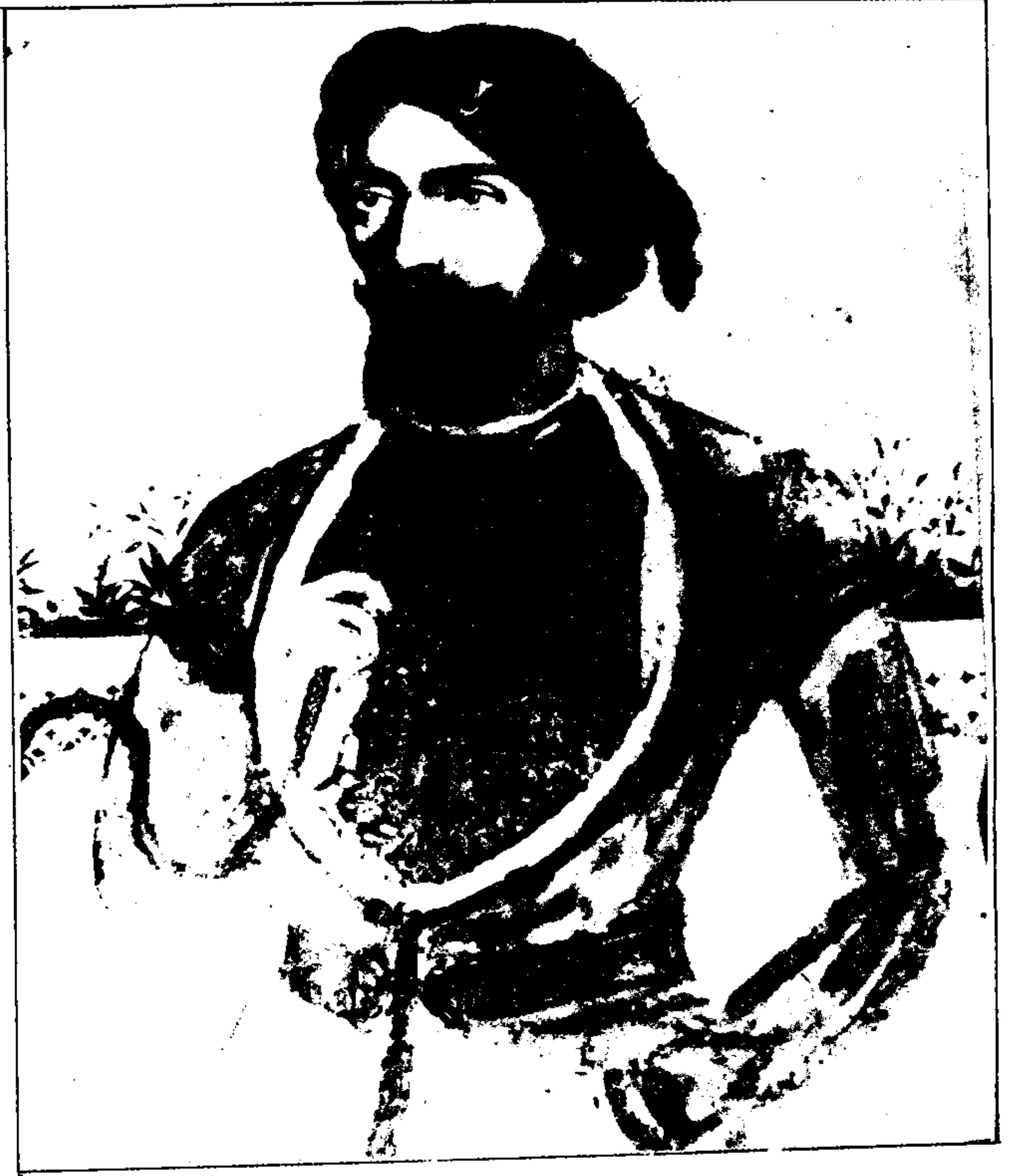
سید محمد لطیف کے والد منشی سید محمد عظیم

1815ء __ 1885ء

پہنچ گئی۔ رؤساء و دیگر شرفائے شہر کے ساتھ خاندانی لحاظ سے تو تعارف تھا ہی' مطبع کے اعلیٰ کارکن ہونے کی وجہ سے حلقہ احباب میں مزید وسعت ہو گئی۔ خاندان میں جب کوئی روزگار کی خواہش کرتا تو عظیم صاحب کے والد بزرگوار اسے سید عظیم صاحب کے پاس بھیج دیتے۔ ان کے چچازاد بھائی عبدالحکیم صاحب آگرہ والے (جو جناب خان بہادر پروفیسر مولوی ذکاءاللہ صاحب کی ہمشیرہ سے بیاہے ہوئے تھے)' ان کے برادر نسبتی میر عنایت علی صاحب اور ہم زلف مرزا محمد بیگ صاحب اور حقیقی بھائی محمد حفیظ اور دیگر بے شمار لوگ ان کے شاگرد اور زیر بار احسان تھے۔

سید محمد عظیم صاحب جس وقت دہلی گزٹ پریس میں تھے' تو انہیں پتہ چلا کہ آگرہ کے نزدیک سکندرہ آرفن پریس فروخت ہونے لگا ہے۔ پنجاب پر سرکار برطانیہ کا قبضہ ہوا تو انہوں نے اس بات کا مصمم ارادہ کر لیا کہ سکندرہ آرفن پریس خرید کر لاہور میں مطبع جاری کریں گے' چنانچہ حکام سے سودا طے کر کے لاہور تشریف لائے اور مطبع کے لیے جگہ کا انتخاب کیا۔ یہ ایک شاہی محل تھا جو نولکھا کے نام سے مشہور تھا اور شہر سے باہر واقع تھا۔ اس میں محل کے علاوہ کئی ایک حویلیاں اور متعدد اندرونی صحن تھے۔ ان سب کے باہر جنوب کی طرف کھنڈر تھے۔ مشرق کی جانب بہت سی سفید زمین تھی اور تین اطراف میں لوگوں کے کھیت تھے۔ یہ وہی مقام ہے جہاں اب لاہور ریلوے سٹیشن واقع ہے۔ یہ جائیداد آپ نے خرید لی۔ یہ مرحلہ طے کرنے کے بعد آپ دہلی سے ہوتے ہوئے آگرہ تشریف لے گئے اور سکندرہ آرفن کا تمام ساز و سامان اور مطبع کے لیے حسب ضرورت ملازمین ساتھ لے کر واپس لاہور تشریف لائے۔ سامان باربرداری اس قدر تھا اور اتنے لوگ ہمراہ تھے کہ جس گاؤں سے گزر ہوتا' لوگ یہی سمجھتے کہ کوئی غنیم آ گیا ہے۔ اسی محل میں مطبع جاری کیا گیا۔ ۱۸۴۸ء میں جاری ہونے والے اس مطبع کو پنجاب کا اولین مطبع قرار دیا گیا ہے۔ اس کا نام "لاہور کرانیکل" رکھا گیا۔ اس میں فارسی اور انگریزی کے الگ الگ شعبہ جات تھے' جن کے مہتمم اور کارکن بہت قابل افراد تھے۔ ان میں سے اکثر وہ یورپین' بنگالی اور ہندوستانی شرفاء تھے' جو سکندرہ آرفن پریس میں ملازم تھے یا جنہیں دہلی سے بلایا گیا تھا۔ ان کی تنخواہیں خاطر خواہ تھیں۔ مطبع کا ایک وسیع گودام تھا۔ اسی طرح دفتری خانہ' مستری خانہ اور لوہار خانہ میں چیدہ چیدہ اشخاص متعین تھے۔

اس مطبع سے ایک انگریزی روزنامہ اخبار "دی لاہور کرانیکل" کے نام سے جاری کیا گیا جو بعد ازاں سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور کے نام سے ۱۹۶۳ء تک شائع ہوتا رہا۔ یہ نہایت اعلیٰ

درجے کا اخبار تھا۔ مسٹر ولبی مینجر اور مسٹر کوپ اس کے ایڈیٹر تھے۔ کوئی دفتر یا سرکاری محکمہ ایسا نہ تھا جس کا مطبع سے واسطہ نہ پڑتا ہو۔ معمولی سے اعلیٰ طباعت کا کام اس مطبع میں ہوتا تھا۔ بڑی بڑی سرکاری رپورٹیں نہایت صحت کے ساتھ چھاپی جاتی تھیں۔ عظیم صاحب خود تمام کاموں کی نگرانی کرتے تھے۔ یہ انہی کی قابلیت اور مہارت تھی کہ انگریزی اخبار کے علاوہ مطبع کے اہم کام کو برسوں بخوبی نبھایا۔ عظیم صاحب کے بیٹے سید شمس الدین صاحب لکھتے ہیں "ہائی کورٹ لاہور کی لائبریری میں' میں نے کرانیکل پریس کی شائع شدہ ایک سرکاری رپورٹ دیکھی' جو بلحاظ طباعت و اشاعت ولایت کی طبع شدہ کتابوں سے کم نہ تھی"۔

سید شمس الدین صاحب ایک خاندانی دستاویز میں تحریر فرماتے ہیں "دہلی میں حضرت والد صاحب (منشی سید محمد عظیم صاحب) نے مطبع لاہور کرانیکل کے اجراء کے لیے ایک کمپنی قائم کی تھی۔ اس میں بائیس حصے والد صاحب کے تھے اور چند حصے بعض رؤسائے دہلی کے تھے۔ ایک حصہ ڈھائی سو روپیہ کا تھا۔ ان شراکت داروں سے مسٹر ولبی مینجر مطبع نے تنازعہ کرا دیا' جس کی بنا پر والد صاحب نے مطبع کو خیرباد کہہ دیا اور اپنے حامی و مربی سر رابرٹ مانٹ گری صاحب بہادر سابق چیف کمشنر پنجاب و بعدہ' نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر پنجاب کی زیر حمایت ایک جدید ذاتی مطبع جاری کرنے کا ارادہ کیا۔

اس تفرقہ کی وجہ سے والد صاحب نے نولکھا والا مکان بھی چھوڑ دیا اور اہل خانہ کو لے کر چوک وزیر خاں کے متصل ایک حویلی میں رہائش اختیار کر لی جسے سلطانہ والی حویلی کہا جاتا تھا۔ سلطانہ والی حویلی میں آتے ہی انہوں نے انگریزی پریس اور ٹائپ کے لیے انڈنٹ کیا اور اس کے آنے پر دیوان شنکر ناتھ کے طویلہ' متصل مسجد وزیر خاں میں ۱۸۵۶ء میں مطبع جاری کیا۔ اس مطبع کا نام سر رابرٹ منٹگمری کے مشورہ سے "پنجابی پریس" رکھا گیا۔ تاریخ اجرائے مطبع پنجابی اخبار مورخہ ۲۴ جولائی ۱۸۵۶ء سے ذیل میں درج کی جاتی ہے:۔

قطعہ تاریخ مطبع پنجابی لاہور

از فقیر انور حسین رسول شاہی ہما

از کمال اہتمام منشی عالی ہمم — چوں بنا ایں مطبع پنجابی لاہور شد
سال تاریخ بنائش باہما گفتہ سروش — وہ کہ اشہر مطبع پنجابی لاہور شد

(۱۲۷۲ھ)

یہاں سے ایک اردو اخبار "پنجابی" بھی جاری کیا گیا جو ہفتہ میں دو بار اور پھر ہفتہ وار شائع ہوتا تھا۔ منشی محمد عظیم صاحب اس کے ایڈیٹر تھے، جبکہ مرزا محمد اکبر سیستانی خاور کو معاون ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ منشی محمد عظیم صاحب نے ایک عربی اخبار "نفع عظیم" جاری کیا، جو ہفتہ میں تین بار شائع ہوتا تھا۔ حضرت والد صاحب کے شاگردوں اور ملازموں میں سے گرگیری صاحب نے اپنا الگ مطبع جاری کیا جس کا نام انہوں نے "دامن گیر" رکھا۔ منشی عزیز الدین صاحب مطبع وکٹوریہ پریس کے مالک ہو گئے مگر والد صاحب کی اسی طرح عزت کرتے تھے اور خود کو ان کا نمک خوار سمجھتے تھے۔ اسی طرح مسٹر کینیڈی، جو پرنٹر تھے، انہوں نے ایک عرصہ کی ملازمت میں اس قدر ثروت پیدا کی کہ اپنا الگ انگریزی مطبع جاری کیا لیکن بہت زیادہ شراب پینے لگے اور اسی وجہ سے انتقال کر گئے۔ ان کے علاوہ بھی کئی افراد نے خاصا نام کمایا"۔

"۱۸۶۱ء میں قانون تعزیرات ہند جاری ہوا۔ اسی سنہ میں سید محمد عظیم صاحب کو سید محمد لطیف صاحب کی شادی کے سلسلے میں دہلی جانا پڑا، جن کی شادی قاضی ولی جان صاحب کی دختر سے قرار پائی تھی۔ اس دوران منشی محمد عظیم صاحب نے پنجابی اخبار، جو طویلہ دیوان شنکر ناتھ میں جاری کیا گیا تھا، اس خیال سے بند کر دیا کہ ان کی عدم موجودگی میں کہیں کوئی غلط بات نہ چھپ جائے"۔

کاروبار میں وسعت ہوئی تو سید محمد عظیم صاحب نے چھاپہ خانہ، کٹڑہ تارکشاں والا میں ایک وسیع مکان میں منتقل کر دیا۔ پریس میں انگریزی اور ہندی کے ٹائپ تھے۔ اردو اور فارسی کے لیے کاتب اور محرر تھے، نیز مستری خانہ، دفتری خانہ اور جلد سازی کا بھی انتظام تھا۔ فارسی اور انگریزی میں طباعت کے لیے مشینیں الگ الگ نصب تھیں۔ یوں تو سبھی قسم کی چھپائی کا کام اس مطبع واقعہ کٹڑہ تارکشاں والا میں ہوتا تھا۔ انگریزی اور فارسی قوانین، اہل ہنود و اسلام کی مذہبی کتابیں، سرکاری محکمہ جات کے مختلف فارم اور رپورٹیں بزبان انگریزی، سررشتہ تعلیم کی کتابیں وغیرہ سب کچھ چھپتا تھا لیکن سب سے عجیب اور منفرد ایک کتاب "نغمہ صنم" چھاپی گئی، جو علم موسیقی کی اولین کتاب تھی۔ اس کتاب کے مصنف دیوان محمد مردان علی خاں رعنا تھے۔ دیوان صاحب علم موسیقی کے استاد تھے اور نغمہ صنم میں انہوں نے تمام راگ، راگنیوں اور گیتوں کو مفصل بیان کیا تھا اور نقشہ جات و تصاویر کے ذریعے ان کو عام فہم کر کے دکھایا تھا۔

اس وقت فقیر نور الدین صاحب مرحوم وزیر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ذہانت اور حاضر

جوانی کا ایک واقعہ سید عظیم صاحب کے فرزند سید شمس الدین صاحب بیان کرتے ہیں۔
"ایک موقع پر لارڈ کیننگ صاحب بہادر گورنر جنرل نے ازراہ تضحیک فقیر نور الدین صاحب سے پوچھا کہ مہاراجہ کی کون سی آنکھ کانی (کانڑی) ہے۔ تو فقیر نورالدین صاحب نے جواب دیا کہ مہاراجہ صاحب کی ہیبت اور شوکت کی وجہ سے آج تک فقیر کو اس امر کی تمیز نہیں ہوئی۔ قصہ پنجاب سنگھ' مصنفہ مولوی کریم الدین صاحب مرحوم ان دنوں سرکاری مدارس میں مروج تھا۔ اس میں یہ قصہ درج ہے۔ قصہ پنجاب سنگھ میں نے مدرسہ واقع حویلی راجہ دھیان سنگھ میں پڑھا تھا"۔

"منشی عظیم صاحب نے پنجابی پریس سے اردو کے ساتھ ایک انگریزی اخبار "دی پنجابی" کے نام سے شروع کیا جو ہفتہ میں تین بار شائع ہوا کرتا تھا۔ اعلیٰ یورپین اس کے مضمون نگار تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران اس کا ہفتے میں تین بار شائع ہونا بھی ناکافی ثابت ہوا تو حسب ضرورت روزانہ صبح اور شام بلکہ شب کے وقت موقع جنگ سے خبریں بذریعہ تار آتیں اور فوراً طبع ہو کر بذریعہ سانڈنی سوار تقسیم کی جاتیں اور بذریعہ ڈاک بیرون جات میں روانہ کی جاتیں۔ ان اضافی پرچوں کی اشاعت بلکہ خود اخبار کی اشاعت پر بے اندازہ روپیہ خرچ ہوتا لہٰذا کچھ عرصے کے بعد اسے بند کر دیا گیا۔ اخبار پنجابی (اردو) سنجیدہ مذاق کی ترجمانی کرتا تھا۔ مذہبی اور ذاتی بحث سے گریز کیا جاتا تھا۔ ان میں زیادہ جگہ خبروں کو دی جاتی تھی۔ نیم سیاسی مضامین' موسم کا حال اور بیرونی خبریں بھی شائع ہوتی تھیں۔ سادگی اور عمدگی میں یہ اخبار اپنے ہم عصروں میں ممتاز تھا۔ بعد میں محمد عظیم صاحب نے انگریزی طباعت کا کام ترک کر دیا اور فارسی و اردو چھاپہ خانہ اور رہائش اس کوچے میں منتقل کر دی جو بازار حکیماں کے ساتھ ٹبی کے سامنے واقع ہے اور ان کے صاحبزادے کے نام پر "بازار جج محمد لطیف" کے نام سے مشہور ہے۔ جس حویلی میں آپ منتقل ہوئے' وہ "حویلی جج صاحب" کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۸۶۱ء میں اخبار "پنجابی" کی اشاعت معطل کر دی گئی لیکن ۱۸۶۵ء میں اس کا دوبارہ اجرا کیا گیا' جس کے بعد یہ اخبار ۱۸۹۰ء تک مسلسل شائع ہوتا رہا"۔

"جب مسٹر پرنسپ' صاحب بہادر کمشنر بندوبست نے ضلع امرتسر کے کل دیہات کے شجرہ ہائے کشوار کی چھپائی کا ٹھیکہ منشی محمد عظیم صاحب کو دیا تو اس کے لیے سید محمد عظیم صاحب خود ایک شاخ مطبع کی لے کر امرتسر تشریف لے گئے اور کرمونکی ڈیوڑھی میں مطبع جاری کیا اور وہیں سب کام مکمل کیا۔ ان دنوں میں سید عظیم صاحب کی آمدنی ایک لاکھ روپیہ ماہوار سے بھی زائد تھی۔ علم و فضل کی بنیاد پر اور اخبارات کے ناشر ہونے کے باعث سید عظیم صاحب

کا شمار شہر کے ممتاز ترین افراد میں ہوتا تھا۔ پنجاب میں صحافت کے بانی کے طور پر ان کا مقام مسلم ہے"۔

ایک خاندانی دستاویز کے مطابق "سید محمد عظیم صاحب بہت زیادہ عبادت گزار تھے اور ہر دم اللہ سے رجوع رکھتے تھے۔ دہلی میں سکونت کے ایام میں ان کے رفیقان طریقت میں سے دو صاحبان حافظ محمد بخش صاحب اور حافظ محمد حسین صاحب ان کے ہمراہ دہلی شہر کے باہر بیابانوں میں نکل جاتے اور وہاں عبادت الٰہی میں مصروف رہتے۔ اس زمانہ میں انہیں کئی مرتبہ ایسی جماعتوں کی زیارت بھی نصیب ہوئی' جو نماز پڑھتی نظر آئیں مگر پھر اچانک نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔ اسی دوران انہیں آقائے دو جہاں سرور کائنات حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت باسعادت نصیب ہوئی"۔

منشی عظیم صاحب چھریرے بدن کے مالک تھے۔ غذا بہت کم تھی۔ انہیں کیمیاگری اور ملمع سازی پر بھی خاصا عبور حاصل تھا۔ چند ادویہ مجرب بھی بناتے اور غرباء میں تقسیم کر دیتے تھے۔ بندوق کا نشانہ لگانا اور تیراکی بھی جانتے تھے۔ مہمان و دوست نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ ضرورت مندوں کے لیے ان کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔

جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کے بعد' اکثر رؤسائے دہلی کو لاہور آنے کی ضرورت پڑتی تو ان میں سے اکثر سید عظیم صاحب کے ہاں ٹھہرتے۔ کنبہ پروری سید محمد عظیم صاحب پر ختم تھی۔ ان کے فرزند سید شمس الدین صاحب کے بیان کے مطابق "جناب والدہ صاحبہ فرماتی تھیں کہ دوستوں اور احباب کی مدارات میں پانچ سو روپیہ خرچ کر دینا ان کے لیے معمولی بات تھی۔ ملنسار ایسے تھے کہ غریب سے غریب کے ہاں بھی شادی وغیرہ پر جانا عین باعث راحت سمجھتے تھے۔ بڑی شادیوں پر ان کا خزانچی پانچ سو روپیہ کی تھیلی ہمراہ لے جاتا تھا۔ کوئی دریافت کرتا کہ یہ بوجھ کیوں اٹھا رکھا ہے تو جواب ملتا کہ ابھی خرچ کثیر آن پڑے تو حضرت کو کیا جواب دوں گا۔ ملازمین سے کسی بھی قسم کا نقصان ہو جاتا تو سخت گیری نہ فرماتے تھے۔ ان کے استعمال میں اکثر اشیائے نقرئی مثلاً پان دان' خاصدان' حقہ' پیچوان' تھالیاں وغیرہ رہا کرتی تھیں"۔

سید شمس الدین صاحب ہی کے بیان کے مطابق "سید محمد لطیف صاحب پنجابی اخبار مورخہ ۳۱ جنوری ۱۸۸۵ء میں تحریر فرماتے ہیں کہ حافظ ثناء اللہ صاحب مرحوم رئیس دہلی کی زبانی ہے کہ اکبر شاہ ثانی کے عہد میں ہمارے خاندان کے وظائف بند کر دیے گئے تھے مگر بادشاہ کو رات' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ آپ ﷺ نے بادشاہ کو

سرزنش کی۔ چنانچہ بادشاہ نے فوراً وظائف بحال کر دیے"۔

"یہ اسی عبادت و ریاضت کا اثر تھا کہ عظیم صاحب نے تمام عمر چارپائی پلنگ پر استراحت نہ فرمائی۔ سردیوں میں زمین پر اور گرمیوں میں تخت پر بستر کر کے سوتے تھے۔ سلام کرنے میں ہمیشہ پہل کرتے تھے۔ دلائل الخیرات اور قصیدہ بردا شریف آپ کا ورد تھا۔ قرآن پاک سے آپ کو دلی محبت تھی۔ میاں قادر بخش صاحب نابینا امام مسجد کا بیان ہے کہ کسی شخص کو تلاوت قرآن مجید کرتے دیکھتے اور اس سے کوئی غلطی ہو جاتی تو فوراً اس کی اصلاح فرما دیتے تھے۔ طبیعت اس قدر گداز تھی کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ذکر مبارک آتا تو فوراً آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔ کوئی رات ایسی نہ گزرتی ہو گی جب ذکر الٰہی نہ فرماتے ہوں۔ ان کی اہلیہ بھی نہایت عبادت گزار تھیں"۔

سید محمد عظیم صاحب بادشاہ دہلی کے پیر و مرشد حضرت میاں غلام نصیرالدین عرف کالے میاں" کے ہاتھ پر بیعت تھے۔ کٹڑہ تارکشاں کی سکونت کے زمانے میں نیاز سولھویں کا مختصر سلسلہ جاری رہا۔ سید شمس الدین صاحب کے مطابق "باوجود اختصار سینکڑوں آدمی خمیری روٹی اور دال نخود تناول کرتے۔ تعلیم نسواں کی طرف بھی عظیم صاحب کی خاص توجہ تھی' جس کے صلے میں حکومت نے انہیں خلعت عطا کی۔ حضرت والد صاحب کا معمول تھا کہ ہر سال اپنے مطبع کی چھپی ہوئی کئی سو روپے کی درسی کتب وغیرہ طلبہ کے انعام کے لیے جناب آرنولڈ صاحب بہادر ڈائریکٹر سرشتہ تعلیم کے حوالے کیا کرتے تھے۔ حضرت والد صاحب وائسریگل درباری تھے۔ گورنر جنرل بہادر اور پرنس آف ویلز وغیرہ کے درباروں میں آپ کو فخر کرسی نشینی حاصل تھا۔

سکونت کٹڑہ تارکشاں میں حضرت والد صاحب ماہوار مشاعرہ منعقد کیا کرتے تھے' جس میں تمام شاعران وقت کے علاوہ اہل شہر کثرت سے شامل ہوتے تھے۔ اس زمانہ میں اعزا کو شوق شعرگوئی تھا۔ نواب شیخ غلام محبوب سبحانی خلف نواب امام الدین خان صاحب رئیس اعظم لاہور اور اسی درجہ کے اور رؤساء اور شعراء شریک مشاعرہ ہوتے تھے۔ ان کی خاطر مدارات دل کھول کر کی جاتی تھی جو حضرت والد صاحب کا خاصہ تھا۔ برادر مکرم جناب مولوی محمد لطیف صاحب بہادر کو بھی شوق شعرگوئی اسی زمانہ میں ہوا تھا۔ ایک ماہوار رسالہ مخنوار ان عالی قدر کے کلام کا شائع کیا جاتا تھا۔

اسی مشاعرہ میں دیوان امرناتھ صاحب رئیس لاہور خلف دیوان دیناناتھ صاحب درباری مہاراجہ رنجیت سنگھ بھی اپنا کلام پیش کیا کرتے تھے۔ ایک کتاب مثنوی بہار عشق مصنفہ دیوان

صاحب موصوف ہے، جس میں اول تو صفت خدا تعالیٰ اور بعد ازاں نعت سرور کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پنج تن پاک درج ہے۔ فرماتے ہیں:

کیا نعت لکھوں میں مصطفیٰ کی — نور حق و جلوہ خدا کی
جو بات کہ فہم میں نہ آئے — کیا اس کا پتہ کوئی بتائے
کیا نعت کہے یہ ذرۂ خاک — حق میں جو ہو تیرے ما عرفناک
اب غنچہ دل چمن چمن ہے — خاک رہ پاک پنجتن ہے

اسی زمانہ کٹڑہ تارکشاں میں حضرت والد صاحب علم برداری کیا کرتے تھے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ جب جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) میں دہلی لٹ گئی تو وہاں کی لوٹ میں کسی امام باڑہ کے علم و شدے بھی لاہور پہنچے۔ حضرت والد صاحب نے انہیں خرید لیا۔ چند علم ان میں سے پیتل کے تھے، جو سالم ایک پرزہ کے بنے ہوئے تھے۔ باقی علم تانبہ کے تھے، ان پر والد صاحب نے سنہری روغن کرایا اور اپنے کاتب مولوی اسد اللہ صاحب سے ان پر کلمات مناسب بہ خط نسخ و خط نستعلیق تحریر کرائے۔ یہ علم چھڑیوں پر آویزاں کیے گئے اور چھڑیاں ایک قطار میں ایک مصفی فرش چوبی پر، جو چوکیوں کا تھا، رکھے گئے، جن پر کلمات متبرکہ بحروف نقرئی تحریر شدہ تھے۔ مکان کو شیشہ و آلات سے خوب آراستہ اور لوبان وغیرہ سے معطر کیا گیا تھا۔ لاہور میں یہ علم عجوبہ روزگار تھے۔ مجھے یاد ہے کہ نواب نوازش علی خاں صاحب قزلباش ان کی زیارت کے لیے تشریف لایا کرتے تھے۔ یہ ایک درگاہ تھی جو زنانہ مکان میں تھی۔ مجالس ہائے عزاداری میدان مطبخ میں منعقد ہوتی تھیں، جن میں کئی سو آدمیوں کا مجمع ہوتا تھا۔ تمام مشہور سوز خوان اور تحت اللفظ پڑھنے والے اپنی خوش الحانی سے دلوں کو مسخر کرتے تھے۔ ہمارے ہاں عشرہ کی ساتویں تاریخ کو مہندی بھی اٹھائی جاتی تھی۔ سبیل ایام عشرہ میں جاری کی جاتی تھی۔ یہ سب نتیجہ آسودگی کا تھا۔ ماتم ہمارے ہاں کبھی نہیں ہوا۔ حضرت والد صاحب اہل سنت والجماعت تھے۔ ان کی بیعت بھی خاندان چشتیہ میں تھی"۔

"سلطنت مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خاتمہ کے بعد جب گورنمنٹ (حکومت برطانیہ) کا تسلط ہوا اور حضرت والد صاحب لاہور تشریف لائے تو رانی جنداں، مہاراجہ کی بڑی رانی زندہ تھیں اور مہاراجہ کے امراء مثل تیجا سنگھ وغیرہ سب زندہ تھے۔ یہ سب اصحاب حضرت والد صاحب کی خدمت میں تشریف لایا کرتے اور ان کی خاطر مدارات کی جاتی تھی۔ ان دنوں بڑی چہل پہل رہتی تھی۔ شہر کا کوئی حصہ نہ تھا کہ وہاں کے رہنے والے والد صاحب کے پاس ملازم نہ ہوں۔ اس لیے شرفائے شہر والد صاحب کی توقیر و منزلت حد سے زیادہ کرتے تھے۔

امراء تو تعظیم و تکریم سے پیش آتے ہی تھے' حکام والا مقام بھی عزت افزائی میں کمی نہ فرماتے تھے۔ صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر اس امر کے خواستگار رہتے تھے کہ ان کے انتظام کی بابت کوئی غلط بات اخبار "دی لاہور کرانیکل" میں شائع نہ ہو"۔

"سردار علی رضا خاں کابلی' جنہیں بعد میں گورنمنٹ نے نواب کا خطاب دیا' کے فرزند نواب نوازش علی خاں' اس زمانے میں چنداں آسودہ نہ تھے۔ حضرت والد صاحب کے ساتھ ان کے تعلقات تھے۔ یہ صاحب ہر سال عشرۂ محرم کے موقع پر والد صاحب سے خرچ مجالس عزاداری کے لیے پانچ سو روپے قرض لیا کرتے تھے اور سال بھر میں بتدریج ادا کرتے"۔

"نولکھا میں ہر چاند کی سولہ تاریخ کو والد صاحب نیاز بزرگان کی تقریب سے فیاضانہ دعوت غرباء و مساکین کرتے تھے۔ متوسط طبقہ کے اصحاب کی بھی دعوت کی جاتی تھی۔ کثرت اغذیہ لذیذہ اور مردمان کی مثل ایک شادی کے ہوا کرتی تھی۔

اسی زمانہ کا ذکر ہے کہ بعد نواب حاجی محمد خان صاحب' نواب صادق محمد خاں صاحب والی ریاست بہاولپور کسی خانہ جنگی کی وجہ سے ثمن برج قلعہ لاہور میں نظربند تھے۔ والد صاحب سے ان کا اس قدر دوستانہ ہو گیا کہ وہ والد صاحب کے پگڑی بدل بھائی بن گئے۔ نواب صاحب کی کئی بیگمات تھیں مگر وہ بے اولاد تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں ثمن برج میں جاتا تو نواب صاحب میدان پریڈ کی طرف کے جھروکوں میں مجھے گود میں لے کر بیٹھے رہتے اور بیگمات' جو پانچ سے کم نہ تھیں' مجھے یکے بعد دیگرے اپنی گود میں رکھنے سے نہ تھکتی تھیں۔ نواب صاحب نے مجھے اپنا بیٹا بنانے کی خواہش کا اظہار کیا مگر والدہ صاحبہ نے انکار کر دیا کہ میں اپنا بچہ کسی کو نہیں دیتی۔

نواب صاحب کو سولہ سو روپیہ ماہوار خرچ ملتا تھا۔ انہوں نے والد صاحب سے استدعا کی کہ ہمارا خرچ آٹھ سو روپے ماہوار ہے' باقی آٹھ سو روپیہ ہمارا آپ جمع کر لیا کریں مگر والد صاحب نے امانت رکھنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ شیخ رحیم بخش کلاں سوداگر انارکلی ایک دیانت دار شخص ہے' آپ آٹھ سو روپیہ اس کے پاس جمع کروا دیا کریں۔ چنانچہ نواب صاحب ایسا ہی کرتے رہے۔ عرصہ کے بعد نواب صاحب ثمن برج میں ہی ہیضہ سے فوت ہو گئے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے' نواب صاحب بعلت خانہ جنگی لاہور لائے گئے تھے۔ حضرت والد صاحب اخبار "لاہور کرانیکل" کے ذریعے ان کی بریت ثابت کیا کرتے تھے اور عنقریب یہ معاملہ نمٹ جاتا مگر عمر نے وفا نہ کی۔ نواب صاحب کا وعدہ تھا کہ اگر خدا نے ریاست میں واپس جانے کا موقع دیا تو والد صاحب کو اپنا مدار المہام کر کے ریاست کے جزوی

دکلی معاملات ان کے سپرد کر دیں گے۔ نواب صاحب کی بیگمات کا انتظام محمد برکت علی خاں صاحب تحصیلدار لاہور کے سپرد ہوا۔ انہوں نے منشی شہامت خاں صاحب کو بیگمات کا داروغہ مقرر کرایا۔ یہ منشی صاحب اس وقت عرضی نویس تھے مگر بعد میں لاہور میونسپل کے کمشنر ہو گئے"۔

دسمبر ۱۸۸۴ء میں سید محمد عظیم صاحب کی طبیعت بگڑ گئی۔ سید محمد لطیف صاحب گورداسپور سے عیادت کے لیے تشریف لائے اور انہیں اپنے ساتھ ہی گورداسپور لے گئے۔ وہاں علاج معالجہ سب کچھ ہوا مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ بالآخر ۲۷ جنوری ۱۸۸۵ء کو اپنی جملہ اولاد کی موجودگی میں واصل بحق ہوئے۔ جسد خاکی لاہور لایا گیا اور رشید الدین مرحوم (جو آپ کے تیسرے صاحبزادے تھے اور صغیر سنی میں ہی انتقال کر گئے تھے) کے پہلو میں قبرستان میانی صاحب میں دفن کر دیا گیا۔ سید محمد لطیف صاحب اور دیگر اقرباء بھی انہی کے پہلو میں آسودۂ خاک ہیں۔

قطعہ تاریخ وفات

از حضرت مرحوم مصنفہ حافظ عمر دراز فائض

مندرجہ پنجابی اخبار مورخہ ۳۱ جنوری ۱۸۸۵ء

صدر افسوس منشی محمد عظیم — کہ باحق ہمی داشت راز و نیاز
ہمیں داشت بر آستین وجود — ہمہ عمر دولت و دین طراز
غنی خاطرش بود از جاہ و مال — دلش پاک بودست از حرص و آز
دل از خلق بردے نجلق عظیم — بد ارچہ زا قران خود سرفراز
چناں ہمتی عالی افتادہ بود — کہ بود اوج گیرای چوں شاہباز
چو من بندگان دارشتہ بسیار بود — بر صادق اطلاق بندہ نواز
پے بیکساں و یتیماں شہر — در دولتس بود پیوستہ باز
بہ توحید و صوم الفتی بیش داشت — ادا کرد حج و زکوٰۃ و نماز
برفت از جہاں وروو ہر کسے — اگرچہ زید عمر ہائے دراز
از اخلاف وا قران او ہر کہ ہست — دلش ہست زیں سانحہ در گداز
نجواں سال فوتش از روی عالم — برفت سوئے جنت آں پاکباز

۱۳۰۲ ہجری

قطعہ تاریخ

از مفتی امام بخش صاحب رئیس وٹالہ

شریف الزماں چوں محمد عظیم　　ز دنیا رواں شد بہ جنت نعیم
ز ترحیل سالش زہاتف نداست　　مکان ابد بین محمد عظیم
۱۳۰۲ ہجری

قطعہ

از مفتی امام بخش صاحب رئیس وٹالہ

چوں محمد عظیم کرد سفر　　سوئے عقبیٰ خیال غیر بہشت
سال ترحیل او از ہاتف غیب　　شد محمد عظیم دین بہشت
۱۸۸۵ عیسوی

قطعہ

از جناب مولوی گل محمد عالی گورداسپور

ز تاریخ حاجی محمد عظیم　　چہ خوش گفت عالی بازرنگار
سوئے خلد شد عزیز نامدار　　دریغا کزیں دار ناپائیدار
۱۳۰۲ ہجری

قطعہ

از جناب منشی محمد غیاث الدین نبیرہ حضرت موصوف

چوں جناب حاجی شوکت عظیم　　ایں جہان پر دغا پدر و دکرد
اشک جاری شندر چشم ناتواں　　از دل محزوں برآمد آہ سرد

الغیاث از مرگ عظیم الغیاث　　از ریاضت بد ہمہ تن حرف درد
بد فنا قبل از فنا اندر جہاں　　ذاتش اندر اتقا بودست فرد
رحم مثلش بر مساکین و غریب　　حق چنیں ست اندریں آواں کہ کرد
ہاتم گفت کشیدہ روی آہ　　جان بحق تسلیم کرد آن نیک مرد

۱۳۰۲ ہجری

قطعہ

از جناب مولوی محمد انور شاہ انور

مقیم امرتسر، ملازم سرکار رامپور

چوں منشی محمد عظیم معظم　　نمود انتقال اندریں سال پرغم
زہر سمت برخاست شور قیامت　　بصد غم جہانے نشستہ بماتم
زہر دیدہ بنیم رواں اشک حسرت　　زہر دل عیاں آہ پرسوز ہر دم
ز رنج و قلق شق گردید دلہا　　شد از بار مہجوریش پشت جان خم
مناسب شمر کانچہ خوانم بمدحش　　کہ بودہ نجیب و خردمند اعظم
بتحریر و تقریر و فہم و فراست　　نبودہ بہ پنجاب مثلش یکے ہم
رشید و وحید و فرید زمانہ　　حلیم و علیم و کریم و مکرم
غرض کان خدا بندہ زین بند فانی　　رہا گشتہ و شد بقایش مسلم
بہ انور علی گفت سال وفاتش　　بود عدن جائے محمد عظیم

۱۳۰۲ ہجری

قطعہ

از حافظ عمر دراز فائض

کرد جہان را وداع منشی محمد عظیم
گشت دل عالی از غم بحرش درینم

84204

بسکہ بدل داشتی عشق رسول کریم
رخت چو زین دار بست گشت بہ جنت مقیم
سال وصالش نوشت فائض غمگیں چنین
سید آل نبی حاجی محمد عظیم

منشی محمد عظیم صاحب کی زوجہ مبارک کی تاریخ وفات بمطابق "پنجابی اخبار" مورخہ ۲۶ فروری ۱۸۹۰ء سے ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

قطعہ تاریخ

از حافظ عمر دراز فائض

جس سے غریب اور یتیم پائیں مراد دل مدام
موت سے اس عفیفہ کے سینہ و قلب چاک ہے
فائض غم رسیدہ شدت و رنج و درد میں
سال وفات لکھ دیا داخل خلد پاک ہے

سید محمد لطیف صاحب نے اپنی تصنیف "تاریخ لاہور" (انگریزی) میں پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر سر چارلس ایچی سن کا وہ پیغام بھی نقل کیا ہے' جو انہوں نے منشی سید محمد عظیم صاحب کی وفات پر دیا تھا۔ "ان کا صحافتی کیریئر چالیس سال کی طویل مدت پر پھیلا ہوا تھا۔ انہوں نے ۱۸۴۹ء میں پرانا "کرانیکل" جاری کیا اور بعد ازاں "پنجابی" (اردو) کی اشاعت شروع کی جو مقامی زبان میں پہلا اخبار تھا۔ پنجاب میں صحافت کے بانی کی حیثیت سے ان کے کارناموں اور حکومت کے مقاصد و عزائم کے دانش مندانہ تجزیے کی صوبے سے متعلق ممتاز افراد قدر کرتے تھے"۔

سر لیپل گرفن (Sir Lepel Griffin) کے مطابق "منشی سید محمد عظیم زبردست قوتوں کے مالک تھے۔ ان کی وفات ایک بڑا نقصان ہے"۔ الغرض سید محمد عظیم صاحب ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے خطہ پنجاب میں صحافت کا جو بیج بویا' وہ ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ ان کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

تاریخی تحقیق کے شوق نے غالباً سید محمد لطیف صاحب میں آثار قدیمہ' مجسموں اور سکوں

میں دلچسپی کو ابھارا۔ ملتان کی قدیم تاریخ پر ان کے کتابچے میں قدیمی کھنڈرات کے ڈھیروں کی
نشاندہی سے آثار قدیمہ میں دلچسپی رکھنے والے افراد آج بھی مستفیذ ہو سکتے ہیں۔ "تاریخ
لاہور" میں گندھارا فن کے نمونوں کے عکس بڑی تعداد میں شامل ہیں' جن سے ظاہر ہوتا ہے
کہ وہ کم از کم ایک حد تک فن پاروں کو کسی قوم کے ارتقاء کا مظہر قرار دیتے تھے۔ کلکتہ سے
شائع ہونے والے رسائل میں انہوں نے سکوں کے بارے میں متعدد مقالے لکھے۔ اس کے
علاوہ لاہور کے عجائب گھر میں موجود مختلف ادوار کے سکوں کے متعلق انہوں نے جس قدر
تفصیل سے روشنی ڈالی ہے' وہ شاید ہی کسی اور کتاب میں نظر آئے۔ ان کی اس تحقیق پر
حیرت ہوتی ہے جو انہوں نے تاریخ کے اصل حقائق کو سامنے لانے کے لیے کی۔ لطیف
صاحب نے اپنی کتاب میں کئی مقامات پر بیان کیا ہے کہ انہوں نے روایتی طریقہ کار سے ہٹ
کر تاریخ کے بارے میں تحقیق کی ہے۔ اس سلسلے میں وہ خود بھی کئی مقامات پر تشریف لے
گئے۔ آثار قدیمہ کا بچشم خود مشاہدہ کیا' اردگرد کے ماحول کا بغور جائزہ لیا۔ مقامی لوگوں سے
رابطہ کر کے عمارات اور آثار کے متعلق قیمتی معلومات جمع کیں۔ سرکاری ریکارڈ میں درج
اصل حقائق کو عام قاری کے روبرو پیش کیا' حالانکہ اس سے پیشتر مورخ حضرات زیادہ تر
اپنے ذاتی مشاہدہ سے کام لینے کے بجائے لکیر کے فقیر ہوتے ہوئے پہلے سے موجود تاریخی کتب
سے ہی استفادہ کو کافی سمجھتے تھے' کسی نئی بات یا تحقیق کے متعلق کوشش کو عبث اور لایعنی
خیال کیا گیا... مگر سید محمد لطیف صاحب کی متجسسانہ طبیعت نے یہ گوارا نہ کیا بلکہ سائنٹیفک
طریقے سے تاریخ کے اصل اور مبنی بر حقیقت اور مبالغہ آرائی سے یکسر پاک حقائق اور
حالات و واقعات کے متعلق نہایت باریک بینی اور احتیاط سے چھان بین کو اپنا نصب العین
بنایا۔ اسی بنا پر انہوں نے کئی تاریخی کتب میں موجود متعدد غلطیوں کی نشاندہی کر کے ان کی
اصلاح بھی کی۔ یقیناً یہ کام زبردست اور شبانہ روز تحقیق و جستجو کے بغیر ناممکن تھا۔

سید محمد لطیف صاحب کے انگریز حکمرانوں اور اعلیٰ سول و فوجی افسران و حکام بالا سے
گہرے اور دوستانہ مراسم تھے۔ انگریز حکام نے ان کی خوب حوصلہ افزائی کی' لہٰذا اسی چیز کو
مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے انگریزوں کو ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور یہاں کے قیمتی
ورثوں اور نوادرات سے روشناس کرانے کے لیے تاریخی کتب (بزبان انگریزی) تصنیف
کیں۔ اگرچہ سید محمد لطیف صاحب نے ایک مختصر زندگی پائی مگر اس قدر قلیل عرصہ میں
تصنیف و تالیف کا یہ ریکارڈ ہر لحاظ سے شاندار اور لائق تحسین و آفرین ہے اور برصغیر کے
مورخین کی صف میں سید محمد لطیف صاحب کا اعلیٰ مقام شک و شبہ سے بالاتر ہے۔

سید محمد لطیف صاحب کی تحریروں سے ان کی عربی، فارسی، اردو اور انگریزی زبانوں پر قدرت اور استعداد کا ہی پتہ نہیں چلتا بلکہ ان کی مستقل مزاجی اور اظہار رائے میں دیانت داری بھی واضح ہے--- سید لطیف صاحب کے چھوٹے بھائی سید شمس الدین صاحب کے مطابق "جناب بھائی صاحب قبلہ کی طبع مبارک کبھی ظرافت کی طرف مائل ہو جاتی تو وہ چٹکلہ دار مضامین اخبار میں لکھتے کہ اگر انہیں سنیں یا پڑھیں تو ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائیں"۔

ان کے ذاتی خیالات، نظریات اور مشاہدات کا عکس ان کی ہر کتاب میں دکھائی دیتا ہے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے، مسلمان حکومت کے زوال پر انہیں افسوس تھا لیکن وہ اس زوال کی وجہ مسلمانوں کی رجعت پسندی قرار دیتے تھے۔ نسلاً وہ پنجابی نہ تھے، لیکن تحریروں کے حوالے سے انہیں پنجابی قوم پرست کہنا غلط نہ ہو گا۔ وہ رنجیت سنگھ سے ازحد متاثر تھے۔ وہ مغل امراء اور سکھ حکام کے مظالم کو ایک ہی نظر سے دیکھتے تھے۔ انہوں نے ہر بات کو نہایت دیانت داری اور ہر قسم کے مذہبی تعصب سے بالاتر ہو کر بیان کیا ہے۔

سید محمد لطیف صاحب نے "تاریخ لاہور" لکھی تو اپنی اس کتاب میں ایسی باتوں اور چیزوں کا بھی اضافہ کیا، جس پر مورخین یا تو دھیان نہیں دیتے رہے یا جان بوجھ کر اس سے پہلوتہی کرتے رہے۔ انہوں نے اس خطہ کی قدیم ترین تاریخ کا ذکر کیا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ جدید دور کے متعلق اور اس کی فلاح و بہبود، لوگوں کے رہن سہن اور نئی نئی ایجادات کے بارے میں بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ یہاں تک کہ دریاؤں، ندی نالوں، پلوں، تاریخی عمارات، سکولوں، کالجوں، سرکاری دفاتر کا تذکرہ کیا ہے تو ساتھ ساتھ اس کے دروازوں، گلی محلوں، بازاروں، چیدہ چیدہ خاندانوں، دستکاریوں، سبزیوں، پھلوں، پھولوں، موسموں، آب و ہوا، میلوں ٹھیلوں، تہواروں، ملبوسات، اہل حرفہ اور دیگر دلچسپیوں کا بڑے خوبصورت اور دلکش پیرائے میں ذکر کیا ہے۔ انہوں نے صرف محاسن ہی بیان نہیں کیے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ عیوب کو بھی واضح کیا ہے۔ انہوں نے جنگوں، قتل و غارت گری، ڈاکہ زنی، ظلم و جبر، محلاتی سازشوں وغیرہ کا حال لکھا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ بادشاہوں اور حکمرانوں کی فیاضیوں، دریا دلی، عوامی فلاح و بہبود، درباری جاہ و جلال، شان و شوکت، چمن آرائی اور عشق و محبت کی داستانوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ انہوں نے بادشاہوں کے عروج و زوال کی مکمل تصویر اپنی اصل حالت میں پیش کی ہے اور اس میں کسی قسم کی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا۔ سید محمد لطیف صاحب کی خدمات کے پیش نظر ان کا نام تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

حقائق کو چھپانے کی ضرورت نہ سید محمد عظیم صاحب نے محسوس کی' نہ سید محمد لطیف صاحب نے اور نہ ہی میں اس کی ضرورت محسوس کرتا ہوں' لہٰذا اپنے دادا سید محمد لطیف صاحب کی نادر کتب کا اردو زبان میں ترجمہ کروا کر دوبارہ اشاعت کا بیڑہ اس مقصد کے تحت اٹھایا ہے کہ نہ صرف اس کتاب' بلکہ سید محمد لطیف صاحب کی دیگر کتب کو عام قاری تک پہنچایا جا سکے اور ان کتب سے صرف ایک مخصوص طبقہ' تاریخ کا طالب علم یا مورخ ہی مستفید نہ ہو بلکہ عام قاری بھی اس چشمہ فیض سے سیراب ہو سکے۔

میری اس ادنیٰ سی کوشش سے نہ صرف میرے بزرگوں کی شبانہ روز محنت کا ثمر حاصل ہو گا بلکہ آنے والی نسلیں بھی اپنے اسلاف کے کارناموں' تاریخی حقائق اور ماضی کے سربستہ رازوں سے واقفیت حاصل کر سکیں گی۔ مجھے امید ہے کہ یہ کاوش تاریخ نگاروں اور اصل تاریخی حقائق کے متلاشی افراد کے لیے ایک سنگ میل کی حیثیت اختیار کر لے گی اور تاریخ کے طالب علموں کے لیے یہ کتب مینارۂ نور کا کام دیں گی۔

اس مشن کی تکمیل میں جناب آئی اے رحمٰن نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی' رہنمائی اور مدد کی۔ جناب اظہر جاوید نے تراجم پر نظرثانی کی اور مفید مشورے دیتے رہے۔ جناب مرزا محمد شعیب نے ان تراجم کی ابتدا سے تکمیل تک میرا ساتھ دیا۔ جناب افتخار محبوب کا کتابوں کے تراجم میں اور جناب لیاقت علی صاحب مالک ادارہ "تخلیقات" کا اشاعت میں بھرپور تعاون رہا' جس کی بدولت یہ کتاب آپ تک پہنچ سکی۔

سید منہاج الدین

۸-اے شمع روڈ' اچھرہ' لاہور

مورخہ ۱۵ جولائی ۱۹۹۴ء

پیش لفظ

اگرچہ پنجاب کا دارالحکومت، قدیم یادگاری آثار کی مختلف نوعیت اور بہتات کے معاملہ میں ایشیا کے روم، دہلی یا فن تعمیر کی شان و شوکت کے سلسلہ میں اکبر کے شہر (اکبر آباد یا آگرہ) کی ہمسری نہیں کر سکتا لیکن اس کے باوجود اس میں اس قدر دلچسپ تاریخی واقعات اور مشاہدات ہیں جو شاید ہی ہندوستان کے کسی دوسرے مشہور شہر میں ہوں۔ ہندوستان کا دوسرا کوئی شہر لاہور کے مقابلہ میں اس بات پر فخر نہیں کر سکتا کہ وہ کئی شاہی خاندانوں کا پایہ تخت رہ چکا ہے، اس کے عالیشان مکانات، چمکدار مینار اور بصلہ نما گنبد کافی دور سے نظر آجاتے ہیں اور نہایت دلکش نظارہ پیش کرتے ہیں۔ اس کی پر ہجوم گلیاں، مصروف ترین بازار اور ترقی کی طرف گامزن صنعتیں اندرونی طور پر اس کی ترقی و عظیم خوشحالی کی غمازی کر رہی ہیں۔

یہ ایک ایسے علاقہ میں واقع ہے جو تاریخ میں آریاؤں کی ابتدائی ہجرت، ان کے پڑاؤ اور تہذیب و تمدن، بود و باش اور ویدک بھجن گانے والوں کی آماجگاہ کے لیے مشہور تھا۔ اس عمدہ نسل نے کالی رنگت والی غلام قوموں کو نکال باہر کر کے یا غلام بنا کر مشرق کی طرف پھیلنا شروع کر دیا۔ ان کے دستاویزی ثبوت، مصری دستاویزات اور چینی فلسفہ کے ہم پلہ ہیں اور ہر ملک کی تاریخ سے زیادہ قدیم ہیں۔

پنجاب، شمالی بدھ مت کا گہوارہ تھا، جس نے پنجاب کی یونانی بادشاہتوں سے نئی تحریک حاصل کر کے اور سکاتھیئن خاندانوں کو اپنے مذہب کی طرف راغب کر کے، مذہب اور ادب کے

میدان میں، وہ فتوحات حاصل کیں جنہوں نے تقریباً نصف نسل انسانی کو متاثر کیا۔ اس دور تک، صوبے کی شمال مغربی سرحد کے علاقہ سے، اس دلچسپ دور کے آثار کا پتہ چلایا گیا ہے جو ایک زمانہ میں پرستش و عبادت کا گہوارہ تھا۔ اس قدیم دور کے کھنڈرات سے حاصل شدہ تعمیراتی فن کو دیکھ کر ہمیں حیرانی ہوئی ہے۔

یہ علاقہ، سکندر کی فتوحات کا علاقہ ہونے کے باعث اور اپنے ساتھ اسی دلچسپی کے وابستہ ہونے کی وجہ سے توجہ کا مرکز ہے۔ جس نے پنجاب میں حقیقی طور پر برہمنیت پر اثر و رسوخ قائم کر کے شمالی ہندوستان میں فن مجسمہ سازی میں اولین تحریک پیدا کی۔ مختصر یہ کہ یہ لوگوں اور مذاہب کا گہوارہ رہا ہے اور اس کے ساتھ ایک روشن ذہن کی نہایت اعلیٰ صلاحیتوں اور وابستگیوں کا تعلق رہا ہے۔

سیاسی نقطہ نظر سے قدرت نے پنجاب کو جزیرہ نمائے ہند میں نمایاں مقام عطا کیا ہے۔ اس کو حقیقی معنوں میں اس عظیم سلطنت کے نیزے کا فولادی پھل اور شمال میں ہندوستان کی نگران چوکی کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ ابتدائی ادوار سے پنجاب نے غیر ملکی حملہ آوروں کے مقابلے میں فصیل اور میدان جنگ میں بیرونی چوکی کا کام کیا ہے اور اس نے مشرق میں سب سے زیادہ فوج جمع کرنے کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے۔

یہ ابتدائی دور سے، سپاہیوں کی سرزمین یا ہندوستان کے ہاتھ کی تلوار رہا ہے جس کے جنگجو، برطانیہ کے سپاہیوں کے ساتھ، خیبر سے چین کی سرحد تک اور برما اور آبناؤں سے لے کر افریقہ کے ساحل اور مصر و منگولیا تک پھیلے ہوئے علاقہ میں کندھے سے کندھا ملا کر لڑے۔ چاہے افغان یا مور، برمی یا سیامیوں میں سے کسی کے ساتھ بھی لڑنا ہو، انہوں نے ہمیشہ برطانوی نام کی عزت میں اضافہ کیا اور ایسی فتوحات اور کامیابیاں حاصل کیں جنہوں نے اس کو اقوام عالم میں فخر سے بلند کر دیا ہے۔

لیکن یہ شہر اس علاقے میں عظیم روایات اور سیاسی دلچسپی کے باعث سب سے زیادہ اہم اور نمایاں ہے۔ لاہور، تاریخ کے طالبعلم اور عام قاری، دونوں کی توجہ حاصل کرتا ہے۔ یہ یکے بعد دیگرے، قدیم ہندوؤں اور مسلمان حکمرانوں کا پایہ تخت رہا ہے اور دو صدی قبل، ہندو مذہب اور اسلام کے درمیان اولین کشمکشوں کا مرکز رہا ہے جو ماضی میں سبکتگین اور محمود کے زمانہ تک محیط ہیں، جس کے نتیجے میں ہندوستان میں ایک ایسا مذہب قائم ہو گیا جو صحرائے عرب سے ابھر کر پوری دنیا کی ایک چوتھائی سے زائد آبادی کی سماجی اور سیاسی حالت پر حقیقی معنوں میں اثر انداز ہوا۔

یہیں پر زیرک اکبر اپنے شاہی محل میں اپنے وزراء کے اجلاس منعقد کرتا تھا۔ اس جگہ سے جہانگیر اور نور جہاں کی محبت بھی وابستہ ہے اور یہ عالیشان شاہجہان کی جائے پیدائش ہونے کے باعث بھی یادگار ہے۔

جب خدا رسیدہ گورو نانک کے فکر انگیز ذہن نے انسان کی سماجی حالت کی اصلاح کرنے اور ایک نادیدہ خدا کی عبادت کرنے کے لیے دو برسرپیکار فرقوں کے امتزاج کے بارے میں سوچنا شروع کیا تو لاہور کی سیاسی حالت ان کے مذہبی نظام کے قیام کے لیے بڑی سود مند ثابت ہوئی جس کی حمایت ان کے پرجوش جانشینوں نے بھی کی۔ جبکہ خاص طور پر وضع کردہ حکمت عملی اور تیمور کی طاقت میں اضافہ کرنے والوں کی کارروائیوں کی تائید بھی کی گئی۔ لہذا جب ان کا زوال شروع ہوا تو گورو کے چیلوں کا گروہ، جن کو ان کے گورو نے اپنے پیچھے چھوڑا تھا، درویشوں سے جنگجو بن گئے اور ان کے آخری عسکری گورو، بہادر گووند نے ان میں قوم پرستی کی نئی روح پھونک دی۔

حالیہ ادوار میں ہم اس کو پنجاب کے شیر رنجیت سنگھ کی قائم کردہ بادشاہت کا دارالخلافہ ہونے کے باعث بھی مشہور پاتے ہیں اور موجودہ دور میں برطانوی حکومت کے زیر انتظام یہ صوبے کا اہم شہر ہے جس کے اندر ایسی اقوام موجود ہیں جو غالباً آریاؤں سے بھی زیادہ بہادر ہیں۔

اس شاہانہ شہر کی تاریخ مکمل طور پر ماضی میں رونما ہونے والے واقعات کے بیان کے لیے وقف ہے جو صوبے کی تاریخ سے ہٹے ہوئے تعلق کو پیش کرتی ہے یا ان عظیم آدمیوں کی زندگی کے واقعات سے وابستہ دلچسپی کے باعث بھی اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے جنہوں نے ایک زمانہ میں اس ملک کی سیاست میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ اس کے عمارتی آثار اور آثار قدیمہ کے بارے میں سیر حاصل بیان کی ضرورت کو کافی عرصہ سے محسوس کیا جا رہا تھا جبکہ سیاحوں کی معلومات کے لیے دہلی، آگرہ، لکھنو اور ہندوستان کے دیگر اہم شہروں کے پاس رہنما کتابچے موجود تھے۔ لیکن یہ امر قابل افسوس تھا کہ پنجاب کا دارالحکومت اس قسم کی کتاب سے محروم تھا۔ یقیناً ہندوستان کے کسی بھی شہر کے مقابلے میں لاہور میں دیکھنے کے لیے دلچسپی کے بہت سے مقامات ہیں اور ماضی کی تاریخ میں یا جدید تہذیب و تمدن کے مراکز میں سب سے زیادہ مشہور ہونے کے باعث ذی شان پنجاب کی سیاحت کرنے والے سیاح قدرتی طور پر دریافت کرتے ہیں۔ کیا اس شہر کے بارے میں کوئی رہنما کتاب ہے؟ تو مایوس کن حد تک انہیں مطلع کیا جاتا تھا کہ بالکل نہیں ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ 1873ء میں حکومت پنجاب کے سیکرٹری اور بعد ازاں، چیف کورٹ کے جج، مسٹر ٹی۔ ایچ تھارنٹن کی حوالہ جاتی کتاب شائع ہوئی، جسے لاہور کی تاریخ اور آثار قدیمہ کا

ایک مختصر بیان کہا جاتا ہے اور 1876ء میں ان صاحب اور میو سکول آف آرٹس لاہور کے پرنسپل، مسٹر جے۔ ایل۔ کپلنگ کی مشترکہ کاوش کا نظرثانی شدہ ایڈیشن شائع ہوا۔ یہ انتہائی اعلیٰ پائے کی کتاب ہے اور اس سے فاضل مصنفین کی زبردست کوشش کا پتہ چلتا ہے لیکن اس کا نفس مضمون محدود ہے اور ایسی چیزوں کو چھوڑ دیا گیا ہے جن کے لیے بہت کچھ کہنے کی ضرورت ہے۔

مزید برآں کتاب کی چھپائی درست نہیں ہے اور جب سے یہ شائع ہوئی ہے اس وقت سے بہت سی تبدیلیاں کی جا چکی ہیں۔ اب اس چیز کی اشد ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ اس اہم شہر کے حوالہ کے لیے عام حجم کی کوئی مکمل کتاب تیار کی جائے۔

اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے موجودہ کتاب پر کام شروع کیا گیا اور یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ اس کی تکمیل کے لیے کس قدر دشواریوں سے گزرنا پڑا اور قدرتی طور پر یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ کوئی ایک آدھ کتاب بھی موجود نہیں تھی جو مسلمانوں کے دور میں لاہور میں پیش آنے والے عوامی دلچسپی کے واقعات کے بارے میں معلومات مہیا کر سکتی۔ جبکہ مسلمانوں سے قبل کی تاریخ سے بہت کم لوگ واقف تھے۔ ایسی بھی کوئی کتاب موجود نہیں تھی جو اس کی قدیم یادگاروں پر روشنی ڈال سکتی یا اس کے آثار قدیمہ کے بارے میں معلومات بہم پہنچا سکتی۔

مقامی طور پر لکھی گئی تاریخی کتابیں مثلاً خزینتہ الاولیاء، سکینتہ الاصفیہ وغیرہ صرف بزرگان دین کی زندگیوں کے متعلق تھیں، جن میں بہت زیادہ مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا تھا۔ جبکہ ہندوستان کی عام تاریخی کتابیں مثلاً طبقات اکبری، اقبال نامہ جہانگیری، منتخب التواریخ وغیرہ، جنگوں صاحب اقتدار، کسی فرد واحد کی مدح سرائی اور کم شہرت کے حامل شخص کی ناپسندیدگی کے متعلق بیان کے لیے وقف ہیں۔ درحقیقت وہ گھٹیا درجے کی درباری سازشوں، شرمناک قتل اور خلاف ورزی و غارت گری کی کارروائیوں کی مستند دستاویزات ہیں۔

مقامی تفصیل کے معاملات دھندلی داستانوں میں چھپے ہوئے ہیں یا ان میں اکتا دینے والی مبالغہ آرائی کی گئی ہے اور مشکل امر یہ ہے کہ اس سے متعلقہ مواد اس طرز پر لکھی گئی ضخیم کتابوں کے بیشمار صفحات میں بکھرا پڑا ہے۔ ان میں فہرست مضامین نہیں ہے۔ مضامین کے بارے میں قاری کی کسی قسم کی رہنمائی نہیں کی گئی۔ بہت سی مثالیں ہیں جن میں مضامین بغیر عنوان کے ہیں۔ اگر عنوان موجود ہوتے تو تفصیل کی بجائے انہی سے مطلب اخذ کیا جا سکتا تھا۔ تاہم اس کتاب کے تاریخی حصہ کے لیے مواد اکٹھا کرنے کے لیے چند نادر دستاویز حاصل کی گئی ہیں۔ ان میں فارسی کی مشہور زمانہ کتاب بہار دانش کے مصنف عنایت اللہ کے بھائی، مُلّا محمد صالح لاہوری کی تصنیف

" شاہجہان نامہ " ، بٹالہ کے قانونگو سجن رائے جو اورنگ زیب کے دور میں منصب دار تھا اس کی تصنیف " خلاصۃ التواریخ " ، ملا عبدالحمید لاہوری کی تصنیف " بادشاہ نامہ " جس کو شاہجہاں کے حکم سے مکمل کیا گیا تھا۔ شیخ احمد زنجانی کی " تواریخ مجددیہ " ، " تحفۃ الواصلین " ، لاہور کے حسن نظامی کی تاج المآثر، عبداللہ کی تاریخ داؤدی ، حیدر مرزا دولت کی " تاریخ رشیدی " ، بہادر شاہ کے دور میں لاہور کے دیوان ، محمد ہادی کی تصنیف " تذکرہ چغتائی " ، محمد شاہ کے دور میں مکمل ہونے والی تصنیف " تذکرہ آنندرام مخلص " اور " تاریخ احمد شاہی " وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اصل کتابوں میں موجود طوالت اور مبالغہ آرائیوں سے قطع نظر کر کے موجودہ بیان کی شکل دی گئی اور یہ امید کی جاتی ہے کہ تاریخی مندرجات اور اس میں بیان کیے گئے مضامین کی وضاحت کے سلسلہ میں یہ حوالہ جاتی کتاب جو اپنے مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کرتی ، ممد و معاون ثابت ہو گی۔ مصنف کا مقصد یہ ہے کہ شاہی حکومت کے ادوار میں صوبائی دارالحکومت میں چیزوں کی حالت کے بارے میں درست تصور پیش کیا جائے ، جن کے متعلق ہندوستان کی سیاست پر بحث کرنے والی تاریخی کتابوں میں تعارف پیش کیا گیا ہے۔ سب سے آخر میں اختصار کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔

کتاب کے بیانی حصہ میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ لاہور کو عمارتی آثار کے معاملہ میں وقت کی دست برد سے محفوظ ان یادگاروں کے حوالہ سے پرکھنا نہیں چاہیے جو سیاح کو ادھر ادھر بکھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ افغانوں اور سکھوں کے بے رحم ہاتھوں نے اپنی اپنی باری پر بڑی بے دردی سے انہیں ان کی عمارتی آرائشوں سے محروم کر دیا۔ نہایت خوبصورت اور شاندار یادگاروں میں سے بہت سی بالکل تباہ و برباد ہو گئیں اور ان کا اب نام و نشان تک نہیں ملتا۔ جبکہ بہت سی عمارتوں کو زینوں اور آرائشی پتھروں سے محروم کر دیا گیا اور سوائے ڈھانچے کے کچھ باقی نہ بچا۔

ان یادگار عمارتوں کو غارت گروں نے ناقابل استعمال اشیاء کہہ کر اس لیے چھوڑ دیا کہ ان کے طاقتور کھردرے ہتھوڑوں کو ان کی مضبوطی اور طاقت کے سامنے منہ کی کھانی پڑی اور اب یہ ان کی تیز چھینیوں کی آزمائش سے لاتعلق کھڑی ہوئی ہیں۔

تاہم وقت کے غیبی تاثر کے باوجود اس پراسرار ، سست اور خاموش لیکن یقینی کارکن ، جس نے انہیں ایستادہ کیا تھا آخر کار انہیں انتہائی طاقتور بادشاہتوں کے ہمراہ خاک میں ملا دیا۔ اس کے بارے میں جرمن شاعر نے بالکل درست کہا ہے: ۔

ترجمہ: " جب سے روم وقت کے فاتح ہاتھ کے نیچے ڈوب چکا ہے ؟
تو زمین کی وسیع جگہ پر امید سے پہلے خیال ٹھہر سکتا ہے ؟ "

انگریزوں کے اس ملک کو فتح کرنے سے قبل عظیم انقلاب رونما ہونے اور بے رحم فطرت کے باوجود یہ جابر حکمرانوں کے زیر نگیں ہو گئیں۔ انہوں نے ہر طرف غارتگری کا کام مکمل کر دیا اور یہ ان ادوار کی یاد تازہ کرنے کے لیے اولین بادشاہتوں اور تہذیب کی پرانی یادگاروں کی شکل میں باقی بچ گئیں، جن کے بارے میں مشتاق قاری بہت کم جانتا ہے۔

یہ امر بہت دلچسپی کا حامل ہو گا کہ اس بارے میں اندازہ لگایا جائے کہ ماضی کے ادوار کی ان عظیم یادگاروں کا تعلق کن سے تھا؟ وہ کون سی مشہور شخصیات تھیں جن کی خاک ان قدیم گنبدوں اور قبروں میں دفن ہے؟ یہ کون لوگ تھے جو اب انسانوں کے شور و غوغا کے سحر سے دور ان خاموش، بے یار و مددگار اور نظر انداز کی گئی جگہوں میں محو استراحت ہیں؟

اس جیسے سکوت میں آدمی حقیقی طور پر خوف محسوس کرتا ہے اور اس بات پر پہلے سے زیادہ غور و خوض کرتا ہے کہ اس کے کام کس قدر ناپائیدار اور عارضی ہیں، قومیں کیسے ابھرتی ہیں اور گزر جاتی ہیں، انسانی مہارت کے انتہائی شاندار نمونے اور ایجادات کیسے گمنامی میں کھو جاتے ہیں اور دنیا کے شاندار اور قابل فخر عجائبات کو وقت اور موت کیسے کھنڈر میں تبدیل کر دیتے ہیں؟ ان جیسے معاملات کے متعلق، معلومات اکٹھی کرنے کے لیے دوبارہ مصیبت میں مبتلا ہونا پڑا۔ اگر آپ ایک ہمسایہ زمیندار سے کاشت کیے گئے کھیتوں کے درمیان کھڑے تن تنہا گنبد یا جی ٹی روڈ سے کچھ فاصلے پر ایستادہ پرانے مینار کے بارے میں دریافت کریں گے کہ اس کا تعلق کس سے ہے؟ تو وہ آپ کو صرف یہی کہے گا۔ " بادشاہاں دے ویلے دا اے " یا ایک پڑھے لکھے شخص سے پوچھا جائے تو وہ آپ کے متجسس سوال کا یہ جواب دے گا " چغتیاں دے ویلے دا اے۔ " ان قیمتی معلومات کے ساتھ ہی دریافت کرنے والا اس خیال کے ساتھ مطمئن ہو کر واپس لوٹ آئے گا کہ اس کی مہم کا نتیجہ برآمد ہو گیا ہے۔

لاہور کی قدیم عمارات کے بارے میں صرف مولوی نور احمد کی " تحقیقات چشتی " اور آنجہانی رائے بہادر کنہیا لال کی اردو زبان میں شائع کردہ کتاب " تاریخ لاہور " ہے۔ رائے صاحب نے اعتراف کیا ہے کہ اس کی تکمیل میں لاہور کے مرحوم مفتی غلام سرور نے حقیقی معنوں میں ان کی مدد کی ہے۔ یہ دوسری کتاب چونکہ نئی تھی اس لیے اس میں تفصیلات کم تھیں اور چشتی کی کتاب، مافوق الادراک کہانیوں سے پر ہے۔ غالباً یہ مقامی بزرگوں کے متعلق ہیں، جن کے مزارات آج بھی لاہور کے قرب و جوار میں بکثرت موجود ہیں۔ یہ کتاب جسے اس کے مصنف نے 1867ء میں شائع کرایا تھا، اختصار کے باوجود یکسر خوبی اور وصف سے خالی نہیں ہے۔ اس وقت سے وہ

مزارات اور قدیم یادگاریں جن کے بارے میں اس کتاب میں ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے بہت سے مکمل طور پر مسمار ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب غلطیوں اور اختلافات سے پر ہے۔ اس جیسے ناکافی مواد اور اس مضمون کے ساتھ انصاف برتنے کے پیش نظر، جس کے ساتھ میری بہت زیادہ دلچسپی قائم ہے۔ میں نے اس بات پر غور کیا کہ میں شہر کے قدیم باشندوں، عالم فاضل ذہین اشخاص اور اس کے قرب و جوار میں رہائش پذیر ضعیف افراد سے ذاتی طور پر پوچھ گچھ کرنے سے زیادہ بہتر کام نہیں کر سکوں گا۔ لہذا میں نے حاصل شدہ معلومات کا بڑی احتیاط سے مسلمان بزرگوں اور اس ملک میں گزرے ہوئے نمایاں اشخاص کی زندگیوں پر لکھی گئی کتابوں کے قدیم نسخوں سے موازنہ کیا جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا، ان میں روضتہ الحباب، تذکرۃ العارفین، قصص الاولیاء، نفحات الانس، مراۃ الہند، حبیب السیار، کتاب رضوانی، کشف المجوب، حقیقت الفقراء، دلیل العارفین، عسکری ولایت وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر تاریخیں اور کتابیں جن کی تعداد بہت زیادہ ہے اور جن میں ان جیسے بزرگوں کے حالات یہاں وہاں درج ہیں، ان کا بڑی احتیاط سے جائزہ لیا گیا۔ لاہور کے عمارتی آثار کے بارے میں اس طریقے سے حاصل شدہ تحقیقات کے دو نتائج برآمد ہوتے ہیں:

1 - چند قدیم عمارات، یادگاروں، محلات اور باغات کے اصل محل وقوع کے بارے میں پتا چلایا گیا ہے، جنہوں نے مغلوں کے دور میں لاہور کے شاہانہ شہر کو آراستہ و پیراستہ کیا ہوا تھا۔ لیکن جن کو پنجاب میں مسلمانوں کی حکومت کے خاتمے کے بعد افراتفری کے دور میں زمیں بوس کر دیا گیا اور اگلے صفحات میں ان کے اصل مقامات کے بارے میں بیان کیا گیا ہے اور ان کے بانیوں اور ان اشخاص کے بارے میں بیان کیا گیا ہے جو ہندوستان کی تاریخ میں جانے پہچانے جاتے ہیں اور جن کے نام ان سے وابستہ ہیں۔

2 - لاہور اور اس کے قرب و جوار میں واقع موجودہ قدیم عمارات کے بارے میں مکمل تفصیلات کا پتہ چلایا گیا ہے۔

یہ کتاب جو تاریخی اور بیانی لحاظ سے اپنے مضمون کے بارے میں ہے، اس کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے:

باب اول، لاہور کے ابتدائی معلوم زمانہ سے موجودہ دور تک سے متعلق ہے۔ ماضی کے ادوار میں یہاں آباد عظیم شخصیات کی زندگیوں سے متعلقہ وہ اہم واقعات بیان کیے گئے ہیں، جن کا تعلق

لاہور سے ہے۔

باب دوئم، لاہور کے قدیم اہم عمارتی آثار اور اس جیسی دیگر عمارات اور مقامات کے بیان کے بارے میں مختص ہے، جو یا تو اپنی شان و شوکت یا تاریخی دلچسپی کے باعث قابل توجہ ہیں۔ اس باب کا مقصد یہ ہے کہ مختلف ادوار میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور حالت کے بارے میں بتایا جائے جن کا مشاہدہ یورپی سیاحوں نے مختلف زمانوں میں کیا ہے اور ان پرانی گزروں کے بارے میں بھی بیان کیا گیا ہے، جن کا ذکر مسلمان مصنفین نے کیا ہے۔

باب سوئم، اس میں لاہور کی جدید عمارات، اداروں اور اس کے شہریوں، ان کے نمایاں رسم و رواج، فنون اور دستکاریوں کی تقلید، ان کی عوامی تفریحات، کھیل اور میلوں ٹھیلوں وغیرہ کا بیان ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ برطانوی تہذیب و تمدن نے اس ملک کے عوام کو عمومی طور پر اور پنجاب کو خصوصی طور پر کس حد تک متاثر کیا۔

باب چہارم، لاہور کے آثار قدیمہ کے بارے میں ہے اور اس سلسلہ میں، میں نے یہ پیش کیا ہے کہ کس طرح بدھ مت نے اپنے مسکن وسطی ایشیاء سے ہجرت کی اور پنجاب کو متاثر کیا۔ عجائب گھر لاہور میں مہاتما بدھ کے اہم مجسموں کے بارے میں بیان کیا گیا ہے اور اس کے علاوہ اس میں موجود سکوں کے بارے میں بھی بیان کیا ہے اور ساتھ عبارات کو بھی پیش کیا ہے۔ عجائب گھر کی طرف سے پیش کردہ پنجاب کی مصنوعات اور دستکاریوں اور ماہرین آثار قدیمہ کی دلچسپی سے متعلق اشیاء کے بارے میں بھی بتایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ پنجاب کے دارالحکومت کی تاریخ سے وابستہ دیگر قدیم اشیاء کے متعلق بھی تفصیل سے بتایا ہے۔

معلومات کے سرچشموں کو ان کے درست مقامات پر تسلیم کیا گیا ہے، جدید دور اور لاہور کے سرکردہ خاندانوں کے بیان کے بارے میں، میں سر لیپل گریفین کی تصنیف "پنجاب کے سردار" (اور اس آدمی کی دقیق کتاب کے صفحات پر روشنی ڈالنی بہت ضروری تھی، جس نے پنجاب کے خاندانوں پر کچھ لکھنے کی ذمہ داری اٹھائی)۔ پنجاب گزیٹیئر ضلع لاہور کے تصفیہ کے کاغذات، بوسورتھ کی تصنیف "لارڈ لارنس کی حیات" (سر ڈبلیو) ڈبلیو ہنٹر کی امپیریل گزیٹیئر، صوبائی اور تعلیمی دستاویزات اور دیگر سرکاری خط و کتابت اور دستاویزات کا بہت احسانمند ہوں جو متعلقہ محکموں کے سربراہوں نے میری خواہش پر پیش کیں۔

میں میو سکول آف آرٹس لاہور کے پرنسپل مسٹر جے۔ ایل کپلنگ، بہادر، سی۔ آئی۔ ای کا بھی بہت ممنون ہوں جنہوں نے قدیم اشیاء کی کان مرکزی عجائب گھر سے اس کتاب کے لیے مواد جمع

کرنے میں میرے ساتھ گراں قدر تعاون فرمایا۔ اس کے علاوہ ڈی۔ جی۔ میکیگن، بہادر، سی۔ ایس اور رائے بہادر گنگارام، ایگزیکٹو انجینئر لاہور، پراونشل ڈویژن کا بھی بیحد شکر گزار ہوں جنہوں نے میری خواہش پر ای۔ ای۔ اولیور، بہادر، سپرنٹنڈنگ انجینئر تھرڈ سرکل کی خصوصی اجازت سے اور کمال مہربانی سے جدید عمارات کی تعمیر سے متعلقہ سرکاری مندرجات پیش کر کے ان کے بارے میں ایک جامع بیان مکمل کرنے میں میری حقیقی طور پر مدد کی۔ اس کے علاوہ میں پنجاب ناردرن سٹیٹ ریلوے کے حکام کا بھی بیحد ممنون ہوں جنہوں نے مجھے ریلوے ورکشاپوں تک رسائی حاصل کرنے اور موقع پر ان کے بارے میں یادداشت قلمبند کرنے کا موقع بہم پہنچایا اور ان کے بارے میں اعداد و شمار بھی فراہم کیے۔

میں یہ امید کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ اس کتاب کا خیر مقدم کیا جائے گا کیونکہ اس میں ہندوستان کے اس شہر کی تاریخ اور آثار قدیمہ کے بارے میں بحث کی گئی ہے جو صرف لاہور ہی کا خاصہ ہے۔ تاہم اس بارے میں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ میں نے قاری کے سامنے شہر کی بالکل واضح تصویر پیش کر دی ہے اور اس کا مقصد محض تفریح طبع کے لیے اس موضوع پر نئی کتاب کے مطالعہ سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔ یہ میرے ہم وطنوں کو ایک مفید سبق دینے کے لیے ہے کہ وہ اس کے مطالعہ کے بعد اس قابل ہو جائیں گے کہ وہ پورے پورے انصاف کے ساتھ اپنے ارد گرد کو دیکھیں اور لاہور کو دیکھیں، جو حقیقت میں دیکھے جانے اور پرکھنے کے قابل ہے۔

فاعتبروا یااولی الابصار

ترجمہ: "عبرت ہے ان کے لیے جو آنکھیں رکھتے ہیں"

عربی کے یہ کلمات کس قدر پرہدایت اور معنی خیز ہیں اور یہ کس قدر اچھا ہو کہ تاریخ کے اوراق کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمارے نوجوان ہم وطن ان کو اپنے دل کی گہرائیوں میں اتار لیں اور یہ ایسا دستور العمل ہے جو ہندوستان کی تاریخ پر لکھی جانے والی ہر کتاب کے صفحہ اول پر سنہری حروف میں لکھا جانا چاہیے کیونکہ اس میں عظیم سچائی مضمر ہے۔

اپنی اور اپنے ارد گرد بسنے والے لوگوں کی حالت کا قدیم ادوار میں گزرنے والے اپنے آباؤ اجداد کے ساتھ موازنہ کرنے کے لیے تاریخ کے مطالعہ سے بہتر کوئی مطالعہ نہیں۔ ماضی کی یاد سے زیادہ حقیقی عبرت انگیز اور دلچسپ موضوع اور کوئی نہیں ہے۔ جو کچھ اوپر بیان کیا جا چکا ہے اس کے مطابق یہ صاف ظاہر ہے کہ شمال سے آنے والے اولین حملہ آوروں سے لے کر آخری حملہ آور شاہ زمان تک جس نے ہندوستان کو فتح کرنے کا خواب دیکھا تھا، لاہور نے اس دوران ہندوستانی

سلطنت کے لیے فصیل کا کام دیا اور اس کے حاکم نے ہندوستان کے حقیقی دروازے کے لیے پاسبان کا کام کیا۔ کتنے فاتحین نے ہندوستان کے سب سے اہم اور چمکدار تحفے پر نظریں جمائی ہوئی تھیں۔ یہاں پر محمود آیا جس نے اپنے ترکستانی جنگجوؤں کے ہمراہ ہندوستان کی جنگ سے نا آشنا سرزمین پر تیس حملے کیے۔ یہاں پر خانہ بدوش دنیا کے طاقتور سردار چنگیز خاں کے لشکر آئے، جنہوں نے سکندر یا اگسٹس سے بڑی سلطنت قائم کی۔ ایسی سلطنت جو تاتار سے پولینڈ و جرمنی اور بحیرہ بالٹک کے ساحلوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے بعد ایک اور مشہور زمانہ فاتح دنیا کا الاؤ تیمور لنگ آیا، جس نے اپنے جانشینوں میں سے ہندوستان میں 27 بادشاہ چھوڑے۔ اس نے ایشیاء کے ایک ہزار شہروں کی لوٹ مار سے ثمرقند کو بھر دیا تھا۔ مہم جو سلطان بابر اپنے ترکوں کے ہمراہ آیا۔ غضبناک نادر شاہ اپنے ایرانی سپاہیوں کے ساتھ آیا۔ احمد شاہ ابدالی افغان جنگجوؤں کے ہمراہ آیا۔ ہر ایک اپنی اپنی باری پر یہاں آیا اور اس نے اس اولین تحفے کو حاصل کیا۔ انہوں نے جس قسم کی مشقت اور مشکلات کا سامنا کیا وہ اس تحفہ کی شایان شان تھیں۔ وہ بلاشبہ طاقتور، فاتحین، قوی حکمران لاکھوں انسانوں کے سردار بیشمار دولت اور ناقابل پیمائش خزانوں کے حامل اور تخت و تاج کے مالک تھے۔ لیکن انہوں نے اس ملک پر جس پر انہوں نے حملہ کیا تھا اپنی فتح کے کیا نشانات پیچھے چھوڑے؟ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جب وہ آئے تو آگ اور تلوار نے ان کے شہہ سوار دستے کی صورت اختیار کر لی تھی اور ہر طرف نوحہ اور آہ و زاری کی فضاء چھائی تھی۔ کیونکہ ہزاروں ماؤں کے بچے چھن گئے، عورتوں کے سہاگ اجڑ گئے اور وہ بیوہ ہو گئیں۔ بچے اپنے محافظوں سے محروم ہو کر یتیم ہو گئے اور وہ ملک کو چھوڑنے کے بعد اپنے پڑاؤ کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

بے انتہا لالچ، فتح کا غرور اور توسیع پسندی کی پیاس کی وجہ سے ان کے حملوں میں تحریک پیدا ہوئی۔ اس چیز نے ملک میں خوف و ہراس اور آفت کی فضاء پیدا کر دی۔ یہی محرکات تھے جنہوں نے محمود کو ہندوستان کے خلاف فوج کشی کرنے پر اکسایا اور نادر شاہ کو اس قابل کیا کہ وہ دہلی کے گلی کوچوں کو اس کے شہریوں کے خون سے بھر دے اور قیمتی ہیرے جن کی شان و شوکت اور چکاچوند سے رو اور برنیئر کی آنکھیں چندھیا گئیں اور تخت طاؤس جس پر گولکنڈہ کے قیمتی جواہرات جڑے ہوئے تھے اپنے ساتھ لے جائے۔

لیکن ہندوستان کے مقدر میں غارتگر حملہ آوروں یا اس کے مطلق العنان حکمرانوں کا آخری شکار بننا نہیں لکھا تھا۔ اس کے لیے اچھے دن آنے والے تھے۔ صدیوں کی طوائف الملوکی اور لاقانونیت کے بعد انگریز ہندوستان سے 15 ہزار میل لمبے سمندر کے ذریعے دور ہونے کے باوجود

اس ملک کے مالک بن گئے۔ اس قوم کی حقیقی شان و شوکت اور سیاستدانوں کی شہرت ، سلطنتوں کے بگاڑ ، طاقتور حکمرانوں کی چاپلوسی یا ملکوں کی تباہی و بربادی میں مضمر نہیں بلکہ اس میں ہے کہ وہ خدا کی مخلوق کو پناہ دیتے اور انہیں جابروں کی غارتگری سے بچاتے ہیں اور ہر ایک کے لیے مساوی قانون وضع کرتے اور انہیں خوش و خرم ، خوشحال ، طاقتور اور متحد بناتے ہیں اور یہ کہ انہوں نے اپنے تمام خیالات اور توانائی کو فنون ، سائنس ، علم و ادب ، تجارت اور زراعت کی ترقی میں لگا دیا ہے۔ وہ قوموں کو خوشحال اور مطمئن دیکھنا چاہتے ہیں اور وہ اس مقولے پر پوری طرح کاربند ہیں کہ حکمران زمین پر خدا کا سایہ ہوتے ہیں لہٰذا ان کا فرض نسل انسانیت کی فلاح و بہبود کے متعلق سوچنا ہے ، تباہی اور بربادی کے لیے نہیں۔

آثار قدیمہ کا مطالعہ ایک ایسا موضوع ہے جس میں تمام متجسس ذہن جو مکمل طور پر اس پسندیدہ مشغلے سے واقف نہ ہوں ، پھر بھی کم یا زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ ماضی کے بارے میں تحقیقات کرنا تمام ذہنوں کے لیے تجسس اور تفنن طبع کی علامت ہے لیکن متفکر ذہن پر ان جیسے مطالعہ جات سے گہرے نقوش پیدا ہوتے ہیں۔ اس جیسا ذہن انتہائی احتیاط کے ساتھ موجودہ اشیا کی حالت کے ساتھ ماضی کے واقعات کا موازنہ کر کے جائزہ لے گا اور اس موازنے سے عظیم ترین قدر و قیمت مہیا کر دے گا۔ میری یہ خواہش ہے کہ میں اپنے نوجوان ہموطنوں سے یہ کہوں کہ " لاہور ہمیشہ سے اس طرح باغ نہیں تھا جیسے اب ہے۔"

یقیناً ایک آنکھ جو انار کلی کی گلیوں کے ہجوم یا جدید شہر کے مصروف ترین بازاروں ، اس کی ترقی کی طرف گامزن صنعتوں ، اس کی کاروباری سرگرمیوں اور سٹہ بازاری کے کاروبار کی عادی ہو چکی ہے اور آنکھ جو حیران کن ریلوے اسٹیشن کے مختلف اور پرہجوم مناظر کی عادی ہو چکی ہے ، جس نے پنجاب کے دارالحکومت کو ہندوستانی تہذیب کے عظیم مراکز سے منسلک کر دیا ہے جہاں سلطنت کے انتہائی شمال اور مشرق کے دور دراز علاقوں کے آدمیوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ سب خوش اخلاق ، پرامن اور مطمئن ہیں۔ ایک آنکھ جو شہر کے دروازوں کے باہر درختوں اور باغات کے مناظر اور ان کے ساتھ بہنے والی بہترین نہر کے نظارے کی عادی ہو گئی ہے۔ اسی آنکھ کو اگر لاہور کا آج سے 25 سال پیشتر کا نظارہ دکھا دیا جائے تو وہ یقیناً گھناؤنا ہو گا۔ جہاں آج کل ڈونالڈ ٹاؤن ، پرانا اور نیا مال روڈ ، خوبصورت مکانات ، ایشیا اور یورپ کی قیمتی اور منتخب اشیاء کی یورپی اور مقامی فرمیں ہیں ، وہاں گیدڑ اور دیگر شکاری جانور آوارہ پھرا کرتے تھے۔ شہر کے انتہائی نزدیکی مضافات کے ساتھ گندی نالیاں ، گہرے گڑھے اور خندقیں ہوا کرتی تھیں۔ شہید گنج جہاں اب پٹھان ایشیاء کے

شہروں سے فروخت کے لیے گھوڑے لاتے ہیں اور کابل کے لذیذ میوہ جات اور ریشمی و ملائم ایرانی قالینوں کی نمائش کرتے ہیں وہ ہنگوں یا اکالیوں جیسے ڈاکوؤں کا مسکن تھا جنہوں نے رنجیت سنگھ کی طاقت کو اس کے عروج کے زمانہ میں للکارا تھا۔ ہیبت ناک کھنڈرات کا پھیلاؤ، شکستہ دیواریں اور قدیم ڈھیر، اجاڑ اور ویران راستے جو میلوں تک پھیلے ہیں اور ملبے کا ڈھیر بن چکے ہیں، وہاں پر اکیلا درخت بھی نہیں ہوتا تھا کہ کوئی تھکا ہارا مسافر اس کے نیچے پناہ ہی حاصل کر لے۔ اب برطانوی تہذیب کے جادو کے اثر سے اس کے منظر میں زندگی کی لہر ایک بار پھر عود کر آئی ہے۔

برطانوی حکومت مقابلتاً کتنے مختصر عرصہ میں حیران کن تبدیلی لائی ہے۔ یہ امر دلچسپی کا حامل ہو گا، اگر موجودہ اشیاء کی حالت کا موازنہ ماضی کی اشیاء سے کیا جائے بشرطیکہ اس میں پورا پورا انصاف برتا جائے تو یہ ناممکن ہے کہ اس کی تعریف نہ کی جائے۔ ظلم اور غارتگری کے دور کی جگہ امن اور یگانگت نے لے لی ہے۔ جہالت کے دور کی جگہ روشن خیالی نے لے لی ہے۔ یہ دور نمود و نمائش، ترقی و خوشحالی کا ہے، جس کی مثال اس عظیم سلطنت کی داستانوں میں کہیں نہیں ملتی۔ بہت سے لوگوں کو وہ دن ضرور یاد ہوں گے جب لاہور اور امرتسر کے درمیان سفر کرنے والے مسافر ایک دوسرے کے ساتھ بغلگیر ہوتے اور آنسو بہاتے تھے کیونکہ انہیں اس بارے میں قطعی یقین نہیں ہوتا تھا کہ پتہ نہیں وہ جیتے جی اپنی منزل مقصود پر پہنچ پائیں گے بھی کہ نہیں اور حفاظت سے گھر لوٹتے ہیں کہ نہیں؟ لہٰذا برطانوی حکومت اور تہذیب و تمدن کے زیر اثر ہمیں کس بات کا پتہ چلتا ہے؟ قبائل جو کبھی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، جنگجو قومیں جنہوں نے ملک میں خوف و ہراس پھیلا دیا تھا اور انہوں نے خوفناک مغلوں کی طاقت کا مقابلہ کیا تھا۔ لوگ جو ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے تھے اور تلواریں نکال لیتے تھے، اب ریل کے ڈبے میں ایک ہی چھت کے نیچے دوستوں کی مانند بیٹھتے اور ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک امن کے ساتھ سفر کرتے ہیں۔ سائنس اور سیاسی دانشمندی نے بے مہار قبائل اور اقوام کو رعایا کے ایک مضبوط بندھن میں باندھ دیا ہے اور ان سب کو قانون سے ڈرنا اور باقاعدہ حکومت اور نظم و نسق کا احترام کرنے کے قابل بنایا ہے۔ یہ اہم مقاصد جنگی ہتھیاروں، دھمکیوں یا ظلم و جبر سے حاصل نہیں کیے گئے بلکہ مفاہمت اعتماد اور خیر خواہی سے حاصل کیے گئے ہیں جنہوں نے مادر پدر آزاد قبائل میں فنون اور مہذب زندگی اختیار کرنے کا شوق اجاگر کیا۔

اگلے صفحات میں اکبر کے دور میں ایک دھوکے باز شخص کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اس نے یہ ظاہر کیا ہوا تھا کہ وہ دریائے راوی کے ایک کنارے سے اگر بلند آواز میں کسی کو نام لے کر پکارے گا تو اس کی آواز دوسرے کنارے پر بھی بیک وقت سنائی دے گی۔ اکبر کے دور کے فریبی شخص کے دعوے کا موازنہ ٹیلی فون اور تار برقی کے ذرائع سے کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ سائنس نے کس حد تک ترقی کر لی ہے۔ ان صفحات میں، میں نے آپ کے لیے ریلوے کی ورکشاپوں کے بارے میں مکمل بیان درج کیا ہے۔ لہٰذا غور کیجیے کہ سائنس کے ذرائع کو استعمال کر کے وہاں کس قدر عظیم کام کیے جاتے ہیں اور ان کا موازنہ اپنے کاریگروں کے غیر معیاری کام سے کیجیے۔ لیکن اپنے علم کے لیے جاننا ضروری ہے کہ وہاں پر ہونے والے کام دراصل سائنس کے نتیجہ میں ہوتے ہیں جن کو ہم خیال کرتے تھے کہ یہ جنوں کے کام ہیں۔

یہ کہنا ضروری نہیں ہے کہ ملک جب سے عظیم ہندوستانی سلطنت کا جزو بنا ہے تو اس میں کس حد تک تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں اور ترقی کی رفتار نے اسے کس حد تک متاثر کیا ہے۔ لیکن برطانوی حکومت کی طرف سے جس تحفے کو سب سے زیادہ قیمتی سمجھا جاتا ہے وہ آزادی ہے جو اس نے کسی قومیت اور عقیدے و مذہب کے فرق کے بغیر اپنی تمام رعایا کو دے رکھی ہے۔

ہوشیار اور پرجوش اورنگ زیب کے جانشین درویش بادشاہ، شاہ عالم کے دور میں لاہور کی اسی بادشاہی مسجد کے بلند منبر سے غضبناک سُنّی جلوس نے، شیعہ مولوی کا سر کاٹ کر فرش پر پھینک دیا تھا کیونکہ اس نے نازیبا الفاظ استعمال کرنے کی جسارت کی تھی۔ اسی شاہی مسجد کو رنجیت سنگھ نے پائمال کیا اور اس نے وہاں بارود رکھا۔ وہاں اب مسلمان بڑے سکون سے وضو کرتے، اذان دیتے اور اپنے پروردگار کی عبادت بغیر کسی روک ٹوک اور خوف کے کرتے ہیں۔ لاہور کی انہی گلیوں میں جہاں خونریزی اور قتل و غارت گری روز کا معمول تھی، وہاں اب مسلمان اور ہندو دونوں قومی معاملات کے متعلق دوستانہ اجلاس منعقد کرتے ہیں۔ برطانوی حکومت کی مشترکہ رعایا ہونے کے ناتے انہوں نے اپنے باہمی اختلافات فراموش کر دیے ہیں اور اس شاہی حکومت کی وفاداری کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس حکومت نے سب کو امن و آشتی فراہم کی ہے اور وہ اپنے ذہنوں میں فتح مندی کے خیال کے تحت تاج برطانیہ سے وابستہ ہو گئے ہیں، جو بہت زیادہ پائیدار، منطقی اور جدید ریاست کی حامل ہے۔ انہی گلیوں میں اب ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف مذہبی فرقوں سے تعلق رکھنے والے رہنما اپنے اپنے مذاہب کے اصولوں کا پرچار کرتے اور علم الکلام کے بیشمار موضوعات پر بحث مباحثے کرتے ہیں۔ اکبر کے دور کے بارے میں

بتایا گیا ہے کہ وہ لاہور میں (جہاں پر خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ اس کے مذہبی خیالات میں بڑی حد تک تبدیلی واقع ہو گئی تھی) اجلاس منعقد کرتا تھا۔ جن میں مذہبی معاملات پر آزادانہ بحث مباحثہ کیا جاتا۔ لیکن اس قسم کے اجلاس جو اکبر اپنے محل میں منعقد کراتا تھا ان کی حفاظت فولادی ہتھیاروں سے مسلح سپاہی کرتے تھے اور وہ خود بھی ذاتی طور پر ان کی نگرانی کرتا تھا کہ آیا نظم و نسق برقرار ہے اور آداب کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے کہ نہیں؟یہی اجلاس اب گلیوں میں منعقد کیے جاتے ہیں۔ ڈیوٹی پر موجود صرف ایک کانسٹیبل کی موجودگی نظم و نسق کو برقرار رکھنے کے لیے کافی ہے۔ لاہور کی گلیوں میں اس جیسے مذہبی اجتماعات جن کو اب ہم لاہور کی پر ہجوم گلیوں میں روزانہ کے معمولات میں دیکھتے ہیں، ان کی نگرانی کرنے کے لیے ہزاروں فوجیوں کے مقابلہ میں میئر کے عملے کا ادنیٰ درجے کا افسر گلیوں میں بغیر کسی پریشانی اور خوف کے بڑی آزادی کے ساتھ پھرتا ہے۔ ان اجتماعات کے اراکین ایک دوسرے کی کارروائیوں میں دخل اندازی کرنے کی جرأت نہیں کرتے۔ جب تک وہ تہذیب اور نظم و نسق کے دائرہ کار کے اندر رہتے ہیں تو انہیں مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے اور وہ بحث کے دوران حدود سے تجاوز نہیں کرتے لیکن ان قواعد کی خلاف ورزی کرنے والوں کو خصوصی ٹریبونل سزا بھی دیتے ہیں۔

ان صفحات کے مطالعہ کے بعد پتا چلتا ہے کہ رنجیت سنگھ نے سکھ دارالخلافہ میں مسلمانوں کی مساجد اور عبادت گاہوں کو بارود خانوں اور آتشیں ہتھیار اور اسلحہ تیار کرنے والے کارخانوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ برطانوی حکومت نے نہایت فیاضی اور انصاف کے ساتھ ان جیسے تمام مقامات مسلمان رعایا کو واپس کر دیے اور ان کا دلی خراج تحسین وصول کیا۔ وفادار رعایا اب ان عبادت گاہوں میں نماز ادا کرتی ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے بزرگوں کی خانقاہیں اور مقبرہ جات جن کو برہما کے پجاری، گورو کے چیلے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے امتی، حکام کے خوف و ڈر اور ان کی ظالمانہ کارروائیوں کے نتیجہ میں چھوڑ گئے تھے، اب دوبارہ آباد ہو گئے ہیں اور لوگوں کی آماجگاہ بن گئے ہیں۔ ہاتھوں میں تسبیحیاں تھامے نیک اطوار مسلمانوں کے جلوس پیشانیوں پر مقدس زعفران کے نشان لگائے راسخ العقیدہ ہندوؤں کے ہجوم اور مخصوص پگڑیوں میں ملبوس سکھ چیلوں کے گروہ ان جگہوں پر مقدس خانقاہ پر چند پھول نچھاور کرنے یا نماز ادا کرنے یا اپنی مذہبی رسومات ادا کرنے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔

ہم نے اس سے قبل اکبر کی فیاضانہ حکومت اور اس کے آزاد خیالات کا حوالہ دیا ہے لیکن ہم تضاد کے خوف کے بغیر کہیں گے کہ برطانوی حکومت سے پیشتر ہندوستان کے خوشحالی کے دنوں میں

بھی نہ تو زندگی اور نہ عزت محفوظ تھی۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے ان صفحات میں درج کیے گئے اکبر کے دور کے حاکم لاہور کے بارے میں صرف ایک بیان کا حوالہ دیں گے جس کے بیٹے نے تدفین کے موقع پر مردے کے ساتھ اپنے ایک نوکر کو بغیر کسی جرم کے زمین میں زندہ دفن کرا دیا، صرف اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے کہ تدفین کے بعد مردہ اکیلا کیا کرے گا؟ جبکہ دوسرے موقع پر لاہور کی گلیوں میں اسی قسم کی ظالمانہ کارروائی کا اعادہ کیا گیا، یعنی ہندوؤں کی ایک بارات سے دلہن کو اٹھا لیا گیا۔ جب انہوں نے اس کے باپ کے سامنے اس امید کے تحت شکایت پیش کی کہ وہ اس کا ازالہ کر دے گا تو انہیں یہ جواب ملا کہ "انہیں خوش ہونا چاہیے کہ وہ اب لاہور کے صوبیدار کے رشتہ دار بن گئے ہیں۔" اس قسم کا انصاف ہندوستانی حکومت کے بہترین ایام میں سلطنت کے دارالخلافہ (یہ لاہور اکبر کے دور کا تھا) میں برتا جاتا تھا۔

غور و خوض کرنے والے تمام آدمیوں کا تاثر بڑا گہرا ہے۔ جب دوسرے روز انہوں نے شہر میں راجہ دھیان سنگھ کی مشہور و معروف حویلی میں مسلمانوں کی مقامی انجمن کی سالگرہ کی تقریب کو بڑے جوش و خروش سے مناتے دیکھا۔ یہ منظر بڑا متاثر کن تھا۔ اسی مکان کے ہال جو انتہائی باغیانہ روش کے حامل افراد کی سازشوں کا گڑھ تھے اب چالیس سال کا مختصر عرصہ گزرنے کے بعد یہاں مسلمانوں کے رہنماؤں کی تقاریر گونج رہی تھیں جو اپنے ہم مذہبوں کو آپس میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے ذرائع فراہم کرنے پر زور دے رہے تھے۔ انہی کے ذریعے وہ ہندوستان کی دیگر اقوام کے ساتھ کامیابی سے مقابلہ کرنے کی توقع رکھ سکتے تھے۔ ان میں سے چند نے ثابت قدمی اور توانائی کے ذریعے اپنے اندر مطلوبہ صلاحیتوں کو ہندوستان میں زندگی کو بہتر بنانے کے لیے نمودار ہونے والے مقابلہ کے میدان میں پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ آج سے چالیس سال قبل لاہور میں ان جیسی چیزوں کے بارے میں خواب بھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

کیا نوجوان قاری اب بھی اس بات سے متفق نہیں ہو گا جس کے متعلق میں نے اس سے پیشتر ذکر کیا ہے کہ "لاہور ہمیشہ سے باغ نہیں تھا جس طرح اب ہے" اور یہ دیکھا گیا ہے کہ موجودہ مندرجات کا موضوع صرف اکیلا لاہور ہی نہیں ہے جس کو برطانوی حکومت سے فائدہ پہنچا بلکہ ہندوستان کے سینکڑوں بڑے شہر ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی نہیں ہے جس میں ایک جیسی خوشحالی، دولت کی ریل پیل اور اطمینان نہ ہو جس طرح یہاں ہے۔ ایک لمحہ کے لیے بھی کون اس قوم کی عظمت پر شک کر سکتا ہے جو اس وسیع و عریض سلطنت پر نہایت دور اندیشی سے ایک مساوی فرمان کے تحت حکومت کر رہی ہے؟

یہ اس کی طرف سے اپنی رعایا کے تمام طبقوں کو تحفظ کی فراہمی ہے، چاہے وہ کسی بھی قومیت یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا، سب کے ساتھ مساوی انصاف برتا جاتا ہے۔ اسی چیز نے برطانوی قوم کو دنیا کے طول و عرض میں عظیم اور باوقار بنا دیا ہے۔ یہی اعلیٰ خصوصیات اور آزاد خیالات ہیں، جنہوں نے اس کی ہندوستان میں اولین آمد سے لے کر اب تک ایک سو سال سے بھی کم عرصہ میں اسے اس قابل بنا دیا کہ اس نے کیپ کمورین سے ہمالیہ کے اندرونی پہاڑوں تک اپنی سلطنت کو وسعت دے دی اور اپنی فرمانروائی میں 250 ملین افراد پر مشتمل رعایا کو متحد کیا (یہ تعداد گبن کی طرف سے رومن سلطنت کے لیے اپنے عروج کے دور میں لگائے گئے اندازہ سے دوگنا ہے) اور اپنے فاتح ہاتھوں کو برہم پترا کے مشرق تک اور قدیم دور کے "ممنوع" دریا اٹک کے مغرب تک لے گئی۔ پیکن کے دروازوں پر امن قائم کرنے کے لیے آسام اور برما کو سلطنت میں شامل کیا، جہاں اس سے قبل روئے زمین کے عظیم ترین فاتحین کے ہاتھ بھی نہیں پہنچ پائے تھے۔ اس نے اپنی حکومت کو کابل کے تخت پر قائم کیا اور احمد شاہ ابدالی کی سلطنت کے منصف بن گئے اور بڑے اعزاز کے ساتھ بے مثال اور نہایت قیمتی ہیرا "کوہ نور" حاصل کیا، جس کو سخت گیر نادر شاہ نے بڑی مشکل سے مغل بادشاہ محمد شاہ سے ہتھیایا تھا اور جسے بعد میں رنجیت سنگھ نے بڑے شرمناک طریقے سے اپنے افغان مہمان، بادشاہ شجاع الملک سے لوٹ لیا تھا۔ اس میں کوئی حیرانی کی بات نہیں ہے کہ اس حکومت کے ماہر فوجی دستوں نے خیبر کی خوفناک گھاٹیوں کا معائنہ کیا ہے۔ اس کے بہادر فوجی ہندوستان کے لامتناہی بیابانوں اور صحراؤں میں داخل ہو گئے اور انہوں نے بلند ترین برفپوش پہاڑوں کے دروں کو طے کیا۔ اس کے انجینئروں نے ریلوے لائن کو سلطنت کے آخری سرے تک پہنچا دیا اور ان علاقوں کو کھنگال مارا جو ابھی تک نظروں سے اوجھل تھے اور اس کے بہادروں نے اپنی دلیرانہ مہم جوئی اور پرمغز تحقیقات کے ذریعے اپنے ملک کو سائنسی دریافت میں اقوام میں عظیم ترین قوم کی حیثیت سے اس مقام پر فائز کر دیا ہے جو پوری دنیا میں خوشحال ترین تہذیب کی حامل ہونے کی دعویدار ہو سکتی ہے۔

اب اگر میں نوجوان قاری کے لیے یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں کہ "لاہور ہمیشہ سے باغ نہیں تھا جس طرح اب ہے۔" حتیٰ کہ اپنے خوشحالی کے دنوں میں بھی نہیں تھا۔ تو مجھے یقین ہے وہ اپنے ذہن میں میری نصیحت کو بٹھا لے گا جو میں نے ان بیانات کے آغاز میں کی تھی کہ وہ اپنے آبائی شہر میں رونما ہونے والی وسیع تر تبدیلیوں کو غیر جانبداری کی نظر سے نہیں دیکھے گا یا اس پر اثر انداز ہونے والی عظیم ترقیوں کے سلسلہ میں لاتعلق تماشائی نہیں بنے گا بلکہ وہ ان سے مفید سبق

حاصل کر کے اپنے آپ کو بہتر شہری اور بہتر رعایا بنائے گا۔ چنانچہ اگر اس موجودہ کتاب کو مکمل کرنے کا میرا مقصد پورا ہو جاتا ہے تو مجھے اس بات کی خوشی ہو گی کہ اس پر کی گئی محنت رائیگاں نہیں گئی۔

محمد لطیف

گورداسپور

24 اپریل 1892ء

باب اوّل

لاہور
تاریخ

لاہور اور قصور کی ابتداء

ہندو روایات :۔ دیومالائی قصوں میں لوہاور یا لاہور کا بانی لو یا لوہ (1) ۔ کو کہا جاتا ہے جو مشہور کتاب رامائن کے ہیرو رام کا بیٹا تھا۔ اسی روایت کے مطابق رام کے دوسرے بیٹے کش نے کشاور یا قصور کی بنیاد رکھی جو بالکل اسی طرز کا شہر تھا۔ اس کے نام کا تعلق ہندوؤں کے آباؤ اجداد کی بہادری کی داستانوں اور ان کی قدیم تہذیب کی روایات سے بڑی حد تک نظر آتا ہے۔ کشمیر اور راجپوتانہ کے پرانے وقائع میں لاہور کا ذکر ہندوؤں کی ایک ریاست کے طور پر آیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وسطی ہندوستان کے سورج پرست، شہزادے کانیکسن کی اولاد میں سے تھے۔ کانیکسں کا تعلق اسی نسل سے تھا اور وہ لاہور سے ہجرت کر کے وسطی ہندوستان پہنچا اور اس نے بادشاہت قائم کی۔

بھاٹی قبیلہ :۔ آج کل بھی شہر کے مختلف دروازوں میں سے ایک کا نام "بھاٹی دروازہ" ہے۔ اس قبیلہ کے بارے میں خیال یہ ہے کہ اگرچہ یہ لوگ اس جگہ سے جنوب کی جانب انتہائی دور دراز علاقہ جیسلمیر کے رہنے والے تھے اور ان کا تعلق انل ہار؛ پتن کے قبیلے سولنکھی سے تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے ابتدائی طور پر آباد کاری کے لیے اور اپنی بود و باش کے لیے لاہور ہی کا انتخاب کیا۔

ہندوؤں کی قدیم داستانوں میں لاہور کا تذکرہ

قدیم داستانوں پر مشتمل ایک جامع کتاب وشوابھاگا میں یہ تحریر ہے کہ دوار پر یا پٹیل کے

دور کے اختتامی ایام میں لاہور کے راجہ یمل جس کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بہت طاقتور بادشاہ تھا اور بھیم سین کے درمیان ایک خونریز جنگ لڑی گئی۔ بھیم سین نے دس ہزار سپاہیوں پر مشتمل فوج کے ساتھ راجہ کو تین دن کی زبردست لڑائی کے بعد نہ صرف شکست دی بلکہ اسے قیدی بنا لیا اور اس کی سلطنت کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ شمالی سرحد کی عشقیہ شاعری لاہور کے نواحی جنگل، جو اس وقت اودھے نگر کہلاتا تھا کا تذکرہ ایک میدان جنگ کے طور پر آیا ہے جہاں جنگ میں سیالکوٹ کے راجہ سل داہن کے بیٹے رسالو کے ہاتھوں راکھشش رکھاس قتل ہوا تھا(2)۔

مذکورہ بالا اور اسی نوعیت کی دیگر روایات سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ لاہور کو راجپوتوں کی اس نسل کے شہزادوں نے آباد کیا تھا جنہوں نے ابتدائی طور پر اپنے آپ کو مغربی ہندوستان میں آباد کیا تھا۔ اس امر کو اس بات سے بھی مزید تقویت ملتی ہے کہ جب شروع شروع میں مسلمان ہندوستان میں داخل ہوئے تو اس وقت لاہور ہندوؤں کی ایک نہایت اہم راج دھانی کے طور پر موجود تھا اور یہیں سے دوسری ریاستوں کو کنٹرول کیا جاتا تھا(3)۔ یہ محض ایک مفروضہ ہے کہ لاہور کے سلسلہ سلاطین میں دوسری مشرقی ریاستوں کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔

مسٹر تھارنٹن نے لاہور کے بارے میں لکھی گئی اپنی کتاب میں نہایت خوش اسلوبی سے اس بات پر تفصیلی بحث کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اجودھیا کے اولین راجپوت شہزادوں کا تعلق اسی خاندان کے گجرات اور مارواڑ میں آباد راجپوتوں سے تھا۔ بعد کے ادوار میں ان کے دور حکومت کی کوئی حتمی تاریخ مرتب نہیں ہو سکی لیکن خیال یہی ظاہر کیا جاتا ہے کہ اس وقت حکومت راجپوتوں کے دوسرے قبائل مثلاً سولنکھی اور بھاٹیوں (بھٹیوں) کی ہی تھی۔ مسلمانوں کی اولین فتوحات کے وقت ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس وقت لاہور، اجمیر کے شاہی خاندان کے چوہان شہزادوں کے قبضہ میں تھا اور دسویں صدی کے آغاز میں اس کی حکومت کی باگ ڈور برہمنوں کے شاہی خاندان کے ہاتھ میں تھی(4)۔

مذکورہ بالا کتاب وشوا بھاگا میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ لاہور کو لوپور کہا جاتا تھا اور اس کے نام کا ماخذ رام کے بیٹے لاو سے لیا جاتا ہے۔ جبکہ راجپوتانہ کے قدیم وقائع میں اس کو لوہ کوٹ کا نام دیا گیا ہے جس کا مطلب "لوہ کا قلعہ" ہے۔ اس میں مزید اس بات کا حوالہ دیا گیا ہے کہ اس کا اصل بانی رام کا بیٹا ہی تھا۔

مسلمانوں کے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہندوستان کے بارے میں مسلمانوں کی فتوحات کے سلسلہ میں حتمی اور مستند رائے سندھی مؤرخین کی ہے۔ ان کی رائے کے مطابق ان فتوحات کا آغاز خلافت کے دور میں ہوا۔

فتح البدان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ عربی زبان کی اولین تاریخی کتاب ہے۔ اس کے ذریعے ہمیں شام، میسوپوٹامیہ (موجودہ عراق) مصر، فارس، آرمینیا، مرانس اوکسانیہ، افریقہ، اسپین اور سندھ میں مسلمانوں کی اولین فتوحات کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں بھی لاہور کا ذکر الہاور کے نام سے آیا ہے۔ یہ کتاب احمد بن یحیٰ المعروف البلادری کی تحریر کردہ ہے۔ وہ نویں صدی عیسوی کے وسط میں خلیفہ المعتصم باللہ کے دربار سے منسلک تھے۔ اس کا حوالہ عربی جغرافیہ دان ابن الھوکل المسعودی اور دیگر قدیم جغرافیہ دانوں نے کئی مرتبہ اپنی تحریروں میں دیا ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں حکم بن ابو لعاصی جو کہ بنو ثقیف سے تعلق رکھتے تھے ان کی زیر قیادت ہیروز (بروچ) اور دیبل کے لیے ایک فوجی مہم بھیجی گئی۔ حضرت عثمان غنیؓ کے دور حکومت میں حاکم بن جہلا العابدی کو معلومات حاصل کرنے اور نگرانی کی غرض سے ہند کی سرحدوں پر بھیجا گیا۔

حضرت علیؓ کی خلافت میں 39 ہجری بمطابق 659ء کے آغاز میں حارث بن مرالعابدی، خلیفہ کی اجازت سے اسی سرحد پر رضاکار کے طور پر بھیجے گئے۔ وہ سندھ میں قیقان تک پہنچے۔ بہت سی فتوحات کیں اور قیدی بھی بنائے لیکن آخر کار قتل کر دیے گئے۔ مصنف مزید لکھتا ہے کہ 44 ہجری بمطابق 664ء، خلیفہ معاویہؓ کے دور میں مہلاب بن ابو صفرا کو اسی محاذ پر جنگ کے لیے روانہ کیا گیا۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے سنہ (بنوں) اور الہادر (لاہور) جو ملتان اور کابل کے درمیان ہیں تک جا پہنچے۔ دشمن نے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ انہیں اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر دیا گیا۔

مراکش کا عظیم سیاح الادریسی نویں صدی میں تحریر کردہ اپنی کتاب نزہت المشتاق فی افتخار الآفاق میں لاہور کا ذکر لوہاور کے نام سے کرتا ہے۔ اصطلاح آور دراصل سنسکرت کے لفظ آورنہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس کا مطلب "قلعہ" ہے۔ یہ اصطلاح ہندوستان کے دیگر کئی شہروں کے ناموں میں بھی مستعمل ہے۔ مثلاً سناور، بجاور، پشاور۔ لوہاور کا سیدھا سادہ مطلب لوہ کا قلعہ ہی بنتا ہے اور یہ نام ہندوؤں کی قدیم داستانوں میں بیان کیے گئے لفظ لوہ کوٹ سے مماثلت اور مطابقت رکھتا ہے۔ ابو ریحان البیرونی اپنی معرکتہ الآراء تصنیف "قانون" میں اپنی ذاتی رائے کے مطابق بیان کرتا ہے کہ ہمالیہ کے پہاڑوں کو ٹیکاس (ٹیکسلا؟) اور لہاور (لاہور) سے دیکھا جا سکتا

ہے۔ یہ دسویں صدی میں محمود غزنوی کے حملے کا دور تھا۔ مسٹر ریناڈ نے اپنی کتاب فریگ مینٹس (ٹکڑے) اور ایلیٹ نے اسے لوہاوور، لہاوور، لوہارو اور لہور لکھا ہے۔

حضرت امیر خسروؒ دہلوی نے تیرہویں صدی کے آخری دور میں اپنی مشہور کتاب قران السعدین میں اسے لہانور لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں: ۔

از حد سامانیہ تا لہانور ہیچ عمارت نیست مگر دار قصور

سامانیہ سے لہانور کی سرحد تک کوئی بھی شہر قصور کی طرح فصیل دار نہیں ہے۔

مسٹر تھارنٹن کے خیال کے مطابق لہانور دراصل لہانگر کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ نور دراصل دکھنی لفظ کی ایک شکل ہے اور اس لفظ کا استعمال دیگر شہروں میں بھی نظر آتا ہے۔ مثلاً کلانور، کنانور وغیرہ۔

رشید الدین نے 710 ہجری بمطابق 1310 عیسوی میں تحریر کردہ اپنی کتاب جامع التواریخ میں اسے لاہور لکھا ہے۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ کوئی بھی مضبوط قلعہ موجود نہیں ہے۔

البیرونی نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ لاہور ایک صوبہ ہے اور اس کا دارالخلافہ مندھوکور ہے اور یہ دریائے ارادا (راوی) کی مشرقی جانب ہے۔ بیہقی نے اس کا ذکر مندکاکور کے طور پر کیا ہے۔

مسلمان مورخین نے اسے لوہار، لوہر اور راہور بھی لکھا ہے۔ موخرالذکر نام کی ماہیت کے بارے میں وضاحت کے ساتھ اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا جاتا ہے کہ اس نام کی مطابقت کابل، کشمیر اور آگرہ کی طرف جانے والی بڑی بڑی شاہراہوں کے ناموں سے بھی تھی۔ مسلمان مصنفین نے چاہے اسے کسی بھی نام سے لکھا ہو لیکن مذکورہ بالا بیان کے مطابق جو بات اخذ کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ لاہور کے نام کا تعلق صرف اور صرف اس کے بانی لوہ سے ہے جو رام کا بیٹا تھا۔

قیام کی تاریخ

لاہور کی ابتدائی تاریخ اس قدر گمنامی کے اندھیرے میں ہے۔ کہ اس کے قیام کی کوئی بالکل درست تاریخ دریافت کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ اس بارے میں قدرے اشتباہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اس کو ہندو راجپوتوں نے آباد کیا تھا۔ مستند عرب جغرافیہ دانوں کی تحریروں اور سندھ کے اولین مسلمان مؤرخین کی پیش کردہ آراء کے مطابق اس بات سے مزید برآں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ خلافت کے ابتدائی دنوں میں اور ساتویں صدی عیسوی کے وسط میں لاہور ایک خاص اہمیت کا شہر تھا۔

کرنل ٹوڈ کی آراء

کرنل ٹوڈ راجپوتانہ کے بارے میں بیان کردہ قدیم وقائع میں دوسری صدی کے وسط کو شہزادہ کانیکسن کی لاہور سے ہجرت کی تاریخ منسوب کرتا ہے۔ محترم مصنف نے راجستان میں اپنی سرکاری نوکری کے دوران بڑی ذہانت اور جانفشانی سے اس کے قدیم تاریخی ریکارڈ اکٹھے کیے اور اپنی معلومات کی بنیاد، پرانی داستانوں میں بیان کردہ مقدس سلسلہ ہائے نسب، مہابھارت، چند کی نظموں، جیسلمیر مارواڑ، اور میواڑ کے قدیم اندراجات، شاعروں اور راہبوں سے حاصل کردہ نوادرات کی فہرستوں، ملک کے دانشوروں کے بیان کردہ سوانحی واقعات اور تاریخوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی غرض سے اکٹھے کیے گئے نقوش پر رکھی۔ مصنف لکھتا ہے کہ سولہ سال کے دوران کی گئی متواتر تحقیق میں ہر شہادت اور تصدیق کو تلاش کیا گیا جو کہ اس عرصہ میں کی جا سکتی تھی۔ مختلف ذرائع سے حاصل کردہ کم از کم دس فہرستیں جن میں سلسلہ ہائے نسب کا اندراج تھا، اس کے مطابق نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کرنل ٹوڈ، کانیکسن کو میواڑ کی سلطنت کا بانی گردانتا ہے اور 145 عیسوی، بمطابق 201 ساموت کو اس کی لاہور سے دوار یکا ہجرت کے ساتھ منسوب کرتا ہے۔ اجودھیا ایودھیا (اودھ) جہاں اس وقت رام کی حکومت تھی، اس کو ہندوؤں کی قدیم تاریخی کتابوں میں کوشالا کہا گیا ہے۔ اس کی نسبت رام کی ماں سے کی گئی ہے جس کا نام کوشلیا تھا۔ لاہور سے ہجرت کرنے والے پہلے شاہی فرد کو میواڑ کے راجہ کے منصب کے مطابق کوشالا پتر یعنی "کوشالا کا بیٹا" کا خطاب دیا گیا۔ میواڑ کے دانا اس بات کا دعویٰ کرتے تھے کہ وہ رام کے بیٹے لوہ کی اولاد ہیں۔ اس نے قدیم لوہ کوٹ یعنی لاہور کو آباد کیا اور اسی کی شاخ سے تعلق رکھنے والے میواڑ کے بادشاہ وہاں رہائش پذیر تھے۔ بعد میں کانیکسن نے دوارکا کو ہجرت کی (5)۔ اس بادشاہ کی لاہور سے ہجرت کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ ہندوؤں کی قدیم دستاویزات کے مستند ہونے کے بارے میں کرنل ٹوڈ کی آراء کے متعلق تصدیق مشرق کے دیگر قدیم مصنفین سے بھی ثابت ہوتی ہے۔

یہ وہی دور تھا جس کا حوالہ کرنل ٹوڈ نے غالباً شہزادہ کانیکسن کی لاہور سے ہجرت کے سلسلے میں دیا ہے یعنی دوسری صدی کا وسط تھا جب مشہور زمانہ ماہر فلکیات اور جغرافیہ دان کلاڈیئس پٹولیمس المعروف پٹولمی نے جغرافیہ کی کتاب لکھی جو آنے والے ادوار میں نصابی کتاب کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔ وہ 139 عیسوی میں اسکندریہ میں آباد ہوا۔ نیز 161 عیسوی میں اس کے زندہ ملنے کی شہادت بھی ملتی ہے۔ جغرافیہ کے متعلق اپنی تحریر کردہ کتاب میں وہ اس بات کا ذکر بھی کرتا ہے کہ پالیو تھرا، یا پالیبوترا (پٹنہ) کے راستے کے درمیان ایک شہر ہے جسے لابوکلا کہا جاتا ہے اور یہ

کاسپیریا (کشمیر) کے راستے میں ہے۔ یہ شہر دریائے بیداس (جہلم) سندابال یا چندرابھاگا (چناب) اور ایدرس (راوی) تک پھیلا ہوا ہے۔

پٹولمی کے لابوکلا کی لاہور سے مطابقت

اسی جگہ اس کے نام اور محل وقوع کو ولفورڈ نے لاہور سے تشبیہ دی ہے۔ جنرل کننگھم اس روایت سے اتفاق کرتے ہوئے لاہور کو پٹولمی کا لابوکلا ہی بتاتا ہے اور پہلے دونوں حروف لابو کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ رام کے بیٹے لاوا (لوہ) کی ترجمانی کرتے ہیں (6)۔ اسی مستند رائے کے مطابق اس کی نشاندہی پٹولمی کی رائے کے مطابق سب سے پہلے کیپرٹ کے ہندوستانی نقشہ میں کی گئی جس میں لاس کی تحریر بھی شامل تھی۔

سیاح الیگزینڈر برنیس نے اپنے سفروں کے دوران کابل کی روایات کا جائزہ لیا (7)۔ وہ لاہور کے قیام کے بارے میں لکھتا ہے۔ کابل کے بارے میں الیگزینڈر کی روایات بالکل درست نہیں۔ لیکن ہرات اور لاہور کے بارے میں اس کا بیان ہے "یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی بنیاد ایک فاتح جس کو وہ ایک پیغمبر کہتے تھے کے غلاموں نے رکھی تھی۔ ان کے نام ہیری (ہرات کا پرانا نام) اور لاہور تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قندھار ان دونوں شہروں سے زیادہ پرانا ہے۔"

سکندر کے زمانہ کے مؤرخین کی تحریروں میں لاہور اور ایسے ہی کسی دوسرے شہر اور اس سے ملتے جلتے نام اور اس سے مشابہت رکھنے والے کسی مقام کی کلیتہً غیر موجودگی اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ لاہور سے یونانی دور کا کوئی سکہ دریافت نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ اس کے ملحقہ علاقوں سے بھی کچھ نہیں ملا۔ لہٰذا اس شہر کے بارے میں عالم اس حتمی رائے پر پہنچے ہیں کہ اگر یونانیوں کے حملہ کے وقت یہ شہر موجود تھا تو اس کو کم از کم پہلی صدی عیسوی تک کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی۔

برنیئر جو 1664 عیسوی میں لاہور آیا۔ اس کے خیال کے مطابق اس شہر کی مطابقت قدیم بوسی پھالا سے ہے۔

قدیم مصنفین آرین اور کرٹیس نے اپنی تحریروں میں لاہور کا تذکرہ کیا ہے اور انہیں سے اتفاق رائے کرتے ہوئے برنیس سے لاہور کو شانگلہ ہی قرار دیا ہے جو کائستھ یا کھتری قبیلہ کے مضبوط قلعہ کے طور پر جانا جاتا تھا۔ یہ وہی شانگلہ ہے جس کا ذکر ڈائیاڈورس نے اسکندر کے زمانے کے ایک شہر کے طور پر کیا ہے۔ وہ اس کی نشاندہی برہمنوں کے ساکالا اور بدھ مت کے پیروکاروں کے علاوہ ساگل کے طور پر بھی کرتا ہے لیکن اس مہم پر نکلنے والے سیاح نے اپنی تحریر میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ یہ شہر دریائے ہائیڈ راؤٹس (راوی) سے 65 میل دور تھا تو اس سے اس کی

جائے واقع یا محل وقوع درست ثابت نہیں ہوتا۔

اس بات پر کرٹیئس اور آرئین دونوں متفق ہیں کہ سکندر نے شانگلہ تک پہنچنے سے قبل کائستھ یا کھتریوں کو سزا دینے کی غرض سے جو اس وقت ایک آزاد ہندوستانی قوم کے طور پر جانے پہچانے جاتے تھے، دریائے ہائیڈ راؤٹس کو عبور کیا تھا۔ اس بات میں اب کوئی شک و شبہ نہیں رہ جاتا کہ اس فاتح یعنی اسکندر اعظم نے لاہور کے ملحقہ علاقہ کے راستے دریائے راوی کو عبور کیا اور یہ خیال بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ غالباً وہیں جس وقت اس نے کھتریوں کی بغاوت کے بارے میں سنا تو اس کا پڑاؤ اسی جگہ پر تھا(8)۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت اس جگہ کی کوئی خاص اہمیت نہ ہو اور اس بات میں بھی شبہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ اس کا ذکر یونانی مصنفین یا مؤرخین نے بھی کیا ہو۔

جب مشہور چینی سیاح اور زائر ہیون سانگ نے 630 عیسوی میں پنجاب کا دورہ کیا تو اس نے شانگالا شہر کی دیواروں کو بالکل منہدم پایا لیکن ابھی تک ان کی بنیادیں قائم تھیں۔ انہیں کھنڈرات کے درمیان اس نے پرانے شہر کا ایک چھوٹا سا خطہ تلاش کیا جہاں اس وقت بدھ مت کے پیروکار آباد تھے اور مہاتما بدھ کے بارے میں باطنی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ چینی سیاح کے بیان کے مطابق ٹکی یا اسارور (جس کے بارے میں جنرل کننگھم کا خیال ہے کہ ہو سکتا ہے یہ علاقہ اسکندر کے زمانہ کا پمپارا ماہی ہو) یہ علاقہ لاہور اور پنڈی بھٹیاں کے درمیان جنوب کی طرف دو میل کے فاصلے پر واقع شاہراہ (یا اول الذکر سے 45 میل اور مؤخر الذکر سے 24 میل دور) 633 عیسوی کے دور میں پنجاب کے دارالحکومت کے طور پر موجود تھا۔ حالانکہ مصنف موصوف نے کشمیر سے لے کر پرجیہ، اجین اور قنوج تک سارے ملک کا سفر کیا اور وہ چائنہ پتی (قصور کی جدید پتی) میں 14 ماہ اور جالندھرا (پٹولمی کا کلنڈرائن) میں 4 ماہ تک رہا لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے سفرنامے میں لاہور کا ذکر تک نہیں کیا اور نہ ہی اس جیسے کسی شہر کا نام تک لکھا ہے۔ وہ تحریر کرتا ہے کہ وہ (633 عیسوی میں) ٹکی کی مشرقی سرحد پر واقع ایک بہت بڑے قصبہ میں پورے ایک ماہ تک ٹھہرا۔ جنرل کننگھم اس بڑے قصبہ کی مطابقت قصور سے بتاتے ہیں، جبکہ اس وقت سلطنت، مشرق میں دریائے بیاس تک پھیلی ہوئی تھی۔ لہذا یہ بڑا شہر یا قصبہ بیاس کے کنارے پر دکھائی دینا چاہیے تھا نہ کہ راوی کے کنارے پر(9)۔

اس کے قیام کی قیاسی تاریخ

پٹولمی کے جغرافیہ میں جس کا ذکر اس سے پیشتر بھی کیا جا چکا ہے، لاہور کے تذکرہ کے پیش

نظر مسٹر تھارنتن پہلی صدی کے اختتام اور دوسری صدی عیسوی کے آغاز کو اس کے قیام کی تاریخ گردانتے ہیں (10)۔

لاہور اسلامی فتوحات سے قبل

اس سے پیشتر چینی سیاح کی مستند رائے کے مطابق ہمیں اس بات کا علم ہوا تھا کہ ٹکی یا اسارو، ساتویں صدی میں پنجاب دارالخلافہ تھا۔ میجر جنرل کننگھم کے مطابق یہ نام اس وقت نہ صرف دارالخلافہ کا تھا بلکہ اس سلطنت کا بھی تھا جو اس وقت پنجاب میں موجود تھی (11)۔ ٹکی سے چند میل دور اس سے زیادہ قدیم دارالخلافہ شی کائی لو تھا جس کی مطابقت پروفیسر لاسن نے آرئین کے شانگلہ اور مہابھارت کے ساگلا سے بتائی ہے۔ ساکالا، طاقتور قبیلے ٹیکاس کا دارالحکومت تھا جس کا ملک بعد میں ٹیکاڈیسا بھی کہلاتا رہا۔ ٹکی کی سلطنت پنجاب کے، سندھ سے بیاس اور ملتان کے زیریں علاقہ جہاں پانچوں دریاؤں کا سنگم ہے، کے تقریباً سبھی علاقوں پر مشتمل تھی۔ ان میں قدیم ہندوستان کے زیادہ تر مشہور علاقے بھی شامل تھے۔ ان میں سے کچھ علاقے سکندر اعظم کے ساتھ لڑائی کے دوران بننے والے میدان جنگ کے علاقے تھے اور کچھ مہاتما بدھ کے دور کی تاریخ کے لیے مشہور ہیں۔ انہیں میں سے ایک لہاور یا لاہور بھی تھا۔ باری دوآب یا بیاس اور راوی کے درمیان واقع ملک میں کساور (قصور) اور چائنہ پتی (پتی) کے علاقے بھی شامل تھے۔

میجر جنرل کننگھم نے تاجر سلیمان جو مسلمانوں کا ایک اولین مؤرخ مانا جاتا ہے اور جس نے 851 عیسوی میں مشرق کی سیاحت کی، کے بیان کردہ "طافک" کی مطابقت چینی سیاح کے "ٹکی" سے کی ہے۔ المسعودی کی جغرافیہ کی کتاب "عرب کے ہیرو" میں اسے "طافن" کہا گیا ہے۔ ابو ریحان اور رشید الدین نے اس کا ماخذ البیرونی سے لیا ہے۔ وہ اسے تاکیشر لکھتے ہیں۔ وہ اس بات پر متفق ہیں کہ کالی راج (لارجک) کے عظیم برفپوش پہاڑ، جو اپنی جسامت کے لحاظ سے دلماوند سے مماثلت رکھتے ہیں، تاکیشر اور لہاور کی سرحدوں سے دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہاں تاکیشر اور لہاور کا ذکر شہروں کے طور پر آیا ہے۔ لہذا مستند عرب جغرافیہ دانوں نے چونکہ ٹاکا کے ساتھ لاہور کا بھی ذکر کیا ہے تو اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ دونوں شہر ایک ہی زمانہ میں موجود تھے۔ اس بات کا بھی امکان موجود ہے کہ ساتویں صدی میں جب ٹاکا آباد کیا گیا تو لاہور بھی اسی دور میں ہی آباد ہوا ہو۔

یہ محسوس ہوتا ہے کہ لاہور کو آٹھویں اور نویں صدی میں اس وقت زیادہ اہمیت ملی جب یہ برہمن خاندان کا دارالحکومت تھا اور یہ وہی دور تھا جب سبکتگین اور اس کے بیٹے محمود نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔

شاہی خاندان میں ہونے والی تبدیلی اور کابل سے ہندوستان جانے والی شاہراہ پر واقع ہونے والی واضح صورتحال کے پیش نظر ایسے محسوس ہوتا ہے کہ محمود غزنوی کے حملہ سے قبل لاہور بالکل ویران ہو گیا تھا۔ اسی دور کے مسلمان مؤرخین نے لاہور کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ وہ صوبے کے دارالخلافہ کی حیثیت میں موجود تھا (12)۔ مرتضیٰ حسین کی تصنیف حدیقۃ الاقلیم میں واضح طور پر اس امر کے متعلق تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ وہ کیا عوامل تھے جن کی بناء پر پایہ تخت کو لاہور سے سیالکوٹ یا سلوان پور جسے راجہ وِکرم جیت کے دور میں راجہ سلوان نے تعمیر کرایا تھا تبدیل کرنا پڑا۔ وہیں یہ بعد میں بھاٹی قبیلے کے لوگ بھی آباد ہو گئے تھے۔ اس سے پیشتر ذکر کیا جا چکا ہے کہ البیرونی نے لاہور کو ایک صوبہ لکھا ہے اور مندھوکور (مندھوکوٹ) کو اس کا دارالخلافہ کہا ہے۔

مسٹر تھارنٹن نے سیالکوٹ کے قریب واقع مقام مان کوٹ کی مطابقت مندھو کوٹ سے بیان کی ہے اور ان کا خیال ہے کہ یہ جگہ آخری شاہی خاندان کا دارالخلافہ تھی۔ اس خیال کو اس حقیقت سے بھی تقویت ملتی ہے کہ شیر شاہ سوری نے حکومت کے پایہ تخت کی لاہور سے مذکورہ جگہ کے بارے میں تبدیلی کے متعلق نہایت سنجیدگی سے غور و خوض کیا تھا۔ لاہور کے ویرانے میں تبدیلی کی تاریخ تقریباً دسویں صدی مقرر کی جاتی ہے۔ گیارہویں صدی کے آغاز میں محمود غزنوی کے دور میں پایہ تخت کو سیالکوٹ اور اس کے نواح سے دوبارہ لاہور کی از سر نو تعمیر کی ایک قلعہ تعمیر کر کے ایک چھاؤنی بھی قائم کی (13)۔

مسلمانوں سے قبل لاہور کے بارے میں لکھی گئی تاریخ کے سلسلہ میں اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ہندوؤں کالاد پور اور لوہ کوٹ مسلمانوں کا لوہاور، لوہار، لہانور یا لاہور اور یہ بھی ممکن ہے کہ بٹولی کالابوکلا کو پہلی صدی کے اختتام اور دوسری صدی عیسوی کے آغاز میں راجپوتوں کی ایک قدیم نسل نے آباد کیا تھا (14)۔ یہ کہ اس کو آٹھویں اور نویں صدی میں اس وقت زیادہ اہمیت حاصل ہوئی جب یہ ایک مضبوط مملکت اور دیگر بڑی ریاستوں کا دارالخلافہ بنا۔ دسویں صدی عیسوی میں خاندانی تبدیلی کے باعث، پایہ تخت کو سیالکوٹ منتقل کیا گیا اور گیارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں پنجاب کے شمال مغرب میں مسلمانوں کی حکومت کے وقت دوبارہ دارالخلافہ بنا دیا گیا۔ مسٹر تھارنٹن کا خیال ہے کہ اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ اس کو دوسری صدی کے آغاز میں آباد کیا گیا ہو۔ گذشتہ تحریروں اور حوالہ جات اور میجر جنرل کننگھم جیسے مستند ماہرین کی تحقیقات سے ان کی آراء اور خیالات کو مزید تقویت ملتی ہے۔

غزنوی خاندان :۔ جب بخارا کے شاہی سامانی خاندان جنہوں نے وسطی ایشیا کے ملکوں پر 120 سال تک حکومت کی ، کے آخری فرمانروا عبدالملک کا ایک مشہور ترک غلام اور سپہ سالار البتگین 977 عیسوی میں فوت ہوا تو اس کے ایک فوجی امیر سبکتگین نے جو اس کا غلام بھی تھا اور بعد میں اس نے اس کی بیٹی سے شادی بھی کر لی تھی ، اقتدار پر قبضہ کر کے قندھار کو سلطنت میں شامل کر لیا۔ سبکتگین نے جس وقت دریائے سندھ کو پار کر کے لاہور کی سلطنت پر حملہ کیا تو اس وقت اس پر قدیم شاہی خاندان کے ایک برہمن شہزادے جے پال کی حکومت تھی۔ تب لگھمان کے قریب ایک زبردست جنگ لڑی گئی جو پشاور سے کابل تک پھیلی وادی کی سرحد پر واقع ایک ایسا شہر تھا جو اپنی طاقت اور دولت کے لیے بڑا مشہور تھا۔ اس جنگ میں ہندوؤں کو زبردست ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ ہندو راجہ کے پچاس ہاتھی پکڑ لیے گئے اور صلح کے لیے یہ شرط رکھی گئی کہ راجہ دس لاکھ درہم شاہی مہر یعنی سکے خراج کے طور پر ادا کرے گا۔ فاتح حکمران غزنی کی طرف واپس ہوئے۔ ابھی تھوڑی مدت بھی نہیں ہوئی تھی کہ جے پال اس معاہدے سے منحرف ہو گیا اور یہاں تک کیا کہ خراج کی رقم وصول کرنے کے لیے آنے والے بادشاہ کے ایلچیوں کو قید میں ڈال دیا۔

لاہور کے راجہ کی غداری نے سبکتگین کو دوبارہ پنجاب کی سرزمین پر لا کھڑا کیا۔ دوسری لڑائی میں ہندوستان کے راجاؤں کی مشترکہ فوج نے حصہ لیا جو ایک لاکھ گھڑ سواروں اور بے شمار پیادہ سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ اس جنگ میں ان کو بری طرح شکست ہوئی اور وہ بے دریغ قتل کیے گئے۔ سبکتگین نے سندھ تک کا سارا ملک فتح کر لیا۔

977 عیسوی میں سبکتگین کی وفات کے بعد اس کے بیٹے نے جو محمود کے نام سے مشہور ہوا ، ایک لڑائی کے بعد غزنی کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ بچپن ہی سے محمود غزنوی کا یہ رجحان تھا کہ سندھ کے پار علاقہ میں بت پرستی کا قلع قمع اور دین محمدیؐ کو قائم کرنا ہے۔

محمود نے اپنے والد کے پرانے دشمن جے پال کو شکست فاش دی۔ یہ جنگ 27 نومبر 1001 عیسوی کو پشاور کے قریب لڑی گئی۔ اس میں ہندوستانی فوج کو مکمل طور پر شکست ہوئی۔ محمود نے ان کا بٹھنڈے تک پیچھا کیا۔ ہندوؤں کی ایک بہت بڑی تعداد کو قید کر لیا گیا۔ ان میں راجہ جے پال اور اس کے عزیز و اقارب بھی شامل تھے ، جن کو بعد میں راجہ کی طرف سے ایک بھاری معاوضہ ادا کرنے اور خراج کے معاہدات کی تجدید کے بعد رہا کر دیا گیا۔ اس کے گلے میں قیمتی نگینوں کے دس ہار تھے جن میں سے صرف ایک ہار 80 ہزار پاؤنڈ کی مالیت کا تھا۔ یہ سب محمود کے قبضہ میں آ گئے۔ بد قسمت شہزادے کو ان توہمات نے آن گھیرا کہ اس کی پے در پے شکستیں اس کے

کسی جرم یا گناہ کے باعث ہیں اور ان کا ازالہ اپنی قربانی پیش کرنے پر ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے عنان حکومت اپنے بیٹے انند پال کے حوالے کی اور اپنی راج دہانی کی دیواروں کے باہر ایک چتا تیار کر کے اس پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھوں سے اس کو آگ لگا کر موت کو گلے لگا لیا۔ اس نے اپنی قربانی پیش کر دی۔ محمود پنجاب میں ایک مسلمان گورنر مقرر کر کے غزنی کی طرف لوٹ گیا۔

اگلے تین سال کے دوران محمود نے ایک انتہائی اہم شہر ملتان پر قبضہ کر لیا، جس کا حکمران اگرچہ ایک مسلمان تھا لیکن اس نے انند پال سے بڑے قریبی تعلقات قائم کیے ہوئے تھے۔ اس نے سندھ کے ایک بڑے حصے اور تمام وادی پشاور پر قبضہ کر لیا اور کشمیر سے لے کر سندھ کی سرحد تک تمام علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

جنگ پشاور:۔ 1008 عیسوی میں انند پال کو راہبوں کی ان ترغیبات نے اکسایا کہ اسے اپنی کھوئی ہوئی آزادی حاصل کرنے کے لیے اور غیر ملکیوں کو اپنے مادر وطن سے نکال باہر کرنے کے لیے زبردست جدوجہد کرنی چاہیے۔ اس مقصد کے لیے ہندوستان کے راجاؤں نے الحاق کر لیا اور پنجاب کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے محمود غزنوی اور مشترکہ ہندوستانی فوجوں کے درمیان پشاور کی سرزمین پر ایک زبردست جنگ لڑی گئی۔ ہندو بڑی بے جگری اور جوش و خروش سے لڑے۔ مسلمانوں کے تین سے چار ہزار سپاہی پہاڑی جنگجو قبیلے گکھڑوں کے ہاتھوں شہید ہوئے، جو موجودہ جٹ خاندان کے قدیم آباؤ اجداد ہیں۔ جنگ کا نقشہ یکدم بدل گیا۔ وہ ہاتھی جس پر انند پال سوار تھا اور اس کو غلط فہمی سے غلط سمت موڑ دیا گیا تھا، گولوں اور تیروں سے خوفزدہ ہو کر میدان جنگ سے بھاگ اٹھا۔ ہندوؤں نے سمجھا کہ شاید میدان جنگ ان کے سرداروں سے خالی ہو چکا ہے چنانچہ وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ اٹھے اور ہر طرف بکھر گئے۔ مسلمان سپاہیوں نے ان کا دور تک تعاقب کیا اور ان کی ایک بہت بڑی تعداد کو تہہ تیغ کیا۔ اگرچہ سلطنت لاہور کا دارالحکومت غزنی کے ساتھ مکمل الحاق رہا لیکن جب سبکتگین نے ہندوستانی علاقہ پر حملہ کیا تب سے گزشتہ پچاس سال کے دوران یہ بالکل خود مختار رہا۔

انند پال کے بعد لاہور کی حکومت اس کے بیٹے جے پال دوئم کے ہاتھ آئی۔ کم عمر شہزادے کو یہ غلط مشورہ دیا گیا کہ وہ قنوج میں سلطان کی فوجوں کی پیش قدمی کو روکے۔ لاہور کے راجہ کے اس رویہ نے محمود غزنوی کو یہ موقع فراہم کر دیا کہ وہ ہندوستان کے اس اہم علاقے پر قبضہ کر لے۔ وہ کشمیر کی طرف اپنی پیش قدمی کو ترک کر کے ایک بہت بڑی فوج کی قیادت کرتے ہوئے پنجاب کی راجدھانی کی طرف بڑھا۔ کم عمر شہزادے نے یہ محسوس کر لیا کہ وہ سلطان کی اس قدر بڑی فوج کا

مقابلہ نہیں کر سکے گا لہذا اس نے لاہور اور اس کے نواحی علاقوں کو خیرباد کہا اور بے یار و مددگار اجمیر کی طرف بھاگ نکلا۔ سلطان نے لاہور پر قبضہ کر لیا اور اس وقت سے اسے مستقل طور پر سلطنت غزنی میں شامل کر لیا گیا۔

تب پہلی مرتبہ سندھ کی مشرقی جانب ایک مستقل چھاؤنی قائم ہوئی اور ہندوؤں کو ہمیشہ کے لیے اپنی اس اہم ریاست سے ہاتھ دھونا پڑے اور ہندوستان میں مسلمانوں کی مستقبل کی حکومت کی بنیاد پڑ گئی۔ یہ واقعہ 1002ء میں رونما ہوا۔

محمود غزنوی کے پوتے مودود کے دور حکومت میں دہلی کے ہندو راجاؤں اور دیگر ملکوں کے فرمانرواؤں کے درمیان اتحاد قائم ہو گیا۔ انہوں نے پنجاب کی طرف چڑھائی کر دی اور لاہور کا محاصرہ کر لیا۔ مسلمان قلعہ بند تھے انہوں نے نہایت بے دلی اور مایوسی سے اس کا دفاع کیا۔ مسلمانوں کو اشیائے خورد و نوش کی شدید قلت کا سامنا کرنا پڑا، قحط کی کیفیت پیدا ہو گئی اور ان کو کہیں سے بھی امداد بہم نہیں پہنچ سکتی تھی۔

مسلمان اس بات کو اپنے لیے انتہائی ذلت آمیز جانتے تھے کہ جس قوم کو انہوں نے میدان جنگ میں کئی دفعہ شکست دی ہے اب اس کا تر نوالہ بن جائیں۔ لہذا آخر کار انہوں نے ایک زبردست ہلہ مارا اور ہندوؤں نے 1045ء میں مجبور ہو کر محاصرہ اٹھا لیا۔ لاہور کو بازیاب کرانے کے سلسلہ میں ہندوؤں کی یہ آخری کوشش تھی۔ بعد ازاں سلجوقی تاتاریوں نے اپنے سرداروں طغرل بیگ اور الپ ارسلان کی زیر قیادت یورپ اور ایشیائے کوچک کے درمیان اپنی سلطنت قائم کر لی جس کے نتیجے میں غزنی کے سلطانوں کو اپنے آباء کے فتح کیے ہوئے علاقوں سے ہاتھ دھونا پڑے اور وہ اپنا پایہ تخت لاہور منتقل کرنے پر مجبور ہو گئے۔

مسعود دوئم (1114-1098 عیسوی) کے دور حکومت میں لاہور کو حقیقی طور پر غزنوی خاندان کا دار الخلافہ بنایا گیا۔ اس نے پنجاب کے مفتوح علاقوں کو متحد کیا۔

(سلطان بہرام 1152-1118 عیسوی) کے دور حکومت میں لاہور کے حاکم بالین نے بغاوت کر دی۔ سلطان نے اس کی سرکوبی کے لیے دو فوجی مہمات روانہ کیں اور دونوں مرتبہ اسے کامیابی ہوئی۔

مؤرخ منہاج السراج لکھتا ہے کہ خدا نے اس کی بے وفائی اور غداری کی اسے بڑی سخت سزا دی۔ وہ میدان جنگ میں اپنے دس بیٹوں کے ہمراہ گھوڑوں پر سوار تھا کہ گھوڑے دلدل میں گر گئے اور دلدل نے دیکھتے ہی دیکھتے انہیں نگل لیا اور وہ ختم ہو گئے۔

غزنی پر غوری سلطان علاؤ الدین کے قبضے کے بعد سلطان بہرام کے بیٹے خسرو شاہ نے لاہور پر دو سال تک حکومت کی (15)۔ وہ لاہور میں 1160 عیسوی میں فوت ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا خسرو ملک المعروف تاج الدولہ سلطان جہاں تخت پر بیٹھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سلطان سبکتگین کی نسل کا وہ آخری چشم و چراغ تھا جس نے اقتدار پر قبضہ برقرار رکھا۔

یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ غزنی کے سلطان نہایت ہی متحمل مزاج اور قوت برداشت کے مالک تھے۔ انہوں نے پنجاب پر نہایت صبر اور تحمل سے حکومت کی۔ انہوں نے ہندوؤں کو اپنی فوج میں ملازمتیں دیں اور ان میں سے تو کچھ حکمرانوں نے ہندوؤں کے خطابات بھی اپنا لیے تھے، جن کو انہوں نے اپنے سکوں پر بھی کندہ کرایا۔ سلطان محمود غزنوی کے دور میں لاہور محمود پور کہلاتا تھا۔ یہ نام محمود کے لاہور پر حملہ کے وقت سکوں پر کندہ کیا گیا۔

غوری اور خاندان غلاماں

شہاب الدین المعروف محمد غوری جسے عام طور پر ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ غور کے سلطان علاؤ الدین کے بیٹے سیف الدین کے جانشین سلطان غیاث الدین کا بھائی تھا۔ اس کے بھائی نے اسے غزنی کی ریشہ دوانیوں سے معمور سلطنت کے صوبوں کو متحد کرنے کی غرض سے ہندوستان بھیجا۔ اس نے ملتان اور قلعہ اچ کو فتح کر لیا جو تاریخ میں اسکندر اعظم کے حملہ اور تباہی کی یادگار کے طور پر مشہور ہے۔

سندھ کے تمام صوبوں کو فتح کرنے کے بعد اس نے دو مرتبہ خسرو ملک کا اس کے دارالخلافہ لاہور میں محاصرہ کیا لیکن دونوں مرتبہ اس شہزادے نے اس حملہ آور کا اس قدر تحمل اور بردباری سے مقابلہ کیا کہ وہ دونوں دفعہ اپنا محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہو گیا۔

آخر کار چالاک غوری سلطان نے ایک جنگی چال چلی۔ خسرو نے اپنی مرضی سے غوری سلطان کے دربار میں اپنے بیٹے محمد کو یرغمال کے طور پر بھیجا۔ غوری سلطان نے نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے کام لیتے ہوئے اور اس بات کی یقین دہانی کراتے ہوئے کہ اسے خسرو پر ہر قسم کا اعتماد ہے اور یہ کہ وہ اپنے زور بازو سے سلجوقیوں کو روکے گا، اس نے شہزادے کو انتہائی حفاظت سے واپس لاہور کی طرف روانہ کر دیا۔ خسرو ملک بغیر کسی محافظ اور رسمی حفاظت کے لاہور سے باہر تک آیا تاکہ اپنے بیٹے سے بغلگیر ہو سکے۔ بعد ازاں محمد نے خراسان کے لیے بھیجی جانے والی اپنی بیس ہزار گھڑ سواروں پر مشتمل فوج کو نہایت تیزی سے ایک الگ تھلگ اور طویل راستے سے خسرو کے دارالحکومت کی طرف موڑ دیا۔ خسرو کے خیمے کو گھیرے میں لے لیا گیا اور اسے مجبور کر دیا گیا کہ وہ

ہتھیار ڈال دے۔ یہ واقعہ 1186ء عیسوی میں پیش آیا۔ خسرو ایک مضبوط قلعہ میں پناہ گزین ہو گیا لیکن ایک نجومی کی پیشین گوئی کے مطابق اسے اس کے اہل خانہ سمیت قتل کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی محمود غزنوی کی عظیم سلطنت ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ لاہور پر بغیر کسی مزاحمت کے قبضہ کر لیا گیا۔

شہاب الدین غوری کی اجمیر کے چوہان راجپوتوں کے راجہ پرتھوی راج (پتھورا رائے) سے زبردست جنگ ہوئی اور وہ نارائن کی جنگ میں دہلی کے راجہ گوبند رائے کے گرز کی ضرب سے شدید زخمی ہو گیا۔ یہ واقعہ افغان بادشاہ کی بہادری اور عسکری شجاعت اور راجپوت جرنیل کی حیرت انگیز طاقت اور بہادری کا واضح ثبوت ہے۔ بادشاہ نے جس وقت گوبند رائے کے جنگی ہاتھی پر حملہ کیا وہ اس وقت گھوڑے کی پشت پر سوار تھا۔ اس نے ایک شیر کی سی طاقت کے ساتھ حملہ کیا اور اپنے دشمن کے دانت حلق تک دھنسا دیے۔ گوبند رائے نے اس کے حملہ کو اتنی ہی طاقت سے لوٹا دیا اور اپنا گرز اس کے بازو پہ اتنی زور سے مارا کہ بادشاہ شدید زخمی ہو گیا۔ اس کی جان اس طرح بچی کہ ایک خلجی نوجوان سپاہی نے اپنی جان کی بازی لگا کر اپنے آقا کو سینے سے تھاما اور گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا میدان جنگ سے فرار ہو گیا۔ بادشاہ کی فوج کو شکست ہوئی اور اس کا چالیس میل تک تعاقب کیا گیا۔ تاہم وہ خود بالکل بے ہوش حالت میں لاہور لایا گیا۔

آریاؤں کی نسل کے نمائندہ اس بہادر ہندو راجہ نے سات مرتبہ لاہور کے دروازوں تک رسائی پائی لیکن آخر کار اسے شکست ہوئی اور وہ 1193 عیسوی میں مسلمان بادشاہ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ سلطان نارائن کی جنگ میں لگے زخموں سے صحت یابی کے بعد ان امراء پر سخت ناراض ہوا جو میدان جنگ سے فرار ہو گئے تھے۔ اس نے انہیں غور واپس پہنچنے کے بعد اس حالت میں چلنے پر مجبور کر دیا کہ گھوڑوں کے توبرے ان کی گردنوں سے بندھے ہوئے تھے، جیسے وہ گدھے ہوں۔ بعد ازاں انہیں حکم دیا گیا کہ وہ گھاس کھائیں ورنہ ان کی گردنیں تلوار سے اڑا دی جائیں گی۔

بعد ازاں گکھڑ جو پنجاب کے شمالی پہاڑوں میں آباد ایک جنگجو قبیلہ تھا، نے سلطان کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر خوارزم تک رسائی پا لی تھی۔ انہوں نے پنجاب کی طرف چڑھائی کر دی اور آخر کار 1203ء میں لاہور پر قبضہ کر لیا۔ لیکن شہاب الدین نے اپنے نائب قطب الدین ایبک کی مدد سے پنجاب پر حملہ کر دیا اور نہ صرف اس صوبے کو دوبارہ بازیاب کرا لیا بلکہ گکھڑوں کو دین اسلام قبول کرنے پر آمادہ بھی کر لیا۔

نیلاب کے کناروں پر گکھڑوں کے ہاتھوں شہاب الدین کے بہیمانہ قتل کے بعد شمالی ہندوستان کے گورنر قطب الدین ایبک نے جو نسلاً ایک غلام تھا، 24 جولائی 1206ء میں لاہور

کی حکومت سنبھالی۔ قطب الدین کی تخت نشینی کے کچھ ہی دنوں بعد شہاب الدین کے ایک دوسرے غلام جس نے اپنے آقا کی موت کے بعد غزنی اور شمالی صوبوں کا انتظام حاصل کر لیا تھا، اس نے اپنے دعوے کو درست ثابت کرنے کے لیے لاہور پر قبضہ کر لیا لیکن اس کو قطب الدین ایبک نے مار بھگایا، جو اس وقت دہلی سے ایک بہت بڑی فوج کی قیادت کرتا ہوا آ رہا تھا۔

پورے ملک میں دینار اور درہم کے سکوں پر اس کا نام اور شاہی القابات نقش کیے گئے۔ اس کا نام جمعہ کے خطبہ میں شامل کیا گیا۔ لاہور جہاں پر سلطان کا اقتدار قائم ہو چکا تھا اور جو اچھے اور پاک باز لوگوں کی قربان گاہ بن چکا تھا اب اس کا دارالخلافہ بنا دیا گیا۔ سلطان لاہور میں 1210ء میں چوگان (جو اب پولو کہلاتا ہے) کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر انتقال کر گیا۔ اس کو لاہور میں ایک خزانے کی طرح دفن کر دیا گیا۔

قطب الدین ایبک کا بیٹا آرام شاہ اس کا جانشین بنا لیکن مرحوم بادشاہ کے داماد اور متبنیٰ بیٹے شمس الدین التمش نے اسے شکست دی اور اسے مار بھگایا۔

حسن نظامی کے مطابق مؤخر الذکر بادشاہ جب لاہور پہنچا تو بیان کیا جاتا ہے کہ وہ جگہ جو مذہب اسلام کے حوالے سے ایک نہایت اہم جگہ سمجھی جاتی تھی اور اسلام کے بڑے صوبوں میں سے ایک صوبہ کے طور پر مشہور تھی اور جو پاکیزہ اور عالی ظرف لوگوں کا مسکن تھی۔ چند سال سے گورنروں کی تبدیلی، بہت سی آفات، آئے دن کی بغاوتوں، شورشوں اور مخالفتوں کے شعلوں کی لپیٹ میں آنے کی وجہ سے سراسیمہ سی تھی۔ اب اس کو دوبارہ امن و آشتی کا گہوارہ بنا دیا گیا۔

ناصر الدین محمود کو 1217ء میں لاہور کا گورنر مقرر کیا گیا۔ اس کے تقرر پر لاہور میں بہت خوشیاں اور جشن منائے گئے اور چوگان کا کھیل پیش کیا گیا جس سے بادشاہ خود بھی بہت خوش ہوا (17)۔ (16)

1218ء میں خوارزم کے سلطان جلال الدین نے ایران اور ایشیائے کوچک کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے لاہور فتح کر لیا لیکن اس کے دستوں کو چنگیز خان کی فوجوں نے پیچھے دھکیل دیا۔ چنگیز خان جو خانہ بدوشوں کی دنیا کا ایک بہت بڑا سردار تھا اور جس نے چین کی سرحد سے بحیرہ کیسپئن تک اور سندھ سے لے کر ارض شمالی تک بہت سی سلطنتوں کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ باہر البدان کے مطابق چنگیز خان کے ایک سردار ترتائی کی قیادت میں کئی ہزار گھڑ سواروں پر مشتمل فوج نے جلال الدین کے تعاقب میں سندھ کو عبور کیا اور پھر ملتان پہنچ کر اس ملک کو تہہ و بالا کرنے کے بعد لاہور کو بھی اسی طرح برباد کر دیا (18)۔

ایک دوسرے مؤرخ کے مطابق، اس موقع پر منگولوں نے جن شہروں کو تباہ و برباد کیا وہ ملتان، لوہاور (19)۔ (لاہور) فرشاور (پشاور) اور ملک پور تھے۔ یہ سب تباہی اور لوٹ مار کرنے کے بعد منگول سندھ کے راستے غزنی کی طرف لوٹ گئے۔

سلطانہ رضیہ بیگم

1236ء میں رضیہ سلطانہ اپنے بھائی رکن الدین کی جانشین مقرر ہوئی۔ اسی کے دور حکومت کے دوران لاہور کے گورنر ملک اعزالدین کبیر خان نے بغاوت کر دی۔ ایک ہمعصر مؤرخ منہاج السراج کے مطابق اس نے عورتوں کا لباس اور نقاب اتار پھینکا اور قبا اور ٹوپی پہن کر تخت پر بیٹھی۔ اس نے اپنی تمام ریاستوں کو احکامات جاری کر دیئے۔ وہ دہلی سے اپنی فوج کو لاہور لائی اور بدامنی کی فضاء کو 1239ء میں امن و آشتی میں بدل دیا۔

اکتوبر 1240 عیسوی میں رضیہ سلطانہ کے ظالمانہ قتل کے بعد اس کا بھائی سلطان معز الدین بہرام شاہ اس کا جانشین بنا۔ خراسان اور غزنی سے پنجاب میں داخل ہونے والی مغلوں کی فوجوں نے قیامت برپا کر دی۔ لاہور کے گورنر ملک کراکش نے ان کی مزاحمت کی تیاریاں کیں لیکن شہر کے لوگوں کا تعاون نہ حاصل کر سکنے کی وجہ سے وہ ایک رات دہلی کی طرف فرار ہو گیا۔ مغلوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا اور مسلمانوں کو بے دریغ قتل کیا اور ان کے ماتحتوں کو قیدی بنا لیا (20)۔ یہ واقعہ دسمبر 1241 عیسوی میں پیش آیا۔

التمش کے چھوٹے بیٹے ناصر الدین محمود (1266 - 1246 عیسوی) کے دور حکومت میں پنجاب کی حاکمیت، سلطان کے ایک قابل وزیر غیاث الدین بلبن جس کو سلطان نے اپنی دامادی میں بھی لیا ہوا تھا کے ایک رشتہ دار شیر خاں کے پاس تھی۔ مغلوں نے پنجاب پر لپنے پے در پے حملوں کو جاری رکھا، مگر انہیں ہر مرتبہ لاہور کے حاکم کی طرف سے منہ کی کھانی پڑی، جس نے ایک مرتبہ یہاں تک کہ ان کے علاقے پر حملہ کر کے غزنی پر قبضہ بھی کر لیا تھا۔ ناصر الدین محمود کی وفات کے بعد اس کے وزیر غیاث الدین بلبن نے جس کو پہلے ہی سے ایک بادشاہ کا اختیار حاصل تھا۔ 1266 عیسوی میں تخت و تاج سنبھالا۔

اس کے سریر آرائے تخت ہونے کے چار یا پانچ سال بعد اس کا عزیز جو کہ لاہور کا ایک عالی ظرف حاکم بھی تھا اور جس نے مغلوں کے راستے میں لپنے آپ کو ایک بہت بڑی رکاوٹ بنا رکھا تھا فوت ہو گیا (21)۔ سلطان نے اپنے بڑے لڑکے شہزادہ محمد کو جو کہ نہایت حوصلہ مند نوجوان

تھا۔ پنجاب اور تمام ماتحت سرحدی اضلاع بشمول سندھ کا گورنر مقرر کیا۔ شہزادے نے سندھ کی سمت سے مغلوں کے حملہ کے خطرہ کے پیش نظر اپنا دربار ملتان میں منعقد کیا۔ وہ دانشور اور صاحب ذوق آدمی تھا اور اس کا دربار ایشاء کے ممالک سے آئے ہوئے علماء اور فضلاء سے بھرا ہوا تھا۔ جن علماء نے اس کے دربار میں شرکت کی ان میں ملک الشعراء حضرت امیر خسروؒ، جن کو اردو شاعری کا بانی تصور کیا جاتا ہے اور جو نہایت اعلیٰ اوصاف کے شاعر اور مصنف تھے اور نہایت عالم اور فاضل تھے اور ایسے ہی اوصاف کے حامل امیر حسن بھی ان میں شامل تھے۔

لاہور کے قلعہ کی از سر نو تعمیر

تقریباً اسی دور میں سلطان، جد کے پہاڑوں کی فوجی مہم سے واپس آتے ہوئے لاہور پہنچا اور اس نے قلعہ کی از سر نو تعمیر کا حکم صادر کیا، جو شمس الدین التمش کے بیٹوں کے دور حکومت میں مغلوں کی تباہ کاریوں سے بالکل مخدوش ہو گیا تھا۔ اس نے لاہور کے قصبات اور دیہات کو پھر سے آباد کیا جو مغلوں کی تباہ کاریوں سے بالکل ویران ہو گئے تھے۔ ان کی بحالی کے لیے اس نے فن تعمیر کے ماہرین اور نگران بھی مقرر کیے (22)۔

ضیاء الدین برنی کو بلبن کے دور کا مستند ترین مؤرخ مانا جاتا ہے۔ وہ تاریخ فیروز شاہی کا مصنف بھی ہے حالانکہ وہ بعد میں آنے والی صدی کا رہنے والا تھا لیکن اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے اپنے والد، دادا اور بڑے عہدوں پر فائز لوگوں سے جو کچھ حاصل کیا وہ سب کچھ تحریر کر دیا۔ پس عالی ظرف شہزادے اور اس کے درباریوں کی صفات بیان کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے کہ جب نوجوان شہزادے کے سامنے شیخ نظامی کا شاہنامہ، خمسہ، دیوان ثنائی اور دیوان خاقانی پڑھے جاتے تو وہ بہت محظوظ ہوتا۔ وہ شعراء کے اوصاف کے بارے میں کی گئی مباحث کو بھی بڑے غور سے سنتا تھا۔ وہ حضرت امیر خسروؒ اور امیر حسن کے اوصاف اور فضیلت کا بڑا قدر دان تھا۔ ان کو دوسروں پر فوقیت دے کر اسے بڑی مسرت ہوتی تھی۔ میں یعنی ان صفحات کا لکھنے والا، امیر خسروؒ اور امیر حسن کو اکثر یہ کہتے سنتا تھا کہ ہم نے خانی شاہد، جیسی صفات اور اعلیٰ ظرف کا حامل شہزادہ کہیں اور نہیں دیکھا (23)۔

ضیاء الدین برنی کے الفاظ کے مطابق 1285ء میں ملتان کا خان جو "سلطنت کا مددگار" کہلاتا تھا، سلطان کے ایک وارث کی حیثیت سے چنگیز خاں کے کتوں میں سب سے بہادر کتے "سمار مردود" کا مقابلہ کرنے کے لیے لاہور کی طرف بڑھا۔ وہ حملہ آوروں کو شکست دینے اور ان کے فتح کیے ہوئے علاقوں کو بازیاب کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ مغلوں کی ایک تازہ دم فوج نہایت تیزی

سے پہنچی، لیکن ایک خونریز لڑائی کے بعد وہ بھاگنے پر مجبور ہوگئے۔ بد قسمتی سے تعاقب کے دوران دشمن کی فوج کے دستے اکٹھے ہوگئے۔ فوج کے لیے یہ انتہائی دکھ کی بات تھی کہ وہ شہزادہ محمد کو راوی کے کنارے تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اسی طرح کی ایک کارروائی میں شہزادے کے مستقل ساتھی اور شاعر حضرت امیر خسروؒ کو مغلوں نے قید کر لیا۔ یہ انتہائی مشکل امر تھا کہ حملہ آوروں کو اس بات پر آمادہ کر لیا جائے کہ وہ "طوطئ ہند" امیر خسروؒ کو رہا کر دیں۔ امیر خسروؒ نے اپنے مربی اور سرپرست کی موت پر ایک مرثیہ بھی تحریر کیا۔

بہادر شہزادہ محمد کی موت نے فوج کے معمولی سے معمولی سپاہی کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں کرا دیے تھے کیونکہ ان میں وہ بیحد مقبول تھا اور ضعیف سلطان جو اب اپنی عمر کے اسی ویں (80) سال میں تھا، اپنے غم کے بوجھ میں دب کر رہ گیا۔

خلجی اور تغلق خاندان

خلجی اور تغلق خاندان کا دور حکومت (1414ء - 1288ء)، 126 سال کے عرصہ پر محیط ہے۔ اس دور کی سیاسی تاریخ میں لاہور کا بھی کچھ حصہ ہے۔ مغلوں نے ارد گرد کے ممالک میں اپنی تباہ کاریاں جاری رکھیں اور حتیٰ کہ ایک موقع پر تو وہ دہلی تک جا پہنچے لیکن 1298ء میں سلطان علاؤ الدین کے ایک قابل سپہ سالار ظفر خاں کی وجہ سے انہیں پسپا ہونا پڑا۔

مغلپورہ کا علاقہ :۔ مغلوں کی ایک بہت بڑی تعداد، لاہور کے باہر ایک قصبہ میں آباد ہو گئی جس کو بعد میں انہی کی نسبت سے مغلپورہ کا نام دے دیا گیا۔ یہ گرد و نواح کے دیگر علاقوں کی بہ نسبت زیادہ متمول اور خوشحال علاقہ کہلایا جاتا رہا۔

علاؤ الدین کے زمانہ میں مغلوں کے حملوں کی مؤثر طور پر روک تھام کا سہرا، حاکم لاہور غازی خاں کے سر رہتا ہے۔ 1305ء میں اس نے کابل اور غزنی تک ان کا تعاقب کیا اور بعد میں انہی شہروں سے بھاری خراج بھی وصول کیا، جو مادی طور پر اس لیے وصول کیا گیا تھا، تاکہ اگلے کئی سال تک ان علاقوں پر مغلوں کے حملوں کی روک تھام کی جا سکے۔

خاندان تغلق کی بادشاہت کا آغاز :۔ غازی خاں نے جو اصل میں غیاث الدین بلبن کا ایک ترک غلام تھا (1321 عیسوی) میں غیاث الدین تغلق کا لقب اختیار کر کے ہندوستان کی حکومت

سنبھالی۔ جس قسم کے حالات اسے ورثے میں ملے اس کے لیے نہایت اعلیٰ سیاسی بصیرت اور انتظامی صلاحیتوں کی ضرورت تھی۔ وہ حاکم لاہور کی حیثیت میں اس کا بھرپور مظاہرہ کر چکا تھا۔ اس نے تغلق خاندان کی بادشاہت کی بنیاد رکھی، جس نے 1321ء سے 1414ء تک ہندوستان پر حکومت کی۔

تیمور کا حملہ:۔ 12 ستمبر 1398ء کو جب تیمور نے دریائے سندھ عبور کیا تو حاکم پنجاب مبارک خان نے غیر مؤثر مزاحمت کی اور مغلوں کی فوج چناب تک پہنچ گئی۔ دہلی روانہ ہونے سے قبل تیمور کی فوج نے پنجاب اور ملتان میں خوب لوٹ مار مچائی۔ نصرت کھوکھر کے بھائی ملک شیخہ کھوکھر جو بعد میں دہلی کے بادشاہ محمود تغلق کے دور میں اس جگہ کا حاکم مقرر ہوا، کی بروقت اطاعت کے باعث لاہور لوٹ مار سے محفوظ رہا۔

دہلی کی فتح کے بعد جب تک شاہی پڑاؤ گنگا اور جمنا کے دوآبہ میں قائم نہیں ہوا تھا وہ بادشاہ کی اطاعت گزاری میں رہا۔ اس نے اپنے گھر واپس جانے کی اجازت طلب کی اور ظاہری طور پر یہ باور کرایا کہ وہ لوگوں سے بادشاہ سلامت کی طرف سے خراج کی رقم وصول کرنے جا رہا ہے اور ساتھ ہی وعدہ کیا کہ وہ دریا کے قریب اس پڑاؤ سے آن ملے گا۔ تاہم لاہور پہنچ کر اس نے خراج کی رقم وصول کرنے کے انتظامات بھی نہ کیے بلکہ بادشاہ سے ملنے کے لیے سمرقند سے آتے ہوئے لاہور سے گزرنے والے اس دستہ سے نہایت بے رخی برتی جس میں مولانا عبداللہ بھی شامل تھے۔

سردار شیخہ کھوکھر کے اس غدارانہ رویہ پر بادشاہ نے اسے پابہ زنجیر کرنے، اس کے علاقہ لاہور کو تباہ کرنے اور وہاں کے باشندوں سے خراج وصول کرنے کی غرض سے شہزادہ پیر محمد، پوتے شہزادہ رستم اور امراء سلیمان شاہ اور جہاں شاہ کو لاہور بھیجا۔ ان شہزادوں اور امراء نے لاہور آنے پر یہاں کے باشندوں سے خراج وصول کیا۔ شیخہ اور اس کے بیوی بچوں کو قید کر لیا۔ بادشاہ اپنی خود نوشت میں لکھتا ہے:۔ جب میں شکار سے واپس آیا تو وہ شہزادے اور امراء جن کو میں نے لاہور بھیجا تھا اپنے ساتھ بہت زیادہ دولت اور ساز و سامان لے کر واپس آگئے۔ میں نے بڑے جوش و خروش اور اعزاز کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ انہوں نے لوٹ مار کا سامان جس میں روپیہ پیسہ، اشیاء اور گھوڑے شامل تھے، مجھے پیش کیا اور میں نے وہ سب کا سب اپنے دربار میں موجود امراء میں تقسیم کر دیا (24)۔ ظفر نامہ کا مصنف اسی واقعہ پر لکھتے ہوئے کہتا ہے:۔ شہزادگان پیر محمد اور رستم، امراء جہاں شاہ اور سلیمان شاہ کے ہمراہ لاہور سے یہاں پہنچے۔ انہوں نے لاتعداد بے دین ہندوؤں کو تہہ تیغ کیا۔ انہوں نے بہت سا مال غنیمت حاصل کیا اور پھر یہی لوٹ کا مال بادشاہ کو پیش کر دیا۔

اس فاتح حکمران نے پنجاب میں کوئی چھاؤنی قائم نہ کی۔ سید خضر خاں کو لاہور کا حاکم مقرر کیا اور واپس ترکستان لوٹ گیا۔ اس نے ہندوستان پر برائے نام حکمرانی کی۔

سید خاندان :۔ غازی خاں تغلق کے بعد خضر خاں سید وہ دوسرا حاکم لاہور ہے جو پنجاب میں حکمرانی حاصل کرنے کے بعد دہلی کا تخت و تاج پانے میں کامیاب ہوا۔ فروری 1412 عیسوی میں محمود تغلق کی وفات کے بعد وہ لاہور سے روانہ ہوا اور دولت خاں افغان لودھی کو جو بادشاہ کی موت کے بعد اس کا جانشین بنا، نکال باہر کیا اور عنان حکومت سنبھال لی۔ تاہم اس نے امراء کے حسد کو بالائے طاق رکھتے ہوئے تیمور کے نام کی ایک بہترین حکومت کی داغ بیل ڈال دی۔ لاہور اور ملتان کی فوجوں کی مدد سے جو اس وقت اس کے ماتحت تھیں اسے اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کا موقع میسر آ گیا۔ سید خاندان کے دور حکومت 1412ء سے 1478ء تک جو 66 برس کے عرصہ پر محیط ہے، میں لاہور کو سیاسی طور پر کوئی شہرت اور نمائندگی نہ مل سکی۔

لودھی خاندان :۔ اب پنجاب میں افغان لودھیوں کی حکومت حقیقی طور پر قائم ہو گئی۔ فیروز تغلق کے زمانے میں بہلول کا دادا ملتان کا گورنر اور باپ حاکم لاہور تھا۔ اس کے چچاؤں کو دہلی کے سید حکمرانوں نے اہم عہدے سونپ رکھے تھے۔ اس کے ایک چچا اسلام خاں کی بارہ ہزار جنگجو سپاہیوں پر مشتمل اپنی ایک نجی فوج تھی۔ بہلول کی والدہ ایک منہدم مکان کے ملبے تلے دب کر بری طرح کچلی گئی لیکن اس کے باپ نے اس کا پیٹ چاک کر کے نوزائیدہ بچہ باہر نکال لیا جس کی قسمت میں آئندہ ہندوستان کا بادشاہ ہونا لکھا تھا۔ پنجاب میں لودھی خاندان کی بڑھتی ہوئی طاقت نے دہلی کے حکمرانوں کو جنہیں اس نے پہاڑوں میں دھکیل دیا تھا کے حسد کو مزید بھڑکایا۔ بہلول کو جوان ہو کر یہ موقع ملا کہ اس نے سب سے پہلے سرہند اور بعد میں پورے پنجاب پر قبضہ کر لیا۔

پنجاب کی آزادی :۔ لاہور کی ریاست کچھ دیر سے دہلی کی ملکیت سے علیحدہ ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ سید خاندان کے آخری فرمانروا سید علاؤ الدین کے وزیر نے اسے آنے کی دعوت دی۔ بہلول نے بعد میں اس کی جگہ لے لی اور اس فرمانروا نے اسے اپنا جانشین مقرر کیا۔ بہلول کی تخت نشینی کا شمار 1450ء میں سلطان علاء الدین کی دست برداری سے کیا جاتا ہے۔ اس کی تخت نشینی کے باعث پنجاب دوبارہ سلطنت دہلی میں شامل ہو گیا۔ اپنے پوتے سلطان ابراہیم کے دور حکومت میں حاکم لاہور دولت خاں لودھی، دہلی کے دربار میں اپنے بیٹے دلاور کی بے عزتی سے سخت متنفر ہو گیا۔ عالم خاں لودھی کے ذریعے اس نے کابل کے مغل حکمران بابر کو ہندوستان کے حالات سدھارنے کی دعوت دی۔ اس نے مغل بادشاہ کو پورے ملک میں حکمران بادشاہ اور خاندان کے خلاف پائی

جانے والی شدید نفرت اور امراء اور فوج کے درمیان پیدا ہونے والی کشمکش اور افراتفری سے بخوبی آگاہ کیا۔

بابر کا لاہور پر قبضہ 1524ء

بابر کی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ وہ ہندوستان پر حملہ آور ہو۔ دہلی دربار افراتفری اور خانہ جنگی کا ایک عجیب و غریب منظر پیش کر رہا تھا۔ پورے ملک میں بے چینی تھی اور حالات قابو سے باہر ہو گئے تھے۔ یہ اس سے پیشتر بھی بتایا جاچکا ہے کہ لاہور پر دولت خاں لودھی اور اس کے بیٹوں غازی خاں اور دلاور خاں کا قبضہ تھا۔ سلطان ابراہیم کی عاقبت نا اندیشی اور غرور نے پنجاب کے حاکم کو بغاوت پر مجبور کر دیا۔ اس کو دبانے کے لیے بادشاہ نے بہار خاں لودھی کی قیادت میں ایک فوج روانہ کر دی۔ دولت خاں نے جب یہ دیکھا کہ وہ اس قدر فوج کا مقابلہ نہیں کر سکے گا تو اس نے بابر کی اطاعت کر لی اور اسے اپنی مدد کو آنے کے لیے کہا۔

مغل بادشاہ نے بڑی خوشی سے اس دعوت کو قبول کیا اور جلد ہی اپنی فوج کو حرکت میں لے آیا۔ وہ دریائے سندھ کو پار کر کے گکھڑوں کے ملک سے گزرتا اور انہیں اپنی اطاعت پر مجبور کرتا ہوا جہلم اور چناب کو عبور کر کے تیزی سے لاہور پہنچا۔

بہار خاں لودھی، مبارک خاں لودھی اور چند دیگر امراء جو ابھی تک دہلی کے بادشاہ کے حامی اور مددگار تھے، انہوں نے لاہور کے قریب حملہ آور فوج کا مقابلہ کیا لیکن زبردست کشت و خون کے بعد انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ فاتحین نے اپنی کامیابی کے غرور میں مست اور اپنی مزاحمت سے سیخ پا ہو کر شہر میں زبردست لوٹ مار شروع کر دی اور اس کی گلیوں کو نذر آتش کر دیا (25)۔ بادشاہ لاہور میں صرف چار روز تک ٹھہرا پھر دیپال پور کی طرف بڑھ گیا، جس کی چھاؤنی کو اس نے تہس نہس کر دیا (26)۔ پھر ستلج کو عبور کر کے وہ سرہند تک پہنچا۔ جب اس تک دولت خاں کی بغاوت کی خبر پہنچی، جو مغل بادشاہ کی عطا کردہ جاگیر "سلطان پور" سے ناخوش تھا اور اب مسلح ہو کر مقابلہ پر اتر آیا تھا تو بابر نے دہلی کی طرف جاری اپنی پیش قدمی کو فی الوقت ترک کر دیا اور نہایت ہوشمندی سے لاہور کی طرف تیزی سے واپس لوٹنا ہی بہتر خیال کیا۔ بادشاہ کی آمد کی خبر سن کر دولت خاں، مشرق کی جانب ایک پہاڑی ریاست کی طرف بھاگ گیا لیکن بادشاہ نے اس کے بیٹے دلاور خاں سے صلح کر لی اور اسے خان خاناں کے خطاب سے نوازا (27)۔ لاہور میں اس

نے پنجاب کے فتح کیے گئے اضلاع امراء میں بانٹ دیے۔ دیپال پور، سلطان ابراہیم کے بھائی سلطان علاء الدین کو دیا گیا جو اس سے پہلے دہلی کی حکومت کا خواہشمند تھا۔ سیالکوٹ خسرو گوکل تاش کو اور کلانور محمد علی تاجک کو دیا گیا۔ اپنے ایک قریبی عزیز میر عبدالعزیز کو لاہور کا انتظام سونپنے اور مغلیہ فوج کے ایک مشہور افسر بابا خشکہ کو سلطان علاء الدین کی پیش قدمی کی نگرانی پر مامور کر کے وہ واپس کابل چلا گیا۔

بابر نے ابھی بمشکل دریائے سندھ ہی کو عبور کیا تھا کہ دولت خاں اپنی پہاڑی کمین گاہ سے نکل کر دیپال پور کی طرف بڑھا جہاں اس کی فوج نے سلطان علاء الدین کو شکست دے دی۔ بابا خشکہ نے لاہور کے حالات درست کرنے کی غرض سے پیش قدمی کی جو اس وقت دولت خاں کی ۔۔ازشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ بابر دوبارہ میدان میں اتر آیا۔ اس کے تمام افسروں نے اپنی فوجوں کو لاہور میں جمع کر لیا جو ابھی تک ان کے قبضہ میں تھا۔ محمد سلطان مرزا، عادل سلطان اور دیگر مغل امراء بادشاہ کا خیر مقدم کرنے کی غرض سے لاہور سے کلانور پہنچے۔ دشمن کی چالیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل فوج نے راوی کے کنارے پر پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ بادشاہ نے اس کی صورت حال کا جائزہ لینے کی غرض سے ایک نگران دستہ روانہ کیا لیکن فوج کو جب اس کی آمد کی خبر ہوئی تو وہ منتشر ہو کر مایوسی کی حالت میں پناہ گاہوں میں چھپنے پر مجبور ہو گئی۔ لہٰذا بادشاہ لاہور میں داخل ہوئے بغیر دہلی کی طرف بڑھ گیا۔ یہ بادشاہ کی پانچویں اور آخری فوجی مہم تھی۔ نیز پانی پت کی لڑائی 29 اپریل 1526 عیسوی میں لڑی گئی۔ اس جنگ نے سلطنت کے مقدر کا فیصلہ کر دیا۔ ابراہیم قتل ہوا اور اس کی فوج کو زبردست کشت و خون کے بعد شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ دہلی پر فاتح حکمران بابر کا قبضہ ہو گیا جس نے ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔ بابر 16 دسمبر 1530ء میں آگرہ میں فوت ہوا (28)۔

مغلیہ دور

خوبصورت اور دیدہ زیب مناظر سے آراستہ، نہایت حسین ندیوں اور آبشاروں سے مزین اور پھلوں، سبزیوں اور گہری چھاؤں کے درختوں سے بھرپور علاقہ سے تعلق رکھنے والے بابر کے ساتھی جو اب جہاں گرد بن گئے تھے، وہ ہندوستان کے ان نامہربان علاقوں میں اپنے طویل قیام کے تصور سے ہی خوفزدہ ہو جاتے تھے۔ فرغانہ اور اس کے گرد و نواح کے پہاڑوں کی شادابی اور خوبصورتی

انہیں واپس گھر لوٹنے پر اکساتی تھی(29)۔ لیکن بابر نے اپنی فوج کے جملہ دستوں کو اکٹھا کر کے نہایت پرجوش اور ولولہ انگیز تقریر کی۔ انہیں تلقین کی کہ اتنی شاندار فتوحات حاصل کرنے کے بعد وہ ان خطرناک اور عاقبت نا اندیشی کے خیالات سے باز رہیں۔ اس نے ہندوستان میں نئی سلطنت کے قیام کے بیشمار فوائد بیان کیے۔ اب ایک ایسی سلطنت کی بنیاد رکھی جا چکی تھی جس کی قسمت میں ایشیا کے اس ملک کی سب سے بڑی سلطنت ہونا لکھا تھا۔

پنجاب میں مغلیہ دور حکومت میں جس پہلے اہم شہر کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی اور جسے سب سے زیادہ فائدہ پہنچا وہ قدرتی طور پر لاہور ہی تھا۔ اولین مغل بادشاہوں کے دور حکومت کو بجا طور پر لاہور کی تاریخ کا سنہری دور کہا جاتا ہے۔ یہ ایک مرتبہ پھر شاہی رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہونے لگا۔ ان کو صنف نازک سے لگاؤ، بہادری اور مہم جوئی، روشن خیالی اور مزاح کی لطیف حس قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی تھی۔ وہ مشرق میں پروان چڑھنے والے فنون لطیفہ اور ادب سے بخوبی واقف تھے اور بعد میں انہوں نے حقیقی طور پر اپنے آپ کو ان کا سرپرست ثابت بھی کیا۔ ان کے دور حکومت میں لاہور جلد ہی علم و فضل کی آماجگاہ بن گیا۔ اب یہ جگہ بخارہ، سمرقند، ماالنہر اور دیگر ایشیائی ممالک سے بلائے گئے علماء، فضلاء، شعراء، مصنفین، خطیبوں اور فلسفہ اور علم الکلام کے ماہرین کا گھر بن گئی اور یہ علاقہ علم و فضل اور امن کے فنون کی تحصیل کے لیے خوب مشہور و معروف ہو گیا۔ بہترین باغات لگائے گئے۔ آبپاشی کے ذرائع کو فروغ دینے کے لیے نہریں کھدوائی گئیں۔ وسیع مساجد بنوائی گئیں۔ سرائے اور کارواں تعمیر کرائے گئے۔ محلات اور گنبد و مینار ایستادہ کیے گئے۔ ملک کے فن تعمیر کو اس قدر فروغ دیا گیا جس کی کسی دور میں بھی مثال نہیں ملتی۔ آج کل لاہور جن اہم یادگار عمارتوں سے آراستہ ہے، ان کے بارے میں پتا چلایا گیا ہے کہ ان کا تعلق مغلوں کے ابتدائی دور سے ہے۔ اس دور میں علم و ادب کی کئی اصناف کی ترویج ہوئی۔ پنجاب کو بھی ان کا مسکن رہنے کا دعویٰ ہے۔

ہمایوں

29 دسمبر 1530ء کو بادشاہ کی موت کے تین روز بعد ہمایوں نے آگرہ میں تخت و تاج سنبھالا۔ جیسے ہی اس کے بھائی کامران نے جو اس وقت کابل اور قندھار کا حکمران تھا اس واقعے کی خبر سنی اس نے پنجاب کی طرف پیش قدمی کر دی۔ اس نے محض دکھاوے کی خاطر یہ باور کرایا کہ

وہ اپنے بھائی کو اس کے تخت نشین ہونے پر مبارک باد دینے جا رہا ہے لیکن حقیقت میں وہ ہندوستان کی حکومت حاصل کرنے کے لیے اپنی قسمت آزمائی کرنے آیا تھا۔ جیسے ہی وہ لاہور کے نزدیک پہنچا، اس نے محسوس کیا کہ میر یونس علی جو بابر کے دور سے اس شہر کا گورنر چلا آرہا تھا، ہمایوں کا وفادار اور حامی ہے۔ اس نے جنگی کارروائی کرنے کے بجائے ایک عجیب چال چلی۔ اس نے اپنے سرکردہ امراء میں سے ایک امیر کیراچہ بیگ کو دربار میں جھوٹ موٹ برا بھلا کہہ دیا۔ کیراچہ بیگ نے بھی محض دکھاوے کی خاطر اس سلوک کو اپنی بے عزتی اور ہتک گردانا اور اگلی رات اپنے تمام ساتھیوں سمیت فرار ہو گیا اور لاہور میں پناہ طلب کی۔ اس دور میں انحرافات اور سازشیں عام تھیں چنانچہ کیراچہ بیگ کے اس رویہ سے کسی کو بھی حیرانی نہ ہوئی۔

اس بات سے خوش ہوتے ہوئے کہ اس کو ایک نہایت اہم آدمی کی حمایت حاصل ہو گئی ہے، میر یونس علی ایک بہت بڑے جلوس کے ہمراہ بیگ کو ملنے اور پنجاب کے دارالحکومت میں اسے خوش آمدید کہنے کے لیے شہر سے باہر تک آیا۔ اس کا انتہائی خوشی اور مسرت سے خیر مقدم کیا گیا۔ اس نے اسے اپنا ذاتی دوست سمجھا اور مستقل طور پر گورنر کی میز پر منعقدہ دعوتوں میں شامل کیا گیا نیز اس کی دلچسپی کے لیے بہت سی رنگارنگ تفریحات کا انعقاد کیا گیا۔ تاہم کیراچہ بیگ انتہائی صبر و سکون سے اپنے موقع کی تلاش میں رہا اور ایک رات جشن کے موقع پر وہ زیادہ رات گزرنے کا منتظر رہا۔ جب سپاہیوں کو اپنے کمروں میں جانے کی اجازت دے دی گئی تو اس نے غداری سے میر کے ایک آدمی کو قابو میں کیا اور اسے اپنا قیدی بنا لیا اور پھر اس نے شہر پناہ کے دروازوں پر قبضہ کر کے مرزا کامران کو شہر میں آنے کی دعوت دے دی۔ مرزا کامران جو نہایت بے چینی سے نتیجہ کے انتظار میں تھا، جیسے ہی اپنے ساتھی کی کامیابی کا سنا فوراً لاہور کی طرف بڑھا اور انتہائی جوش و خروش سے شہر میں داخل ہوا۔

شہر پر مرزا کامران کا قبضہ ہو گیا۔ کوئی مزاحمت نہ کی گئی۔ اس نے میر یونس علی کو رہا کرتے ہوئے ہمایوں کے پاس جانے کی اجازت دے دی۔ اپنی کامیابی کے بعد کامران نے ستلج تک سارے پنجاب پر قبضہ کر لیا اور اپنے آپ کو اس کا حکمران تسلیم کرا لیا۔ ہمایوں قدرتی طور پر نرم مزاج کا آدمی تھا۔ چنانچہ اس نے جلد ہی کابل، قندھار اور پنجاب پر اپنے بھائی کی حکومت کی توثیق کر دی (30)۔ اس سلوک سے خوش ہو کر مرزا نے بادشاہ کی خدمت میں خیر سگالی کے طور پر قیمتی تحائف بھیجے۔ بعد میں جب تک وہ بادشاہ سے خط و کتابت کرتا رہا، اپنے ہر پیغام میں اپنی عجز و انکساری کا اظہار کرتا اور اپنے آپ کو بادشاہ کے ایک خادم اور خیر خواہ کے طور پر پیش کرتا۔ ایک

مرتبہ اس نے بادشاہ کی خدمت میں اپنا ترتیب دیا ہوا ایک قصیدہ بھی بھیجا:

قصیدہ کامران مرزا

حسن تو دم بدم افزوں بادا	طالعت فرخ و میمون بادا
گرد کان از رہ لیلی خیزد	جائے او دیدہ مجنوں بادا
ہر غبارے کہ ز راہت خیزد	نور چشم من محزون بادا
ہر کہ گرد تو چو پر کار نگشت	او ازیں دائرہ بیرون بادا
کامران تا کہ جہاں راست بقا	خسرو دہر ہمایوں بادا

تمہارے حسن میں ہر دم اضافہ ہو
تمہاری قسمت اسی طرح چمکتی رہے ہمیشہ
لیلی (31) کے راستے میں سے اٹھنے والی گرد
مجنوں کی آنکھوں میں اپنی جگہ پا جائے
تمہاری راہ سے اٹھنے والی گرد
اس دکھی شخص کی آنکھوں کا نور بن جائے
جو تمہارے گرد گھڑی کی سوئیوں کی مانند نہیں گھومتا
اسے دنیا کی گردش سے نکل جانا چاہیے
اے کامران ! جب تک یہ دنیا باقی ہے
ہمایوں (32) اس دنیا کا بادشاہ رہے

علامہ ابو الفضل نے یہاں مزاحیہ انداز میں لکھا ہے :۔
وہمانا کہ دعائے او باجابت رسیدہ بود کہ بمقتضائے کم اخلاصی از دائرہ اعتبار بلکہ از دائرہ ہستی بیرون آمد چنانچہ در جائے خود گزارش یابد۔
اور یقیناً اس (کامران) کی دعا قبول ہوئی اور اس کے نتیجہ میں اس کو نہ صرف وفاداری کے دائرہ کار سے نکال دیا گیا بلکہ ہستی کے دائرہ کار سے بھی نکال دیا گیا اور اس کو اس کی مناسب جگہ پر پہنچا دیا گیا (33)۔

1535ء میں محمد زمان مرزا(34) ، نے مندسور میں شکست کھانے کے بعد پنجاب کی طرف رخ کیا اور لاہور کا محاصرہ کر لیا۔ تاہم کامران مرزا اپنی مہم میں بروقت کامیابی حاصل کرنے کے بعد قندھار کی طرف لوٹ گیا اور زمان مرزا محاصرہ اٹھا کر آخر کار گجرات کی طرف بڑھ گیا۔

جب ہمایوں اور شیر شاہ سوری کے درمیان کشمکش پیدا ہو گئی تو ہمایوں بادشاہ نے اپنے بھائیوں ہندال اور عسکری کے ہمراہ لاہور میں پناہ حاصل کر لی لیکن اس کے بھائی کامران مرزا کی غداری نے جو پنجاب کو شیر شاہ کے حوالے کر کے اس سے صلح کر چکا تھا، ہمایوں کو شاہی خاندان کے ہمراہ لاہور چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے اور مرزا نے 31 اکتوبر 1540ء کو راوی عبور کیا۔ مرزا، ہزارہ کے قریب بادشاہ سے علیحدہ ہو گیا اور بادشاہ سندھ کی طرف بڑھ گیا۔

شیر شاہ سوری جو آگرہ سے پنجاب تک بادشاہ کا تعاقب کرتا ہوا آیا تھا اس نے ایک نئے قلعہ روہتاس کی بنیاد رکھی اور اپنے ایک قابل جرنیل حواس خان کو صوبے کا حاکم مقرر کر کے آگرہ کی طرف لوٹ گیا۔

شیر شاہ ایک نہایت سمجھدار اور عالی شان بادشاہ تھا۔ سرحد پر حکمرانی کرنے کے علاوہ اس نے لاہور اور پشاور جیسے تجارتی شہروں پر قبضہ کرنے کے بعد پنجاب کی تجارت کو وسطی ایشیا اور شمالی چین کے ساتھ فروغ دیا۔ اس نے لاہور اور ملتان کو ملانے کے لیے 1500 میل لمبی سڑک تعمیر کرائی اور بنگال سے نیلاب (جو سندھ کا ایک علاقہ ہے) آنے والے مسافروں کے آرام کے لیے اس پر پھلوں کے درخت لگوائے۔

شیر شاہ سوری نے برسراقتدار آنے کے بعد روہ سے آنے والے اپنے ہم وطنوں کے لیے روزگار کے خصوصی انتظامات کیے۔ یہ بہترین انسان 22 مئی 1545ء کو کالینجار کے محاصرے کے دوران گولہ پھٹنے سے فوت ہوا۔ اسے اس کے خیمہ میں لایا گیا جہاں وہ دو روز تک حیات و موت کی کشمکش میں رہا لیکن ہوش میں ہوتے ہوئے اور مستقبل کے بارے میں غور کرتے ہوئے اس نے آخری سانس تک اپنا فرض خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔ شیر شاہ کو بستر مرگ پر اس بات کا سخت افسوس تھا کہ وہ لاہور شہر کو ختم نہیں کر سکا۔ اس کی دیرینہ سوچ تھی کہ لاہور شہر کو یکسر تباہ کر دے۔ وہ کہتا تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی حملہ آور کے راستے میں اس قدر بڑا شہر موجود نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وہ یہاں پہنچنے پر سب سے پہلے اس پر قبضہ کرتا ہے اور بعد میں اپنی رسد جمع کر لیتا ہے اور اپنے ذرائع کو منظم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کو اس بات کا بھی شدید افسوس تھا کہ اس کو وقت نہیں مل سکا کہ وہ پنجاب پر مغلوں کے حملوں کی نگرانی کرنے کے لیے روہ ،

(35) کے پہاڑوں سے اپنے قبیلے کے آدمیوں کو بلا کر مقرر کر سکتا۔

ہمایوں نے 2 جنوری 1555ء کو چودہ سال کی جلا وطنی کے بعد دریائے سندھ کو بغیر کسی مزاحمت کے پار کیا۔ لاہور کے افغان حاکم سکندر شاہ نے پنجاب کی فوج کو دہلی روانہ کر دیا تھا تاکہ صوبہ میں دفاع کی خاطر کوئی فوج موجود نہ رہے۔ ہمایوں لاہور کی طرف بڑھا جو اس کی ملکیت میں آچکا تھا۔ 24 فروری کو جب وہ اس میں داخل ہوا تو اس کے شہریوں نے انتہائی جوش و خروش اور خوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا خیر مقدم کیا (36)۔ فرحت خاں کو لاہور کا سکے دار (حاکم)، بابوس خاں کو فوجدار، مرزا شاہ سلطان کو امیر اور مہتر اور جوہر کو صوبہ پنجاب کا خزانچی مقرر کرنے کے بعد بادشاہ سرہند کی طرف بڑھ گیا (37)۔

اکبر

1556ء میں دہلی میں اپنے والد کے انتقال کے بعد اکبر نے جو اس وقت تیرہ سال اور چار ماہ کی عمر کا تھا، کلانور پنجاب میں تخت و تاج سنبھالا (38)۔ جہاں وہ مشہور سپہ سالار اور وزیر بہرام خان کی اتالیقی میں سکندر شاہ سے جنگ کے سلسلہ میں خیمہ زن تھا، یہیں سے اس کے نام کے خطبہ کا باضابطہ اعلان کیا گیا۔ بادشاہ کے حکومت سنبھالنے کے بعد سب سے اہم واقعہ جو رونما ہوا وہ ہمایوں کے دور کے اول درجہ کے امیر اور حاکم لاہور شاہ ابو المعالی کا قبضہ تھا، جس نے بغاوت کر دی (39)۔ اسے گرفتار کر لیا گیا اور پہلوان کا لگاز کوتوال یا لاہور کے کوتوال کے سامنے پیش کیا گیا لیکن وہ ان کے قبضہ سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے ایک فوج جمع کر کے کشمیر پر حملہ کر دیا۔ کوتوال نے اس واقعہ پر شرمندہ ہوتے ہوئے اور شاہی حکومت کے سامنے اس کو اپنی ہتک اور بے عزتی گردانتے ہوئے خودکشی کر لی۔

بادشاہ اپنی حکومت کے دوسرے سال کے دوران اپنے سپہ سالار حضر خاں کی لاہور سے بیس کوس کے فاصلے پر شکست کی خبر سن کر لاہور پہنچا اور چار ماہ اور چودہ دن تک وہاں رہا۔ اس نے یہ سارا وقت پنجاب (40) ، میں اپنی حکومت کو مضبوط بنانے اور مجتمع کرنے اور سکندر خاں سوری کے خلاف جنگی کارروائیوں کی نگرانی کرتے ہوئے گزارا جو سیوالک کے پہاڑوں میں اپنی پوزیشن مضبوط بنا چکا تھا۔ اس کے بعد اکبر، مہدی قاسم کی ہمشیرہ کے بیٹے حسین خاں کو لاہور کا حاکم مقرر کرنے کے بعد دہلی واپس چلا گیا۔ غالباً یہ وہی دور تھا جب مشہور شاعر اور وزیر اور اکبر کے

دربار کو رونق بخشنے والے قابل امراء میں سے ایک مرزا عبدالرحیم خان خاناں کی لاہور میں ولادت ہوئی۔ وہ بادشاہ کے اتالیق اور سپہ سالار بہرام خاں کا بیٹا تھا۔

جب بہرام خاں کو ناپسندیدہ قرار دے دیا گیا تو شمس الدین محمد خان عاتکہ (41) ، کو جو سکندر خاں سوری کے خلاف ہونے والی جنگوں میں اپنے آپ کو منوا چکا تھا، جھنڈا اور اعزازی خلعت وغیرہ دے کر پنجاب کا حاکم بنا کر روانہ کیا گیا۔ بعد میں بادشاہ نے لاہور میں اس سے اپنی حکومت کے پانچویں سال میں ملاقات کی۔ شمس الدین کو خان اعظم کے خطاب سے نوازا گیا اور اس کو اور اس کے خاندان کو پنجاب (4.2) ، میں بہت سی جاگیروں سے سرفراز کیا گیا۔ اسی سال ہجری 964 ہجری کو بادشاہ بیگم، ملکہ مریم مکانی دیگر خواتین (43)، کے ہمراہ کابل سے آنے کے بعد شاہی پڑاؤ میں شامل ہو گئیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پیش قدمی کے دوران شہنشاہ کے ہاتھیوں میں سے ایک ہاتھی حادثاتی طور پر بہرام خاں کے خیموں میں گھس گیا۔ اس کے اور شمس الدین کے درمیان ناراضگی پیدا ہو گئی۔ اسے شبہ تھا کہ یہ حادثہ وزیر کی وجہ سے ہوا ہے۔ گورنر اپنے بیٹوں کے ہمراہ خان خاناں کے خیموں میں گیا اور قرآن پاک اٹھا کر حلف اٹھایا کہ یہ واقعہ محض حادثہ تھا۔ چنانچہ بدگمانی دور ہو گئی (44)۔

1556ء میں بادشاہ کے سوتیلے بھائی محمد حکیم مرزا نے کابل سے نکالے جانے کے بعد اور اپنے آپ کو پنجاب میں آباد کرنے کی غرض سے لاہور کا امن و امان تباہ کر دیا۔ اس کے ساتھ کابل میں شامل ہونے والے بہت سے مقامی منصب داروں نے اسے اکسایا تھا۔ بھیرہ میں لوٹ مار کرنے کے بعد وہ پیش قدمی کرتا ہوا لاہور کی جانب بڑھا اور مہدی قاسم خاں کے باغ میں پڑاؤ ڈال لیا جو شہر سے باہر راوی کے کنارے پر واقع تھا۔ پنجاب کے چند امراء مثلاً میر محمد خان کلاں، قطب الدین محمد خاں اور شریف خاں نے جیسے ہی اس کی پیش قدمی کی خبر سنی فوراً لاہور میں جمع ہو گئے اور قلعہ کو مضبوط کر دیا۔ مرزا نے کئی مرتبہ اپنی فوج کو قلعہ کے حصار تک آگے بڑھایا لیکن امراء نے اپنی توپوں اور بندوقوں کی گولہ باری سے اسے شکست دے دی۔

ان جارحیتوں کی خبر بادشاہ کو آگرہ میں ملی تو وہ سرہند کے راستے پنجاب کی طرف بڑھا اور جب مرزا نے اپنے آپ کو مزاحمت کے قابل نہ پایا تو کابل کی طرف بھاگ گیا۔ بادشاہ نے جمنا کو عبور کیا تو اسے اس کے فرار کی خبر ملی لیکن اس نے لاہور کی طرف اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ لاہور پہنچنے پر امراء اور معززین جنہیں حکومت کی حمایت اور وفاداری کے صلے میں جن کا وہ مظاہرہ کر چکے تھے، خطابات سے نوازا گیا تھا، نے بادشاہ کا بڑے پرجوش انداز میں استقبال کیا۔ بادشاہ دارالسلطنت

لاہور میں رجب کے مبارک موقعہ پر داخل ہوا اور اسے شہر پناہ میں مہدی قاسم خاں (45) کے مکان میں ٹھہرایا گیا۔ بادشاہ کے حکم سے قطب الدین محمد خاں اور گکھڑوں کے سردار کمال خاں نے بھیرہ کے پرگنہ تک محمد حکیم مرزا کا تعاقب کیا لیکن مرزا (46) پہلے ہی دریائے سندھ عبور کر چکا تھا۔

ابو الفضل کے مطابق " بادشاہ جب تک لاہور میں رہا اس نے اپنے اطمینان کے لیے لوگوں کے معاملات سنوارنے میں اپنے آپ کو مصروف رکھا " ۔ ملک کے زمیندار شاہی دربار میں اپنی اطاعت گزاری ثابت کرنے کے منتظر رہتے اور ان پر بڑی مہربانی کی جاتی۔ سندھ کے حاکم محمد باقی نے دربار میں اپنا سفیر بھیجا اور اس کی دعوت کو بادشاہ نے خیر سگالی سمجھتے ہوئے قبول کر لیا۔

اپنی حکومت کے بارہویں سال (فروری 1567ء) کے آغاز میں بادشاہ نے کمراکہ شکار کے لیے باہر جانے کا ارادہ کیا (47)۔

لاہور کے چاروں طرف چالیس کوس کے علاقہ میں امراء کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ شہر کی اطراف میں پانچ کوس کے دائرے میں جنگلی جانوروں کو ہانک کر لے آئیں۔ انہوں نے مل جل کر میر محمد عاتکہ کے زیر ہدایت تقریباً ہر قسم کے 15000 جانور اکٹھے کر لیے۔ شاہی کیمپ جو سرگرمیوں کے لیے استعمال ہوتا تھا اسے درمیان میں نصب کیا گیا تھا۔ بادشاہ گھوڑے پر سوار ہو کر شکار کے لیے نکلا۔ امراء اور خان دائرے کو تنگ کرنے کی غرض سے ہر روز آگے بڑھتے رہے۔ تب نوابین اور معززین کو اس کھیل میں شامل ہونے کی اجازت دے دی گئی اور بعد میں عوام الناس کے لیے بھی اس میں حصہ لینے کے لیے عام اجازت دے دی گئی۔ ان میں مشکل سے کوئی ایسا سپاہی یا عام آدمی ہو گا جس نے اس شکار سے لطف نہ اٹھایا ہو۔ کافی دنوں کی تفریح اور جشن کے بعد بادشاہ نے شہر کی طرف واپس آتے ہوئے اپنا گھوڑا دریائے راوی میں ڈال دیا اور تیر کر اسے پار کر گیا۔ اس کی تقلید کرتے ہوئے اس کے درباریوں نے بھی ایسا ہی کیا اور دو آدمیوں کے سوا سبھی حفاظت سے دریا عبور کر گئے۔ 22 مارچ 1567ء کو میر محمد خاں عاتکہ کو پنجاب کے معاملات کے بارے میں ہدایات دے کر بادشاہ نے واپس آگرہ کی طرف سفر شروع کر دیا۔

حکومت کے تیرہویں سال میں حسین قلی خاں کو پنجاب کا حاکم مقرر کیا گیا اور اسے اپنے بھائی اسماعیل خاں (48) ، کے ہمراہ لاہور روانہ کیا گیا۔ اگلے سال بادشاہ نے صوفی بزرگ حضرت فرید الدین شکر گنج کے مزار اقدس پر حاضری دینے کے لیے اجودھن (پاک پتن) کا دورہ کیا۔ یہ جگہ مرزا عزیز کوکل تاش المعروف عظیم خان کی جاگیر تھی۔ اس نے بادشاہ کی خوب آؤ بھگت کی۔

مندرجہ ذیل قطعہ سے اس یادگار واقعہ کی تاریخ نکالی جاتی ہے۔

مہمانان عزیزند شہ و شاہزادہ

بادشاہ اور شہزادہ واجب الاحترام مہمانان ہیں

بادشاہ دیپالپور سے لاہور روانہ ہوا جہاں وہ حسین قلی خاں کا مہمان بنا۔ نیز وہاں چند روز شکار کرنے کے بعد وہ اجمیر روانہ ہو گیا۔

بادشاہت کے سترہویں سال حسین قلی خاں کو "خان جہاں" کے خطاب سے نوازا گیا لیکن وہ اس کے کچھ عرصہ بعد فوت ہو گیا۔ بدایونی لکھتا ہے جب وہ لاہور کا حاکم تھا تو اس کی خوراک جو کی روٹی پر مشتمل تھی اور یہ سب کچھ اس نے رسول پاکؐ کے اسوہ حسنہ پر عمل کر کے اختیار کیا ہوا تھا۔ اس نے کئی ہزار مساجد اور قدیم مزارات کو مرمت اور تعمیر کرایا یا از سرنو بحال کرایا۔

1579ء میں کابل کے حکمران محمد حکیم مرزا نے ایک بار پھر دریائے سندھ کو عبور کیا اور پنجاب کے حاکم کنور مان سنگھ کو شکست دے دی۔ اس کے بعد وہ لاہور کی طرف بڑھا اور مہدی قاسم خاں کے باغ میں پڑاؤ ڈال لیا۔ کنور مان سنگھ، سید خان، راجہ بھگوان داس، سید حمید، محمد زمان اور پنجاب کے دیگر جاگیرداروں نے قلعہ کو مضبوط کرنے کے انتظامات کیے۔ شہزادے کی طرف سے شیر خواجہ، نادر علی زرقہ اور میر سکندر نے قلعہ پر لگاتار حملے کیے لیکن وہ کسی قسم کا اثر قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے (49)۔ دریں اثناء شہزادے کو جیسے ہی بادشاہ کی پنجاب میں آمد کی اطلاع ملی تو وہ فروری میں دریائے راوی کو پار کر کے کابل کی طرف روانہ ہو گیا۔ بادشاہ نے اپنے بیٹے شہزادہ مراد کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ اس کا تعاقب کرے۔ لیکن 6 مارچ 1579ء کو فتح حاصل کیے ابھی تھوڑی دیر بھی نہیں ہوئی تھی کہ شہزادہ پہاڑوں میں غائب ہو گیا۔ بادشاہ کابل میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوا۔ کابل سے واپسی پر سال نو کے موقع پر بادشاہ نے اپنی بادشاہت کے 33 سال پورے ہونے کی خوشی میں پنجاب کے دارالخلافہ میں جشن کا اہتمام کیا۔ دولت خانہ عام یا دیوان عام جو ایک سو چودہ دالانوں پر مشتمل ہے، اس کو طرح طرح کے خوبصورت گلدانوں اور زیبائشی سامان اور نقش و نگار سے مزین پردوں سے آراستہ کیا گیا۔ نواحی اضلاع کے سردار، بادشاہ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے آئے۔ ان میں راجہ کماؤں بھی شامل تھا۔ اس کے آباؤ اجداد نے اس سے قبل مسلمانوں کی حکومت نہیں دیکھی تھی۔ اگلے رمضان المبارک میں بادشاہ، سید خاں، راجہ بھگوان داس اور کنور مان سنگھ کو پنجاب کے معاملات سپرد کر کے فتح پور (50) روانہ ہو گیا۔

تقریباً اسی دور (1580 عیسوی) میں لاہور میں ایک شعبدہ باز رہتا تھا، جس کا نام شیخ کمال بیانی تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ آنکھ جھپکنے کی دیر میں دریائے راوی کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے پہنچ سکتا ہے اور وہاں سے کسی کا بھی نام پکار سکتا ہے۔ چنانچہ جو بھی دریا کے دوسرے کنارے گیا اس نے اس کے بارے میں سنا۔ لوگوں نے اس کی آزمائش کرنے کے لیے اسے اپنا شعبدہ دکھانے کو کہا۔ اس نے اپنا کرتب اتنی کمال ہوشیاری سے دکھایا کہ لوگ اس کے قائل ہو گئے کہ واقعی اس کے پاس کوئی معجزاتی طاقت ہے کیونکہ ذرا سی دیر میں وہ اس کنارے سے غائب ہو گیا اور تھوڑی دیر بعد دوسرے کنارے پر لوگوں کے نام پکارتا سنائی دیا۔ یہ خبر بادشاہ تک بھی پہنچ گئی۔ چنانچہ بادشاہ نے اپنے طور پر اسے بلایا اور اسے دریا کے کنارے پر لے جا کر کہا کہ اپنا شعبدہ دکھائے۔ بادشاہ نے جو کچھ اسے کہا تھا اس کے بارے میں اس شخص نے کسی قسم کا کوئی جواب دینے کی جرات نہ کی۔ اس پر بادشاہ نے کہا ٹھیک ہے ہم تمہارے ہاتھ پاؤں باندھ کر تمہیں قلعہ کی دیوار سے دریا میں پھینک دیتے ہیں اگر تم پانی میں سے بحفاظت باہر آ گئے پھر تو ٹھیک ہے ورنہ جہنم رسید ہو جاؤ گے۔ جب اسے دریا کے کنارے پر لایا جا رہا تھا تو اس نے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا : میں یہ سب کچھ محض اپنے پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے کرتا تھا۔ اس دھوکہ باز شخص نے اس شعبدے کی مشق کچھ اس طرح کی ہوئی تھی۔ اس کا ایک بیٹا تھا، اس نے اپنے باپ کی آواز کی نقل کی کچھ اس طرح مشق کی ہوئی تھی اور اسے اس پر اتنا عبور حاصل تھا کہ ہوشیار سے ہوشیار یا سمجھدار آدمی مشکل سے اس کے فرق کو شاید ہی محسوس کر سکتا۔ جیسے ہی اس کا باپ دکھاوے کے طور پر وضو کر کے دریا کے کنارے پر کھڑا ہو کر اور بعد میں اس میں غوطہ لگا کر چھپ جاتا تو وہ یعنی اس کا بیٹا فوراً دوسرے کنارے پر کھڑا ہو کر اپنے باپ کی طرح آواز نکال کر زور زور سے چیخنے لگتا کہ " فلاں فلاں گھر جاؤ " ۔ اس دھوکہ باز شخص نے بہت سے لوگوں کو اپنے شعبدہ سے فریب میں مبتلا کیا۔ ان میں خان خاناں اور دولت خاں بھی شامل تھے۔ آخر کار اکبر نے اس دھوکے بازی کا پول کھولا (51)۔

جب شہنشاہ اکبر اپنی حکومت کے چونتیسویں سال میں کشمیر روانہ ہوا تو اس نے لاہور کا انتظام ٹوڈر مل کے سپرد کیا۔ وہ ضلع لاہور میں چونیاں کا ایک بہت بڑا ماہر حسابات اور محاسب کھتری تھا (52)۔ وہ بہت پہلے اکبر کی ملازمت میں آ چکا تھا۔ حکومت کے 23 ویں سال اس کو دیوان کا عہدہ عطا کیا گیا اور اسی سال کے دوران اس نے مالی اصلاحات کو متعارف کرایا، جس کی وجہ سے پورے ہندوستان میں اس کا نام مشہور ہو گیا۔ اس نے مالی حسابات، زمین کی پیمائش اور

ٹیکس کا نیا نظام متعارف کرایا۔ اس نے ہندوستان کے بڑے شہروں میں شاہی ٹیکسالوں کے لیے قواعد و ضوابط بنائے۔ ان سب کے بارے میں علامہ ابو الفضل کی مشہور تصانیف، آئین اکبری اور اکبر نامہ میں تفصیل سے بتایا گیا ہے۔ اس کی بطور تقرری سے پیشتر تمام سرکاری حسابات کو ہندی حروف یا اصطلاحوں میں لکھا جاتا تھا۔ ٹوڈر مل نے فارسی کی اصطلاحوں کو متعارف کرایا، جس کی وجہ سے اس کے ہم مذہب افراد کو اپنے مسلمان حکمرانوں کی درباری زبان کو سیکھنے کا موقع ملا۔

اکبر کے دور حکومت کے 22 ویں سال میں ٹوڈر مل کو سلطنت کے وزیر کا عہدہ عطا کیا گیا۔ یہ اکبر کی آزاد حکمت عملی کا نتیجہ تھا کہ ہندوؤں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے تحت نہایت اعلیٰ منصب حاصل کیے۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے باپ راجہ بھگوان داس کی طرح مان سنگھ کو بھی ست ہزاری کا منصب عطا کیا گیا اور اسے پنجاب کا حاکم بھی بنایا گیا۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ پنجاب کو ہمیشہ ایک نہایت اہم صوبہ سمجھا جاتا رہا ہے اور ہندوستان کے دارالخلافہ کی گورنری کو ملک میں وزارت عظمیٰ سے بھی زیادہ فوقیت دی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں کا اہم عہدوں پر فائز ہونا اکبر کی فراخ دلی اور کھلے ذہن کو ظاہر کرتا ہے اور اسی وجہ سے اکبر کی ساری حکمت عملی میں ایک جوش و خروش نظر آتا ہے۔

یوسف زئی سے شاہی فوجوں کی واپسی کے تھوڑی دیر بعد جہاں اکبر نے ٹوڈر مل کو سپہ سالار راجہ مان سنگھ کے ہمراہ روانہ کیا تھا (53)۔ اس نے گنگا جا کر سکون سے مرنے کے لیے رخصت کی درخواست دی کیونکہ اب وہ بہت ضعیف ہو چکا تھا۔ بادشاہ نے اس کی درخواست منظور کر لی لیکن اس نے اسے ہردوار سے یہ کہہ کر واپس بلا لیا کہ اپنے ملک و ملت کے لیے فرض بجا لانا بھی ایک مقدس زیارت ہے اور گنگا کے کنارے بیٹھے رہنے سے کہیں بہتر ہے۔

ٹوڈر مل بادل نخواستہ واپس آ گیا لیکن اس کے تھوڑی دیر بعد 1581 عیسوی میں لاہور میں انتقال کر گیا۔ ٹوڈر مل کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد راجہ بھگوان داس بھی (1589 عیسوی) میں 998 ہجری کے آغاز میں لاہور میں فوت ہو گیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ٹوڈر مل کی آخری رسومات سے واپسی پر اس پر پیشاب کی تکلیف کا حملہ ہوا جس کی وجہ سے وہ انتقال کر گیا۔ اس کے پاس امیرالامراء یا امیر العظیم کا لقب تھا (54)۔ دور حکومت کے 29 ویں سال اس کی بیٹی کی شادی شہزادہ سلیم کے ساتھ ہوئی۔ شہزادہ خسرو اسی کی اولاد تھا۔

اگلے سال 999 ہجری بمطابق (1582ء) میں اکبر کے دربار کا عظیم شاعر عرفی لاہور میں فوت ہو گیا۔ وہ عبدالرحیم خان خاناں کا ایک مصاحب تھا۔ اس نے 14000 اشعار پر مشتمل

دیوان وصیت کے طور پر چھوڑا۔ جس وقت اس کا انتقال ہوا، اس کی عمر صرف 36 سال تھی اور 30 سال بعد شاعر صابر نے اس کے جسد خاکی کو اصفہان سے منتقل کر کے نجف اشرف کے مقدس مقام پر دفن کیا۔ لہذا اس کے اشعار میں حضرت علیؓ کی شان میں بیان کی گئی پشین گوئی بھی بعد ازاں پوری ہو گئی۔ جب وہ کہتا ہے:۔

بکاوش مشرہ از گور تا نجف بروم　　　　اگر بہ ہند ہلاکم کنند و گر بہ تتار

ترجمہ: "اگر وہ مجھے ہند یا تتار کہیں بھی قتل کریں تو میں اپنی قبر سے نجف تک اپنی پلکوں پر سفر کر کے پہنچ جاؤں گا۔

عرفی کی وفات کی تاریخ اس قطعہ سے نکلتی ہے۔

عرفی جوانہ مرگ شدی

ترجمہ عرفی جوانی میں مر گیا ہے۔

مشرقی خیالات کے مطابق اس کی جواں مرگی، قدماء پر دشنام طرازی کی زیادتی کی وجہ سے ہوئی۔

اکبر کے دور میں لاہور ایک نہایت اہم جگہ کے طور پر مشہور ہو گیا اور اسے بہت زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی۔ اکبر کے دور حکومت کے دوسرے سال ابو الفضل لاہور کے بارے میں لکھتا ہے: یہ بہت گنجان آباد شہر ہے۔ ہر قوم کے افراد کی آماجگاہ اور ایک بہت بڑا تجارتی مرکز ہے۔ ایک مختصر وقت میں فوجیں یہاں اکٹھی کی جا سکتی ہیں اور فوجوں کے لیے جنگی ہتھیاروں کی حسب خواہش مقدار حاصل کی جا سکتی ہے (55)۔

ایک شاہی ٹیکسال، قالین بافی کی صنعت اور دیگر ادارے یہاں موجود تھے۔ بادشاہ کو باغات سے بڑا لگاؤ تھا اس نے لاہور میں انگوروں اور خربوزوں کی کاشت کی غرض سے ماہر باغبانوں کو ایران سے منگوایا۔ اکبر نے چودہ سال کے عرصہ کے لیے یعنی 1584ء سے 1598ء تک لاہور کو اپنا صدر مقام بنایا اور یہیں سے اس نے کشمیر کے لیے فوجی کارروائیاں کیں۔ شمال مشرقی افغانوں سے جنگ کے منصوبے بنائے۔ سندھ اور قندھار میں فتوحات حاصل کیں اور یہیں سے یوسف زئیوں کے خلاف مہمات تیار کیں۔ انہیں میں سے ایک کارروائی کے دوران اس کا چہیتا اور پسندیدہ شخص راجہ بیربل اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا (56)۔

17 ذیقعد 1001 ہجری بمطابق (1592 عیسوی) کو ناگور کے شیخ مبارک کا لاہور میں انتقال ہو گیا۔ وہ ہندوستان کے مشہور شعراء اور عظیم سیاستدان فیضی اور ابو الفضل کے والد تھے۔

وہ انتہائی قابل اور ذہین شخص تھے۔ انہوں نے ممبع الیون کے نام سے چار جلدوں پر مشتمل قرآن پاک کی تفسیر لکھی۔ ان کی دوسری تصنیف " جامع الکلام " کہلاتی ہے۔ اپنی عمر کے آخری حصہ میں ان کی بصارت تقریباً ختم ہو گئی اور وہ نوے برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔ ان کی وفات کی تاریخ ان الفاظ سے نکلتی ہے۔ شیخ کامل (57)۔

پراسرار حوض :۔ 1002 ہجری بمطابق (1593 عیسوی) میں حکیم علی گیلانی نے لاہور کے محل کے صحن میں ایک شاندار حوض تعمیر کرایا۔ تہہ خانے میں ایک زینے کے ذریعہ پہنچا جا سکتا تھا اور یہ ایک راہداری کے ساتھ منسلک تھا اور یہ راہداری چھ مربع گز چوڑے ایک کمرے کی طرف جاتی تھی۔ اس میں درجن بھر افراد کے جمع ہونے کی گنجائش تھی۔ اس راہداری کو اتنی کمال ہوشیاری اور جدت سے تعمیر کیا گیا تھا کہ پانی کا ایک قطرہ گرے بغیر کمرے میں پہنچا جا سکتا تھا۔ جب اکبر نے پانی میں غوطہ لگایا اور وہ تہہ تک پہنچا تو وہ ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ کمرہ روشن ہے اور اس میں فرنیچر، بستر، گاؤ تکیے اور چند کتابیں بھی موجود ہیں۔ بادشاہ نے وہیں آرام کیا اور کھایا پیا۔ اسے ناشتہ بھی وہیں فراہم کیا گیا۔ سترہ سال قبل ایک دوسرے حکیم نے اسی قسم کا حوض فتح پور میں تعمیر کرانے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا تجربہ کامیاب نہ ہو سکا۔ تاہم اس دفعہ حکیم علی اس پراسرار حوض کو تعمیر کرانے میں کامیاب ہو گئے اور میر حیدر جو پہیلیاں بنانے والے تھے، انہوں نے تاریخ ان الفاظ میں نکالی: حوض حکیم علی، جس کی مدد سے 1002 ہجری کی تاریخ دریافت ہوتی ہے (58)۔ بادشاہ نے اس حوض کو تانبے کے سکوں سے بھر دیا جن کی مالیت 20 کروڑ تھی۔ شہنشاہ اکبر کو ہندوستان کے فقید المثال موسیقاروں، میاں تان سین اور شیخ بانجو کی موسیقی سننے کا ہر وقت بڑا شوق رہتا تھا، ایک دفعہ بادشاہ نے شیخ کو حکم دیا کہ وہ ایک ہی دفعہ ساری رقم لے جائے۔ شیخ نے اپنے آپ کو اس کا اہل نہ سمجھا اور شہنشاہ سے استدعا کی کہ اسے اس کی بجائے کچھ سونا عنایت کر دیا جائے اور بادشاہ نے اس کے بدلے میں اسے 10000 سکے عنایت کر دیے۔

لاہور میں رہائش اختیار کرنے سے کچھ عرصہ پیشتر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اکبر کے مذہبی خیالات میں نئی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ وہ اپنی ذات میں روحانی اور بے دین رہنمائی دونوں کو اکٹھا کرنے میں بے چین نظر آتا تھا۔ اس کو صدر الصدور، قاضیٔ اعظم اور مفتیٔ اعظم نے امیر المومنین، وقت کا مجتہد اور اسلام کا وارث قرار دیا۔ اس وقت لاہور کے ملاؤں کے متعلق شکوک و شبہات میں مبتلا ہونے کے باعث بادشاہ نے ایک آزاد خیال مولوی قاضی صدر الدین لاہوری اور دیگر ملاؤں مثلاً عبدالشکور گلدار، ملا محمد معصوم اور کئی دوسروں کے بارے میں حکم جاری کیا کہ

انہیں شہر سے جلاوطن کر دیا جائے (59)۔

اپنی بادشاہت کے اکتیسویں سال لاہور میں رہائش کے دوران بادشاہ نے شہزادہ سلیم کی شادی رائے سنگھ کی بیٹی سے کر دی جو رائے کلیان مل کا بیٹا تھا۔ بادشاہ ایک برات کے ہمراہ دلہن کے باپ کے گھر پہنچا۔ جب شادی بیاہ کی تقریبات ختم ہو گئیں تو تحائف کا تبادلہ کیا گیا (60)۔
قریباً اسی دور میں توران کے بادشاہ عبداللہ خاں ازبک نے اکبر کو اس کی دین اسلام سے برگشتگی کے بارے میں لکھا۔ مفتی اعظم میراں صدر جہاں اور حکیم ہمام، جن کو دربار میں بڑا اثر و رسوخ حاصل تھا سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ توران کے بادشاہ کے خط کے جواب میں ملک الشعراء شیخ فیضی نے چند عربی شعر مرتب کیے جن میں ارتداد کے الزام کی یکسر تردید کی گئی ہے اور اس عظیم شاعر نے اس کی جو خوبصورت پیرائے میں تردید کی وہ ان مندرجہ ذیل اشعار سے ظاہر ہے:۔

قیل ان الالٰہ ذو ولد — قیل ان الرسول قد کہنا

مانجاالہ والرسول معا — من لسان الوری فکیف انا

ترجمہ: لوگ خدا کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس کا ایک بیٹا ہے اور رسول کے بارے میں یہ کہا جاتا رہا ہے کہ وہ جادوگر ہیں۔ لہذا لوگوں کے بہتان سے بھلا میں کیسے محفوظ رہتا۔

ان اعتراضات کے باوجود ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اس نے جھوٹی نبوت کا دعویٰ دیا۔ اس کے لیے سرعام یہ کلمہ اختیار کیا گیا:۔

لا الہ الا اللہ اکبر خلیفتہ اللہ

ترجمہ: سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں اور اکبر اللہ کا نائب ہے۔

تقریباً اسی دور میں شاعر مُلا شیری نے چند قطعات مرتب کیے جن میں بادشاہ کی حماقت کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:۔

شورش مغز است اگر در خاطر آرد جاہلی
کز خلائق مہر پیغمبر جدا خواہد شدن
خندہ مے آید مرازین بیت بس کز طرفگی
نقل بزم منعم و ورد گدا خواہد شدن
بادشاہ امسال دعوی نبوت کردہ است
گر خدا خواہد بس از سالی خدا خواہد شدن

ترجمہ: اگر دماغ میں جہالت سما جائے تو مغز میں شورش پیدا ہو جاتی ہے۔
اور مخلوق، پیغمبر کی محبت سے الگ ہو جاتی ہے۔
میں اس بیت کی جدت کی وجہ سے اس پر ہنسنے سے متاثر نہیں ہو سکتا۔
یہ امراء کی بزم میں سنائی جائے گی اور گدا اسے پڑھنا جاری رکھے گا۔
بادشاہ نے اس سال نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔
اگر خدا نے چاہا تو اس سال کے گزرنے پر خدا بھی بن بیٹھے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دین کے معاملہ میں اس کے یکطرفہ عجیب و غریب رویہ کے باوجود، اس کے لاہور میں طویل قیام کے دوران اکبر کی مذہبی فراخدلی میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ اس سچ کے بعد کہ وہ مدعی ہونے کا دعویدار محض تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ایک متلاشی کے طور پر زیادہ سرگرم عمل ہو گیا تھا۔ اس کی مذہبی رواداری کے بارے میں گہرے مشاہدے، کسی بھی خاص فرقہ کی جانبداری سے مکمل آزادی، اس کے خیالات کی پاکیزگی، اس کے جذبات اور منصوبہ جات سے خلوص اور سب سے بڑھ کر ہر مذہب کی اچھی باتوں کو سراہنے کی وجہ سے ان باتوں نے انسانیت کی انتہائی بلندی پر پہنچنے کے لیے اس کی راہ ہموار کر دی۔ اب بادشاہ مذہب کے رموز و ضوابط کے نقاط پر مشہور علماء کے ساتھ بڑی آزادی کے ساتھ گفت و شنید کرتا تھا۔ اس کا دربار ہر ملک سے آئے ہوئے مختلف مذاہب کے ہر ذات سے تعلق رکھنے والے علماء اور قابل افراد کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ان سب کو بادشاہ سے بات چیت کرنے کی اجازت تھی۔

دھرم پورہ :۔ بادشاہ نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے قیام و طعام کی غرض سے بیرون شہر دو عمارتیں تعمیر کرائیں۔ ان میں سے ایک کو وہ دھرم پورہ اور دوسری کو خیر پورہ کہتا تھا۔ بعد میں یہودیوں اور آتش پرستوں کی بھی وہاں آؤ بھگت ہونے لگی۔ ان اداروں کا انتظام ابوالفضل کے سپرد تھا۔ کیونکہ ان مقامات پر جوگیوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ چنانچہ ان کے لیے ایک علیحدہ استقبالی گھر تعمیر کرا دیا گیا۔ اس کو جوگی پورہ کا نام دیا گیا (61)۔ ہر ہفتہ یا اتوار کی شام کو وہاں اجلاس منعقد ہوتے۔ بدایونی کے الفاظ میں: وہاں سائنس کے گہری بصیرت کے حامل نکات، الہام کی باریکیوں، تاریخ کے اشتیاق اور قدرت کے عجائبات، جن کے بارے میں خلاصہ بیان کرنے کے لیے کئی کتابیں درکار ہوں گی، کے بارے میں بحث و مباحث ہوتیں۔ وہاں پر لوگوں نے اپنے آپ کو غور و فکر، انداز نشست و برخاست، خطابات، خیالات کے اظہار و تعظیمات، کیمیاگری، دلربائی اور جادوگری میں مشغول کر رکھا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خود بادشاہ بھی کیمیاگری کے فن سے آشنا تھا اور اس

نے ساری محفل کے سامنے اپنے تیار کردہ سونے کی نمائش کی۔ بعض اوقات ساری ساری رات اختلاف رائے میں بیت جاتی۔ اس دوران بادشاہ ان سرگرمیوں میں موجود رہتا اور یہاں منعقد ہونے والی مباحث میں اپنی دلچسپی کا اظہار کرتا۔ بعض اوقات ان اجلاسوں کے نتائج بڑے مہلک ثابت ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک مشہور شیعہ عالم اور "تاریخ الفی" کے مصنف ملا احمد کو مرزا احمد فولاد بیگ نے لاہور کی گلیوں میں قتل کر دیا کیونکہ اس نے نبی پاکؐ کے صحابہ کرامؓ کو سرعام برا بھلا کہہ دیا تھا۔

مرزا کو ایک ہاتھی کے پاؤں سے باندھ کر لاہور کی گلیوں میں گھسیٹا گیا۔ ایک سنی مؤرخ لکھتا ہے: آخر کار وہ شہادت کے عظیم مرتبہ پر فائز ہو گیا۔ ملا احمد کی موت کی تاریخ ان الفاظ سے نکلتی ہے:

زہی خنجر فولاد

ترجمہ: مرحبا! اے خنجر فولاد

'ملاّ احمد کی تدفین کے بعد شیخ فیضی اور شیخ ابوالفضل نے اس کی قبر پر محافظ مقرر کر دیے لیکن شیعہ ملا سے کچھ اس قدر نفرت کی جاتی تھی کہ ان تدابیر کے باوجود جب بادشاہ کشمیر کے لیے روانہ ہوا تو لاہور کے عوام نے ایک رات اس کی قبر سے اس کی لاش نکال کر نذر آتش کر دی۔

شہنشاہ چڑھتے سورج کی پوجا کرتا اور ہر روز جھروکے یا محل کی بالکونی میں نمودار ہوتا تاکہ لوگ ایک دیوتا کی طرح اس کی عبادت کریں۔ اس نے سورج کے احترام میں ایران کا قدیم جشن نو روز دوبارہ بحال کر دیا۔ اس نے یہ سب کچھ اپنی بادشاہت کا جشن منانے کے لیے اختیار کیا اور ابوالفضل کو آتش پرستوں کے مندروں کا نگران مقرر کیا۔ سورج کے برج سنبلہ میں داخل ہونے پر اس نے اپنی پیشانی پر ہندوؤں کی طرح نشان بنا لیا اور برہمنوں نے بٹے ہوئے سوتی کپڑے کی راکھی کو تعویز کی مانند اس کی کلائی پر باندھ دیا۔ لیکن بادشاہ کی جانبداری صرف برہما اور زرتشت کے ماننے والوں کی طرف نہیں تھی۔ وہ نہایت صبر و تحمل سے ہر مذہب کے پیروکاروں کی بات سنتا اور ان کے بحث مباحثوں کے متعلق اپنی حقیقی دلچسپی کا اظہار بھی کرتا تھا۔ وہ عیسائیوں پر اس حد تک مہربان تھا کہ اس کی بظاہر معقولیت کی بناء پر وہ اس قدر پرامید ہو گئے کہ وہ بادشاہ کو اپنے مذہب کی طرف راغب کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ تیسری مرتبہ بادشاہ کی سنجیدہ درخواست پر گوا کی پرتگالی حکومت نے اس کے پاس تبلیغی جماعتیں بمعہ قانونی کتابوں اور انجیل کے روانہ کیں۔

اس وقت دربار (1595 عیسوی) لاہور میں تھا جس کے بارے میں پادریوں نے بیان

کیا ہے کہ یہ بہت پر مسرت شہر ہے۔ اپنے جریدہ میں بڑے پر جوش انداز میں بادشاہ کے دربار کی شان و شوکت اور اس کی فوج کی عظمت کے بارے میں بیان کرتے ہیں۔ 5000 ہاتھی جن کے سروں پر لوہے کے پترے لگے ہوتے تھے اور ان کی سونڈھیں اور دانت خنجروں اور تلواروں سے مسلح ہوتے اور دستوں کے پیچھے چل رہے ہوتے تھے۔ انہوں نے بیان کیا ہے کہ شاہی رہائش گاہ دریا میں موجود ایک جزیرہ میں تھی اور ان کے لیے بھی وہیں ٹھہرنے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ بادشاہ نے ان کا پرتپاک استقبال کیا اور جب اسے کنواری مریم کی ایک زیبائشی مورتی پیش کی گئی تو اس کی آنکھیں چندھیا گئیں لیکن انہیں یہ دیکھ کر انتہائی افسردگی ہوئی کہ بادشاہ چڑھتے سورج کی پوجا کرتا ہے اور اپنی پوجا اس کی ایک کرن اس کائنات کو روشن کرنے والے دیوتا کی روشنی کے طور پر کراتا ہے۔ اکبر بادشاہ ہر روز جھروکے میں آتا اور یہ دیکھتا کہ ہزاروں لوگ اس کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ اب کیونکہ پادریوں کی امید برآور نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ وہ واپس گوا لوٹ گئے۔ تاہم اکبر کا بیٹا اور اس کا جانشین جہانگیر پرتگالی عیسائیوں کے بارے میں اپنے باپ سے بھی بڑھ کر فراخ دل ثابت ہوا۔ اس نے انہیں اجازت دے دی کہ وہ لاہور میں تبلیغی ادارہ قائم کر سکتے اور ایک گرجا اور سکول بھی تعمیر کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ جہاں چاہیں تبلیغ کر سکتے ہیں۔ وہ پادریوں کی گفتگو بڑی توجہ سے سنتا حتیٰ کہ اس نے مبلغوں کے لیے وظائف بھی مقرر کر دیے تھے۔ تاہم بعد میں شاہجہان نے جو ایک کٹر مسلمان تھا ان وظائف کو بند کر دیا اور گرجے کو گرا دیا (62)۔

تقریباً اسی دور (1584ء) میں چار انگریزوں نے لاہور کا دورہ کیا۔ ان صاحبان کے نام نیو بری، فچ، سٹورے اور لیڈز تھے۔ یہ ترکی میں قائم ایک غیر ملکی کمپنی کے ارکان تھے لیکن ان کی سیاحت کے بارے میں کوئی تفصیلی بیان موجود نہیں ہے (63)۔

1585ء میں ایران کے شاہ اسماعیل صفوی کا ایک رشتہ دار مرزا رستم اپنے بھائی سے ناراض ہو کر اپنے خاندان اور بیوی بچوں کے ہمراہ لاہور آگیا۔ بادشاہ نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اس نے حکیم عین الملک، خان خاناں، زین خاں اور حکومت کے دیگر زعماء کو اس کا استقبال کرنے کے لیے شہر سے 4 کوس کے فاصلے پر روانہ کیا۔ بادشاہ سے ملاقات پر اس کو ایک کروڑ ٹنکہ نقد اور پنج ہزاری کا منصب عطا کیا گیا۔ ملتان اس کو بطور جاگیر بخش دیا گیا اور بادشاہ نے اس کو گھریلو استعمال کی اشیاء مثلاً قالین، کرسیاں، میزیں وغیرہ بھجوائیں۔ ان کی مالیت کئی ہزار روپے تھی (64)۔

1586ء میں طبقات اکبری کا مصنف مرزا نظام الدین احمد 45 سال کی عمر میں لاہور میں فوت ہو گیا اور اس کو اس کے باغ میں دفن کیا گیا۔ بدایونی لکھتا ہے: لاہور کے عوام اور خواص

میں سے چند ہی ایسے لوگ ہوں گے جنہوں نے اس کے جنازے میں شریک ہو کر آنسو نہ بہائے ہوں اور اس موقع پر اس کی شفقت اور مہربانی کو یاد کر کے افسوس کا اظہار نہ کیا ہو (65)۔ اس کی تاریخ وفات مندرجہ ذیل قطعہ سے نکلتی ہے:۔

رفت مرزا نظام الدین احمد   سوئے عقبیٰ و چست و زیبا رفت

جوہر او زبسکہ عالی بود   در جوار ملک و تعالیٰ رفت

قادری یافت سال تاریخش   گوہر بے بہا، ز دنیا رفت

ترجمہ: مرزا نظام الدین احمد سوئے عقبیٰ سدھار گیا ہے۔ وہ بڑی جلدی اور خوبصورتی سے اس دنیا سے رخصت ہو گیا ہے۔ اس کا جوہر عالی تھا اور وہ فرشتوں کے مقدس مقام پر پہنچ گیا ہے۔ قادری نے اس کی تاریخ وفات کا سال ڈھونڈا ہے۔ بیشک ایک گوہر بے بہا اس دنیا سے رخصت ہو گیا ہے۔

شیخ فیضی کا انتقال:۔ 1595ء کا سال تاریخ میں اکبر کے دربار کے ملک الشعراء شیخ فیضی کی وفات کے سلسلہ میں یادگار سمجھا جائے گا۔ وہ ایک موقع شناس، ایک شاعر، ایک مصنف اور اپنے آقا کے دل کا چین اور منظور نظر تھا۔ وہ 1595ء میں لاہور میں بیمار پڑا۔ اس کو پھیپھڑوں میں تکلیف تھی۔

بدایونی اس دردناک داستان کے آخری لمحات کو قلمبند کرتے ہوئے لکھتا ہے: جب وہ جان کنی کی کیفیت میں تھا تو بادشاہ آدھی رات کے وقت اس کے پاس آیا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے اس کا سر اٹھایا اور کئی مرتبہ بلند آواز میں اسے پکارا۔ شیخ جائیو، میں اپنے ساتھ حکیم علی کو لے کر آیا ہوں، تم مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے؟ مریض چونکہ قوت گویائی کھو بیٹھا تھا چنانچہ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بادشاہ نے دوبارہ وہی سوال دہرایا لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا۔ اس پر بادشاہ نے غم اور دکھ سے مغلوب ہو کر اپنی دستار کو پھاڑ کر زمین پر پھینک دیا اور وہاں سے چلا گیا۔ پھر ابوالفضل سے تسلی کے چند کلمات کہے۔ اس کے فوراً بعد فیضی انتقال کر گیا۔ یہ واقعہ 5 اکتوبر 1595ء کو رونما ہوا۔ بدایونی نے اس کی تاریخ وفات ان الفاظ میں نکالی ہے۔

"قاعدہ الحاد شکست"

ترجمہ: الحاد کا ادارہ ٹوٹ گیا ہے۔

مندرجہ بالا خلاصے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اکبر کی حکومت کو لاہور کے لیے ایک نہایت درخشندہ زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ جب اس نے اپنے دور حکومت کے 43 ویں سال میں، 14

سال کے قیام کے بعد اسے چھوڑا (66)، اور دکن کے راستے آگرہ کے لیے روانہ ہوا تو اس نے لاہور میں شاہی حرم سرا کو شہزادہ خرم (شاہجہان) کے ہمراہ خواجہ شمس الدین حوافی کے انتظام میں چھوڑا۔ جب اکبر کی والدہ دیگر بیگمات کے ہمراہ آگرہ پہنچی تو خواجہ، دور حکومت کے 44 ویں سال تک اس عہدے پر برقرار رہا۔ شمس الدین اگلے سال لاہور میں انتقال کر گیا اسے خاندانی قبرستان میں دفن کیا گیا جو اس نے شہر کے علاقہ میں بنوایا تھا۔ بعد میں اس کے احترام میں اس علاقے کو حوافی پورہ کہا جانے لگا (67)۔

اکبر کے دور حکومت میں مندرجہ ذیل مشہور اشخاص لاہور میں آباد ہوئے:

1۔ مرزا ابراہیم :۔ ابن مرزا سلیمان (ابن خان مرزا، ابن سلطان محمود، ابن ابو سعید مرزا، پوتا قطب الدین امیر تیمور گورگان) پنج ہزاری منصب پر فائز تھا۔ مرزا سلیمان 920 ہجری بمطابق (1514ء) کو لاہور میں پیدا ہوا اور یہیں 997 ہجری بمطابق عیسوی) (1588 میں فوت ہوا۔ وہ ولی بدخشاں کے نام سے جانا جاتا تھا۔ وہ تیمور کی چھٹی پشت سے تھا۔ اس کی بیوی خرم بیگم نہایت چالاک عورت تھی۔ اس نے اپنے خاوند کو قبضہ میں کر رکھا تھا۔ اس نے شہزادہ کامران کی بیوہ محترم خاناں کی شادی اس کی مرضی کے خلاف مرزا ابراہیم سے کر دی جس سے اس کا ایک بیٹا شاہ رخ پیدا ہوا۔

2۔ مرزا رستم :۔ ابن بہرام، ابن شاہ اسماعیل صفوی، اکبر نے اسے پنج ہزاری منصب پر فائز کیا اور ملتان جاگیر کے طور پر عنایت کیا۔ ایک وقت میں اسے لاہور کا حاکم بھی مقرر کیا گیا۔ اس نے شہزادہ دارا شکوہ کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کر دی اور 72 سال کی عمر میں 1051 ہجری (1641ء) کو شاہجہاں کے دور میں فوت ہوا۔

3۔ مرزا محمد :۔ خان کانال میر محمد اتگہ خاں کا بڑا بھائی تھا۔ وہ پنج ہزاری منصب پر فائز تھا اور اس نے کامران مرزا اور ہمایوں کے تحت بڑی نمایاں خدمات انجام دیں۔ اکبر نے اسے پنجاب کا حاکم مقرر کیا اور اس نے گکھڑوں کے ساتھ جنگ میں اپنا لوہا منوا لیا۔

4۔ سعید خاں :۔ یعقوب بیگ کا بیٹا تھا۔ اس نے اکبر کے دور حکومت میں بڑا مرتبہ اور مقام حاصل کیا، جس نے اسے شاہ قلی مہرام جو صوبہ میں غیر مقبول ہو چکا تھا، کی جگہ پنجاب کا حاکم مقرر کیا۔

5۔ خان خاناں مرزا عبدالرحیم :۔ بہرام خاں کا بیٹا تھا۔ وہ 946 ہجری بمطابق 1539 عیسوی لاہور میں پیدا ہوا۔ جب مہابت خاں نے پنجاب سے شہنشاہ جہانگیر کا قبضہ

برقرار رکھنے کے منصوبہ میں ناکامی کے بعد فرار کا راستہ اختیار کیا تو نور جہاں نے مہابت خاں کی مدد کے لیے مرزا عبدالرحیم کو مقرر کیا۔ اس نے فوجی مہم کے لیے اپنے پاس سے 12 لاکھ روپے کا عطیہ دیا۔ تاہم اس سے پہلے کہ اس منصوبہ پر عمل درآمد کیا جاتا، مرزا لاہور میں بیمار پڑ گیا اور دہلی پہنچنے پر 1036 ہجری 1626ء کو جہانگیر کی وفات سے ایک سال قبل 72 سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔ ان الفاظ سے اس کی تاریخ وفات نکلتی ہے:-

خان سپہ سالار کو

ترجمہ: "فوج کا کماندار خاں کہاں ہے۔"

6 - **زین خاں** :- ہرات کے خواجہ مقصود علی کا بیٹا تھا۔ وہ اکبر کے دور میں پانچ ہزار پانچ سو سپاہیوں کے دستہ کا سپہ سالار تھا۔ ہمایوں کی ایران کے لیے روانگی کے وقت وہ مسلسل اکبر کی والدہ کی خدمت پر مامور رہا اور ہر سرد و گرم میں شاہی گھرانے کے ساتھ منسلک رہا۔ دور حکومت کے اکتالیسویں سال اس کو قلی خاں کی جگہ کابل کا حاکم مقرر کیا گیا۔ اسی سال شہزادہ سلیم، زین خاں کی بیٹی کے عشق میں گرفتار ہوا اور پھر بعد میں اس سے شادی کر لی۔ اگرچہ اکبر اس پر خوش نہیں تھا۔ جلال خاں روشنائی کی موت کے بعد زابولستان میں فسادات کا خاتمہ ہو گیا۔ چنانچہ زین خاں کو لاہور بلا لیا گیا۔ وہ 1010 ہجری عیسوی) (1601 کو اکبر کے انتقال سے چار سال قبل فوت ہوا۔ وہ ایک بہت اچھا شاعر تھا اور موسیقی کے بہت سے ساز بجا لیتا تھا۔ موچی دروازہ کے باہر "میدان زین خاں" ابھی تک اس کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہاں پر زین خاں کا ایک باغ موجود تھا اور یہ جگہ بعد میں اس کے نام سے مشہور ہوئی۔

7 - **مرزا یوسف** :- میر احمد رضوی کا بیٹا تھا۔ وہ مشہد کا سید تھا۔ اکبر کو اس سے بہت زیادہ لگاؤ تھا۔ شاہ جہاں کے دور حکومت کے آغاز پر اس کو "صف شکن خان" کے خطاب سے نوازا گیا۔ وہ لاہور میں لوگوں کی صحبت سے بالکل الگ تھلگ زندگی گزارنے لگا۔ جہاں اس کو 12000 روپے پنشن ملی اور وہ 1055 ہجری (1645 عیسوی) میں فوت ہو گیا۔

8 - **مہدی قاسم خاں** :- کو اکبر نے چار ہزار دستہ کا کماندار بنایا۔ وہ 1001 ہجری (1592 عیسوی) میں فوت ہوا (68)۔

9 ۔ **شاہ قلی مہرام** :۔ تین ہزار پانچ سو کا سالار تھا۔ اس نے ہندوؤں کے ساتھ جنگ میں بڑے نمایاں جوہر دکھائے۔ " اکبر نامہ " کے مطابق یہ شاہ قلی ہی تھا جس نے ہیمو کے ہاتھی پر حملہ کیا تھا۔ ایک تیر کی بناء پر اس کی آنکھ میدان جنگ میں ضائع ہو گئی۔ اس کو اس وقت بالکل پتا نہ چل سکا کہ اس کا دشمن کون ہے لیکن فیل بان نے اس کو اس کی علامت بتا دی۔ شاہ قلی زخمی سپہ سالار کو اکبر کے پاس لایا۔ بیرام کی موت کے بعد شاہ قلی کو سلطنت کا " امیر " مقرر کیا گیا اور اکبر کے دور حکومت کے بیسویں سال میں اسے خان جہاں کے بنگال روانہ کیے جانے کی بناء پر پنجاب کا حاکم مقرر کیا گیا۔

10 ۔ **حسین خاں (ٹکڑیال)** :۔ وہ مہدی قاسم خاں کا بھانجا اور داماد بھی تھا۔ اپنی حکومت کے دوسرے سال اکبر نے اسے لاہور کا حاکم مقرر کیا۔ جب صفر 965 ہجری (1557ء) کو اکبر دہلی کی طرف روانہ ہوا تو اس نے حسین خاں کو پنجاب کا حاکم مقرر کیا۔ وہ کٹر سنی تھا اور جب اس نے اپنا عہدہ سنبھالا تو حکم جاری کر دیا کہ ہندو چونکہ کافر ہیں، اس لیے مسلمانوں سے امتیاز کے لیے وہ اپنے کندھوں کے قریب پٹکا (ٹکڑا) ڈالا کریں۔ اسی وجہ سے اس کو ٹکڑیال یا ٹکڑے والا کا نام دیا گیا(69)۔

11 ۔ **شیخ فرید بخاری** :۔ جب شہزادہ خسرو، لاہور میں لوٹ مار کرنے کی غرض سے آگرہ سے پنجاب کی طرف روانہ ہوا تو شیخ فرید کو بہت سے بخاری اور بارہ سیدوں کے ہمراہ اس کا تعاقب کرنے کے لیے روانہ کیا گیا۔ اس کی مدد کے لیے جہانگیر بھی مہابت خاں اور شریف خاں امیر الامراء کے ہمراہ روانہ ہوا۔ اس نے شہزادے پر حملہ کیا اور اسے شکست دی۔ جہانگیر کے دور حکومت کے پانچویں سال شیخ کو پنجاب کا حاکم مقرر کیا گیا۔ 1021 ہجری (1612ء) میں اس نے کانگڑہ جانے کی تیاری کی لیکن 1025 ہجری عیسوی) (1616 کو انتقال کر گیا۔ اسے لاہور میں دفن کیا گیا۔ اس نے لاہور میں ایک محلہ تعمیر کرایا، جو بعد میں اس کے نام سے مشہور ہوا(70)۔

12 ۔ **فرحت خاں** :۔ جب ہمایوں سرہند کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے لاہور سے روانہ ہوا تو وہ دیگر امراء کے ہمراہ مرزا کامران کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اسے لاہور کا صوبیدار مقرر کیا گیا۔ جب شاہ ابو المعالی کو پنجاب کا حاکم مقرر کیا گیا تو اس نے فرحت خاں کو باہر بھیج دیا۔ اکبر کی پنجاب میں آمد پر وہ اس کے ساتھ شامل ہو گیا۔

13 ۔ **خواجہ شمس الدین خوافی** :۔ خواف، خراسان کا ایک ضلع اور قصبہ ہے اور امیر

اسی جگہ کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد کا نام خواجہ علاء الدین تھا۔ ان کا خواف میں بہت احترام کیا جاتا تھا۔ شمس الدین کو یکے بعد دیگرے کابل کا دیوان اور صوبیدار اور بعد میں قلیج خان کی جگہ سلطنت کا دیوان بنایا گیا۔ دور حکومت کے 43 ویں سال اسے پنجاب کی عمل داری میں دے دیا گیا اور وہ 1008 ہجری بمطابق 1592 عیسوی کو لاہور میں وفات پا گیا۔ خواجہ نے بابا حسن ابدال جو حکیم ابو الفتح گیلانی کی جائے مدفون تھی۔ وہاں شہنشاہ اکبر کے حکم سے اپنا قبرستان بنایا تھا اور شمس الدین کو لاہور کے اس حصہ میں اپنے ہی تعمیر کردہ مقام پر دفن کر دیا گیا۔ اسی کے نام کی نسبت سے اسے خوافی پورہ کہا جاتا تھا۔

14 ۔ **میر مراد جو وانئی** (71) :۔ وہ ایک بہترین نشانہ باز تھا اور اکبر نے اسے شہزادہ خرم (شاہجہاں) کے لیے نشانہ بازی کا استاد مقرر کیا۔ وہ اکبر کی حکومت کے 46 ویں برس لاہور کے بدخشی کی حیثیت سے فوت ہوا۔

15 ۔ **مرزا قلیج خان** :۔ اس کو پنجاب کا حاکم بنایا گیا اور وہ روشنائیوں کے خلاف بڑی بے جگری سے لڑا۔ "معاصر" اسی سلسلہ میں ایک کہانی بیان کرتا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب مرزا نے عنان حکومت سنبھالی تو اس دور میں ان کو کس قدر خود مختاری حاصل تھی اور یہ کس طرح من مانیاں کرتے پھرتے تھے۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ جن کے نام مرزا چین قلیج اور مرزا لاہوری تھے۔ ان کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ یہ انتہائی بد طینت انسان تھے۔ موخرالذکر نے اپنے خادموں میں سے ایک کو منکر اور نکیر کے بارے میں کچھ جاننے کی بناء پر زندہ دفن کرا دیا۔ منکر و نکیر دو ایسے فرشتے ہیں جن کے بارے میں مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ وہ مرنے والے شخص کی قبر میں اس کی روح سے پوچھ گچھ کرتے ہیں اور اگر متوفی کا عقیدہ صحیح ثابت نہ ہو تو مردے کو لوہے کی آگ کی طرح دہکتی ہوئی گرزوں سے مارتے ہیں۔ جب اس آدمی کو قبر کھود کر باہر نکالا گیا تو وہ مر چکا تھا۔ ایک دوسرے موقع پر جب اس کا باپ حاکم لاہور تھا تو اس نے ہندوؤں کی ایک بارات میں ہل چل مچا دی اور دلہن کو زبردستی اٹھا کر لے گیا۔ مصیبت زدہ لوگوں نے اس کے باپ سے شکایت کی تو اس نے کہا کہ انہیں خوش ہونا چاہیے کہ ان کا تعلق لاہور کے صوبیدار سے ہے (72)۔

16 ۔ **مولانا حسام الدین** :۔ کا خاندانی نام سرخ تھا۔ وہ آبائی طور پر لاہور کے رہنے والے تھے۔ اپنے علم و فضل اور پاکیزگی کے لیے مشہور تھے۔ ان کے مطالعہ میں فلسفہ اور علم الکلام کے مضامین شامل تھے (73)۔

17 ۔ شاہ داؤد :۔ لاہور کے نزدیک جھانی میں قیام کرنے کی بناء پر جھانی وال کہلاتے تھے۔ وہ ایک صاحب علم شخص تھے۔ ان کا انتقال 982 ہجری بمطابق 1574 عیسوی ہوا۔

18 ۔ مولانا محمد :۔ لاہور میں رہتے تھے۔ 1004 ہجری بمطابق 1595 عیسوی تقریباً نوے سال کی عمر میں فوت ہوئے۔

19 ۔ مولانا عبدالسلام :۔ لاہور میں رہتے تھے۔ وہ عظیم فقیہہ تھے۔ انہوں نے بیہزاوی کی شرح بھی لکھی۔ شاہجہان کی حکومت کے پہلے برس نوے سال سے زیادہ عمر میں فوت ہوئے۔

20 ۔ مولانا اسحاق :۔ شیخ کاکو کے فرزند تھے اور لاہور میں رہتے تھے۔ وہ علم و فضل میں یکتائے روزگار تھے۔ شیخ سعد اللہ ، شیخ منور اور بہت سے دیگر علماء ان کے شاگردوں میں شامل تھے۔ وہ ایک سو سال سے زیادہ عمر میں فوت ہوئے اور انہیں لاہور میں دفن کیا گیا (74)۔

21 ۔ میر نوراللہ :۔ حکیم ابو الفتح نے انہیں اکبر سے متعارف کرایا تھا اور انہوں نے علم و فضل میں بہت شہرت حاصل کی۔ جب لاہور کے قاضی شیخ معین کو سبکدوش کیا گیا تو انہیں ان کا جانشین بنادیا گیا۔

22 ۔ مولانا جمیل :۔ بدایونی نے مولانا جمیل کا ذکر اکبر کے زمانے کے ایک نہایت عالم و فاضل شخص کے طور پر کیا ہے اور انہیں محلہ تلہ کا رہنے والا بتایا ہے ، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ لاہور کا ایک محلہ تھا۔

23 ۔ مولانا اسماعیل :۔ طبقات اکبری کے مطابق ، وہ اکبر کے دور حکومت میں لاہور کے مفتی تھے۔

24 ۔ شیخ منور :۔ وہ لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کا جیّد علماء میں شمار ہوتا تھا۔ انہوں نے بادشاہ کے حکم سے ٹھٹھہ (سندھ) کے ملا احمد اور قاسم بیگ کے ہمراہ شہروں اور ملکوں کے بارے میں لکھی گئی کتاب " مجمع البدان " کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ وہ ہندی کی ایک کتاب مشارق الانوار اور بادی البیان ، ارشاد قاضی وغیرہ ، کتابوں کے مصنف ہیں۔ جب بادشاہ کے حکم سے لاہور کے علماء و فضلا کو لاہور سے جلاوطن کیا گیا تو انہیں گوالیار بھیج دیا گیا جہاں وہ قید خانے میں 1011 ہجری بمطابق 1602 عیسوی انتقال کرگئے۔

25 ۔ جہانگیر :۔ سلطان سلیم نے 1606 عیسوی میں آگرہ کے مقام پر 38 سال کی عمر میں

تخت و تاج سنبھالا ۔ جہانگیر کا لقب اختیار کرنے کے بارے میں وہ اپنی سرگزشت میں لکھتا ہے:

ملہم غیب بخاطرم انداخت کہ کار بادشاہان جہانگیریست ۔ خود را جہانگیر نام نہم و لقب خود راچون جلوس در وقت طلوع ۔ حضرت نیر اعظم و نورانی گشتن عالم واقعہ شدہ نور الدین سازم ۔

ترجمہ: "کسی غیبی طاقت نے میرے ذہن میں یہ بات ڈال دی ہے کہ بادشاہوں کا کام دنیا کو فتح کرنا ہے ۔ اسی لیے مجھے خود کو جہانگیر (دنیا کو فتح کرنے والا) کہلوانا چاہیے ۔ جب میں نے عنان حکومت سنبھالی تو چونکہ سورج طلوع ہو کر دنیا کو روشنی عطا کر رہا تھا لہذا مجھے نور الدین (دین کی روشنی) کا لقب اختیار کرنا چاہیے ۔

پنجاب کی حاکمیت ، مغل قبیلے کے ایک سردار اور اکبر کے امراء میں سے ایک ممتاز امیر سعید خاں کے سپرد کی گئی ۔

لاہور کا محاصرہ

اس کے تخت و تاج سنبھالنے کے چھ ماہ بعد اس کے سب سے بڑے بیٹے خسرو نے کھلی بغاوت کر دی ۔ اس نے آگرہ سے لاہور آکر اس کا محاصرہ کر لیا ۔ شاہی سپہ سالار دلاور خاں پانی پت سے پیش قدمی کرتا ہوا لاہور آیا اور اس نے مرزا حسین اور عبدالرحیم دیوان اور لاہور کے کوتوال نور الدین قطب قلی کی مدد سے قلعہ اور شہر کا دفاع کیا ۔ اس کے بعد جہانگیر بھی ایک بہت بڑی فوج کی قیادت کرتے ہوئے وہاں پہنچا ۔ خسرو نے اپنے ساتھیوں سے وعدہ کیا کہ شہر پر قبضہ ہونے کے بعد انہیں سات دن کے لیے اس میں لوٹ مار کرنے کی اجازت دے دی جائے گی اور عورتوں و بچوں کو جنگی قیدی بنانے کی بھی اجازت ہو گی ۔ اس کے ساتھیوں نے دروازوں میں سے ایک کو نذر آتش کر دیا لیکن دلاور خاں اور شاہی فوج کے دیگر افسروں نے شہر کی دیواروں کے اندر دروازے پر دوسری رکاوٹ کھڑی کر دی ۔

جب خسرو کو شاہی فوج کی آمد کی اطلاع ملی تو اس نے سوچا کہ لڑائی کا خطرہ مول لینا ہی پڑے گا ۔ چنانچہ دونوں فوجوں کا آمنا سامنا بھیرن وال میں ہوا جو جالندھر اور امرتسر کے درمیان نصف راستہ میں واقع ہے ۔ ایک زبردست جنگ ہوئی ۔ اس میں شاہی فوج کی طرف سے شیخ فرید بخاری کی

قیادت میں بارہ کے سیدوں نے اپنی شجاعت کا لوہا منوایا۔ ان کی فوج کو دشمن پر مکمل فتح نصیب ہوئی اور ان میں سے چار سو کے قریب مارے گئے۔ دشمن کی فوج تتر بتر ہو گئی اور لاہور کا محاصرہ اٹھا لیا گیا۔ خسرو کو دریائے چناب عبور کرنے کی کوشش میں گرفتار کر لیا گیا اور اسے مرزا کامران کے باغ میں اپنے شہنشاہ باپ کے سامنے بیڑیاں ڈال کر پیش کیا گیا۔ اس کے دو سرکردہ مشیر حسین بیگ اور مرزا عزیز اس کے دائیں اور بائیں تھے۔ شہزادہ ان کے درمیان کھڑا رو رہا تھا اور اس کے جسم پر کپکپاہٹ طاری تھی۔ اس کو قید میں ڈال دیا گیا لیکن اس کے دونوں مشیروں کو جن کے نام اس سے پیشتر بیان کیے گئے ہیں، گائے اور گدھے کی کھالوں میں بند کر کے گدھوں پر بٹھا کر اس حالت میں شہر کا چکر لگایا گیا کہ ان کے منہ ان کی دم کی طرف تھے۔ مرزا کامران کے باغ (جو نولکھا کہلاتا تھا)، سے شہر کے دروازوں تک نوکیلے کھمبوں کی دو رویہ قطار بنا دی گئی اور 700 غداروں کو زندہ ان پر پرو دیا گیا۔ بادشاہ یہ سارا منظر اس شاہی شہ نشین میں بیٹھ کر دیکھ رہا تھا جسے اس کے والد نے قلعے کے بڑے مینار پر ہاتھیوں کی لڑائی دیکھنے کی غرض سے تعمیر کروایا تھا (76)۔ مجرم انتہائی کرب و اذیت میں ہلاک ہوئے۔ شہزادہ خسرو بھی شکستہ دل، آہوں اور آنسوؤں میں ایک ہاتھی پر سوار ایک زرد سے دو رویہ راستے کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ایک گرز بردار، بڑی شان و شوکت سے مزاح انداز میں اسے اپنے ساتھیوں کی طرف سے سلامی پیش کر رہا تھا۔ اس کی جان تو بخش دی گئی لیکن اسے سخت قید میں رکھا گیا۔ (75)

گورو ارجن:۔ گورو ارجن جو سکھوں کا چوتھا گورو مانا جاتا ہے اور جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے آدی۔ گرنتھ یا اپنے پیشروؤں کی تحریروں کی تدوین و تالیف کی تھی۔ اس پر الزام لگایا گیا کہ اس نے بادشاہ کے خلاف بنائے جانے والے منصوبوں میں خسرو کی مدد کی تھی۔ چنانچہ اسے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ بادشاہ اس واقعے کو اپنی خود نوشت میں کچھ اس طرح بیان کرتا ہے:

> "بیاس کے کنارے گووند وال میں ارجن نام کا ایک ہندو رہتا تھا۔ اس نے روحانی رہنمائی یا مشائخ کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ اس نے نہ صرف بہت سے بیوقوف ہندوؤں بلکہ کئی نادان اور غافل مسلمانوں کو بھی اپنی خواہشات اور فریب کا غلام بنایا ہوا تھا۔ وہ اس کی تقدیس کا خوب ڈھنڈورا پیٹتے تھے۔ اسے وہ گورو کہہ کر پکارتے تھے۔ اس کے چاروں طرف اس کے چیلے جمع رہتے تھے اور اس کی خوب عزت و تکریم کرتے تھے۔ انہوں نے اس فریب اور دھوکہ دہی کو تین یا چار نسلوں تک جاری رکھا۔ میرے دل میں کئی دفعہ یہ خیال آیا کہ میں اس فریب

کو ختم کر دوں یا گورو کو دین اسلام کی طرف راغب کروں ۔ حتیٰ کہ آخر کار اسی دور میں خسرو نے اس سمت میں دریا عبور کر لیا۔ گورو اس سے ملنا چاہتا تھا چنانچہ جہاں گورو کی رہائش تھی وہ بھی وہیں خیمہ زن ہو گیا۔ اس نے شہزادے سے ملاقات کی اور اسے بہت سی معلومات فراہم کیں۔ اس نے شہزادے کی پیشانی پر زعفران سے نشان بنایا جس کو ہندوؤں کی خاص بولی میں کشکا کہا جاتا ہے۔ وہ اسے اچھے شگون کی علامت کے طور پر لگاتے ہیں۔ میں کیونکہ اس تصور کو بالکل فضول سمجھتا تھا چنانچہ میں نے جیسے ہی اس کے بارے میں سنا تو حکم جاری کیا کہ گورو کو میرے پاس لایا جائے۔ مرتضیٰ خاں کو حکم دیا کہ وہ اس کے بیٹوں، اہل خانہ اور رہائش گاہ کا انتظام اپنے پاس رکھے۔ اس کی تمام جائیداد بحق سرکار ضبط کر لی گئی اور خود اسے قید بامشقت میں رکھا گیا۔ "

ارجن قید کی سختیوں سے مر گیا حالانکہ اس کے پیرو کار اس کی موت کو ایک معجزہ سمجھتے ہیں۔

جہانگیر کو لاہور سے بہت لگاؤ تھا چنانچہ کابل اور کشمیر جاتے وقت اپنا دربار یہاں منعقد کرتا۔ لاہور کے معاملات کو درست کرنے کے بعد شہنشاہ نے اپنی حکومت کے پہلے سال قلیچ خاں کو حاکم مقرر کیا اور کابل کا دورہ کرنے کے لیے چلا گیا(78)۔ اگلے سال جب عراق اور خراسان کے امراء، ایران کے ایلچی اور شریف مکہ کے نمائندے نے بادشاہ سے ملاقات کی تو اس وقت دربار لاہور میں منعقد کیا گیا۔ ان کے لیے بادشاہ نے تحائف پیش کیے جن کی مالیت ایک لاکھ روپیہ تھی۔

حکومت کے پانچویں سال شیخ فرید بخاری، جس نے بیاس کے کنارے خسرو کو شکست دی تھی اور جسے "مرتضیٰ خان" کا خطاب عطا کیا گیا تھا، اسے پنجاب کا حاکم مقرر کیا گیا۔ لاہور میں اس نے ایک محلہ، ایک بہت بڑا حمام اور چوک تعمیر کرایا، جو بعد میں اس کے نام سے مشہور ہوا (79)۔

بادشاہ نے اپنی سرگزشت میں ایران کے شاہ عباس سے اپنی دوستی کا بڑے والہانہ انداز میں ذکر کیا ہے اور اسے اپنا "بھائی عباس" کہا ہے۔ ایرانی بادشاہ کی طرف سے موصول شدہ خطوط کا حوالہ بادشاہ نے اس اچھی رائے کے ثبوت کے طور پر دیا ہے جو اس کے دل میں پہلے ہی سے موجود تھی۔ یہ خطوط نہایت دلچسپ ہیں۔ یہ صرف شاہی فصاحت اور بلاغت کا نمونہ ہی نہیں بلکہ اس سے برادرانہ تعلقات کا اظہار بھی ہوتا ہے جو ان دونوں قوموں کے اتنا دور ہونے کے باوجود ان میں

قائم تھے۔

بادشاہ اور حرم سرا کو وزیر اعظم آصف خاں کی طرف سے لاہور میں دی جانے والی ایک شاندار دعوت کا ذکر بڑے پر جوش انداز میں کیا گیا ہے۔ ان موقعوں پر لاکھوں روپے مالیت کے تحائف اور انوکھی اشیاء کا تبادلہ کیا گیا۔

بادشاہ کو راوی کے پار واقع باغ دلآویز اور شہر کے نواح میں واقع باغ مرزا کامران بہت پسند تھے۔ اس نے حرم سرا اور امراء کے ہمراہ وہاں بڑے پر مسرت دن گزارے۔

بادشاہ کو شکار سے بڑا لگاؤ تھا۔ لہذا اس نے جہانگیر آباد یا ہرن مینار موجودہ شیخوپورہ کا مسلسل دورہ کیا۔

ایک شاہی ہرن جسے (ہنس راج) مانس راج کہا جاتا تھا اور بادشاہ اسے بہت عزیز رکھتا تھا، دور حکومت کے دوسرے سال یہاں مر گیا۔ بادشاہ نے حکم جاری کیا کہ اس کی قبر پر ایک شاندار یادگار تعمیر کی جائے۔ اس کے اوپر جانور کی جسامت کے برابر پتھر کا مجسمہ نصب کیا گیا۔ اس عمارت پر نصب کی جانے والی پتھر کی تختی پر مندرجہ ذیل عبارت بزبان فارسی کنندہ ہے:۔

"درین فضائی دلکش اھوئی بدام جہاندار خدا آگاہ نورالدین جہانگیر بادشاہ آمدہ در عرض یک ماہ از وحشت صحرایت بر آمدہ سر آمدہ اھوان خاصہ گشت۔

ترجمہ: "اس خوبصورت مقام پر خدا ترس بادشاہ نورالدین جہانگیر نے ایک ہرن پکڑا۔ جس نے ایک ماہ کے عرصہ میں اپنی وحشت اور جنگلی عادات کو چھوڑ دیا اور شاہی ہرنوں کا سردار بن گیا۔"

یہ عبارت فن خطاطی میں یکتائے روزگار ملا محمد حسین کشمیری کی تحریر کردہ تھی۔ اس مرنے والے جانور کی یاد کو قائم رکھنے کے لیے بادشاہ نے حکم جاری کر دیا کہ کوئی ہندو یا مسلمان اس مقام پر اور اس کی حدود میں ہرن کا شکار نہیں کرے گا۔

اسی سال سلطان شاہ افغان جس نے خسرو کو قید سے فرار ہونے میں مدد دی تھی، اس کو حضر آباد کے میر مغل کروڑی نے گرفتار کر لیا اور بادشاہ کے حکم سے لاہور کی جلسہ گاہ میں تیر باران (تیروں کا نشانہ بنا دیا) کر دیا۔

شوال کی یکم تاریخ کو شہنشاہ نے لاہور کے ایک خدا رسیدہ بزرگ مولانا محمد امین کے پاس حاضری دی۔ وہ اپنی حاضری کی مندرجہ ذیل دلچسپ چیدہ چیدہ باتوں کے بارے میں لکھتا ہے:۔

"یکم شوال کو میں نے شیخ محمد کمال کے ایک مرید، مولانا محمد امین سے ملاقات

کی۔ شیخ محمود اپنے زمانے کے نہایت خدارسیدہ بزرگ تھے اور اس کے مرحوم بادشاہ جنت آشیانی (ہمایوں) ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ایک دفعہ بادشاہ نے خود اپنے ہاتھوں سے ان کے ہاتھوں پر پانی انڈیلا۔ مذکورہ بالا، مولانا نہایت پاکباز بزرگ ہیں، ان کا دنیاداری سے تعلق ہونے کے باوجود، وہ اپنے کردار کی آزادی اور اطمینان میں ممتاز مقام رکھتے ہیں اور انہیں اپنی روح پر قابو ہے۔ مجھے ان کی صحبت سے بڑی مسرت حاصل ہوئی۔ میں نے ان کے سامنے اپنی چند باطنی پریشانیوں کا ذکر کیا۔ انہوں نے مجھے مکمل طور پر ہدایت دی اور ان کی گفتگو سے مجھے قلبی و ذہنی طور پر خوشی مل رہی تھی اور تسلی ہو رہی تھی۔ امداد کے طور پر ان کے نان نفقہ کے لیے ایک ہزار بیگھہ زمین اور ایک ہزار روپے نقد انہیں پیش کرنے کے بعد میں وہاں سے آگیا۔"

لاہور میں پیش آنے والے مندرجہ ذیل واقعہ کو دور حکومت کے 9 ویں سال میں درج کیا گیا۔

"ان دنوں لاہور کی خبریں لکھنے والا اس بات کی خبر دیتا ہے کہ تیر کے مہینے کے قریب دس آدمی لاہور سے ایمن آباد کے لیے روانہ ہوئے جو دارالخلافہ سے 12 کوس کے فاصلے پر ہے۔ ایک نہایت گرم ہوا چلنا شروع ہو گئی۔ انہوں نے ایک درخت کے سائے تلے پناہ لی۔ جب وہ اس انتہائی گرم آندھی اور لو میں گھر گئے تو ان پر کپکپاہٹ طاری ہو گئی اور ان میں سے نو اسی وقت موقع پر ہلاک ہو گئے۔ ان میں سے ایک آدمی جو بچ رہا تھا وہ کافی عرصہ تک بیمار رہا اور وہ بڑے جتن اور مصیبتوں سے تندرست ہوا۔ درختوں پر جتنے بھی پرندے تھے مر کر نیچے گر پڑے۔ ان حصوں میں موسم اس حد تک مہلک ہو چکا تھا کہ جنگلی جانوروں نے اپنے آپ کو میدانوں میں گرا دیا۔ انہوں نے گھاس پر لوٹتے ہوئے جان دے دی۔ اسی طرح لاتعداد جانور ہلاک ہو گئے۔"

مہلک وباء:۔ دور حکومت کے دسویں سال پنجاب میں ایک نہایت مہلک وباء پھیل گئی اور لاہور بھی اس کی لپیٹ میں آگیا۔ سارے کا سارا سرہند اور دہلی تک دوآب کا علاقہ اس بیماری کی وجہ سے اجڑ گیا اور ہزاروں گاؤں برباد ہو گئے۔ جہانگیر نے اسے دو سال کی خشک سالی یا قحط سے منسوب کیا ہے، جس سے علاقہ بری طرح متاثر ہوا اور یہ کوئی خاص قسم کا زہر تھا جس کی وجہ سے فضا میں

بیماری پھیل گئی۔ جہانگیر کے حکم سے آگرہ سے لاہور تک پہلے ہی سڑکوں کے دونوں جانب سایہ دار درخت لگا دیے گئے تھے۔ بادشاہ نے اپنے دور حکومت کے چودھویں سال آگرہ سے لاہور تک ہر کوس کے فاصلہ پر ایک مینار (جسے کوس مینار کہا جاتا تھا) اور مسافروں کی سہولت کے لیے جی ٹی روڈ پر ہر تین کوس کے فاصلے پر پکا کنواں تعمیر کرنے کا حکم صادر کیا(80)۔

حضرت میاں میرؒ :۔ حضرت شیخ محمد میرؒ المعروف میاں میرؒ جو لاہور کے صوفی بزرگ تھے ، سے ان کی تقدیس اور علم و فضل کی وجہ سے شہنشاہ ملاقات کرنے کا بہت خواہشمند تھا اور اس وقت خود لاہور نہ جاسکنے کی بناء پر اس نے انہیں اپنی حکومت کے چودھویں سال آگرہ تشریف لانے کی دعوت دی۔ درویش بزرگ نے دعوت قبول کر لی۔ بادشاہ اس ملاقات کے نتیجہ سے بہت خوش ہوا۔ اس نے اپنی سرگزشت میں ان صوفی بزرگ کی روحانی طاقت اور علم و فضل کا ذکر بڑے واشگاف انداز میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

" حقیقی طور پر وہ خدا کے پیارے ہیں۔ تقدس اور روح کی بالیدگی کے معاملہ میں اس وقت کوئی ان کا ہمسر نہیں ہے۔ یہ ادنیٰ خادم (یعنی شہنشاہ) اس درویش بزرگ کے پاس جایا کرتا تھا۔ انہوں نے اسے علم الکلام کے بہت سے نکات تفصیل سے سمجھائے۔ میری یہ خواہش تھی کہ میں انہیں کچھ روپیہ پیسہ پیش کروں لیکن چونکہ وہ دنیاداری کی چیزوں سے بالاتر تھے اس لیے میں اس پیش کش کی جرات نہ کر سکا اور ان کی جائے نماز کے لیے ایک ہرن کی کھال پیش کر کے اطمینان حاصل کر لیا۔ پھر وہ فوراً لاہور کے لیے روانہ ہوگئے۔ "

کشمیر کا دورہ کرنے کے بعد بادشاہ نے اپنی حکومت کے پندرہویں سال دربار مستقل طور پر لاہور میں منتقل کر لیا۔ وہ جہانگیر آباد سے لاہور آیا کرتا تھا۔ شہنشاہ نے اپنی تزک میں ان مقامات کا بیان بڑی دلچسپی سے کیا ہے:۔

" الہیٰ " کے مہینہ کی 25 تاریخ کو شاہی پڑاؤ جہانگیر آباد میں قائم کیا گیا۔ جب میں شہزادہ تھا تو یہ میری شکار گاہ تھی۔ یہاں میں نے اپنے نام سے ایک گاؤں کی بنیاد رکھی اور یہاں ایک شاندار عمارت تعمیر کرانے کے لیے اس کا انتظام اپنے کیراول ، سکندر مبین کے سپرد کیا۔ عنان حکومت سنبھالنے کے بعد میں نے اسے ایک پرگنہ میں تبدیل کر دیا اور اسے ایک جاگیر کے طور پر سکندر کو بخش دیا۔ اس کے بعد میں نے یہاں ایک محل بمعہ ایک تالاب اور مینار کے تعمیر کرنے کا

حکم دیا۔ سکندر کی وفات کے بعد یہ جائیداد ارادت خاں کو جاگیر میں دے دی گئی۔ اس کے پاس بھی ان عمارات کا انتظام تھا۔ تقریباً اسی دور میں ان عمارتوں کی تعمیر مکمل ہو گئی۔ تالاب بہت بڑا اور شاندار تھا۔ اس کے درمیان میں ایک دلکش اور خوشگوار عمارت بنائی گئی تھی۔ ان عمارتوں کی کل قیمت یا لاگت ایک لاکھ اور پچاس ہزار روپے تھی۔ شکار گاہ واقعی بادشاہوں کے شان شایان تھی۔ ہم جمعہ ہفتہ کو یہاں ٹھہرتے اور مختلف شکاروں سے دل بہلاتے تھے۔ لاہور کے حاکم قاسم خاں نے یہاں حاضری دی اور سونے کی پچاس مہریں تحفہ کے طور پر پیش کیں۔ لاہور کے دریا کے کنارے اس جگہ سے ایک منزل دور مومن عشق باز کا باغ تھا۔ شاہی پڑاؤ اسی جگہ قائم کیا گیا۔ اس باغ میں عمدہ پودوں، سرو کے شاندار درختوں اور آم کے درختوں کو لگایا گیا تھا۔ محرم کی 5 تاریخ اور الٰہی مہینے کی 9 تاریخ کو 1031 ہجری میں، ہم اپنے ہاتھی، جسے اندر کہا جاتا تھا، پر سوار ہو کر مومن کے باغ سے روانہ ہوئے اور راستے میں دولت نچھاور کرتے ہوئے، ہم شہر کی طرف بڑھے۔ تین گھڑیوں اور سورج کے طلوع ہونے کے دو گھنٹے بعد ایک مبارک لمحہ میں، ہم محل میں داخل ہوئے اور لوگوں کی مبارکبادوں اور پرجوش عقیدت کے درمیان، ہم نے ان عمارتوں میں قدم رنجہ فرمایا، جنہیں حال ہی میں مامور خاں کے زیر انتظام تعمیر کرایا گیا تھا۔

ان محلات کی خوبصورتی اور حسن و جمال کے بارے میں بادشاہ لکھتا ہے:۔

بے تکلف منازل دلکشا و نشیمن ھاے روح افزاء درغایت لطافت و نزاہت ھمہ منقش و مصور بعمل اومستان دان نادرہ کار آراستگی یافتہ باغہائی سبز خورم بانواع و اقسام گل و ریاحین نظر فریب گشتہ

زفرق تابقدم ھر کجا کہ منگرم

کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا این جاست

بالجملہ مبلغ ھفت لکھہ روپیہ کہ بیست و سہ ہزار تومان

رائج ایران باشد صرف این عمارت شدہ

ترجمہ: "یہ عمارتیں نہایت پرتکلف اور دلکشا ہیں اور یہ مسکن بڑے خوبصورت اور دلکش ہیں۔ ان کو اس دور کے ماہر فنکاروں کی نہایت لطیف اور نزاکت والی

تصاویر اور نقش و نگار سے مزین کیا گیا ہے اور ان کو دلفریب باغات سے آراستہ
کیا گیا ہے۔ ان باغات میں خوب سبزہ اور انواع و اقسام کے خوشبودار پھول ہیں۔
میں نے سر سے پاؤں تک مشاہدہ کیا ہے۔
اور ہر قدم پر اس کی خوبصورتی نے میرے دل کو لبھایا اور مجھ سے کہا، "یہ جگہ
تمہارے لیے ہے۔"
اور اس عمارت پر مبلغ سات لاکھ روپے جو ایران کے موجودہ سکہ 23 تومان
کے برابر ہیں، کی لاگت آئی۔" (81)

شہنشاہ بڑے فخر سے کانگڑہ کے قلعہ کے قبضہ کے بارے میں لکھتا ہے کیونکہ اب تک وہاں کوئی بھی مسلمان حملہ آور نہیں پہنچ سکا تھا۔ سلطان فیروز شاہ نے ایک بہت بڑی فوج کی قیادت کرتے ہوئے اس پر حملہ کیا لیکن اسے ناکامی ہوئی۔ اکبر کی فوج نے خان جہاں کی زیر قیادت اس پر حملہ کیا۔ لیکن محاصرہ اٹھا لیا گیا۔ عبدالعزیز خاں نقشبندی کو کانگڑہ کا قلندر مقرر کیا گیا۔ بعد ازاں خود شہنشاہ جہانگیر نے بھی اس کا دورہ کیا۔

شاندار دعوتیں :۔ بادشاہ نے شہزادہ خرم کے نئے محل کا معائنہ بھی کیا اور قاسم خاں کی دعوت کو بھی قبول کر لیا۔ اس سے پیشتر بھی بادشاہ نے قاسم خاں کے لاہور کے نواح میں واقع باغات کا دورہ کیا تھا اور راستے میں دس ہزار روپے نچھاور کیے تھے۔ لاہور کے حاکم نے دیگر تحائف کے علاوہ بادشاہ کو نہایت خوبصورت اور شاندار، لعل اور ایک ہیرا تحفے کے طور پر پیش کیا۔

اس سال (دور حکومت کے پندرہویں سال) کو لاہور میں بادشاہ کے پانچویں بیٹے شہریار کے صاحبزادے کی نور جہاں کی علی قلی بیگ ترکمان سے پیدا ہونے والی لڑکی اور بادشاہ کے وزیر اعظم اعتماد الدولہ نادر الملک کی پوتی سے منگنی کے موقع پر ہونے والی خوشیوں اور جشن کے حوالے سے یادگار سمجھا جائے گا۔ بادشاہ نے لاکھوں روپے مالیت کے قیمتی تحائف "سچک" یا منگنی کے تحفہ کے طور پر بھیجے۔

وزیر اعظم نے شاہی امراء کو لاہور میں اپنے نئے محل میں ایک بہت بڑی دعوت دی۔ بادشاہ بڑے خوبصورت پیرائے میں اس محل کے بارے میں لکھتا ہے۔ اس کو شاندار کمروں اور پرشکوہ دیوان خانوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ بادشاہ اور حرم کی بیگمات نے اپنی تشریف آوری سے اس کو رونق بخشی اور بوڑھے وزیر نے ان کی خوب آؤ بھگت کی۔ اس کے بعد بادشاہ آگرے کی طرف روانہ ہو گیا۔

راستے میں جالندھر کے قریب واقع اپنی نئی سرائے جس کو نور سرائے محل کہا جاتا تھا۔ نور جہاں نے بادشاہ کی دعوت کی۔ بادشاہ لکھتا ہے: اس مقام پر نور جہاں کے گماشتوں نے ایک وسیع سرائے تعمیر کی اور بادشاہوں کے شایان شان ایک باغ بھی لگایا۔ یہ عمارتیں اس وقت مکمل ہو چکی تھیں۔ بیگم نے دعوت قبول کرنے کی استدعا کی۔ لہذا میں نے اس کے لیے اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ اس نے ایک ایسی دعوت کا انتظام کیا جو اپنی خوبصورتی اور رنگ برنگی تقریبات میں تمام سابقہ دعوتوں پر سبقت لے گئی۔ اس نے نہایت قیمتی اور انوکھے تحائف مجھے پیش کیے۔ میں نے اس کے احترام میں اور دل رکھنے کے لیے ان میں سے چند منتخب کر لیے۔ میں وہاں دو روز تک ٹھہرا۔ اس کے بعد میں نے صوبہ پنجاب کے دیوان میر قوام الدین کو لاہور واپس جانے کی اجازت دے دی۔

حاکم لاہور کا تقرر:۔ دور حکومت کے انیسویں سال مین یمین الدولہ آصف خاں کو صادق خاں کے بعد لاہور کا حاکم مقرر کیا گیا۔ اس کے فیاضانہ انتظامات کے تحت لاہور بہت خوشحال رہا۔ فن تعمیرات میں دلچسپی ہونے کی بناء پر اس نے شہر اور قلعہ کو نہایت آراستہ و پیراستہ کر دیا۔ بادشاہ کا انجام قریب تھا لیکن اس کی چہیتی بیوی نور محل کی باغیانہ روش نے اس کے آخری ایام کو نہایت تلخ بنا دیا۔ اس کو اس کی ماں اور باپ (دونوں اس وقت تک فوت ہو چکے تھے) نہایت قیمتی مشورے دیتے رہے تھے جن پر عمل کر کے اس نے شاہجہاں کو اس کی قانونی وراثت سے محروم کرنے اور اپنے داماد شہریار کے مفادات کی خاطر سلطنت کو غصب کرنے کے لیے اپنے طور پر منصوبے بنانے شروع کر دیے۔ حصار اور دوآب میں واقع شاہجہاں کی جاگیر کو ضبط کر کے شہریار کو دے دیا گیا اور شہزادے سے کہا گیا کہ وہ اس جاگیر کے بدلہ میں اس کے برابر دکن اور گجرات کا علاقہ لے لے۔ اس چیز نے شہزادے کو بغاوت پر آمادہ کر دیا (82)۔

بادشاہ کشمیر میں بیمار پڑ گیا اور جب 1628ء میں لاہور کی طرف آ رہا تھا تو راستے میں راجوڑی کے مقام پر اپنے دور حکومت کے بائیسویں سال میں فوت ہو گیا۔ اس کے جسد خاکی کو مقصود خاں کے انتظام میں لاہور لایا گیا اور مرحوم کی خواہش کے مطابق جمعۃ المبارک کی صبح کو دریائے راوی کے کنارے پر نور جہاں کے باغ میں دفن کیا گیا۔

شاہ جہاں:۔ سلطان خرم (شاہجہاں) 30 ربیع الاول 1000 ہجری بمطابق 1592ء کو لاہور میں پیدا ہوا۔ اس کی ماں، مارواڑ کے رانا اودھے سنگھ کی بیٹی تھی۔ جب 1616ء میں وہ دکن کی فوج کا سپہ سالار اور شہنشاہ کا جانشین مقرر ہوا تو اس کو باپ کی طرف سے شاہجہان کا خطاب ملا۔ جب بادشاہ کا انتقال ہوا تو شاہ جہاں دکن میں تھا۔ نور جہاں کی خواہش تھی کہ وہ شہریار کو (جس کے

ساتھ اس نے اپنی بیٹی جو شیر افگن سے تھی شادی کی تھی) تخت و تاج دلا دے۔ شہریار اپنی حرکتوں کی بناء پر عام طور پر ناشدنی کے نام سے مشہور تھا۔ جب اس نے بادشاہ کی موت کی خبر سنی وہ اس وقت لاہور میں موجود تھا۔ اس نے اپنی سازشی بیوی کے اکسانے پر خود بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس نے لاہور میں شاہی خزانے اور دیگر سرکاری اداروں پر قبضہ کر لیا۔ اس نے سپاہیوں اور امراء کی حمایت حاصل کرنے کے لیے تحفے تحائف کی صورت میں 70 لاکھ روپے ضائع کر دیے اور اپنے گرد پندرہ ہزار آدمیوں کی فوج اکٹھی کر لی۔ دریں اثناء یمین الدولہ، آصف خاں جو خان اعظم (ارادت خاں) کے ساتھ مل کر کام کر رہا تھا، اس نے بھمبر کے قریب خسرو کے بیٹے داور بخش عرف بولاکی کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس کارروائی سے اس کا مقصد یہ تھا کہ بغاوت کے امکانات سے احتراز کیا جائے اور شہزادہ خرم کے دارالخلافہ پہنچنے اور شاہی القابات اختیار کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت حاصل کیا جا سکے۔ بولاکی، بادشاہ کی حیثیت سے سلامی لیتا ہوا لاہور کی طرف بڑھا۔ نیز اس کی زیر قیادت شاہی دستوں کا شہر سے تین کوس کے فاصلے پر شہریار کی باغی فوجوں سے آمنا سامنا ہوا۔ مؤخرالذکر نے جب یہ محسوس کیا کہ وہ شاہی فوجوں کا مقابلہ نہیں کر سکے گا تو وہاں سے بھاگ نکلا۔ شہریار قلعہ کے زنان خانے میں چھپ گیا لیکن اگلے روز ایک خواجہ سرا نے اسے باہر نکال دیا۔ اسے قید میں ڈال دیا گیا اور اس کے تین روز بعد اندھا کر دیا گیا۔

شاہجہاں نے لاہور میں بادشاہت کا اعلان کر دیا اور تمام مساجد میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ شہریار، داور بخش، اس کے بھائی گرشاسپ اور شرابی دانیال کے بیٹوں طہمورس اور ہوشنگ جنہوں نے اس معاملے میں شہریار کی حمایت کی تھی، کو لاہور میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

خدمت پرست خاں کو لاہور کا حاکم مقرر کیا گیا اور یمین الدولہ آصف خاں کو ہیرے جواہرات کے جڑاؤ کی تلوار، خنجر اور قیمتی سامان پر مشتمل خلعت سے نوازا گیا۔

اپنی جائے پیدائش ہونے کی وجہ سے شاہجہاں خاص طور پر لاہور ہی سے وابستہ رہا۔ "بادشاہ نامہ" کے مطابق، دور حکومت کے چوتھے سال تک، جب تک کہ معتمد خاں نے آگرہ میں ان کا بندوبست نہ کر دیا، جہانگیر کی بیگمات لاہور کے محل میں ہی رہیں اور شاہی خاندان کے شہزادگان بھی زیادہ تر عرصہ کے لیے ان ہی بیگمات کے ساتھ رہے۔ یہ جگہ امراء اور اہل علم حضرات کی آماجگاہ تھی۔ دارالحکومت میں ان کی آمد پر انہیں قیمتی تحائف سے نوازا جاتا۔ دور حکومت کے چھٹے سال لاہور میں بادشاہ شاہجہاں کی طرف سے قالین بافی کی صنعت کا قیام ایک قابل تعریف واقعہ ہے عبدالحمید کہتا ہے:

یہ قالین کس قدر نرم اور ملائم ہیں۔ ان کا مقابلہ اگر ایران کے بادشاہ کی صنعت میں تیار کردہ قالینوں سے کیا جائے تو وہ ان کے مقابلے میں کھردرا نمدہ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ پشم اور اون سے تیار کیے جاتے تھے۔ بالکل اسی طرح کی صنعت کشمیر میں بھی موجود ہے۔ شاہی محل کے تمام کمروں کو ان خوبصورت قالینوں سے سجایا جاتا تھا۔

عنان حکومت سنبھالنے کے بعد شاہجہان نے 1038 ہجری (1628ء) میں اپنا دربار لاہور میں منعقد کیا۔ حکیم علم الدین المعروف وزیر خاں اس وقت پنجاب کا حاکم تھا۔ عبدالحمید کی تصنیف " بادشاہ نامہ " میں شہنشاہ کی لاہور آمد کا واقعہ بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

" شاہی پڑاؤ، لاہور کے نواح میں واقع خواجہ ہوشیار کے تالاب سے روانہ ہونے کے بعد 7 رمضان المبارک کو دارالخلافہ پہنچا۔ شہر سے دور کچھ فاصلے پر وزیر خاں (جس نے ایک ہزار اشرفیاں اس پر نثار کر دیں)، لاہور کے امراء و زعماء اور صوبہ جات کے صوبیداروں نے بادشاہ کا بڑا پر شکوہ استقبال کیا۔ وہ دن کی پہلی گھڑی کے بعد محل میں داخل ہوا۔ 9 تاریخ کو وزیر خاں نے بادشاہ کو چار لاکھ روپے مالیت کے ہیرے جواہرات، سونا، چاندی کے ظروف، قیمتی سامان، گاؤ تکیے، قالین، گھوڑے اور اونٹ پیش کیے، جو اس نے پنجاب میں اپنی حکومت کے دوران جمع کیے تھے۔ اسی دن جب کابل کے صوبیدار سعید خاں کو شرف باریابی بخشا گیا تو اس نے بادشاہ کی خدمت میں ایک ہزار اشرفی ایک سو گھوڑے اور ایک سو اونٹ نذرانہ کے طور پر پیش کیے۔ ملتان کے حاکم قلیج خان نے اٹھارہ عراقی گھوڑوں کے علاوہ نادر ایرانی اشیاء کا تحفہ پیش کیا۔ کانگڑہ کے فوجدار نجابت خاں کا عہدہ بڑھا دیا گیا اور دیگر صوبیداروں کو بھی اسی طرح نوازا گیا۔ ان سب تحائف کی مالیت دس لاکھ روپے تھی۔ "

15 تاریخ کو بادشاہ نے جنت مکانی (جہانگیر) کے مقبرہ پر حاضری دی اور دس ہزار روپیہ غرباء میں تقسیم کر دیا جبکہ اس کے ہمراہ آنے والے شاہی خاندان کے شہزادوں نے پانچ ہزار روپے تقسیم کیے۔ بادشاہ جس کو فقیروں سے بہت زیادہ عقیدت تھی، اس نے حضرت میاں میرؒ کے آستانہ پر حاضری دی۔

مُلا عبدالحمید بیان کرتا ہے۔ " وہ ایک نہایت پاکباز اور خدارسیدہ انسان تھے، دنیا سے الگ تھلگ رہنے والے اور بہت کم گو تھے۔ بادشاہ نے یہ جانتے ہوئے کہ وہ دنیاوی دولت کی پرواہ نہیں کرتے، سفید کپڑے کی ایک دستار اور ایک تسبیح ان کی خدمت میں پیش کی اور ان کی دعائے خیر وصول کی۔ "

اسی مصنف کے بیان کے مطابق "اس نے 19 تاریخ کو لاہور کے ایک اور محترم بزرگ، فقیر، شیخ بلاولؒ کے در پر حاضری دی اور ان کی خدمت میں 2000 روپے نذرانے کے طور پر پیش کیے۔ تاہم انہوں نے یہ رقم اپنے دیگر مریدوں اور فقیروں میں تقسیم کر دی کیونکہ وہ اپنے پاس کچھ بھی نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کے خیرات خانے میں جو کچھ بھی آتا وہ سب خرچ کر دیتے۔"

شاہ جہاں کا نیا محل :- اب جبکہ دولت خانہ یا لاہور کے قلعے کو کافی عرصہ سے نظر انداز کیا گیا تھا اور اس پر کوئی توجہ نہیں دی گئی تھی چنانچہ جب شہنشاہ کو پنجاب کے دار الخلافہ میں آنے کا موقع میسر آیا تو اس نے غسلخانہ اور خواب گاہ کو ماہرین تعمیرات کے نقشوں کے مطابق از سر نو تعمیر کرنے کا حکم جاری کیا۔ ان عمارتوں کی نگرانی اور دیکھ بھال وزیر خاں کے سپرد کی گئی اور اسے حکم دیا گیا کہ وہ یہ سارے کام بادشاہ کی کشمیر سے واپسی تک مکمل کر لے۔ جنت مکانی (جہانگیر) کا تعمیر کردہ شاہ برج، شاہجہاں کو متاثر نہ کر سکا۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ اس کو مسمار کر کے از سر نو تعمیر کیا جائے اور اس کی تکمیل کا کام یمین الدولہ آصف خاں کے مزاج پر چھوڑ دیا گیا جو اس سے پہلے شاہی قلعے کی تزئین و آرائش کے سلسلہ میں سلیقہ مندی اور عقل سلیم کا مظاہرہ کر چکا تھا(83)۔

21 تاریخ کو یمین الدولہ آصف خاں نے، بادشاہ، شہزادگان اور بیگمات کی لاہور میں واقع اپنے نئے محل میں پر تکلف دعوت کی۔ اس محل کو اس نے بیس لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر کروایا تھا(84)۔ یمین الدولہ نے اس موقع پر شاہی خاندان کے افراد کو تحائف دینے کے علاوہ، بادشاہ کی خدمت میں چھ لاکھ روپے مالیت کے ہیرے جواہرات، قیمتی پارچہ جات، گھوڑے اور دیگر نادر اشیاء پیش کیں۔

21 تاریخ کے بعد جہانگیر آباد جو ہرن مینارہ (جدید شیخوپورہ) کے نام سے جانا جاتا ہے، میں تین دن ہرن کا شکار کھیلتے ہوئے گزارے گئے۔ ہرن اس علاقے میں بکثرت پائے جاتے تھے۔ بادشاہ اس تفریح سے بہت محظوظ ہوا کیونکہ یہاں شکار وافر مقدار میں تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ عمارت میرے خیال میں اس طرح تعمیر نہیں کی گئی جس طرح جنت مکانی (جہانگیر) بنوانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ ایک اچھوتے اور خوبصورت نقشہ کے مطابق نئی عمارت تعمیر کی جائے۔ یہ عمارت ایک سال کی مدت میں 80,000 ہزار روپے کی لاگت سے مکمل ہوئی۔ 24 تاریخ کو شاہی دستوں نے راوی کی جانب کوچ کیا۔ بادشاہ کی کشمیر سے واپسی پر وزیر خاں نے بادشاہ کی خدمت میں 50,000 ہزار روپے مالیت کا سونے کا سفری تخت، پچاس عراقی گھوڑے اور دو لاکھ روپے مالیت کی دیگر نادر اشیاء پیش کیں۔ بادشاہ نے ایک مرتبہ پھر صوفی بزرگ حضرت میاں میرؒ

اور حضرت شیخ بلاولؒ کے در اقدس پر حاضری دی۔

1041 ھ (1631ء) کو دربار دوبارہ لاہور میں منعقد کیا گیا۔ قندھار جو جہانگیر کے 17 سالہ دور حکومت سے ایرانیوں کے قبضہ میں چلا آرہا تھا، تقریباً اسی دور میں اس پر ہندوستان کے بادشاہ کے حکم سے اس کے حاکم علی مردان خان نے قبضہ کر لیا۔ اس نے لاہور میں شاہجہان کے دربار میں اس سے ملاقات کی۔ بادشاہ نے نہایت مشفقانہ انداز میں اس کا استقبال کیا اور اسے امیر الامراء مقرر کیا۔ محمد صالح لاہوری کی تصنیف، شاہجہان نامہ (عمل صالح) میں بادشاہ سے اس کی پہلی بالمشافہ ملاقات کا واقعہ بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے:۔

بادشاہ نے دکن میں جنگ ختم ہونے کے بعد اکبر آباد (آگرہ) کا دورہ کیا اور پھر لاہور روانہ ہو گیا۔ راجہ ٹوڈر مل کے تالاب کے کنارے لاہور کے صوبیدار وزیر خاں، کانگڑہ کے فوجدار شاہ قلی خاں اور لاکھی جنگل کے فوجدار بختیار خاں نے بادشاہ کی خدمت میں حاضری دی۔ ہر ایک نے اپنی بساط اور عہدے کے مطابق نذر پیش کی۔ رجب کی 15 تاریخ کو بادشاہ، ہوشیار خاں کے باغ سے روانہ ہو کر راستے میں سونا اور چاندی نثار کرتا ہوا ایک سعد گھڑی میں لاہور کے دولت خانہ (85)، (قلعہ) میں داخل ہوا(86)۔ میر بخشی یا توپ خانہ کے سردار، معتمد خاں اور نائب بخشی، تربیت خاں نے بادشاہ کے حکم کے تحت علی مردان خاں کا" خاص و عام" کے دروازے تک استقبال کیا اور اسے بادشاہ کے حاضرین دربار سے متعارف کرایا گیا۔ خان نے آداب بجا لاتے ہوئے بادشاہ کو ایک ہزار سونے کی مہریں نذر کے طور پر پیش کیں اور اس کے مقابلے میں اسے ریشمی اور سوزن کاری سے مزین پارچہ جات، جڑاؤ زیورات اور بمعہ سجاوٹی پر کے ایک دستار، جڑاؤ سے مزین ایک خنجر، ڈھال اور تلوار پر مشتمل خلعت سے نوازا گیا۔ اس کو 6000 افراد کے دستے کا امیر مقرر کیا گیا اور منقش باگوں والے دو گھوڑے اور چاندی کے ہودوں والے چار ہاتھی عنایت کیے گئے ان میں سے ایک ہاتھی اپنے قد و قامت کی وجہ سے کوہ شکن مشہور تھا۔ اعتماد الدولہ کی حویلی میں اس کی رہائش وغیرہ کا انتظام کیا گیا۔ مزید برآں قندھار سے اس کی رخصتی کی تاریخ سے لے کر لاہور پہنچنے کی تاریخ تک راستے میں اٹھنے والے تمام اخراجات جو دس لاکھ روپے کے قریب بنتے تھے، ان کی ادائیگی سرکاری خزانے سے کی گئی۔ اس کے خادموں کو بھی بیس ہزار روپے عنایت کیے گئے کیونکہ وہ زرخیز اور ٹھنڈے ملک سے تازہ دم ہو کر آیا تھا اس لیے بادشاہ نے بڑی خوشی سے اسے کشمیر کا حاکم مقرر کر دیا۔ اس کے داماد علی بیگ اور بیٹوں عبداللہ بیگ اور اسماعیل بیگ کو ریاست میں اعلیٰ منصب عطا کیے گئے۔

لاہور کی خوشحالی کا دور

اس دور میں لاہور اپنی شان و شوکت اور آب و تاب کے عروج پر تھا۔ لوگ اتنے خوشحال تھے کہ ماضی میں اس کی مثال نہیں ملتی تھی۔ بادشاہ کی قائم کردہ مثال کی تقلید کرتے ہوئے بہت سے امراء نے شہر کو خوبصورت عمارات سے آراستہ کر دیا اور محمد صالح لاہوری اپنی بہترین تصنیف "عمل صالح" میں اسی سلسلہ کے بارے میں بیان کرتا ہے کہ ان کئی امراء میں وزیر خاں اور علامہ افضل خاں کے نام بھی شامل ہیں جنہوں نے اسی دور میں لاہور میں نجی طور پر وسیع عمارتیں تعمیر کرائیں۔[1]

بادشاہ کے بے شمار فوجی مصاحبوں کے علاوہ شہزادوں کے جاذب نظر گھڑ سواروں کے دستے اور ریاست کے بیشمار نوابین و امراء کے مصاحبین، قندھار اور غزنی کے علاقوں کے صوبہ جات، نریدا اور تپتی کے حکام اور ان کے ساتھیوں کے بے پناہ لشکر نے جو بادشاہ کو خراج عقیدت پیش کرنے آئے تھے اس شاندار اور متاثر کن نظارے کو ملاحظہ کیا۔ یہاں پر غیر ملکی قوموں کے نمائندگان، بادشاہ کو دوستانہ خطوط یا اپنے اپنے ملک کی نادر اشیاء پیش کرنے کے لیے آئے۔ اسی دور میں بلخ کے امیر، والئ توران، ایران کے صفوی بادشاہ (87)، اور اجرہ کے حکمران علی پاشا کے نمائندے بھی لاہور میں آئے۔ بادشاہ کے پاس نذرانوں اور تحائف کی بہتات ہو گئی۔ اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی اس کی فیاضی اور سخاوت سے فیض یاب ہوتا تھا۔ اپنے باپ کے مقبرہ پر ہر مرتبہ حاضری دینے پر کسی طرح بھی دس ہزار سے کم روپے، مذہبی لوگوں اور اس ادارے سے منسلک دیگر متقی اور پرہیزگاروں میں تقسیم نہیں کرتا تھا۔ دیگر مواقعوں مثلاً عید میلاد النبیؐ، معراج شریف (جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری آسمان تک تشریف لے گئے) بادشاہ کی برسی، نو روز یا سال نو کا جشن، کے موقعوں پر شاید ہی کوئی غریب آدمی ہو گا جو بادشاہ کی سخاوت سے مستفید نہ ہوا ہو۔ ہزاروں روپے ان میں خیرات کے طور پر تقسیم کیے جاتے تھے۔ ہر معراج النبیؐ کی رات کو حفاظ اور شہر کے دیگر متقی و مذہبی آدمیوں میں دس ہزار روپے تقسیم کیے جاتے تھے۔ بادشاہ اپنے وزیروں اور امراء کے ساتھ بہت زیادہ مہربان تھا اور ان سے ملاقات کر کے انہیں عزت بخشتا تھا۔ لاہور میں قیام کے دوران علی مردان خان، علامہ افضل خان، علامہ وزیر خاں اور یمین الدولہ آصف جاہ نے یکے بعد دیگرے بادشاہ کی دعوت کی۔ ان میں سے ہر ایک نے کئی لاکھ روپے مالیت کے تحائف بادشاہ کو پیش کیے۔ یکم شوال کو عید کا تہوار آرہا تھا۔ بادشاہ بڑی شان و شوکت سے عید

گاہ روانہ ہوا۔ اس نے آتے اور جاتے وقت اپنے ہاتھی پر سے غریبوں اور ضرورت مندوں کو نوازنے کے لیے زر و سیم نچھاور کیے۔ لاہور میں چند ماہ قیام کرنے کے بعد بادشاہ براستہ پشاور اور علی مسجد، کابل کے لیے روانہ ہوا۔

اسی سال1631ء میں لاہور میں واپس آنے کے بعد بادشاہ کے حکم سے علی مردان خاں کو لاہور اور کشمیر کا حاکم مقرر کیا گیا اور اسے 7000 پیدل اور 7000 گھڑ سوار دستے کا امیر مقرر کیا گیا۔ لیلۃ البارات (شب بارات) کے موقع پر محل کو بڑے خوبصورت انداز میں سجایا گیا اور اس میں چراغاں کیا گیا۔ مُلّا عبدالحمید لکھتا ہے: خان کے منصب داروں نے اس کی ہدایت کے مطابق دیوان خاص اور دیوانِ عام کی بیرونی دیواروں جو کافی بلند تھیں، میں لکڑی کے تختوں کو مختلف آرائشی انداز میں نصب کر کے ان میں چراغ روشن کر دیئے۔ بادشاہ نے جھروکے میں بیٹھ کر اس چراغاں کا نظارہ کیا۔ علی مردان خاں نے ایرانی طرز کی آتشبازی کا بڑے نرالے انداز میں مظاہرہ کیا۔ رنگ برنگی اور مختلف اقسام کی آتشبازی کے مظاہرے سے بادشاہ بہت محظوظ ہوا۔ حسب معمول اس موقع پر بھی دس ہزار روپے خیرات کے طور پر غرباء میں تقسیم کیے گئے اور مُلّا عبدالحکیم سیالکوٹی اور ملا فاضل میں سے ہر ایک کو 400 اشرفیاں عنایت کی گئیں (88)۔

یہ علی مردان خاں کی تقلید کا اثر تھا کہ اس کے مصاحبین میں سے ایک شخص نہروں کی تعمیرات کے فن میں ماہر تھا۔ چنانچہ بادشاہ نے حکم دیا کہ جہاں سے دریائے راوی پہاڑیوں میں سے ہوتا ہوا میدانی علاقوں میں گرتا ہے، اسی مقام سے ایک نہر کھودی جائے تاکہ اس علاقے کو سیراب کیا جا سکے۔ علی مردان خاں کو نہر کی تعمیر کے لیے ایک لاکھ روپیہ فراہم کیا گیا۔ اس کے بعد 48 جریب کوس کے فاصلہ پر نور پور کے گاؤں راجپور سے لاہور کے نواحی علاقہ تک نہر کھودنے کی تیاری شروع کر دی گئی۔ بادشاہ نے دوسری مرتبہ کشمیر کا دورہ کیا۔ پنجاب کے دار الخلافہ میں واپس آ کر بادشاہ نے وزیر خاں کو آگرہ کا صوبیدار مقرر کیا۔ اس نے بادشاہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے عہدے پر کام شروع کر دیا۔ سلطان ترکی کے سفارتی نمائندے ارسلہ آقا کو پندرہ ہزار روپے مالیت کی خلعت عطا کی گئی۔ دربار مسلسل لاہور ہی میں منعقد ہوتا رہا۔ 1043 ہجری بمطابق 1633ء کو چنیوٹ کے ملا سعد اللہ، جسے موسادی خاں نے بادشاہ سے متعارف کرایا تھا، کو 1000 کا منصبدار بنایا گیا اور شاہی خاندان کے افراد کا نگران مقرر کیا گیا (89)۔

شالامار باغ کی تعمیر

اگلے سال علی مردان خاں کی نہر بھی 2 لاکھ روپے کی کل لاگت سے مکمل ہو گئی۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کے کنارے پر ایک وسیع و عریض باغ لگایا جائے جس میں دالان، حمام، تالاب اور فوارے بھی تعمیر کیے جائیں۔ چنانچہ 3 ربیع الاول کو اس باغ کی تعمیر کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور خلیل اللہ خاں کو حکومت کے دیگر ملازمین کے ہمراہ اس کی تکمیل کا کام سونپا گیا۔ جمادی الاول کی 4 تاریخ کو اس میں شجر کاری کا آغاز کیا گیا۔ اس میں پھول اور پودے لگانے کا کام شروع کر دیا گیا۔ بادشاہ نامہ میں اس میں لگائے گئے درختوں کے بارے میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ اس میں کابل اور قندھار سے پھلوں کے درخت بھی منگوا کر لگائے گئے۔ اسی سال آگرہ سے قولنج کے مرض کے باعث وزیر خان کے انتقال کر جانے کی خبر پہنچی۔ بادشاہ نے اس پر انتہائی افسوس اور دکھ کا اظہار کیا اور مرحوم کے بیٹوں سے ان کے والد کی موت پر تعزیت کی۔ 17 شعبان کو بادشاہ اپنے ایک اور وفادار خادم، ہندوستان کے سپہ سالار، اپنے سسر اور نور جہاں کے بھائی یمین الدولہ آصف خاں، خان خاناں سے محروم ہونا پڑا۔ بادشاہ کے حکم کے تحت اس کے جسد خاکی کو جنت مکانی (جہانگیر) کے مقبرہ سے مغرب کی جانب، جلو خانہ کے چوک کے قریب دفن کیا گیا اور اس کی یاد قائم رکھنے کے لیے ایک بہت بڑا گنبد بھی تعمیر کیا گیا۔ اس کے اہل خانہ کو تعزیتی خلعت عطا کیے گئے اور مرحوم وزیر کے حرم کی خواتین کو توڑے بھیجے گئے، ہر توڑا کپڑے کے 9 ٹکڑوں پر مشتمل تھا۔

مرحوم کے بیٹے شائستہ خاں کو جو بہار کا حاکم تھا خلعت سے نوازا گیا اور اس کے ساتھ بادشاہ کی طرف سے ایک تعزیتی خط جو اس نے خود تحریر کیا تھا روانہ کیا گیا۔ بادشاہ اس میں لکھتا ہے:۔

> مبازر الملۃ یمین الدولہ آصف خان خانخانان سپہ سالار او اخر روز پنجشنبہ ہفتدہم شہر شعبان المعظم داعی۔ یا ایتہا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیہ مرضیہ۔ را بلبیک اجابت تلقی نمودہ بہ نزھتگاہ جاودانی و آرام جائی دائی شتافت۔ دل حق شناس و خاطر حقیقت اساس کہ بان دانائی رموز سلطنت توجہ و انس تمام داشت از وقوع این قضیہ قرین تاسف و تاثر و تلہف و تحسر گردید۔ لیکن از انجا کہ سالکان مسالک تحقیق را درین قسم قضایا غیر از طریق مستقیم رضا و تسلیم مسلکی نیست۔

خاطر حق پسند را بقضا راضی ساختہ بصبر و خود سندی گرائیدیم۔ ان خانہ زاد شائستہ نیز بمقضائی عبودیت از منہج قویم صبر و شکیبائی تجاویز نموده خود را بسلامت ذات اشرف اقدس ماخر سند گردا اند و عنایت بیغایت بادشاہانہ را در بارہ خود افزون شناسد۔

ترجمہ: مبازر الملتہ، یمین الدولہ آصف خاں، خان خاناں سپہ سالار نے بدھ کی شام اور مقدس مہینے شعبان کی 17 تاریخ کو اس داعی اجل کو لبیک کہا جو فرماتا ہے کہ اے نفس مطمعنہ! اپنے رب کی مرضی سے راضی ہو جا۔ اس کے جواب میں اس نے کہا۔ میں حاضر ہوں اے میرے رب اور اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے وہ دائمی اور ہمیشہ قائم رہنے والی دنیا کی جانب کوچ کر گیا۔ سچ کی تلاش اور درست سوچ میں سرگرداں ہمارا ذہن جو حکومت کے معاملات میں الجھا ہوا ہے، اس موقع پر اور اس نقصان پر بہت غمگین ہے لیکن اب جبکہ سالکان نے اس سلوک کی راہ میں تحقیق کی ہے کہ اس پر تسلیم و رضا کے سوا اور کوئی چارا نہیں ہے۔ بہتری اسی میں ہے کہ آدمی راضی برضا ہو جائے اور اس پر صبر کرے اور اے بادشاہ کے خادم، تمہارے لیے ہماری پہلی نصیحت ہے کہ صبر و شکیبائی کی قوت سے تجاوز کیے بغیر تم یہ بات اپنے ذہن میں بٹھا لو کہ تمہیں ہماری سلامتی اور بہتری کے لیے اپنے آپ کو خوش رکھنا ہو گا اور ہمارے لیے دعا کرنی ہو گی۔ یاد رکھو کہ ہماری مہربانی و شفقت میں تمہارے لیے اضافہ ہوتا رہے گا۔

کشمیر میں قحط:۔ 1634ء میں کشمیر میں ایک زبردست قحط پھیل گیا۔ فصلوں کی کٹائی کے موسم میں زبردست بارشوں اور سیلاب کی وجہ سے کھڑی فصلوں کی بربادی کے بعد ہزاروں مفلس اور قلاش لوگوں نے اس علاقہ سے ہجرت کی اور لاہور میں داخل ہوگئے۔ ان مفلس لوگوں کی تعداد تیس ہزار سے بھی تجاوز کر چکی تھی۔ ان کے ایک وفد نے ایک صبح جھروکے کے درشن کے وقت حاضری دی۔ بادشاہ نے بڑی خوشی سے ان کے لیے ایک لاکھ روپے کی امداد کا اعلان کیا اور یہ حکم دیا کہ جب تک یہ لوگ دارالخلافہ میں ٹھہریں، انہیں روزانہ کھانا وغیرہ مہیا کیا جائے۔ اس کے علاوہ کشمیر کے قحط زدہ عوام کے لیے بھی پچاس ہزار روپے بھیجے گئے۔ ذوالحجہ کی 15 تاریخ کو بادشاہ نے علی مردان خاں کے گھر قدم رنجہ فرما کر اس کو رونق بخشی اور علی مردان خاں نے بادشاہ کی خدمت میں

1,80,000 روپے مالیت کے ہیرے جواہرات پیش کیے۔ مرحوم یمین الدولہ کے دیوان، رائے مکنہ داس کو 500 پیدل اور 100 گھڑ سوار دستے کا امیر مقرر کیا گیا اور اسے خالصہ کا دفتر دار (جائیداد کا نگران) مقرر کیا گیا جبکہ متوفی بہاری مل کو صوبہ پنجاب کا دیوان مقرر کیا گیا تھا۔

جب 1635ء میں بادشاہ کے چوتھے بیٹے شہزادہ مراد بخش کی شادی، شاہ نواز خاں صفوی کی صاحبزادی سے انجام پائی تو اس وقت دربار لاہور ہی میں تھا۔ اس موقع پر بہت زیادہ جشن اور خوشیاں منائی گئیں اور یہ تقریبات اور جشن کافی دنوں تک رہے۔ ان تقریبات کے بعد شہزادے کو ملتان کا حاکم بنا کر روانہ کر دیا گیا۔ جب شاہی باغات "فرح بخش" اور "فیض بخش" کی تکمیل ہو گئی تو بادشاہ نے اپنی آمد سے ان کو رونق بخشی (90)۔ سال کے اختتام پر بادشاہ نے دربار کو آگرہ منتقل کر لیا۔

1638ء میں بادشاہ نے کشمیر جاتے ہوئے ایک بار پھر لاہور کا دورہ کیا۔ وہ کیونکہ فیض بخش اور فرح بخش نامی باغات میں ہی زیادہ وقت ٹھہرا اس لیے اسے شہر میں داخل ہونے کا وقت نہ مل سکا۔ اس وقت قلیچ خاں پنجاب کا حاکم اور اس کا بھتیجا خنجر خاں، کانگڑہ کا فوجدار تھا۔ اسی سال علامہ سعد اللہ کو وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز کیا گیا اور اس کا عہدہ بڑھا کر 5000 ہزار سپاہی اور 2000 ہزار گھڑ سوار دستے کا امیر کر دیا گیا۔ بادشاہ 15 رمضان المبارک کو واپس لاہور آیا۔ اس کے ہر سفر میں اس کی با اعتماد بیٹی جہاں آراء بادشاہ بیگم (شہزادی) اس کے ساتھ ہوتی تھی۔ اس کو اپنی مرحومہ والدہ کے تمام اختیارات اور حقوق حاصل تھے۔ شاہ جہاں کے زمانے کے مؤرخین بیان کرتے ہیں، وہ غیر شادی شدہ تھی اور بڑی خوبصورت اور ہر لحاظ سے مکمل تھی۔ وہ اپنی بذلہ سنجی، سخاوت اور خوبصورتی کی وجہ سے اتنی مشہور نہیں جتنی اپنے شہنشاہ باپ سے محبت کی وجہ سے تھی۔ اس کو ساٹھ لاکھ روپے سالانہ وظیفہ ملتا تھا۔ اس کی والدہ کے دور میں صالح النساء خانم اس کے اہل خانہ کی منتظم اور اس کی مہر کی نگران تھی۔ بادشاہ کی اس کے ساتھ بہت زیادہ دلبستگی اور محبت تھی اور وہ اس کی مستقل ساتھی تھی اور اس کے آخری لمحات تک اس کے ساتھ رہی۔ اسی سال شوال کی 29 تاریخ کو جہانگیر کی بیوہ نور جہاں، جسے دو لاکھ روپے سالانہ وظیفہ ملتا تھا کا لاہور میں انتقال ہو گیا اور اسے اس کے بھائی آصف خاں کے مزار کے قریب اپنے تعمیر کردہ مقبرہ میں دفن کر دیا گیا۔ اگلے دو سال تک دربار لاہور ہی میں منعقد ہوتا رہا۔ حالانکہ بلخ اور بدخشاں کی جنگوں نے بادشاہ کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ پنجاب کے دارالخلافہ سے روانہ ہو کر کابل کا دورہ کرے۔ "بادشاہ نامہ" کے مطابق اس وقت صوبہ لاہور کی آمدنی 90 کروڑ، صوبہ ملتان کی 28 کروڑ اور صوبہ کشمیر

کی آمدنی 15 کروڑ تھی۔

1675ء کے سال میں امیر الامراء علی مردان خاں کشمیر جاتے ہوئے راستے میں اسہال کے باعث فوت ہو گیا۔ وہ بذریعہ کشتی ابھی ماچھی وارا تک ہی پہنچا تھا کہ اس کی بیماری مہلک صورت اختیار کر گئی۔ اس کا بیٹا ابراہیم خاں اس کی میت کو بذریعہ کشتی لاہور لایا اور اسے اپنی ماں کے مقبرہ میں دفن کیا۔ اس کے پاس 2000 سپاہیوں اور 500 گھڑسواروں کے دستے کے امیر کا عہدہ تھا۔ اس کے علاوہ 30 لاکھ روپے کا انعام بھی ملا تھا۔ بادشاہ کو اس کی موت پر سخت دکھ اور افسوس ہوا۔ مرحوم نے پسماندگان میں چار بیٹے، عبداللہ بیگ، ابراہیم خاں، اسماعیل اور اسحاق چھوڑے۔ یہ سب بادشاہ کی خدمت پر مامور تھے۔ فوج میں بھی ان کے منصب بڑھا دیے گئے۔ مرحوم نے اپنے عملہ میں بکثرت ملازمین کو شامل کیا ہوا تھا۔ بادشاہ نے ان کے لیے کافی سہولت پیدا کر رکھی تھی۔ اس کے دیوان محمد مقیم، گھریلو نگران، خواجہ اسماعیل، لشکر خاں اور دیگر عملہ کو شاہی ملازمت میں لے لیا گیا۔ مرحوم نے ایک کروڑ روپے مالیت کی جائیداد ترکہ میں چھوڑی۔ ان میں سے پچاس لاکھ روپے حکومت کے مطالبے پر مملکت کو واپس کر دیے گئے اور باقی تیس لاکھ روپے مرحوم کے بیٹوں میں سے سب سے زیادہ چہیتے بیٹے ابراہیم خاں کو دیئے گئے جبکہ باقی ماندہ بیس لاکھ روپے دیگر تینوں بیٹوں میں تقسیم کر دیے گیے۔

شاہ جہان کے دور حکومت میں مندرجہ ذیل مشہور افراد لاہور میں آباد ہوئے:۔

1۔ **شیخ محمد میر المعروف میاں میرؒ**:۔ بہت زیادہ شہرت کے حامل تھے۔ ان کی پرہیزگاری اور علم و فضل کی بناء پر ہر جگہ ان کا احترام کیا جاتا تھا۔ انہوں نے دنیا سے مکمل طور پر علیحدگی اختیار کی ہوئی تھی اور اپنا سارا وقت عبادت اور ریاضت کے لیے وقف کر رکھا تھا اور ان کے پاس عظیم روحانی قوت تھی۔ شاہجہاں نے کئی مرتبہ ان کے پاس حاضری دی اور وہ بادشاہ کے سب سے بڑے بیٹے دارا شکوہ کے روحانی پیشوا بھی تھے۔ " شاہجہاں نامہ " کے مطابق عالم گنج لاہور کے قریب غیاث پور گاؤں میں دفن کیے گئے(91)۔

2۔ **شیخ بلاول قادریؒ**:۔ انتہائی محترم اور متقی انسان تھے۔ وہ درویشوں کے ساتھ وابستہ رہتے اور غریبوں و محتاجوں کو کھانا کھلاتے تھے۔ ان کی گفتگو فصاحت اور بلاغت سے معمور ہوتی تھی۔ انہوں نے لوگوں کو اخلاق اور دین کی تعلیم دی۔ انہوں نے لاہور میں

ایک خیرات خانہ بھی قائم کیا جس میں سینکڑوں محتاجوں اور مفلسوں کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔
وہ شعبان کے مہینہ میں 1046 ہجری بمطابق 1636ء کو فوت ہوئے اور انہیں لاہور میں دفن کیا گیا۔

3۔ مُلّا شاہ :۔ بدخشاں کے رہنے والے اور ایک اعلیٰ پائے کے عالم فاضل شخص تھے۔ وہ 1023 ہجری (بمطابق 1614ء) میں لاہور آئے اور حضرت میاں میرؒ کے مرید ہوگئے۔
وہ الگ تھلگ رہ کر عبادت و ریاضت میں مصروف رہتے تھے۔ "شاہجہاں نامہ" کے مطابق انہوں نے اپنے روحانی پیشوا کی تقلید کرتے ہوئے شادی بھی نہیں کرائی تھی۔ وہ گرمیوں کے موسم میں کشمیر جایا کرتے تھے اور سردیوں کا موسم لاہور میں گزارتے تھے۔ بعد ازاں انہوں نے کشمیر کی طرف سفر کرنا چھوڑ دیا اور اپنے مرشد کے کہنے کے مطابق اپنی ساری زندگی لاہور میں گزار دی۔ وہ اکثر شاعری بھی کرتے تھے۔ ان کی شاعری میں دنیا کی بے ثباتی کے بارے میں زور دیا گیا ہے۔ انہوں نے لوگوں کو صراط مستقیم پر چلنے کی تاکید کی ہے اور آفاقی علم حاصل کرنے کے لیے کہا ہے۔ وہ 1072 ہجری بمطابق 1661ء لاہور میں انتقال کر گئے۔ انہیں ان کے مذہبی پیشوا کے مزار کے احاطے میں دفن کیا گیا۔ مندرجہ ذیل اشعار ان کی شاعری کا نمونہ ہیں :۔

ای بند بپائی قفل بردل هشدار وی دوختہ چشم پائی در گل هشدار
عزم سفر مغرب و رو یا مشرق ای راہ رو پشت بمنزل هشدار

ترجمہ : اے بندے ، تمہارے پاؤں میں زنجیر اور دل پر قفل پڑا ہے ہوشیار۔
اے بندے ، تمہاری آنکھیں بند ہیں اور تمہارے پاؤں مٹی میں پڑے ہیں ہوشیار۔
تم مغرب کی طرف عازم سفر ہو لیکن ابھی تک تمہارا چہرہ مشرق کی جانب ہے۔
اے مسافر! تمہاری منزل تمہاری پشت پر ہے ، ہوشیار!

4۔ خواجہ بہاری ، کا آبائی علاقہ بہار (بنگال) تھا۔ اپنی زندگی کے اوائل میں وہ لاہور آنے کے بعد حضرت میاں میرؒ کے مرید ہوگئے۔ وہ 1041 ہجری بمطابق 1631ء میں فوت ہوئے ۱۔ انہیں ان کے مرشد کے مزار کے احاطہ میں دفن کیا گیا۔ " بادشاہ نامہ " کے

مصنف نے بڑے وثوق سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے بہت سی کرامات پیش کیں۔

5۔ **مُلاّ عبدالحکیم سیالکوٹی** :۔ ایک عظیم عالم، مصنف اور مفسر تھے۔ ان کی علمیت کی شہرت ہندوستان کی پوری سلطنت میں پھیل گئی تھی۔ وہ ساٹھ برس تک لوگوں کو فلسفہ اور علم الکلام کی تعلیم دیتے رہے۔ ان کے اہم کاموں میں، بیہزاوی، مقدمات اربعتہ العیاج، فتاول شرح موفیق، شمسہ، عقائد مُلاّ جلال اور حکمت الآئین کی تفاسیر و شروح شامل ہیں۔ ان کا طویل اور مفید سلسلہ رشد وہدایت 1067 ہجری (1656ء) میں اختتام پذیر ہو گیا۔ انہوں نے پسماندگان میں ایک بیٹا مولانا عبداللہ چھوڑا۔

6۔ **علامی سعداللہ خاں**، ذات کے تہائم اور موضع پتراکی، چنیوٹ کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد ایک کاشتکار تھے۔ ان کے اہل خانہ پردے کے سخت پابند تھے۔ سعداللہ خاں اوائل عمری میں لاہور آکر ایک مسجد میں رہنے لگے۔ وہاں انہوں نے درویشانہ تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ اس کے بعد وہ دہلی چلے گئے اور وہاں اپنی تعلیم مکمل کر کے پورے عالم بن گئے۔ ان کے معلم کو تسبیح خانہ یا شاہی عبادت گاہ میں ایک عہدہ ملا ہوا تھا۔ چنانچہ انہی کے اثر و رسوخ سے وہاں ان کا بھی وظیفہ مقرر ہو گیا۔ انہوں نے بادشاہ کی توجہ حاصل کر لی اور درجہ بدرجہ ترقی کر کے وزیر کے عہدے تک جا پہنچے۔ وہ 1067 ہجری بمطابق 1656ء کو فوت ہوئے۔

7۔ **مُلاّ علاء الملک**، کا خاندانی نام فاضل خاں تھا۔ وہ ایک ماہر مہندس (انجنیئر) تھے۔ انہیں نہروں کی تعمیرات میں مہارت حاصل تھی۔ شالامار باغ لاہور کا نقشہ انہوں نے ہی تیار کیا تھا اور اس کے کام کی تکمیل بھی انہیں کی زیر نگرانی ہوئی۔ یمین الدولہ کی وفات کے بعد وہ سلطنت کے وزیر بنا دیے گئے، لیکن اپنا عہدہ سنبھالے انہیں دو ہفتے ہی ہوئے تھے کہ 1073 ہجری بمطابق 1662ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

8۔ **مولانا محمد فاضل بدخشانی**، کا آبائی علاقہ بدخشاں تھا۔ انہوں نے ہندوستان میں آنے کے بعد علم الکلام اور فقہ میں مُلاّ جمال لاہوری کی شاگردی اختیار کی۔ وہ جہانگیر کے دور حکومت میں لاہور میں "عدالتی" کے عہدہ پر فائز تھے اور شاہجہاں کی حکومت کے آٹھ سال تک اسی عہدہ پر متمکن تھے۔ اس کے بعد وہ سرکاری نوکری سے سبکدوش ہوگئے۔ ان کا انتقال لاہور میں ہوا۔

9۔ **مُلاّ جامی لاہوری**، ایک نہایت عالم فاضل شخص تھے۔ انہوں نے اپنا وقت لوگوں کو

رشد و ہدایت دینے کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ وہ ایک باصلاحیت شاعر بھی تھے۔ مندرجہ ذیل بند ان کی شاعرانہ صلاحیت کا نمونہ ہے۔

ہر کس کہ دل از مدار دنیا برداشت　　عبرت ز شمار کار دنیا برداشت

گویند زمین بر سر گاو سست بلے　　گاو ست کسے کہ بار دنیا برداشت

ترجمہ: وہ جس نے دنیا کے معاملات سے اپنا ذہن ہٹا لیا ہے، اسے اس سے بڑا اچھا سبق ملا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ دنیا ایک بیل کے سینگ پر کھڑی ہے۔ بے شک جس نے اس دنیا کے معاملات کا بوجھ اپنے اوپر لاد لیا ہے اس کی مثال بالکل اسی بیل جیسی ہے (92)۔

مُلّا جامی کا انتقال لاہور میں ہوا۔ ان کا مزار حضرت محمد طاہر بندگیؒ کے مزار کے احاطے میں ہے۔ اس کے ساتھ ایک مسجد بھی موجود ہے۔

10۔ چندر بھان، لاہور کا رہنے والا تھا۔ اس کو علوم و فنون پر بڑی دسترس حاصل تھی۔ اس نے برہمن کے نام سے شاعری بھی کی۔ مندرجہ ذیل شعر اس کی شاعری کے نمونے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔

چشم تا برہم زدی انجام شد آغاز عمر

طے شد این رہ انچنان کا واز پائے برنخواست

ترجمہ: ۔ آنکھ بند ہونے سے زندگی کا انجام ہو جاتا ہے۔

زندگی کا سفر مکمل ہو چکا ہے لیکن پاؤں کی آہٹ سنائی نہیں دیتی۔

11۔ میر عبدالکریم، شاہجہاں کے دور میں لاہور کا میر عمارت یا تعمیرات کا نگران تھا۔

12۔ حکیم علیم الدین المعروف وزیر خاں، نے لاہور میں ایک مسجد تعمیر کرائی جو اس کے نام سے منسوب ہے۔ وہ چنیوٹ کا رہنے والا تھا (93)۔ "بادشاہ نامہ" کے مطابق عربی اور فلسفہ کا علم حاصل کرنے کے بعد وہ حکیم دعاوی کا شاگرد بن گیا۔ اس سے اس نے طب کا فن سیکھا۔ ایک ماہر طبیب ہونے کی وجہ سے جلد ہی وہ شاہجہاں کی توجہ کا مرکز بن گیا اور ایک مختصر وقت میں وہ بادشاہ، شہزادگان اور حرم کی بیگمات کے مزاج اور طبیعت سے آشنا ہو گیا۔ اس کو پہلے "دیوان بیوتات" (اہل خانہ کا نگران) اور پھر میر سامان (شاہی طعام خانے کا نگران) بنایا گیا اور پھر جلد ہی اس کو دیوان کے عہدہ پر ترقی دے دی گئی۔

پھر اسے پنج ہزاری رسالے کا امیر مقرر کیا گیا اور آخر کار اسے پنجاب کا صوبیدار مقرر کر دیا گیا(94)۔

13۔ شیخ طاہر بندگیؒ، لاہور کے رہنے والے تھے(95)۔ ان کا علم و فضل میں گہرا مشاہدہ تھا اور ان کے مریدوں کی تعداد بے شمار تھی۔ تذکرہ مجددیہ کے مطابق وہ شیخ احمد سرہندیؒ مجددی کے مرید تھے۔ ان کا گزارہ حدیث کی کتابوں کی نقل اور قرآن کریم کی تفاسیر سے ہونے والی آمدنی پر تھا۔ انہوں نے اپنا سارا وقت لوگوں کو رشد وہدایت دینے پر وقف کر رکھا تھا۔ وہ 5 محرم 1040 ہجری بمطابق 1630ء کو انتقال کر گئے اور انہیں لاہور میں دفن کیا گیا(96)۔

تذکرہ مجددیہ، محمد طاہر بندگیؒ کے سرہند میں اپنے روحانی پیشوا کو لکھے گئے بیشمار فارسی خطوط پر مشتمل ہے۔ وہ اعلیٰ فارسی طرز کے نمونہ جات ہیں۔ ہم ان میں سے ایک خط کا اقتباس یہاں پیش کر رہے ہیں کیونکہ اس سے اس دور کے راسخ العقیدہ مسلمانوں کے درمیان پائے جانے والے مذہبی خیالات کا پتہ چلتا ہے:۔

حضرت من سلامت

احقر الخدمت محمد طاہر بعرض میرساند کہ چون از آستانہ علیا متوجہ لاہور شدم در ہر قدمی باخود میگفتم کہ ای نادان مقصود را گذاشتہ کجا پیروی۔۔۔اما از غیب ندامی آمد کہ راھی شو راھی شو۔ فی الجملہ کشان کشان بایں شہر اور دمذو در گوشہ مسجد حیران نشستم ناگاہ بردح پر فتوح حضرت خواجہ نقشبند ظاہر شد و باعث گشت کہ برای کاریکہ مامور شدہ مشغول شد۔ امتثالا لامرحم و امرکم چند کس را مشغول ساختم حالا مجلس گرم است و مشلخان عالیشان فوج در فوج تشریف می ارندو الطاف کثیرہ می فرمایند خصوصا روح حضرت خواجہ بزرگ یعنے حضرت نقشبندؒ و حضرت غوث الاعظمؒ و حضرت خواجہ فرید گنج شکرؒ در حلقۂ ذکر و نماز تشریف ما میشود۔

ترجمہ: " حضور والا خدا آپ کو سلامت رکھے!

احقر الخدمت محمد طاہر عرض کرتا ہے کہ آپ کے آستانہ عالیہ سے رخصت ہونے کے بعد میں لاہور کی جانب عازم سفر ہوا۔ میں ہر قدم پر اپنے آپ سے کہتا۔ اے

نادان شخص! اپنے گوہر مقصود کو چھوڑ کر تو کہاں جا رہا ہے؟ لیکن اچانک غیب سے آواز آئی، چلتے رہو، چلتے رہو، آخر کار میں کشاں کشاں لاہور میں داخل ہو گیا اور ایک مسجد کے گوشہ میں حیران و پریشان بیٹھ گیا کہ اچانک بروح پر فتوح حضرت خواجہ نقشبند ظاہر ہوئے اور اس بات پر اصرار کیا کہ مجھے وہ کام اب شروع کر دینا چاہیے جس کے لیے حکم دیا گیا ہے۔ اس حکم کی تعمیل پر خاص آدمیوں کو اس کام پر مامور کیا گیا۔ (خدا کی عبادت کے لیے کہنے کے کام پر) اب محفل خوب گرم ہے اور عالی شان مشائخ فوج در فوج تشریف لا رہے ہیں اور اپنے لطف و کرم سے نواز رہے ہیں، خصوصاً ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ حضرت خواجہ نقشبندؒ و حضرت غوث الاعظمؒ و حضرت خواجہ فرید گنج شکرؒ کی روحیں ذکر اور نماز کی محفل میں موجود ہیں۔"

14۔ **مُلاّ عبدالسلام دیوی** :۔ "بادشاہ نامہ" کے مطابق، انہوں نے عربی زبان، دیوی میں واقع اپنے گھر میں سیکھی۔ دارالسلطنت (لاہور) آنے کے بعد انہوں نے فقہ اور علم الکلام کے معاملہ میں ملا عبدالسلام لاہوری (اکبر کے دور کے نمبر 19) کی شاگردی اختیار کر لی۔ انہوں نے پہلے اپنے شاگردوں کو پڑھایا اور بعد میں سرکاری نوکری کر لی۔ جب مُلاّ عبدالحمید اپنی کتاب "بادشاہ نامہ" لکھ رہا تھا تو اس وقت مصنف کے مطابق، وہ دنیا کی بڑھتی ہوئی خوشحالی کے لیے دعائیں کرنے اور نمازیں ادا کرنے کے لیے سرکاری معاملات سے سبکدوش ہو کر حکومت کے پنشندار ہو گئے۔

15۔ **مُلاّ یوسف لاہوری** ۔ "بادشاہ نامہ کے مطابق، وہ ایک عالم باعمل (ایسا عالم جو کچھ پڑھتا ہے اسی پر عمل بھی کرتا ہے) تھے۔ وہ مُلاّ جمال لاہوری کے مرید تھے اور تاریخ میں، قرآن پاک، احادیث اور دیگر قانونی کتابوں کی تفاسیر و شروح کے لیے بہت مشہور ہیں۔ انہوں نے پچاس سال تک لوگوں کو رشد و ہدایت سے مستفید کیا اور 80 سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔

16۔ **شیخ ابوالمعالیؒ** :۔ "بادشاہ نامہ" کے مطابق، وہ اس وقت لاہور کے پرگنہ، بھیرہ کے رہنے والے تھے۔ وہ حضرت میاں میرؒ کا بہت احترام کرتے تھے۔ انہی سے انہوں نے علم الکلام کی تعلیم حاصل کی۔ جب مُلاّ عبدالحمید نے اپنی کتاب لکھی تو اس وقت آپ حیات تھے۔

مصنف، شیخ کی مذہبی پاکیزگی کے بارے میں لکھتا ہے:۔

واز اہل و عیال گیختہ اکنون بشغلی کہ اذان رہ نوردی بیداری یقین فراگرفتہ مشغول است و پائی آمد و شد او کوتاہ و چشم گریان و دل بریان دارد سیمای حالش بر سوز و گداز دلالت میکند۔

ترجمہ:۔ انہوں نے اپنے اہل و عیال سے تعلق توڑ کر ایک راستے پر جانے کے لیے تیار ہونے کے لیے خود کو مصروف کر لیا ہے۔ پارسائی اور ہوشمندی کے راستہ پر۔ وہ اپنے مقام پر خود ہی قید ہیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں اور دل (خدا کے عشق کی آگ سے) جھلس رہا ہے۔ ان کی پیشانی سے ان کے ذہن کی گرمجوشی (خدا کے لیے) کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔"

اورنگ زیب:۔ دکن کی طویل جنگوں میں مصروف رہنے کے باعث، اورنگ زیب کو اپنے پیشرو حکمرانوں کے مقابلہ میں، لاہور میں دربار منعقد کرنے کا بہت کم موقع ملا لیکن سرکاری خط و کتابت میں لاہور کو حسب معمول ابھی تک دارالسلطنت ہی کے طور پر لکھا جاتا تھا۔

دارا شکوہ:۔ شاہجہان کا سب سے بڑا بیٹا دارا شکوہ لاہور سے بڑا لگاؤ رکھتا تھا۔ وہ وہاں مقبول بھی بہت زیادہ تھا۔ لہٰذا اس نے وہاں سکونت اختیار کر لی۔ وہ شہر کی فلاح و بہبود میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ اس نے اس شہر کو خوبصورت عمارات، وسیع چوکوں (چوراہوں) اور بازاروں سے آراستہ کر دیا تھا جہاں اس وقت سلطان کی سرائے ہے، اسی جگہ دارا شکوہ کا چوک یا چوراہا موجود ہوتا تھا۔ اس کے دونوں جانب بڑے دروازے بھی تھے۔ انہیں میں سے شمال کی طرف واقع ایک دروازے پر کانسی کا بہت خوبصورت کام کیا گیا تھا۔ اس کی وزیر خاں مسجد کے صدر دروازے سے بہت مماثلت تھی۔ یہ دروازہ انگریزوں کے دور کے آغاز تک موجود رہا لیکن اسے غالباً 1854ء میں مسمار کر دیا گیا۔ جس جگہ کو اب شہید گنج کہا جاتا ہے، یہ گھوڑوں کی منڈی ہوا کرتی تھی۔ سرائے کی جنوبی طرف واقع مسجد، لاہور کے کوتوال، عبداللہ نے اورنگ زیب کے دور حکومت میں تعمیر کرائی، جو اپنی عدالت نخاس خانہ یا گھڑ بازار میں لگاتا تھا۔

دارا شکوہ ایک بلند حوصلہ، فیاض اور نیک اطوار شہزادہ تھا۔ اس میں شاہانہ وقار اور شان و شوکت پائی جاتی تھی۔ وہ صاف گو اور بہادر تھا۔ وہ آزاد خیال تھا۔ لہٰذا اپنا فارغ وقت خطوط لکھنے میں صرف کرتا تھا۔ علم الکلام اس کا پسندیدہ موضوع تھا۔ اس نے اس موضوع پر اور خدا رسیدہ بزرگان دین کے حالات زندگی پر بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ دارا شکوہ کی تصانیف میں سفینۃ

الاولیاء ، جس میں مسلمان اولیائے کرام کی حیات اور کارناموں کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔ حضرت میاں میرؒ اور ان کے ورثاء کی حیات پر ایک کتاب سکینتہ الاولیاء، اس کے علاوہ دیوان اکسیر عظیم ، رسالہ معارف ، شطحیات دارا اور سراکبری زیادہ مشہور ہیں۔ وہ حضرت میاں میرؒ کے مرید ملا شاہ کا مرید تھا۔ وہ خاص طور پر سکھوں کے ساتویں گورو ہر رائے سے بہت انس رکھتا تھا اور جب وہ اپنے بھائی اورنگ زیب سے ہراساں ہو گیا تو گورو نے شہزادے کی حمایت کا اعلان کر دیا۔

آگرہ کے قریب اورنگ زیب سے شکست کھانے کے بعد وہ نہایت تیزی سے لاہور کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور شاہی خزانے کو قبضہ میں لے کر فوج میں اضافہ کرنا شروع کر دیا۔ اس نے امراء کو بڑی فیاضی سے انعام و اکرام سے نوازا اور بہت ہی کم عرصہ میں اپنے گرد بیس ہزار گھڑ سواروں کو جمع کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بھیرہ ، خوشاب کے فوجدار خنجر خاں اور جموں کے سردار راجہ راج روپ نے اس کی طرف داری کی۔ اس نے ستلج کے راستے کی حفاظت کے لیے پانچ ہزار سپاہیوں کا دستہ روانہ کیا۔ اسی طرح کا ایک اور فوجی دستہ داؤد خاں کی زیر قیادت ، بیاس کی حفاظت کے لیے روانہ کیا گیا(97)۔ تاہم اورنگ زیب نے جیسے ہی دہلی کے معاملات کو درست کیا تو وہ اپنے بھائی کے تعاقب میں پنجاب کی طرف روانہ ہوا۔ پنجاب کے حلیفوں نے دارا کو دھوکہ دیا۔ راجہ راج روپ کسی بہانے سے پہاڑوں میں نکل گیا اور دارا کو آڑے وقت میں کابل سے جس امداد کی توقع تھی وہ بھی نہ مل سکی۔ دارا نے جب یہ محسوس کیا کہ جن فوجی دستوں نے حملہ کیا ہے وہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکے گا تو اس نے 13,000 یا 14,000 گھڑ سواروں کے ہمراہ لاہور کو خیرباد کہا اور ملتان کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ لاہور سے روانہ ہوتے وقت بندوقوں اور جنگی اسلحہ کے علاوہ سونے کی سلاخوں اور سونے چاندی کے سکوں پر مشتمل ایک کروڑ روپے مالیت کا خزانہ بھی اپنے ساتھ لے گیا(98)۔ اورنگ زیب جو اس وقت تک دریائے ستلج کو پار کر چکا تھا، اس نے اپنے سب سے بڑے بیٹے شہزادہ محمد عظیم کو لاہور کا انتظام سنبھالنے کے لیے روانہ کیا اور خود ملتان کی طرف بڑھ گیا۔ دارا شکوہ کو ملتان میں اس کے اپنے آدمیوں نے دھوکہ دیا۔ سید عرب خاں اور شیخ موسیٰ گیلانی ، جن کو دارا شکوہ نے ملتان کا انتظام سونپا تھا، انہوں نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ دارا بھکر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اورنگ زیب کے سپہ سالار صف شکن خاں نے اس کا تعاقب کیا۔ اورنگ زیب ملتان پہنچا اور مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ بہاء الدینؒ کے مزار پر حاضری دی۔ وہاں اس نے ایک ہزار روپے نذرانہ پیش کیا۔

اورنگ زیب کی لاہور آمد

اس کے بعد وہ اپنی پوری فوج کے ہمراہ لاہور کی طرف روانہ ہوا۔ وہ 24 محرم 1069 ہجری بمطابق 1659ء کو لاہور میں داخل ہوا۔ وہ دہلی کو جانے والی سڑک پر واقع فیض بخش باغ میں ٹھہرا۔ اگلے روز شہر کی جانب سے شہزادے محمد عظیم نے محمد امین میر بخشی اور دیگر امراء کے ہمراہ بادشاہ سے ملاقات کی اور اس نے شہزادے کی معیت میں قلعہ کا بنظر غائر معائنہ کیا (99)۔ لاہور کا قلعدار امین اللہ، بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے قلعہ میں انتظامات کرنے کے بارے میں زبانی طور پر اسے ہدایات دیں۔ دوبارہ فرح بخش باغ کی طرف واپس آتے ہوئے اس نے راستے میں وزیر خاں کی مسجد میں باجماعت نماز ادا کی اور تقریباً شام کے وقت فیض بخش باغ میں پہنچ گیا۔

خلیل خاں کو پنجاب کا حاکم مقرر کیا گیا اور اس کی خدمات کے صلے میں بادشاہ نے خوش ہو کر اسے انعام کے طور پر ایک محل یا جائیداد جس کی مالیت ایک کروڑ روپے کے قریب تھی، عنایت کی۔ کشمیر کے سابقہ حاکم لشکر خاں کو صوبہ ملتان کا حاکم مقرر کیا گیا۔ خواجہ اسماعیل کرمانی کو لاہور کا دیوان مقرر کیے جانے پر خلعت سے نوازا گیا۔ درویش محمد کا منصب بڑھا کر پنج ہزاری اور سلطان بیگ (100)، کا ڈیڑھ ہزاری کر دیا گیا۔ نئے چاند کے پہلے روز بادشاہ دہلی روانہ ہو گیا۔

دارا انتہائی دگرگوں حالت میں اجمیر روانہ ہوا۔ یہاں شہزادہ پرویز کی بیٹی اور اس کی بیوی نادرہ بیگم، جس کو وہ بہت چاہتا تھا اور جو ہر سرد و گرم زمانہ اور مشکل وقت میں اس کی وفا شعار ساتھی تھی، پیچش کے باعث انتہائی تکلیف دہ حالت میں فوت ہو گئی۔ شہزادے نے اپنے ایک با اعتماد خادم گل محمد کے ذریعے اس کی میت کو لاہور روانہ کیا کیونکہ مرحومہ کی وصیت تھی کہ اسے حضرت میاں میرؒ کے مزار اقدس کے احاطہ میں دفن کیا جائے (101)۔

1072 ہجری بمطابق 1655ء کو حاکم لاہور خلیل اللہ کے انتقال پر اس کے بیٹوں کو خلعت تعزیت عطا کی گئی اور ممتاز زمانی بیگم کی ہمشیرہ (جسے شاہجہان کی بیوی، تاج محل کہا کرتی تھی) ملکہ بانو کی بیٹی اور مرحوم کی بیوہ حمید بانو بیگم کے لیے پچاس ہزار روپے کا وظیفہ مقرر کیا گیا۔ محمد امین خاں کو مرحوم کی جگہ حاکم پنجاب مقرر کیا گیا۔

اگلے سال بادشاہ نے لاہور کا دورہ کیا اور رجب کے مہینے کی 2 تاریخ سے 9 تاریخ تک فیض بخش باغ میں ٹھہر کر شہر اور قلعہ میں داخل ہونے کے لیے کسی خاص گھڑی کا انتظار کرنے لگا۔

آخر کار شاہی نجومیوں نے اعلان کیا کہ اس مہینے کی 10 تاریخ کا دن مبارک ہے۔ بادشاہ اور شہزادہ معظم ایک ہی ہاتھی پر بیٹھ کر طلوع آفتاب سے دو گھڑی بعد شہر میں داخل ہوئے۔ بعد میں اس نے محل میں قدم رکھا۔ اگلے دن جمعہ کے روز بادشاہ نے شہر پناہ کے نواح میں ہتھیہ پل دروازہ کے قریب مسجد فیروز (102)، میں معمول کے مطابق نماز ادا کی۔ اس نے یہ قانون بنا دیا تھا کہ ہر جمعہ کو نماز کی ادائیگی کے سلسلہ میں اسی طرح اجتماعات ہوتے رہیں گے۔ اسی مہینے میں صدر الصدور عابد خاں کے ذریعے 20 ہزار روپے کی رقم مستحق لوگوں میں تقسیم کی گئی (103)۔ رمضان المبارک کی 25 تاریخ کو بادشاہ نے دریائے راوی کے پار واقع باغ دلکشا میں ایک عالی شان دعوت کا انتظام کیا (104)۔ بادشاہ نے ایشیا اور افریقہ کے حکمرانوں کے احترام میں اپنا دربار منعقد کیا۔ بعد میں تحائف کا تبادلہ کیا گیا۔ لہذا اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ دور حکومت کے چھٹے سال میں ایران کے شاہ عباس کے نمائندے نیداک بیگ، جس نے بادشاہ کے حضور حاضری دی۔ بادشاہ نے اس کے ذریعے شاہ ایران کے لیے سات لاکھ روپے مالیت کے تحائف بھیجے اور اس کے ساتھ تربیت خاں کو ہندوستان کے شہنشاہ کا نمائندہ بنا کر روانہ کیا گیا۔ بخارہ کے بادشاہ عبدالعزیز خاں کے لیے ڈیڑھ لاکھ روپے اور بلخ کے سبحان قلی خاں کے لیے ایک لاکھ روپے مالیت کے تحائف بھیجے گئے۔ توران کے سفیر مصطفیٰ خاں خوافی، لیبے سینا کے سفیر سیدی کمال، یمن کے بادشاہ کے نمائندے امام اسماعیل اور کاشغر کے بادشاہ عبداللہ خاں کے نمائندے نے بادشاہ کو اپنے اپنے حکمرانوں کی طرف سے دوستانہ خطوط پہنچائے۔ انہیں نہایت قیمتی تحائف دے کر رخصت کیا گیا۔ شریف مکہ کا سفارتی نمائندہ سید یحییٰ جسے چھ لاکھ 30 ہزار روپے عطا کیے گئے تھے، وہ اپنے آقا کی جانب سے عربی گھوڑوں کا تحفہ لے کر آیا تھا، اسے چھ ہزار روپے مالیت کی خلعت سے نواز کر رخصت کیا گیا۔

بند عالمگیری

1662ء میں دریائے راوی میں طغیانی آجانے اور اس کے رخ تبدیل کر جانے کے باعث شہر کو بہت سخت نقصان پہنچا۔ بادشاہ نے شہر کی حفاظت کی خاطر اس کے کنارے پر چار میل کے فاصلے تک ایک پختہ بند تعمیر کرایا۔ کہا جاتا ہے کہ اس بند کو سیسے کی طرح مضبوط بنایا گیا تھا۔ مختلف مقامات پر کچھ فاصلوں پر لوگوں کے نہانے کے لیے زینے بنائے گئے تھے اور اس کے کنارے کے ساتھ واقع امراء کے باغات کو سیراب کرنے کے لیے بیلوں کے ذریعے چلنے والے رہٹ لگائے

گئے تھے۔ ایک ہمعصر مورخ کے بیان کے مطابق، یہ بند، سد اسکندری (یا ایسی فصیل جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے اسکندر اعظم نے گوگ اور میگوگ کے حملوں سے محفوظ رہنے کے لیے تعمیر کرایا تھا) کا کام دیتا تھا۔ اس سے نہ صرف شہر تباہ ہونے سے بچ گیا بلکہ اس کی وجہ سے دریا کا رخ بھی تبدیل ہو گیا اور وہ شمال کی جانب ایک میل کے فاصلہ پر بہنے لگا۔

69-1968ء کے دوران جب بادشاہ نے حسن ابدال اور سرحد کے دیگر علاقوں کا دورہ کیا تو اس وقت دربار کو لاہور میں منعقد کیا گیا تھا۔ لاہور میں قیام کے دوران بادشاہ نے مندرجہ ذیل غزل موزوں کی اور اسے خلیل اللہ خاں کو اپنے دستخط کرکے ارسال کیا:۔(105)

غزل مصنف اورنگ زیب بادشاہ

زدرد دل چہ نویسم کہ جوش بے تابی ست
زشوق جان چہ نگارم کہ نامہ سیمابی ست
شب خیال فراق کہ ریخت خون دلم
کہ تار اشک گلابی و دیدہ عنابی ست
چگونہ شرح دہم حال دل کہ بیتابم
زیاد تاب خش دل کتاں مہتابی ست
نشتہ ایم درین بحر تا خداچہ کند
بکشتی کہ زیک قطرہ آب گرد ابست
نماند صورت راز دلم نہان عزت
کہ دیدہ صفحہ تصویر رنگ بیخوابی ست

ترجمہ: "میں درد دل کے بارے میں کیا بتاؤں کہ یہ کس قدر بیتاب ہے۔ میں شوق دل کے بارے میں کیسے بتا سکتا ہوں کیونکہ میرے ہاتھ میں خط، پارے کی طرح لرزاں ہے۔ شب فراق میں تمہارے خیال سے میرا دل خوں ہو رہا ہے۔ آنکھوں سے اشک رواں ہیں اور ان کا رنگ عنابی ہے۔ میں اپنے دل کی حالت کیسے بیان کر سکتا ہوں کیونکہ اب تاب شکیبائی نہیں رہی۔ تمہاری یاد اس پر اسی طرح سے اثر انداز ہو رہی ہے جس طرح چاندنی کتان پر اپنی آب و تاب سے جلوہ

گر ہوتی ہے۔ اس سمندر میں، ہم ایک کشتی میں بیٹھے خدا کی مرضی کے منتظر ہیں۔
ہمارے لیے ایک قطرہ بھنور کی مانند ہے۔ ابھی تک میرا راز دل عزت افشا نہیں
ہو سکا۔ میری آنکھوں سے بیخوابی کا اظہار ہو رہا ہے۔"

شاہ برج

بادشاہ کے قیام کشمیر کے دوران وزیر اعظم فاضل خاں کا انتقال ہو گیا۔ اس سے بادشاہ کو نہایت دکھ اور رنج ہوا اور اس کی وصیت کے مطابق اس کے جسد خاکی کو، اس کے اسی مقصد کے لیے تعمیر کردہ باغ میں دفن کرنے کے لیے لاہور روانہ کیا گیا (106)۔ بادشاہ نے کشمیر سے واپس آنے کے بعد کچھ دنوں کے لیے دریائے راوی کے پار واقع باغ دلکشا میں قیام کیا۔ وہیں پہ لاہور کے حاکم ابراہیم خاں نے اس سے ملاقات کی۔ اس نے اپنے دادا جہانگیر کے مقبرہ پر حاضری دی اور 10,000 ہزار روپے کا نذرانہ پیش کیا۔ ربیع الثانی کی گیارہ تاریخ کو شاہ برج (107)، (جس کو شان و شوکت اور رفعت کی بنیاد کہا جاتا تھا اور جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اسے دیکھنے کے لیے سورج ہر روز آسمان سے 9 زینے نیچے اترتا ہے اور اپنے آپ کو اس کے دیدار سے مستفید کرتا ہے) میں ایک بہت بڑے دربار کا انعقاد کیا گیا۔

> در عمارات فیض بنیاد شاہ برج دار السلطنت لاہور کہ در رفعت و شان عزت بخش چرخ ذات البروج و آفتاب ہر صبح بعزم تماشائی ان شگرف مکان بر نر دبان نہ پاید فلک در عروج است۔

محل کو خوبصورتی سے سجایا گیا اور وہاں بڑی رنگا رنگ اور پر شکوہ تقریبات کا انعقاد کیا گیا۔ اسی موقع پر بادشاہ کی 46 ویں سالگرہ ہونے کی وجہ سے بادشاہ کو سونے چاندی اور دیگر قیمتی دھاتوں میں تول کر یہ سارا مال خیرات کے طور پر دے دیا گیا۔ دربار کے جن امراء کو خلعت سے نوازا گیا، ان میں حاکم لاہور ابراہیم خان، قلعہ دار حاجی محمد ابراہیم خاں، دیپال پور کا فوجدار فیروز خاں اور کابل کا گورنر امیر خاں شامل تھے۔ دہلی روانہ ہونے سے قبل کئی دن تک فیض بخش باغ میں شاہی پڑاؤ رہا۔

دور حکومت کے 23 ویں برس، شہنشاہ کے تیسرے بیٹے شہزادہ محمد معظم کو پنجاب کا حاکم مقرر کیا گیا اور لطف اللہ خاں کو اس کا نائب مقرر کیا گیا۔ لیکن اس کے چند سال بعد

1694ء میں محمد معظم (جس کے بعد شاہ عالم کو حاکم مقرر کیا گیا) کو اپنے مہربان اور دلآویز مزاج کے باعث لاہور میں بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہو گئی۔

1664ء میں بادشاہ کی کشمیر روانگی کے موقع پر فرانسیسی سیاح برنیئر شاہی فوج کے ہمراہ لاہور آیا۔ گذشتہ چند برس سے ہونے والی لگاتار بارشوں کی وجہ سے کئی مکان بالکل تباہ ہو گئے اور سینکڑوں مکین ان کے ملبہ کے نیچے آ کر مر گئے۔ دریا کے رخ موڑنے کی وجہ سے محل زیادہ دیر تک اس کے کنارے پر موجود نہ رہ سکا۔ برنیئر لکھتا ہے "یہ ایک بلند اور عالی شان عمارت تھی حالانکہ یہ دہلی اور آگرہ کے محلات سے کم تر تھی۔"

اورنگ زیب کی وفات کے بعد لاہور کی حالت

یہی کہا جا سکتا ہے کہ اورنگ زیب کی وفات کے ساتھ ہی لاہور کی تاریخ کے شاندار دور کا خاتمہ ہو گیا۔ بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد کی رہائش گاہ جس کو بادشاہ کی کشمیر اور کابل روانگی کے مواقعوں پر ملاقات کے سلسلہ میں ابھی زیادہ استعمال بھی نہیں کیا گیا تھا اور جس کی شان و شوکت کا جواب نہیں تھا وہ بھی زیادہ دیر محفوظ نہ رہ سکی۔ یہ وہ پہلی عمارت تھی جس کو اتنی تباہی اور بربادی کا سامنا کرنا پڑا کہ ایک بار پھر تیمور کے زمانہ کی یاد تازہ ہو گئی۔

پایہ تخت دہلی کی طرف سے خاطر خواہ حمایت حاصل نہ ہونے کے باعث حاکم پنجاب نے نیم خود مختاری کا اعلان کر دیا، جبکہ سکھوں نے مزاحمت نہ ہونے کی وجہ سے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور اس سلسلہ میں اپنی کوششوں کو تیز کرنے کے علاوہ ملک کا امن و امان درہم برہم کر دیا۔

اسی دور میں گرد گوبند کے پیروکار " باندہ " نے " سچا بادشاہ " کا لقب اختیار کر کے سرہند اور سہارنپور کے علاقوں میں لوٹ مار شروع کر دی اور اس کے پیروکاروں نے غارتگری اور لوٹ مار کی کارروائیوں کو جالندھر دوآبہ کے علاقوں، راہون اور سلطان پور تک بڑھا دیا۔ اس کے بعد دشمن لاہور کے ملحقہ علاقوں میں غارت گری کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ شہر اور اس کے نواحی علاقوں کے لیے زبردست خطرہ پیدا ہو گیا۔ صوبہ لاہور کا نائب اسلام خاں جو دیوان کاظم خاں کے ساتھ مل کر کام کر رہا تھا، اس نے شہر کی قلعہ بندی کو مضبوط کرنے کے بعد شہر سے چار یا پانچ کوس کے فاصلہ پر دشمن کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اندرون شہر میں رہنے والے لوگ محفوظ رہے۔ لیکن سکوں نے شالا مار باغ (108)، تک کے نواحی علاقہ میں لوٹ مار کا بازار خوب گرم کیا اور اس کے بعد وہ

شاہدرہ اور کرنال کی طرف واپس چلے گئے (109)۔

بادشاہ شاہ عالم المعروف بہادر شاہ جو اورنگ زیب کا بیٹا اور جانشین تھا، اس وقت راجپوتوں کی بغاوت کو دبانے میں مصروف تھا۔ اگلے سال (1710ء) میں وہ لاہور کی طرف روانہ ہوا۔ بادشاہ کی آمد پر باغی سکھ منتشر ہو کر مختلف اطراف میں بھاگ گئے۔ مؤرخ مرتضیٰ حسین، بادشاہ کی لاہور آمد کے بارے میں کچھ اس طرح بیان کرتا ہے:۔

"بادشاہ نے حکم جاری کر دیا کہ ہندو اپنے سر کے بال اور سکھ اپنی لمبی داڑھیاں ترشوا لیں۔ ان دنوں میں ہندو خاص طور پر ضلع لاہور کے رہنے والے ہندو داڑھیاں رکھتے تھے اور پہلی نظر میں کسی ہندو اور مسلمان میں فرق معلوم کرنا بہت مشکل تھا۔ چنانچہ ہندوؤں کو داڑھیاں کٹوانے کا حکم دے دیا گیا۔ اس کے بعد بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کی تاجپوشی کی سالگرہ کا جشن منانے کے لیے تیاریاں شروع کر دی جائیں اور شاہجہاں کے دور میں تیار ہونے والا بہت بڑا خیمہ "دل بادل" نصب کر دیا جائے۔ یہ خیمہ ایک مہینہ کے عرصہ میں نصب ہوا اور دیکھنے والوں کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس خیمہ میں بہادر شاہ نے ایک عالی شان دعوت کا انتظام کیا۔ بادشاہ کے چاروں بیٹوں، معزالدین جہاندار شاہ، محمد عظیم الشان، خجستہ اختر جہاں شاہ اور رفیق القدر رفیع الشان کے علاوہ ان کے فرزندوں اور چھوٹے و بڑے وزراء اور امراء کو خلعت، جاگیریں، نقدی، ہیرے جواہرات اور قیمتی موتیوں سے نوازا گیا اور اس دعوت کی تقریبات 9 دن تک ہوتی رہیں۔" (110)

بادشاہ نے لاہور میں قیام کے دوران شیعہ فرقے کا پیروکار ہونے کے باعث، چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ کے نام کے ساتھ لفظ وصی (وارث) متعارف کرانے کی کوشش کی۔ اس سے یہ تاثر ملتا تھا کہ حضرت علیؓ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقیقی وارث اور جانشین ہیں (111)۔ اس بدعت نے سُنّیوں میں ایک زبردست اختلاف رائے کا طوفان برپا کر دیا۔ اس کے علاوہ شیعہ مبلغ نے لاہور کی جامع مسجد کے منبر پر بیٹھ کر جیسے ہی اختلافی کلمہ استعمال کیا، اسے سُنّیوں کی ایک جماعت نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ چنانچہ لاہور کے صدر نے سنیوں کی تعلیمات کی حمایت میں بادشاہ کو ایک عرضداشت پیش کی چونکہ صدر کو سینکڑوں، ہزاروں لوگوں کی حمایت حاصل تھی اس لیے بادشاہ نے عوام کی بغاوت کے خدشہ کے پیش نظر اپنے ہاتھ سے عرضداشت پر حکم صادر فرمایا کہ

خطبہ اسی طرز یا شکل میں پڑھا جائے گا جس طرح اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں پڑھا جاتا تھا (112)۔

انتقال سے کچھ عرصہ پہلے بوڑھے بادشاہ کی ذہنی حالت درست نہ رہی۔ انہی دوروں کے دوران ایک مرتبہ اس نے حکم دیا کہ شہر کے تمام کتوں کو ہلاک کر دیا جائے۔ لوگوں نے سارے دن میں اپنے پالتو کتے لا کر دے دیے اور انہیں صبح صبح راوی کے پار پہنچا دیا گیا (113)۔ بادشاہ 28 فروری 1712ء کو 70 سال کی عمر میں لاہور میں انتقال کر گیا (114)۔ وہ ایک حلیم الطبع اور فیاض حکمران تھا۔ شہر کے متفرق دروازوں میں سے ایک دروازے کو "شاہ عالمی دروازہ" کہا جاتا تھا۔ آج کل بھی اسی کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ یہی چیز اس کی مقبولیت کی دلیل ہے (115)۔

بادشاہ کی موت پر شہر میں بہت زیادہ ابتری پھیل گئی اور اگر ہمعصر مصنفین پر یقین کیا جائے تو ان دنوں لاہور میں امن و امان اور نظم و ضبط کے نام سے کوئی آشنا تک نہیں تھا۔ "تاریخ چغتائی" کے مصنف محمد ہادی کے مطابق "لوگوں کے لیے بہت زیادہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ غنڈوں، بدمعاشوں اور آوارہ گردوں نے لوگوں کی جائیدادوں پر ہاتھ ڈالنے شروع کر دیے تھے۔ گلیوں میں اس قدر بھیڑ ہو گئی تھی کہ ان میں سے بڑی مشکل سے راستہ بنایا جا سکتا تھا۔ امراء بادشاہ کا پڑاؤ چھوڑ کر اپنے اہل و عیال کے ہمراہ شہر کی طرف بڑھ رہے تھے لیکن ان کے ٹھہرنے کے لیے بھی کوئی مکان نہیں مل سکتا تھا۔ لوگ رہائش کی تلاش میں چھوٹی چھوٹی دکانوں میں پناہ حاصل کر رہے تھے۔ سپاہی اپنی تنخواہ کے لیے شور مچا رہے تھے اور شہزادوں کی فوجوں میں افراتفری پیدا ہو گئی تھی۔ باپ اپنے بیٹوں کو اور بیٹے اپنے باپوں کو بھول گئے تھے اور یہ سارا منظر بالکل قیامت کا سماں پیدا کر رہا تھا۔" (116)

لاہور میں جنگ

اس کے فوراً بعد مرحوم بادشاہ کے چاروں بیٹوں کے درمیان اقتدار کے لیے مقابلہ شروع ہو گیا۔ امیر الامراء بخشی الملک ذوالفقار خاں کے سوا تمام امراء نے بادشاہ کے سب سے چھوٹے بیٹے عظیم الشان کی حمایت کی جس کو 78,000 گھڑسواروں کی حمایت حاصل تھی۔ عظیم الشان اور اس کے بڑے بھائی جہاندار (جس کو دیگر دونوں بھائیوں کی حمایت بھی حاصل تھی) کی فوجوں کے

درمیان شہر کی فصیل کے باہر لڑائی شروع ہو گئی۔ تینوں بھائیوں نے بذات خود گھوڑوں پر سوار ہو کر فوجوں کی قیادت کی، چار یا پانچ روز تک گولہ باری ہوتی رہی۔ آخر کار وہ ہاتھی جس پر "عظیم الشان" سوار تھا، توپ کے گولہ سے سونڈ زخمی ہو جانے کے باعث بے چین ہو کر بے قابو ہو گیا۔ غضب ناک جانور نے دریائے راوی کا رخ کیا اور اپنے آپ کو اس کے کنارے کی ڈھلوانی سطح پر گرا کر اپنے سوار سمیت پانی میں غوطہ لگا دیا اور اس کے بعد دوبارہ باہر نہ نکل سکا۔ ہمالیہ کے پہاڑوں کی برف پگھلنے کے باعث دریا میں زبردست طغیانی آئی ہوئی تھی۔ شہزادے اور ہاتھی کی تلاش فوری طور پر شروع کر دی گئی لیکن ان کا بعد میں کوئی سراغ نہ مل سکا۔ آخر کار جہاندار شاہ نے بے خبری کی حالت میں اپنے باقی ماندہ دونوں بھائیوں کو قتل کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ لیکن سات ماہ کے بعد اس زنخے بادشاہ کو عظیم الشان کے بیٹے فرخ سیر نے شکست دے دی۔ اس نے آخر میں اپنے چچا کو قید خانے میں تلوار سے قتل کر کے اپنے باپ کی موت کا بدلہ لے لیا۔ فرخ سیر نے 9 جنوری 1713ء میں دہلی کا تخت و تاج سنبھالا۔

سکھوں کی لوٹ مار

بہادر شاہ کی موت کے بعد پیدا ہونے والی افراتفری کے دوران سکھ اپنی پہاڑی پناہ گاہوں سے ایک مرتبہ پھر باہر نکل آئے اور انہوں نے انبالہ اور لاہور تک کے پنجاب کے علاقہ کو غارت کر دیا۔ بادشاہ فرخ سیر نے ایک تورانی امیر نواب عبدالصمد خاں دلیر جنگ کو پنجاب کا حاکم بنا کر روانہ کیا اور اس کے مشرقی محاذ کو مضبوط کرنے کے لیے منتخب شدہ کئی فوجی دستے روانہ کیے۔ عبدالصمد خاں ایک طاقتور اور باعمل انسان تھا۔ اس کے بہترین انتظام کے تحت ہی پنجاب دوبارہ آباد ہوا۔ وہ اپنے ساتھ کشمیر سے (جس کا وہ حاکم بھی رہ چکا تھا) اپنے ہم وطن جنگجو آدمیوں پر مشتمل فوجی دستے بھی لے کر آیا تھا۔ دہلی سے توپ خانے کی رسد پہنچنے پر وہ لاہور سے روانہ ہوا اور سکھوں پر ہلہ بول دیا۔ گورداسپور (جہاں انہوں نے ایک مضبوط قلعہ تعمیر کر رکھا تھا) کے قریب ایک زبردست معرکے میں انہیں شکست دی اور تقریباً تین یا چار ہزار کے قریب سکھوں کو تہ تیغ کیا اور جو زندہ بچ گئے انہیں پابہ زنجیر کر کے بادشاہ کے پاس بھیج دیا گیا (117)۔ گورو سردار باندہ کو اس کے سات آٹھ سالہ بیٹے اس کے دیوان اور تین یا چار ہزار سکھوں کے ہمراہ قیدی بنا لیا گیا۔ قتل کیے گئے دو ہزار سکھوں کے سروں میں بھوسہ بھر کر انہیں نیزوں پر لٹکا کر دہلی بھیج دیا گیا (118)۔ بادشاہ

فرخ سیر کے حکم سے باندہ اور اس کے دیگر پیروکاروں کی ایک بہت بڑی تعداد کو زبردست تشدد کے بعد موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ باندہ کی موت کے بعد سکھوں کو سزا دینے کا عمل شروع کر دیا گیا۔ لہذا ان کی بہت بڑی تعداد پہاڑوں کی کھوؤں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئی۔ باقی ماندہ جو زندہ بچ رہے انہیں اپنے مذہب سے دستبردار ہونے یا اپنے عقیدے کی ظاہری شکل کو چھوڑنے پر مجبور کیا گیا یا قید کیا گیا اور موت کے گھاٹ اتار دیا گیا(119)۔

عبدالصمد خاں کے بعد اس کا بیٹا ذکریا خاں المعروف اعزالدین خان بہادر (جس کا چچا قمر الدین خاں دہلی میں وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز تھا) پنجاب کی حاکمیت کے سلسلہ میں اس کا جانشین بنا۔ (1738ء - 1717ء) بیس سال کے عرصہ تک پنجاب میں امن و امان کی فضاء قائم رہی۔ دہلی کے کمزور دربار کی طرف سے زیادہ مداخلت نہ ہونے کی بناء پر حاکم پنجاب کو لوگوں کی جان و مال پر مکمل اختیار حاصل ہو چکا تھا لیکن اس نے اپنی طاقت کو، ہوشمندی، اعتدال پسندی اور اپنی حکومت کی بہتری کے لیے استعمال کیا(120)۔

نادر شاہ کا حملہ

آخر کار 1738ء میں لاہور کے عوام ہندوستان کو مغرب کی طرف سے لاحق خطرے کے پیش نظر خواب غفلت سے بیدار ہو گئے اور یہ خطرہ ایک ایشیائی فاتح اور مشرقی تاریخ کے غیر معمولی کرداروں میں سے ایک مشہور کردار، نادر شاہ قلی المعروف نادر شاہ کا حملہ تھا۔ تیمور اور چنگیز خاں کے ساتھ اس کا شمار بھی تلوار کے دھنی مشہور شہزادوں میں کیا جاتا ہے(121)۔

18 نومبر 1738ء کو ایرانی جارجین اور قزلباش سپاہیوں پر مشتمل 2 لاکھ 70 ہزار فوج کی قیادت کرتے ہوئے اس نے دریائے سندھ عبور کر کے پشاور، وزیر آباد اور ایمن آباد کے درمیان پورا علاقہ تباہ کر دیا۔ اعزالدولہ نواب ذکریا خاں نے 20 ہزار گھڑ سواروں کی ایک فوج کے ہمراہ دریائے راوی کے کنارے پر پڑاؤ ڈالا اور پڑاؤ کے ارد گرد خندق کھود کر اور توپوں کو مناسب سمتوں میں نصب کر کے اپنی حالت کو کافی مضبوط کر لیا۔ تاہم نادر شاہ نے حاکم لاہور کے توپ خانے کو دریائے راوی کے دوسرے کنارے پر بائیں جانب کافی دور چھوڑتے ہوئے اپنی فوج کے ہمراہ پایاب دریا کو عبور کیا اور شالامار باغ کی جانب بڑھا، جہاں اس نے پڑاؤ ڈال دیا۔ حاکم لاہور نے دو دن کی جھڑپوں کے بعد یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اس خوفناک دشمن کی مزاحمت کے

لیے کوئی کوشش بار آور نہیں ہو گی۔ ایرانی بادشاہ سے امن پر صلح کر لی۔

شوال کی 12 تاریخ کو نادر شاہ نے ایک کھلے دربار میں حاکم لاہور کا ہر لحاظ سے بڑی شان اور تواضع سے استقبال کرتے ہوئے اسے طلائی زربفت کا ایک چپکن، جواہرات کے جڑاؤ والا ایک خنجر اور ایک گھوڑا پیش کیا۔ 14 تاریخ کو اس نے نادر شاہ سے دوبارہ ملاقات کی اور اسے بیس لاکھ روپے کی رقم پیش کی۔ اس میں شہر کے متمول شہریوں نے بھی اپنا حصہ ڈالا تھا۔ چونکہ بادشاہ کے حرص و لالچ کا کسی حد تک سامان کر دیا گیا تھا چنانچہ اس وجہ سے لاہور قتل و غارت گری اور لوٹ مار سے محفوظ رہا۔ ایک ہمعصر مؤرخ لکھتا ہے کہ ایرانی بادشاہ چونکہ ناظم (اعزالدولہ زکریا خاں) پر بہت مہربان تھا چنانچہ اس نے اپنے دوسرے بیٹے حیات اللہ خاں بہادر کو اس کی خدمت میں چھوڑا اور اسے پانچ سو گھڑ سواروں کے دستہ کا امیر مقرر کیا (122۔ 29 دسمبر کو نادر شاہ کی فوج لاہور سے دہلی روانہ ہو گئی۔

عبدالصمد خاں اور اس کے بیٹے زکریا خاں کے مستحکم دور حکومت میں سکھوں نے اپنے آپ کو ایک صلح جو قوم کے طور پر پیش کرتے ہوئے اپنے دیہات میں بھائی چارے اور یگانگت کی فضاء قائم کر دی تھی یا لوٹ مار کے ذریعہ گزر اوقات کرنے کے لیے جنگلوں اور وادیوں میں نکل گئے تھے لیکن دہلی کی اسلامی سلطنت کی سراسیمگی اور حاکم لاہور کے دربار کی حماقتوں اور سازشوں کی فضاء ان کے لیے سازگار ثابت ہوئی۔ اپنے آپ کو عسکری لحاظ سے منظم کرنے کے بعد انہوں نے دیہات پر حملہ کر کے شہروں اور قصبوں میں لوٹ مار مچا دی۔ لاہور کے شمال میں ایمن آباد کے ملحقہ علاقوں میں غارت گری کرنے کے بعد سکھوں کی ایک فوج مال غنیمت حاصل کرنے کے لیے روانہ ہوئی۔ زکریا خاں، خان بہادر کے بیٹے اور جانشین یحییٰ خاں نے اپنے دیوان اور وزیر اعظم لکھپت رائے کے بھائی جسپت رائے کی قیادت میں فوجی دستے روانہ کیے۔ سکھوں نے حاکم لاہور کی فوج کو شکست دی اور ان کے سردار کو قتل کر دیا۔ حاکم لاہور نے لکھپت رائے کی قیادت میں ایک بہت بڑی فوج روانہ کی۔ اس نے اپنے بھائی کی موت کا بدلہ لینے کے لیے حملہ آوروں کی ایک بہت بڑی تعداد کو ہتہ تیغ کر ڈالا اور بہت سے سکھوں کو پابہ زنجیر کر کے لاہور لایا گیا جہاں انہیں "گھوڑا نخاس" یا گھڑ بازار میں انتہائی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اسی وقت سے سکھ اس واقعہ کی یادگار کے طور پر اس مقام کو "شہید گنج" پکارنے لگے۔ اس قتل گاہ کی مزید نشاندہی ایک سمادھی سے بھی ہوتی ہے جو شہید اعظم اور گورو گوبند کے دیرینہ ساتھی، بھائی تارو سنگھ کی یاد میں تعمیر کی گئی ہے۔ اس نے اگرچہ معافی کی پیشکش کر دی تھی لیکن پھر بھی اس نے کہا اگر میں اپنے

مذہب کی ظاہرا شکل سے دستبردار ہو گیا یا اپنے مذہب کو ترک کر بیٹھا تو میں اس ذلت آمیز قید پر موت کو ترجیح دوں گا۔ یہ واقعہ 1746ء میں رونما ہوا۔

احمد شاہ کا حملہ

اس واقعے کے دو سال بعد یا 1748ء میں نادر شاہ کا جانشین احمد شاہ ہندوستان کو فتح کرنے کے ارادے سے 12،000 درانی گھڑ سواروں کی قیادت کرتا ہوا دریائے سندھ کو عبور کر کے دریائے راوی تک آن پہنچا۔ اس وقت زکریا خاں کے دونوں بیٹوں یحییٰ خاں اور حیات اللہ خاں المعروف شاہ نواز خاں (123)، کے درمیان لاہور کی حکومت کے لیے زور آزمائی ہو رہی تھی۔ مؤخرالذکر جو اس وقت ملتان کا حاکم تھا، اس نے اپنے بڑے بھائی یحییٰ خاں کو شکست دے کر پنجاب کی حکومت حاصل کر لی۔ دہلی دربار یا تو بہت کمزور ہو چکا تھا یا مداخلت کے سلسلہ میں غیر جانبدار ہو چکا تھا۔ شاہ نواز خان نے شاہی دربار سے احمد شاہ کے حملہ کے خلاف امداد مانگی لیکن بے سود ثابت ہوئی۔ دہلی سے آڑے وقت میں امداد کی توقعات پوری نہ ہونے پر مایوس ہو کر شاہنواز خاں نے شہر کے دروازوں اور گلیوں میں حفاظتی دستے مقرر کر کے قصور کے سردار ذاللہ خاں کی قیادت میں ایک فوج کابل کی فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے روانہ کی۔ پٹھان سردار اپنی پوری قوت کے ساتھ دشمن پر چڑھ دوڑا۔ احمد شاہ نے اپنے خاندانی مبلغ صابر شاہ کو حاکم لاہور کو بات چیت کے ذریعے قائل کرنے اور مزید کارروائی سے باز رہنے کے لیے اس کے پاس بھیجا۔ شاہ نواز خان نے دینی پیشوا کا کھلے دربار میں بڑی تواضع سے استقبال کیا لیکن اس کی گستاخی پر جلاد کی تلوار سے اس کا سر قلم کرا دیا (124)۔ اس ذلت سے احمد شاہ درانی اس قدر مشتعل ہو گیا کہ اس نے فوراً دریائے راوی کو عبور کیا اور اپنی فوج کی قیادت کرتا ہوا شہر لاہور کی فصیل کے سامنے پہنچ گیا۔ حاکم لاہور نے شہر کی فصیل کے نیچے خندقوں میں بیٹھ کر مقابلہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی یہ مزاحمت بہت کمزور تھی۔ اس کے نتیجہ میں فصیل پر جلد ہی درانی جنگجوؤں نے قبضہ کر لیا۔ شاہنواز خان لاہور اور اس کے عوام کو حملہ آور کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود دہلی فرار ہو گیا۔ جلد ہی احمد شاہ نے شہر پر قبضہ کر لیا اور شہر کے لوگوں سے بھاری تاوان حاصل کیا۔

احمد شاہ دہلی کی طرف بڑھا لیکن سرہند کے مقام پر مرحوم وزیر قطب الدین کے بیٹے معین الملک المعروف میر منو کی بہادری اور مہارت کی اعانت حاصل ہونے پر قائم مقام بادشاہ کی فوج کی

مزاحمت کے باعث پسپا ہونے پر مجبور ہو گیا۔ میر منو کو لاہور کی حاکمیت عطا کر دی گئی۔

اپریل 1748ء میں بادشاہ محمد شاہ دہلی میں فوت ہو گیا۔ ولی عہد شہزادہ کو پنجاب سے واپس بلا لیا گیا۔ احمد شاہ کو جیسے ہی اس بات کی اطلاع ملی وہ اپنی فوج کی پسپائی کو ترک کر کے اپنی معمول کی فوجی مہم پر لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔ میر منو جس کے بلند حوصلہ اور ذہانت نے درانیوں کے پہلے حملہ کو ناکام بنا دیا تھا لاہور سے باہر نکل کر چناب کے جنوب کی طرف سدھورا میں خندق کھود کر محاذ قائم کر لیا اور اتنی شجاعت اور دلیری کا مظاہرہ کیا کہ احمد شاہ کو اس وقت تک توسیع کے لیے مزید منصوبہ جات بنانے سے روک دیا۔ تاہم اس نے لاہور کے حاکم کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ تمہاری بقاء اسی میں ہے کہ تم لاہور کے چاروں اضلاع یعنی سیالکوٹ، ایمن آباد، پسرور اور اورنگ آباد کی آمدنی میرے حوالے کر دو۔ یہ سارے انتظامات کرنے کے بعد وہ واپس قندھار لوٹ گیا۔

توقع کے مطابق میر منو مطلوبہ آمدنی کابل روانہ نہ کر سکا۔ چنانچہ احمد شاہ کو ایک مرتبہ پھر پنجاب پر حملہ کرنے کا بہانہ ہاتھ آ گیا۔ لہٰذا اس نے 1752ء میں دوبارہ حملہ کر دیا۔ میر منو نے اپنی مدد کے لیے جالندھر دوآب کے حاکم آدینہ بیگ خاں اور ملتان کے دیوان راجہ کوڑا مل کو بلا لیا اور شاہدرہ کے قریب دریائے راوی کے کنارے پڑاؤ ڈال کر چاروں طرف خندق کھود کر محاذ قائم کر لیا لیکن جیسے ہی درانی فوجیں حصار کو توڑ کر تیزی سے مشرقی جانب بڑھیں تو حاکم لاہور، لاہور کی طرف چلا گیا۔ اس نے تمام گلیوں کی ناکہ بندی کی اور اندرونی دفاع کو مستحکم کرنے کے بعد شہر کی فصیل کے سامنے خندق میں مورچہ بندی کر کے بیٹھ گیا۔ درانی فوج نے لاہور کا محاصرہ کر لیا۔ احمد شاہ شالا مار باغ سے ملحقہ علاقہ میں خیمہ زن ہو گیا۔ بہادر میر منو نے چار ماہ تک بڑے پرعزم طریقے سے اس صورتحال کو برقرار رکھا اور صرف دفاعی کارروائیوں پر کاربند رہ کر عام حملے سے گریز کرتا رہا۔ دونوں فریقین کی جانب سے چھوٹی موٹی جھڑپوں توپوں کی گولہ باری اور توڑے دار بندوقوں کی گولیوں کے تبادلے کا سلسلہ جاری رہا لیکن دشمن کا محاصرہ بہت سخت تھا اور رسد پہنچنے میں بھی ناکامی ہو رہی تھی۔ چنانچہ لاہور کی فوج نے 12 اپریل 1752ء کو صبح سویرے نہایت تیزی سے باہر نکل کر گاؤں محمود بوٹی کے قریب واقع ایک اینٹوں کے بھٹہ میں مورچہ سنبھال لیا۔ احمد شاہ کی فوج نے معمول کے مطابق مارچ کرتے ہوئے پیش قدمی کی اور اس کے توپ خانے نے لاہور کی فوج پر فائر کھول دیا لیکن اس گولہ باری کا جواب اس قدر طاقت اور مہارت سے دیا گیا کہ اسی دن دوپہر تک حملہ آور فوج کے سرکردہ افسر پریشان ہو گئے۔ احمد شاہ نے یہ دیکھتے ہوئے حکم دیا کہ فوج کا

انتظام اب تازہ دم گھڑ سوار درانیوں کے حوالے کر دیا جائے۔ حیرانی کی بات ہے کہ فتح کا پیمانہ یکدم بدل گیا۔ میر منو کو اپنے خندقی مورچوں میں واپس جانے پر مجبور کر دیا گیا جہاں وہ ابھی تک زمین سے چمٹا بیٹھا تھا۔ حالات اب اس کے قابو سے باہر ہو گئے تھے۔ چنانچہ اس نے اپنے آپ کو حالات پر چھوڑ دیا۔ آدینہ بیگ خاں اچانک اپنے دستوں کو میدان سے نکال کر لے گیا جبکہ جس ہاتھی پر راجہ کوڑا مل سوار تھا اس کا پاؤں ایک پرانی قبر کے گڑھے میں دھنس گیا۔ راجہ کو ایک درانی گھڑ سوار نے پکڑ کر قتل کر دیا۔ میر منو نے جب اپنی حالت کو غیر مستحکم محسوس کیا تو بادشاہ کی اطاعت کر لی۔

احمد شاہ نے وزیر جہاں شاہ کے توسط سے حاکم لاہور کو شرف بازیابی بخشا اور اسے بڑی تواضع اور اعزاز کے ساتھ خوش آمدید کہا۔ تمام موقعوں پر میر منو نے جس حوصلہ، عزم اور ذہانت کا مظاہرہ کیا بادشاہ نے اس کی بہت تعریف کی۔ اسے "رستم ہند" کہا اور اسے نہایت قیمتی خلعت سے نوازنے کے بعد فرزند خاں کا لقب عطا کیا اور اس سے ایک بھاری تاوان وصول کرنے کے بعد اسے کابل کی درانی حکومت کے تحت دوبارہ پنجاب کا حاکم مقرر کر دیا گیا۔

میر منو اپنے نئے اعزازات سے مستفید ہونے کے لیے زیادہ دیر تک زندہ نہ رہ سکا۔ وہ اسی سال (1752ء) میں اپنے گھوڑے سے گر کر ہلاک ہو گیا۔ اس نے پسماندگان میں ایک شیر خوار بیٹا امین الدین خان اور بیوہ مراد بیگم چھوڑی وہ بہت بلند حوصلہ اور ذہین عورت تھی۔ ابدالی کے ذہن میں اس افسر کے متعلق کچھ اس قدر احترام سمایا ہوا تھا کہ اس نے اس کی موت کے بعد بھی لاہور اور ملتان کے صوبوں کو اس کے خاندان کے انتظام کے تحت چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور اس کے شیر خوار بیٹے کو اس کی ماں کی اتالیقی کے تحت حکومت کے لیے منتخب کر لیا۔ دس ماہ کے بعد بچے کا انتقال ہو گیا اور بیگم کو چونکہ صوبہ کے سرداروں کی کافی حمایت حاصل تھی چنانچہ اس نے اپنے حاکم پنجاب ہونے کا اعلان کر دیا اور کابل اور دہلی کے درباروں میں اپنی حیثیت کو محفوظ کرنے کے لیے نمائندے بھیجے۔

اس کا دوغلا پن جلد ہی بے نقاب ہو گیا۔ دہلی کا ایک وزیر غازی الدین عماد الملک ایک بہت بڑی فوج کی قیادت کرتے ہوئے لاہور کی طرف روانہ ہوا۔ وہ اپنے ساتھ قائم مقام بادشاہ اور عالمگیر ثانی کے سب سے بڑے بیٹے مرزا علی گوہر کو بھی لے کر آیا جو احمد شاہ کے بعد دہلی کی حکومت کا جانشین بنا۔ لاہور میں انقلابی صورت حال پیدا ہو گئی اور بادشاہ کی قائم مقام بیگم کو اس کی خوابگاہ میں ہی قیدی بنا لیا گیا۔ نوجوان وزیر نے بیوہ کی لڑکی کا ہاتھ مانگ لیا کیونکہ وہ کافی دیر سے اس سے شادی کرنے کا خواہشمند تھا۔ آدینہ بیگ خاں کو اس شرط پر حکومت کے عہدہ پر مقرر کیا گیا کہ وہ

30 لاکھ روپے شاہی خزانے کو خراج کے طور پر پیش کرے گا۔ غمزدہ بیگم نے اپنے داماد کے ظلم پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی اور دہلی کی سلطنت کے زوال کے لیے شہر کی تباہی کے لیے اور امراء کی ذلت کے لیے پشین گوئیاں کرنے لگی (125)۔

احمد شاہ ابدالی نے جیسے دہلی کے وزیر کے حملہ کے بارے میں سنا تو وہ فوراً قندھار سے روانہ ہوا اور (56-1755ء) میں دریائے سندھ کو عبور کر کے بغیر کسی مزاحمت کے لاہور پر قابض ہو گیا۔ آدینہ بیگ خاں نے جب اپنے آپ کو مزاحمت کے قابل نہ پایا تو حصار کی طرف فرار ہو گیا۔ متھرا اور دہلی کو غارت کرنے کے بعد احمد شاہ لاہور واپس آیا اور اپنے بیٹے تیمور شاہ کو اپنے وزیر سردار جہاں کی نگرانی میں دریائے سندھ کے مشرقی صوبوں کی دیکھ بھال کے لیے نامزد کرنے کے بعد اپنی عظیم الشان فوج کے ہمراہ قندہار واپس لوٹ گیا۔

بعد ازاں سکھ اپنی تعداد اور اپنی گستاخیوں میں بہت بڑھ گئے اور ان کے مسلح جتھوں نے پنجاب کے مختلف اضلاع کو تہہ و بالا کر دیا۔ سکھوں کی زیادتیوں کا بدلہ چکانے کے لیے تیمور شاہ ان کے دارالحکومت امرتسر کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے ان کے مقدس تالاب اور عبادت کے دیگر مقامات کو گندگی سے آلودہ کر دیا۔ اس کارروائی سے سکھ غضب ناک ہو کر جتھوں کی صورت میں لاہور کی طرف چڑھ دوڑے۔ انہوں نے اس کے ارد گرد کے دیہاتوں اور قصبوں کی آمدنی کو بانٹ لیا۔ تیمور شاہ نے اپنی بچی کھچی فوج کے ساتھ ان پر لگاتار حملے کیے لیکن اس کو مسلسل شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ آخرکار اسے پنجاب کا علاقہ خالی کر کے دریائے سندھ سے پار جانے پر مجبور کر دیا گیا اور پنجاب کا دارالخلافہ پہلی مرتبہ سکھوں کے قبضہ میں آ گیا۔ (57-1756ء)، ان کے رہنما جسّا سنگھ کلال نے حکم جاری کیا کہ روپے سکوں کی صورت میں بنائے جائیں اور ان پر یہ عبارت کندہ کی جائے۔

سکہ زد در جہان بفضل اکال　　ملک احمد گرفت جسّا کلال

ترجمہ: "جسا کلال نے احمد کے ملک پر قبضہ کر لیا ہے اور اکال کی مہربانی سے دنیا میں سکہ رائج کر دیا ہے۔"

لیکن لاہور پر ان کا قبضہ بہت کم عرصہ کے لیے تھا۔ آدینہ بیگ خاں کے صبر و تحمل سے ناجائز فائدہ اٹھا کر سکھوں نے اپنی طاقت میں بے پناہ اضافہ کر لیا یہ محسوس کرتے ہوئے کہ گرو کے چیلے ہر موقع کو اپنے ہی فائدہ کے لیے استعمال کر کے سرکش ہو رہے ہیں۔ اس نے مرہٹوں کو آنے کی دعوت دی۔ وہ اس وقت دہلی میں تھے۔ پنجاب کے زرخیز صوبہ کو فتح کرنے کے لیے ان کی پیش قدمی

کے اخراجات ادا کرنے کا ان سے وعدہ کیا گیا۔ رگھو ناتھ راؤ اور ملہار راؤ کی قیادت میں لاہور پر مرہٹوں کا قبضہ ہو گیا۔ انہوں نے سکھوں کو نکال باہر کیا۔ آدینہ بیگ خاں کو 1758ء میں لاہور کا حاکم مقرر کیا گیا۔ تاہم اس کو اپنے نئے عہدے پر فائز ہوئے ابھی تھوڑا عرصہ ہی ہوا تھا کہ اس کا انتقال ہو گیا۔

مرہٹوں کی کامیابی احمد شاہ ابدالی کے پانچویں حملہ کی وجہ بن گئی اور پانی پت کے مقام پر 1761ء میں زبردست جنگ لڑی گئی جس کے نتیجہ میں ان کی فوج مکمل طور پر تباہ ہو گئی جو تین لاکھ جنگجو سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ اس طرح ان کی طاقت بالکل ختم ہو کر رہ گئی۔ بلند خاں پٹھان کو لاہور کا حاکم فوجداری مقرر کیا گیا لیکن اس وقت تک سکھوں کی قوت میں بے پناہ اضافہ ہو چکا تھا۔ امرتسر میں ان کے سرعام اجلاس ہوتے اور گرو کے پیروکار مقدس تالاب میں آزادانہ غسل کرتے تھے۔ افغان حاکم لاہور خواجہ عبید جو بلند خاں کا جانشین تھا اسے شہر کی فصیل سے نکلنے کا حوصلہ نہ ہو سکا۔

ان واقعات کی خبر احمد شاہ ابدالی تک پہنچی تو وہ نومبر 1762ء میں دوبارہ حملہ آور ہوا۔ یہ اس کا چھٹا حملہ تھا۔ احمد شاہ اپنی بڑی فوج کے ساتھ لاہور میں داخل ہوا اور ستلج کے جنوبی کنارے پر کوٹ بھیرہ کے میدانوں میں افغانوں اور سکھوں کے درمیان خونریز لڑائی لڑی گئی جس میں سکھوں کو مکمل طور پر شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ سکھ اس نقصان کو "گھلو گھارا" یا قتل عام کے نام سے پکارتے ہیں۔ اسی سال احمد شاہ ایک کھتری کابلی مل کو لاہور میں حاکم مقرر کر کے کابل لوٹ گیا۔ ابھی احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان کے علاقے سے رخصت ہوئے تھوڑا عرصہ ہی ہوا تھا کہ سکھ جو ہر وقت تیار رہتے تھے، اپنی پہاڑی کمین گاہوں سے ایک نئی طاقت اور بیشمار تعداد میں میدانوں کی طرف چڑھ دوڑے۔ انہوں نے قصور میں لوٹ مار کرنے کے بعد قدیم قصبے سرہند کو زمیں بوس کر دیا۔ اس کارروائی نے احمد شاہ ابدالی کو پنجاب میں اپنے ساتویں حملے کے لیے اکسایا۔ لہذا وہ جنوری 1764ء میں لاہور شہر کی فصیلوں تک آن پہنچا۔ اس کی آمد پر سکھوں نے اپنا پرانا طریقہ اختیار کیا اور ہر طرف منتشر ہو کر پھیل گئے۔ لہذا احمد شاہ کو انہیں سزا دینے کا موقع میسر نہ آسکا اور وہ واپس کابل کی طرف لوٹ گیا۔

لاہور پر سکھوں کا قبضہ

سکھوں نے دوبارہ جمع ہو کر احمد شاہ کے ہندو حاکم (126) ، کو نکال باہر کیا اور خود لاہور کے مالک بن گئے۔ انہوں نے شہر کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا اور اس پر بالترتیب گجر سنگھ، لہنہ سنگھ اور سوبھا سنگھ قابض ہو گئے۔ انہیں لاہور کے تین بڑے سردار کہا جاتا تھا۔ پہلے کا علاقہ شالا مار سے لاہور تک محیط تھا، وہاں پر اس نے اپنے لیے ایک قلعہ بھی تعمیر کرایا جو بعد میں اس کے نام سے مشہور ہوا۔ لہنہ سنگھ نے قلعہ (شہر پناہ) کا انتظام سنبھالا۔ اس کا علاقہ میستی، حضری، کشمیری اور روشنائی دروازوں کے اندر کا علاقہ تھا اور سوبھا سنگھ زبندہ بیگم کے باغ میں (جو اب نواں کوٹ کہلاتا ہے) آباد ہو گیا۔

جب لاہور کے بھنگی سردار پنجواڑ کی طرف واپس چلے گئے تو احمد شاہ ابدالی نے 1767ء میں آخری بار پنجاب پر حملہ کیا۔ تجربہ کار اور چوکس فرمانروا کافی سال تک انتظار کرتا رہا لیکن اسے صوبے کے انتظام کے لیے کوئی قابل شخص میسر نہ آسکا۔ چنانچہ اس نے سکھوں کے معاملہ میں مصالحتی حکمت عملی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ لہذا اس نے لہنہ سنگھ کو واپس بلوایا اور اسے لاہور کا انتظام سونپ کر کابل واپس چلا گیا جہاں وہ جون کے آغاز میں 1773ء میں انتقال کر گیا (127) ۔

شاہ زمان کا حملہ :۔ اس واقعہ کے تیس سال بعد تک سکھ بھنگی سرداروں نے بڑے صبر و تحمل سے لاہور پر حکومت کی لیکن یہ سکوت 1797ء میں اس وقت ٹوٹا جب تیمور شاہ کا بیٹا اور مشہور و معروف احمد شاہ ابدالی کا پوتا شاہ زمان 33,000 افراد پر مشتمل فوج (جو تقریباً سبھی گھڑ سوار تھے) کی قیادت کرتا ہوا لاہور کی طرف بڑھا۔ افغان فرمانروا کی اتنی بڑی فوج کے ساتھ آمد کی وجہ سے نہ صرف پنجاب کے لیے بہت زیادہ خطرہ پیدا ہو گیا بلکہ اس کی وجہ سے کلکتہ میں بھی سنسنی پھیل گئی۔ گورنر جنرل سرجان شور نے اپنی 4 جولائی 1797ء کی تحریر میں اس کی روداد بیان کی ہے اور اس کی پیش قدمی کے بارے میں بڑی تفصیل سے امکانات کا جائزہ لیتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچے کہ لاہور پر اس کا حملہ اگرچہ ایک تجرباتی نوعیت کا تھا لیکن اس کا اصل مقصد ہندوستان پر حملہ کرنا تھا۔ مقامی فوج میں اضافہ کیا گیا اور فوجی دستوں کو یہ حکم دے دیا گیا کہ وہ مختلف چھاؤنیوں میں ہر وقت تیار رہیں۔ ان کی خدمات کی ضرورت کہیں پر بھی پڑ سکتی ہے۔

جاڑے کا موسم شروع ہوتے ہی لوگوں نے دیکھا کہ کابل کے پہاڑی فرمانروا اپنے سروں پر بھیڑ کی کھال کی لمبی ٹوپیاں پہنے محل کی فصیل تک آن پہنچے ہیں۔ لاہور کے عمر رسیدہ شہریوں کو ابھی

تک یاد تھا کہ اس دور میں بھی اسی طرح کے لباس میں ملبوس نوجوان جنگجو اسی طرح بڑی شان سے عالی شان گھوڑے پر سوار تھا۔ شاہ زمان کی آمد پر لہنہ سنگھ لاہور سے باہر نکل گیا لیکن اس کی آمد پر پیدا ہونے والا خطرہ اس وقت ٹل گیا جب بادشاہ کو اپنے علاقوں کی طرف واپس جانا پڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے بھائیوں میں سے ایک نے بغاوت کر کے ملک کا امن و امان تباہ کر دیا تھا۔ تاہم اس نے اس وقت تک پنجاب کے دارالحکومت کو خیرباد نہیں کہا جب تک اس شہر کے چند متمول شہریوں سے 30 لاکھ روپے کی مالی امداد حاصل نہ کر لی۔

شاہ زمان 1798ء میں لاہور میں دوبارہ نمودار ہوا لیکن وہ یہاں چند ماہ تک ہی ٹھہر سکا۔ کیونکہ ایران سے آنے والی اطلاعات نے اس کی روانگی کو ضروری بنا دیا۔ تاہم یہ سال تاریخ میں اس لیے بھی یادگار سمجھا جائے گا کیونکہ اسی دور میں سکرچاکیہ مسل کے مہا سنگھ کے بیٹے رنجیت سنگھ نے پنجاب کی شاہی حکومت کو حاصل کرنے کے لیے مبینہ طور پر اس طرف پیش قدمی کر دی تھی۔ درانی حکومت کے لیے پیش کردہ نمایاں خدمات اور خاص طور پر دریائے جہلم میں ڈوبنے والی 12 میں سے 8 توپوں کی بازیابی کرا کے انہیں کابل بھیجنے کے صلے میں واپس لوٹنے والے حکمران نے رنجیت سنگھ کو رسمی طور پر لاہور شہر کی حکومت پیش کی۔ یہ تحفہ بس برائے نام ہی تھا کیونکہ رنجیت سنگھ نے خود ہی اس قدیم شہر کی حکومت حاصل کر لینا تھی۔ اس سے دونوں مقاصد حاصل ہو سکتے تھے یعنی اس سے طاقتور ہمسایہ کی حمایت بھی حاصل ہو سکتی تھی اور مسلمان آبادی کے حسد سے بھی بچا جا سکتا تھا۔ اس وقت سے لاہور کی تاریخ اس عظیم مہاراجہ کی تاریخ میں مدغم ہو گئی۔ چونکہ تاریخ کا مطالعہ کرنے والے اس کی زندگی کے واقعات سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ اس لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ایک مختصر سا خاکہ یہاں پیش کر دیا جائے۔

رنجیت سنگھ کا لاہور پر قبضہ

تینوں حکمرانوں (لاہور کے) میں سے سوبھا سنگھ، شاہ زمان کی 1797ء میں لاہور میں پہلی مرتبہ آمد کے بعد فوت ہو گیا اور اس کا بیٹا موہر سنگھ اس کا جانشین بنا جبکہ چیت سنگھ، لہنہ سنگھ کا جانشین بن گیا۔ ان تینوں میں سے سب سے زیادہ طاقتور گجر سنگھ کا بیٹا صاحب سنگھ یہاں موجود نہیں تھا بلکہ اس وقت گجرات میں تھا۔ چیت سنگھ اور موہر سنگھ دونوں نے لاہور میں نہ تو اپنا کوئی کردار ہی پیش کیا اور نہ کوئی اثر و رسوخ قائم کر سکے۔ ان کے اپنے پیروکاروں حاکم رائے، بھائی

گورنجش سنگھ ، میاں عاشق محمد اور میر شادی نے رنجیت سنگھ سے گٹھ جوڑ کر لیا تھا، جو ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ انار کلی میں داخل ہوا۔ محکم دین چودھری جو "لاہوری دروازے" کا نگران تھا، اس نے اس کو حملہ آور کے لیے کھول دیا اور اس نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ چیت سنگھ اور موہر سنگھ فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ 1799ء میں اس نے حکومت کے منصب کے مطابق "سرکار" کا لقب اختیار کیا اور 1800ء میں ایک ٹیکسال قائم کی۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ حالانکہ رنجیت سنگھ نے اپنی طرز زندگی کا آغاز ایک حکمران کے طور پر کیا تھا لیکن اس نے نہ تو شاہی القابات ہی اختیار کیے اور نہ شاہانہ جاہ و جلال کا خواہشمند ہوا۔ اس کے سکوں پر اس کا نام نہیں لکھا گیا۔ اس نے کسی جگہ اپنا نام مقرر نہیں کیا اور نہ کسی شے کو اپنے نام سے منسوب ہی کیا۔ اس نے امرتسر میں جو قلعہ تعمیر کرایا تھا اس کو بھی "گوو ند گڑھ" کے نام سے پکارتا تھا۔ حتیٰ کہ اس نے وہاں پر جو باغ لگوایا تھا اس کو بھی "رام باغ" کا نام دیا۔ 1802ء میں اس نے آخری مشہور بھنگی سردار کی بیوہ کو بے دخل کر کے سکھوں کے دارالحکومت امرتسر کو فتح کر لیا۔ 1806ء میں اس نے ستلج کو عبور کر کے لدھیانہ پر قبضہ کر لیا۔ اگلے سال اس نے قصور کو فتح کیا اور 1809ء میں اس نے انگریزوں کی حکومت یعنی (برطانوی حکومت) سے ایک معاہدہ کیا اور انہوں نے اس کی خواہش کے مطابق دریائے ستلج کے شمال اور مغرب کی طرف کے علاقہ کو اس کی حدود میں شامل کر دیا۔ یہ رنجیت سنگھ کی نیک نامی تھی کہ وہ مرتے دم تک اس معاہدے پر نہایت وفاداری کے ساتھ کاربند رہا۔ اسی سال اس نے سنسار چند سے "کانگڑہ" بھی ہتھیا لیا۔ 1813ء میں اس کی فوج نے دیوان محکم چند کی زیر قیادت کابل کے وزیر فتح خاں اور اس کے بھائی دوست محمد خاں کو شکست دے کر اٹک پر قبضہ کر لیا۔ 14-1813ء میں اس نے کابل کے سابق بادشاہ، شاہ شجاع سے مشہور ہیرا "کوہ نور" زبردستی چھین لیا۔ 1818ء میں اس نے ملتان پر قبضہ کر لیا۔ اسی سال کے آخر میں وہ دریائے سندھ کو پار کر کے پشاور میں داخل ہوا جو اس کی آمد پر بالکل خالی ہو گیا تھا۔ 1819ء میں اس کی فوج نے شہزادہ کھڑک سنگھ اور مسر دیوان چند کی قیادت میں کشمیر فتح کر لیا۔ 20-1819ء میں دریائے سندھ کے ڈیرہ جات اس کے علاقہ میں شامل ہوگئے۔ 1834ء میں اس کے سپہ سالاروں نے جموں کے راجاؤں کی قیادت میں لداخ کو تسخیر کر لیا۔

رنجیت سنگھ 27 جون 1839ء میں 57 سال کی عمر میں لاہور میں انتقال کر گیا۔ وہ زندہ بھی ایک شیر کی طرح رہا اور مرا بھی ایک بوڑھے شیر کی طرح۔ اس نے اپنے چالیس سالہ دور حکومت میں نہ صرف اپنی قوم کے بلند حوصلہ سرداروں کے غرور کو خاک میں ملایا بلکہ 300 قابل

تعریف توپوں کے سمیت 80,000 ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک منظم مسلح فوج بھی تیار کی۔ اس نے اپنے پیچھے ایک ایسا ملک چھوڑا جو تبت سے لے کر کوہ سلیمان کے سلسلہ تک اور اس طرف دریائے سندھ سے لے کر ملتان تک پھیلا ہوا تھا۔

رنجیت سنگھ کے جانشین

رنجیت سنگھ کے بعد اس کا سب سے بڑا بیٹا کھڑک سنگھ اس کا جانشین بنا۔ وہ ایک کم عقل حکمران ثابت ہوا۔ 1840ء میں اس کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا نونہال سنگھ اس کا جانشین مقرر کیا گیا۔ جب وہ اپنے باپ کی آخری رسومات ادا کر کے واپس آ رہا تھا تو راستے میں حضوری باغ کی طرف جاتے ہوئے ایک محرابی دروازے کا ایک حصہ گر جانے کے باعث ہلاک ہو گیا۔ اسی دن لوگوں نے اس کی تاجپوشی کا نظارہ کیا تھا اور اسی دن وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ رنجیت سنگھ کے مشہور و معروف بیٹے شیر سنگھ کو حکمران منتخب کر لیا گیا لیکن کھڑک سنگھ کی بیوہ اور مرنے والے شہزادے کی ماں چند کور نے حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی۔ شیر سنگھ جو فوج میں بہت مقبول تھا۔ اس نے 14 جنوری 1841ء کو لاہور پر حملہ کر دیا اور مائی چند کور کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے اپنے مہاراجہ ہونے کا اعلان کر دیا اور دھیان سنگھ کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ "سندھیانوالوں" نے سوچا کہ انہیں نئے حکمران کے خلاف اپنی جارحیت کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے اس کی تباہی کے لیے ایک منصوبہ تیار کر لیا اور اجیت سنگھ نے 15 ستمبر 1843ء کو شیر سنگھ اور بعد میں اسی طرح دھیان سنگھ کو بھی قتل کر دیا۔ دھیان سنگھ کی موت کا بدلہ لینے کے لیے اس کے بیٹے ہیرا سنگھ نے لاہور کا محاصرہ کر لیا اور قلعے پر حملہ کر دیا۔ فوج نے اس کے حکم پر فوری طور پر عمل کرتے ہوئے دونوں مقامات کو فتح کر لیا۔ اجیت سنگھ کو قلعے کی ایک اونچی دیوار سے فرار ہونے کی کوشش میں گرفتار کر لیا گیا اور اس کی سازش میں پہلے سے شریک ساتھی لہنہ سنگھ کو فوری طور پر قتل کر دیا گیا۔ دلیپ سنگھ نے اپنے مہاراجہ ہونے کا اعلان کر دیا اور ہیرا سنگھ کو اپنا وزیر مقرر کیا۔

نیا وزیر عملی طور پر پنجاب کا حکمران تھا لیکن اس کو مکمل طور پر اپنے پیشوا پنڈت جلہ کی رہنمائی حاصل تھی۔ راجہ ہیرا سنگھ کی حکومت کے سب سے بڑے دو دشمن اس کا چچا سچیت سنگھ اور سردار اتر سنگھ سندھیانوالہ تھے۔ اس کے خلاف ایک بہت بڑی فوج روانہ کی گئی۔ دلیر راجہ آخر دم تک لڑتا ہوا لاہور کے نواحی علاقہ میں میاں وڈا کے مزار کے قریب مارا گیا۔ لاہور سے روانہ کی گئی

ایک بہت بڑی فوج کے ذریعے فیروز پور کے قریب اتر سنگھ اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مشہور بیٹے کشمیرا سنگھ پر زبردست حملہ کیا گیا اور اس میں دونوں قتل ہو گئے۔ جلہ پنڈت نے اپنے متکبرانہ رویہ کے تحت سکھوں کو بھڑکایا اور بادشاہ کی ماں کی قانون شکنی کی۔ وہ اور اس کا آقا ہیرا سنگھ لاہور سے فرار ہونے لگے لیکن انہیں شاہدرہ کے قریب جا لیا گیا اور 21 دسمبر 1844ء کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

لاہور پر برطانوی فوج کا قبضہ

رانی کا بھائی جواہر سنگھ اور اس کا منظور نظر لعل سنگھ انتظامیہ کے بارسوخ ارکان بن گئے۔ مؤخرالذکر کو باقاعدہ طور پر وزیر مقرر کیا گیا لیکن اس نے خالصہ فوج کی ناراضگی مول لے لی۔ اس کی مذمت کی گئی اور 21 ستمبر 1845ء میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ فوج کو اب پورے اختیارات حاصل ہو گئے تھے۔ انگریزوں سے جنگ کے امکان کے تحت لعل سنگھ کو وزیر اور تیج سنگھ کو سپہ سالار منتخب کر لیا گیا۔ انگریزوں سے جنگ کا اعلان 17 نومبر کو کر دیا گیا اور سکھ فوج نے 11 دسمبر 1845ء کو ستلج کو عبور کر لیا۔ جنگ مدکی (18 دسمبر) جنگ فیروز شہر (21 اور 22 دسمبر) بدووالٰ کی جھڑپ (21 جنوری 1846ء) جنگ علی وال (28 جنوری) اور سوبراؤں کی جنگ (10 فروری) کے نتیجہ میں سکھوں کو مکمل طور پر شکست ہو گئی اور لاہور پر برطانوی فوجوں کا قبضہ ہو گیا۔ برطانوی فوج 20 فروری 1846ء کو سکھوں کے دارالحکومت میں آئی اور قلعہ میں انگریز فوجوں نے چھاؤنی قائم کر لی۔ برطانوی حکومت کی نگرانی میں حکومت کے انتظام اور نظم و نسق کے لیے ایک مجلس کے تحت لاہور میں اجلاس منعقد ہوا اور اس کے دوران ہی اقلیت کے نمائندوں دلیپ سنگھ اور لعل سنگھ جنہوں نے اس بغاوت کو بھڑکایا تھا، انہیں لاہور سے نکال دیا گیا۔ لعل سنگھ کے نکالے جانے سے رانی جنداں کے دل میں سخت نفرت بھر گئی اور سکھ بھی گورنر جنرل کی طرف سے ان کے ملک کے بارے میں کیے جانے والے تصفیہ سے مطمئن نہ ہوئے۔

ملتان کے سکھ حاکم مولراج نے بغاوت کر دی اور یہ سکھوں کی دوسری لڑائی کا موجب بنی۔ ملتان کو فتح کر لیا گیا اور باغی مولراج کو قیدی بنا لیا گیا۔ اس پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اور اسے مجرم ثابت کر دیا گیا لیکن انگریزوں کی بردباری کی وجہ سے اس کی جان بچ گئی۔ اسے عمر قید

کی سزا دے دی گئی۔

ملتان کی بغاوت کے بعد سکھ فوج اور سکھ آبادی نے واضح اور کھلے طور پر بغاوت کر دی۔ خالصہ فوج لاہور سے ساٹھ میل کے فاصلے تک آن پہنچی۔ لارڈ گوہ کو پنجاب فوج کا سربراہ مقرر کیا گیا اور 13 جنوری 1848ء کو جلیانوالہ کی خونریز لڑائی لڑی گئی۔ اپنے ملک کو بازیاب کرانے کی رنجیت سنگھ کی فوج کی یہ آخری کوشش تھی۔ اس کے بعد 21 فروری 1848ء کو گجرات کی جنگ لڑی گئی جس میں لارڈ گوہ نے اپنی پوری فوج کے ساتھ پیش قدمی کرتے ہوئے سکھوں کو مکمل طور پر شکست دے دی۔

دلیپ سنگھ کو 29 مارچ 1848ء کو باقاعدہ طور پر معزول کر دیا گیا اور لاہور کی بادشاہت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس علاقے کو برطانوی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔

--------- O ----------

حوالہ جات

1۔ لوہ کے لیے وقف شدہ ایک مندر اب بھی قلعہ کے شمال مغربی کونے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک چوبی سیڑھی نشیبی تہہ خانے تک جاتی ہے۔

2۔ تھارنٹن کی کتاب لاہور۔ صفحہ 112

3۔ عرب کے اولین جغرافیہ دان ملتان کو "فرج" یا "سونے کا گھر" لکھتے ہیں۔ کیونکہ حجاج بن یوسف کے سپہ سالار محمد بن قاسمؒ کو اس شہر کے ایک مکان میں چالیس باھار سونا ملا۔ اسی وقت سے اس کا نام سونے کا گھر مشہور ہو گیا۔ ایک باھار 333 من کے برابر ہوتا ہے۔ المسعودی کے مطابق ایک بت کا نام ملتان تھا۔ ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے آنے والے زائرین اپنے ساتھ روپیہ پیسہ، قیمتی پتھر، صندل کی لکڑی اور عطریات لاتے تھے اور انہیں چڑھاوے کے طور پر دے جاتے تھے۔ بادشاہ کے خزانے کا بیشتر حصہ انہیں چڑھاووں پر مشتمل ہوتا تھا جو ملتان بت کو پیش کیے جاتے تھے۔

4۔ ایلیٹ کی کتاب "ہندوستان کے مؤرخین" صفحہ 116، جلد 1

5۔ میواڑ کے قدیم وقائع صفحہ 232، جلد اول

6۔ تھارنٹن کی کتاب لاہور صفحہ 110 اور کننگھم کی کتاب "ہندوستان کا قدیم جغرافیہ" صفحہ 197 کا موازنہ کیجیئے۔ اسی مضمون کے بارے میں ملاحظہ کیجیئے۔ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے بارے میں رپورٹ صفحہ 205، جلد 11

7۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کابل کا سابقہ نام زابل تھا اور یہ کافر سے یا انندل بادشاہ جس نے اس کی بنیاد رکھی سے تعلق رکھتا ہے۔ تب سے اس کا نام زابلستان پڑا۔ بخارا میں برنز کے سفر صفحہ 148، جلد 1

8۔ ہندوستان کا قدیم جغرافیہ از میجر جنرل کننگھم صفحہ 191

9۔ ڈاکٹر ہنٹر لاہور کے بارے میں اپنی کتاب "امپیریل گزیٹئر" صفحہ 415 (جلد 8) میں لکھتے ہیں کہ چینی بدھ مت زائر ہیون سانگ نے اپنے سفرنامہ میں اس شہر کا تذکرہ کیا ہے۔ جنرل کننگھم نے اپنی تصنیف "ہندوستان کا قدیم جغرافیہ" کے باب اول میں یہ لکھا ہے کہ ہیون سانگ کے سفرنامہ میں لاہور کا ذکر کہیں موجود نہیں ہے۔

10۔ یہ تاثر کہ چینی سیاح نے اپنے سفرنامہ میں جس "عظیم شہر" کا ذکر کیا ہے وہ لاہور ہی ہے

اس کے مطابق مسٹر تھارنٹن لاہور کے بارے میں تحریر کردہ اپنی کتاب کے صفحہ نمبر 112 پر لکھتے ہیں کہ برہمنوں کے عظیم شہر جس کا ذکر ہیون سانگ نے کیا ہے وہ لاہور شہر ہے اور یہ پہلی اور ساتویں صدی عیسوی کے درمیان موجود تھا۔ میجر جنرل کننگھم نے اپنی کتاب " قدیم جغرافیہ " صفحہ نمبر 198 پر واضح طور پر لکھا ہے کہ چینی سیاح نے جس شہر کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے اس کی سیاحت کی تھی وہ لاہور ہرگز نہیں تھا بلکہ قصور کا جدید شہر تھا۔ ساتوی صدی عیسوی میں قیام لاہور کے بارے میں اغلب رائے کی بنیاد چینی سیاح کے اس صدی کے وسط میں کیے گئے لاہور کے سفر پر مبنی نہیں ہو سکتی۔ یونانی جغرافیہ دانوں کی تحریروں اور کشمیر اور راجستھان کی قدیم تاریخی کتابوں سے لاہور کے محل وقوع کے بارے میں اس بات کی شہادت بھی ملتی ہے کہ لاہور پہلی صدی کے اختتام اور دوسری صدی عیسوی کے آغاز میں قائم کیا گیا تھا۔

11 - لفظ پنجاب جس کا مطلب ہے (پانچ دریا) اس کی اصل فارسی زبان سے ہے۔ جب مسلمانوں نے اس ملک کو فتح کیا تو اس کو اپنا لیا۔ مہابھارت میں اس ملک کو ٹیکا ڈیسا یا ٹیکاس کا ملک کہا گیا ہے۔ بامیان سے جمنا کے کناروں تک پھیلے اور پورے ملک میں مستعمل ناگری کردار ٹیکاری کہلاتے ہیں۔ کشمیر کی قدیم تاریخی کتاب " راجہ ترانجنی " ٹیکاری کرداروں میں تحریر کی گئی۔

12 - مصنف کہتا ہے :۔ وچون بمرور ایام معموری آن روی بانحطاط نہاد دارالحکومت شہر سیالکوٹ مقرر گشت ۔" لیکن جب امتداد زمانہ سے اس شہر کی آبادی کم ہوئی تو پایہ تخت کو سیالکوٹ میں قائم کیا گیا۔ حدیقتہ الاقلیم ، باب 3 ، صفحہ 146

13 - مؤرخ مرتضیٰ حسین کہتے ہیں: ۔" وچون سلطان محمود غزنوی فتح ہند نمود ملک ایاز بابادی آن کوشیدہ و شہرے بتجدید و قلعہ پختہ تعمیر ساخت ۔" جب سلطان محمود غزنوی نے ہند کو فتح کیا تو ملک ایاز نے اس کو آباد کرنے کی ذمہ داری سنبھالی۔ اس نے ایک نیا شہر تعمیر کرایا اس میں ایک پختہ قلعہ بھی تعمیر کرایا۔ حدیقتہ الاقلیم باب 3 ، صفحہ 146

14 - العتبی کی تاریخ یمینی۔

فرشتہ ۔ العتبی کے مطابق وہ چیونٹیوں اور پتنگوں کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ تاریخ یمینی

15 - منہاج السراج نے اسے " محمد باحلیم " کہا ہے۔

16 - یہاں پر لاہور کا اصل تلفظ لاہُور ہے۔

17- حسن نظامی کی 1205 عیسوی میں لاہور کے بارے میں لکھی گئی کتاب تاج المعاصر۔ یہ شمال مغربی ہندوستان میں پہلی اسلامی ریاست کے قیام کی ہمعصر تاریخ ہونے کے ناتے نہایت اہم تصنیف ہے۔

18- حسن نظامی

19- یہاں لاہور کو لوہاور کہا گیا ہے۔

20- منہاج السراج

21- ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی

22- تاریخ فیروز شاہی

23- یعنی شہید خاں یہ لقب شہزادہ محمد کو دیا گیا جب وہ مغلوں کے خلاف ایک جنگ میں مارا گیا۔

24- ملفوضات تیموری

25- اس دور میں لودھیوں نے سرہند، لاہور، سنام، سمانیہ اور حصار کے علاوہ پانی پت پر بھی قبضہ کیا ہوا تھا۔ سنبھل پر دریا خاں لودھی اور پٹیالہ پر رائے پرتاب کی حکومت تھی۔ تاریخ خاں جہاں لودھی۔

سلطان لودھی کا صرف دہلی، پالم اور چند نواحی پرگنوں پر قبضہ تھا۔ تاریخ داؤدی میں ایک یادگار عمارت کا پتہ بھی چلتا ہے جو آج بھی سید خاندان کے دور حکومت میں سلطنت کے آہستہ آہستہ ختم ہونے کی حالت کی غمازی کر رہی ہے۔

پادشاہی شاہ عالم ---- از دہلی تا پالم

شاہ عالم کی حکومت دہلی سے پالم تک ہے۔ تاریخ داؤدی

26- ایرسکائن کی کتاب "بابر کی سرگزشت" صفحہ نمبر 287

27- خلاصۃ التواریخ صفحہ 244

فرشتہ صفحہ 42 جلد دوم اور خلاصۃ التواریخ صفحہ 245 کا موازنہ کیجیے۔

28- بابر کے جسد خاکی کو کابل لے جایا گیا اور وہیں دفن کیا گیا۔

29- ایک شاعر نے اس شعر میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے:۔

اگر میں بحفاظت دریائے سندھ کو پار کر لیتا ہوں
تو ہند میں میری دوبارہ آمد پر مجھے تھام لینا

30۔ تاریخ رشیدی صفحہ 140 اور اکبر نامہ صفحہ 96 جلد اول

31۔ مجنوں کی مشہور زمانہ محبوبہ جس کے ساتھ مجنوں کا عشق، نظامی کی نظموں کا عنوان ہے۔

32۔ اکبر نامہ صفحہ نمبر 96 جلد 1

33۔ ہمایوں کے ایران سے آنے کے بعد کامران کو اندھا کرنے کا حکم دیا گیا اور بعد ازاں اسے مکہ مکرمہ جانے کی اجازت دے دی گئی جہاں آخرکار اس کا انتقال ہو گیا۔ اس دور میں رونما ہونے والے اس دردناک واقعے کا ذکر ابوالفضل نے اکبر نامہ (صفحہ 247 جلد 1) میں کیا ہے۔ جس رات مکہ مکرمہ کے لیے کامران کی روانگی کا تعین کیا گیا اسی رات ہمایوں بھائی چارے کے تمام آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے درباریوں کے ہمراہ دریائے سندھ کے کنارے پر واقع شہزادے کے محل میں داخل ہو گیا۔ بدقسمت شہزادے نے اپنے بادشاہ بھائی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے مندرجہ ذیل شعر کا حولہ دیا ہے :-

"کلاہ گوشہ درویش بر فلک ساید کہ سایہ ہمچو تو شاہی فگند بر سراو"

"جب تم جیسا کوئی بادشاہ اس فقیر کے سر پر سایہ فگن ہوتا ہے تو اس کی پگڑی آسمان کو چھونے لگتی ہے۔" اس کے فوراً بعد اس نے مندرجہ ذیل شعر پڑھا:-

برجانم از تو ہرچہ رسد جائے منت ست گر ناوک جفاست وگر خنجر ستم

"میں نے تمہارے ہاتھوں سے جو کچھ پایا ہے وہ مہربانی ہے یا تو وہ ستم کا تیر ہے یا ظلم و جفا کا خنجر۔"

34۔ وہ خراسان کے مشہور سلطان حسین مرزا کا پوتا تھا۔ ازبکوں کے ہاتھوں اپنے والد کی بادشاہت کی تباہی کے بعد وہ بابر کے دربار میں آگیا تھا اور اس کا بڑا چہیتا بن گیا تھا۔ بابر نے اپنی ایک بیٹی کی شادی اس کے ساتھ کر دی۔ ایرسکائن کی "بابر کی سرگزشت" کا موازنہ خلاصۃ التواریخ سے کیجیئے۔

35۔ یہ کوہ سلیمان کی ایک پہاڑی ہے۔ یہاں پر بہلولڑا کے پرگنوں میں افغان بڑی تعداد میں آباد تھے اور انہیں بادشاہ نے یہاں آباد کیا تھا۔ تاریخ شیر شاہی۔

36۔ ایرسکائن۔

37۔ اکبر نامہ صفحہ 25 ، جلد 1

38۔ اس وقت کلانور لاہور کے ضلع کا ایک اہم قصبہ تھا۔ اس واقعے کی یادگار کے طور پر بادشاہ

کے حکم سے اکبر کی تاجپوشی کے بعد وسیع محلات اور شاندار عمارات تعمیر کرائی گئیں۔ جب اکبر کے ایک مشہور زمانہ مؤرخ عبدالقادر بدایونی نے اپنی تاریخ لکھی تو اس وقت یہ عمارات تعمیر کی جا رہی تھیں۔ منتخب التواریخ جلد 3 ۔ ان میں سے کچھ برطانوی دور حکومت میں موجود تھیں لیکن انہوں نے اینٹیں حاصل کرنے کی غرض سے انہیں انتہائی بے دردی سے برباد کر دیا۔ جس جگہ اکبر نے اپنے امراء کے ہمراہ ہندوستان کی بادشاہت سنبھالی تھی اب اس جگہ پکی اینٹوں کا ایک چبوترہ موجود ہے۔ اس کے چاروں اطراف میں زمینداروں کی زرخیز زمین ہے۔

39۔ وہ سادات گھرانے کا فرد تھا اور کاشغر کا رہنے والا تھا۔ وہ اپنی بہادری اور اعضاء کے تناسب کے لیے مشہور تھا۔ ہمایوں نے اسے فرزند (بیٹا) کا خطاب بخشا۔

40۔ اکبر نامہ

41۔ اس کی ماں اکبر کی دایہ تھی۔ ہمایوں اسے جی جی انگہ کہا کرتا تھا۔
اکبر، شمس الدین عاتکہ کو (مربی) خاں طباقت کہتا تھا۔

42۔ اس کے چھوٹے بھائی قطب الدین نے جو شہزادہ سلیم کا اتالیق تھا، لاہور میں بہت سی مساجد کی بنیاد رکھی۔ بلاچمین صفحہ 333

43۔ حاجی بیگم، ہمایوں کی ایک بیوی، گلچہرہ بیگم اور گلبدن بیگم ہمایوں کی ہمشیرائیں اور گلچہرہ بیگم کی بیٹی سلیمہ سلطان بیگم ۔ اکبر نامہ

44۔ منتخب التواریخ

45۔ قاسم خاں، اکبر کے دربار کا ایک امیر تھا۔ جس باغ کا راوی (یا چھوٹا راوی) کے کنارے کے بارے میں حوالہ دیا گیا ہے وہ شیعہ لوگوں کی کربلا کے نزدیک تھا جہاں مسلمان دسویں محرم کو تعزیہ دفن کرتے ہیں۔ یہ حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار کے جنوب مغرب اور گورنمنٹ سکول کے احاطہ یا برف خانہ کے عقب میں واقع تھا۔ قاسم خاں کے مزار کے نام سے ایک بہت اونچا گنبد کافی دیر تک یہاں موجود رہا۔ یہ اس مسلمان امیر کا مقبرہ تھا جس کے نام سے یہ باغ مشہور ہوا۔ یہ عمارت دو منزلہ تھی اور اس کے چاروں طرف محرابیں بنی ہوئی تھیں۔ یہ لاہور کی نہایت اہم اور شاندار عمارتوں میں سے ایک تھی جس کا شاندار اور شاہانہ مینار ابھی تک لوگوں کے ذہنوں میں تازہ ہے۔ کشن سنگھ کمبوہ کے بیٹے نے اس کی ملکیت کا جھوٹا دعویٰ کیا اور صرف اینٹوں کی خاطر اس کو بالکل برباد کر دیا۔ اب اس کے

کھنڈرات تک باقی نہیں رہے سوائے اس کے کہ چونے کا ایک ڈھیر اور اینٹوں کے کچھ ٹکڑے موجود ہیں۔

مہدی قاسم خاں کافی عرصے تک اکبر کے دور میں کابل کا حاکم رہا اور 1001 ہجری بمطابق (1592 عیسوی) کو لاہور میں قتل ہو گیا۔ بحوالہ معاصر۔ مذکورہ بالا مقبرہ اکبر نے اس کی یاد میں تعمیر کروایا تھا۔ بدایونی سے پتہ چلتا ہے کہ لاہور میں مہدی قاسم خاں کی ایک حویلی تھی جسے وہ باغ مہدی قاسم خاں کہا کرتا تھا۔ بدایونی 11 صفحہ 290 تا 292

46۔ اکبر نامہ صفحہ 216 ۔ جلد دوم

جب مرزا نے پنجاب پر عارضی طور پر قبضہ کیا تھا تو مشہد کے رہنے والے ایک شاعر نے اس کی شان میں مندرجہ ذیل قصیدہ لکھا:۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔۔۔ وارث ملک ست محمد حکیم ۔

اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحم والا ہے۔ بادشاہت محمد حکیم کی ہے۔ بدایونی ۔ صفحہ 94

47۔ کمراکہ ، ایک ترکی لفظ ہے۔ ایک بہت بڑے میدان میں شکار کو بہت سے نقارچیے دھکیل کر لے جاتے ہیں اور اس کے گرد حلقہ باندھ لیتے ہیں۔

48۔ طبقات اکبری صفحہ نمبر 286

49۔ اکبر نامہ صفحہ 203 ، جلد 3

50۔ طبقات اکبری ، صفحہ 351

51۔ البدایونی ، صفحہ 367 تا 368

52۔ اس کی اپنی ذاتی رہائش گاہ لاہور میں بھاٹی گیٹ کے اندر بازار حکیماں میں تھی۔

53۔ راجہ مان سنگھ ، جہانگیر کے دور حکومت کے نویں سال دکن میں طبعی موت سے فوت ہوا۔ اس نے اپنے پیچھے پندرہ سو بیویاں چھوڑیں جن میں سے ساٹھ اس کی ارتھی کے ساتھ جل کر مر گئیں۔ بلاچمین ، صفحہ 341

54۔ البدایونی جو ہندوؤں سے شدید نفرت کرتا تھا اس نے ٹوڈر مل اور بھگوان داس کی موت کا ذکر کچھ یوں کیا ہے:۔ " ان کو جلدی جلدی دوزخ میں داخل کیا گیا اور دوزخ کے انتہائی زیریں درجے میں ڈال کر اذیتیں دی گئیں وہاں وہ بچھوؤں اور تند خو جانوروں کی خوراک بن گئے۔ خدا ان دونوں کو بھسم کر دے گا۔ " ان کی تاریخ وفات اس قطعہ سے نکلتی ہے۔

بگفتا ٹوڑر و بھگوان مردند

ترجمہ: ۔ کسی نے کہا: ٹوڈر اور بھگوان مر گئے ہیں۔

مندرجہ ذیل رباعی سے ٹوڈر مل کی وفات کا پتہ چلتا ہے۔

ٹوڑر مل انکہ ظلمش بگرفتہ بود عالم

چون رفت سوئے دوزخ خلقے شدند خورم

تاریخ رفتنش را از پیر عقل جستم

خوش گفت پیر دانا وی رفت در جہنم

ترجمہ: ٹوڈر مل کے ظلم سے سارا عالم تنگ تھا۔ جب وہ جہنم رسید ہوا تو لوگوں نے خوشیاں منائیں۔

میں نے بوڑھے عقل مند سے اس کی موت کی تاریخ معلوم کی تو اس بوڑھے نے خوشی سے جواب دیا۔ وہ دوزخ میں چلا گیا ہے۔

55۔ اکبر نامہ، صفحہ نمبر 39، جلد 2

56۔ یہ واقعہ 1586 عیسوی میں رونما ہوا۔ اس کا اصل نام مہیش داس تھا اور وہ اکبر کی بادشاہت کے تھوڑے عرصہ بعد کالپی سے آکر دربار سے وابستہ ہو گیا تھا وہ بھاٹ یا مراثیوں کے طبقہ سے تعلق رکھتا تھا جس کو ایرانی "بادہ فروش" یا "قصیدہ گو" کہتے تھے۔ وہ اپنی بذلہ سنجی کی وجہ سے بادشاہ کا بہت چہیتا ہو گیا اور اس کو کاب رائے یا ملک الشعراء کے خطاب سے نوازا گیا۔ اس کو شاعری پر بڑا ملکہ حاصل تھا اور وہ موسیقی میں بھی بڑا ماہر تھا۔ اس کی مختصر ہندی نظمیں، لطائف اور بذلہ سنجی آج بھی ہندوستان کے لوگوں میں بڑی مقبول ہیں۔

57۔ البدایونی۔

58۔ البدایونی صفحہ 265، مغلیہ دور کے مؤرخین نے بھی اکثر اس حوض کا ذکر کیا ہے۔ جہانگیر نے 1600 عیسوی میں اس کا مشاہدہ کیا اور حکیم علی کو 2000 سپاہیوں کا سپہ سالار بنا دیا۔ اس کا بیٹا حکیم عبدالوہاب لاہور میں ایک منصب دار تھا اسے بھی 500 گھڑ سواروں کے دستہ کا سپہ سالار بنایا گیا تھا۔ بادشاہ نامہ۔

حکیم علی گیلانی، ایران کے علاقہ جیلان کے رہنے والے تھے اور اکبر کے ذاتی مصاحب اور

دوست تھے۔ ایک دفعہ بادشاہ نے ان کی حکمت کی آزمائش کی غرض سے مختلف بوتلوں میں صحت مند اور بیمار آدمیوں کے پیشاب کے علاوہ جانوروں کے پیشاب بھی ڈال دیئے۔ اس کے اطمینان کے لیے حکیم نے مختلف اقسام کے درست فرق اس کو بتا دیئے۔ بلاچ مین۔

59۔ البدایونی، صفحہ 277

60۔ اکبر نامہ، صفحہ 326 ، جلد 3

61۔ البدایونی، صفحہ 324 ، میاں میر کی سڑک کے بائیں جانب دارا نگر کے نواح میں خیر پورہ کا ایک حصہ ابھی تک موجود ہے۔

62۔ تھارنٹن کی کتاب کے صفحہ نمبر 122 اور وھیلر کی کتاب کی جلد ا کے صفحہ 195 کا موازنہ کیجیئے۔ جب فرانسیسی سیاح تھیوے ناٹ نے 1665ء میں لاہور کا دورہ کیا تو عیسائیوں کے گرجا کے کچھ آثار ابھی باقی تھے۔ قلعے کے دروازے پر اس وقت ایک صلیب اور حضرت مریمؑ کی تصویر بھی موجود تھی۔

63۔ تھارنٹن

64۔ البدایونی، صفحہ 388

65۔ البدایونی، صفحہ 397

66۔ اکبر نامہ، صفحہ 514 ، جلد 3

67۔ بلاچمین صفحہ 446

68۔ "معاصر" بحوالہ صفحہ 26 اور 27 اور اس سے قبل۔

69۔ آئین اکبری

70۔ تزک جہانگیری

71۔ قندھار جانے والی سڑک پر خراسان کا ایک قصبہ، جو وائی ہے۔

72۔ بلاچمین، صفحہ 501

73۔ طبقات اکبری

74۔ ان کا مزار مزنگ کی مشرقی جانب موجود ہے۔ باب دوئم ملاحظہ کیجیئے۔

75۔ خوبصورت ملائم آرائشی ٹائلوں سے مزین نولکھا کا دروازہ کافی عرصہ تک موجود رہا لیکن بعد میں اب اسے مسمار کر دیا گیا ہے۔ بحوالہ باب دوئم۔

76۔ واقعات جہانگیری، صفحہ 88

77 - بحوالہ باب دوئم

78 - جہانگیر کے مشاہیر اعظم معتمد خاں کی تصنیف: اقبال نامہ جہانگیری

79 - وہ ہر سال اپنے دور حکومت میں سرکاری افسروں کو تین خلعت عنایت کرتا تھا اور ہر سال اپنے پیادہ سپاہیوں کو ایک ایک کمبل دیتا تھا۔ اس نے اپنے تحفہ میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں کی۔ "معاصر"

80 - ان کوس میناروں میں سے چند ابھی تک دہلی اور آگرہ کی پرانی سڑک پر موجود ہیں۔

81 - ان عمارتوں کا رخ مغرب کی جانب قلعہ کے دروازے کی طرف تھا۔ منقش دیواریں اب بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ بحوالہ قلعے کے بارے میں بیان، باب دوئم۔

82 - اقبال نامہ جہانگیری، صفحہ 196 ، ایڈیشن 1865ء کلکتہ۔

83 - "عمل صالح"

84 - محمد صالح لاہوری کی تصنیف، عمل صالح، کے مطابق آصف خاں کا محل قلعہ کے قریب "میدان نخاس" میں واقع تھا۔ مصنف بیان کرتا ہے: ۔

ترجمہ: ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یمین الدولہ نے یہ شاندار اور خوبصورت عمارات، قلعہ کی جانب میدان نخاس میں تعمیر کرائی تھیں جہاں اس جگہ شہر کے کاروباری حضرات اور تاجر روزانہ جمع ہوتے تھے۔ ان کی تعمیر پر بیس لاکھ روپے کی لاگت آئی اور دس سال کے عرصہ میں ان کی تعمیر کا کام مکمل ہوا۔ اب یہ جگہ بادشاہی مسجد کے جنوب میں اور تحصیل کورٹ جسے عام طور پر نخاس کہا جاتا ہے کے شمال میں ہے۔ میں نے چھان بین کی ہے کہ آصف خاں کے محل اسی جگہ پر تھے۔ اس جگہ کو بعد میں آنے والے (دارا شکوہ) کے دور میں دہلی دروازے کے باہر موجود سرائے سلطان کے نخاس سے گڈ مڈ نہیں کرنا چاہیے۔

85 - قلعہ کو مستقل طور پر "دولت خانہ" یا دولت کا گھر کہا جاتا رہا ہے۔

86 - خاص اور بڑے موقعوں پر ہندوستان کے شہزادوں کی یہ ایک رسم تھی کہ وہ راستے میں ضرورت مند اور غریب لوگوں پر سونا اور چاندی نچھاور کرتے تھے۔

87 - محمد صالح، شاہجہاں نامہ میں بیان کرتا ہے: ۔ "شاہ ایران کے نمائندے مرزا یادگار بیگ کو جو کافی عرصہ سے لاہور ہی میں مقیم تھا اس دور میں قیمتی پارچہ جات اور ہیرے جواہرات سے مرصع خنجر پر مشتمل خلعت کے علاوہ مبلغ دس ہزار روپیہ نقد عنائت کیا گیا۔ اپنی آمد کی تاریخ سے لے کر رخصتی کی تاریخ تک اسے پچاس ہزار روپے مالیت کے تحائف کے علاوہ دو

لاکھ روپے نقد سے نوازا گیا۔ اس وقت بادشاہ نے صفوی بادشاہ کے لیے مذکورہ نمائندے کے ہاتھ پچاس ہزار روپے مالیت کی ایک صراحی اور ہیرے جواہرات سے مزین ایک تھال روانہ کیا۔ " شاہ جہاں نامہ۔

88۔ محمد صالح کی تصنیف " شاہجہاں نامہ " ۔

89۔ شاہجہاں نامہ کے مطابق شیخ سعد اللہ کو صدر الصدور (مفتی اعظم) موساوی خاں نے رمضان کے مہینے میں 1050 ہجری بمطابق 1640ء کو بادشاہ سے متعارف کرایا تھا۔ بادشاہ اس نوجوان کے خطاب سے بہت خوش ہوا اور اسی سال اسے خان کا خطاب دے کر 1000 پیدل اور 500 گھڑسوار دستہ کے امیر کا منصب عطا کیا اور اسے گلشن خانے کا نگران مقرر کیا۔ اگلے سال اس کے منصب کو بڑھا کر 3000 پیدل اور 2000 گھڑ سوار دستے کا امیر مقرر کر دیا گیا اور اسے خلوت خانے کا داروغہ بھی مقرر کیا گیا۔ چوتھے سال اسے وزیر کا عہدہ دیا گیا اور ساتویں سال اسے 7000 پیدل اور 7000 گھڑ سوار دستے کا منصب دار مقرر کر کے علامہ فہمی (بہت عالم فاضل اور سمجھدار) کا خطاب دیا گیا۔

90۔ اس دورے کے بارے میں تفصیل کے لیے شالامار باغ کی تاریخ باب دوم ملاحظہ کیجیئے۔

91۔ محمد صالح کی تصنیف " شاہجہاں نامہ " ۔

92۔ ہندوؤں کی دیومالائی داستانوں کے مطابق دنیا ایک بیل کے سینگ پر ٹھہری ہوئی ہے۔ مصنف یہاں یہ کہتا ہے کہ جو آدمی اپنے آپ کو دنیا کے مسائل میں پھنسا لیتا ہے کسی طرح بھی ایک بیل سے کم نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ بیوقوف آدمی ہے۔

93۔ اس کے محلات کے آثار ابھی تک شہر کی جنوب مشرقی جانب چنیوٹ میں موجود ہیں۔ پکی اینٹوں کی دیواروں سے ملحقہ دالان اور محرابی چھتوں کے کمرے انتہائی مضبوط اور ٹھوس ہیں۔ اس جگہ کو لوگ " ریختی " کے نام سے پکارتے ہیں اور اس جگہ پر دھوبی رہتے ہیں جو قاضی غلام حیدر چنیوٹی کو کرایہ ادا کرتے ہیں۔ وزیر خان کی اولاد ابھی تک لاہور میں آباد ہے لیکن انور علی، ہسپتال اسسٹنٹ جو اب گوجرانوالہ میں رہتا ہے اس کے سوا سب کی حالت دگرگوں ہے۔

94۔ چنیوٹ میں اس جگہ مجھے قاضیوں اور شاہ برھان کے مزار کے متولیوں کے قبضہ میں موجود پرانے دلچسپ کاغذات کی چھان بین کرنے کا موقع ملا۔ رئیس چنیوٹ قاضی قطب الدین کے قبضہ میں کاغذات پر وزیر خاں کی مہر کے نقش کا نمونہ ذیل میں درج کیا جارہا ہے: ۔

ز لطف شاہ جہان بادشاہ بند نواز ۔۔۔ وزیر خان بجہان جاودان بود ممتاز

ترجمہ : ۔ " شاہجہاں بادشاہ بندہ نواز کے لطف و کرم سے وزیر خاں ہمیشہ اس دنیا میں ممتاز رہے ! "

95 ۔ وہ اندرون شہر لاہور کے محلہ شیخ اسحاق (یا موجودہ موتی بازار اور چونا منڈی) میں رہتے تھے جہاں اب حویلی جمعدار سنگھ موجود ہے ۔

96 ۔ ان کا مزار میانی صاحب میں بلند دیواروں کے ایک احاطہ میں واقع ہے اور وہاں مسلمان اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں ۔

97 ۔ معاصر عالمگیری ۔

98 ۔ عالمگیر نامہ ، صفحہ 188 ، کلکتہ ایڈیشن ۔

99 ۔ عالمگیر نامہ ، صفحہ 214 ۔

100 ۔ وہ فیض بخش یا شالا مار باغ کی سڑک پر واقع " گلابی باغ " کا بانی تھا ۔

101 ۔ حفی خاں کی منتخب الباب اور محمد کاظم کی عالمگیر نامہ ۔

102 ۔ اس جگہ کا مقام معلوم نہیں ہو سکا ۔ شاہجہان اور عالمگیر دونوں کی تواریخ میں ہتھیہ پل کا ذکر قلعہ کے دروازہ کے طور پر آیا ہے ۔ میں نے اس کی شناخت کی ہے کہ مسٹر تھارنٹن کا ہاتھی پان دروازہ یہی ہے ۔ بحوالہ " لاہور اسی طرح ہے جس طرح پہلے تھا ۔ " اسی دروازے پر نصب پتھر پر فارسی میں عبارت کندہ ہے ۔ اب اس کے قریب کوئی مسجد واقع نہیں

103 ۔ عالمگیر نامہ ، صفحہ 167 ۔ س پیرے کی اصل عبارت درج ذیل ہے ۔

" فرد ای ان کہ جمعہ بود در مسجد فیروز خاں کہ در فضائی بیرون قلعہ نزدیک بدروازہ ہتھیہ پل واقعت بائیں معہود نماز گزاردہ مقرر فرمودند کہ سایر جمعات بدین دستور انجا اقامت جماعت می نمودہ باشند و در ایام این ماہ مبارک اثر بیست ہزار روپیہ بوساطت صدر الصدور عابد خان بار باب استحقاق اتفاق شد ۔ "

104 ۔ معاصر عالمگیری ، دور حکومت کا پانچواں سال ۔

105 ۔ معاصر عالمگیری ، دور حکومت کا اٹھارواں سال ۔

106 ۔ عالمگیر نامہ ، صفحہ 833 ، اس باغ یا کسی قبر کا اب نام و نشان باقی نہیں رہا ۔

107 ۔ عالمگیر نامہ ، صفحہ 842

108 ۔ یہاں پر فیض بخش باغ کے لیے " شالا مار " کا نام سب سے پہلے حفی خاں نے اپنی تصنیف

"منتخب الباب" میں بیان کیا ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس باغ کو "شالا مار باغ" بہادر شاہ کے دور حکومت میں کہا جانے لگا تھا۔

109۔ خفی خاں کی تصنیف "منتخب الباب"۔

110۔ حدیقتہ الاقلیم، باب 3، صفحہ 129

111۔ یہ شاہی حکم جاری کیا گیا تھا کہ کلمہ "لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ" (اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں) کے بعد خطبہ میں یہ کلمہ پڑھا جائے وعلی ولی اللہ و وصی رسول اللہ۔ (علیؑ اللہ کے دوست ہیں اور رسول خدا کے وارث ہیں) بحوالہ سیر المطاہرین، جلد اول، صفحہ 381۔

112۔ خفی خاں۔

113۔ سیر المطاہرین، جلد اول، صفحہ 281

114۔ اس کے جسد خاکی کو لاہور سے دہلی لے جانے کے بعد قطب الدین کے مقبرہ کے احاطہ میں دفن کر دیا گیا۔

115۔ اس کو پہلے "بھیروالا" دروازہ کہا جاتا تھا۔ تھارنٹن۔

116۔ محمد ھادی کی تذکرہ چغتائی۔ مصنف، بہادر شاہ کے دور میں لاہور کا دیوان تھا بعد میں وہ حاذن یا خزانے کا منتظم بھی رہا۔

117۔ خفی خان کی منتخب الباب۔

118۔ خفی خان کی منتخب الباب۔

119۔ ہر سکھ کے سر کی قیمت مقرر کر دی گئی اور حاکم لاہور کی زیر قیادت پورے صوبے میں ہر جگہ سکھوں کی سخت تلاش شروع کر دی گئی۔ فاسٹر کے سفرنامے، جلد اول، صفحہ 313-312 اور میلکم کی "سکھوں کے خاکے" صفحہ 86-85

120۔ نواب خان بہادر نے ثابت کر دیا کہ وہ ایک باصلاحیت اور ہر دلعزیز حاکم ہے۔ اسے ہندو اور مسلمان دونوں بہت پسند کرتے تھے۔ اس امیر کی دیگر خصوصیات کے متعلق پڑھنے کے لیے قارئین کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ میری کتاب "تاریخ پنجاب" کا مطالعہ کریں۔

121۔ نادر شاہ حقیقتاً تلوار کا دھنی تھا۔ شہر میں لوٹ مار کرنے کے بعد دہلی کے بادشاہ کی لڑکی سے اپنے بیٹے کی شادی بیاہ کی رسوم کے موقع پر جب دہلی کے بادشاہ نے اپنا ایک ایلچی دولہا کی سات پشتوں تک شجرہ نسب بیان کرنے کے لیے ایرانی فرمانروا کے پاس روانہ کیا تو

تیموری نسل کی شہزادی کا رشتہ مانگنے سے اور اس کا ہاتھ تھامنے سے قبل اس نے ایلچی سے کہا کہ جاؤ اپنے آقا سے کہہ دو کہ میرا لڑکا ابن نادر شاہ ابن تلوار ابن تلوار ۔۔۔۔ اس طرح اس نے 70 کے قریب نسلیں گنوا دیں۔ روم کے بانیوں کی طرح وہ بھی حقیقت میں ایک چرواہا تھا۔

122 ۔ تذکرہ آنند رام مخلص۔

123 ۔ لاہور میں پہلی مرتبہ اپنی آمد کے موقع پر نادر شاہ نے یہ خطاب حیات اللہ خاں کو دیا تھا۔

124 ۔ صابر شاہ کا مزار اورنگ زیب کی شاہی مسجد کے عقب میں ایک بلند چبوترے پر موجود ہے دیکھیے باب دوئم۔

125 ۔ تاریخ احمد شاہی۔

126 ۔ کابلی مل ایک بزدل شخص تھا اور اسی دور میں انتہائی جابر انسان بھی ثابت ہوا۔ لاہور پر قبضہ کرنے کے سلسلہ میں سکھوں کے منصوبہ کا پتہ چل جانے کے باعث وہ لاہور کو اپنے بھتیجے امیر سنگھ کے انتظام میں چھوڑنے کے بعد تحفظ کے لیے جموں کی طرف فرار ہو گیا۔ ایک تاریک رات، لہنہ سنگھ اور گجر سنگھ بھنگیوں نے لاہور پر اچانک قبضہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے دیکھا کہ سب دروازے بند ہیں۔ لیکن ایک شخص دیال سنگھ نے انہیں ایک موری دکھا دی اور اسی کے ذریعے بمشکل داخلہ ممکن ہو سکتا تھا۔ اسی راستے سے سردار داخل ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کے بعد 200 دیگر سکھ بھی ان کے پیچھے اسی راستے سے داخل ہوگئے۔ انہوں نے اچانک قلعہ کا انتظام حاصل کر لیا۔ نائب حاکم امیر سنگھ کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس کو اس وقت گرفتار کیا گیا جب وہ ایک ناچ گانے کی محفل میں شریک تھا۔ اسے پابہ زنجیر کر دیا گیا۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے پورے شہر کا نظم و نسق ان متحدہ سرداروں کے ہاتھ میں آچکا تھا۔ "پنجاب کے سردار"۔

127 ۔ احمد شاہ ابدالی 50 سال کی عمر میں فوت ہوا۔ اس کو چہرے میں ناسور کی تکلیف تھی۔ غالباً اس کو یہ تکلیف 1764ء میں ہوئی تھی۔

باب دوئم

لاہور

بیانی

(دور قدیم)

لاہور ایک بلدیاتی شہر، پنجاب کا دار الحکومت اور اسی نام کی قسمت اور ضلع کا انتظامی صدر مقام ہے۔ یہ دریائے راوی کے جنوب میں ایک میل کے فاصلے پر اور ضلع کی مشرقی سرحد کے تقریباً 23 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کا عرض 31 درجے ڈگری، 34 فٹ 5 انچ شمالاً اور طول 74 درجے ڈگری، 21 فٹ شرقاً ہے اور یہ سطح سمندر سے 706 فٹ بلند ہے۔ شہر کو متوازی الاضلاع شکل میں تعمیر کیا گیا ہے۔ قلعہ کے علاوہ دیواروں کے اندر کا علاقہ تقریباً 461 ایکڑ پر محیط ہے۔ یہ دریائے راوی کی پرانی گزر گاہ کے میدان پر کھڑا ہے۔ یہ شہر میدان سے قدرے بلندی پر ہے اور اس کے شمال کی طرف شرقاً غرباً ایک بلند مینڈ (باہن) سی بن گئی ہے۔ یہ بلند جگہ کئی صدیوں کے کھنڈرات کے انبار کی وجہ سے معرض وجود میں آئی۔ دریا مشرق کی طرف سے ایک لمبا چکر کاٹتا ہوا، ایک نیم دائرے کی شکل میں شہر کے شمال کی طرف سے گزرتا ہے۔ ایک زمانے میں یہ شہر کی دیوار کے ساتھ بہتا تھا لیکن 1662ء میں اس کے رخ بدلنے کی وجہ سے شہر کو لاحق خطرے کے پیش نظر بادشاہ اورنگ زیب نے اس کے کنارے پر تقریباً 4 میل کے فاصلے تک پختہ اینٹوں اور چونا گارے کا ایک بہت بڑا بند تعمیر کرایا۔ اس نے شہر کو تباہی سے بچا لیا۔ اس عظیم بند عالمگیری کے کچھ حصے قلعہ کی شمال مشرقی جانب اور گاؤں بھوگے وال میں آج کل بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس

کے تھوڑے عرصہ بعد دریا نے اپنی پرانی گزر گاہ کو چھوڑ دیا اور اس کے بعد دوبارہ ادھر نہیں آیا لیکن قلعہ کے کچھ فاصلے پر اس دریا کی ایک ذیلی نہر آج کل بھی بہتی ہے۔

دریائے راوی کی گزر گاہ

دریائے راوی ان پانچ دریاؤں میں سب سے چھوٹا ہے جنہوں نے پنجاب کو موجودہ شکل دی ہے۔ اس کو ہندو شاستروں میں اندرا کے ہاتھی کے نام کے حوالہ سے " اراوتی " کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ضلع میں اچوگل گاؤں کے راستہ سے داخل ہو کر یہ اپنی پوری وسعت میں بہتا ہوا ضلع منٹگمری کی سرحد پر اس سے جدا ہوتا ہے۔ عظیم نہر باری دوآب اسی کی ایک شاخ ہے۔ اس میں سے کئی دوسری شاخیں بھی پھوٹتی ہیں۔ تاہم یہ سب آخر میں دوبارہ دریا میں شامل ہو جاتی ہیں۔ اس کی روانی میں ناہمواری ہونے کی وجہ سے اس دریا کو جہاز رانی کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کے ذریعے لاہور سے روڑی بھکر تک غلہ اور اناج پہنچایا جاتا ہے اور چنبہ کی پہاڑیوں سے دیو دار کی لکڑی، شہتیریوں کی شکل میں اس کے بہاؤ پر لائی جاتی ہے۔ شمال کی جانب شہر کچھ چوڑا ہو گیا ہے اور اس کی شکل کچھ غیر متوازن سی ہو گئی ہے۔ ہندو بادشاہوں کے دور میں خانہ جنگیوں اور ہنگامہ آرائیوں کے نتیجہ میں ویران ہو جانے کے باعث سلطان محمود غزنوی نے پنجاب کی فتح اور 1023ء میں اس ملک پر مستقل طور پر قبضہ کرنے کے بعد اس کو از سر نو آباد کیا۔ اس نے اپنے چہیتے غلام اور مشیر ملک ایاز کو یہاں پر قائم کردہ چھاؤنی کے انتظام و انصرام کے لیے چھوڑا۔ مؤخر الذکر کی زیر نگرانی اس شہر کو کافی وسیع کیا گیا اور اس کی تزئین و آرائش کی گئی۔ اکبر نے لاہور میں اپنے قیام (1584ء - 1598ء) کے دوران اس شہر کے اطراف میں پختہ اینٹوں کی ایک نہایت مضبوط اور بلند فصیل تعمیر کرائی۔ اس نے ایک محل بھی تعمیر کرایا جس میں بعد کے ادوار میں اس کے جانشینوں نے توسیع کی۔ اکبر کی تعمیر کردہ شہر کی فصیل کو اس وقت زیادہ نقصان پہنچنا شروع ہوا جب 1812ء میں رنجیت سنگھ نے اس کو از سر نو تعمیر کرایا اور اس کے چاروں طرف ایک چوڑا اور انتہائی گہرا نالہ کھدوا دیا۔ اس سے اینٹیں ننگی ہو گئیں اور زمین اندر کو دھنس گئی۔ چنانچہ ایک وسیع پشتے کی شکل دینے کے لیے کچھ فاصلوں پر مضبوط برجیاں بنائی گئیں۔ قلعے کی دیوار جو پہلے 30 فٹ بلند تھی۔ بعد میں صفائی وغیرہ کے مقاصد کے تحت کم ہو کر تقریباً 15 فٹ رہ گئی۔ نالے کو بھر دیا گیا اور بعد میں بلدیہ شہر نے اس کے کنارے پر لگائے گئے نفیس باغات کو باری دوآب نہر سے

نکالی گئی ایک چھوٹی نہر کے ذریعے سیراب کیا اور شہر کو ماسوائے شمال کی جانب کے ہر طرف سے احاطہ کر دیا گیا ہے۔

شہر کا حدود اربعہ

شہر طول میں سوا میل اور عرض میں بشمول قلعہ ایک میل کا ایک تہائی یا اس سے کچھ زیادہ ہے اور یہ حلقہ تقریباً تین میل سے قدرے کم ہے۔ محل، شاہی گرجا اور رنجیت سنگھ کے مقبرہ نے شمالی حصہ کو احاطہ کیا ہوا ہے جہاں سے شاہدرہ کی جانب دریائے راوی دکھائی دیتا ہے۔ شہر میں 13 دروازوں کے ذریعے پہنچا جا سکتا ہے۔

اس کے شمال میں:۔

روشنائی دروازہ:۔ یہ بادشاہی مسجد اور قلعہ کے درمیان واقع ہے۔ چونکہ قلعہ سے شہر میں جانے کے لیے یہ ایک بہت بڑی گزر گاہ تھی اس لیے امراء، درباری، شاہی ملازمین، کئی مرتبہ یہاں سے گزرتے تھے کیونکہ رات کو اس جگہ روشنی کی جاتی تھی اس لیے یہ "روشنی کا دروازہ" روشنائی دروازہ کہلاتا ہے (1)۔

کشمیری دروازہ:۔ یہ دروازہ اس لیے کشمیر کے نام سے منسوب ہے کیونکہ اس کا رخ کشمیر کی جانب ہے۔

مستی دروازہ:۔ یہ نام دراصل "مسجدی" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اکبر کی والدہ مریم مکانی کی مسجد اس کے شروع میں واقع ہے۔ اسی لیے اسے یہ نام دیا گیا۔

خضری دروازہ:۔ مشہور ہے کہ زمانہ سلف میں دریائے راوی شہر کی دیوار کے ساتھ بہتا تھا اور گھاٹ بھی اس جگہ کے بہت قریب تھا۔ لہٰذا اس کا خضری نام (حضرت موسیٰ کے ساتھی) حضرت خضر علیہ السلام کے نام سے بھی منسوب کیا جاتا ہے۔ وہ ایک روحانی بزرگ ہیں۔ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق ان کو سمندروں اور دریاؤں پر اختیار حاصل ہے اور وہ آب حیات کو دریافت کرنے والے بھی ہیں۔ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں یہاں پر ایک پنجرے میں دو پالتو شیر رکھے جاتے تھے۔ لہٰذا اس دروازے کو "شیرانوالہ دروازہ" کہا جانے لگا۔ آج کل لوگ اسے دونوں ناموں یعنی "خضری" اور "شیرانوالہ" دروازہ سے پکارتے ہیں۔

اس کے مشرق کی طرف:۔

یکی دروازہ :۔ اس کا اصل نام "ذکی" تھا۔ یہ دروازہ پیر ذکی شہید کے نام سے مشہور ہے۔ روایت مشہور ہے کہ جب بے دین مغلوں نے شمال کی اطراف سے حملہ کیا تو یہ بزرگ کمال دلاوری سے اس شہر کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہوگئے۔ دروازے پر ان کا سر گردن سے جدا ہو گیا تو جسم بے سر دشمنوں سے لڑتا رہا اور آخر کار شہر کے ایک حصہ کے قریب گر پڑا۔ ان کا ایک مزار اس جگہ بنایا گیا جہاں پر ان کا سر گرا تھا اور دوسرا اس جگہ پر تعمیر کیا گیا جہاں ان کا دھڑ گرا تھا۔ دو قبریں اب زیارت گاہ خاص و عام ہیں۔

دہلی دروازہ :۔ اس دروازے کا رخ چونکہ لاہور سے دہلی جانے والی سڑک کی طرف ہے۔ اس لیے اسے "دہلی دروازہ" کا نام دیا گیا۔

اکبری دروازہ :۔ کیونکہ جلال الدین محمد اکبر نے اس شہر اور قلعہ کی از سر نو تعمیر کرائی تھی اس لیے اس نے اس کو اپنے نام سے موسوم کیا۔ اس دروازے کے ساتھ ہی اکبر نے ایک منڈی بھی بنوائی تھی جس کو بعد میں اس کے نام سے "اکبری منڈی" کہا جانے لگا۔ یہاں پر ہر قسم کا اناج و غلہ فروخت کیا جاتا ہے۔

اس کے جنوب کی طرف:

موچی دروازہ :۔ یہ نام دراصل "موتی" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اس کو اکبر کے ایک ملازم موتی رام کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جو اس وقت اس جگہ رہائش پذیر تھا۔

شاہ عالمی دروازہ :۔ یہ دروازہ (اورنگ زیب کے بیٹے اور جانشین) محمد معظم شاہ عالم بہادر شاہ کے نام سے موسوم تھا، جو نہایت حلیم الطبع اور فیاض بادشاہ تھا۔ وہ 28 فروری 1712ء کو فوت ہوا۔

لاہوری دروازہ :۔ اس کو لوہاری دروازہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس دروازے کو شہر لاہور کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب محمود غزنوی کے دور میں ملک ایاز نے اس شہر کو از سر نو تعمیر کرایا تو سب سے پہلے شہر کی آبادی اسی محلے سے شروع ہوئی جس کو "لاہوری منڈی" بھی کہا جاتا ہے۔ اس کو شہر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

موری دروازہ :۔ یہ دروازہ دوسرے سبھی دروازوں سے چھوٹا ہے اور جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، پرانے وقتوں میں اس کو شہر کے فضلات اور گندگی کے نکاس کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

اس کے مغرب کی طرف: ۔

بھاٹی دروازہ :۔ اس دروازے کو راجپوتوں کے قدیم قبیلے بھائی یا "بھاٹیوں" سے منسوب کیا جاتا

ہے جو زمانہ قدیم میں یہاں آباد تھے۔

ٹکسالی دروازہ:۔ اس کو یہ نام اس لیے دیا گیا کہ مسلمان بادشاہوں کے دور حکومت میں اس کے قریب ایک ٹکسال قائم تھی۔ ماہرین آثار قدیمہ نے قیاس آرائی کی ہے اور اس کے بارے میں چند اسباب کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ یہ نام قدیم شہر ٹیکسلا کی وجہ سے پڑا ہے، جو مہاتما بدھ کے قابل تعریف کارناموں اور خیرات کے لیے مشہور ہے جب انہوں نے اپنا سر بھی خیرات کے طور پر پیش کر دیا تھا۔ جنرل کننگھم نے راولپنڈی میں واقع "شاہ کی ڈھیری" سے اس کی نشاندہی کی ہے۔ تاہم یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس نام کو ٹکاس سے اخذ کیا گیا ہے جو ایک دور میں پنجاب کے بلا شرکت غیرے حکمران تھے اور وہ اب کافی تعداد میں جہلم اور راوی کے درمیان پہاڑیوں میں موجود ہیں۔

شہر کا گردو نواح

جدید لاہور قدیم دارالسلطنت کے ملبے اور کھنڈرات کے درمیان واقع ہے۔ یہ مشرق سے مغرب تک پانچ یا چھ میل کے فاصلے تک پھیلا ہوا ہے۔ موجودہ دور کے مقابلہ میں ایک زمانہ میں یہ شہر اس سے کہیں زیادہ بڑے علاقے پر پھیلا ہوا تھا۔ اس کا واضح ثبوت، اس کے چاروں طرف موجود، بہت سی پرانی مسجدیں، مزارات، مقبرے اور باغات ہیں۔ سکھوں کے عروج کے زمانہ میں مذکورہ عمارات ماضی کی عظمت کے نشانات کو چھاؤنیوں کی تعمیر اور فرانسیسی افسروں کی مشقوں کے میدانوں کے لیے مسمار کر دیا گیا جبکہ بہت سی عمارتوں سے اینٹیں اور عمارتی سامان حاصل کرنے کے لیے انہیں گرا دیا گیا۔ 1849ء میں ملک کو سلطنت میں شامل کیے جانے کے وقت سے بہت بڑی بڑی تبدیلیاں کی گئیں۔ جدید تعمیرات میں استعمال کے لیے پرانی اینٹوں کی بہت بڑی مقدار یہاں سے لے جائی گئی اور یہی علاقہ جو اجڑ گیا تھا یا پرانے مقبرہ جات اور محرابی دروازوں کے شکستہ حال کھنڈرات پر مشتمل تھا، اب دلآویز باغات، سرسبز میدانوں، پختہ سڑکوں (جن کے دونوں اطراف میں گھنے سایہ دار درخت ایستادہ ہیں) نہروں، سرکاری دفتروں اور خوبصورت یورپی مکانات میں تبدیل ہو گیا ہے۔ تاہم جہاں تک شہر کی آبادی کا تعلق ہے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ لاہور کی عظمت رفتہ اور شان و شوکت اب دوبارہ کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ مسٹر تھارنٹن کی شہر لاہور کے بارے میں تصنیف سے لاہور شہر کے حجم اور وسعت کے بارے میں اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ لاہور شہر پہلے 36 گزر یا محلوں میں منقسم تھا۔ جدید شہر میں ان میں سے صرف نو کو شامل کیا گیا ہے۔ اسی مصنف کا خیال ہے کہ اچھے دنوں میں یعنی شاہ جہاں کے دور حکومت میں یہ شہر سولہ

یا سترہ میلوں تک محیط تھا۔

یہ امر نہایت دلچسپ ہو گا اگر مسلمانوں اور سکھوں کے بالترتیب دور حکومت میں لاہور کی صورتحال کے بارے میں یورپی اور مقامی سیاحوں اور مصنفین کے بیانات کا مختصر خلاصہ ذیل میں پیش کر دیا جائے:۔

سینٹ ٹامس ہربرٹ بارٹ جس نے اکبر کے دور حکومت 1595ء میں لاہور کی سیاحت کی، اپنے سفرناموں میں یوں بیان کرتا ہے:۔

" لاہور ایک ایسا شہر ہے جو اپنی شہرت اور عظمت میں عروس البلاد آگرہ سے مقابلہ کرتا ہے۔ میں نے آٹھ ماہ میں یہ دیکھا کہ اس کی فضاء بڑی صاف ستھری اور صحت افزاء ہے۔ گلیاں شاندار اور ہموار ہیں۔ ان میں سے بہت سی گلیوں کو دریا کے پانی سے صاف کیا جاتا ہے اور اس کا پانی استعمال کیا جاتا ہے۔ دریائے راوی، پنجاب اور کشمیر کے پہاڑوں سے ہوتا ہوا شہر کے قریب بہتا ہے........

لاہور میں بہت سی چیزیں قابل توجہ ہیں۔ مثلاً قلعہ، محلات، مسجدیں، حمام، تالاب اور باغات وغیرہ۔ قلعہ بہت بڑا، یکسانیت سے بھرپور ہے اور بڑی شان و شوکت سے ایستادہ ہے۔ اس کی تعمیر میں استعمال ہونے والا پتھر سفید اور چمکدار ہے۔ اس میں 12 بغلی دروازوں کے ذریعے داخل ہوا جاتا ہے۔ ان میں سے تین شہر کے نام پر اور باقی ماندہ ملک کے نام پر مشہور ہیں۔ یہ شہر پورس کے زمانہ میں بڑی شہرت کا حامل تھا۔ دوسرے لفظوں میں ہندوستان کا کوئی اور صوبہ اس کی خوشحالی اور تجارت میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور نہ مشرق کا کوئی اور علاقہ ان معنوں میں اس کا مقابلہ کر سکتا ہے کہ یہاں سے آگرہ جانے والی سڑک پر تین سو میل سے زائد فاصلے تک، دونوں جانب، املم، السل اور شہتوت کے گھنی چھاؤں والے درخت لگائے گئے ہیں جن کی چھاؤں سورج کی تمازت کو کم کر دیتی ہے اور ہر آٹھ میل کے فاصلے پر ایک آرام دہ سرائے موجود ہے جہاں سیاح بلامعاوضہ آرام کر سکتے ہیں۔ "(2)

ابو الفضل سولہویں صدی میں تحریر کردہ اپنی کتاب "آئین اکبری" میں بیان کرتا ہے:۔

" لاہور بزرگ شہریست میان دوآبہ باری ۔۔۔ در بزرگی و انبوھی مردم کم همال ۔۔۔ در باستانی نہجات بہ لھاور تعبیر رود ۔ درین دولت ابد پیوند قلعہ وارک واز

خشت پختہ ساختہ اندو چون چند گاہ پائی تخت شد و والا کا نہا بر افروختہ آمد و دلکشا باغہا شادابی دیگر بخشید و گونا گوں مردم بر شہر راہ بیگاہ شد و شگرف کا رہا بر ساختند و در انبوھی و بزرگی از اندازہ گذشت ۔ "

ترجمہ : ۔ " باری دوآب میں لاہور ایک عظیم شہر ہے ۔ اس کی عظمت اور آبادی کے لحاظ سے اس کا کوئی ہمسر نہیں ۔ قدیم تاریخ میں اسے " لوہاور " کہا گیا ہے ۔ بادشاہ سلامت کے دور حکومت میں قلعہ کو پختہ اینٹوں اور چونے سے تعمیر کیا گیا اور بعد میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حکومت کا پایہ تخت یہاں قائم ہو گیا ۔ یہاں بلند و بالا محل تعمیر کیے گئے اور ان کی خوبصورتی کو چار چاند لگانے کے لیے دلآویز باغات بھی لگائے گئے ۔ یہ شہر ہر قوم اور ہر شہر کے لوگوں کا مسکن بن گیا اور یہاں پر نہایت بہترین عمارات بنوائی گئیں ۔ اپنی وسعت اور آبادی کے لحاظ سے یہ کہیں زیادہ اپنی حد سے تجاوز کر چکا ہے ۔ "(3)

ایک اور جگہ ابو الفضل لاہور کے بارے میں بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے : ۔

" و از توجہ شاہنشاہی در کشمیر ہنگامہ شالبافی گرمی پذیرفت و در لاہور از ہزار کارخانہ زیادہ شد "

ترجمہ : ۔ بادشاہ کی اس کی طرف توجہ دینے کی وجہ سے کشمیر میں شال بافی کے کام کو خوب ترقی ملی اور لاہور میں شال بافی کے ایک ہزار سے زائد کارخانہ جات تھے "(4)

" ایران اور توران کی منتخب اشیاء یہاں دستیاب ہوتی تھیں ۔ مختلف اقسام کا انگور اور خربوزہ یہاں پیدا ہوتا تھا ۔ "(5)

انگریزوں کی لاہور آمد

رچرڈ سٹل اور جان کروتھر، دو انگریز 1626ء میں جہانگیر کے دور حکومت میں تجارت کی غرض سے لاہور آئے ۔ وہ اس طرح بیان کرتے ہیں : ۔

" لاہور ہندوستان کے شہروں میں سب سے اچھا شہر ہے ۔ یہاں ہر چیز با افراط دستیاب ہے ۔ یا مسٹر کوریاٹ کے الفاظ میں " یہاں کے میدانی قطعات لتنے

شاندار ہیں کہ میں نے اس سے پہلے کہیں نہیں دیکھے۔ "ٹھٹھہ (سندا) اپنی اشیاء لے جانے کے لیے ہندوستان کے سبھی شہروں کے تاجر یہاں اس شہر میں جمع ہوتے ہیں۔ سامان سے لدے ہوئے 12 یا 14 ہزار اونٹ ایران براستہ قندھار جانے کے لیے یہاں سے گزرتے ہیں۔"

مسٹر تھارنٹن نے اس سے پیشتر اپنی متذکرہ کتاب برائے لاہور میں بادشاہ شاہجہان کے دور حکومت میں 1641ء میں لاہور کی سیاحت کرنے والے ایک ہسپانوی راہب فرا سبیشیئن مینرک کے سفرنامے کا ذکر کیا ہے:۔

"آگرہ سے روانگی کے بائیسویں روز طلوع آفتاب کے وقت ہم لاہور شہر کے قریب پہنچ گئے۔ وہ بہت بڑا اور وسیع و عریض نظر آ رہا تھا لیکن جتنا بڑا وہ دکھائی دے رہا تھا اس کے مقابلے میں ان لوگوں کی رہائش کے لیے مکان کافی نہیں تھے جو شہر سے باہر آدھ فرسخ کے فاصلے پر خیمہ زن تھے۔ بڑے دروازوں اور رنگ برنگی شہ نشینوں اور محرابوں سے مزین یہ ایک بڑا اور منظم شہر ہے۔ میں شہر میں ایک بھاری ذمہ داری قبول کرتے ہوئے داخل ہوا۔ کیونکہ گلیاں لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ کچھ پیدل تھے، کچھ اونٹوں پر، کچھ ہاتھیوں پر اور دیگر چھوٹے چھکڑوں پر سوار ایک دوسرے سے ٹکراتے اور جھولتے ہوئے جا رہے تھے جو سب سے اچھا ہو سکتا تھا وہی پہلے گزر جاتا۔ یہ جلدی اس لیے تھی کہ ان لوگوں نے دربار میں حاضری دینی تھی۔ شرفاء میں سے بہت سے افراد پانچ سو گھڑسواروں کے ہمراہ چلے جا رہے تھے۔"

اشیائے خورد و نوش

لوگوں کے انبوہ کثیر کی وجہ سے جب ہم نے دیکھا کہ ہمارے لیے آگے جانا مشکل ہو گیا ہے تو ہم نے اپنا راستہ بدلنے کا فیصلہ کیا اور اس ہجوم سے ایک گولی کی طرح نکلے اور واپس آکر شہر کے باہر چند درختوں تلے آن کھڑے ہوئے۔ وہاں اس جم غفیر کے لیے لوگوں کی ایک کثیر تعداد کھانا تیار کر رہی تھی اور فروخت کر رہی تھی۔ کچھ لوگ کھانا کھا رہے تھے، کچھ بیچ رہے تھے اور دوسرے دیکھ رہے تھے۔ ان دیکھنے والوں میں، میں بھی تھا۔ میرے تجسس نے مجھے مزید آگے جانے کے لیے اکسایا۔ آخرکار میں ایک بڑے بازار میں پہنچ گیا۔ اس بازار میں جانے پر آپ کو بعض ایسی چیزوں کی

مہک آتی ہے جس کے لیے آپ پہلے سے تیار نہیں ہوتے۔ وہاں بڑی بڑی دکانیں یا اعلیٰ پائے کے باورچی خانے ہوتے ہیں جہاں مختلف اقسام کے جنگلی اور پالتو جانوروں کا گوشت فروخت کیا جاتا ہے۔ کیونکہ سور کا گوشت استعمال نہیں کیا جاتا لہذا اس کی جگہ آپ کو گھوڑے کا گوشت مہیا کر دیا جاتا ہے۔ چند دکانیں مختلف انواع و اقسام کے پرندوں پر مشتمل ہیں۔ دوسری دکانوں میں ہر طبقہ کے مزاج کے مطابق اشیاء موجود ہوتی ہیں۔ مثلاً مکھن، تیل، عطریات، بینگن، آم، کیلے وغیرہ، اس بازار میں عام شے مثلاً چاول، جڑی بوٹیاں اور سبزی وغیرہ میں سے کوئی ایسی شے نہیں جس کو طلب نہ کیا جاتا ہو۔

روٹی کی مختلف اقسام :۔ عام روٹی تمام اقسام کے آٹے کا آمیزہ تیار کر کے بنائی جاتی ہے اسے لوہے کے پتروں یا مٹی کے برتنوں میں پکایا جاتا ہے۔ یہ "اپاس" کے نام سے مشہور ہے۔ قافلوں میں سفر کرنے والے لوگ سفید آٹے سے بنی ایک دوسری قسم کی روٹی استعمال کرتے ہیں، اسے "کروچہ" کہتے ہیں (6)۔ یہ روٹی اعلیٰ طبقے کے افراد بھی استعمال کرتے ہیں۔ روٹی کی ایک تیسری قسم جسے ریگونیز کہتے ہیں (7)۔ یہ انتہائی عمدہ روٹی ہوتی ہے، اسے بہترین آٹے اور خالص مکھن سے تیار کیا جاتا ہے، جو چیزیں میں نے یہاں شمار کروائی ہیں۔ بازاروں میں ان کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں دیکھنے کے لیے تھیں لیکن میرا خیال ہے اپنے مشتاق قاری کی تسلی کے لیے میں نے کافی کچھ بیان کر دیا ہے لیکن جس چیز کی میں نے سب سے زیادہ تعریف کی وہ اشیاء کی مناسب اور جائز قیمت تھی۔ ایک آدمی چاندی کے دو روپوں (پانچ پنس) میں ایک دن میں خوب سیر ہو کر اور شاہانہ انداز میں کھانا کھا سکتا تھا۔ سہولیات کی افراط اور گلیوں کی صفائی اور اس کے علاوہ امن اور سکون جس کا ہر چیز کے ساتھ تعلق تھا اور اسی طرح لوگوں کی ایک دوسرے کے ساتھ دیانتداری اور انصاف کی فضاء جس کی وجہ سے تاجر اور مال تجارت دونوں چوروں سے محفوظ تھے، یہ دیکھ کر میں بہت حیران ہوا۔

محل اور باغات

شہر لاہور بڑے خوبصورت مقام پر واقع ہے۔ اس کے مناظر بڑے دلفریب ہوتے ہیں۔ اس کے ایک طرف شفاف پانی کا دریا ہے جو کشمیر کے پہاڑوں سے نکلتا ہے اور اپنے راستے پر بہتا ہوا زمین کو سیراب اور شاداب کرتا ہوا آخرکار ملتان شہر تک پہنچ کر مشہور دریائے سندھ میں جا شامل ہوتا ہے۔ لاہور مغلیہ سلطنت کا دوسرا شہر (اپنے حجم میں بڑا ہونے کے باعث) نفیس محلات،

باغات، تالابوں اور فواروں سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ اس کی اشیائے خورد و نوش اتنی باافراط ہیں کہ ان کو یہاں بیان کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اگر صدر گلی (جو بازار دل چوکو کے نام سے مشہور ہے) (8)۔ اس کو فائدے کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کا مقابلہ یورپ کے کسی بھی امیر ترین بازار سے کیا جاسکتا ہے۔

مذکورہ بالا بیان سے پتہ چلتا ہے کہ شاہجہان کے دور میں لاہور خوشحالی کے معاملہ میں بام عروج پر پہنچ گیا تھا۔ اس کے جانشین اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں اس کو دولت مندی اور اہمیت کے لحاظ سے بڑی شہرت مل گئی۔ بادشاہ کی کشمیر روانگی کے موقع پر دربار کو لاہور میں منعقد کیا جاتا تھا اور بادشاہ اس شہر کی فلاح و بہبود میں بڑی دلچسپی لیتا تھا۔ اس نے جامع مسجد تعمیر کرائی جو لاہور کی خوبصورت اور زیبائشی عمارتوں میں سے ایک ہے اور اس کے ساتھ ایک مدرسہ قائم کر کے اس شہر کو آراستہ کیا۔ اس نے ایک مشہور بند بھی تعمیر کرایا جو اس کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کی وجہ سے شہر دریا برد ہونے سے محفوظ رہا۔

جواہرات کا مشہور فرانسیسی تاجر جان بٹپسٹا ٹیوزنیئر جس نے (1641-68ء) کے دوران شاہجہان اور اورنگ زیب کے دور حکومت میں زمینی راستے کے ذریعے براستہ قندھار، کابل لاہور، اصفہان سے آگرہ اور دہلی تک سفر کیا۔ وہ اپنے سفرناموں میں لاہور کا ذکر کچھ اس طرح کرتا ہے:۔

> "لاہور بادشاہت کا دارالخلافہ ہے اور یہ ان پانچ دریاؤں میں سے ایک کے کنارے پر آباد ہے جو شمالی پہاڑوں سے نکل کر دریائے سندھ میں جا شامل ہوتے ہیں اور انہیں دریاؤں کی وجہ سے اس علاقہ کو پنجاب کا نام دیا گیا۔ آج کل یہ دریا شہر سے ایک چوتھائی فرسخ کے فاصلے پر بہتا ہے اور جب یہ اپنا راستہ تبدیل کرتا ہے تو اردگرد کا علاقہ اکثر اس کے سیلاب اور طغیانی سے تباہ ہو جاتا ہے۔ شہر کافی بڑا ہے اور ایک کوس سے زیادہ طول میں پھیلا ہوا ہے لیکن گھروں کے زیادہ تر بڑے حصے جو آگرہ اور دہلی کے مکانات سے بلند ہیں، کھنڈرات میں تبدیل ہو رہے ہیں، لگاتار بارشوں کی وجہ سے ان میں سے کافی تعداد منہدم ہو چکی ہے۔ بادشاہ کا محل قدرے نفیس اور عمدہ ہے اور یہ دریا کے رحم و کرم پر ہے۔ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ دریا ایک چوتھائی فرسخ کے فاصلے پر بہہ رہا ہے۔ لاہور میں شراب دستیاب ہو سکتی ہے۔" (9)

برنیئر 1664ء میں لاہور سے گزرا اس نے اس کے قلعہ کی شان و شوکت، گلیوں اور بازاروں کے ہجوم اور رونق اور اس کے بلند و بالا مکانات کا بخوبی جائزہ لیا اور دہلی و آگرہ کے مکانات سے ان کا موازنہ کیا (10)۔ لیکن اب شہر میں تباہی کی علامات ظاہر ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ سیاح تھیوینات نے اسے ایک سال کے بعد دیکھا اور اس کے گرد و نواح کی شکستہ حالت کا بغور جائزہ لیا۔ وہ اس بات کا بھی ذکر کرتا ہے کہ اس کی آمد سے کچھ عرصہ قبل شہر اور اس کی نواحی بستیاں تین فرسخ کے فاصلے تک پھیل چکی تھیں (11)۔

اورنگ زیب کے انتقال کے بعد دہلی کی خانہ جنگیوں اور شاہی حکومت کے زیر انتظام صوبوں میں ہونے والی ہنگامہ آرائیوں میں صاحب اقتدار حکمران کچھ اس قدر منہمک ہو گئے تھے کہ انہوں نے پنجاب کے معاملات کو یکسر نظر انداز کر دیا، یا یہ ثابت کیا کہ وہ لاہور کے ناظم پر کسی قسم کا بھی کوئی اختیار رکھنے کے اہل نہیں ہیں۔ ناظم لاہور نے جب یہ دیکھا کہ ہنگامی حالت میں پایہ تخت سے کسی قسم کی کوئی مدد نہیں مل رہی اور وہ ہر قسم کے تسلط سے بالکل آزاد ہو چکا ہے تو اس نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ حاکموں کی کمزوری کی وجہ سے سکھوں کو لوٹ مار اور غارت گری کی کارروائیاں کرنے میں حوصلہ افزائی ہوئی اور لاہور کے نواحی علاقے جو ایک وقت میں بڑے گنجان آباد اور متمول تھے انہیں سب سے پہلے نقصان اٹھانا پڑا۔ برنیئر نے اپنے مشاہدے کے بعد لکھا ہے کہ اس بارے میں بڑے وثوق سے کہا جاتا ہے کہ شہر کی فصیل کے باہر بے شمار گنجان آباد بستیاں تھیں۔ یہ طویل بازاروں کے ذریعے جدید شہر کے دروازوں سے منسلک تھیں، خالی قطعات کو باغات، محرابی نالوں، مسجدوں، حماموں اور کارواں سرائے سے بھر دیا گیا تھا۔ موجودہ ضلع کچہری اور برف خانہ کے نواح میں لاہور کا موتی محل یا شاہی گلی واقع تھی۔ وہاں پرانے سکوں اور زیورات کے آثار پائے گئے۔ آخر کار شدید بارشوں کے بعد انہیں نکال لیا گیا۔ حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار اور شیعہ امام باڑہ کے درمیان آج کل بھی "شیش محل" کی بنیادوں کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ تحقیقات چشتی کے مطابق یہاں پر ایک بازار لگتا تھا لیکن اب اس کے کوئی آثار موجود نہیں ہیں۔ انار کلی کے مقبرہ سے ٹکسالی دروازے تک شہر کی فصیل کے ساتھ بہنے والے دریائے راوی کے کنارے کے ساتھ ساتھ عالی شان عمارات سے ملحقہ شاہی باغات اور شاندار بارہ دریوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔

شہر کے پرانے علاقے

شہر کا سب سے امیر ترین علاقہ مغلپورہ، لاہور اور شالیمار کے نصف راستے پر موجودہ بیگم پورہ کے مقام پر واقع تھا۔ اس جگہ مغل امراء اور نوابین رہتے تھے۔ یہ جگہ بلند و بالا مکانات، عظیم الشان محلات اور تاجروں و سوداگروں کی عالی شان دکانوں پر مشتمل تھی۔ بعد میں یہ جگہ نواب ذکریا خاں خان بہادر اور اس کے جانشینوں کی رہائش گاہ بن گئی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ جگہ اتنی گنجان آباد اور امیر ترین تھی کہ احمد شاہ درانی نے جب پہلی مرتبہ یہاں حملہ کیا تو اس کو لوٹ مار کے دوران یہاں سے اتنا کچھ مل گیا کہ وہ مزید لالچ کے تحت شہر میں بھی داخل نہ ہوا۔ وہ اور اس کے سپاہی اپنے ساتھ بے شمار دولت لے کر گئے۔

دیگر مشہور مقامات جن کا ہمعصر مسلمان مصنفین نے بغور مشاہدہ کیا وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

محلہ لنگر خاں :۔ شہر کا یہ وسیع و عریض علاقہ اس جگہ موجود تھا جہاں اس وقت چیف کورٹ اور اکاؤنٹنٹ جنرل کا دفتر واقع ہے۔ بعد کے دور میں حضرت شاہ چراغؒ کا مزار بھی اسی محلہ میں تعمیر کیا گیا۔ جب 1526ء میں سندھ کے حکمران حسین ارغون نے شہنشاہ بابر کے حکم سے ملتان پر قبضہ کیا تو بابر نے یہ صوبہ اپنے بیٹے مرزا عسکری کو عنایت کر دیا۔ اس نے اسے ملتان روانہ کیا اور اس کے ساتھ لنگر خاں کو بھی بھیجا جو ملتان میں اس نسل کے آخری فرمانروا سلطان محمود لنگاہ کے دربار میں امیرالامراء تھا۔ بابر کے انتقال کے بعد ہمایوں نے ملتان اور سارے کا سارا پنجاب اپنے بھائی کامران مرزا کو دے دیا۔ اس شہزادے نے ملتان کا نظم و نسق سنبھالنے کے لیے اپنے مصاحبین کو وہاں روانہ کیا اور لنگر خاں کو لاہور واپس بلا لیا۔ اس کی آمد پر اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ مرزا نے شہر کے قریب اسے رہائش گاہ تعمیر کروا کے دی، جو بعد میں اسی کا ایک حصہ بن گئی۔ اس کے محل کو " دائرہ لنگر خاں " کے نام سے پکارا جاتا تھا (12)۔ اس بیان کی، تاریخ سندھ، خلاصۃ التواریخ اور نظام الدین احمد کی طبقات اکبری سے مکمل طور پر تصدیق ہو گئی ہے اور اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں رہا کہ دائرہ لنگر خاں بعد میں واقعی لاہور کا ایک حصہ بن گیا۔

محلہ پیر عزیز :۔ موجودہ مزنگ کو افغان گوت، مزنگ کے ایک پیر عزیز نے تعمیر کرایا تھا۔ اس وقت سے اس بستی کو مزنگ کا نام دیا گیا۔ اسلامی دور حکومت کے شروع میں اس محلہ کے مغلوں کو باغی قبیلوں نے لوٹ لیا۔ سکھوں کے زمانہ میں ان کی جگہ بلوچوں اور مغلوں نے لے لی۔ بعد میں

ارائیں بھی ان کے محکوم بن کر یہاں آگئے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں بلوچوں کا اس جگہ بڑا اثر ورسوخ تھا۔ یہاں پر عبداللہ شاہ بلوچ کے مقبرے کی بڑی تعظیم کی جاتی ہے۔

محلہ عبداللہ واڑی :۔ حاجی محمد سعید لاہوری کا مقبرہ حضرت شاہ چراغ کے مزار سے جنوب کی طرف سرکاری محکمہ ٹیلیگراف کے نئے دفتر کے قریب واقع ہے۔ یہ جگہ محلہ عبداللہ واڑی کے نام سے مشہور تھی۔ کتابوں میں محمد سعیدؒ صاحب کے نام سے منسوب محلہ عبداللہ واڑی کے ذکر سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ اسی نام کے علاقہ میں رہتے تھے۔ حاجی محمد سعید جو اس دور کے نہایت عالم و فاضل شخص تھے، عالمگیر ثانی کے دور حکومت میں یہاں آباد ہوئے۔ ان کا زیادہ تر وقت لوگوں کو مذہبی تعلیم دینے میں صرف ہوتا تھا۔ جب نادر شاہ درانی مرہٹوں پر شاندار فتح حاصل کرنے کے بعد واپس لاہور آیا تو اس نے حاجی محمد سعیدؒ کے احترام میں شہر کو غارت گری سے بچائے رکھا۔ اسی دور سے محمد سعیدؒ ایک ولی اللہ کے طور پر مشہور ہوئے اور ان کا نہایت احترام کیا جانے لگا۔ کابل کے چند سردار ان کی یاد میں اس دن کا بہت احترام کرتے تھے۔ جب امیر دوست محمد خاں کا بھائی سردار سلطان محمد خاں لاہور میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کا مہمان بنا تو وہ بڑی باقاعدگی سے ان کے مزار پر حاضری دیتا اور فاتحہ خوانی کرتا تھا۔ محمد سعیدؒ کی اولاد نرینہ تو نہیں البتہ دو صاحبزادیاں بی بی صاحب جان اور رحمت بی بی تھیں، جن کی اولاد اب بھی شہر لاہور میں آباد ہے۔ محمد سعید 1181 ہجری (1767ء) میں فوت ہوئے اور انہیں اسی علاقہ میں دفن کیا گیا (13)۔ بھنگی مثل کے گوجر سنگھ نے اس محلہ کو لوٹ لیا اور اس کی عمارات کو مسمار کر دیا۔

لکھی محلہ :۔ یہ اس مقام پر آباد تھا جہاں اس وقت رتن چند کے باغ کے عقب میں کرنل ہال کی کوٹھی موجود ہے۔ اس علاقے میں سنار، ساہو کار، کھوجے اور پراچے آباد تھے جو نہایات متمول اور صاحب جاہ و حشم تھے۔ انہی کی وجہ سے اس محلے کو یہ نام دیا گیا۔ مسلمانوں کی حکومت کے زوال پر جب وحشی ٹولوں نے اس شہر کے گرد و نواح میں لوٹ مار اور غارت گری کا بازار گرم کر دیا تو بہت سے متمول لوگ یہاں سے ہجرت کر کے جموں چلے گئے جبکہ دوسرے اندرون شہر رہائش پذیر ہو گئے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں خشت فروشوں نے اس عمارت کو بنیادوں تک کھود ڈالا۔ لہذا اس محلے کا اب نام و نشان تک باقی نہیں رہا (14)۔

محلہ مائی لاڈو :۔ یہ محلہ دائی لاڈو یا محلہ تلہ کے نام سے مشہور تھا۔ یہ رتن چند داڑھی والے کے باغ کی جگہ پر آباد تھا اور شہر کے بیرونی سب محلوں سے بڑا تھا۔ اس کی غربی حد دولا واڑی محلے سے ملتی تھی اور مشرقی حد محلہ زین خاں کے ساتھ ملحق تھی۔ اس محلہ کو جہانگیر کے دور کی ایک نہایت

متمول اور معزز دایہ لاڈو نے آباد کیا تھا۔ اس محلہ میں بڑی بڑی عالی شان عمارتیں بنائی گئی تھیں لیکن غارت گروں نے اس کو تباہ و برباد کر دیا۔ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں اس کی عمارتوں کی شکستہ دیواریں موجود تھیں لیکن خشت فروش کشمیریوں نے ان کو بنیادوں تک کھود ڈالا۔ اس جگہ پر دائی لاڈو کی مسجد ابھی تک موجود ہے (15)۔

محلہ زین خاں :۔ موچی دروازے کے باہر موجود تھا۔ اس جگہ کو اب بھی لوگ میدان زین خاں کے نام سے پکارتے ہیں (16)۔ زین خاں نے اس کو وسیع و عریض محلات سے آراستہ کیا اور یہ محلہ اسلامی دور حکومت کے اختتام پر آباد ہوا۔ ایک مرتبہ جے سنگھ کنھیا نے اسے لوٹنے کی کوشش کی لیکن زین خاں کے ایک وارث نے دس ہزار روپیہ کا نذرانہ دے کر اسے ٹالا۔ بعد میں بھنگیوں نے اس محلہ میں غارت گری شروع کر دی اور اسے نذر آتش کر دیا۔ یہاں کے رہنے والے کچھ تو ملک کے دوسرے علاقوں میں چلے گئے جبکہ دوسرے شہر لاہور میں فصیل کے اندر آباد ہوگئے۔ زین خاں کے محل سے متعلقہ ایک حمام اور ایک تہہ خانہ رنجیت سنگھ کے دور تک موجود رہا۔ مگر اب اس کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔

محلہ محمد صدیق چشتی :۔ میدان زین خان میں اور رتن چند سرائے سے پنجاب اور این، ڈبلیو ریلوے اسٹیشن آنے والی سڑک کے جنوب میں ایک چار دیواری میں حضرت محمد صدیق چشتی لاہوری کا مقبرہ ہے۔ وہ 8 ذوالحجہ 990 ہجری (1582ء) کو اکبر کے دور حکومت میں فوت ہوئے۔ اس خانقاہ کا متولی ایک بہت ضعیف العمر شخص ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس چار دیواری کے باہر زین خاں کا باغ ہوتا تھا اور جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے اس باغ کا دروازہ بھی موجود تھا۔

محلہ سید سر :۔ سادات کا یہ محلہ گڑی شاہو کی بستی کے قریب اور میاں میرؒ کے مزار کی طرف جانے والی سڑک پر تھا۔ یہاں پر ایک قدیم تالاب موجود تھا۔ اس کے پانی کے بارے میں لوگوں کا عقیدہ تھا کہ اس میں شفا پائی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی بھی بیماری میں مبتلا لوگ یہاں غسل کرتے اور بالکل شفایاب ہو جاتے۔ اس تالاب کا اصل نام سید سر (17) تھا۔ اس کو سید عبدالوسع کے بیٹے سید عبدالخلیق نے بنوایا تھا۔ وہ اسکندر شاہ سوری کے دور حکومت میں یہاں آکر آباد ہوئے۔ انہوں نے یہاں ایک مدرسہ قائم کیا جس میں علم الکلام کی تعلیم دی جاتی تھی۔ وہ تالاب جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں شفاء کی پر اسرار خصوصیت پائی جاتی تھی، اب موجود نہیں ہے لیکن اس کی خاک کو مقدس سمجھا جاتا ہے۔ آج کل مائیں اپنے بچوں کے جسموں کے متاثرہ حصوں پر یہ خاک

لگاتی ہیں تو وہ حصے تندرست ہو جاتے ہیں۔ اس محلہ پر لٹیروں نے لگاتار حملے کیے لیکن سید انہیں معقول نذرانے پیش کر کے واپس جانے کی استدعا کرتے۔ لہذا وہ واپس لوٹ جاتے تھے۔ آخر کار بھنگی مثل کے سرداروں کو مطلع کیا گیا کہ اس محلہ کے لوگ گائے ذبح کرتے ہیں۔ لہذا سکھوں نے اس محلہ پر چڑھائی کر دی۔ اسے خوب لوٹ کھسوٹ کر تباہ و برباد کر دیا۔ یہاں کے لوگ کچھ جبو دیہات کی طرف اور کچھ اندرون شہر لاہور میں چلے گئے جبکہ دوسرے مختلف دیہاتوں میں پھیل گئے۔

گنج محلہ :۔ یہ اس مقام پر آباد تھا جہاں اب میاں میر ریلوے اسٹیشن امرتسر کی سڑک پر بنا ہوا ہے۔ اس محلہ کا اب کوئی نشان باقی نہیں ہے مگر ریلوے اسٹیشن کے مشرقی جانب اس نام کا گاؤں موجود ہے۔ اس کے قریب بہادر خاں کا مقبرہ بھی ہے۔

چوک دارا :۔ یہ نہایت گنجان آباد علاقہ دہلی دروازہ کے باہر لنڈا بازار اور سلطان کی سرائے کے مقام پر آباد تھا۔ چوک دارا بڑی دلکش جگہ پر موجود تھا۔ اس میں چمکدار منقش ٹائلوں سے مزین عالی شان دروازے کے ذریعہ داخل ہوا جاتا تھا۔ اس دروازے کے دونوں جانب دو منزلہ دکانوں کی قطاریں تھیں، جن میں تاجروں اور سوداگروں نے اپنا کاروبار قائم کر رکھا تھا۔ غرض کہ یہ بازار اس خوش اسلوبی سے بنایا گیا تھا کہ لوگوں کی کثیر تعداد یہاں آتی تھی۔ یہاں دارا شکوہ کا خوبصورت محل اور اس کے اہم مصاحبین کی رہائشی عمارات بڑی شان سے ایستادہ تھیں۔ نخاس یا گھڑ بازار بھی اسی علاقہ میں تھا (18)۔ جوہریوں کی یہاں پر دکانیں ہونے کے باعث لوگ اس کو جوہری بازار بھی کہتے تھے۔ عہد چغتائی کے آخر تک یہ چوک آباد رہا لیکن سکھ لٹیروں نے اسے لوٹا اور غارت کر دیا۔ اس کے ساکنین مختلف اطراف میں بھاگ گئے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں بھی اس چوک کی بہت سی عمارات موجود تھیں لیکن کشمیری خشت فروشوں نے اس کو گرا کر بنیادیں تک نکال لیں۔ انگریزی عہد میں اس مشہور و معروف چوک کے کھنڈرات سرکاری عمارات کے عظیم ٹھیکیدار محمد سلطان کو فروخت کر دیے گئے۔ گویا اس کو اینٹوں کی ایک کان مل گئی۔ اسی کھنڈر سے اینٹیں حاصل کر کے اس نے ایک عظیم سرائے جو بعد میں اس کے نام سے مشہور ہوئی اور بہت سی عمارات لنڈے بازار میں تعمیر کرائیں۔ سرائے کی مشرقی جانب دارا شکوہ کی تعمیر کردہ ایک دو منزلہ مسجد تھی جو اپنی مثال آپ تھی۔ اس کو بھی سلطان نے گرا دیا۔ اس کے نتیجہ میں تھوڑی دیر بعد وہ فوت ہو گیا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ عتاب اس پر "خدا کے گھر" کو گرانے کی وجہ سے آیا تھا۔

محلہ حوافی پورہ :۔ دارا شکوہ نے اپنی کتاب سفینۃ الاولیاء میں لاہور شہر کے محلہ حوافی پورہ کا ذکر

اپنے روحانی پیشوا حضرت میاں میرؒ کی جائے وصال کے طور پر اور گاؤں ہاشم پورہ کا ذکر ان کے مقام تدفین کے طور پر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

وفات حضرت ایشان روز سہ شنبہ بعد از نماز ظہر ہفتم ماہ ربیع الاول سال یکہزار و چہل و پنج ہجری بمعمورہ لاہور در محلہ حوافی پورہ واقعہ شد و جمع کثیرے بہ جنازہ ایشان نماز گذار بودہ اند و مدت عمر شریف ہشتاد و ہفت سال و قبر ایشان در موضع ہاشم پورہ متصل لاہور است۔

ترجمہ:۔ حضرت کی وفات بروز منگل 7 ربیع الاول 1045 ہجری بعد از نماز ظہر لاہور شہر کے محلہ حوافی پورہ میں ہوئی۔ لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد آپ کے جنازہ میں شریک ہوئی۔ آپ کی عمر مبارک 87 برس تھی۔ ان کا مزار لاہور سے متصل موضع ہاشم پورہ میں تعمیر کیا گیا۔

محلہ حوافی پورہ کے بالکل صحیح مقام کا پتہ نہیں چلایا جا سکتا لیکن دارا شکوہ کے بیان سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ اس شہر کی آبادی موجودہ میاں میرؒ فوجی چھاؤنی تک پھیل گئی تھی اور یہ کہ صوفی بزرگ کی جائے مدفون ہاشم پورہ کو شہر کا ایک نواحی علاقہ سمجھا جاتا تھا۔ محمد شاہ کے دور حکومت میں موضع ہاشم پورہ اجڑ گیا اور ہاشم کی اولاد دریائے راوی کے پار جا کر آباد ہو گئی۔ انہوں نے وہاں جبو اور جھگیاں گاؤں آباد کیے۔

تریپولیہ بازار:۔ جہانگیر کی کتاب میں ہمیں لاہور کی اس مسجد کے ذکر کا بھی پتہ چلتا ہے جو اس نے شہر کے تریپولیہ بازار میں تعمیر کرائی تھی۔ اس وسیع و عریض اور عالی شان مسجد کی عمارت امرتسر کی سڑک کے دائیں جانب، نارتھ ویسٹرن سٹیٹ ریلوے اسٹیشن کے نزدیک موجود تھی۔ بعد کے ادوار میں یہ عید گاہ کے طور پر مشہور ہو گئی لیکن حال ہی میں اینٹوں کی خاطر اسے مسمار کر دیا گیا ہے۔

وقائع جہانگیری کے مطابق بادشاہ نے اس مسجد اور اس سے ملحقہ گلی کی تعمیر کے لیے 20 لاکھ روپے کی منظوری دی۔ یہ مسجد خواجہ ایاز کی زیر نگرانی تعمیر ہوئی اور اس کے مشرق، شمال اور جنوب میں تین بازار بنائے گئے۔ ہر گلی مکمل بالائی منزلوں سمیت دو سو ستر دکانوں پر مشتمل تھی۔ بادشاہ جس وقت دارالسلطنت آگرہ میں تھا تو اسے ایک عرضداشت کے ذریعہ مطلع کیا گیا کہ مسجد اور گلی مکمل ہو گئی ہے اور دکانوں کے کرایہ سے حاصل ہونے والی آمدنی 2,500 روپے ماہانہ ہے۔ اس بات کا پتہ بھی چلتا ہے کہ بادشاہ کی چہیتی بیوی نور جہاں کی سفارش پر مولوی عنایت

حسین کو مسجد میں معلم اور حافظ حبیب کو امام مقرر کیا گیا۔ اس کے علاوہ پچاس خادم بھی مستقل طور پر اس کے ساتھ منسلک کر دیے گئے۔ جب اس شہر کے نواحی علاقے ویران ہو گئے تو مسجد کو عید گاہ کے طور پر استعمال کیا جانے لگا(19)۔

غالباً پرانے آباد علاقے موجودہ شہر کی حدود سے متجاوز نہیں ہوئے اور جیسا کہ اکبر اور اس کے قریبی جانشینوں کے دور حکومت میں مسلمان مصنفین نے جن گزروں اور علاقوں کا نہایت گنجان آباد ہونے کے طور پر ذکر کیا ہے وہ آباد شہر کی دیواروں سے باہر کے نواحی علاقے تھے۔ لاہور کے یہ علاقے ظاہری طور پر ہندوستان کے قدیم شہروں یعنی دہلی، آگرہ اور ملتان کی طرز پر آباد کیے گئے اور مشرقی شہروں یعنی شیراز، اصفہان، سمرقند اور کابل سے بھی ان کی بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔ جہاں نواحی علاقے شہر کے نہایت اہم حصہ کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔

لاہور اور اس کے مضافات:۔ شہر کی فصیل سے باہر لاہور کے پرانے آباد علاقوں کے حالات بیان کرنے کے بعد یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہیں ہو گا کہ رنجیت سنگھ اور اس کے جانشینوں کے دور حکومت میں شہر اور اس کے مضافات کے حالات کیا تھے۔

ایک انگریز افسر جو 1809ء ، رنجیت سنگھ کے حکومت سنبھالنے کے دس سال بعد لاہور آیا وہ اپنی ڈائری میں لکھتا ہے:۔

24 مئی، میں نے لاہور کے کھنڈرات کی سیر کی وہ ماضی کی کھوئی ہوئی شان و شوکت کی درد ناک تصویر پیش کر رہے تھے۔ پچاس سال پیشتر یہاں پر عالی شان اور فلک بوس عمارات اور مسجدیں جو اس مصروف اور چاق و چوبند آبادی کے لیے سرمایہ افتخار تھیں، اب ریزہ ریزہ ہو کر خاک میں ملتی جا رہی ہیں اور نصف صدی تک بالکل زمیں بوس ہو جائیں گی۔ میں جب ان کھنڈرات میں گیا تو مجھے کوئی انسان نظر نہ آیا۔ صرف خاموشی، تنہائی اور اداسی تھی۔

سیاح مور کرافٹ جس نے 1820ء میں لاہور کو دیکھا وہ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے:۔

"لاہور کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ 12 کوس کے دائرہ میں پھیلا ہوا تھا۔ تاہم فصیل کے پار اس کی عمارات کے کھنڈرات سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو آج کل کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ اسی طرح فصیل کے اندر کا علاقہ بھی آج کل بہت گنجان آباد ہے۔ گلیوں میں اس قدر رونق اور بھیڑ ہے کہ میں نے ہندوستان کے کسی اور شہر میں اس قدر ہجوم نہیں دیکھا

(20)۔

الیگزینڈر برنز جو 1831ء میں لاہور آیا وہ اپنے سفرنامہ میں اس سیاحت کے بارے میں لکھتا ہے:۔

18 جون کی صبح کو ہم شاہی شہر لاہور میں داخل ہوئے جو ایک زمانہ میں دہلی کا ہمسر تھا۔ ہم اس کے کھنڈرات کی طرف نکل گئے۔ شام کے وقت اپنی مٹر گشت کے دوران ہمیں اس شہر کو دیکھنے کے بہت سے مواقع ملے۔ قدیم شہر مشرق سے مغرب تک پانچ میل کے فاصلے تک پھیلا ہوا تھا اور اوسطاً اس کی چوڑائی بھی تین میل تھی کیونکہ اس کے کھنڈرات سے بھی یہی معلوم ہو رہا تھا۔ مسجدیں اور مقبرے جو مکانات سے قدرے مضبوط تھے میدانوں کے درمیان میں بنائے گئے تھے۔ اسی طرح سیاحوں کے لیے کارواں سرائے بھی بنوائی گئی تھیں۔ موجودہ شہر نے قدیم دارالسلطنت کے مغربی زاویے کو گھیرا ہوا ہے اور اس کے چاروں طرف ایک مضبوط دیوار سے احاطہ کیا ہوا ہے۔ مکانات بلند و بالا اور گلیاں تنگ ہیں جو درمیان سے گزرنے والے گٹر کی وجہ سے مجرمانہ حد تک گندی ہیں۔ لاہور کے بازاروں سے امارت کا کوئی زیادہ اظہار نہیں ہوتا لیکن پنجاب کا تجارتی اثر و رسوخ اب موجودہ دارالحکومت امرتسر میں پایا جاتا ہے (21)۔

ہنری ایڈورڈ فین جو 1837ء میں برطانوی کمانڈر انچیف کے ہمراہ شہزادہ نونہال کی شادی پر لاہور آیا۔ وہ لاہور کے بارے میں لکھتا ہے:۔

" 28 مارچ، لاہور سے روانہ ہوئے اور شہر کی فصیل کے نیچے سے گزرے۔ ہم دس میل تک چلتے ہوئے اس قدیم دارالسلطنت کے کھنڈرات میں سے گزرے جو مغل بادشاہوں کے زمانہ میں دہلی اور آگرہ کے ہم پلہ تھا۔ لاہور ہندوستان کا سابق دارالخلافہ تھا اس کے بعد مسلمان فاتحین آگرہ اور دہلی میں آباد ہوگئے۔ اس وقت یہ اپنے عظیم حجم اور شان و شوکت کے لحاظ سے بہت مشہور تھا لیکن اب یہ دونوں چیزیں اس سے جدا ہو چکی ہیں۔ اس کی موجودہ عظمت (جس میں چند نفیس عمارات کے کھنڈرات کی موجودگی اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ یہ بھی کبھی موجود تھیں) شہنشاہ ہمایوں (22) کی وجہ سے ہے۔ اس نے کچھ عرصہ تک یہاں اپنا دارالسلطنت قائم کیا اور اسے اپنی من پسند رہائش گاہ بنالیا (23)۔

سیاح میسن 1838ء میں یا رنجیت سنگھ کے انتقال سے ایک سال پیشتر یا برطانوی حکومت سے الحاق سے سات سال قبل لاہور کے بارے میں لکھتا ہے: ۔

" لاہور، پنجاب اور رنجیت سنگھ کے دیگر علاقوں کا دارالخلافہ، بلاشک و شبہ، عہد پارینہ کا ایک شہر ہے اور یہ کافی عرصہ تک اپنے حجم کے پھیلاؤ اور شان و شوکت کے لحاظ سے مشہور رہا ہے۔ ہندوستان کے مؤرخین نے اس کی تعریفوں کے جو پل باندھ دیے ہیں، اس کے بارے میں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ان کا اطلاق سابقہ شہر پر ہوتا ہے جس کے صرف اب کھنڈرات ہی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں رائج الوقت اس ضرب المثل کا بھی بڑے وثوق سے حوالہ دیا جا سکتا ہے کہ اصفہان اور شیراز مل کر بھی لاہور کے نصف کے برابر بھی نہیں ہو سکتے۔ تاہم موجودہ شہر بہت اہمیت کا حامل ہے اور بہت سی عالی شان اور اہم عمارات پر مشتمل ہے۔ دیواروں کے بغیر قدیم شہر کے ہر طرف بکھرے ہوئے کھنڈرات اب بھی بڑے دلکش ہیں اور قدیم لاہور کے پھیلاؤ کا وسیع تصور پیش کرتے ہیں۔ بیشمار مقبرے اور دیگر ڈھانچے ابھی تک ایستادہ ہیں اور ان میں سے کئی تو تقریباً مکمل حالت میں کھڑے ہیں۔ ان کی مضبوطی کچھ اس قدر ہے کہ اگرچہ امتداد زمانہ سے مکمل طور پر ختم تو نہیں ہو سکے لیکن پھر بھی اس کا غیر محسوس تصور ضرور پیش کر رہے ہیں (24)۔

کیپٹن وان اورلچ، جس نے لاہور کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں 1842ء کے قریب دیکھا، اس کے بارے میں لکھتا ہے: ۔

" ہم نے دریائے راوی کے کنارے پر شہر سے باہر جنرل وینتورا کے گھر کی چھت سے شہر اور اس کے مضافات کا نہایت دلکش نظارہ کیا۔ مینار، سرما، محل اور شہنشاہ جہانگیر کے دور کی چند مساجد کے چمکدار نیلے گنبد خاص طور پر نمایاں تھے۔ دور ہمالیہ کے برف پوش پہاڑوں کا دھندلا سا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ شہر کے جنوب میں قدیم لاہور کے کھنڈرات کے ملبہ کی وجہ سے کچھ پہاڑیاں سی بن گئی ہیں اور ان میں شہر میں حائل ہونے والی کارواں سرائے، مزارات کے مینارے اور مساجد جن کو میں نے گنا تو وہ چالیس سے کم نہیں تھے، وہ بھی ان میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ شاندار مسجدیں دیکھ کر متمول اور مذہبی دور اور فنون

لطیفہ کا دلدادہ زمانہ یاد آجاتا ہے۔ چند عمارات جن کے چاروں طرف خوبصورت باغات ہیں اور کھجور کے درختوں کی چھتریاں ان پر سایہ فگن ہیں، ماضی کی رعنائیوں کے تصور کو مزید تقویت دے رہی ہیں۔" (25)

نصف صدی کے دوران رنجیت سنگھ کی طرف سے سکھ حکومت کے قیام کے وقت ہندوستان کے چند شہروں کو وقتاً فوقتاً ہونے والے حملوں، لٹیروں کے ٹولوں، لوٹ مار اور بربادی سے اتنا نقصان نہیں اٹھانا پڑا جتنا لاہور کو اٹھانا پڑا۔ اس کی ظاہری صورتحال کے پیش نظر ہندوستانی سلطنت کی شمال مغربی سرحد ہونے کے باعث قدرتی طور پر یہ پہلا شہر تھا جو ہر نئے آنے والے حملہ آور کا تختہ مشق بنا، جس نے یہاں اپنی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔ بستی کے بعد بستی اجڑتی رہی اور اتنا بڑا شہر کم ہو کر چار دیواری کے اندر مقید ہو گیا۔ لوگ حفاظت کی خاطر اندرون شہر چلے گئے۔ تاجر اور بیوپاری جموں و امرتسر اور دیگر مقامات کی طرف چلے گئے جبکہ اہل حرفہ نے ہندوستان جانے کے لیے کوئی نہ کوئی راہ تلاش کر لی۔ مسٹر تھارنٹن لکھتے ہیں:۔

آخر کار شہر کے اس حصہ کے ساکنین اکبر کی تعمیر کردہ فصیل کے اندر کے علاقہ میں مقید ہو کر رہ گئے۔ باہر کا علاقہ تباہ و برباد ہو گیا۔

لاہور کی قدیم عمارتوں کے آثار

ہندوؤں کا دور :۔ لاہور میں ہندوؤں کے زمانے کی عمارتوں کے آثار موجود نہیں ہیں۔ اس کی وجہ بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس جگہ یا اس کے مضافات میں عمارتی پتھر دستیاب نہیں تھا۔ لاہور پر ہونے والے بیشمار تباہ کن حملوں کا جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہو سکتا ہے غارت گروں کے بے رحم ہاتھوں سے بھی انہیں نقصان پہنچا ہو لیکن لاہور کے بارے میں قیاس آرائی کی جاتی ہے کہ ملتان کے مقابلے میں جہاں کئی صدیوں تک سورج دیوتا کی پوجا کی جاتی رہی ہے، تاریخ میں اس کو ہندو دیوتاؤں کے تہوار منانے کی جگہ کے طور پر نہیں جانا جاتا یا ہندو دیو مالا کے مطابق برہما کے پیروکار ہی جس کو مقدس مانتے ہوں۔ اسی وجہ سے دوسرے شہروں مثلاً بنارس اور متھرا کے علاوہ بہت سے دیگر علاقوں میں زیادہ یا کم اہمیت اور خوبصورتی کی مذہبی عبادت گاہیں تعمیر کی گئیں اور نہ یہ کبھی کسی دور میں ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے زائرین کے لیے دلچسپی کا مقام ہی رہا ہے لیکن یہ ایسے لوگوں کی کثیر تعداد کا مسکن ضرور رہا ہے جو اپنی روح کی تسکین کے لیے جوالا مکھی کے پراسرار شعلوں، تھانیسر کی خانقاہ یا امرناتھ کی مقدس پہاڑیوں کو دیکھنے چلے آئے ہیں اور گنگا کے پانی میں اپنے مردوں کو بہاتے رہے ہیں۔ مزید برآں یونانی اور آریاؤں کی فتح کے بعد سندھ جو کئی صدیوں تک شمالی بدھ مت کا گہوارہ رہا ہے، اس کے مغربی علاقوں میں، ملک کے عمارتی اور مقبروں کی تعمیر کے فن میں کمی واقع ہو گئی اور اس دریا کے مشرق میں واقع ریاستوں نے اس علاقہ میں کوئی خاص اثر و رسوخ قائم نہ کیا اور ابھر کر سامنے نہ آسکیں۔ برہمن جنہوں نے نرم خو اور مندروں کی تعمیر کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنے والے تورانی ہندوؤں کو محکوم بنا لیا تھا، وہ مندروں کی تعمیر کرنے والی نسل کے طور پر جانے نہیں جاتے۔ ان حقائق سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ لاہور میں ہندوؤں کی عمارتوں کے آثار کی غیر موجودگی کی وجہ کیا ہے؟

لاہور کے مغرب میں تین میل کے فاصلہ پر موضع اچھرہ میں بھیرن کا تھان اور چاند رات قلعہ میں لوہ کا مندر اور تحصیل کے قریب دھرم شالہ جس میں بازار کی سطح کے برابر سیڑھی کے زینوں کے ذریعے پہنچا جا سکتا ہے، صرف یہی اہم عمارتیں ہندوؤں کے دور کی ہیں جن کے آثار باقی بچے ہیں۔ ان میں تعمیراتی نقطہ نظر سے کوئی قابل ذکر چیز نظر نہیں آئی۔ روایت کے مطابق اچھرہ کے ساتھ قدیم لاہور کا علاقہ متصل تھا۔ یہ گاؤں، اچھرہ لاہور کہلاتا ہے۔ یہ نام لاہور کے پرانے کاغذات اور ہنڈیوں پر بھی ملتا ہے۔

پٹھانوں کا دور :- یہ زمانہ 1030ء سے 1526ء تک محیط ہے۔ محرابوں کی قطاریں، دیواروں کی موٹائی اور ڈھلوان کا استعمال ان کے فن تعمیر کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اس دور کے قابل ذکر آثاروں میں صرف لاہور میں واقع نیویں مسجد اور شیرانوالی مسجد ہے۔ دونوں انتہائی ٹھوس ہیں اور ان کی عظیم الشان دیواریں بھی ڈھلوانی ہیں۔ پٹھانوں کے دور کی عمارات کے آثار کی غیر موجودگی سے اس نتیجہ پر پہنچا جاسکتا ہے کہ لاہور کیونکہ سیاسی لحاظ سے بڑا اہم شہر تھا، لہذا اس دور میں انہیں تعمیری کام کرنے کا موقع میسر نہیں آسکا ہوگا۔ مسٹر تھارنٹن نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے کہ در حقیقت لاہور تعمیری نقطہ نظر سے واقعتاً مغلوں کا شہر تھا۔ جب تک مغل اس ملک کے مالک نہیں بن گئے تب تک یہاں فن تعمیر کے کمالات نظر نہیں آئے۔ ان کے فطرت کی رعنائیوں کے متعلق گہرے مشاہدے، خیالات کی صفائی اور جوش و خروش اور ان کی چستی اور شگفتگی گو مزاج کی وجہ سے اس ملک میں فن تعمیر اور فن باغبانی میں زبردست تحریک پیدا ہوئی اور انہیں فروغ حاصل ہوا۔

بابر کا اس ملک کے بارے میں اظہار خیال :- پر مسرت اور دلکش ملک (وادی فرغانہ) میں پیدا ہونے اور پلنے بڑھنے کے باعث جہاں قدرتی مناظر، پہاڑیاں، ندی نالے، لہلہاتے پودے، سرسبز و شاداب چراگاہیں کثرت سے موجود تھیں اور جن کی خوبصورتی کے بارے میں اس نے اپنے الفاظ میں منظر کشی کی ہے۔ "کابل کے قلعہ میں شراب پینا اور اس کے جام کو بغیر رکے سارے کا سارا بھیجنا، اس میں بیک وقت پہاڑ، ندی، شہر اور صحرا کا ذکر ملتا ہے۔ بابر نے پنجاب کے بے آب و گیاہ اور بنجر میدانوں کو بڑی نفرت اور مایوسی سے دیکھا۔ اپنی فقید المثال تزک (سرگزشت) میں ہندوستانی شہروں کی بدصورتی اور عمومی طور پر اس ملک کے ناپسندیدہ کردار کے بارے میں بڑے پرزور انداز میں شکوہ کرتا ہے۔ چغتائی شہزادہ لکھتا ہے:-

> ہندوستان کا ملک اور شہر نہایت بدہیئت ہیں۔ اس کے شہر اور زمینیں یکساں معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے باغات کی دیواریں نہیں ہیں۔ اس کا زیادہ تر حصہ چٹیل میدانوں پر مشتمل ہے۔ ہندوستان میں اگر دریاؤں کو علیحدہ کر دیا جائے تو تازہ پانی نہیں ملے گا۔

بادشاہ، لوگوں کے بارے میں مزید بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

> "ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں دلچسپی کے مقامات بہت کم ہیں۔ یہاں کے لوگ خوبصورت نہیں ہیں۔ ان میں دوستانہ ماحول کی آزادانہ گفتگو یا باہمی روابط

کی شناسائی کے سحر کا تصور تک نہیں۔ ان میں نہ تو ذہانت اور نہ ادراک ہے۔ نہ تو شائستگی، نرم خوئی ہے اور نہ شفقت یا دوستی کے جذبات ہیں۔ نہ تو مصنوعات کے متعلق منصوبہ بندی کرنے کے لیے کوئی نئی اختراع یا میکانکی ایجاد ہے اور نہ تعمیری منصوبہ بندی کا کوئی علم یا مہارت ہی ہے۔ ان کے پاس نہ تو اچھے گھوڑے ہیں اور نہ عمدہ گوشت۔ نہ انگور ہیں اور نہ خربوزے، نہ اچھے پھل ہیں اور نہ برفیلا یا ٹھنڈا پانی۔ نہ تو اچھی غذا ہے اور نہ ان کے بازاروں میں روٹی۔ نہ حمام یا مدرسے ہیں اور نہ شمع اور نہ مشعل ہے۔ حتیٰ کہ شمعدان تک نہیں۔" (26)

بابر نے ہندوستان اور ہندوستان کے لوگوں کے بارے میں جو کچھ بھی کہا ہے اس میں زیادہ سچائی نہیں ملتی کیونکہ اس نے محض سطحی سا مشاہدہ کیا تھا۔ اس لیے وہی کچھ دیکھا جو کچھ اسے دکھائی دیا (27)۔

مغلیہ دور:۔ تب ہمیں مغلوں کے دور میں پر شکوہ اور پر جلال یادگار عمارتیں ملتی ہیں جو نہ صرف لاہور کی شان و شوکت اور حسن ہیں بلکہ آج کل مغلوں کے پسندیدہ دار الخلافوں دہلی اور آگرہ کے لیے بھی سرمایہ افتخار ہیں۔ مغلوں کے ابتدائی دور کے فن تعمیر کی نمایاں خصوصیات میں چوکور یا مختلف رنگین پتھروں یا ملائم اور چمکدار ٹائلوں پر پچی کاری کے نقش و نگار بھی شامل ہیں۔ اس کا بہترین نمونہ شاہدرہ لاہور میں جہانگیر کے مقبرہ میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے (28)۔

مغلوں کے بعد کے دور (یا جو بھی اصطلاح سمجھ لیں یعنی شاہ جہاں اور اس کے جانشینوں کے دور) کے نمایاں نقوش میں بیرونی اور اندرونی زیبائش کے لیے ملائم اور چمکدار ٹائلوں کا بے دریغ استعمال نظر آتا ہے۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ ملائم ٹائلوں میں مختلف رنگوں کی سجاوٹ کا فن ہندوستان میں مکمل طور پر ختم ہو چکا ہے۔ رنگین ٹائلیں لاہور اور ملتان میں تیار کی جاتی ہیں لیکن ان کا رنگ مدہم اور نمونہ ناقص ہوتا ہے۔ ٹائلوں پر چمکدار پلستر اور شگفتہ اور واضح رنگ چڑھانے کے طریقہ سے لوگ بالکل ناآشنا ہو چکے ہیں۔ اس دور میں زیبائش کے لیے استرکاری، کندہ کاری اور پتھر میں گلکاری پر رنگ کے استعمال کا عمل کچھ زیادہ نظر آتا ہے۔

تمام ادوار میں مغلوں کے فن تعمیر کی اہم خصوصیات میں باہمی محرابیں، ایرانی طرز کے گنبد، طویل مینار اور مضبوط قوسی چھتیں زیادہ نمایاں ہیں۔ زیادہ تر معاملات میں مینار، بیرونی محرابوں اور بڑے گنبدوں کے اوپر ایستادہ دکھائی دیتے ہیں۔ خود گنبد بھی ساری عمارت پر سایہ فگن ہوتے اور اسے ایک جاہ و جلال اور شان و شوکت بخشتے ہیں اور اس بات سے ماہر تعمیرات کی ذہانت

کا پتہ چلتا ہے جبکہ اندرونی طور پر مفصل اور پر پیچ خاشیہ اور تصویر کشی ایک عمدہ اور نہایت خوشگوار منظر پیش کرتی ہے۔

اس وقت لاہور میں موجود مغلیہ دور کے آثار کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اپنے فن تعمیر میں شان و شوکت اور رنگا رنگی کے لحاظ سے دہلی کے ہمسر نہیں ہو سکتے لیکن جہانگیر کا مقبرہ، بادشاہی مسجد، وزیر خاں کی مسجد، شالامار باغ اور محل میں موجود شیش محل، فن تعمیر کے غیر اہم نمونہ جات نہیں ہیں۔ اگر ہم قلعہ کے سامنے والے حصہ پر غور کریں تو اس میں مینار کاری سے مزین دیواری نقش و نگار اور واضح و دلکش آرائش نظر آتی ہے۔ اس کی دیوار کے ساتھ بہتا دریا، مضافات کے درمیان کھلی جگہ، خوبصورت باغات کے ساتھ پیوستہ دریا کا کنارا، نولکھا سے راوی تک پھیلے مرزا کامران کے باغات اور پر شکوہ محل، شہر کی فصیل کے باہر بافراط پودوں و درختوں کے درمیان واقع چینی کی چمکدار ٹائلوں والی دیواروں سے آراستہ بارہ دریاں اور جاذب نظر دروازے اور خوبصورت مقبرہ جات، 20 لاکھ روپے کی لاگت سے تیار شدہ آصف خاں کا محل، شہر کے وسط میں وزیر خاں کی شاندار مسجد اور ترپولیہ بازار اور مسجد جس کا ذکر جہانگیر نے کیا ہے، ان کو دیکھنے سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ لاہور اپنے خوشحال دنوں میں کیسا تھا۔

اب ہم برطانوی راج (29) سے پہلے کے دور سے متعلق لاہور کی یادگار عمارتوں کے آثار کے بارے میں بیان کرتے ہیں کیونکہ ان کے تاریخ تعلق اور ان کی اپنی خصوصیات کی وجہ سے وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کے بارے میں بیان کیا جائے۔

مقبرہ جہانگیر:- شہر کی شمال مغربی جانب تین میل کے فاصلے پر دریائے راوی (یونانیوں کا ہائیڈ اٹس) کے دوسرے کنارے پر شاہدرہ کے مقام پر پشاور جانے والی جرنیلی سڑک پر اکبر اعظم کے بیٹے اور جانشین، جہانگیر کا مقبرہ واقع ہے۔ یہ لاہور کا بہترین زیور، حسن و خوبصورتی کی بے مثال یادگار اور تاج محل اور قطب مینار کے بعد ہندوستان کی سب سے عالی شان عمارت ہے۔ اس شاندار عمارت میں شمال اور جنوب میں ایک دوسرے کی مخالف سمت میں پتھر اور اینٹوں کے بنے ہوئے عالی شان دروازوں کے ذریعے سے داخل ہوا جاتا ہے۔ ان کے ذریعے پانچ سو فٹ طویل چوکور احاطہ میں پہنچا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ چار سو فٹ کا دالان ہے اور اس کے ساتھ مسافروں اور فقیروں کی رہائش کے لیے بنائے گئے حجروں کی قطاریں ہیں۔ اس احاطہ سے، درمیان میں سے گزرنے والی اینٹوں سے بنی چار روشوں کے ذریعے جن میں بے شمار فوارے نصب کیے گئے تھے، چھ سو گز مربع کے احاطہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں سے سامنے کی طرف باغ کا پورا منظر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن

ب یہ کھنڈر میں تبدیل ہو چکا ہے۔ باغ کے بیچوں بیچ ایک سیدھے اور چوڑے راستے کے ذریعے ہم
سنگ سرخ سے بنے ایک مربع شکل کے چبوترے پر آ جاتے ہیں۔ اس وسیع و عریض چو گوشہ
چبوترے میں سنگ مرمر اور میناکاری سے مزین دروازے کے ذریعے داخل ہوا جاتا ہے۔ پوری
عمارت کے چاروں طرف محراب دار راہداری ہے اور اس کے ساتھ مسافروں کی رہائش کے لیے
کمرے بنائے گئے ہیں۔ راہداری کو بڑی کثرت سے سنگ مرمر کی آرائش اور گلکاری و پچی کاری کے
سادہ قرآنی آیات سے مزین کیا گیا ہے۔ محرابوں پر بڑی مہارت سے گلکاری کی گئی ہے اور یہ ابھی
ت محفوظ حالت میں ہے۔ یہ خاص طور پر ایک نمایاں چیز ہے۔ دیواروں پر رنگین تصویر کشی کی
سجاوٹ اور پچی کاری میں کندہ کاری نہایت اعلیٰ کاری گری کا ثبوت ہے۔ اس چو گوشہ چبوترے کے
ر طرف پچیس زینوں پر مشتمل ڈھکی ہوئی سیڑھیاں ہیں جن کے ذریعے ایک اور شاندار و بارعب
چبوترے پر پہنچا جا سکتا ہے۔ اس کے ہر کونے پر چار منزلہ اونچا مینار ہے۔ جس پر لہریئے دار سنگ مر
مر کی قلموں کے حاشیے اور سنگ عقیق کے نہایت شاندار ٹکڑے نصب ہیں۔ ان پر سفید سنگ مرمر
کی چھتری نما برجیاں بنی ہوئی ہیں۔ یہ مینار 95 فٹ بلند ہیں۔ ہر ایک کے ساتھ، ساٹھ زینوں کی
گشتی سیڑھی ہے۔ چبوترہ 211 فٹ 5 انچ مربع شکل کا نہایت شاندار ہے۔ ان خوبصورت
میناروں کی بلندی سے پوری عمارت اور اس کے چاروں طرف کے علاقہ کا بھرپور نظارہ کیا جا سکتا
ہے۔ چھت کے چاروں طرف لگے کٹہروں کا سنگ مرمر اور میناروں کی غلام گردشوں میں نصب
سنگ مرمر کی کندہ کاری کا نہایت عالی شان کام، جس سے اس عمارت کا سڈول پن ظاہر ہوتا تھا،
جب رنجیت سنگھ نے اتار کر اس کی جگہ اینٹوں کی چنائی کرا دی۔ حال ہی میں برطانوی حکومت نے
ابتدائی منزل میں سنگ مرمر کی کندہ کاری کے کام کی مرمت کرائی ہے۔ مقبرے کے اندرونی حصہ میں
سفید سنگ مرمر کا ایک بلند تعویذ ہے۔ اس میں بادشاہ کا جسد خاکی ہے۔ اس کی اطراف میں تاج
محل آگرہ کے مقبروں کی طرز پر پچی کاری سے آرائش کی گئی ہے۔ دونوں اطراف میں اللہ تعالیٰ کے
99 اسمائے گرامی بڑی خوبصورتی سے کندہ کیے گئے ہیں اور اوپر والے حصہ میں قرآن پاک کی
مندرجہ ذیل آیات کندہ ہیں:۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ھو الغفار الذنوب

قال اللہ تبارک و تعالیٰ قل یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسہم لا تقنطو من رحمۃ اللہ
ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا انہ ھو الغفور الرحیم کل نفس ذائقۃ الموت و انما توفون

اجورکم یوم القیامۃ فمن زحزح عن النار و ادخل الجنۃ فقد فاز وما الحیوۃ الدنیا الامتاع الغرور و قل رب الغفور الرحیم و انت خیر الراحمین سبحان ربک رب العزت عما یصفون و سلم علی المرسلین والحمد للہ رب العلمین۔

ترجمہ :۔ شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔

اللہ تعالی نے فرمایا۔ آپ کہہ دیجئے کہ اے میرے بندو جنہوں نے (کفر و شرک کر کے) اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں کہ تم خدا کی رحمت سے نا امید مت ہو بالیقین خدا تعالی تمام (گذشتہ) گناہوں کو معاف فرما دے گا۔ واقعی وہ بڑا بخشنے والا، بڑی رحمت والا ہے۔ ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور تم کو پوری پاداش تمہاری قیامت ہی کے روز ملے گی۔ تو جو شخص دوزخ سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا سو وہی پورا کامیاب ہوا اور دنیوی زندگی تو کچھ بھی نہیں صرف دھوکے کا سودا ہے اور کہہ دیجئے اے میرے رب میرے گناہ بخش دے اور مجھ پر رحمت کر بیشک تو بخشنے والا ہے۔ آپ کا رب جو بڑی عظمت والا ان باتوں سے پاک ہے جو یہ (کافر) بیان کرتے ہیں اور سلام ہو پیغمبروں پر اور تمام خوبیاں اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام عالم کا پروردگار ہے۔

سر کی طرف مندرجہ ذیل عربی عبارت درج ہے :۔

ھو اللہ الذی لا الہ الا ھو عالم الغیب والشہادۃ ھو الرحمن الرحیم۔

ترجمہ :۔ وہی ہے اللہ جو، نہیں کوئی معبود مگر وہ جاننے والا پوشیدہ کا اور حاضر کا، وہی ہے بخشش کرنے والا مہربان۔

پاؤں کی طرف فارسی کی مندرجہ ذیل دو سطریں درج ہیں :۔

" مرقد منور اعلی حضرت غفران پناہ نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ فی سنہ 1037 ہجری۔ "

ترجمہ :۔ قبر مبارک پر انوار اعلی حضرت (بخشش کی پناہ میں) نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ۔ سنہ 1037 ہجری۔

اس عمارت کی اطراف میں چار بڑی محرابیں ہیں۔ ان میں سے تین کو سنگ مرمر کی جالیوں سے بند کر دیا گیا ہے اور ایک کو آمد و رفت کی غرض سے کھلا رکھا گیا ہے۔ جس پائے پر لوح مزار

ایستادہ ہے اس کے پہلوؤں کو خوبصورت پتھروں سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ گلاب اور دوسری قسم کے پھولوں میں اصلیت پیدا کرنے کے لیے مختلف پتھروں کے ہلکے اور گہرے رنگوں کی آمیزش کی گئی ہے۔ اس کمرے کا فرش اور دیواریں شفاف سنگ مرمر کی ہیں۔

1627ء میں کشمیر میں راجوڑی کے مقام پر جب جہانگیر کا آخری وقت آیا تو اس نے اپنی پیاری اور باکمال بیوی نور جہاں کے لاہور میں واقع باغ جسے (دلکشا باغ کے نام سے پکارا جاتا تھا) میں دفن ہونے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس طرح اس نے اسے محبت کا آخری خراج تحسین پیش کیا۔ اس کی خواہش کے مطابق اسے اسی جگہ دفن کیا گیا اور اس کے بیٹے اور جانشین شاہ جہاں نے اس کی یاد کو قائم رکھنے کے لیے یہ شاندار عمارت تعمیر کرائی۔ محمد صالح اپنی تصنیف "شاہجہاں نامہ" میں مقبرہ جہانگیر کی تعمیر کے بارے میں مندرجہ ذیل تفصیلات مہیا کرتا ہے۔

> "بادشاہ کو اس کی اپنی خواہش کے مطابق دریائے راوی کے پار واقع باغات میں سے ایک باغ میں دفن کیا گیا۔ سنی عقیدے کے مطابق اور اپنے نامور جد امجد، بابر (30) کی تقلید کرتے ہوئے اس نے خواہش ظاہر کی کہ اس کے مزار کو اوپر سے کھلا رکھا جائے تاکہ آسمان سے اس کے اوپر بارش اور رحمت خداوندی برس سکے۔ اس کی خواہش کے مطابق اس کے بیٹے اور جانشین بادشاہ شاہجہاں نے اپنے باپ کے مزار کے گرداگرد سنگ سرخ کا ایک سو گز طویل عالی شان مقبرہ تعمیر کرا دیا۔ مزار جو سنگ مرمر کے ایک کشادہ چبوترے پر بنایا گیا ہے اس کو بے شمار قیمتی پتھروں کی نہایت عمدہ و خوبصورت گلکاری سے مزین کیا گیا ہے۔

عمارت کے سادہ پن کے باوجود یہ مقبرہ دس سال کے عرصہ میں تعمیر ہوا اور اس پر دس لاکھ روپے لاگت آئی۔ (31)

باغ کی دیوار جو اس عمارت کے گرد بنی ہوئی تھی اس کے ایک حصہ کو دریائے راوی بہا کر لے گیا۔ اس عمارت کو سکھ بادشاہت کے قیام سے قبل لاہور پر حکمرانی کرنے والے تین سرداروں میں سے ایک لہنہ سنگھ کے بے رحم ہاتھوں سے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ظالمانہ تہذیب سوزی سے سخت نقصان اٹھانا پڑا کیونکہ اس نے امرتسر میں سکھ گوردوارہ کی آرائش کے لیے اس مقبرہ کے انتہائی بیش بہا قیمتی اور زیبائشی پتھروں کو اکھاڑ ڈالا۔ مہاراجہ نے یہ عمارت فرانسیسی افسر ایم ایمائز کو رہائش کے لیے دے دی۔ اس نے اس کی خوب صفائی ستھرائی کرائی اور ہر چیز درست کی لیکن یہ

افسر کچھ عرصہ بعد فوت ہو گیا۔ بعد میں یہ عمارت دوست محمد خاں کے بھائی سلطان محمد خاں کو دے دی گئی۔ اس کے وحشی لشکریوں نے اس یادگار عمارت کے کمروں میں آگ جلاکر اور اس کے قیمتی پتھر چرا کر اسے بہت زیادہ نقصان پہنچایا۔ برطانوی حکام اس عمارت کی مناسب طور پر مرمت کراتے رہے ہیں۔

حکومت برطانیہ نے حال ہی میں (90 - 1889ء) ، اس مشہور زمانہ مقبرہ کی مرمت پر 12,500 روپے کی رقم خرچ کی ہے۔ ابھی اس عمارت کو بہت زیادہ مناسب مرمت کی ضرورت ہے۔ شاہی حکومت نے اس مقصد کے لیے 41,600 روپے کی تخمینی لاگت کی منظوری دی ہے۔

سرائے جہانگیر:۔ وسیع و عریض سرائے جہانگیر اس بادشاہ کے مقبرہ کے مغرب میں واقع ہے۔ اس کے دو عالی شان دروازے ، ایک شمال اور دوسرا جنوب کی طرف ہے۔ دونوں کو بڑی خوبصورتی سے سنگ مرمر اور سنگ سرخ سے آراستہ و پیراستہ کیا گیا ہے۔ سرائے کی مغربی جانب ایک مسجد واقع ہے ۔ اس کے تین گنبدوں کے ساتھ محرابیں ہیں۔ درمیان والی محراب بلند و بالا ہے۔ اس میں سنگ مرمر کے پھولوں کو سنگ سرخ میں بڑی خوبصورتی سے آراستہ کیا گیا ہے۔ مسجد کی مشرقی جانب پانی کا حوض ہے جس کو اب مٹی سے پر کر دیا گیا ہے۔ مشرقی دروازے کا رخ مقبرہ جہانگیر کی طرف ہے۔ بعد میں سرائے کو ، نارتھ ویسٹرن ریلوے کے کارخانہ کے گودام کے طور پر استعمال کیا جانے لگا لیکن اب اس کو خالی کر دیا گیا ہے۔ حقیقت میں یہ ایک لاجواب ، حسین اور وسیع و عریض عمارت ہے اور ابھی تک جاذب نظر ہے۔

مقبرہ آصف جاہ:۔ مقبرہ جہانگیر کی مخالف سمت میں مغرب کی جانب ایک الگ قطعہ زمین پر پختہ اینٹوں کی چار دیواری میں بادشاہ کے وزیر اور نور جہاں کے بھائی مرزا ابو الحسن آصف جاہ کا مزار ہے۔ اس کو اینٹوں سے مثمن (ہشت پہلو) شکل میں تعمیر کیا گیا ہے۔ اس پر اینٹوں ہی کا گنبد ہے۔ آصف جاہ 17 شعبان 1051 ہجری (1634ء) اپنی ہمشیرہ سے چار سال پیشتر فوت ہوا۔ " بادشاہ نامہ " کے مصنف ملا عبد الحمید لاہوری ، جس نے اس عمارت کے آغاز اور تکمیل کو بچشم خود ملاحظہ کیا تھا ، اس کے مطابق اس عمارت کو شاہجہان نے چار سال کے عرصہ میں تین لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر کرایا تھا۔ یہ اپنی رنگین یا منقش ٹائلوں کی وجہ سے بہت مشہور ہے جن کی مدد سے محرابی گزرگاہوں کو آراستہ کیا گیا ہے لیکن اب ان کا حسن ختم ہو چکا ہے۔ عمارت کے اندرونی حصہ میں بمعہ فرش ، سفید سنگ مرمر لگایا گیا تھا اور اس میں نہایت بیش قیمت نایاب پتھر نصب کیے گئے تھے

اور بیرونی دیواروں کو بھی نہایت قیمتی پتھروں سے مزین کیا گیا تھا لیکن ان سب کو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے امرتسر کے گوردوارہ کو سجانے اور حضوری باغ لاہور میں سنگ مرمر کے جھلہ کی تعمیر میں جزوی طور پر استعمال کرنے کی غرض سے اکھاڑ لیا۔ یہ عمارت ایک چبوترے پر قائم ہے جس کی بغلی دیواروں پر سرخ چونے کا پتھر لگایا گیا ہے۔ اس مربع چبوترے کے چاروں کونوں پر ہر ایک کے ساتھ پانی کا حوض ہے لیکن اب وہ کھنڈر میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ یہ حسین و جمیل عمارت پانی کے فواروں اور خوبصورت روشنیوں سے مزین ایک وسیع و عریض باغ کے درمیان واقع تھی۔ اس کے آثار اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ مقبرہ جہانگیر کی سرائے کی مانند اس مقبرے کے بلند و بالا و عالی شان دروازے کا رخ بھی جنوب کی طرف ہے۔ اس کے ساتھ ملحقہ مسجد اب انگریزوں کی نجی رہائش گاہ میں تبدیل ہو گئی ہے۔ اس مزار کا تعویذ شفاف سنگ مرمر کا ہے اور اس پر بادشاہ کے مزار کی طرح عربی آیات کندہ ہیں۔

آصف جاہ یا آصف خاں، بادشاہ کی ملکہ، ارجمند بانو بیگم (جس کو عام طور پر تاج محل اور تاج محل آگرہ کی خاتون کہا جاتا تھا) کا باپ تھا۔ وہ نو ہزاری منصب پر فائز تھا۔ یعنی اس کی کمان میں 9 ہزار پیادہ اور 9 ہزار گھڑ سوار فوج تھی۔ شاہجہاں نے اسے یمین الدولہ، خان خاناں اور سپہ سالار کے خطابات سے نوازا تھا۔ بحیثیت سپہ سالار اس کا مشاہرہ سولہ کروڑ بیس لاکھ دام یا 40,50,000 روپے تھا اور جاگیروں کے علاوہ اس کے پاس پچاس لاکھ روپے کا زر کثیر بھی تھا۔ وہ 10 نومبر 1641ء کو لاہور میں 72 سال کی عمر میں اپنے ترکہ میں بے بہا دولت چھوڑ کر فوت ہوا۔[°] اس کے انتقال کے وقت اس کی جائیداد کی مالیت 2 کروڑ 50 لاکھ روپے تھی، جو بیالیس لاکھ روپے کے طلائی، پچیس لاکھ روپے کے چاندی کے سکوں اور تیس لاکھ روپے کے ظروف وغیرہ اور تیئس لاکھ روپے کی دیگر جائیداد پر مشتمل تھی۔ لاہور میں اس کے 20 لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر کردہ محل دارا شکوہ کو دے دیے گئے۔ یہ وہی گھر تھا جہاں وہ اس عیسائی پادری فادر میزک کے ساتھ آیا تھا، جب گوا کی پرتگالی حکومت نے ہگلی کے قیدیوں کی رہائی کا کام تفویض کیا تھا۔ مسٹر کینے اپنی تصنیف "ہندوستان کی تاریخ" میں اسی پادری کی روم میں 1653ء میں شائع ہونے والی کتاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس نے اس عالی شان محل میں دیکھا کہ اسے جن رنگین اور خوبصورت تصاویر سے آراستہ کیا گیا تھا ان میں ایسی تصاویر بھی تھیں جن میں سینٹ جان اصطباغی کی زندگی کی عکاسی کی گئی تھی۔ وزیر نے میزک کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور وعدہ کیا کہ قیدیوں کو اگر رہا نہیں کیا گیا تو انہیں فوری طور پر رہائی مل جائے گی۔

آصف جاہ نے اپنے پیچھے تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں چھوڑیں، جن کے درمیان 20 لاکھ روپے کی نقد رقم اور قیمتی اشیاء تقسیم کر دی گئیں۔ باقی ماندہ کو شاہی خزانے میں جمع کرا دیا گیا۔ کیونکہ مرحوم کی خواہش تھی کہ اس کی موت کے بعد اس کی ساری جائیداد شاہی خزانے کے سپرد کر دی جائے۔

مقبرہ نور جہاں :۔ مقبرہ جہانگیر کے نزدیک جہانگیر کی شریک حیات نور جہاں کا مقبرہ ہے جس کی زندگی یکساں طور پر رومان اور دلچسپ واقعات سے عبارت ہے۔ وہ 29 شوال 1055 ہجری (1638ء) کو 72 سال کی عمر میں فوت ہوئی اور اسی مقصد کے لیے اپنے تعمیر کردہ مقبرہ میں دفن ہوئی سنگ مرمر کا تعویذ ہوبہو جہانگیر اور آصف جاہ کے مقبروں کی طرح اسی مقام پر اتنی ہی جسامت اور معیار کا ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کے مختلف متبرک اسمائے گرامی کندہ تھے جن سے اعلیٰ کاریگری اور مہارت کا ثبوت فراہم ہوتا تھا لیکن اب یہ سب مٹ گئے ہیں۔ محرابی چھتوں والے کمروں کو سنگ مرمر اور پچی کاری کے گل بوٹوں سے آراستہ کیا گیا تھا لیکن یہ سب کچھ رنجیت سنگھ نے اتار لیا (32)۔ اب یہ سادہ سی ایک منزلہ عمارت ہے جس کی چار بڑی محرابیں اور درمیان میں آٹھ مستطیلی در اور عقب میں محرابوں کی تین قطاریں ہیں۔ ان کا قطر 135 فٹ ہے۔ اندرونی کمرہ میں دو قبریں ایک نور جہاں اور دوسری اس کی دختر لاڈلی بیگم کی ہے۔ اس کے نیچے ایک تہہ خانہ ہے۔ جب رنجیت سنگھ اس عمارت کا سب قیمتی پتھر اتروا چکا تو اس نے سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تہہ خانہ کو کھولنے کا حکم دیا۔ تہہ خانہ کھولنے پر دریافت ہوا کہ نعشوں پر مشتمل دو تابوت آہنی مہدوں میں رکھے ہیں۔ ان مہدوں کو بڑی بے رحمی سے ہٹا لیا گیا اور تابوت زمین میں دفن کر دیئے گئے۔ تہہ خانہ کو جنگلی جانوروں کی آماجگاہ بننے کے لیے کھلا چھوڑ دیا گیا۔

نور جہاں کی سرگزشت :۔ مور کی مشہور زمانہ تصنیف "لالہ رخ" کی ہیروئن نور جہاں کا اصل نام مہرالنساء تھا۔ جہانگیر اسے نور محل کہا کرتا اور وہ نور جہاں کے نام سے جانی جاتی تھی۔ وہ تہران کے ایک نواب خواجہ محمد شریف کے بیٹے غیاث بیگ کی صاحبزادی تھی۔ اپنے باپ کی موت کے بعد ناموافق حالات نے غیاث بیگ کو اپنی بیوی، دو بیٹوں اور ایک بیٹی کے ساتھ ہندوستان کے لیے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا۔ راستے میں اسے لوٹ لیا گیا۔ صرف دو خچر باقی بچے جن پر خاندان کے افراد باری باری سوار ہوتے تھے۔ قندھار پہنچنے پر اس کی بیوی نے مشہور زمانہ نور جہاں کو جنم دیا۔ افلاس کے ہاتھوں مجبور والدین نے اس بات سے مایوس ہو کر کہ وہ اس نوزائیدہ بچی کو پال نہیں سکیں گے، اسے سڑک کے کنارے پر ڈال دیا۔ ایک قافلے کا سربراہ ملک سعود بھی اسی راستے سے

سفر کر رہا تھا۔ اس کی نظر ایک لاوارث بچی پر پڑی ۔ اس نے رحمدلی کے جذبہ اور اس کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر اسے اٹھالیا اور اس کی اپنی ماں ہی کو اس کی دایہ کے طور پر ملازم رکھ لیا۔ اس کی اکبر سے جان پہچان تھی۔ لہذا اسی کے توسط سے غیاث بیگ ،فتح پور سیکری کے دربار میں بادشاہ سے متعارف ہوا۔ نور جہاں کی والدہ کا بادشاہ کی حرم سرا میں آزادانہ طور پر آنا جانا تھا۔ اس دوران اس کی بیٹی بھی اس کے ہمراہ ہوتی تھی۔ جب نور جہاں نے جوانی میں قدم رکھا تو اس کی بے مثال خوبصورتی، حسن و جمال اور دلکشی نے دربار میں سنسنی پیدا کر دی۔ شہزادہ سلیم جو بعد میں جہانگیر بنا اس وقت عنفوان شباب میں تھا۔ اس کے حسن و جمال سے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اگرچہ عشق کی آگ باہمی طور پر لگی ہوئی تھی لیکن وہ پہلے ہی سے ایک بہادر ترکمان نوجوان علی قلی بیگ سے منسوب تھی۔ یہ معاملہ اکبر کے کانوں تک پہنچا تو اس نے نور محل کی شادی اس کے منگیتر کے ساتھ کر کے انہیں بنگال روانہ کر دیا۔ تاہم جہانگیر کو تخت و تاج سنبھالے ابھی بمشکل ایک سال ہی ہوا تھا کہ اس نے اپنے دودھ شریک بھائی قطب الدین کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ اس کی محبوبہ کو حاصل کرنے میں اس کی مدد کرے۔ وہ بحیثیت ایک حاکم کے بنگال روانہ ہوا۔ وہاں اس نے علی قلی بیگ (جو اس وقت شیر افگن کے نام سے مشہور تھا اور جسے اکبر نے بردوار میں بہت بڑی جاگیر عطا کی تھی) سے اس معاملہ پر گفت و شنید کی۔ اس مطالبے پر شیر افگن کو شدید صدمہ پہنچا اور اس نے اس کو اپنے لیے انتہائی ذلت محسوس کیا۔ اس نے خنجر نکال کر حاکم کے دل میں اتار دیا لیکن محافظوں نے اس کے ٹکڑے کر دیے۔ نور جہاں کو آگرہ بھیج دیا گیا جہاں وہ مرزا ہندال کی بیٹی اور اکبر کی بیوہ سلطانہ رقیہ بیگم کے گھر میں چار سال تک گوشہ نشین رہی۔ جشن نوروز کے موقع پر شہنشاہ کی نظر اس پر پڑی تو اس کے دل میں اس کے لیے عشق کی آگ دوبارہ بھڑک اٹھی۔ وہ ملکۂ مشرق اور مختار کل بن گئی۔ بادشاہ اس کے بارے میں لکھتا ہے:۔

" اس کے ساتھ شادی کرنے سے قبل مجھے شادی کے مطلب تک کا پتہ نہیں تھا۔

اس میں دلکش حسن و جمال اور پارسائی کے علاوہ بہترین صلاحیتیں اور دانشمندی ایک ساتھ موجود تھیں۔ بادشاہ اور اس کے درباریوں پر اس کا دیرپا اثر و رسوخ ، حکومت اور دربار (جس کو اس نے اپنے ذوق کے مطابق آراستہ کیا) کے لیے یکساں طور پر سودمند تھا۔ بادشاہ کے نام کے ساتھ اس کا نام بھی بڑے خوبصورت پیرائے میں سکوں پر درج تھا۔

" بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور

بنام نور جہاں بادشاہ بیگم زر

ترجمہ :۔ بادشاہ جہانگیر کے حکم سے ملکہ نور جہاں کے نام کی وجہ سے سونا کی مالیت میں سو گنا اضافہ ہو گیا۔

وہ بادشاہ کی قائم مقام ملکہ تھی اور اسے سوائے خطبہ کے شاہی اقتدار کی تمام مراعات حاصل تھیں۔ اس کے باپ کو جب وزیر اعظم بنا دیا گیا تھا اسے علم اور نقارہ عطا کر کے دربار میں اسے بجانے کی اجازت دے کر ایک خاص رعایت بخشی گئی۔ اس کے سب سے بڑے بھائی مرزا ابو طالب المعروف شائستہ خاں کو بنگال کا حاکم بنا دیا گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ابتدائی تاریخ میں جابجا اس کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے دوسرے بھائی مرزا ابوالحسن آصف جاہ کا عہدہ بڑھا کر نو ہزاری کر دیا گیا۔ اس کی دایہ دلآرام کے پاس صدر النساء کا منصب تھا۔ اس نے فیشن کو ایک نیا انداز دیا۔ کمروں کی آرائش اور ضیافتوں کے انتظام میں اس کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ جہانگیر سے اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس کی وفات کے بعد اور بادشاہ کی ہندو بیوی سے پانچویں بیٹے شہریار جس سے اس نے اپنی (شیر افگن سے) بیٹی لاڈلی بیگم کی شادی کر دی تھی، کی گرفتاری کے بعد اس کا اثر و رسوخ ختم ہو گیا۔ شاہجہاں نے اس کے لیے دو لاکھ روپے سالانہ کا وظیفہ مقرر کیا۔ وہ کبھی کبھار فارسی نظمیں بھی کہتی۔ اس نے اکبر کی دوسری بیوی، سلمیٰ سلطان بیگم اور اورنگ زیب کی باکمال بیٹی زیب النساء کی طرح مخفی کے نام سے شاعری کی۔ وہ یتیم بچیوں کی خاص سرپرست تھی۔ اس نے اپنے پاس سے وظیفہ جات مہیا کر کے ان جیسی کم و بیش پانچ سو لڑکیوں کی شادی کرائی۔ اس نے زنانہ ملبوسات میں بہت سی اختراعات کیں اور زیورات کے نئے نمونے وضع کیے۔

مرزا غیاث بیگ المعروف اعتماد الدولہ 1622ء میں کشمیر جاتے ہوئے کانگڑہ کے مقام پر فوت ہوا اور اس کو آگرہ میں اس کی حکمران بیٹی کے تعمیر کردہ نہایت دلفریب مقبرہ میں دفن کیا گیا۔ مرزا اس وقت بیمار ہوا جب جہانگیر اور نور جہاں کشمیر کی طرف محو سفر تھے۔ شاہی جوڑے کو کانگڑہ کے قلعہ کی سیر سے واپس بلا لیا گیا اور جب وہ پہنچے تو مرزا آخری سانسیں لے رہا تھا۔ نور جہاں نے اپنے بادشاہ شوہر کی طرف اشارہ کر کے اپنے باپ سے دریافت کیا کہ آیا وہ اسے پہچانتا ہے؟ تو اس قریب المرگ شخص نے انوری کے مندرجہ ذیل شعر کا حوالہ دیتے ہوئے جواب دیا:۔

آنکہ نابینائی مادر زاد اگر حاضر شود
در جبین عالم آرا بہ بیند مہتری

ترجمہ :۔ اگر کوئی مادر زاد نابینا یہاں کھڑا ہو تو وہ بادشاہ کو اس کی روشن پیشانی

سے پہچان لے گا۔"

اس کے چند گھنٹوں بعد وہ فوت ہو گیا۔ جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ مرزا اپنی دل شکستگی کے باعث فوت ہوا۔ کیونکہ 2 ماہ اور 20 روز قبل اس کی مہربان بیوی اس سے جدا ہو گئی تھی۔

بارہ دری مرزا کامران :۔ یہ مستحکم و مضبوط پرانی عمارت اپنی عالی شان اور بلند و بالا محرابوں کے ہمراہ دریائے راوی کے دائیں کنارہ پر کھڑی ہے۔ یہ فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے۔ تقریباً نصف صدی سے قدیم دریائے راوی کی پرجوش روانی اس کی دیواروں کو غارت کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کے زینے بہہ گئے ہیں۔ موجودہ نسل کی یادداشت سے کافی عرصہ قبل اس کے ایک حصہ کے بہہ جانے کے سوا اس عظیم الشان دریا کا اتار چڑھاؤ اس عمارت پر اثر انداز نہیں ہو سکا۔ یہ عمارت پختہ اینٹوں سے تعمیر کی گئی ہے اور دریا کے کناروں سے اس کا نظارہ نہایت دلکش اور جاذب نظر دکھائی دیتا ہے۔ اس کا بانی، بادشاہ بابر کا بیٹا اور ہم جو ہمایوں (دونوں ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے بانی ہیں) کا بھائی مرزا کامران تھا۔ یہ عمارت ایک خوبصورت باغ کے وسط میں واقع تھی، جس کا شمار ان باغات میں ہوتا تھا جن کو پہلے پہل ہندوستان میں سرسبز و شاداب اور میوہ جات سے بھرپور ملک سے آنے والے مغلوں نے لگایا تھا۔ اس وقت راوی اپنی موجودہ گزر گاہ سے دو میل کے فاصلے پر شہر کی فصیل کے ساتھ بہتا تھا۔ محمد شاہ کے دور میں دریا نے اپنا رخ تبدیل کیا اور مغل امراء کے لگائے گئے بہت سے باغات کو بہا کر لے گیا۔ مرزا کامران کے باغ کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ محرابوں کے نچلے حصہ میں مختلف رنگوں کی تصاویر اور باغ میں پرانی روشوں کے نشانات اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس کے جنوب میں محرابی پل کا ایک حصہ بھی موجود ہے جس میں سے فواروں کا پانی بہتا تھا۔ اس عمارت کو اب ریسٹ ہاؤس کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

بادشاہی مسجد :۔ قلعہ کے مغرب کی طرف بادشاہی مسجد یا اورنگ زیب کی شاہی مسجد واقع ہے۔ یہ ایک بلند چبوترے پر ہے۔ محرابدار عمارت کی شکل میں تعمیر کی گئی ہے۔ زمین سے اس کی سطح کافی بلند ہے۔ مشرق کی طرف سنگ سرخ اور سنگ مرمر سے تعمیر کردہ ایک خوبصورت اور عالی شان دروازہ ہے جس تک کابل سے منگوائے گئے پتھر "ابری" کی قلموں کے حاشیہ سے مزین چکردار زینوں کے ذریعے پہنچا جاتا ہے۔ زینوں کی تعداد بائیس ہے۔ سب سے اوپر والا 79 فٹ تین انچ لمبا ہے اور سب سے نچلا 20 فٹ طویل ہے۔ یہ مسجد مکہ کی الولید مسجد کی نقل ہے۔ محرابی گزر گاہ کے اوپر سنگ مرمر اور سنگ سرخ کی بہت سی برجیاں ہیں اور اس دروازے کی پیشانی پر باہر

کی جانب کلمہ طیبہ کے نیچے مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

مسجد ابو ظفر محی الدین محمد عالمگیر بادشاہ غازی سنہ 1082 ہجری

باھتمام کمترین خانہ زادان فدائی خان کوکہ اتمام یافت

ترجمہ:۔ مسجد ابو ظفر محی الدین محمد عالمگیر بادشاہ غازی سنہ 1082 ھ میں تعمیر ہوئی اور اس کی نگرانی اس خاندان کے ایک ادنیٰ خادم خان کوکہ نے کی۔

برنیئر(33)، نے ذکر کیا ہے کہ اس عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ اس مسجد کو اورنگ زیب نے 1673ء میں اپنے دودھ شریک بھائی فدائی خاں کوکہ کے ذریعہ تعمیر کروایا تھا۔ وہ مغلیہ حکومت کے اسلحہ خانہ کا انچارج تھا۔ خلاصۃ التواریخ کے مطابق مسجد کی تعمیر پر چھ لاکھ روپے سے زائد رقم خرچ کی گئی اور ملتان کی آمدنی بھی اس کی تعمیر پر صرف ہوئی (34)۔ محرابی دروازے کی پیشانی 66 فٹ اور 10 انچ طویل ہے۔ یہ محرابی گزر گاہ ایک بہت بڑے صحن کی طرف کھلتی ہے جو شمالاً جنوباً 530 فٹ اور شرقاً غرباً 527 فٹ ہے۔ اس کا حاشیہ پختہ اینٹوں کا ہے۔ ہر جائے نماز کو سیاہ پتھر کے تنگ حاشیہ سے آراستہ کیا گیا ہے۔ تاہم فرش ابھی بہت زیادہ مرمت طلب ہے۔ وسط میں نمازیوں کے وضو کے لیے پانی کا حوض ہے۔ اس مربع نما صحن کے مغرب کی طرف بذات خود مسجد ہے۔ اس کی چھت پر سنگ مرمر کے تین عالی شان گنبد ہیں جن پر پیتل کے چمکدار کلس ہیں اور خمدار گنبدوں میں سے اس طرح نکلے ہوئے ہیں کہ ان کی مماثلت غبارے سے بہت ملتی ہے۔ مسجد کے ان گنبدوں کے نیچے ایک بہت بڑا دیوان ہے، جس کے مشرق کی طرف کئی محرابی دروازے ہیں۔ اس کے عقب میں محرابی دروازوں کا ایک دوسرا دیوان بھی ہے۔ درمیان والی محراب جس پر سنگ سرخ میں سفید سنگ مرمر کے نہایت دلفریب گل بوٹے بنائے گئے ہیں۔ ایک بہت بڑے کشادہ اور بلند و بالا دروازے کی شکل میں ہے۔

منبر:۔ انتہائی مغرب کی جانب درمیانے گنبد کے نیچے قبلہ کے رخ ایک محراب ہے۔ اس جگہ منبر ہے، جہاں ہر جمعہ کو خطیب صاحب وعظ کرتے ہیں اور نماز پڑھاتے ہیں۔ اس کے ساتھ تیمور کا کمرہ اعتکاف یا چلہ گاہ ہے۔ اب اس جگہ خلوص دل کے ساتھ عزت مآب ملکہ ہندوستان کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگی جاتی ہیں۔

مینار:۔ صحن کے چاروں کونوں پر سنگ سرخ کے بلند و بالا مینار ہیں جو ہر چیز سے زیادہ قد و قامت رکھنے کی وجہ سے کئی میل سے نظر آجاتے ہیں حالانکہ یہ مینار وضع قطع میں نہایت سادہ اور دیکھنے میں بالکل ہموار نظر آتے ہیں لیکن اپنی جسامت، پختگی اور وسعت میں دلکش ہونے کے باعث دیکھنے

والوں کو اپنی شان و شوکت سے متاثر کیے بغیر نہیں رہتے۔ ہر مینار کی بلندی 143 فٹ 6 انچ ہے اور اس کا بیرونی قطر 67 فٹ اور اندرونی قطر ساڑھے آٹھ فٹ ہے۔ میناروں کی بالائی منزل جن پر گنبدیاں بنی ہوئی تھیں، 1840ء میں آنے والے زلزلہ کے باعث خطرناک حد تک متزلزل ہو گئی تھیں۔ نتیجتاً انہیں مسمار کر دیا گیا۔ ان کی بالائی منزل تک ان کے اندر بنے ہوئے سنگ سرخ کے تنگ زینوں کے ذریعے پہنچ سکتے ہیں۔ اوپر سے سارے شہر کے ارد گرد کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔
شیر سنگھ نے جنوری 1841ء میں ان میناروں پر قلعہ کے محاصرہ کے دوران توڑے دار بندوقوں والے سپاہی مقرر کر دیے۔ جنہوں نے اپنے آتشیں اسلحہ سے احمق کھڑک سنگھ کی بیوہ مہارانی چند کور کے حامی ڈوگرہ فوجیوں میں تباہی پھیلا دی۔ اس گولہ باری کے نتیجہ میں رانی کو شکست ہوئی اور شیر سنگھ کی تاجپوشی ہوئی۔ جب ہیرا سنگھ نے شیر سنگھ اور دھیان سنگھ کے قتل کے بعد سندھیانوالیہ کا محاصرہ کیا تو اس نے کشمیر کی پہاڑی جنگوں میں استعمال ہونے والی زنبوراتوپوں کو میناروں پر چڑھا کر ان کا رخ قلعہ کی طرف کر دیا۔ ہیرا سنگھ کو فتح حاصل ہوئی اور وہ اپنے باپ کی جگہ وزیر بن گیا۔
محرابی کمرے:۔ اس صحن کے شمال اور جنوب میں "فیکس انڈیکہ" قسم کے درخت سایہ فگن ہیں اور ان کے ساتھ محرابی چھتوں کے کمروں کی قطاریں ہیں جو مسجد سے متعلقہ طلبہ کے قیام و طعام کی غرض سے تعمیر کیے گئے تھے۔ اسی طرح کے کمرے مسجد کی مشرقی جانب بھی موجود تھے لیکن برطانوی حکام نے انہیں مسمار کرا دیا۔

موجودہ دور کے مشہور و معروف سیاح (لارڈ کونے مارا) اس عالی شان اور خوبصورت مسجد میں لگے سنگ مرمر اور سنگ سرخ کا تاثر بیان کرتا ہے:۔
سنگ سرخ اور سنگ مرمر سے اور کسی قسم کا تاثر سوائے اس بات کے کہ اس صحن کے ساتھ اگے ہرے بھرے درختوں کے پس منظر میں یہ نہایت سادہ اور متاثر کن نظر آتے ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ نیل کنٹھ کے رنگین پر اور دن کی روشنی میں دکھائی دینے والا چاند بھی اس مسجد کے تاثر میں اضافہ کرتے ہیں۔

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس مسجد کا پتھر دراصل داراشکوہ نے اپنے روحانی پیشوا حضرت میاں میرؒ کی قبر پر مقبرہ تعمیر کرنے کے لیے اکٹھا کیا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ اپنے منصوبہ کو عملی جامہ پہناتا۔ اس کے چالاک بھائی اورنگ زیب نے تخت و تاج سنبھالتے ہی اسے موت کے گھاٹ اتار دیا اور سارے پتھر اور ساز و سامان کو قبضہ میں لے کر اپنے نام سے تعمیر ہونے والی مسجد کی تعمیر میں استعمال کر لیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے مسجد کو اسلحہ خانہ اور فوجی گوداموں کے لیے استعمال کیا

لیکن برطانوی حکومت نے 1856ء میں اس کو مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے تبرکات مقدسہ :۔ مسجد کے اس عالیشان محرابی دروازہ کی بالائی منزل میں شیشے کے بکسوں میں حضور اکرمؐ اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ اور دین اسلام کے سرکردہ بزرگوں کے تبرکات مقدسہ رکھے گئے ہیں۔ یہ ان اشیاء پر مشتمل ہیں:۔

ایک کلاہ اور اس کے گرد لپٹی ہوئی دستار مبارک، ایک سبز جبہ، آپؐ کے استعمال میں رہنے والا سرخ اور سفید دھاریوں والا پلنگ پوش، ایک سفید پائجامہ اور آپؐ کا (نعلین) ایک جوتا، صندلی رنگ کے ایک پتھر پر آپؐ کے پاؤں مبارک کا نشان اور ایک سفید جھنڈا، جس پر کڑھائی سے قرآن پاک کی آیات درج کی گئی ہیں۔

حضرت علیؓ کے تبرکات مقدسہ :۔ یہیں پر حضرت علیؓ کے دست مبارک سے کوفی رسم الخط میں ایک سفید کاغذ پر لکھی ہوئی قرآن پاک کی پہلی سورت موجود ہے۔ ایک کلاہ جس کے گرد سفید دستار لپٹی ہوئی ہے اور ایک پرانے کاغذ پر آپ سے متعلق لکھا ہوا ایک تعویذ ہے۔

حضرت فاطمہؓ کے تبرکات مقدسہ :۔ حضرت محمدؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کے رومال اور قالین جن پر کڑھائی کی ہوئی ہے۔

حضرت امام حسینؓ کے تبرکات مقدسہ :۔ حضرت امام حسینؓ کے دست مبارک سے کوفی رسم الخط میں تحریر کردہ سورۃ یسین اور والصفت۔ آپؓ کی کلاہ اور اس کے گرد لپٹی ہوئی صندلی رنگ کی دستار مبارک اور جھنڈا۔ آپؓ کا ایک خون آلود رومال، جائے نماز۔

حضرت غوث الاعظمؒ کے تبرکات مقدسہ :۔ حضرت غوث الاعظمؒ کی دستار، رضائی، کربلا کی کچھ سرخ مٹی، حضرت خواجہ اویس قرنیؓ کا شکستہ دانت۔ نبی پاکؐ کے روضہ اطہر کا غلاف، حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ اور حضرت غوث الاعظمؒ کے روضوں کے غلاف موجود ہیں۔ مسلمان اپنے بزرگان کے ان تبرکات مقدسہ کی جان و دل سے عقیدت و احترام کرتے ہیں۔ پہلے ان کو شیش محل میں رکھا گیا تھا لیکن بعد میں مسلمانوں کے حوالے کرنے کے بعد اب انہیں اس جگہ رکھ دیا گیا ہے (35)۔

صابر شاہ کا مقبرہ :۔ اینٹوں کے ایک بلند مدور چبوترہ پر بادشاہی مسجد کے عقب میں مغرب کی طرف صابر شاہ کا مقبرہ موجود ہے۔ اگر مسجد کے جنوب مغربی مینار پر چڑھ کر نیچے میدان میں اس طرف نگاہ دوڑائی جائے تو واضح طور پر نظر آئے گا۔ صابر شاہ، احمد شاہ درانی بادشاہ کا خاندانی مذہبی

پیشوا تھا اور اس حکمران نے اسے لاہور کے حاکم شاہنواز خاں کے دربار میں بات چیت کے ذریعے معاملات طے کرنے کے لیے نمائندہ بنا کر بھیجا لیکن فقیر نے شاہنواز کی دربار میں سرعام بے عزتی کر دی۔ مشتعل حاکم نے 1747ء میں فوری طور پر اس کا سر قلم کرا دیا۔ یہ واقعہ احمد شاہ کے ہندوستان پر پہلے حملہ کے وقت پیش آیا(36)۔

حضوری باغ:۔ سرائے اورنگ زیب اور شاہی جامع مسجد کے مشرق میں تاریخی لحاظ سے ایک نہایت اہم عمارت موجود ہے۔ چار دیواری جس میں اب ایک باغ اور ایک بارہ دری موجود ہے۔ اس میں مغلوں کے دور حکومت میں شاہی سواروں کے دستے اور مصاحبین کی ایک بہت بڑی تعداد جمع ہوتی تھی۔ وہ بادشاہ کے لیے ایک جلوس کی شکل اختیار کر لیتے تھے کیونکہ بادشاہ، شاہی مسجد میں نماز ادا کرنے کے لیے جاتا، اس کے آگے آگے گرز بردار غلام اور اس کے پیچھے اس کے امراء نوابین اور چیدہ چیدہ درباری چل رہے ہوتے تھے۔ برنیئر اس شاہی جلوس کے بارے میں نہایت حسین پیرائے میں بیان کرتا ہے:۔

قلعہ سے باہر نکلنے سے پیشتر بادشاہ نے جس راستے سے گزرنا ہوتا تھا اس پر گرمی اور گرد کے باعث پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا تھا۔ بادشاہ کی اقامت گاہ سے قلعہ کے دروازے تک سینکڑوں سپاہیوں کی قطار تشکیل دے دی جاتی تھی اور بادشاہ ایک مشرقی حکمران کی بھرپور شان و شوکت سے اس کے درمیان سے گزرتا تھا۔

برنیئر جو کہ ان زرق برق مناظر کا چشم دید گواہ تھا، اس نے اعتراف کیا کہ واقعی اس میں شان و شوکت اور شاہانہ عظمت موجود تھی۔

گلاب خانہ:۔ جنوبی دروازے سے متصل دو منزلہ عمارت جو اب نارمن سکول کی اقامت گاہ کے طور پر استعمال ہو رہی ہے، اصل میں اس کو اورنگ زیب کے دور حکومت میں بادشاہی مسجد میں تعلیم حاصل کرنے والے علماء کی اقامت گاہ کے طور پر تعمیر کیا گیا تھا۔ بعد کے ادوار میں اسے آبدار خانہ یا بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد کے لیے استعمال میں آنے والے تازہ مشروبات کی جگہ کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں اسے "گلاب خانہ" (گلاب کے عرق کا گھر) کہا جانے لگا۔ یہاں پر گلاب کے عرق اور بید مشک (جن کو مشروبات کے ٹھنڈا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا) کو فقیر نورالدین اور عزیز الدین کی نگرانی میں کشید کیا جاتا تھا اور یہیں پر رنجیت سنگھ کے شاہی طبیب فقیر نورالدین کی ادویات اور جڑی بوٹیوں کا ذخیرہ بھی ہوتا تھا۔ ان کی نگرانی میں قیمتی پتھروں، موتیوں اور دیگر اجزاء سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے استعمال کے لیے

معجون اور دیگر مقوی ادویات تیار کی جاتی تھیں۔

سنگ مرمر کی بارہ دری :۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس قطعہ کو جو قلعہ کو بادشاہی مسجد سے جدا کرتا ہے، وسیع و عریض باغ اور ایک بارہ دری سے آراستہ کر دیا جو آج بھی اس کے دور کے فن تعمیر کا ایک یادگار نمونہ ہے۔ یہ 1818ء میں تعمیر کی گئی۔ یہ عمارت جس کی پیمائش 44 فٹ 6 انچ سے 45 فٹ تک ہے دو منزلہ ہے اور اس کے نیچے تہہ خانہ بھی ہے۔ اس کی چھتیں منوت کار اور آئینہ دار منقش ہیں۔ ان میں چھوٹے چھوٹے محدب آئینے اسی طرز پر نصب کیے گئے ہیں جس طرح اس کے قریب ہی واقع شیش محل اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھ میں نصب کیے گئے ہیں۔ اس عمارت کی تعمیر میں، زیب النساء کے مقبرہ واقع نواں کوٹ، مقبرہ شاہ شرف واقع بیرون ٹیکسالی دروازہ اور مسلمانوں کے دیگر مقبرہ جات سے انتہائی بے دردی سے اکھاڑے گئے پتھروں کو استعمال کیا گیا۔ اس غارت گری کے باوجود دوسری اور تیسری منزل کے فرش چونے گارے سے بنانے پڑے۔ اپنی ملی جلی بناوٹ کی بناء پر یہ عمارت فن تعمیر کے لحاظ سے ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔ یہ انتہائی عالی شان، حسین و جمیل اور جاذب نظر ہے۔ یہاں پر مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنے وزراء اور سرداروں کے ہمراہ دربار لگایا کرتا اور کاروبار سلطنت چلایا کرتا تھا۔ یہیں پر شیر سنگھ نے بھی اپنا دربار منعقد کیا اور اپنے جاہ و جلال کے مظاہرہ سے حظ اٹھایا (37)۔

اکبری دروازہ :۔ سنگ مرمر کی بارہ دری کی مشرقی جانب ایک بلند و بالا دندانے دار دیوار کے وسط میں ایک بھاری بھر کم دروازہ ہے جسے "اکبری دروازہ" کہا جاتا ہے۔ اس عظیم الشان دروازہ کے اوپر اکبر نے دونوں جانب شاندار مینار تعمیر کروائے تھے۔ یہ قلعہ میں جانے کے لیے ایک قدیم گزرگاہ تھی۔ جنوری 1841ء میں مہاراجہ شیر سنگھ نے اس کے سامنے مورچہ سنبھالا اور دیواروں کے سامنے 12 توپیں نصب کیں، جن پر ابھی تک محاصرین کی گولیوں اور گولوں کے نشانات موجود ہیں۔

روشنائی دروازہ :۔ حضوری باغ کے شمال کی طرف روشنائی دروازہ موجود ہے جس کا شمار شہر کے دروازوں میں ہوتا ہے۔ اس گزرگاہ کے نزدیک، کھڑک سنگھ کا بیٹا شہزادہ نونہال سنگھ اور گلاب سنگھ کا بڑا بھائی ادھم سنگھ جب کھڑک سنگھ کی آخری رسومات سے فارغ ہو کر واپس آ رہے تھے تو جس جگہ شہزادہ کی پنجاب کے مہاراجہ کے طور پر تاجپوشی کی جانا تھی، وہاں ایک محرابی گزرگاہ کے ایک حصہ کے گر جانے سے وہ ہلاک ہو گئے۔

قلعہ لاہور:۔ قلعہ لاہور شہر کے شمال مغربی حصہ پر محیط ہے۔ اس کے گرد ایک نہایت بلند و بالا فصیل ہے جس میں بندوقچیوں کے لیے سوراخ بھی بنائے گئے ہیں۔ اکبر نے اس کو پرانے قلعہ کی جگہ پر تعمیر کرایا۔ قلعہ میں مغرب کی طرف سے ایک بیرونی دروازے کے ذریعے داخل ہوا جاتا ہے۔ اس پر انگریز سپاہیوں کا پہرہ رہتا ہے۔ بائیں طرف تقریباً پچاس گز کے فاصلہ پر بیرونی فصیل اور محل کی پیشانی کے درمیان نہایت دلچسپ اور نادر آرائشی روغنی ٹائلوں سے سجاوٹ کی گئی ہے۔ محل کی بیرونی دیوار پر انسانوں اور جانوروں کے جلوسوں اور لڑائیوں کی عکاسی کرنے والی تصاویر بنائی گئی ہیں۔ سرٹامس ہربرٹ، بی ٹی، جنہوں نے 1626ء میں، جہانگیر کے انتقال کے ایک سال بعد لاہور کی سیاحت کی۔ وہ اپنے سفرنامہ "افریقہ اور ایشیا کے سفر" میں محل کے بارے میں ذکر کرتے ہیں۔ اس دلچسپ بیان سے 250 سال پہلے عظیم مغلوں کے لاہور میں واقع دربار کی حالت کا اندازہ ہو جاتا ہے اور اس دور میں قلعہ کی صورتحال کا بھی پتہ چلتا ہے۔

مسٹر ٹامس ہربرٹ، بی ٹی کا بیان:۔ قلعہ کے اندر ایک محل واقع ہے۔ اس میں دو دروازوں کے ذریعہ داخل ہوا جاتا ہے۔ وہاں سے دو شاہی ایوانوں کی طرف راستہ جاتا ہے۔ ان کے آخر پر دو راستے اور نکلتے ہیں۔ ایک بادشاہ کے دربار اور جھروکہ کی طرف جاتا ہے۔ جہاں رسم کے مطابق وہ ہر روز عوام کو درشن کراتا تھا۔ دوسرا دیوان خاص کی طرف جاتا ہے، جہاں بادشاہ ہر شب کو آٹھ سے گیارہ بجے تک امراء سے تبادلہ خیال کرتا تھا۔ دیوار پر مختلف تصویری کہانیوں اور کھیل تماشوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ ان میں جہانگیر (شاہ سلیم) کو بڑے جاہ و جلال سے ایک قالین پر اکڑوں بیٹھے دکھایا گیا ہے۔ اس کے دائیں ہاتھ، اس کا بیٹا پرویز، خرم اور تیمور اور اس کے بھائی جہاں شاہ اور شاہ مراد کے ساتھ کھڑا ہے (جس کے بارے میں خان اعظم کا بڑا بھائی مرزا شریف بیان کرتا ہے کہ اس کے پاس اتنی دولت اور حیثیت تھی کہ وہ ہر دن اور ہر رات اپنی ایک سو سے زائد داشتاؤں کو نئے ملبوسات زیب تن کراتا اور ان کی پہلی پوشاک کو پھاڑ کر زمین میں دفن کر دیتا تھا)۔ اس کے علاوہ ان میں مرزا رستم (جو ایک دور میں قندھار کا بادشاہ تھا) خان خاناں، راجہ مان سنگھ، خان اعظم آصف خاں اور راجہ جگن ناتھ (ہندوستان کا کروسس) بھی شامل ہیں۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب اس کا انتقال ہوا تو اس نے جہانگیر کے لیے ساٹھ من خالص سونا (ہر من کا وزن پانچ اور 20 پاؤنڈ تھا اور ہماری موجودہ رقم کے مطابق تقریباً ساٹھ ہزار پاؤنڈ سٹرلنگ کے برابر تھا) اور قیمتی ساز و سامان سے لدے تین سو ہاتھیوں کو اپنے ترکہ میں چھوڑا۔ اس کی موت پر اس کی بیویاں، بہنیں، بھتیجا اور سات دیگر احباب، اس کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے زندہ اس کی

چتا میں جل کر مرگئے۔ بائیں جانب راجہ بون سنگھ (مکھی کے نشان والا)، راجہ رام داس شمشیر بردار مقرب خان مسخرا، راجہ روددو راؤ، اس کے علاوہ راجہ رن سنگھ اور بیر سنگھ وغیرہ کھڑے ہیں۔ ایک دوسرے مقام پر ایک مغل کو شاہی لباس میں قالین پر بیٹھے دکھایا گیا ہے۔ اس کے دروازوں پر صلیب اور حضرت مریمؑ کی تصاویر بنی ہوئی ہیں۔ ایک دوسری جگہ پر بادشاہ کے آباؤ اجداد میں سے بابر کو اپنے تیس امراء کے ساتھ، قلندروں وغیرہ کی زیارت کرتے دکھایا گیا ہے۔

سینٹ ٹامس ہربرٹ کے بیان سے دو چیزوں کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ اول یہ کہ جہانگیر کے دور میں قلعہ کے ارد گرد شہری آبادی موجود تھی۔ دوسرا یہ کہ قلعہ کی بیرونی دیوار پر جن روغنی ٹائلوں سے آرائش کی گئی ہے اس کو جہانگیر نے بنوایا تھا۔ بادشاہ کو لاہور سے بہت لگاؤ تھا۔ اس نے اپنے وزیر اور برادر نسبتی آصف خاں کی زیر نگرانی محل کو خوبصورت بنایا اور اس میں توسیع بھی کی۔ صلیب اور حضرت مریمؑ کی تصاویر سے جہانگیر کی عیسائیت کے بارے میں عقیدت کا پتہ چلتا ہے۔

سر ٹامس رو جنہوں نے 1615ء میں مغلیہ دور کے دربار کی سیاحت کی۔ وہ اس دور کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "یورپین کو اس دور میں بڑی نمایاں حیثیت حاصل تھی اور ان کے مذہب کو بھی خصوصی اہمیت دی جاتی تھی۔ جہانگیر کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے اپنی تسبیح میں حضرت عیسیٰ اور حضرت مریمؑ کی مورتیاں بھی شامل کر لی تھیں۔

سیاح کوریاٹ جس نے اسی سال ہندوستان کی سیاحت کی تھی۔ بادشاہ کے بارے میں بیان کرتا ہے کہ وہ ہمارے نجات دہندہ کے بارے میں بڑے ادب و احترام سے بات کرتا تھا اور انہیں عظیم پیغمبر عیسیٰ کہہ کر بلاتا تھا۔ اس وقت لاہور میں پرتگالی مشنریوں کا قائم کردہ عیسائیوں کا گرجا گھر بھی موجود تھا۔ ٹامس کوریاٹ بادشاہ کی سورج کی پوجا کے بارے میں لکھتا ہے: وہ ہر روز بلا ناغہ دن میں تین مرتبہ طلوع آفتاب کے وقت جس کے سامنے دونوں ہاتھ اٹھا کر پوجا کرتا۔ دوپہر اور شام کے پانچ بجے اپنے درباریوں کو درشن کراتا تھا۔ یہ بیان واضح طور پر چار مرتبہ جہانگیر کے محل کے سامنے بُرجوں کے اوپر محرابی دروازوں میں طلوع آفتاب کی دلالت کرتا ہے۔

جانوروں کی لڑائی کے بارے میں بادشاہ کی دلچسپی کے متعلق سر ٹامس ہربرٹ اپنی ڈائری میں لکھتا ہے۔ دوپہر کو وہ دوبارہ ہاتھیوں اور دوسرے جنگلی جانوروں کی لڑائی کا نظارہ کرنے کے لیے جھروکہ کی کھڑکی میں رونق افروز ہوا۔ اسی وقت سے کھیل تماشوں میں مصروف آدمیوں، گھوڑوں اور ہاتھیوں کی تصاویر دیواروں پر بنائی گئی ہیں۔ سینٹ تھامس ہربرٹ نے ذکر کیا ہے کہ

بہت سی تصاویر مدھم پڑ گئی ہیں اور کچھ پلستر کی وجہ سے مٹ گئی ہیں لیکن اب بھی ان میں منطقۃ البروج اور فرشتوں کی علامتی تصاویر اور جیومیٹری کے خوبصورت نمونہ جات کے علاوہ رقص کرتی ہوئی لڑکیوں ، شعبدہ بازوں ، لدے ہوئے اونٹوں ، گھڑ سواروں ، دو کھروں والی بلاؤں اور پرندوں کی تصاویر دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان تصاویر میں مغلوں کو لمبے کوٹ پہنے ہوئے ، ہاتھ میں تلوار لیے ہوئے ، گھڑ سواروں کو نیزہ پھینکتے ہوئے ، گھڑ سواروں اور پیادہ سپاہیوں کی فوج کے ہمراہ ہاتھیوں پر سوار امراء کے جلوس ، اونٹوں کی لڑائی ، ہاتھیوں کی جنگ ، شیروں کو ہرن کا شکار کرتے ہوئے ، مغل کو جھنڈا اٹھائے ہوئے اور چورس لہراتے ہوئے اور بگل برداروں اور گرز برداروں کو دکھایا گیا ہے۔ محرابوں پر پریوں کو پروں سمیت دکھایا گیا ہے۔ ہندووانہ طرز کی اس جیسی تصاویر قلعہ کی بہت سی عمارتوں پر کثرت کے ساتھ بنائی گئی ہیں۔ اسی نوعیت کی تصاویر جہانگیر کے دیوان کے چھجہ کو سہارا دینے والے سنگ سرخ کے ستونوں پر بھی موجود ہیں۔ جن میں شامل ہاتھیوں اور دیگر روایتی جانوروں کی شکلوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے ان اصولوں پر سختی سے عمل درآمد نہیں کیا گیا ، جن میں زندہ جانوروں کی تصاویر بنانے کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔ اکبر. جہانگیر اور شاہجہان کی طرف سے سورج کی پرستش اور شاہجہان کی طرف سے دہلی میں پتھر میں ، پتھہ اور جے مل کے نمائندوں کے طور پر تعمیر کی جانے والی تصویر جس میں دو راجپوتوں کو دو ہاتھیوں پر بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ (جنہوں نے چتوڑ کو اکبر سے بچانے کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر دیا تھا) اور آخر میں شاہجہاں کے تخت طاؤس سے ہندووانہ رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ شاہجہان نے انسانی خون پر سرکاری عمارات کی بنیاد رکھنے کی ہندووانہ رسم کو دوبارہ جاری کر دیا۔ نئی دہلی میں سینکڑوں مجرموں کو ذبح کیا گیا اور ان کا خون شہر کی بنیادوں پر بہایا گیا۔ شالا مار باغ لاہور میں ایک سیڑھی کی نشاندہی کی گئی ہے ، جہاں بنیاد رکھنے کے موقع پر بادشاہ کے حکم سے ایک لڑکے کو قربان کر دیا گیا۔

قلعہ اور محل مشرق سے مغرب تک 500 فٹ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کو چار بادشاہوں نے بنوایا تھا۔ انتہائی مشرق کی جانب اکبر کے محل کی بنیادیں ہیں۔ اس سے آگے جہانگیر کا دیوان ہے جس کے دائیں بائیں میناروں کی طرح محرابی ستون ہیں اور آخر میں دو مسدسی میناروں کے درمیان دیوار کا پردہ ہے ، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے شاہ جہاں نے تعمیر کرایا تھا۔ اورنگ زیب اور سکھوں نے بعد میں اس میں مزید اضافہ کیا۔

ہاتھی پاؤں دروازہ :۔ پہلے دروازہ کے بعد جہاں انگریز سپاہیوں کا پہرہ ہے۔ اسی سمت میں ذرا

آگے بڑھیں تو ایک اور دروازہ آجاتا ہے، جسے "ہاتھی پاؤں دروازہ" کہا جاتا ہے کیونکہ جب حرم سرا کی بیگمات سیر وغیرہ کے لیے باہر نکلتیں تو اس راستہ سے ہاتھیوں پر سوار ہو کر جایا کرتی تھیں۔ یہ ایک بہت بڑی اور نہایت بلند و بالا نوکیلی محراب پر مشتمل ہے۔ اس کو منقش روغنی یا چینی کی ٹائلوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ اس دروازہ کے اوپر فارسی کی مندرجہ ذیل عبارت درج ہے :-

شاہ جم جاہ سلیمان قدر کیوان بارگاہ
کز سپہر و مہر برتر بردہ رایات جلال
ثانی صاحب قران شاہ جہاں کز عدل وجود
نیستش نوشیروان مانند دافریدوں ہمال
شاہ برجے حکم کر داخلت کز فرط علو
ہست بیرون ہمچو عرش اعظم از وہم و خیال
در صفا و رفعت و لطف و ہوا برجے چنین
از حصار چرخ ننمودست و ننماید جمال
بندہ یکدل مرید معتقد عبدالکریم
بعد اتمام عمارت یافت این تاریخ سال
دائما چون دولت این بادشاہ جم سپاہ
این ہمایون برج عالی باد از آفت بے زوال
سنہ 1041 ہجری

ترجمہ :- جمشید کی عظمت، سلیمان کی شان و شوکت اور کیوان جیسا محل رکھنے والا بادشاہ جس کا جھنڈا سورج اور آسمان سے بھی بلند [illegible] شاہجہاں، جس کے عدل اور فیاضی میں کوئی اس کا ثانی نہیں، نوشیرواں اس کے برابر نہیں اور نہ ہی فریدوں اس کی ہمسری کر سکتا ہے۔ اس نے ایک ایسا شاہ برج تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ جس کا رخ آسمان کی طرف ہو، جو اپنی جسامت، خوبصورتی، بلندی اور شان و شوکت کے لحاظ سے، اس سے پیشتر کسی کے تصور میں بھی نہ آیا ہو۔ اس جیسا مینار زیر آسمان نہ کبھی تھا اور نہ کبھی ہو گا۔ مرید معتقد، بندہ عبدالکریم (المعروف) یکدل نے اس عمارت کی تکمیل کے بعد اس کی بنیاد کی مندرجہ ذیل تاریخ دریافت کی۔

جمشید کی طرح ایک عظیم الشان فوج کے حامل اس بادشاہ کی شان و شوکت ہمیشہ قائم و دائم اور اس مبارک اور عالی شان مینار کو کبھی زوال نہ آئے ۔ 1041 ہجری یا جانشینی کا چوتھا سال۔

شاہ برج :۔ دروازے پر درج عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ برج شاہجہان کے دور حکومت کے چوتھے سال کے دوران تعمیر کیا گیا۔ ملا عبدالحمید لاہوری اپنی کتاب " بادشاہ نامہ " میں اس بات سے آگاہ کرتے ہیں کہ اس کو جھروکہ کے سامنے بیک وقت دہلی کے شاہی برج کے ساتھ تعمیر کیا گیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں: ۔

وحکم مقدس شرف صد و ریافت کہ در دارالسلطنت لاہور نیز پیش جھروکہ دولت خانہ خاص و عام بہ ہمین آئین ایوانی عالی نیا کنند و عمارت شاہ برج با تمام رسانند این برج رفیع و بنائے منیع راکہ سر رفعتش بمناط پروین کشیدہ است و اساسش بہ پشت گاو زمین رسیدہ

با پشت گاو و ماہی دراصل ہم قرین
با برج گاو و ماہی در فرع ہمقران
بتوان از و مشاہدہ کردن بچشم سر
کیفیت کواکب و اشکال آسمان

گوئی روضہ الیست از بہشت برین یا آسمانی با چندین تماثیل و صور بر زمین ۔

ترجمہ :۔ اور یہ شاہی حکم ملا کہ (دہلی کی طرز کا) کا ایک بہت بڑا اور عظیم الشان محل دیوان خاص اور دیوان عام کے سامنے دارالسلطنت لاہور میں تعمیر کیا جائے اور شاہ برج کی عمارت کو مکمل کیا جائے۔ یہ مینار اور ناقابل رسائی عمارت اتنی عالی شان ہے کہ یہ فلک تک پہنچتی ہے۔ اس کی بنیادیں اس بیل کی کمر پر ہیں جس نے زمین کو اٹھا رکھا ہے (38)۔

اس کی بنیاد ، زمین کے بیل تک جاتی ہے۔

اس کا سرا چاند تک پہنچتا ہے۔

اس کی چوٹی سے واضح طور پر ستاروں اور دیگر اجرام فلکی کو دیکھا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بہشت بریں کا ایک باغ ہے یا زمین پر بے شمار تصاویر اور صورتوں کا آسمان ہے۔

اس برج کو جہانگیر کے دور حکومت کے 19 ویں سال میں شروع کیا گیا تھا لیکن اس کے نقشہ کو پسند نہ کیا گیا اور اس کو یمین الدولہ آصف خاں اور دیگر مہندسوں (انجنیئروں) کے پیش کردہ منصوبہ کے تحت نئے سرے سے تعمیر کیا گیا۔ اس عظیم الشان برج اور اس کے ساتھ ملحقہ محلوں کے اب کوئی آثار باقی نہیں ہیں لیکن دروازہ جس پر عبارت کندہ ہے، ابھی تک ایستادہ ہے۔

لوہ کا مندر:۔ قلعہ کے شمال مغرب کی طرف ایک قدیم دروازہ تھا جس کو اب بند کر دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ملحقہ بیرکیں اب فوجی گوداموں کے طور پر استعمال ہو رہی ہیں۔ ان گوداموں کے شمال میں ایک گہرے گڑھے میں ایک چار دیواری کے اندر رام کے بیٹے لوہ کا ایک چھوٹا سا مندر موجود ہے، روایت ہے کہ لاہور کو اسی نے آباد کیا تھا۔ اس مندر کی سطح قلعہ کی بیرونی زمین کی سطح کے برابر ہے۔ واضح طور پر اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ جب اکبر نے قلعہ تعمیر کیا تو اس سے کافی عرصہ پہلے یہاں پر مندر کی اصل بنیادیں موجود تھیں۔ لوہ کے مندر کے شمال میں شاہی بیگمات کے کمرے تھے۔ ان کے تہہ خانے ابھی تک موجود ہیں اور آج کل شراب کے گوداموں کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں۔

دیوان عام:۔ قلعہ ایک عام مربع بیرک کی شکل پیش کرتا ہے جو انگریز فوجی دستوں کی قیام گاہ، توپ خانہ اور پیدل فوج کے اسلحہ کے گوداموں اور میگزین کے کمروں پر مشتمل ہے۔ درمیان والی بیرک پہلے شاہ جہاں کی تخت گاہ تھی۔ دیوان عام ایک طویل کمرہ ہے جس کو کئی ستونوں نے سہارا دے رکھا ہے۔ محمد صالح لاہوری کی تصنیف "عمل صالح" کے مطابق جب اس عمارت کی تعمیر مکمل ہو گئی تو بادشاہ نجومیوں کے مشورہ کے بعد ایک مبارک گھڑی میں اس میں داخل ہو کر رونق افروز ہوا۔ شاعر طالب کلیم نے بادشاہ کے لیے مندرجہ ذیل قصیدہ لکھا اور اسے خلعت سے نوازا گیا:۔

این تازہ بنا کہ عرش ہمسایہ اوست
رفعت حرفے زر تہہد پایہ اوست
باغیست کہ ہر ستون سبزش سرویست
کاسائش خاص و عام در سایہ اوست

ترجمہ:۔ یہ نئی عمارت عرش کی ہمسایہ ہے۔ رفعت خود اس کی شان و شوکت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ ایک باغ ہے اور اس کا ہر ستون، سرو کی مانند سرسبز ہے۔ اس کے سایہ میں خاص و عام آرام کرتے ہیں۔

دیوان خاص:۔ دیوان خاص وسیع و عریض کمروں پر مشتمل ہے۔ تاہم اب اس کو سپاہیوں کے

کوارٹروں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ دیوان خاص میں بادشاہ ہر روز بڑے جاہ و جلال اور شاہانہ انداز میں جلوہ گر ہوتا تھا۔ جیسے ہی بادشاہ رونق افروز ہوتا تو اس کے سامنے واقع نقار خانہ کے شاہی نقارے عسکری دھنیں بجانا شروع کردیتے۔ زرہ بکتر میں ملبوس اور آہنی سازوں والے ہاتھی، گھوڑوں پر سوار سپاہیوں کا زرق برق جلوس معائنے کے لیے بادشاہ کے سامنے سے گزرتا۔ مسٹر تھارنٹن لکھتے ہیں، "لیکن اسی اثناء میں اس کے بالکل سامنے واقع ایک خالی مزار سے (جو اب موجود نہیں) مُلّا کی آواز آتی۔ وہ بادشاہ کو اس بات کی یاد دہانی کراتا کہ اسے بھی دوسروں کی طرح آخر کار مر جانا ہے۔"

برنیئر جو ایک سمجھدار اور بامروت سیاح ہے اور جس نے بذات خود بڑی مستعدی سے مغلیہ حکومت اور سلطنت کی حالت کا جائزہ لیا، اس کے مطابق یہ جلوس ہر روز ایک گھنٹہ سے زائد وقت تک رہتا تھا لیکن باوجود اس کے کہ ان مظاہروں سے وقت برباد ہوتا تھا بلکہ کافی زیادہ کاروبار سلطنت بھی اس سے متاثر ہوتا تھا۔ بادشاہ اپنی تمام سہولت اور خوشی کے ساتھ اپنے آپ کو ان تقریبات میں مصروف کرلیتا تھا اور حکومت کے اندرونی کاروبار سلطنت میں اس کی توجہ بھی کم نہیں ہوتی تھی۔

یہیں پر شہزادگان، سفیر، امراء، درباری، بڑے بڑے خان، نواب، راجے اور مہاراجے اس عظیم مغل بادشاہ کے آگے سجدہ ریز ہو جاتے تھے۔ پہلے جنگلے کے قریب جو خواص کو عوام سے جدا کرتا تھا، سیاح نے بادشاہ کو پہلی مرتبہ تعظیم پیش کی۔ اس کے بعد وہ درباریوں کے ہجوم میں سے ہوتا ہوا سرخ جنگلے کے قریب پہنچا اور دوسری مرتبہ تعظیم پیش کی۔ اس کے بعد وہ تین زینے چڑھ کر چبوترے پر پہنچا اور تیسری مرتبہ تعظیم پیش کی۔ اس دوران ہر مرتبہ نقیب بلند آواز سے دہراتا جاتا تھا۔ اے زیب عالم، اے عالم پناہ، شہنشاہوں کے شہنشاہ، شاہجہاں، بادشاہ سلامت، عادل، مبارک فاتح۔ یہاں پر اس نے اپنے آپ کو شہزادوں، وزیروں اور انتہائی متمول اور صاحب حیثیت آقاؤں کے درمیان پایا۔ اس کی آنکھیں دربار کی عظمت اور شان و شوکت سے چندھیا گئیں۔ محل کے سامنے ایک چار دیواری میں محرابوں پر ایک خستہ حال عمارت ہے اس کی عین نچلی طرف سنگ مرمر کی بارہ دری، جعفری جالی دار محرابوں کے ساتھ بنی ہوئی ہے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ہر روز صبح کے وقت درباری امراء عرض بیگی یا نقیب کے ذریعے بادشاہ کے احکامات وصول کرنے کے لیے جمع ہوتے تھے۔ سنگ مرمر کی محرابوں کی بارہ دری کے اوپر شاہجہاں کی خوابگاہ ہے۔ یہاں وہ حرم کی بیگمات کے درمیان سونے کے لیے جایا کرتا تھا۔ اس پر تاتاری محافظوں کا پہرہ ہوتا تھا۔ صبح بیدار

ہونے کے بعد وہ سنگ مرمر کی کھڑکی میں امراء کو درشن کراتا جو اس کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے نیچے جمع ہو جاتے تھے وہ اپنے اپنے منصب اور مرتبہ کے لحاظ سے کھڑے ہوتے تھے۔ ایک دور میں اس جگہ کو چھاؤنی کے گرجا کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا لیکن اب اس کو فوجی مقاصد کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ خوابگاہ کلاں، جہانگیر کے دور کے فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے۔

موتی مسجد :۔ تخت گاہ کے عقب میں اور بارکوں کی غربی جانب جہانگیر کی تعمیر کردہ موتی مسجد ہے۔ اس کو اب سرکاری بیت المال کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ حرم سرا کی بیگمات کے لیے شاہی عبادت گاہ تھی۔ اس کی عمارت نہایت متبرک، سادہ اور شاہانہ ہے اور اس کے اوپر شفاف سفید سنگ مرمر کے ابھرے ہوئے گنبدوں کی وجہ سے اس میں قریب قریب سچے موتی جیسی چمک دمک پیدا ہو گئی ہے۔ عبادت گزاروں کے لیے ایک صحن ہے جس کی پیمائش 50 فٹ شمالاً جنوباً اور 33 فٹ شرقاً غرباً ہے۔ بیرونی صحن کی طرف کھلنے والی محرابی گزر گاہ کے اوپر فارسی کی مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

> " بادشاہ سلامت، صاحبقران ظل سبحانی، حشمت سلیمان، شوکت تیمور اور فاتح مانند اسکندر، دین پناہ، پسر بادشاہ سلامت، فاتح لادین، جلال الدین اکبر۔"
>
> نور الدین جہانگیر نے اس عالی شان عمارت کو اپنے نہایت عاجز مرید اور ادنیٰ غلام اور وقف شدہ نوکر مامور خاں کی کوششوں سے اپنے مبارک دور حکومت کے بارہویں سال 1007 ہجری بمطابق 1598ء میں مکمل کیا۔

رنجیت سنگھ نے موتی مسجد کا نام تبدیل کر کے موتی مندر رکھ دیا۔ برطانوی حکومت میں اس کو سرکاری بیت المال کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ سکھوں کی یہ عادت بن چکی تھی کہ وہ مسلمانوں کی عمارات کو ہندو نام دے دیتے تھے۔ مثال کے طور پر گجرات میں رسول نگر کو اس کی اسلامی خصوصیت سے محروم کر کے رام نگر کہا جانے لگا۔ مسجد کا فرش شفاف سنگ مرمر کا ہے۔ سکھوں نے اس کے کلسوں کے ساتھ لگے قیمتی پتھروں سے ان کو محروم کر دیا۔

شاہی حمام :۔ موتی مسجد اور شاہی تخت گاہ کے درمیان واقع شاہی حمام کو ہسپتال میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ سیاح مینڈلسلو اور فرانسس برنیئر نے غسلخانہ (حمام) کا تصویری خاکہ پیش کیا ہے۔ اس عمارت کو کابینہ کے اجلاس کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ ہر کسی کو نہیں بلکہ اعلیٰ منصب پر فائز امراء کو ان کمروں میں جانے کی اجازت ہوتی تھی اور مغل بادشاہ مختلف موضوعات پر ان سے تبادلہ خیال کرتے تھے۔

ثمن برج :۔ ثمن برج (39) کی طرف واقع دروازہ کے شمال میں سنگ مرمر کی ایک انتہائی خوبصورت بارہ دری ہے۔ اس کی چھت پر سنگ مرمر کے جالی دار کٹہرے ہیں۔ برج انتہائی وسیع و عریض عمارت ہے۔ جس میں نزاکت اور خوبصورت طرز تعمیر نے حسن اور آن بان کو یکجا کر دیا ہے۔ جدید فوجی ضروریات کے مطابق اس خوبصورت یادگار عمارت میں کسی قسم کے تصنع سے کام نہیں لیا گیا ہے ۔ قیمتی سنگ مرمر کی بارہ دری جو نولکھا کے نام سے مشہور ہے ، اس کو اورنگ زیب کے دور سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کی خمیدہ چھت پر بہت سا پچی کاری کا آرائشی کام خراب ہو چکا ہے اور مرمت طلب ہے ، یہ عمارت اپنی طرز تعمیر اور جسامت کی خوبصورتی کے لحاظ سے اب بھی جاذب نظر ہے۔ اس کو انتہائی مہارت سے قیمتی پتھروں کے ساتھ عمدہ گلکاری سے مزین کیا گیا ہے اور چھت پر پچی کاری کا انتہائی باریک کام اور اس کی چمک دمک دیکھ کر سیاح اس کی تعریف و توصیف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

شیش محل :۔ شیش محل کا کچھ حصہ شاہجہاں اور کچھ اورنگ زیب نے تعمیر کرایا تھا۔ اس میں بڑی مہارت اور کاریگری سے پچی کاری کے چمکدار شیشوں یا مختلف رنگوں کے ننھے منے محدب آئینوں کو سفید سیمنٹ کے نقوش اور گلکاری میں آراستہ کیا گیا ہے۔ یہ انتہائی زرق برق اور شاندار نظارہ پیش کرتا ہے۔ بالائی مینار کی طرف جاتی لکڑی کے حاشیہ والی کمروں کی چھتوں پر رنگ و روغن اور ملمع کاری کا کمال دکھایا گیا ہے۔ صحن میں پانی کا ایک حوض ہے جو خوبصورتی میں لاجواب ہے۔ اس کے درمیان ایک چبوترہ ہے جس کے ہر کونے پر فوارہ نصب ہے۔ اس دیوان کے آخر میں شمالی جانب سفید سنگ مرمر کی انتہائی نازک جالی سے وسیع و عریض نمائش گاہ کا نظارہ کیا جا سکتا ہے اور پچی کاری کے حاشیہ سے مزین ایک دھانے سے دریا کی طرف سے آنے والی تازہ ہوا کا لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہ دریا جہانگیر اور اس کے اولین جانشینوں کے دور میں قلعہ کی فصیل کے ساتھ بہتا تھا۔ ثمن برج کے نیچے وسیع و عریض تہہ خانے ہیں، جن کو اب شراب کے گوداموں کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

شاہ برج کی انتہائی بلندی سے شہر کی مختلف اور ہنگامہ خیز زندگی اس کی بل کھاتی گلیوں ، اس کے ملمع شدہ میناروں اور گنبدی محلوں کا خوبصورت نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ شمال میں دریا اپنے پر پیچ راستہ پر بل کھاتا ہوا چاندی کی دھاری معلوم ہوتا ہے۔ مغرب کی طرف لہلہاتے سرسبز و شاداب درخت ، ہرے بھرے باغات اور وسیع و عریض کھیت بہترین نظارہ پیش کرتے ہیں جبکہ مشرق کی طرف دور فاصلے پر سکوت میں کھڑے ، کلس ، مینار ، قدیم عمارات اور گنبد ، قریب ہی

موجود مصروف بازاروں کے ساتھ ایک عجیب تضاد پیش کرتے ہیں۔ اس شاہی عمارت کے ایوانوں نے بہت سی لیکن انتہائی اہم تبدیلیوں کو دیکھا ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں اکبر اعظم اپنے وزیروں، ابوالفضل، بیربل، ٹوڈر مل اور مان سنگھ کے ساتھ کشمیر کی فتح، افغانوں سے جنگ، یوسف زئیوں کی سزا اور سندھ کے الحاق کے بارے میں اپنے منصوبوں کو حتمی شکل دینے کے لیے اجلاس منعقد کرتا تھا۔ اس شاہی رہائش گاہ میں جہانگیر نے اپنی خوابگاہ کے اوپر تین چوتھائی ٹن وزنی سونے کی زنجیر کے ساتھ منسلک ایک سونے کی گھنٹی لٹکا رکھی تھی۔ اس کے ساتھ مختلف فاصلوں پر چھوٹی چھوٹی 80 گھنٹیاں بھی بندھی ہوئی تھیں۔ مقصد یہ تھا کہ اگر کسی کو بادشاہ سے یا حکومت سے کسی قسم کا شکوہ ہو تو وہ شکایت کر سکے۔ یہاں پر پھولوں کے بستر پر آزاد خیال بادشاہ نے حسین و جمیل نور جہاں کی پر مسرت صحبت میں تند و تیز شراب کے جام خالی کر دیے۔ یہ وہی نور جہاں تھی جس کو بعد میں نور محل اور نور جہاں کے خطاب دیے گئے۔ اب دریائے راوی کے کنارے پر دفن لاچار اور عدم توجہی کا شکار ہے۔ شاہی محل اور تنہا قبر، نرم و ملائم ریشمی بستر اور سرد کھردری زمین میں کس قدر انوکھا تضاد پایا جاتا ہے۔ یہاں پر جاہ و حشمت والا بادشاہ شاہجہان اور دانشمند اورنگ زیب اپنے اپنے دور میں شاہی امراء کے اجلاس منعقد کرتے رہے ہیں اور یہیں پر بامروت بہادر شاہ لاہور کے ملاؤں کے ساتھ مذہبی معاملات پر تبادلہ خیال کرتا رہا ہے۔ بہادر شاہ کے زمانہ سے سکھوں کے دور تک یہ جگہ مسلمان موروثی حاکمان لاہور کی پسندیدہ رہائش گاہ رہی ہے۔ لاہور کے تین سکھ حاکموں نے اپنے دور حکومت میں یہاں دنیا کی پریشانیوں سے علیحدہ ہو کر غیر مہذب عیش و نشاط میں اپنے آپ کو غرق کر دیا اور یہیں پر حالیہ دور کے شہرت یافتہ رنجیت سنگھ نے فتوحات اور توسیع پسندی کے منصوبے تشکیل دیے اور سرکاری ضیافتیں منعقد کیں۔ آخر میں شیش محل اس لیے بھی مشہور ہے کہ یہاں رنجیت سنگھ کے جانشینوں نے پنجاب کی حکومت رسمی طور پر انگلستان کی ملکہ کے نمائندوں کے حوالے کر دی۔

اسلحہ خانہ :۔ شیش محل کی مخالف سمت میں روغنی کھڑکیوں اور دروازوں کے اندر ایک محرابدار عمارت ہے۔ یہ اسلحہ خانہ ہے جو سکھوں کے قرون وسطیٰ اور جدید حکومت کے متعلق نہایت دلچسپ ہتھیاروں اور اسلحہ کے ذخیروں پر مشتمل ہے وہاں پر تباہ کن گرز، بھاری بھر کم جنگلی کلہاڑے، توڑے دار بندوقیں، رائفلیں اور سلارا، جسے صبح کا ستارہ کہا جاتا تھا۔ ایک قسم کا کوڑا، اس کوڑے کا دستہ لوہے جیسا ہے۔ سکھ حکومت کے ملازم فرانسیسی اور اطالوی افسروں کے چاندی کے پتروں والے خود اور سینہ بند بھی موجود ہیں۔ آہنی نیزے اور سکھوں کے پہناوے میں

آنے والے ٹوپ ، فولادی ڈھالیں جن پر سورج کی کرنیں دکھائی گئی ہیں ۔ گھنٹی کے پیندے کی طرح منہ والی پستولیں ، جن کو " شیر کی بچیاں " کہا جاتا تھا۔ وہاں پر پہلے جنگجو گرو ، گرو گوبند کا آہنی جنگی کلہاڑا بھی رکھا گیا ہے ۔ پٹھانوں کے لمبے اور مہلک چاقو ، نہنگوں اور اکالیوں کے جنگی چھلے یا چکر اس سکھوں کی سیدھی اور لمبی تلواریں یا کرچ ، ہندوؤں کی کٹار ، ایرانیوں کے پیش قبض ، بچوا یا بل کھایا ہوا دو دھاری خنجر ، وہاں پر اونٹ کی کھال پر نصب ، زنبراک یا چول چھلے ، جازیل یا بڑی نالی والی توڑے دار بندوقیں ، کاربینوں کی مختلف اقسام ، نقارے اور بگل اور جنگی موسیقی کے دیگر آلات ، وہاں پر رنجیت سنگھ کے سپاہیوں کی وردیاں ، جھنڈے ، جو علم بردار جنگوں میں اٹھاتے تھے ان میں سے چند ایک پر ہندوؤں کے ہنومان جی کی تصاویر بنی ہوئی ہیں۔ ان میں دو آلات بڑے عجیب و غریب پڑے ہوئے ہیں۔ ایک ایسا آلہ ہے جس میں مجرموں کی انگلیاں پھنسا کر پیچ کس دیے جاتے تھے ۔ ان کو مہاراجہ شیر سنگھ کے دور میں استعمال کیا جاتا تھا۔ ایک دوسرا آلہ ہے جس کے ذریعے پاؤڈر کی طاقت کا انداز لگایا جاتا تھا۔ وہاں پر کوے کے پنجوں جیسے چھوٹے ہتھیار بھی دیکھے جا سکتے ہیں ، جن کو جب زمین پر پھینکا جاتا تھا تو وہ گھڑ سواروں کے گھوڑوں کو لنگڑا کر دیتے تھے ، وہاں پر دو تلواریں بھی پڑی ہیں جن پر کوفتگری کا کام کیا گیا ہے ۔ مندرجہ ذیل تعویذ کو ایک انتہائی خوبصورت تلوار کے پھل پر سنہری حروف میں کوفتگری کے کام کے ذریعہ کندہ کیا گیا ہے : ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لافتا   الاعلی   لا   سیف   الا   ذوالفقار

ہر   بلا   سے   پیش   اید   این   ہنجو   ان   ہفتاد   باد

ترجمہ : ۔ " شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے (40)۔

کوئی سپاہی علیؓ جیسا بہادر نہیں اور کوئی تلوار ذوالفقار کی طرح خون کی پیاسی نہیں ہے ۔ " (41)

اگر کوئی مصیبت پیش آئے تو مندرجہ بالا کو 70 سے زائد دفعہ دہرائے ۔

ایک دوسری تلوار پر مندرجہ ذیل عبارت کوفتگری کے کام میں موجود ہے : ۔

عمل اللہ

اصفہانی

ان اللہ علی کل شیء قدیر

ترجمہ :۔ اصفہانی (للہ) (42) کا کام

" بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے "۔

قلعہ کے دروازہ کے سامنے مغرب کی طرف مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھی ہے جو درحقیقت پنجاب کا آخری موروثی حکمران تھا۔ یہ عمارت ہندو اور اسلامی فن تعمیر کا مجموعہ ہے۔ حقیقت میں ہندوانہ طرز کی ہے اور اس میں زیادہ تر اسلامی طرز کا کام کیا گیا ہے۔ یہ عمارت سنگین اور سیدھی سادی طرز کی ہے۔ دروازے کے سامنے والے حصہ پر ہندو دیوی دیوتاؤں ، گنیش ، دیوی اور برہما کی شبیہیں ، سنگ سرخ میں بنائی گئی ہیں۔ اندرونی چھتوں کو سفید سیمنٹ میں محدب آئینے نصب کر کے آراستہ کیا گیا ہے۔ درمیان والی محرابی چھت میں سنگ مرمر میں کنول کا پھول بنایا گیا ہے اور اس کے نیچے چھپرکٹ یا چھتری ہے۔ جس نے عظیم مہاراجہ کی راکھ کو ڈھانپ رکھا ہے اور چاروں طرف اسی طرز کے چھوٹے پھول ، مہاراجہ کی چار بیویوں اور سات کنیزوں کی یاد میں بنائے گئے ہیں جنہوں نے خود کو اس کی چتا پر قربان کر دیا تھا جو سمادھ رانیوں کی نمائندگی کر رہے ہیں ان پر تاج رکھے گئے ہیں جبکہ تاج کے بغیر ستون ، یکساں طور پر لیکن غیر قانونی وفادار بیویوں کی قربانی کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ مزید دو ستون ان کبوتروں کی عقیدت میں بنائے گئے ہیں جو حادثاتی طور پر آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آگئے اور جل کر راکھ ہو گئے تھے۔ انہیں ستی کا درجہ دیا گیا۔ جب مہاراجہ کی نعش کو جلایا جارہا تھا تو بارش کے چند قطرے گرے ، ضعیف الاعتقاد لوگوں کا خیال تھا کہ ہر دلعزیز مہاراجہ کی موت پر آسمان بھی آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

اس عمارت میں واقع سنگ مرمر کی بنی ہوئی دیوی کی بارہ دری دلیپ سنگھ کی والدہ مہارانی جنداں کی جائیداد تھی۔ جب اس کو لاہور سے جلاوطن کیا گیا تو اس نے یہ سمادھ کو تحفہ کے طور پر دے دی۔ بغلی دیواروں میں موجود چھوٹے طاقچوں میں ہندو دیوتاؤں کے سنگ مرمر کے بت رکھے ہوئے ہیں ، جن کو گرو کے چیلے پوجتے ہیں۔

اس عمارت کو کھڑک سنگھ نے شروع کروایا تھا لیکن اس کی بے وقت موت نے اس کو مکمل کرنے کی مہلت نہ دی۔ اس کا کچھ کام شیر سنگھ نے کروایا لیکن اس کو دلیپ سنگھ کے دور حکومت کے آخر تک بھی مکمل نہ کیا جا سکا۔ اندرونی عمارت میں سنگ مرمر کی محرابیں ایک وقت میں خطرناک حالت میں ہو گئی تھیں لیکن آنجہانی لیفٹیننٹ گورنر سر ڈونالڈ میکلوڈ کے حکم سے ان کو آہنی بریکٹوں کے ذریعے سہارا دے دیا گیا۔ سمادھ کی اس چار دیواری کے اندر لمبی داڑھیوں والے سکھ مبلغین گرنتھ پڑھتے ہوئے ملیں گے۔ ان کے اوپر نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ چادری یا

مور پنکھ جھل رہے ہوتے ہیں، جو تقدس کا نشان سمجھا جاتا ہے۔ ستار (جسے گرو نانک اپنے قابل اعتماد چیلے مردانہ سے سنا کرتے تھے) بجایا جاتا ہے اور ایسے بھجن اور گیت بڑے جوش و خروش سے گائے جاتے ہیں جن میں بہادر گروؤں کے کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔ ساری کارروائی بڑے منظم طریقے سے ہوتی ہے۔ بھجنوں کو بڑے غور سے سنا جاتا ہے اور اس ساری کارروائی کے دوران مکمل خاموشی رہتی ہے۔ پڑھنے کے بعد ان ضخیم کتابوں کو انتہائی احتیاط سے ریشمی کپڑے کے غلافوں میں لپیٹ دیا جاتا ہے اور سارا مجمع مناسب طور پر منتشر ہو جاتا ہے تو یہ منظر بڑا مقدس معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنے حکمرانوں کے اب بھی شکر گزار ہیں جن کے زیر سایہ ان کو کسی بیرونی دباؤ کے بغیر اپنے مذہبی حقوق حاصل ہوئے۔

سمادھ :۔ اس سمادھ کے ساتھ ہی چھوٹے گنبدوں والی عمارتیں ہیں جو مہاراجہ کے بیٹے کھڑک سنگھ اور پوتے نونہال سنگھ کی یاد میں بنائی گئی ہیں۔

سمادھ ارجن مل :۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مقبرے کے سامنے حضوری باغ سے پریڈ گراؤنڈ کی طرف جانے والی سڑک پر سکھوں کے پانچویں گرو ارجن مل کی سمادھ واقع ہے۔ اس نے اپنے پیشرو گروؤں کی بہت سی تحروں کو مرتب کیا۔ اسے "آدی گرنتھ" کہا جاتا ہے اور جو سکھوں کی زیادہ تر الہامی کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس نے سکھوں کے لیے منظم قواعد و ضوابط مقرر کیے اور انہیں باقاعدہ ایک ضابطہ اخلاق دیا اور اس کی وزارت کے دوران گرو نانک کے اصول ان کے پیروکاروں کے ذہنوں میں رچ بس گئے۔ اس نے امرتسر کو معتقدین کا مسکن بنا دیا اور اس مرکزی مقام کی وجہ سے جو گرو کے چیلوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا، ان میں یگانگت پیدا ہو گئی اور یہ چھوٹا سا گاؤں جس میں ایک تالاب بھی ہے، مشرق کے گنجان آباد شہروں میں سے ایک شہر بن گیا۔ ارجن کا لاہور میں جہانگیر کے وزیر خزانہ چندو شاہ سے جھگڑا ہو گیا۔ اس نے گرو کے بیٹے کے لیے اپنی لڑکی کا رشتہ بھی پیش کیا تھا۔ تاہم اس کی وجہ سے قرابتداری کو ختم کر دیا گیا۔ گرو نے بادشاہ کے باغی بیٹے خسرو کی طرفداری کی جس نے عارضی طور پر پنجاب پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کو قید میں ڈال دیا گیا اور کہا جاتا ہے کہ اس کی موت، قید کی سختیوں اور تشدد سے واقع ہوئی جبکہ اس کے پیروکار یہ توجیہہ بیان کرتے ہیں کہ جب اس کو نہانے کی غرض سے راوی پر لے جایا گیا تو گرو معجزانہ طور پر دریا کے نیچے غائب ہو گیا۔ یہ واقعہ 1606ء میں پیش آیا۔ سمادھ کو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے تعمیر کرایا تھا۔ ایک نہایت قیمتی ریشمی کپڑے کا شامیانہ اس عمارت کے مرکزی حصہ پر پھیلا ہوا ہے جو سنگ مرمر کے چبوترے پر جس کے ارد گرد سنگ مرمری کا جنگلہ لگا ہوا ہے، ایستادہ ہے۔ چھت کو انتہائی

خوبصورتی سے پچی کاری کی گلکاری سے سجایا گیا ہے اور اس میں آئینوں کے ننھے ننھے ٹکڑے آویزاں کیے گئے ہیں۔ زمین میں گاڑے گئے پتھر کے ایک بہت بڑے پیالے میں گرو کے چیلوں کو نشہ آور مشروب مہیا کرنے کے لیے بھنگ گھوٹی جاتی ہے۔ طاقچوں میں دس سکھ گروؤں کی سنگین مورتیاں ہیں۔ اس عمارت میں بڑی بڑی ضخیم جلدوں پر مشتمل گرنتھ اور آدی گرنتھ رکھی گئی ہیں، جن کو مخصوص اوقات میں ان کے پیروکار مختلف تقریبات کے مواقعوں پر پڑھتے ہیں۔ سمادھ کے گنبد کے ایک کونہ سے ایک ترنگہ یا جھنڈا سکھوں کے پانچویں بادشاہ جسے گرو کہا جاتا ہے، کی آخری آرام گاہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

اس عمارت کی چار دیواری کے اندر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بیویوں میں سے ایک بیوی رانی لچھی کی سمادھ بھی موجود ہے۔

مسجد مریم زمانی :۔ یہ مسجد شہر کی قدیم مساجد میں سے ایک ہے۔ یہ شہر کے مستی دروازہ کے قریب قلعہ لاہور کی مشرقی دیوار کی مخالف سمت میں واقع ہے۔ اس کے شمالی دروازے پر موجود عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ اس کو جہانگیر کے دور حکومت میں اس کی والدہ مریم زمانی نے 1023 ہجری بمطابق (1614ء) میں تعمیر کروایا تھا۔ "آئین اکبری" کے مطابق وہ راجہ بہاری مل کی بیٹی اور راجہ بھگوان داس کی ہمشیرہ تھی۔ اس عمارت کی طرز تعمیر پٹھانوں اور مغلوں کے عبوری دور کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کے عظیم الشان گنبد (درمیان والا بڑا ہے اور اس کے دائیں بائیں چھوٹے ہیں) بھاری بھرکم محرابیں، پٹھانوں کے قدیم دور کی طرز تعمیر کی نشاندہی کرتی ہیں۔ جبکہ اس کی گزرگاہ، چھجے اور بغلی کمرے، طرز تعمیر کے لحاظ سے پٹھانوں کی بجائے مغلیہ دور کا پتہ دے رہے ہیں۔ مسجد کے چاروں کونوں پر محرابدار مینار ایستادہ ہیں۔ اس کو سیمنٹ اور انتہائی اعلیٰ قسم کے چونے کے ساتھ اس خوبصورتی سے تعمیر کیا گیا ہے کہ عمارت کی پختگی کا مکمل انحصار اسی سے وابستہ معلوم ہوتا ہے۔ مسجد کے صحن کے درمیان میں نمازیوں کے وضو کے لیے پانی کا ایک فوارہ بھی ہے۔ رنجیت سنگھ نے اس مسجد کو بندوقوں اور بارود کی تیاری کے لیے استعمال کیا۔ لہذا اسی وجہ سے اسے "بارود خانہ والی مسجد" کہا جانے لگا۔ یہ کام جواہر مل مستری کی نگرانی میں ہوتا تھا۔ لاہور کے ڈپٹی کمشنر نے 1850ء میں یہ مسجد اور اس کے ساتھ ملحقہ دکانیں اور مکانات مسلمانوں کے حوالے کر دی۔ مسلمانوں نے حال ہی میں چندہ اکٹھا کر کے اس کی مرمت کروائی ہے۔

شمالی دروازے پر درج عبارت

اللہ اکبر

منت ایزد را کہ آخر گشت کا راز ابتدے
ہم بتوفیق خدا و حکم صاحب مسندے
حضرت مریم زمانی بانی ہذا المکان
کز عنایات الہی ساختہ حامی ہدے
از پئی تاریخ ختم این بنائے چون بہشت
فکر می کردم کہ آخر یافتم خوش مسجدے

ترجمہ: ۔" اللہ بہت بڑا ہے ۔"

" اللہ کا شکر ہے کہ جس کے فضل و کرم سے بادشاہ کے حکم سے اس عمارت کو مکمل کیا گیا۔ اس عمارت اور بخشش والی جگہ کی بانی ملکہ مریم زمانی ہیں۔ اس جنت نظیر عمارت کی تکمیل کے بعد، میں اس کی تاریخ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ آخر کار میں نے لفظ کسی عمدہ مسجد ہے، میں اس کو دریافت کر لیا۔ "

مشرقی دروازے پر درج عبارت

شاہ عالمگیر نورالدین محمد بادشاہ

باد یارب در جہان روشن چو نور مہر و ماہ

ترجمہ: ۔ خدایا، شاہ عالمگیر نورالدین محمد بادشاہ اس جہان میں، ہمیشہ سورج اور چاند کی طرح روشن رہے۔

درمیانی محراب پر رسول کریمؐ کی احادیث مبارکہ اور آیت الکرسی درج ہے۔

شمالی محراب پر درج عبارت

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المومن فی المسجد کالسمک فی الما۔

ترجمہ: ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ مومن مسجد میں اس طرح ہوتا ہے جیسے مچھلی پانی میں۔

مقبرہ فضل شاہ :۔ یہ دلچسپ مقبرہ جس کے ارد گرد چار دیواری بنی ہوئی ہے، مستی دروازہ کے باہر میونسپل باغ میں واقع ہے۔ فضل شاہ، سید پور تحصیل ظفر وال ضلع سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ وہ سکھوں کے دور میں لاہور آکر ایک مسجد کے مُلاّ بن گئے۔ پھر عینک سازی کا کام کرنے لگے۔ تب ایک نوشاہی فقیر رحمٰن شاہ کے مرید ہونے کے بعد ایک مست فقیر بن گئے۔ راجہ دنیا ناتھ کو ان سے بے انتہا عقیدت تھی۔ راجہ ہر روز ان کے پاس حاضر ہوتا۔ اس کو ان کی روحانی اعانت پر مکمل بھروسہ تھا۔ وہ ان کو ہزاروں روپے پیش کرتا لیکن فقیر اس رقم کو خیرات کر دیتے اور اس بات سے قطعی لاتعلق رہتے تھے کہ انہیں کیا کچھ دیا جا رہا ہے۔ جذب کی حالت میں وہ اکثر راجہ کو پتھر مارتے اور اسے گالیاں دیتے لیکن وہ بجائے برہم ہونے کے ان کو اپنے لیے بہتری متصور کرتا تھا۔ وہ 1854ء میں فوت ہوئے اور ان کو اس قبر میں دفن کیا گیا جسے راجہ دنیا ناتھ نے فقیر کی زندگی ہی میں تعمیر کرا دیا تھا۔

مقبرہ بلند شاہ :۔ اس مزار کے قریب ہی فضل شاہ کے بیٹے بلند شاہ کا مقبرہ ہے۔ وہ 1287 ہجری (1870ء) میں فوت ہوئے۔ مزار کے شمال کی طرف سنگ مرمر کی تختی پر مندرجہ ذیل تاریخ درج ہے:۔

تاریخ وفات سیادت پناہ سید بلند شاہ غفراللہ لہ

سہ شنبہ از صفر بست و نہم بو
کہ واصل شد بحق ان دین پناہی

بگو از سال ترحیلش کہ بادا
مقامش جنت الماوی الہی

1287 ہجری

ترجمہ :۔ "تاریخ وفات، سید بلند شاہ (اللہ مغفرت کرے)"۔
بروز منگل 29 صفر کو دین پناہ واصل بحق ہوئے۔
ان کی وفات کے سال کے لیے کہو۔
الہیٰ ان کا ٹھکانہ جنت الماویٰ میں بنانا۔

1287 ہجری

مقبرہ شیخ محترم:۔ یہ مقبرہ بدھو کے آوا کے مغرب میں اور شالا مار باغ کی سڑک کے شمال میں ریلوے کی بیرکوں کے اختتام پر واقع ہے۔ یہ چوکور شکل میں ہے۔ اس کے اوپر ایک گنبد اور چاروں کونوں پر مینار ہیں۔ گنبد کے نیچے شیخ محترم اور ان کے دو نزدیکی عزیزوں کے مزارات تھے۔ مقبرے کی چار محرابی گزرگاہیں ہیں۔ بیرونی دیواروں پر بہت سے عربی کے فقرے اور فارسی کے اشعار کندہ تھے۔ تاہم ان میں سے صرف مندرجہ ذیل کو پڑھا جا سکا ہے:۔

ہادی سالکان راہ نجات
آن سلیمان دل و خرد آصف

قطب حق شاہ محترم ز جہاں
رفت در بزم اولیائے سلف

سال تاریخ رحلتش جستم
گفت طبع سلیم نیک حلف

پنج بر چمن زنخل و فق و بگو
قدس اللہ سرۃ الاشرف

کتبہ محمد اکرم

ترجمہ:۔ "راہ نجات کے سالکوں کے ہادی جو سلیمانؑ کا دل اور آصف جیسی عقل رکھتے تھے، اللہ کے بزرگ شاہ محترم، اس دنیا سے رخصت ہو کر بزم اولیاء میں تشریف لے گئے ہیں۔ جب میں نے ان کی تاریخ وفات تلاش کی تو عقل سلیم نے کہا:

مندرجہ ذیل جملہ سے پانچ کو منہا کرو اور کہو: خدایا انہیں جنت الفردوس میں داخل فرما۔ تحریر کردہ محمد اکرم۔"

عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ کی وفات 1102 ہجری (1690ء) میں یا اورنگ زیب کے انتقال کے سترہ سال قبل ہوئی۔

محرابوں پر یہ عبارت درج ہے:۔

اللھم اغفرلامۃ محمدؐ

اللھم ارحم الامۃ محمدؐ

ترجمہ:۔ خدایا! حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کے گناہ بخش دے۔
خدایا! حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت پر مہربانی فرما۔ جنوبی دروازے پر فارسی کے اشعار بھی درج تھے لیکن اس وقت صرف مندرجہ ذیل عبارت کو پڑھا جاسکا ہے۔

برآستان توام سزارادت ما

ترجمہ:۔ "میں نے تیرے آستان پر اپنی جبیں نیاز کو جھکا دیا ہے۔"

غربی کونے کی جنوبی دیوار کے اوپر یہ عبارت درج ہے:۔

واللہ انیس التایبین

ترجمہ:۔ "اللہ تعالیٰ اطاعت گزاروں کو دوست رکھتا ہے۔"

مقبرے کے ارد گرد برآمدہ ہے اور اس کو انگریزوں کی رہائش کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔ آج کل اس کو نارتھ ویسٹرن ریلوے کوآپریٹو سٹور ایسوسی ایشن، اسلحہ اور ہتھیاروں کے ڈیلروں اور شراب و اسپرٹ کے لائسنس یافتہ تھوک و پرچون ڈیلروں کے لیے سوڈا واٹر تیار کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

دروازہ گلابی باغ:۔ شالامار باغ کی سڑک پر نصف سے ذرا زیادہ فاصلے پر بائیں جانب گلابی باغ کی گزر گاہ ہے۔ باغ تو اب موجود نہیں ہے لیکن روغنی ٹائلوں سے مزین ایک عالی شان محرابی گزر گاہ ابھی تک ایستادہ ہے۔ یہ حسین و جمیل دروازہ رنگین گلکاری اور روغنی منقش دیواروں کی وجہ سے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ جو اب بھی اسی طرح واضح ہے اور اس کی سجاوٹ بھی اسی طرح قائم و دائم ہے جس وقت اسے بنایا گیا تھا۔ "گلابی باغ" کے الفاظ کی خوبصورتی سے باغ کے نام کا پتہ چلتا ہے اور اس کی تاریخ کا بھی پتہ معلوم ہوتا ہے۔ الفاظ کے اعداد سے اس دور کا اظہار ہو رہا ہے جب اس عمارت کو تعمیر کیا گیا اور یہ باغ لگایا گیا۔ حساب لگایا ہے کہ یہ دور 1066 ہجری یا 1655ء تھا۔

دروازے پر درج عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ اس کو مرزا سلطان بیگ نے تعمیر کرایا تھا۔ وہ ایران کے ایک امیر مرزا غیاث الدین کا چچا زادہ تھا جو شاہجہان کی بیٹی سلطان بیگم کا شوہر تھا۔ وہ 1649ء کو ہندوستان آیا اور بادشاہ کے داماد کے اثر و رسوخ سے اس کو "میر البحار" مقرر کیا گیا۔

وہ شکار کا بہت شوقین تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی موت سے دو ماہ قبل شاہجہان نے اسے ایک ولائتی رائفل تحفے کے طور پر دی لیکن بادشاہ کا یہ تحفہ اس کے لیے مہلک ثابت ہوا۔ اس کے ساتھ وہ شکار کھیلنے کے لیے ہرن مینارہ یا جہانگیر آباد موجودہ شیخوپورہ گیا لیکن اس آتشیں ہتھیار کے پھٹ جانے کے باعث ہلاک ہو گیا۔ "تحقیقات چشتی" کے مصنف مولوی نور احمد اس کی تاریخ وفات 13 شوال 1068 ہجری بمطابق (1657ء) بتاتے ہیں۔

دروازے کی پیشانی پر فارسی کے مندرجہ ذیل اشعار درج ہیں: ۔

بانی باغ سخاوت فاتح باب کرم
آن کہ از دارائے گردوں ساخت باغ چون ارم
اہل معنی بردوامش خواستند از حق دعا
بیگ سلطان را الہی دار دایم محترم

ترجمہ: ۔ "اس باغ سخاوت کے بانی اور مہربانی کے دروازہ کو کھولنے والے وہ ہیں جنہوں نے خدا کی رضامندی سے باغ بہشت کی مانند یہ باغ بنوایا ہے۔ لہذا انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اپنی درازی عمر کے لیے دعا کی۔ خدایا! سلطان بیگ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محترم رہے۔"

محرابی دروازے کے اطراف میں مندرجہ ذیل اشعار کا بند درج ہے جس میں اس کی تاریخ بیان کی گئی ہے: ۔

خوشا باغ کہ دارد لا داغش
گل خورشید دمہ زیبد چراغش

ز تقویم خرد پرسید غازی
گلابی باغ شد تاریخ باغش

ترجمہ: ۔ "کیسا دلکش باغ ہے۔ یہ باغ اتنا خوبصورت ہے کہ پوست پر رشک کا نشان لگایا گیا ہے۔ چاند اور سورج کے پھول اس میں چراغوں کی مانند لگائے گئے ہیں۔ غازی نے اس کی تاریخ کے بارے میں دریافت کیا تو اس کو "گلابی باغ" کی تاریخ دی گئی۔"

پہلی سطر میں الفاظ "رشک کا نشان" پوست کے پھول میں سیاہ حصہ کی طرف اشارہ کرتے

ہیں۔

مقبرہ دائی انگہ اور سلطان بیگم :- گلابی باغ کے دروازہ سے چند قدم کے فاصلے پر شمال کی طرف شاہجہاں اور اس کی بیٹی سلطان بیگم کی دایہ، دائی انگہ کا پرشکوہ مقبرہ ہے۔ یہ مثمن شکل میں ہے۔ اس عمارت کے اوپر ایک بہت بڑا گنبد اور اس کے ہر کونے پر ایک ایک مینار ہے۔ دیواروں پر روغنی گل بوٹوں سے آرائش کی گئی ہے۔ دیواروں کی اندرونی جانب قرآن حکیم کی آیات درج ہیں۔ (یہ سورۃ فتح) انا فتحنا سے شروع ہوتی ہیں۔ اس عربی قطعہ کے آخر پر اس کے مصنف کا نام محمد صالح درج ہے۔ الفاظ یہ ہیں :۔

کتبہ محمد صالح غفر اللہ ذنوبہ و ستر عیوبہ سنہ 1082 ہجری۔

ترجمہ :۔ "تحریر کردہ محمد صالح، اللہ اس کے گناہ معاف کرے اور اس کے عیب چھپائے۔ 1082 ہجری۔"

عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ اس عمارت کو 1082 ہجری (1671ء) میں تعمیر کیا گیا۔ پتھر کے تعویذ کو مسمار کر کے ہٹا دیا گیا ہے لیکن عمارت ابھی تک کھڑی ہے اور یہ دیکھنے والوں کی تحسین پاتی ہے۔ اس عمارت کے نیچے تہہ خانے بھی ہیں۔ ان کے راستے کو بند کر دیا گیا ہے لیکن ان کو بالائی سطح کے سوراخوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔

مقبرہ شرف النساء بیگم :- شرف النساء بیگم کا مقبرہ جو اپنی دیواروں پر سرو کے درختوں کی تصویر کشی کی بناء پر "سرو والا مقبرہ" کے نام سے مشہور ہے، شالامار باغ کی طرف جانے والی سڑک کے شمال کی طرف شہر اور باغ کے درمیان تقریباً نصف فاصلے پر واقع ہے۔ یہ مقبرہ خصوصی طور پر ایک بلند چبوترے پر تقریباً ایک منزل اونچا ہے۔ اس کے اوپر روغنی منقش ٹائلوں کے ذریعے آرائش کی گئی ہے۔ شرف النساء بیگم، حاکم لاہور نواب خان بہادر خاں کی منہ بولی بہن تھی۔ اس کی یہ عادت تھی کہ وہ اس مینار میں ہر روز ایک گھنٹہ تک قرآن پاک کی تلاوت کرتی۔ وہ ایک چوبی سیڑھی کے ذریعے اس پر چڑھتی تھی۔ وصیت کرنے کے بعد اس نے قرآن پاک کو ہیرے جواہرات سے مزین ایک تلوار کے ساتھ یہاں رکھوا دیا۔ اس نے اپنی وفات تک روزانہ یہ عمل جاری رکھا۔ موت سے قبل اس نے اس مینار میں دفن ہونے کی خواہش کا اظہار کیا۔ لہٰذا اس کی خواہش پر عمل کیا گیا اور قرآن و تلوار کو تعویذ کے اوپر رکھ کر اس کی خواہش کے مطابق مینار کے دروازوں کو پختہ اینٹوں کی چنائی کر کے بند کر دیا گیا۔ سکھوں کو اس بات سے باخبر کیا گیا کہ عمارت کی اس چار دیواری میں نہایت قیمتی اشیاء پڑی ہوئی ہیں۔ لہٰذا اسے توڑ کر کھولا گیا اور اس میں رکھا ہوا قیمتی

قرآن اور تلوار نکال لیے گئے۔ پہلے پہل مینار کے ارد گرد خوبصورت باغ اور تالاب موجود تھا۔ اس کے آثار ابھی تک موجود ہیں۔ دیوار کے بالائی حصہ پر روغنی ٹائلوں کے مربع شکل کے ڈیزائن بنائے گئے ہیں جن میں طغریٰ رسم الخط میں عربی زبان کے مندرجہ ذیل قطعات نیلے رنگ کے حروف میں لکھے گئے ہیں:۔

الله باقی والکل فانی

ترجمہ:۔ "اللہ ہی ہمیشہ رہنے والا ہے اور ہر شے فانی ہے۔"

بگہ گنبد:۔ بیگم پورہ کے مشرق میں مثمن شکل کی ایک قدیم عمارت ہے جسے بگہ گنبد یا" سفید گنبد کہا جاتا ہے۔ گنبد اور مینار مسمار ہو چکے ہیں لیکن اس کو سہارا دینے والی دیواریں ابھی تک ایک بلند چبوترے پر قائم ہیں جن کے درمیان میں نواب ذکریا خان، خان بہادر کے بیٹے یحییٰ خاں کا مزار واقع ہے۔ حتیٰ کہ خشت فروشوں نے قبر تک کھود ڈالی ہے اور جب میں نے وہاں جا کر دیکھا تو وہاں صرف ایک خالی گڑھا تھا جس میں جل کے درخت اگے ہوئے تھے (43)۔ یہ مقبرہ سرسبز زمین پر واقع ہے جو اب بیگم پورہ کے نمبردار الہیٰ بخش کی ملکیت ہے۔ اس کو مقبرہ کے جنوب میں واقع ایک پرانے اور بہت بڑے کنوئیں کے ذریعہ سیراب کیا جاتا ہے۔ اس کے اور شرف النساء بیگم کے مقبرے (سرو والا مقبرہ) کے درمیان ایک قدیم بارہ دری ہے جس میں ان دنوں زمینداروں کے مویشیوں کو باندھا جاتا ہے (44)۔

جب اس المیہ کے بعد جو مہاراجہ کھڑک سنگھ کی بیوہ کے قتل پر اختتام پذیر ہوا۔ شیر سنگھ، دھیان سنگھ کی دعوت پر لاہور آیا تو سب سے پہلے وہ اسی گنبد میں اترا اور اس جگہ سے بدھو کا آوا گیا جہاں سپاہیوں نے پنجاب کے مہاراجہ کے طور پر اسے سلامی دی۔ شیر سنگھ اس گنبد کو بڑا مبارک سمجھتا تھا اور اکثر یہاں آیا کرتا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ اس کی مکمل طور پر مرمت کرائی جائے لیکن قسمت بڑی ناپائیدار تھی وہ خود سندھیانوالوں کی سازش کا شکار ہو گیا۔ لہذا اس کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔

قدیم بارہ دری:۔ پرانی بارہ دری جس کا پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے، سید رحمت اللہ کے مزار کے بالکل قریب اور جنوب مغرب کی طرف بگا گنبد اور بیگم پورہ کے درمیان ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کے بارہ محرابی دروازے ہیں جن کو پختہ اینٹوں کے ستونوں نے سہارا دے رکھا ہے۔ اس عمارت کے درمیان میں ایک بلند چبوترہ ہے جس پر نواب خان بہادر کے چند درباریوں کے مزار تھے لیکن اب ان کے آثار تک موجود نہیں ہیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور حکومت کے آغاز میں

کانگڑہ کے سنسار چند جس کی حسین و جمیل بیٹیوں سے مہاراجہ نے شادی کی تھی، اس نے یہاں پر ایک شاندار باغ لگایا تھا۔ بعد میں اس جگہ کو مہاراجہ نے چھاؤنی کے طور پر استعمال کیا اور بارہ دری کو سبحان خاں کماندار نے استعمال کیا۔ اب یہ زمینداروں کے قبضہ میں ہے جو اسے زرعی مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

حجرہ سید رحمت اللہ شاہؒ :۔ سید رحمت اللہ شاہ چشتیؒ کا مزار شہر سے شالا مار باغ جانے والی سڑک کے شمال میں سرو والا مقبرہ اور بگا گنبد (مقبرہ یحییٰ خان) کے درمیان واقع ہے۔ چار دیواری کے اندر ایک بلند و بالا چبوترے پر دو مزار ایک سید رحمت اللہ شاہ چشتیؒ اور دوسرا ان کے صاحبزادے سید برکت اللہ شاہؒ کا ہے۔ رحمت اللہ شاہ، محمد شاہ کے دور حکومت میں حاکم لاہور نواب عبدالصمد خان، دلاور جنگ کے روحانی پیشوا تھے۔ وہ 1120 ہجری بمطابق 1708ء میں فوت ہوئے۔ اس بزرگ کو اڑوس پڑوس کے زمیندار اب " پیر سانپوں والا " کہہ کر پکارتے ہیں۔ جب عمر رسیدہ اشخاص سے معلوم کیا گیا کہ اس بزرگ کو یہ نام کیوں دیا گیا تو مجھے بتایا گیا کہ رنجیت سنگھ نے اپنی فوج کے کچھ حصہ کو اس علاقہ میں آباد کیا۔ فوج کے آدمیوں نے کچھ غیر دانشمندانہ کام کیے اور ان میں سے چند سانپوں کے ڈسنے سے ہلاک ہو گئے۔ فوجی خوفزدہ ہو گئے اور اس علاقے کو اس خیال کے تحت خالی کر دیا گیا کہ اس جگہ کے غلط استعمال کی وجہ سے بزرگ ناراض ہو گئے ہیں اور یہ ساری آفت اسی وجہ سے آئی ہے۔ تب سے لوگ انہیں " سانپوں والا پیر " کے نام سے پکارتے ہیں۔ اب یہ جگہ چاروں طرف سے زرخیز ہے اور چبوترہ سرسبز و شادات کھیتوں کے درمیان کھڑا ہے۔

بیگم پورہ کے عمارتی آثار :۔ شالا مار باغ کی سڑک پر خواجہ محمودؒ کے مقبرہ کے قریب شمال کی جانب موضع بیگم پورہ ہے۔ اس جگہ پر مغلیہ دور کی یادگار عمارتوں کی کثرت ہے اور اس جگہ آثار قدیمہ والوں کے لیے بہت زیادہ دلچسپی کا سامان ہے۔ اس کو محمد شاہ کے دور حکومت میں حاکم پنجاب ذکریا خاں المعروف خان بہادر خاں کی والدہ بیگم جان نے آباد کیا تھا۔ لہٰذا اسی کے نام کی نسبت سے اسے بیگم پورہ کہا جانے لگا۔ یہ جگہ خان بہادر کے وقت میں شان و شوکت اور خوشحالی کے لحاظ سے اپنے عروج پر تھی۔ وہ اپنے اہل خانہ کے ہمراہ یہاں رہائش پذیر تھا۔ اس نے اس جگہ کو محرابی نالوں حماموں، سرائے، پرتکلف محلوں، شاندار مساجد اور تالابوں سے آراستہ و پیراستہ کر دیا تھا۔ اس کی شان و شوکت دیکھتے ہوئے اس امر واقعہ سے یہ تصور قائم ہوتا ہے کہ حاکم لاہور نے دہلی کے دربار کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور پنجاب کی ساری دولت بیس سال کے عرصہ تک (1717ء سے 1738ء) بیگم پورہ کے محلوں میں جمع ہوتی رہی اور اس دوران

پنجاب میں امن و سکون رہا۔ مسٹر تھارنٹن نے جائزہ لیا ہے کہ "صرف اس وقت تک محفوظ تھا۔ اس کے بیگم پورہ میں موجود محلوں میں اس نے نہایت دلجمعی کے ساتھ تیمور کے گھرانے کی ناکام ہوتی ہوئی اور مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کا مشاہدہ کیا۔" یہ جگہ رنجیت سنگھ کے دور حکومت میں گلاب سنگھ پوہو واندیہ کے قبضہ میں تھی۔ سکھوں نے رنجیت سنگھ کے اقتدار سنبھالنے سے قبل اور اس کے دور میں بہت سی عمارتوں کو زمیں بوس کر دیا۔ بعد میں اور برطانوی دور میں کافی عرصہ تک یہ جگہ لاہور اور اس کے گرد و نواح کی سرکاری اور نجی عمارتوں کے لیے بہترین قسم کی اینٹیں مہیا کرنے کے لیے ایک کان کی شکل میں موجود رہی۔ اب اس کے کون سے آثار باقی بچے ہیں جو اس کی سابقہ عظمت و شان و شوکت کا بین ثبوت فراہم کر سکیں؟ یہ رعب دار گزر گاہ جس کے ساتھ محرابی کمرے اور بغلی کمرے بنے ہوئے ہیں ایک وسیع و عریض صحن کی طرف کھلتی ہے، اس کے ساتھ حجروں اور دیگر عمارتوں کی قطاریں ہیں۔

مسجد خان بہادر خاں :۔ باغ کے دروازے کو محفوظ کر لیا گیا ہے۔ خان بہادر خاں کی خوبصورت مسجد اپنے حسین میناروں جن پر کانسی کا کام کیا گیا ہے اور محرابی دروازوں کے ساتھ دور سے نظر آجاتی ہے۔ درمیانی محراب کے بالائی حصہ پر سنگ مرمر کی ایک تختی نصب ہے جس پر کلمہ طیبہ درج ہے، اس کے دونوں اطراف میں عربی رسم الخط کی مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

عجلو بالصلوۃ قبل الموت   عجلو بتوبۃ قبل الفوت

ترجمہ:۔ "موت سے قبل نماز کے لیے جلدی کرو اور فوت ہونے سے قبل توبہ کے لیے جلدی کرو۔"

عظمت رفتہ کے ان آثاروں اور کھنڈروں کو دیکھنے سے بڑھ کر اور کوئی چیز اس قدر دل شکستہ اور خوفناک نہیں ہو سکتی۔ ان کو دیکھنے سے ذہن میں خیال آتا ہے کہ دنیا کی شان و شوکت کس قدر عارضی اور غیر یقینی ہے۔ یہ محل جو ایک زمانہ میں غضب ناک نادر شاہ کے حامی اور اس کی دلکش بیگمات کی رہائش گاہ تھے اور جہاں وہ ایک حاکم کی تمام شان و شوکت اور نخوت کے ساتھ بیٹھ کر حکومت کے معاملات کے متعلق، امراء اور افسروں کو احکامات دیا کرتا تھا، سب کھنڈر بن چکے ہیں اور ان ریزہ ریزہ اور وقت کی تباہی سے محفوظ رہنے والے ٹوٹے پھوٹے گنبدوں کے نیچے ایک ضعیف عورت رہتی ہے اور ہر وقت آٹے کی چکی چلاتی رہتی ہے یا ایک جولاہا اپنی کھڈی پر مصروف نظر آتا ہے۔ ایک بلند چبوترے پر خود نواب خان بہادر خاں کی اپنی قبر ہے۔

بیچارہ انسان! اس کی اب کوئی چیز باقی نہیں ہے۔ صرف راکھ ہے۔ اس کے پہلو میں اس

کے تجربہ کار، باپ عبدالصمد خان، سیف الدولہ دلیر جنگ کی قبر ہے، جو سکھوں کا زبردست دشمن سخت گیر اور مشہور بیراگی باندہ کو شکست دینے والا تھا۔ ایک دوسرے چبوترے پر مغرب کی طرف نواب کے پوتوں خواجہ عنایت اللہ بیگ، قلندر شاہ اور نواب غازی بیگ کے مزار ہیں۔ چوتھا مزار نواب غازی بیگ کی زوجہ مائی سہاگن بیگم کا اور پانچواں اس کی صاحبزادی، صاحب بیگم کا ہے۔ مسجد کی مشرقی جانب چبوترے پر دو اور مزار اس کی زوجہ باہو بیگم اور نواب خان بہادر کی والدہ بیگم جان کے ہیں۔

مقبرہ خواجہ محمودؒ:۔ اس مقبرے کا بلند و بالا گنبد بیگم پورہ کے مغرب کی طرف شالا مار باغ کی سڑک پر واقع ہے۔ "کتاب رضوانی" کے مطابق خواجہ محمود المعروف بہ حضرت ایشانؒ کا آبائی وطن بخارا تھا۔ انہوں نے شاہی مدرسے میں تعلیم حاصل کی اور ایک باکمال عالم بن گئے۔ ان کی پرہیزگاری اور ریاضت و عبادت کی شہرت دور دراز تک پھیل گئی۔ انہوں نے ہرات، کابل اور قندھار میں ہزاروں مرید بنائے۔ وہ اکبر کے دور میں کشمیر آئے اور اس کا جانشین جہانگیر انہیں آگرہ لے آیا۔ شاہجہاں کے دور حکومت میں آپ کا قیام لاہور میں تھا۔ اس بادشاہ نے عنان حکومت سنبھالنے کے بعد آپ کی خدمت میں ایک لاکھ طلائی ٹکے پیش کیے، جن کی مدد سے انہوں نے ایک نہایت شاندار باغ لگایا۔ موجودہ مقبرہ انہوں نے اپنی زندگی ہی میں تعمیر کروایا تھا۔ شاہجہاں کا وزیر، وزیر خاں ان سے بڑی عقیدت رکھتا تھا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ کی دعا سے نور جہاں کو ایک خطرناک بیماری سے شفا ہو گئی۔ نواب خان بہادر خاں کی حکومت کے دوران جب وہ یہاں بیگم پورہ میں رہائش پذیر تھا، اس وقت اس مقبرے کی مقبولیت اپنے عروج پر تھی۔ یہاں پر ہر ہفتے علماء کرام جمع ہوتے اور ناداروں اور محتاجوں میں کھانا تقسیم کیا جاتا۔ اس کے علاوہ ہر آدمی کو ایک روپیہ نقد بھی دیا جاتا۔ وہاں پر تسبیح خانے بھی بنائے گئے تھے اور مسجدیں جو اب بالکل الگ تھلگ ہیں۔ وہاں لوگوں کا جم غفیر نماز ادا کرنے کے لیے اکٹھا ہوتا تھا لیکن سکھوں کے دور میں ان جیسی تمام عمارتوں کو نظر انداز کر دیا گیا۔ وہ منبر ابھی تک موجود ہے، مسجد میں جس پر بیٹھ کر خواجہ محمودؒ وعظ کیا کرتے تھے۔ آپؒ حضرت میاں میرؒ کے ہمعصر تھے اور آپؒ سے اکثر مذہبی معاملات میں تبادلہ خیال کیا کرتے تھے۔

حلیہ شاہ بدر دیوانؒ:۔ یہ شاندار عمارت شالا مار باغ کی سڑک اور حضرت ایشانؒ کے مقبرے کے شمال میں واقع ہے اور ایک نو فٹ بلند دیوار میں گھری ہے۔ اس چار دیواری کے درمیان میں تقریباً تین فٹ بلند چبوترہ ہے۔ اس کے اوپر مربع شکل کی عمارت ہے جس پر ایک مینار ایستادہ ہے۔ اس

میں جنوب کی طرف سے واقع سیڑھی کے ذریعہ داخل ہو سکتے ہیں۔ باقی ماندہ تینوں اطراف کی دیواروں میں سنگ سرخ کی جعفری جالیاں ہیں۔ اس عمارت کو چاروں طرف سے زمین سے تین فٹ کی بلندی پر نیلے اور زرد رنگ کی روغنی منقش ٹائلوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ شمال کی طرف چینی اور روغنی منقش کام سے مزین ایک چھوٹا سا مینار ہے جو چراغ وغیرہ رکھنے کی غرض سے بنایا گیا ہے۔

شاہ بدر دیوانؒ کا مزار موضع مسانیاں تحصیل بٹالہ ضلع گورداسپور میں واقع ہے لیکن جس مقبرے کے بارے میں بات ہو رہی ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں اس بزرگ درویش نے چالیس روز تک گوشہ نشینی اختیار کر کے عبادت و ریاضت میں وقت گزارا، اسی وجہ سے یہ جگہ " چلہ بدر دیوان کہلاتی ہے۔ اس صوفی بزرگ کے مریدوں کی لاہور میں آباد اولاد نے اس مقبرے کے ارد گرد ایک چھوٹا سا باغ بھی لگوا دیا ہے۔

مقبرہ میر نعمت خاں :۔ پیر سراج الدین گیلانیؒ کے مزار کی غربی جانب موضع بھوگیوال کے جنوب میں اور شالامار باغ کی سڑک کے شمال میں مربع شکل کی ایک شاندار عمارت ہے، جس پر منقش روغنی ٹائلوں سے سجاوٹ کی گئی ہے۔ اس کو محرابوں نے سہارا دے رکھا ہے۔ محرابیں پختہ اینٹوں کے ستونوں پر کھڑی ہیں۔ پختہ اینٹوں ہی کے بنے ہوئے ایک چبوترے کے درمیان میں مزار ہے۔ گنبد کے نیچے ایک بڑا سفید مزار ہے اور اس کے پہلوؤں میں دو چھوٹی قبریں ہیں۔ سفید بڑا مزار شاہ جہاں کے زمانہ میں اس کے توپ خانہ کے کماندار، میر نعمت خاں کا ہے (45)۔ پرانے وقتوں میں باڑہ کے سید حسین علی کا ایک باغ یہاں موجود تھا۔ اس مقبرے کے جنوب میں تین گنبدوں اور تین محرابوں والی ایک بہت بڑی مسجد ہے۔ اس کے صحن میں پختہ اینٹوں کا حاشیہ لگایا گیا ہے۔ اس مسجد کو میر نعمت خاں نے تعمیر کرایا تھا۔ گنبد اور مسجد دونوں حکومت کی تحویل میں ہیں۔

مقبرہ سید سراج الدین :۔ یہ مقبرہ شالامار روڈ کے شمال میں خان خاناں کے گنبد کے مخالف سمت میں واقع ہے۔ گنبد ڈھلوانی ہے اور اس کے اوپر استعمال کیے گئے چونے کے پلستر کا رنگ امتداد زمانہ سے سیاہ پڑ چکا ہے۔ یہ عمارت مربع شکل کی ہے اور اس کے شمال مشرق اور مغرب کی دیواروں میں قدم آدم کی بلندی پر جعفری جالیاں پتھر میں بنائی گئی ہیں۔ جنوب کی طرف ایک سیڑھی کے زینوں کے ذریعے اس میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اس مقبرے کی شمالی دیوار کی اندرونی جانب سنگ مرمر کی تختی نصب ہے اور اس پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

اللہ محمدؐ ابو بکر عمر عثمان علی

ترجمہ :۔ اللہ ، محمدؐ ، ابو بکرؓ، عمرؓ، اور علیؓ

اس بزرگ کی قبر ایک تہہ خانے میں ہے۔ جنوب کی طرف سے یہ اب بالکل عیاں ہو گیا ہے۔ سید سراج الدین گیلانیؒ 10 محرم 1140 ہجری بمطابق 1727ء کو فوت ہوئے۔ مقامی اور اڑوس پڑوس کے لوگ اس صوفی بزرگ کی کرامات کے بارے میں بہت سی کہانیاں بیان کرتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس مقبرے سے رات کے وقت کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ کی آواز سنی گئی ہے۔ درحقیقت یہ مقبرہ انتہائی دلچسپی کا حامل ہے اور اس کے گرد و نواح میں واقع کثیر عمارتی آثار بہت خوبصورت اور شاندار ہیں۔

شالا مار باغ :۔ لاہور کے شمال مغربی کونے میں تین میل کے فاصلے پر شاہجہان کا مشہور و معروف و خوشنما باغ موجود ہے ، جسے شالا مار باغ کہا جاتا ہے۔ اسے پنجاب کا (ورسلیز) پیرس کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ مغلیہ شان و شوکت کی یادگار یہ عمارت مستطیل نما، متوازی الاضلاع ہے۔ اس کے گرد 1,200 قدم لمبی اور 800 قدم چوڑی پختہ اینٹوں کی دیوار ہے۔ اس کے یکے بعد دیگرے تین تختے ہیں جو ایک دوسرے سے 12 اور 15 فٹ کی بلندی تک آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ باغ کی پوری جگہ کم و بیش 80 ایکڑ پر محیط ہے۔ کافی فاصلے سے لائی گئی ایک نہر اس خوبصورت باغ کو قطع کرتی ہوئی درمیانے تختے میں موجود ایک بہت بڑے تالاب میں گرتی ہے: اس تالاب اور نہر سے 450 فوارے بلند ہوتے ہیں ، جن کا پانی بعد میں سنگ مرمر کے ایک حوض میں جمع ہوتا ہے۔ پانی کا اس قدر وافر اخراج ماحول اور آب و ہوا کو تر و تازہ رکھنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ بالائی تختے پر پختہ ستونوں کی ایک بارہ دری ہے (46)۔ یہ ہر طرف سے کھلی ہوئی ہے۔ جب اس کے سامنے فواروں کی دھاریاں چلتی ہیں تو بڑا خوشنما منظر دکھائی دیتا ہے۔ نیز نچلے تختوں پر بارہ دریوں کے سامنے سنگ مرمر کی بنی ہوئی چھوٹی تنگ پلیوں کے آگے ان کا منظر بڑا دلکش معلوم ہوتا ہے۔ درمیان میں ایک حوض ہے جس پر نہایت دلفریب منڈیر بنی ہوئی ہے اور اس میں سفید سنگ مرمر کی جھری دار منقش ڈھلوانی تختی کے اوپر سے بہتا ہوا ایک جھرنا گرتا ہے۔ اس کے نیچے پانی لہروں کی صورت میں بہتا ہوا نشیبی تالاب میں گرتا ہے۔ جب یہ پانی ایک دوسرے حوض میں گرتا ہے تو یہ باغ کے آخیر تک پہنچ جاتا ہے۔ چلتے ہوئے فوارے نہ صرف مناظر کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں بلکہ شدید گرمی کو بھی کم کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ بارہ دریاں اور دیگر عمارتیں مختلف جگہوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ محرابیں اور بارہ دریاں ، سنگ مرمر اور سنگ سرخ کی ہیں اور ان کو انتہائی دلکش انداز

میں تعمیر کیا گیا ہے۔

اس باغ میں نہایت دلفریب پھل دار درخت اور پھولوں کی جھاڑیاں کثرت سے ہیں۔ اس میں لیموں اور انار کے انتہائی خوبصورت درختوں کے جھنڈ ہیں۔ سنگترے کے درختوں پر مشتمل خیابان اپنے موسم میں بڑے بڑے وزنی پھل سے اس قدر لد جاتے ہیں کہ ان کی ٹہنیاں ٹوٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ آم کے انتہائی دلکش اور بلند و بالا درخت خوب تر و تازہ ہیں اور ان سے لذیذ پھل حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کو لاہور کی گلیوں میں بیچا جاتا ہے۔ موجودہ دور کے ایک سیاح نے اچھی رائے کا اظہار کیا ہے: "اس کے باہر چکاچوند اور گرد و غبار ہے اور اس کے اندر لہلاتا سبزہ، سفید سنگ مرمر، سرد حوض اور لہروں والا جھرنا ہے۔"

یہ باغ اب لاہور اور میاں میر کے یورپی طبقہ کے لیے دعوتوں، پکنکوں اور مختلف نوعیت کی دیگر تقریبات کا مسکن بن چکا ہے۔ ایسے موقعوں پر باغ کی روشوں کے ساتھ پھولوں کی تہیں بچھائی اور سیر گاہیں بنائی جاتی ہیں۔ فوارے چلائے جاتے ہیں اور روشوں کے اوپر بڑے دلکش انداز میں شاخوں کی محرابیں بنائی جاتی ہیں۔ آم اور سنگترے کے سرسبز درختوں کے ساتھ چراغاں کا بڑا قابل ستائش تاثر پیدا ہوتا ہے اور پانی کی سطحوں پر ان درختوں کے چمکدار عکس جب شفاف آئینوں کے بہت سے ٹکڑوں کی مانند بکھرتے ہیں جو جادوئی ماحول محسوس ہوتا ہے۔ جب یہ حویلی رنگین چراغوں اور قمقموں سے جگمگا اٹھتی ہے تو بالکل پریوں کا محل معلوم ہوتی ہے۔ درخت، جھیلیں، راستے اور سنگ مرمر کی عمارتوں کی چھتیں سب مختلف رنگوں کی روشنیوں سے ٹمٹمانے لگتے ہیں۔ غیر معمولی رنگوں اور روشنیوں کی آتشبازی کی وجہ سے باغ شعلوں کے سمندر میں تیرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

باغ کے کونوں پر سنگ سرخ کی پانچ شاندار برجیاں ہیں، جہاں سے نواحی علاقہ خاص طور پر جنوب مشرقی سمت میں واقع موضع باغبانپورہ اور پرانے کھنڈرات کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔

ان باغات یا شالا مار باغ کو شاہجہاں کے دور حکومت کے چھٹے سال میں یا (47) 1634ء میں کشمیر کے شاہی باغات کی طرز پر بادشاہ کے حکم سے خلیل اللہ خاں کے زیر انتظام بنوایا گیا۔ باغات کو سیراب کرنے کے لیے مادھو پور سے ایک نہر لائی گئی اور اس پر دو لاکھ روپے خرچ آیا۔ یہ نہری نظام کے عظیم مہندس (انجینیئر) علی مردان خاں اور ملا علاء الملک کی مشترکہ کاوش تھی۔ ان باغات اور اس کے ساتھ ملحقہ عمارات پر چھ لاکھ روپے لاگت آئی اور یہ ایک سال پانچ ماہ اور چار روز میں تعمیر کیے گئے (48)۔

ملا عبدالحمید لاہوری اپنی بہترین کتاب " بادشاہ نامہ " میں بادشاہ کی ان باغات میں پہلی مرتبہ آمد کے بارے میں مندرجہ ذیل دلچسپ تفصیلات مہیا کرتا ہے۔ "جب بادشاہ کو اس بات سے آگاہ کیا گیا کہ خلیل اللہ کے زیر انتظام تیار ہونے والا باغ مکمل ہو گیا ہے۔ شاہی نجومیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ بادشاہ کے دورہ کے لیے مبارک (وقت) گھڑی کا تعین کریں۔ لہذا بادشاہ کے دورے کے لیے 7 شعبان 1052 ہجری کی تاریخ مقرر کی گئی۔ بادشاہ نے اسی روز اپنی تشریف آوری سے باغ کو رونق بخشی اور اس کا نظارہ کر کے بہت زیادہ محظوظ ہوا۔ حکومت کے امراء اور معززین نے مبارکباد پیش کی جبکہ سب نے شاہی اقتدار کی عظمت و شان و شوکت کے لیے کی گئی دعا میں حصہ لیا۔ ذہین اور فطین اشخاص کے انبوہِ کثیر نے جنہیں بادشاہ کے روبرو پیش کیا گیا اور جنہوں نے روم عراق اور ماوراالنہر کو دیکھ رکھا تھا، بادشاہ کو آگاہ کیا کہ اس تاریخ کو اس سے قبل اس جیسا باغ کبھی تعمیر نہیں کیا گیا نہ تو کبھی دیکھا اور نہ کسی سے ذکر ہی سنا ہے۔ "عبدالحمید مزید بیان کرتا ہے کہ " اس باغ میں بہت سی عمارتیں تعمیر کی گئیں اور جب کبھی بھی بادشاہ کا جی چاہتا تو وہ دارالسلطنت لاہور میں رہنے والی شاہی حرم کی بیگمات کے ہمراہ یہاں سیر کے لیے آتا اور خیمے نصب کرنے کی ضرورت کو لازمی نہیں سمجھا جاتا تھا۔"

دوسری منزل پہ مشرق کی جانب شاہی حمام ہیں۔ یہ چار محرابی کمروں پر مشتمل ہیں ان میں حوض بھی بنائے گئے ہیں۔ ان کو مشرقی جانب ان کمروں کے باہر آگ کی مدد سے گرم کیا جا سکتا تھا۔ کمروں اور حوضوں کی مناسب طور پر دیکھ بھال اور مرمت وغیرہ کر کے ان کو مکمل طور پر محفوظ کر لیا گیا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ترکی طرز پر تعمیر کیے جانے والے ان حماموں کو گرم کرنے کے لیے سینکڑوں من ایندھن درکار ہوتا تھا۔

باغ کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ " فرح بخش " کہلاتا ہے اور دوسرا حصہ جس میں درمیان والا اور تیسرا تختہ شامل ہیں، " فیض بخش " کہلاتا ہے (49)۔

احمد شاہ کے پرآشوب دور میں سکھوں کا پنجہ استبداد اس شاندار باغ تک بھی پہنچ گیا اور انہوں نے اس کا بہت سا آرائشی پتھر لوٹ لیا۔ لاہور کے تین حاکموں میں شامل لہنہ سنگھ نے سنگ لشیب کی ایک نہایت قیمتی بارہ دری یہاں سے اکھاڑ لی اور اسے شہر میں پتھر پالش کرنے والوں کے ہاتھ 24.000 روپے میں فروخت کر دیا۔ رنجیت سنگھ نے بربریت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے پسندیدہ مذہبی دارالحکومت امرتسر کی نئی عمارات اور گوبند گڑھ کے ساتھ تعمیر کیے جانے والے قلعہ کو آراستہ کرنے کے لیے اس باغ کے زیادہ تر حصے کا نہایت قیمتی آرائشی سنگ مرمر اتار کر اسے اجاڑ

دیا۔ مرکزی حوض کے ساتھ سنگ مرمر کی بنی ہوئی بارہ دریوں کا پتھر امرتسر کے رام باغ کو سجانے میں استعمال کیا گیا اور اس کی جگہ یہاں پر اینٹوں سے چنائی کر کے سفیدی کر دی گئی۔

یہ بالکل یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس باغ کو موجودہ نام "شالا مار" کس زمانہ سے کہا جانے لگا تھا۔ ملا عبدالحمید لاہوری کی تصنیف "بادشاہ نامہ" (جس کو شاہجہاں بادشاہ کے حکم سے تحریر کیا گیا تھا) اور محمد ساقی مستعد خاں کی کتاب "مآثر عالمگیری" جسے اورنگ زیب کے جانشین شاہ عالم کے دور میں لکھا گیا تھا، میں ذکر ملتا ہے کہ اس باغ کو بادشاہ کی آمد کی وجہ سے فرح بخش کہا جانے لگا اور نادر شاہ کے مؤرخین کی کتابوں میں پہلی مرتبہ اس کے نام "شالا مار" کا ذکر ملتا ہے لیکن یہ واضح نہیں ہو سکا کہ اس کے لیے یہ نام کیوں اختیار کیا گیا؟

مقبرہ عبدالغنیؒ :۔ عبدالغنیؒ کے مزار کا گنبد شالا مار باغ اور شالا مار باغ کو جانے والی سڑک کے شمال میں موضع باغبانپورہ کے درمیان واقع ہے۔ یہ گنبد ایک بلند چبوترے پر واقع ہے اور اس کو ایک مربع شکل کی عمارت نے سہارا دے رکھا ہے۔ اصل میں اس پر نیلے رنگ کی کانسی کا کام کیا گیا تھا لیکن اس کے انتہائی قلیل آثار باقی ہیں۔ اس مقبرے کو دارا شکوہ نے تعمیر کرایا تھا۔ عبدالغنی صوفی بزرگ حضرت میاں میرؒ کے خلیفہ تھے۔

مسجد خواجہ ایاز :۔ یہ قدیم مسجد موضع باغبانپورہ کے قریب واقع ہے۔ اس کا بانی نواب علی مردان خاں کا ایک امیر خواجہ ایاز تھا۔ جب بادشاہ شاہجہاں کے حکم سے شالا مار باغ لگایا جا رہا تھا تو اس وقت یہ سرکاری عمارتوں کا نگران تھا۔ اس نے ایک باغ بھی تعمیر کرایا تھا جو ابھی تک شالا مار باغ کے مشرق میں ایک چار دیواری میں موجود ہے اور اب سندھیانوالہ سرداروں کے قبضہ میں ہے۔ مسجد کی تین محرابیں اور تین نہایت عمدہ گنبد ہیں۔ صحن میں دس گز طویل اور دس گز چوڑا ایک تالاب ہے۔ درمیانی محراب کے بالائی حصہ پر نصب سنگ مرمر کی ایک تختی پر عربی قطعات کے ہمراہ اس کے بانی کا نام بھی درج ہے :۔

بندہ درگاہ خواجہ ایاز

ترجمہ: "خدا کے آستانے کا غلام خواجہ ایاز"

فرش پختہ اینٹوں کا ہے اور دیواروں پر نقش و نگار سے آرائش کی گئی ہے۔

مقبرہ مادھو لال حسینؒ :۔ اس مشہور و معروف صوفی بزرگ کا مزار موضع باغبانپورہ کے شمال میں واقع ہے۔ ایک بلند چبوترے پر دو قبریں ہیں۔ ایک مادھو کی اور دوسری لال حسینؒ کی ہے۔ اصلی قبریں تہہ خانہ میں ہیں۔ اس چبوترے کے گرد ایک چار دیواری ہے جس میں جنوب کی طرف

دروازہ موجود ہے۔ چبوترے اور چار دیواری کے درمیان زائرین کے لیے خالی جگہ چھوڑی گئی ہے۔ اس چبوترے کے چاروں طرف سنگ سرخ کی جالیاں لگائی گئی ہیں۔ اس چار دیواری کے شمال میں ایک مینار میں قدم رسولؐ کا عکس انتہائی عقیدت و احترام کے ساتھ رکھا گیا ہے اور اس کے مغرب کی طرف ایک مسجد ہے (50)۔ " حقیقت الفقراء " کے مصنف پیر محمد کے مطابق لال حسینؒ اکبر کے دور میں یہاں آباد ہوئے۔ وہ دریائے راوی کے پار موضع شاہدرہ کے ایک برہمن لڑکے مادھو پر فریفتہ ہو گئے۔ ان کی اس لڑکے کے ساتھ بے انتہا محبت کی وجہ سے اس روز سے اس کا نام اس صوفی بزرگ کے نام کے ساتھ منسلک ہو گیا۔ مادھو مسلمان ہو گیا اور اس کا مزار بھی اپنے مذہبی پیشوا کے مزار کے ساتھ واقع ہے (51)۔ حضرت لال حسینؒ کی کرامات کے بارے میں بہت سی کہانیاں بیان کی جاتی ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی راتیں دریائے راوی میں کھڑے ہو کر قرآن پاک کے زبانی دور کر کے گزارا کرتے تھے۔ آپ 1008 ہجری بمطابق 1599ء میں فوت ہوئے اور شاہدرہ میں دفن کیے گئے۔ چند سال بعد ان کی پیش گوئی کے مطابق ان کی قبر کو دریائے راوی کا سیلاب بہا کر لے گیا۔ مادھو نے آپ کے جسد مبارک کو نکالا اور انتہائی عقیدت و احترام کے ساتھ موجودہ مقام پر دفن کیا۔

دارا شکوہ حضرت لال حسینؒ کے بارے میں لکھی گئی اپنی مشہور زمانہ تصنیف " شطحیات دارا " میں بیان کرتا ہے کہ شہزادہ سلیم اور اکبر کے حرم کی بیگمات ان کے روحانی کمالات پر یقین رکھتے تھے اور ان کی انتہائی عقیدت و احترام کرتے تھے۔ شہزادہ سلیم نے خصوصی طور پر اپنے دربار کے ایک افسر بہار خان کو اس صوفی بزرگ کی روزمرہ کی کارروائیوں کو قلمبند کرنے کے لیے مامور کیا اور یہ تصنیف جسے " بہاریہ " کہا جاتا ہے، حضرت لال حسینؒ کے بارے میں دلچسپ معلومات سے بھرپور ہے۔

بسنت اور چراغاں کے میلے :۔ لاہور کے دو عظیم میلے جنہیں بسنت اور چراغاں کہا جاتا ہے اس مزار پر منعقد ہوتے ہیں۔ لوگوں کو ابھی تک یاد ہے کہ اس جگہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں بسنت (جس کا مطلب بہار ہے) کی آمد پر کس قدر جشن اور خوشیاں منائی جاتی تھیں۔ جب عیش پسند مہاراجہ اس کے سردار اور فوجی دستوں کے علاوہ ہر کوئی زرد پوشاک میں ملبوس ہوتا تھا۔ مہاراجہ اس خانقاہ پر حاضری کے وقت 1,100 روپیہ نقد اور دو زرد شالوں کا جوڑا نذرانے کے طور پر پیش کرتا تھا۔

مسجد نواب ذکریا خاں :۔ اس خانقاہ کے غربی جانب محمد شاہ کے دور حکومت میں لاہور کے

حاکم نواب ذکریا خاں کی مسجد ہے۔ بیرونی محراب پر روغنی ٹائلوں میں نیلے حروف میں فارسی کے مندرجہ ذیل اشعار درج ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مسجد کو 1144 ہجری بمطابق 1731ء میں تعمیر کیا گیا۔

خواست در دور شاہ ملک پناہ	شاہ ہندوستان محمد شاہ
عالم و عادل و سخی زمانی	در صف معرکہ چو شیر ژیان
زیدہ بارگاہ اور نواب	ذکریا خاں صوبہ پنجاب
بد خواہش اگرچہ جمشید است	لرزہ در تن فتادہ چون بید است
نیک نام آنکہ نیک نامی او	ہمچو بوئی گل است در ہر سو
چاہ و مسجد زخود بنا کند	عالی و خوب و خوشنما بکیند
محض بسر خدا کند این کار	تا نمازی شود نماز گزار
بازہر چہ ثواب زان آید	بسوی بانیش کند عاید
یارب از فضل خود نگاہش دار	از شکستن تو در پناہش دار
کرد احداث مسجد محکم	نیز خوش دور چاہ مستحکم
نزد درگاہ صاحب عرفان	واقف سر حضرت رحمان
ان کہ معروف شد بہ لال حسین	خاک نعلین اوست سرمہ عین
کرد معمار چون بصد تدبیر	مسجد و چاہ رانکو تعمیر
سال تاریخ او چنین آمد	مسجد نیک.........

تاریخ

چو این سجدہ گہ از پئی خاص و عام
بنا یافت از سرور نیک نام
ز تاریخ او ہر کہ جوید شمار
بد اند ہزار و صد و چہل و چار

ترجمہ: ۔ ہندوستان کے بادشاہ ملک پناہ محمد شاہ کے دور میں جو عالم و عادل اور اس دور کا سخی تھا۔ حاکم پنجاب نواب ذکریا خاں جو اس کے دربار کے معززین

میں شامل ہوتا تھا اور میدان جنگ میں غضبناک شیر کی طرح لڑتا تھا، اس کا بد خواہ چاہے جمشید ہی کیوں نہ ہو، اس کے خوف سے تنکے کی طرح کانپتا تھا اور وہ اس قدر مشہور و معروف شخص تھا کہ اس کی نیک نامی کی شہرت چاروں طرف پھول کی خوشبو کی طرح پھیل گئی۔ اس نے خود اپنے روپے پیسہ سے ایک نہایت عالی شان مسجد تعمیر کرائی جو نہایت بلند و بالا، شاندار اور حسین و جمیل تھی۔ اس نے محض خدا کی خوشنودی کے لیے یہ عمارت تعمیر کرائی تاکہ نمازی یہاں نماز ادا کر سکیں اور اس کے بانی کو ثواب پہنچانے کے لیے دعائیں کریں۔ اے خدا اس پر اپنا فضل و کرم کر اور اس کو نقصان سے محفوظ رکھ۔ اس نے اس مسجد کے ساتھ ایک شاندار کنواں، اس صوفی بزرگ کے مزار کے قریب بنوایا جو اسرار خداوندی سے واقف تھے اور جو لال حسینؒ کہلاتے ہیں۔ ان کے جوتوں کی خاک آنکھوں کے لیے سرمہ ہے۔ جب معمار نے اس مسجد اور کنواں کو انتہائی مہارت سے تعمیر کیا تو اس کی تاریخ بنیاد تھی۔ اچھی مسجد (ناقابل فہم)۔

دیگر قطعہ تاریخ

یہ مسجد جو سجدہ گاہ خاص و عام ہے۔ اس کو سرور نیک نام نے تعمیر کرایا۔ جو بھی اس کی تاریخ بنیاد کے بارے میں دریافت کرنا چاہے اسے آگاہ کرو کہ یہ ایک ہزار ایک سو چوالیس ہے۔

درمیانی محراب پر یہ عبارت درج ہے:۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

افضل الذکر لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ و بہ نستعین

ترجمہ:۔ شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان و نہایت رحم والا ہے۔
افضل ذکر ہے، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور ہم اسی سے مدد چاہتے ہیں۔

مقبرہ نواب میاں خاں:۔ یہ شاندار مقبرہ موضع بھوگی وال کی غربی جانب واقع ہے۔ نواب میاں خاں، شاہجہاں کے وزیر اعظم نواب سعداللہ خاں کا بیٹا تھا۔ وہ 1082 ہجری بمطابق 1671ء عالمگیر کے دور حکومت میں فوت ہوا اور یہیں دفن ہوا۔ یہ خاندان چنیوٹ (جہاں سعد

اللہ خاں کی مسجد سیاحوں کی دلچسپی کا محور ہے) میں آباد تھا اور کیونکہ اس علاقے میں سیاہ پتھر کی افراط تھی اس لیے یہ سیاہ پتھر میاں خاں کے مقبرے اور اس باغ سے ملحقہ عمارت میں بڑی کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔ لاہور میں میاں خاں کی ان شاندار عمارات پر لاکھوں روپے لاگت آئی اور یہ مغلیہ دور کے اختتام تک بہترین حالت میں رہیں۔ رنجیت سنگھ نے ان کو قیمتی پتھر سے محروم کر دیا۔ اس باغ پر سوچیت سنگھ نے قبضہ کر لیا اور وہ اسی کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اس نے اس کے گرد چار دیواری بنوائی جو ابھی تک موجود ہے۔ ایک دور میں یہ شیخ امام الدین کے قبضہ میں رہا، جس نے شہر میں اپنی حویلی تعمیر کرنے کے لیے اس کا زیادہ تر پتھر اتار لیا۔ انگریزوں کے دور میں اس کو نواب علی رضا خاں کے پاس فروخت کر دیا اس نے اس میں کچھ اضافہ کیا۔

اس باغ کی قدیم عمارات میں ایک نہایت عمدہ گزرگاہ ہے جس کے ساتھ بہت سے محرابی کمرے، ایک بہت بڑا تالاب جس کے ساتھ ایک آبشار یا جھرنا ہے، ایک وسیع و عریض بارہ دری ہے جس کی محرابی چھت پختہ اینٹوں سے بنائی گئی ہے اور ایک دوسرے کے سامنے شاندار گنبدوں والی دو مساجد ہیں۔ ان مسجدوں کے درمیان طویل حوض پانی کے ہیں۔ شرقی جانب والی مسجد غالباً خواتین کے لیے اور غربی جانب والی مسجد حکومت کے امراء کے لیے بنائی گئی تھی۔

میاں خاں کا مزار:۔ میاں خاں کا مزار سیاہ پتھر کی ایک بارہ دری میں واقع ہے جس کے گرد سیاہ پتھر ہی کا ایک بلند چبوترہ ہے جس پر زینوں کے ذریعہ پہنچا جا سکتا ہے۔ سنگ مرمر کا تعویذ راجہ سوچیت سنگھ نے غارت کر دیا تھا لیکن مزار کا نشان ابھی تک موجود ہے۔

اس وقت تک لوگ اس جگہ کو "مشکی دے محل" یا "سیاہ محل" کہتے آئے ہیں کیونکہ ان عمارات کو کالے پتھر سے تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ جگہ نہ صرف اپنے طرز تعمیر کی خوبصورتی کی وجہ سے دلچسپی کی حامل ہے بلکہ اس علاقے کے خوبصورت و دلکش مناظر کی وجہ سے بھی ہے۔

گنبد رسول شاہیاں:۔ موضع بھوگی وال کی غربی جانب اور حلیہ شاہ بدر دیوان کے شمال مشرقی کونے میں ایک ہشت پہلو (مثمن) عمارت پر گنبد واقع ہے۔ اگرچہ اب خود گنبد امتداد زمانہ سے سیاہ معلوم ہوتا ہے لیکن محرابوں پر روغنی نقش و نگار کا کام ابھی تک موجود ہے۔ دراصل گنبد ایک بلند و بالا چبوترے پر قائم تھا اور اس کے آثار اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس چبوترے کے نیچے ایک تہہ خانہ ہے جہاں پر اس شخصیت کا جسد خاکی دفن ہے جس کی خاطر یہ عمارت بنوائی گئی۔ اس کے نام کا درست اندازہ نہیں لگایا جا سکتا لیکن گنبد "رسول شاہیوں کا مقبرہ" کہلاتا ہے کیونکہ اس فرقے کے پیروکار سکھوں کے دور میں یہاں آباد تھے۔

قدم رسولؐ :۔ نارتھ ویسٹرن ریلوے اسٹیشن کی چار دیواری میں اسٹیشن کے شمال میں زمین سے بلند مقام پر ایک گنبد موجود ہے۔ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہاں پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدم مبارک کا عکس رکھا گیا تھا اور اسی لیے مسلمان اس جگہ کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ یہاں پر اس گنبد کے ساتھ 1030 ہجری بمطابق 1620ء یا جہانگیر کے دور حکومت میں غلام رسول نامی ایک تاجر نے 7,000 ہزار روپے کی لاگت سے ایک تالاب اور کنواں (اب یہ سب مسمار ہو چکے ہیں) تعمیر کرایا۔ اس گنبد کے باہر اس جگہ کے متولی حاجی جمعیت کا مزار تھا۔ غلام رسول بھی انہی بزرگ کے مرید تھے۔ حاجی جمعیت، غلام رسول اور اس کے گرد و نواح میں واقع دیگر اشخاص کے مزارات مسمار کر دیے گئے ہیں اور گنبد محکمہ ریلوے کے حکام کے پاس فروخت کر دیا گیا ہے اور مزار کے متولیوں کی اولاد نے نشان قدم رسولؐ کو یہاں سے ہٹا دیا ہے۔

اصل میں اس گنبد کے گرد ایک چار دیواری تھی اور جنوب کی طرف ایک دروازے کے اوپر منقش روغنی ٹائلوں میں عربی زبان کا مندرجہ ذیل قطعہ درج ہے:۔

از مسعود و من مسعود الی ابنہ سالم الی ابنہ مسلم و من مسلم الی ابنہ عاقل و من عاقل الی ابنہ جوہر و من جوہر الی ابنہ باقر و من باقر الی ابنہ اسعد و من اسعد الی ابنہ نصیر و من نصیر الی ابنہ طاہر و من طاہر الی ابنہ طیب و من طیب الی ابنہ مجیب و من مجیب الی ابنہ حبیب و من حبیب الی ابنہ جمال۔

مطلب یہ ہے کہ:۔

" وہ مسعود تھا اور اس کا بیٹا سلیم، ابن مسلم ابن عقیل ابن جوہر ابن باقر ابن اسعد ابن نصیر ابن طاہر ابن طیب ابن مجیب ابن حبیب ابن جمال۔ "

اس کے اوپر حاجی جمال کا شجرہ نسب دروازے کے بالائی حصہ پر کندہ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بلاشک و شبہ اس جگہ کے حقیقی وارث (متولی) یہی ہیں۔

مشرقی جانب کے محرابی دروازے پر روغنی منقش کام میں زرد حروف میں یہ درج ہے:۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم السلام علی رسولہ محمدؐ وآلہ و اصحابہ

ترجمہ:۔ شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔
حضرت محمدؐ پر، آپ کی آل پر اور صحابہ پر اللہ کی سلامتی ہو۔

مندرجہ بالا عبارات کا ذکر چشتی کی کتاب میں ملتا ہے کیونکہ اس نے ان کو بذات خود دیکھا تھا (52)۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مقدس پتھر کو مکہ سے مسعود لے کر آیا تھا اور اس وقت

مسعود کی اولاد میں سے حاجی جمال اس گنبد کی تعمیر کے وقت اس کا متولی تھا۔ حاجی جمال نے سات مرتبہ مکہ مکرمہ کا حج ادا کیا اور اپنے مرید غلام رسول کو خواب میں یہ مقدس جگہ دکھائی۔ یہ خود بھی ایک فقیر بن گئے تھے۔ اپنے ایک قرض دار سے ملنے والی رقم سے انہوں نے یہ مقبرہ تعمیر کرایا (53)۔

ٹاہلی صاحب :۔ سکھوں کی یہ متبرک عبادتگاہ، پاگل خانہ کے جنوب میں نارتھ ویسٹرن ریلوے اسٹیشن کے قریب واقع ہے۔ ایک چار دیواری میں کئی متبرک عمارات واقع ہیں۔

سمادھ باوا سری چند :۔ ان سب میں سب سے زیادہ اہم عمارت، سکھ مذہب اور اس فرقہ کے بانی گرو نانک کے فرزند باوا سری چند کی سمادھ ہے۔ ان کے وارث نانک شاہی کہلاتے ہیں۔ انہوں نے ایک فرقہ کی بنیاد رکھی جسے اوداسی کہا جاتا ہے۔ اس فرقہ کے پیرو کار ایک لنگوٹ پہنتے اور جٹاؤں کو یا بالوں کو پگڑی کی طرح سر پر لپیٹ لیتے ہیں اور کاندھوں پر کمبل رکھتے ہیں۔ یہ سمادھ ہشت پہلو (مثمن) شکل کی ہے اور اس پر ایک گنبد ایستادہ ہے۔ اس کے جنوب کی طرف بارہ گز لمبا ایک جھنڈا نصب ہے جس کو مکمل طور پر کپڑے سے ڈھکا ہوتا ہے۔ پہلے پہل یہ سمادھ چھوٹی تھی لیکن جمنا داس مہنت نے سمت 1890 بکرمی بمطابق 1834ء اس میں توسیع کی اور اسے مزید خوبصورت بنایا۔ اس کے ساتھ ناگ دیوتا کی سمادھ ہے، اس کی بھی پرستش کی جاتی ہے۔ انہی کمروں میں سے ایک میں گرنتھ صاحب رکھی گئی ہے۔

اس کے علاوہ وہاں پر دیوان بھوانی داس پشاوریہ المعروف دیوان کُبّا کی سمادھ ہے۔ یہ وہ پہلا شخص تھا جس نے پشاور سے آنے کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ کا دفتر فارسی درست کیا اور سرکاری حسابات کا باقاعدہ نظام متعارف کرایا۔ اس جگہ کو ٹاہلی صاحب کہا جاتا ہے کیونکہ یہاں پر شیشم یا ٹاہلی کا ایک قدیم درخت ہے جس کے بارے میں خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ اس کا تعلق باوا سری چند کے زمانہ سے ہے۔ اس کی بھی پرستش کی جاتی تھی کیونکہ سکھ فرقہ کے بانی کے فرزند سے تعلق ہونے کی بناء پر اسے ان کی یادگار کے طور پر مقدس خیال کیا جاتا تھا۔

بدھو کا آوا :۔ بدھو کا بلند و بالا بھٹہ جسے بدھو کا آوا یا پزادہ کہا جاتا ہے۔ لاہور سے تین میل کے فاصلے پر شالا مار باغ کی سڑک کے جنوب میں واقع ہے۔ سدھو کا بیٹا بدھو، شاہجہان کے دور میں ظروف ساز تھا۔ سدھو جو جہانگیر کے دور میں یہاں آباد ہوا اس نے شاہی حکام کے حکم کے تحت لاہور کے گرد و نواح میں کئی بھٹے تعمیر کیے۔ مقصد یہ تھا کہ ان کی مدد سے وہ شاہی عمارات اور لاہور میں امراء کے محلوں کے لیے پکی اینٹیں مہیا کر سکے۔ بڑا مقصد ان کا یہ تھا کہ نور جہاں کے بھائی

ابوالحسن آصف جاہ کے بائیس لاکھ روپے کی لاگت سے تیار ہونے والے محل کے لیے اینٹیں دستیاب ہو سکیں۔

کہا جاتا ہے کہ بدھو کے آوے کی آگ، حضرت میاں میرؒ کے ایک مرید عبدالحق کی بد دعا کے نتیجے میں بجھ گئی۔ وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک انتہائی سرد دن میں جب موسلا دھار بارش ہو رہی تھی وہ اس بھٹے کے قریب حرارت حاصل کرنے کی غرض سے آئے لیکن بدھو کے نوکروں کی مداخلت سے انہیں روک دیا گیا۔ ان سے چونکہ فقیر کو واپس بھیجنے کی گستاخی ہو گئی تھی۔ لہٰذا فقیر نے بدھو کو بد دعا دی حالانکہ اس نے بعد میں ندامت کا اظہار کیا لیکن یہ جرم اتنا سنگین تھا کہ اس کی معافی نہیں ہو سکتی تھی۔ لہذا یہ آوا ہمیشہ کے لیے ناکارہ ہو گیا۔

اس آوے کے اوپر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ایک فرانسیسی افسر جنرل اویٹیبائل نے ایک خوبصورت بارہ دری تعمیر کرائی لیکن اب اس کا کوئی نشان باقی نہیں بچا۔ یہیں پر مہاراجہ شیر سنگھ اور راجہ ہیرا سنگھ نے اپنے اپنے دور میں لاہور کا محاصرہ کرنے کے لیے اپنے خالصہ دستوں کو اکٹھا کیا۔

گنبد خان دوراں :۔ خان دوراں کا گنبد، بدھو کے آوا یا پزادہ کے جنوب میں بھٹہ کے بالکل قریب اور دہلی دروازہ سے شالامار کو آنے والی سڑک کے جنوب میں واقع ہے۔ یہ گنبد جو پختہ اینٹوں کے ایک چبوترہ پر ایستادہ ہے، انتہائی خاص طرز تعمیر کا ہے۔ یہ عمارت مربع شکل کی ہے اور اس کے ہر طرف ایک محرابی دروازہ ہے۔ اس مربع شکل کے اوپر ہشت پہلو (مثمن) عمارت ہے، جہاں سے نکلا ہوا گنبد پوری عمارت پر سایہ فگن ہے۔ گنبد جزوی طور پر نیلے رنگ کی منقش روغنی ٹائلوں سے آراستہ ہے اور محرابوں پر مختلف رنگوں کے نقش و نگار بنائے گئے ہیں لیکن ان سجاوٹوں اور نقش و نگار کے مدھم و دھندلے نشانات ہی دکھائی دیتے ہیں۔ چوگوشہ عمارت کے بیرونی کونوں اور اس چبوترے کے ارد گرد ستونوں کے نشانات (ہر طرف سے اب بھی چھ ہی دکھائی دیتے ہیں) سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں پر محرابی چھتوں والے کمرے اس مقبرے کے چاروں طرف موجود تھے۔ یہ مقبرہ موجودہ عمارت کے مقابلہ میں حجم کے لحاظ سے بہت بڑا تھا۔

یہ گنبد خان دوراں نے اپنی بیوی کی جائے مدفون کے طور پر تعمیر کرایا تھا لیکن جب وہ خود فوت ہوا تو بعد میں اس کے بیٹے نے اس کو اس کی بیوی کے مزار کے پہلو میں دفن کیا۔ وہ 1053 ہجری بمطابق 1643ء میں فوت ہوا۔ اس کے خطابات یمین الدولہ، خان دوراں بہادر اور نصرت جنگ تھے اور وہ ست ہزاری منصب پر فائز تھا یعنی 7000 پیادہ اور 7000 گھڑسواروں کا امیر

تھا (54)۔ وہ دکن میں انتہائی دلیری سے لڑا۔ وہاں اس نے جھجر سنگھ بندیلہ کی بغاوت کو دبا دیا اور راجہ نور سنگھ دیو کو شکست دی، جس کی بیوی رانی پاربتی جنگ کے دوران خنجر سے زخمی ہو گئی تھی (55)۔

قدیم بادشاہی کنواں :۔ شالا مار باغ اور امرتسر کی طرف جانے والی ریلوے لائن کے درمیان نصف فاصلے پر اور نواب علی مردان خان کے مقبرے کے جنوب مغربی جانب ایک پرانا کنواں ایک تالاب جتنا بڑا ہے۔ یہ کنواں اتنا بڑا ہے کہ اس پر ایرانی طرز کے کئی رہٹ اکٹھے کام کر سکتے ہیں۔ پانی کی سطح سے تھوڑے فاصلے پر ایک کھڑکی دکھائی دیتی تھی جو اب بند کر دی گئی ہے جو تہہ خانہ میں اس کمرے کی طرف جاتی تھی جو ابو الحسن خاں کے مقبرے سے اس کنویں کو منسلک کرتا تھا۔ اصل میں یہ اس کے باغ سے ملحقہ تھا۔ مخدومہ بیگم کا گنبد (جو بعد میں گرا دیا گیا) اس وسیع و عریض کنویں کے بالکل قریب تھا۔

یہ گنبد منقش روغنی ٹائلوں سے آراستہ تھا اور چار محرابوں پر کھڑا تھا۔ خلاصۃ التواریخ کے مطابق مخدومہ بیگم، ادبی ذوق اور شاعرانہ ذہن کی حامل عورت تھی۔ وہ ابوالحسن خاں کی بیوی تھی (56)۔ جس کا شاندار مقبرہ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس پر دس لاکھ روپے کی لاگت آئی تھی، اس کے بالکل قریب تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں آسمانی بجلی گرنے سے اس کو جزوی طور پر نقصان پہنچالیکن اب حال ہی میں اینٹوں کے حصول کی خاطر اس کو مکمل طور پر مسمار کر دیا گیا ہے۔ یہ مقبرہ جس میں مخدومہ بیگم محو استراحت تھی، اس نے اپنی زندگی ہی میں تعمیر کرایا تھا۔ اس نے اپنے خاوند کی یادگار کے مقابلے میں اس کے احترام میں، اپنے مقبرے کو اس کے مقبرے سے چھوٹا بنوایا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اس خاتون نے اپنے بیٹے شائستہ خاں کی ہدایت کے تحت اپنے خاوند کے مزار پر قرآن پاک کی تلاوت کرنے کے لیے ایک ہزار حفاظ مقرر کیے۔ تحقیقات چشتی کے مطابق حفاظ کرام اس مزار پر حاکم لاہور خان بہادر کے زمانہ تک آتے رہے جو بذات خود کھانے پینے سے ان کی تواضع کرتا تھا۔ محمد شاہ کے دور میں حامد قاری (57) اس مقبرے سے ملحقہ خیرات خانے کا ناظم تھا۔

مقبرہ علی مردان خاں :۔ گلابی باغ کے دروازے کے بالکل سامنے شالا مار باغ کی سڑک کے بائیں جانب نہری کام کے عظیم مہندس (انجینئر) علی مردان خاں کا دلکش مقبرہ ہے۔ اس نے اس مقام پر نہر تعمیر کی جہاں پہ شہر اور ہمالیہ کے پہاڑوں کے درمیانی علاقہ کو سیراب کرنے کے لیے دریائے راوی کے پانی کا لاہور کے لیے بندوبست کیا گیا تھا۔ یہ مقبرہ جو ہشت پہلو (مثمن) شکل میں

ہے اپنی بلندی کی وجہ سے توجہ پالیتا ہے۔ اس کے گرد تین فٹ بلند ایک چبوترہ ہے، اس کو مکمل طور پر پتھروں کی قلموں اور سنگ سرخ سے مزین کیا گیا تھا لیکن سکھوں کے پنجہ استبداد نے ان کو قیمتی پتھروں سے محروم کر دیا۔ یہ مقبرہ ایک انتہائی پرتکلف باغ میں کھڑا ہے جس میں شاندار عمارتیں بنائی گئی تھیں لیکن ماسوائے ایک شکستہ دروازے کے اب اس کے کوئی آثار موجود نہیں ہیں۔ مرکزی گنبد کے نیچے تہہ خانہ ہے جہاں پنجاب کے ورسلیز جسے شالا مار باغ کہا جاتا ہے کا نقشہ بنانے والا محو استراحت ہے۔ رنجیت سنگھ کے دور حکومت میں اس مقبرہ کو مہاراجہ کی فوج کے ایک جرنیل گلاب سنگھ پاہونڈیہ نے فوجی بارود یا میگزین کے لیے استعمال کیا اور اس باغ کی گزرگاہ بتالین جسے مسار نوالی کے نام سے جانا جاتا ہے، اس کے کرنل گردت سنگھ نے نجی رہائش گاہ کے طور پر استعمال کیا۔ دروازہ وسیع و عریض ہے اور اس کو گلابی باغ کے دروازے کی طرز پر خوبصورت رنگوں کی منقش روغنی ٹائلوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ سامنے والے حصہ میں محرابیں ہیں جن پر سرخ اور سفید رنگ سے آرائش کی گئی ہے۔ محرابوں کے اوپر والے رنگ گہرے نیلے اور سفید ہیں اور اس میں زرد نقش و نگار بنائے گئے ہیں، ابھی تک نمایاں اور واضح ہیں۔

مرات الہند کے مصنف کے مطابق علی مردان خاں ایران کے صفوی بادشاہ شاہ طہماسپ کے ایک درباری امیر گنج علی خاں کا بیٹا تھا۔ 1637ء میں قندھار پر ہندوستان کے بادشاہ کا قبضہ ہو جانے کے بعد اس نے دربار میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس کی خوب آؤ بھگت کی گئی اور اسے اعلیٰ رتبے کا امیر بنا دیا گیا۔ 1639ء میں علی مردان خاں کو پنجاب کا حاکم بنایا گیا۔ اس نے کئی جنگوں میں شرکت کی اور دیگر فرائض سرانجام دیے۔ ایلفن سٹون بیان کرتا ہے کہ سرکاری عمارات کی تعمیر میں اپنی مہارت اور ذہانت کی وجہ سے اس کو عالمگیر شہرت حاصل ہو گئی۔ اس کا بین ثبوت اس کے نام کے ساتھ منسوب دہلی کی ایک نہر بھی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی شہرت مختلف تقریبات اور مواقع پر اپنے ذوق اور خوش لباسی کے اظہار کی وجہ سے بھی تھی (58)۔ یہ اولین امیر کشمیر جاتے ہوئے راستے میں 16 اپریل 1657ء کو انتقال کر گیا اور لاہور میں اپنی والدہ کے مقبرے میں دفن ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ کو اس کی موت کا بے انتہا صدمہ ہوا (59)۔

مقبرہ حامد قاری :۔ اس مقبرہ کی چار دیواری لاہور کی شرقی جانب بجادہ بدھو سے دو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ حسن عالم کے صاحبزادے حامد قاری، بادشاہ محمد شاہ کے دور میں لاہور کے ایک عظیم عالم اور مذہبی شہرت کے حامل شخص تھے۔ وہ 1071 ہجری (بمطابق 1660ء) لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ انتہائی خوبصورت اور مترنم آواز میں قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتے تھے اسی لیے

انہیں قاری کہا جاتا تھا۔ وہ لاہور میں اپنے وقت کے ایک مشہور و معروف عالم فاضل بزرگ مولوی تیمور کے شاگرد تھے۔ آپ کا انتقال 1166 ہجری بمطابق 1752ء میں ہوا۔ جس مدرسے میں وہ اپنے شاگردوں کو دینی تعلیم دیا کرتے تھے وہ ان کی خود تعمیر کردہ مسجد میں واقع تھا۔ یہ مسجد ابھی تک اپنے ایک کنویں، حماموں اور درویشوں کے حجروں سمیت موجود ہے۔ اس مسجد کی محرابوں پر مندرجہ ذیل اشعار درج ہیں جن میں اس کی تاریخ بنیاد کے بارے میں بتایا گیا ہے:۔

خداوند را شکر دارم بیاد
چہ خوش مسجد از دست مسکین نہاد
خود گفت از سال تاریخ ان
ز آفات دوران زوالش مباد

1141 ھ

ترجمہ:۔ میں نے خدا کا شکر ادا کرنا ہے۔
اس کی مہربانی سے یہ عاجز بندہ اس مسجد کو تعمیر کرنے کے قابل ہوا۔
عقل اس کے سال تاریخ کے بارے میں کہتی ہے کہ اس کو دنیا کی آفات سے کبھی زوال نہ آئے۔

آخری شعر میں 1141 ہجری بمطابق 1728ء کو اس کا سال تاریخ بتایا گیا ہے۔ حامد قاری کی تصانیف، ملفوظات اور رسالہ حرمت حقاہیں۔

مقبرہ خان خاناں:۔ یہ مقبرہ شالامار روڈ کے جنوب میں اور نواب مہابت خاں کے باغ کی جنوب مغربی جانب پختہ اینٹوں کے ایک چبوترہ پر واقع ہے۔ تاہم اب یہ انتہائی شکستہ حالت میں ہے۔ نیلے اور زرد رنگ کے روغنی منقش کام سے آراستہ گنبد ایک مربع شکل کی عمارت پر ایستادہ ہے، جس کے ہر طرف محرابی گزر گاہیں ہیں۔ اس کے دونوں طرف محرابی طاقچے ہیں۔ غلام گردشیں پختہ اینٹوں کے پشتوں پر بنی ہوئی ہیں اور یہ عمارت کا نہایت شاندار اور دلکش منظر پیش کرتی ہیں۔ یہ مقبرہ دراصل ایک باغ کے وسط میں تھا، جس کا دروازہ بعد میں کافی دیر تک موجود رہا لیکن شیرا زمیندار نے اسے حکومت سے خریدنے کے بعد مسمار کر دیا اور اب اس کا کوئی نشان باقی نہیں ہے۔

خان خاناں المعروف یمین الدولہ جو اس گنبد کے نیچے دفن ہے، دہلی کے بادشاہ محمد شاہ کے ایک وزیر نواب قمر الدین خاں کا سب سے بڑا بیٹا تھا جو کرنال میں احمد شاہ ابدالی کے ساتھ جنگ میں توپ کا گولہ لگنے سے ہلاک ہو گیا تھا (60)۔ اس کا چھوٹا بھائی نواب معین الملک تھا عرف عام

میں جو میر منو کے لقب سے جانا پہچانا جاتا تھا جس کے مقبرے کی محراب پنجاب نارتھ ویسٹرن ریلوے اسٹیشن کے قریب ہے۔ اس کو محمد شاہ کے بیٹے اور جانشین مغل بادشاہ دہلی، احمد شاہ نے خان خاناں کا خطاب دیا۔ وہ اپنی منہ بولی بہن اور خان بہادر جس کے ساتھ اس کی شادی ہوئی تھی، کے درمیان صلح کرانے کے لیے لاہور آیا لیکن 1192 ہجری بمطابق 1778ء میں انتقال کر گیا اور اسے یہیں دفن کیا گیا۔

گنبد نواب صادق خاں :- یہ گنبد شالامار روڈ کے کنارے پر جنوب کی طرف باغبانپورہ مڈل سکول کے احاطہ کے سامنے واقع ہے۔ یہ گنبد پختہ اینٹوں کے ایک چبوترہ کے وسط میں بنی مربع شکل کی عمارت پر ایستادہ ہے اور اس کے کونوں پر چھوٹے مینار ہیں۔

نواب صادق خاں کا آبائی وطن تہران تھا اور وہ نواب جعفر خاں کا والد تھا جس کے مقبرے کی بلند و بالا محراب موضع گڑھی شاہو کے مشرق میں واقع ہے۔ صادق خاں 1029 ہجری بمطابق 1619 ء کو فوت ہوا اور یہیں دفن کیا گیا۔

مقبرہ کی مشرقی جانب ایک نیا کنواں کھودا گیا ہے جو آج کل ایک فقیر قلندر شاہ کے قبضہ میں ہے جو اصل میں میرٹھ کے رہنے والے ہیں۔

مہابت خان کا باغ :- یہ چھوٹا سا انتہائی شاندار باغ جس کے گرد پختہ اینٹوں کی ایک بلند چار دیواری ہے، شالامار باغ کے مغرب میں اور موضع باغبانپورہ کے جنوب میں واقع ہے۔ قدیم دروازہ مغرب کی طرف ہے اور اس کی بالائی منزل کو بمبئی کے پارسی سوداگروں نے تعمیر کر کے اس میں اضافہ کیا ہے۔ اس وقت وہی اس کے مالک ہیں۔ نیا دروازہ شمال کی طرف ہے۔ مشرق اور جنوب کی طرف پختہ اینٹوں کے کمرے اور دیوان تعمیر کیے گئے ہیں۔ جنوب میں ایک چھوٹی سی مسجد بھی ہے جس کے صحن میں پانی کا حوض ہے۔ نیز ایک کنواں بھی ہے تاہم اب یہ کارآمد نہیں ہے۔

یہ باغ مہابت خاں المعروف خان خاناں، یمین الدولہ نے تعمیر کرایا۔ اس کا اصل نام زمانہ بیگ تھا اور وہ کابل کے غیور بیگ کا بیٹا تھا۔ جہانگیر اپنی تزک میں اس کے بارے میں لکھتا ہے "زمانہ بیگ ولد غیور بیگ، احدی (محافظ سے مستثنیٰ) کے طور پر میری خدمت کر کے (جب میں ابھی تک ولی عہد تھا) 500 کا منصب حاصل کر چکا تھا۔ اب وہ (میرے تخت و تاج سنبھالنے کے بعد) مہابت خاں کا لقب حاصل کر چکا ہے اور اسے 1000 اور 500 کا منصب عطا کر کے اہل خانہ کا مشاہر مقرر کیا گیا ہے۔

جہانگیر کے دور حکومت کے 17 ویں سال میں اسے ہندوستانی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا گیا

اور سات ہزاری منصب عطا کر کے اسے شاہ جہاں کے مقابلے پر روانہ کیا گیا جس کو اس نے الہ آباد کے قریب شکست دی۔ نور جہاں جس نے اپنے داماد شہریار کے مفاد کے لیے شاہجہاں کے خلاف خود مہابت خاں کا انتخاب کیا تھا، وہ مہابت خاں کی طاقت کی وجہ سے اس سے حسد کرنے لگی لیکن موخرالذکر نے بادشاہ کی بیوی کو گرفتار کر لیا۔ یہ ملکہ بھی اپنے بادشاہ خاوند کے ساتھ قید میں رہی لیکن آخر کار اس کی رہائی کے لیے تیار کی جانے والی سازش میں کامیاب ہو گئی۔ ان کارروائیوں کے بعد مہابت خاں کو دکن کا حاکم بنا کر روانہ کیا گیا جہاں اس نے دولت آباد کا محاصرہ کیا اور بعد میں قبضہ کر لیا۔

مہابت خاں 1634ء میں فوت ہوا۔ موت کے وقت وہ فوجی انتظامیہ کا سربراہ تھا اور اس کو خان خاناں کا لقب ملا ہوا تھا۔ شاہجہاں نے مہابت خاں کے سب سے بڑے صاحبزادے کو آسائش دی، جسے آخر کار کابل کا حاکم بنا دیا گیا اور اسے اس کے والد کا خطاب عطا کیا گیا (61)۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے یہ باغ فقیر عزیز الدین کو دے دیا جنہوں نے اس کی خوب دیکھ بھال کی۔ اپنے انتقال کے وقت ان کے وارث فقیر چراغ الدین نے اسے پارسی سوداگروں، جہانگیری اینڈ کمپنی کے پاس فروخت کر دیا جنہوں نے اس کو نظر انداز کر دیا ہے (62)۔

مزار میاں وڈا :۔ شیخ محمد اسماعیل المعروف میاں وڈا کا وسیع و عریض مقبرہ شالامار باغ سے ایک میل کے فاصلے پر جنوب کی طرف واقع ہے۔ انہوں نے اکبر کے دور میں 1008 ہجری بمطابق 1599ء میں اس کے ساتھ ایک مدرسہ تعمیر کرایا۔ یہ مدرسہ قرآن پاک کی تعلیم دینے کی غرض سے تعمیر کرایا گیا۔ یہاں پر فقیروں کے قیام کے لیے بے شمار حجرے اور ایک مسجد بھی ہے۔ محمد اسماعیل کے والد فتح اللہ تھے۔ ان کے والد عبداللہ ولد سرفراز خاں تھے وہ 995 ہجری بمطابق 1586ء میں پیدا ہوئے اور چناب کے کنارے پر واقع لنگر مخدوم کے مخدوم عبدالکریم کے مرید ہو گئے۔ وہ ایک عظیم عالم و فاضل شخصیت بن گئے۔ انہوں نے لاہور کے نواحی علاقہ محلہ تیل پورہ میں اپنا مدرسہ کھولا۔ انہوں نے علم الکلام فقہ، حدیث اور تفسیر کی تعلیم دی۔ ہزاروں لوگوں نے اس ادارے سے فیض حاصل کیا۔ بحیثیت ایک مذہبی استاد اور معلم اخلاق ان کی شہرت دور دراز تک پھیل گئی۔ آپ 1095 ہجری بمطابق 1683ء اورنگ زیب کے دور میں پورے سو برس کی عمر میں فوت ہوئے۔ ان کی خواہش کے مطابق ان کے مزار کے اوپر گنبد تعمیر نہیں کیا گیا۔ اورنگ زیب نے اس ادارے کی دیکھ بھال کے لیے کافی زیادہ زمین وقف کر دی۔ یہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور حکومت میں آباد ہوئی کیونکہ کئی سکھ سردار اس میں دلچسپی لیتے تھے۔ مرحوم سرکاری ٹھیکیدار

محمد سلطان جس کا نام ایک ماہر تعمیرات اور دہلی دروازے کے باہر تعمیر کردہ سرائے کے بانی کے طور پر کافی عرصہ تک یاد رکھا جائے گا، اس نے رکھ جلو میں سے کافی زمین اس مدرسہ کی دیکھ بھال کے لیے عطیہ کے طور پر دی جو ابھی تک درویشوں کی ایک بہت بڑی تعداد اور نابینا افراد کی دیکھ بھال کر رہا تھا اور یہ سب یہاں قرآن پاک کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ جنوبی دروازے پر مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ درج ہے:۔

شنو تاریخ ان دریاے معنی
کہ عمرش گشت در عشق خدا صرف
دل و جان کرد قربان الہی
کہ اسماعیل ثانی بود بے حرف

ترجمہ: ۔ یہ تاریخ (انتقال کی) دریائے معنی کی ہے۔انہوں نے اپنی تمام عمر خدا کی محبت میں بسر کی۔ اور اس کے لیے اپنے دل و جاں قربان کر کے بلاشبہ اسماعیل ثانی بن گئے۔

نولکھا :۔ نارتھ ویسٹرن ریلوے اسٹیشن کے شمال میں ایک علاقہ ہے جو نولکھا کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جہاں پر انگریز معززین جو زیادہ تر محکمہ ریلوے کے ملازمین ہیں ان کے گھر ہیں یہاں پر ایک زمانہ میں، ہمایوں کے بھائی شہزادہ کامران (جو اس وقت حاکم لاہور تھا) کے آباد کردہ محل اور باغات ہوا کرتے تھے۔ شہزادہ نے اولیت لاہور میں عمارتوں کو آراستہ کرنے پر دی۔ اس نے ایک شاندار محل تعمیر کرایا جو نولکھا کے نواحی علاقوں سے دریائے راوی تک پھیلا ہوا تھا جو ایک زمانے میں شہر کی فصیل کے نیچے بہتا تھا۔ بعد میں محل پر آصف خاں نے قبضہ کر لیا۔ اس باغ کے دروازوں میں سے ایک جس کو روغنی منقش کام سے آراستہ کیا گیا تھا کافی دیر تک قائم رہا لیکن اس کو اب مسمار کر دیا گیا ہے۔

یہ جگہ اس لیے نولکھا کہلاتی ہے کیونکہ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے بانی نے یہاں موجود عمارتوں کی تعمیر پر نو لاکھ روپے خرچ کیے تھے۔ نولکھا کی حدود میں ایک ایسے واقعہ نے جنم لیا جو پنجاب کی تاریخ میں کسی طرح بھی کم اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ یعنی 1849ء میں یہاں قدیم "لاہور کرونیکل" انگریزی پریس اور مجلہ قائم کیا گیا (63)۔

گنبد محمود شاہ :۔ شیخ محمود شاہ کا گنبد پرانے شالامار روڈ کے دائیں جانب اور شمال میں گھوڑے شاہ کے مقبرے کے بالکل سامنے واقع ہے۔ شیخ کے لاہور اور امرتسر میں بہت سے مرید تھے اور ان کا

انتقال لاہور میں 17 جمادی الاول 1283 ہجری (1866ء) میں ہوا۔ گنبد کے فرش کے نیچے ایک تہہ خانہ ہے جہاں مشہور زمانہ شیخ کا جسد خاکی دفن ہے۔ اس گنبد کو ان کی زندگی میں ان کے مریدوں نے تعمیر کرایا اور ان کے انتقال کے بعد تابوت کو زمین میں دفن کر دیا گیا۔ گنبد کے جنوب میں اسی طرح کے صحن میں ایک بہت بڑی مسجد ہے جس میں ایک وسیع و عریض صحن اور کنواں ہے۔ یہ ایک قدیم مسجد تھی لیکن اس کو محمود شاہ کے مریدوں نے مرمت کرا دیا ہے۔

مزار گھوڑے شاہ :۔ گھوڑے شاہ کا مزار، پرانے شالامار روڈ پر محمود شاہ کے مزار کے سامنے واقع ہے۔ ان کا اصل نام بہاؤ الدین تھا اور وہ بخاری سید تھے۔ ان کے دادا سید عثمان، اچ سے آکر لاہور میں آباد ہوگئے۔ فالج کی تکلیف کے باعث ان کے ہاتھ اور پاؤں کانپتے تھے۔ لہذا اسی وجہ سے انہیں " جھولن شاہ " کہا جانے لگا(64)۔ ان کا مزار قلعہ لاہور میں واقع ہے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے محمود شاہ، سجادہ نشین بنے۔ مؤخرالذکر کے ایک صاحبزادے بہاؤ الدین تھے جن کو ان کے دادا کے بعد جھولن شاہ کے لقب سے پکارا جانے لگا۔ اس جھولن کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ یہ پیدائشی ولی تھے۔ جب وہ ابھی بچے تھے اور عمر مبارک پانچ سال تھی تو ان میں ایک گھڑ سوار کی مہارت ظاہر ہونے لگی۔ انہیں گھڑ سواری کا بہت شوق تھا۔ کوئی مرید انہیں گھوڑا پیش کر دیتا اور اس پیدائشی ولی سے حسب خواہش مراد حاصل کر لیتا۔ گھوڑوں کے بارے میں ان کا شوق اس حد تک بڑھ گیا کہ کوئی آدمی انہیں چاہے گھوڑے کی شکل کا کھلونا ہی دے دیتا تو اپنی مراد پا لیتا۔ جب سید محمود کو اپنے بچے کی بزرگانہ روحانی طاقت کے بے دریغ اظہار کی اطلاع ملی تو وہ بہت ناراض ہوئے اور انہیں اپنے پاس بلا کر اتنی کم عمر میں اسرار کائنات اور قدرت کے عجائبات کو آشکار کرنے کی جرأت پر سخت سرزنش کی۔ سید محمود نے انہیں بد دعا دی اور بے چارے جھولن اسی وقت فوت ہوگئے۔ وہ صرف پانچ سال تک زندہ رہے اور اس جگہ دفن ہوئے جہاں ان کا مزار موجود ہے۔ اس کے ساتھ ایک مسجد، کنواں اور حجرے موجود ہیں۔ لوگ اس مزار پر گھوڑے کی شکل کے کھلونے نذرانے کے طور پر پیش کرتے ہیں جو چار دیواری کے ساتھ ڈھیر کی صورت میں ہزاروں کی تعداد میں پڑے ہوتے ہیں۔ یہ بزرگ لڑکا ربیع الاول 1003 ہجری بمطابق 1594 ء میں فوت ہوا۔ اس مزار پر ایک سالانہ عرس منعقد ہوتا ہے۔

مزار شاہ بلاولؒ : حضرت شاہ بلاولؒ کا مزار لاہور سے ایک کوس کے فاصلے پر مشرق کی جانب راجہ دینا ناتھ کے باغ کے قریب واقع ہے۔ ان کا جسد مبارک دراصل دریائے راوی کے کنارے ایک بلند و بالا گنبد کے نیچے دفن تھا(65)۔ لیکن دریائے راوی میں سیلاب آجانے کے باعث وہ

چار دیواری کی ایک دیوار بہا کر لے گیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے حکم دیا کہ ان کا جسد مبارک یہاں سے نکال کر کسی اور بہتر جگہ دفن کر دیا جائے۔ فقیر عزیز الدین کو یہ فرض سونپا گیا اور لوگوں نے وفات کو دو صدیاں گزر جانے کے بعد اس صوفی بزرگ کے جنازہ میں ہزاروں کی تعداد میں شرکت کی۔ دیکھا گیا کہ جسد خاکی کے تابوت پر لوہے کی ہک لگی ہوئی ہے اور اس کے ساتھ اسی دھات کی زنجیر بندھی ہوئی ہے۔ جب اسے کھولا گیا تو جسد مبارک بالکل درست حالت میں تھا۔ رائے کنہیا لال کا مشاہدہ ہے کہ "نعش کی رنگت ہرگز نہیں بدلی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص اسی وقت فوت ہوا ہے۔ مسلمانوں نے اس ولی اللہ کی نماز جنازہ پڑھنے کے بعد اس صندوق کو موجودہ جگہ دفن کر دیا۔" (66)

شاہ بلاولؒ لاہور سے 12 کوس کے فاصلے پر واقع شیخوپورہ کے رہنے والے تھے اور ستر سال کی عمر میں ان کا انتقال لاہور میں ہوا، جہاں وہ 1046 ہجری بمطابق 1636ء میں آباد ہو گئے تھے۔ اس صوفی بزرگ کی حیات کے کارناموں پر لکھی گئی کتاب "محبوب الواصلین" کے مطابق ان کے آباؤ اجداد ہرات کے باشندے تھے اور ان کے والد سید عثمان اور دادا سید عیسیٰ کو ہمایوں اس وقت اپنے ساتھ پنجاب میں لے کر آیا جب اس نے ایران کے بادشاہ شاہ طہماسپ کی فوجوں کی مدد سے ہندوستان کو دوبارہ فتح کر لیا تھا۔ شیخوپورہ کا قلعہ اور اس کا ملحقہ علاقہ سید کو جاگیر میں دے دیا گیا۔ شاہ بلاولؒ لاہور میں آباد ہونے کے بعد شیخ شمس الدین قادری کے مرید اور مولوی ابوالفتح کے استاد بن گئے۔

وہ اپنی بزرگی، پرہیزگاری اور علم و فضل کے باعث پورے علاقے میں مشہور ہو گئے اور اسی وجہ سے ان کے بے شمار مرید ہو گئے۔ وہ اکثر یہ مندرجہ ذیل شعر دہرایا کرتے تھے:۔

زندگی مقصود بہر بند گیست
زندگی بے بندگی شرمندگیست

مطلب یہ کہ "زندگی کا مقصد بندگی کرنا ہے اور زندگی جس میں بندگی نہ کی جائے شرمندگی کا باعث ہے۔"

لڑکپن میں وہ اکثر "نام حق" کا یہ مندرجہ ذیل شعر پڑھا کرتے تھے:۔

یا الہیٰ بدہ توفیقم
راہ بنما بسوئے تحقیقم

ترجمہ:۔ اے اللہ تو مجھے اپنی توفیق عطا کر

اور سیدھے راستے پر میری رہنمائی کر۔

شاہ جہاں اپنے آبائی شہر لاہور میں قیام کے دوران حضرت شاہ بلاولؒ کے پاس مسلسل حاضری دیا کرتا تھا اور ان کا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔ اس صوفی بزرگ نے ایک بہت بڑے خیرات خانے کا بندوبست کیا ہوا تھا اور ہزاروں ضرورت مند لوگ ہر روز ان کی سخاوت اور دریا دلی سے فیض یاب ہوتے تھے۔

گنبد پرویز :۔ موضع خواجہ سعید کے مغرب میں ایک بلند و بالا گنبد ہے۔ یہ سرسبز و شاداب کھیتوں کے درمیان قد آدم کے برابر بلند ہشت پہلو (مثمن) چبوترے پر بنے ایک اور مدور چبوترے پر نمایاں جگہ پر ایستادہ ہے۔ یہ گنبد مثمن شکل کی عمارت پر انتہائی شان کے ساتھ بلند دکھائی دیتا ہے جس کے ساتھ محرابیں بنی ہوئی ہیں۔ اس کو سنگ مرمر اور دیگر قیمتی پتھروں سے آراستہ کیا گیا تھا لیکن رنجیت سنگھ نے اس کو قیمتی پتھروں سے محروم کر دیا اور یہ سب امرتسر میں دربار صاحب کو آراستہ کرنے کے لیے لے گیا۔

شاہجہاں کے دور میں یہاں ایک بازار قائم کیا گیا تھا جس کو پرویز آباد کہا جاتا تھا۔ قدیم باشندے ابھی تک اس جگہ کو پرویز آباد کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ گنبد جہانگیر کے دوسرے بیٹے شہزادہ پرویز کے مقبرہ کے نام سے مشہور ہے۔ چشتی اور مفتی غلام سرور دونوں اس کو اسی شہزادے سے منسوب کرتے ہیں لیکن پرویز 1036 ہجری بمطابق 1626ء میں برھان پور دکن میں ہذیان کے مرض سے فوت ہوا۔ بادشاہ نے کابل میں یہ خبر اپنی وفاشعار بیوی نور جہاں کی کوششوں سے قید سے رہائی کے وقت سنی اور شاہجہاں کے تخت و تاج کا وارث بننے کے امکانات روشن ہو گئے (67)۔

اس حقیقت کا جائزہ لینے کے بعد میرا خیال ہے غالباً یہ جگہ جس کو ابھی تک پرویز آباد کہا جاتا ہے، پرویز کے دو بیٹوں کی جائے مدفون ہے۔ ہمیں آگاہ کیا گیا ہے کہ ان شہزادوں کو دیگر شاہی خاندان کے شہزادگان کے ساتھ لاہور میں شاہجہاں کے برسراقتدار آنے کے بعد اس کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔ ان کی نعشوں کو لاہور میں ایک باغ میں دفن کر دیا گیا (68)۔

گنبد احمد علی شاہ :۔ یہ گنبد موضع خواجہ سعید کے مغرب میں ایک مسافر خانہ میں واقع ہے جو مستان کا تکیہ (69)، کے نام سے مشہور ہے۔ اس گنبد کے نیچے شہزادہ پرویز کے مہاوت احمد علی شاہ کا جسد خاکی محو خواب ہے۔ مسلمان بادشاہوں اور شہزادوں کی یہ عادت تھی کہ وہ اپنے مہاوت کے لیے سید ہی کا انتخاب کرتے تھے۔ حضرت علیؓ کی اولاد کے احترام و عقیدت کے باعث شہزادے کے

آگے سید کے سوا کسی اور ذات کا شخص نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

حجرہ میر مہدی :۔ موضع خواجہ سعید کے شمال مغربی جانب گاؤں کے بالکل قریب گنبد پرویز اور مزار احمد علی شاہ کے درمیان ایک بلند چبوترہ ہے جس پر میر مہدی کی قبر اور مسجد ہے۔ اس چبوترے پر اور بھی کئی قبور ہیں لیکن جنوب کی طرف سب سے بڑی قبر میر مہدی کی ہے۔ مسجد کی مغرب کی طرف صرف ایک ہی بلند و بالا محراب ہے۔ اس کے اوپر ابھرے ہوئے حروف میں کلمہ اور مندرجہ ذیل عربی قطعہ درج ہے :۔

اللھم صلی علی محمد و علی آل محمد بعدد من قعد و قام

ترجمہ :۔ اے اللہ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور آپ کی آل پر رحمت بھیج اس وقت تک جب تک تیری مخلوق زندہ ہے۔

پہلے اس جگہ کو گاؤں اور اس کے مضافات کے لوگ عید گاہ کے طور پر استعمال کرتے تھے لیکن اب ویران ہو گئی ہے۔

کوئی بھی میر مہدی کے حالات کے بارے میں نہیں جانتا لیکن مسجد کی محراب انتہائی خوبصورت ہے اور اس پر گلکاری کے کام نے اس کی خوبصورتی اور شان و شوکت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ یہ عمارت واضح طور پر اولین مسلمان بادشاہوں کے دور سے تعلق رکھتی ہے۔

خواجہ سعید کی صاحبزادی کا گنبد :۔ موضع خواجہ سعید کی شمال مغربی جانب ایک بلند چبوترے پر مربع شکل کا گنبد ہے۔ اس گنبد کو سہارا دینے والی دیواروں کے ہر طرف سنگ سرخ کی جالیاں تھیں جن کے کچھ حصے ابھی تک موجود ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ پورے گنبد پر پتھر لگائے گئے تھے لیکن سکھ انتہائی بے دردی سے انہیں اکھاڑ کر لے گئے۔ اس گنبد کے نیچے ایک پکا مزار ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ خواجہ سعید کی صاحبزادی کی قبر ہے، جن کے نام سے اس گاؤں کو پکارا جاتا ہے۔

شہید گنج :۔ شہید گنج دہلی دروازہ کے باہر لنڈا بازار کے مشرق میں سلطان کی سرائے کے قریب واقع ہے۔ اس جگہ کا اصل نام گھوڑا نخاس یا (گھوڑوں کی منڈی) تھا۔ لیکن جب یحییٰ خاں کے دور حکومت میں دیوان لکھپت رائے نے ایمن آباد کے قریب سکھ باغیوں کو اپنے بھائی جسپت رائے کی موت کا بدلہ لینے کے لیے عبرتناک سزا دی اور اپنے ساتھ بہت سے قیدیوں کو لاہور لے آیا اور ان کے سر انتہائی بے دردی سے بلا ندامت اڑا دیے گئے۔ اس واقعہ کی یاد میں اس جگہ کو شہید گنج کہا جاتا تھا۔ شہید اعظم، بھائی تارو سنگھ تھا۔ حالانکہ اس کو اس شرط پر معافی کی پیشکش کر دی گئی تھی کہ اگر

وہ گرو کا مذہب چھوڑ دے اور پیغمبرؐ کا دین اختیار کر لے تو اسے چھوڑ دیا جائے گا لیکن اس نے ارتداد پر موت کو ترجیح دی۔ اس کو پرتشدد طریقے سے قتل کیا گیا۔ سکھوں نے اس کی یاد میں ایک سمادھ تعمیر کرادی۔ ایک اور سمادھ اس جگہ کی نشاندہی کرتی ہے جہاں بھائی دھنہ سنگھ کو قتل کیا گیا تھا۔ سکھوں کی قتل گاہ کا، ایک گنبد کی وجہ سے پتہ چلتا ہے جس پر ایک سنہری کلس موجود ہے۔ اس جگہ ان سب کی لاشوں کو دفن کیا گیا تھا۔ اس عمارت کے ساتھ کمرے، حجرے اور ایک گوردوارہ بھی بنایا گیا ہے اور سکھ اس جگہ کا بہت احترام کرتے ہیں۔ سڑک کے ساتھ والے ایک کمرے میں تلنبے کے ایک بہت بڑے برتن میں بھنگ سے تیار شدہ محلول کو بھرا جاتا ہے اور اسے سکھ مذہب کے پیروکاروں میں بلامعاوضہ تقسیم کر دیا جاتا ہے۔

اسی چار دیواری میں بھائی مانی سنگھ اور بھائی گلزار سنگھ کی سمادھیں بھی ہیں۔ دونوں گورو گوبند سنگھ کے وفادار پیروکار اور خدمت گزار تھے۔ مانی سنگھ پنجابی زبان کا شاعر تھا۔ اس نے گوبند سنگھ کی گرنتھ کو خوبصورت منظوم شکل میں مرتب کیا۔ وہ دونوں آنند پور، مکھو وال کے رہنے والے تھے جہاں گرو عموماً قیام کرتے تھے اور جب وہ دربار صاحب امرتسر میں حاضری کے لیے آئے تو انہیں بادشاہ کے افسروں نے گرفتار کر لیا اور لاہور لے آئے جہاں انہیں میر منو کے دور حکومت میں 5 صفر 1140 ہجری بمطابق 1727ء سرعام پھانسی دے دی گئی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ شہیدوں کے اس مقام کی بہت زیادہ عقیدت و احترام کرتا تھا۔ اس کی یہ عادت تھی کہ وہ اس جگہ حاضری دیتا تھا۔ اس نے اس کی دیکھ بھال کے لیے لاہور اور امرتسر کے اضلاع میں زمین کے عطیات دیے۔ یہ روزانہ کا عمل تھا کہ رنجیت سنگھ کے تکیے کے نیچے ہر رات سو روپے رکھے جاتے تھے جن کو بھائی رام سنگھ کے ذریعے ہر صبح ضرورت مندوں میں خیرات کے طور پر تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اس سو روپے میں سے روزانہ پانچ روپے شہید گنج میں بھنگ پر آنے والی لاگت میں حصہ ڈالنے کے لیے بھیجے جاتے تھے اور اس میں اضافی طور پر مہاراجہ 25 روپے خیرات خانے کے لیے بھیجتا تھا۔

مقبرہ میر منو :۔ پنجاب پر احمد شاہ درانی کے حملہ کے دوران لاہور کے حاکم میر معین الملک جسے عام طور پر میر منو کہا جاتا ہے اور اس کا مقبرہ ریلوے اسٹیشن کے قریب شہید گنج میں واقع ہے، نے سکھوں سے انتہائی سخت سلوک کیا۔ اسی لیے وہ اسے بڑی نفرت سے یاد کرتے ہیں۔ راجہ ہیرا سنگھ کی وزارت کے دوران سکھوں نے سنیاسی فقیر کی مہیا کردہ معلومات پر اس تہہ خانے کو کھولا جہاں میر منو دفن ہے۔ ان کو اس بات کا یقین تھا کہ مرحوم کی نعش ایک سونے کے صندوق میں رکھی گئی

ہے لیکن انہیں انتہائی مایوسی ہوئی کیونکہ وہاں جلی ہوئی اینٹوں کے علاوہ کچھ نہیں ملا۔ لاہور کے ایک زمانہ میں دہشتناک حکمران کی آخری آرام گاہ پر اس وقت شراب کے سوداگروں کا قبضہ ہے۔ ان کی کمپنی کا نام نمایاں طور پر وہاں نصب ایک بہت بڑے بورڈ پر درج ہے (70)۔ اس عمارت کے بارہ محرابی دروازے ہیں۔ تاہم ان میں سے اب گیارہ بند ہو چکے ہیں۔ مرکزی گنبد ابھی تک موجود ہے اور اسی طرح چند محرابی کمرے بھی موجود ہیں۔

مسجد دائی انگہ :- انگہ بادشاہ شاہجہاں کی دایہ تھی۔ اس کے نام سے منسوب مسجد پنجاب ناردرن سٹیٹ ریلوے اسٹیشن پر واقع ہے۔ یہ ایک انتہائی شاندار مسجد ہے اور اس کو " لاہور کرونیکل " اخبار اور پریس کے آنجہانی مدیر مسٹر ہنری کوپ نے نجی رہائش گاہ کے طور پر استعمال کیا۔ انہوں نے اس کو 12،000 روپے کے عوض سابقہ پنجاب اینڈ دہلی ریلوے کمپنی کے پاس فروخت کر دیا۔ جب محکمہ ریلوے براہ راست حکومت کے زیر انتظام آیا تو یہ جگہ حکومت کی تحویل میں آ گئی اور اس میں قابل ذکر ترامیم کی گئیں۔ اب یہ عمارت پنجاب ناردرن سٹیٹ ریلوے کے ٹریفک مینیجر کے دفتر کے طور پر استعمال ہو رہی ہے۔ مسجد کے میناروں میں سے دو ابھی تک کھڑے ہیں۔ ان پر کانسی میں روغنی منقش کام کیا گیا ہے۔ اس مسجد کے گنبد بصلہ نما ہیں۔ دیواروں کی اندرونی جانب زرد رنگ میں خوبصورت منقش روغنی کام کے ساتھ قرآن پاک کی آیات لکھی گئی ہیں۔

اردو میں انگہ کا مطلب دایہ ہے۔ انگہ کا اصل نام زیب النساء تھا۔ وہ ایک مغل مراد خاں کی بیوی تھی، جو جہانگیر کے دور حکومت میں بیکانیر کا عدالتی (مجسٹریٹ) تھا۔ اس کا ایک بیٹا محمد رشید خاں تھا جو اس زمانے میں ایک بہترین تیر انداز تھا۔ وہ دارا شکوہ کے خلاف ایک کارروائی میں ہلاک ہو گیا۔ انگہ نے اپنی ضعیف العمری میں حج کرنے کے لیے مکہ جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ لہذا شاہجہاں نے فریضہ حج ادا کرنے کے لیے اسے بہت سی سہولیات بہم پہنچائیں۔ ہندوستان سے روانہ ہونے سے قبل اس نے شاہجہاں کے دور حکومت کے آٹھویں سال 1045 ہجری بمطابق 1635ء یہ مسجد تعمیر کرائی۔ یہ مغلیہ دور میں تعمیر کی جانے والی مساجد میں سے انتہائی منفرد مسجد تھی اور اس کی وسیع و عریض زمینوں سے حاصل ہونے والی آمدنی اس کے بانی نے وصیت کے مطابق اس کے نام لگا دی تھی تاکہ کافی عرصہ تک اس عبادت گاہ کو آباد رکھا جائے اور اس کی دیکھ بھال کی جاتی رہے۔ رنجیت سنگھ نے برسراقتدار آنے کے بعد اس کو بارود خانہ (میگزین پاؤڈر) کے طور پر استعمال کیا اور اس کے علاوہ اس نے بہت سی مساجد اور مقبروں کو بھی اسی مقصد کے لیے استعمال

کیا۔ آخرکار مسٹر کوپ نے پنجاب کے الحاق کے بعد برطانوی حکام کی اجازت سے اس کو اپنی رہائش گاہ کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اس مسجد کی اندرونی دیواروں پر کانسی کا کام بہت خوبصورت ہے اور روغنی ٹائلوں کا بہترین نمونہ ہے۔ نمایاں عربی رسم الخط میں قرآنی آیات انتہائی مہارت سے لکھی گئی ہیں۔ مرکزی دیوان (کمرہ) میں سب سے اوپر عربی زبان میں کلمہ طیبہ درج ہے:۔

لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ

ترجمہ:۔ کوئی معبود نہیں مگر اللہ اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔

اس کے نیچے یہ قطعہ درج ہے:۔

اللہ، محمدؐ، ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، حسنؓ، حسینؓ

غربی دیوان کے بغلی کمرہ کے دائیں جانب اور مرکزی دیوان کے جنوب میں یہ درج ہے:۔

باہتمام خود مقبول باتمام رسیدہ

مقبول کی ذاتی نگرانی کے تحت مکمل ہوئی۔

بائیں جانب یہ درج ہے:۔

کتبہ ابراہیم سنہ 1045

تحریر کردہ ابراہیم 1045

مقبرہ مولوی نظام الدینؒ:۔ یہ نفیس مقبرہ (71) موضع شاہو کی گڑھی کے مغرب میں دہلی دروازہ سے حضرت میاں میرؒ کے مزار کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے پر ایک بلند جگہ پر واقع ہے۔ اس کا شاندار گنبد مربع شکل کی عمارت پر ایستادہ ہے اور اس کے ہر طرف تین تین محرابی دروازے ہیں۔ درمیان والا بڑا ہے اور بغلی چھوٹے ہیں۔

مقبرہ کی مخالف جانب مغرب کی طرف (پختہ شکل میں) ایک چبوترے کے کھنڈرات ہیں (72)۔ جس پر مولوی نظام الدینؒ کی ایک مرید مائی معصومہ کا مزار تھا۔ مقبرہ کی شرقی جانب تین فٹ بلند ایک چبوترہ تھا۔ اس کے ساتھ تہہ خانے تھے۔ ان میں سے ایک میں مولوی صاحب کی ایک کنیز مسمات خیر قدم کی قبر تھی لیکن اب وہ مسمار ہو چکی ہے (73)۔ کہا جاتا ہے کہ جو لوگ مسوں کی بیماری میں مبتلا ہو جاتے وہ اس صوفی بزرگ کو جھاڑو اور پھولوں کا گلدستہ نذرانے کے طور پر پیش کر کے منت مانتے تو تندرست ہو جاتے تھے۔ ابھی تک لوگ یہ نذرانہ پیش کرتے ہیں اور اسی وجہ سے ان صوفی بزرگ کو پیر موحکہ یا ایسا بزرگ کہا جاتا ہے جو لوگوں کے مسے ٹھیک کر دیتا ہے۔ یہ صوفی بزرگ 10 صفر 1117 ہجری بمطابق 1705ء اورنگ زیب کی وفات سے دو

سال پیشتر فوت ہوئے۔

گڑھی شاھو :۔ یہ گڑھی یا قلعہ میاں میڑ کی سڑک پر شمال کی جانب سید جان محمد حضوریؒ کے مقبرے کی مخالف سمت میں واقع ہے۔ اس کے بانی بخارا کے عالم فاضل شخص ابوالخیر تھے جو شاہجہاں کے دور میں 1036 ہجری بمطابق 1626ء لاہور میں آباد ہو گئے تھے۔ وہ 1719ء میں تقریباً سو برس کی عمر میں فوت ہوئے اور یہیں دفن ہوئے۔ انہوں نے عربی کی تعلیم کے لیے یہاں ایک مدرسہ قائم کیا۔ اس کے گرد ایک بلند دیوار ہے اس میں طلباء اور اساتذہ کے قیام و طعام کے لیے حجروں کی قطاریں بھی تعمیر کرائیں۔ یہ کمرے جن کی چھتیں پختہ اینٹوں سے تعمیر کی گئی ہیں، بڑا ٹھوس کام ہے اور یہ آج تک قائم و دائم ہے۔ اس مدرسہ کے ساتھ انہوں نے گڑھی کے انتہائی جنوب کی طرف مسجد تعمیر کرائی۔ اس جگہ کو اس کے بانی کے نام پر خیر گڑھ کہا جانے لگا۔ سکھوں کے اولین دور حکومت میں گڑھی کے مسلمان امراء نے ایک رہزن "شاہو" کی وجہ سے اس علاقے کو خالی کر دیا جس نے گڑھی پر غاصبانہ طور پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسی وقت سے یہ جگہ "شاہو کی گڑھی" کہلانے لگی۔ شاہو کی موت کے بعد مسلمانوں نے دوبارہ اس جگہ پر قبضہ کر لیا لیکن اس جگہ کو بعد میں بھی ڈاکو کے نام کی وجہ سے شاہو کی گڑھی ہی کہا جاتا رہا، جس نے اس پر زبردستی قبضہ جما لیا تھا۔ یہ مقام اپنی قدیم عمارات، ان کی بلند چار دیواری اور اس کے ساتھ ملحقہ شاندار مسجد کے باعث دلچسپی کا حامل ہے۔ یہ سڑک کے کنارے پر واقع ہے اور کافی عرصہ تک اسلامی ادارے کے طور پر قائم رہا۔

حجرہ نواب جعفر خاں :۔ نواب جعفر خاں کا حجرہ یا مقبرہ (74) جو ایک منفرد طرز تعمیر کا حامل ہے۔ یہ موضع گڑھی شاہو کی شرقی جانب اور لاہور سے میاں میڑ کی طرف آنے والی سڑک کے شمال میں واقع ہے۔ یہ اردگرد کے علاقہ سے تقریباً 15 فٹ بلند جگہ پر سرسبز و شاداب خطہ کے درمیان واقع ہے۔ اس پر جنوب کی طرف واقع سیڑھی کے ذریعہ پہنچا جا سکتا ہے، جن میں سے 9 زینے ابھی تک موجود ہیں، وہاں پر بالائی منزل کا دروازہ ہے۔ اس کے نچلے دو زینے گر چکے ہیں۔ لہٰذا اس کی وجہ سے آدمی بڑی دقت سے عمارت کی بالائی منزل پر پہنچ سکتا ہے۔ مہاراجہ شیر سنگھ کے دور میں زبردست بارشوں کے باعث شمال اور مشرق کی طرف کی دیواریں گر چکی ہیں کیونکہ اردگرد کے علاقہ کے مقابلہ میں مزار ایک منزل بلند ہے چنانچہ یہ سیلاب کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہا۔

غربی جانب بڑی محراب پر مختلف رنگوں کی مینا کاری اور گلکاری کی آرائش کا کام ابھی تک نمایاں اور واضح ہے۔ اس محراب کے اطراف میں اور عمارت کے شمال اور جنوب میں محرابیں بنی ہوئی ہیں جن کے ہر طرف کونوں کے اوپر دائرے بنائے گئے ہیں جن میں ابھرے ہوئے حروف میں

کلمہ پاک درج ہے۔ غربی محراب کے درمیان اس کے اوپر عربی رسم الخط میں مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

انما توفون اجورکم یوم القیامۃ فمن زحرح عن النار فما متاع الحیٰوۃ الدنیا الامتاع الغرور و دخل الجنۃ و دخل علیہا ذکریا المحراب وجد عندھا رزقا قال یا مریم انی لک ھذا ھو قالت من عنداللہ ۔

ترجمہ :۔ یقیناً جو کچھ تم کرتے ہو اس کا اجر تمہیں قیامت کے دن دیا جائے گا اور دنیا کی زندگی تو محض پانی کا بلبلہ ہے اور جو کوئی جہنم سے آزاد ہو کر جنت میں داخل ہوتا ہے یقیناً اپنے دل کی خواہش کو پالیتا ہے اور جب ذکریاؑ نے محراب کے نیچے مریمؑ سے ملاقات کی تو ان کے پاس چیزوں کی افراط کو دیکھا تو انہوں نے دریافت کیا، تم نے یہ سب کچھ کہاں سے حاصل کیا ہے تو وہ کہنے لگیں، یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ملا ہے۔

مسجد کے صحن میں نواب جعفر خاں اور اس کے بیٹے کاظم خاں کے مزارات ہیں۔ مراۃ الہند کے مطابق جعفر خاں، شاہجہاں کے دور میں ست ہزاری منصب پر فائز تھا۔ اس کا باپ صادق خاں ہترانی تھا (76) اور وہ 7 رمضان المبارک 1070 ہجری بمطابق 1659ء فوت ہوا اور یہ وہ سال تھا جب دارا شکوہ کو سندھ سے ناقابل تلافی شکست کے بعد دہلی میں اورنگ زیب کے حکم سے قتل کر دیا گیا تھا۔

بھرے (77) والا مقبرہ :۔ نواب جعفر خاں کے مقبرے کی غربی جانب ایک بلند چبوترہ ہے۔ اس کے نیچے ایک تہہ خانہ میں مولوی صادق علی گجراتی اور ان کی زوجہ دفن ہیں۔ محمد صالح کی تصنیف " شاہجہاں نامہ " کے مطابق صادق علی، نواب جعفر خاں کے اہل خانہ اور خلیل اللہ کے معلم تھے۔ نیز موجودہ عمارت کو نواب نے ان کی یادگار کے طور پر تعمیر کرایا۔

مکان بنگلہ :۔ یہ گنبد جو بنگلہ کے نام سے مشہور ہے (یا جھونپڑی سے مماثلت رکھنے کی وجہ سے بنگلہ کہا جاتا ہے) بھرا یا مولوی صادق علی صاحب کے مزار سے شمال کی طرف اور ملتان ریلوے لائن کے مشرق میں واقع ہے۔ اس کا زیریں حصہ مثمن (ہشت پہلو) شکل میں ہے لیکن دیواروں نے جس گنبد کو سہارا دے رکھا ہے وہ مستطیل ہے اور دونوں جانب سے ڈھلوانی ہونے کی وجہ سے بنگلہ کی شکل بن گئی ہے۔ " شاہجہاں نامہ " کے مطابق یہ اورنگ زیب کے دور حکومت میں حاکم لاہور، نواب خلیل اللہ خاں کی صاحبزادی موتیہ بیگم کا مزار ہے۔ وہ ایک عالم فاضل خاتون تھی اور

وہ غیر شادی شدہ ہی فوت ہو گئی تھی۔ لہذا اس کے باپ نے اپنی باکمال بیٹی کی یاد کو برقرار رکھنے کے لیے اس کی قبر پر مقبرہ تعمیر کرا دیا۔ قبر کا اب کوئی نشان نہیں ملتا اور اس مقبرے کو اب زمیندار زرعی مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

قصاب خانے کی قدیم مسجد :- یہ پرانی مسجد نصرت خاں کے گنبد کے جنوب میں دہلی جانے والی ریلوے لائن کے کنارے پر واقع ہے۔ بلند و بالا محرابوں پر ایک عالی شان گنبد سایہ فگن ہے۔ رنجیت سنگھ کے دور میں اس مسجد کو پاؤڈر میگزین (بارود خانہ) کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور یہ جنرل گلاب سنگھ کے قبضہ میں تھی۔ اس نے اس کو خوبصورت تالاب اور دیگر عمارات سے محروم کر دیا۔ اکبر کے زمانہ میں یہاں ایک نہایت گنجان آباد محلہ موجود تھا جسے محلہ بوچڑ خانہ کہا جاتا تھا۔ اس مسجد کو محلہ کے افراد نے 1060 ہجری بمطابق 1649ء اس وقت تعمیر کرایا جب شاہجہاں نے شہزادہ اورنگ زیب کو قندھار کی بازیابی کے لیے بھیجا کیونکہ ایرانیوں نے اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا تھا۔ یہ سال تاریخ میں اس لیے بھی یادگار رہے گا کیونکہ اسی سال اورنگ زیب نے دنیا سے الگ ہو کر دین کے بارے میں غور و خوض کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا اور بادشاہ جو اس خطرناک نوجوان کے مستقبل سے بے خبر تھا اس نے اس کو اس کام سے روکا۔ اس مسجد کے پہلے امام جان محمد، جو اس دور کے نہایت مشہور و معروف اور عالم فاضل شخص تھے، ان کا مزار اس کے شمال میں قریب ہی ایک چار دیواری میں موجود ہے۔ جان محمد، مولوی محمد اسماعیل المعروف میاں وڈا کے مرید تھے اور یہ مسجد آج کل میاں وڈا کے مزار کے متولین کے زیر انتظام ہے۔

اس مسجد کی شرقی جانب ایک پرانا کنواں موجود ہے۔ تاہم اس جگہ کو عبادت گاہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

مقبرہ نواب بہادر خان :- یہ شاندار مقبرہ امرتسر ریلوے لائن کے شمال میں نصرت خاں کے مقبرے کے قریب لاہور سے تین میل مشرق کی طرف ریلوے کے آہنی پل پر واقع ہے۔ محرابوں کے اوپر ایک بلند و بالا گنبد ہے جو ہر ظرف سے سولہ گز لمبائی کے ایک وسیع و عریض مثمن چبوترے کے درمیان ایستادہ ہے۔ یہ عمارت لاہور کی قدیم عمارتوں میں سے ہے اور جب میاں میر میں چھاؤنی قائم کی گئی تو فوجی افسروں نے اس کو تھیٹر کے طور پر استعمال کیا۔ اب محکمہ ریلوے نے اسے گودام بنا لیا ہے۔ گنبد کو باہر کی طرف سے سنگ مرمر سے آراستہ کیا گیا تھا۔ تاہم رنجیت سنگھ نے اسے اتروا لیا۔ دو مختلف سیڑھیوں کے زینے بالائی منزل تک جاتے ہیں جہاں سے اردگرد کے علاقے کا خوبصورت نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ حکومت نے حال ہی میں اس عمارت کو اپنے خرچہ سے

مرمت کروایا ہے۔ مراۃ الہند کے مطابق نواب بہادر خاں، اکبر کے درباری امراء میں شامل تھا اور وہ 1010 ہجری بمطابق 1601ء اس سال فوت ہوا جب اکبر نے خندیش (خاندیش) پر فتح حاصل کی اور وہ یہیں دفن ہوا۔

قدیم شہر لاہور کا محلہ گنج اسی جگہ آباد تھا جہاں اب مزار واقع ہے۔

یہ عمارت مثمن (ہشت پہلو) شکل میں ہے اور اس کے ہر طرف بلند و بالا محرابیں ہیں اور اس کے اوپر چھوٹی گنبدیاں (برجیاں) اور کلس ہیں۔ چبوترہ وسیع و عریض ہے اور ابھی تک درست حالت میں ہے۔ مقبرہ میں مشرق کی جانب کچھ اضافہ کیا گیا ہے اور وہاں پرانا محرابی دروازہ بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

مقبرہ شیخ عبدالحق:۔ شیخ عبدالحق (وہ فقیر جن کی بد دعا سے بدھو (78)، ظروف ساز کا آوا سرد ہو گیا تھا) کا گنبد بہادر خاں کے مقبرے کے جنوب میں واقع ہے۔ یہ ایک مربع شکل کی عمارت پر ایستادہ ہے جس کے ہر طرف محرابی گزر گاہ بنی ہوئی ہے۔ اس گنبد کو بدھو نے فقیر کی وفات کے بعد تعمیر کرایا تھا۔ اس کی تاریخ کے بارے میں علم نہیں ہے۔ اس بیان کے مطابق کچھ لوگ غلط طور پر اس مزار کو خود بدھو سے منسوب کرتے ہیں۔

مقبرہ نصرت خاں:۔ یہ بلند و بالا اور شاندار عمارت لاہور کے مشرق میں اڑھائی میل کے فاصلے پر موجودہ موضع چنت گڑھ میں دہلی ریلوے لائن کے شمال میں واقع ہے۔ یہ دو منزلہ عمارت مثمن شکل کے ایک چبوترہ کے وسط میں کھڑی ہے۔ بالائی منزل پر خوبصورت محرابوں کے اوپر بلند و بالا گنبد ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں جنرل کورت نے اس مقبرے کو نجی رہائش گاہ کے طور پر استعمال کیا اور اس میں بہت سے کمروں کا اضافہ کیا۔ تاہم ماسوائے بالائی منزل کے مغرب میں واقع تین محرابوں کے وہ مسمار ہو چکے ہیں۔ برطانوی حکومت نے حال ہی میں اس کی مکمل طور پر مرمت کرائی ہے۔

مراۃ الہند کے مصنف کے مطابق خواجہ صابر المعروف نواب نصرت خاں (جس کو عامیانہ انداز میں نستر خاں کہا جاتا ہے) امراء کے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور اسے شاہجہاں سے "خان دوراں" کا خطاب ملا تھا۔ وہ لاہور میں 1070 ہجری بمطابق 1659ء فوت ہوا۔ جب دارا شکوہ کو شکست ہوئی اور اس کے بھائی اورنگ زیب نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ موجودہ مقبرہ اورنگ زیب نے اس کی یادگار کے طور پر تعمیر کرایا تھا۔

اس مقبرے کو لوگ اب عامیانہ انداز میں گنبد بھروالا کہتے ہیں کیونکہ سکھوں کی حکومت

کے خاتمے کے بعد پکھر قبیلے کے لوگ یہاں آباد تھے۔ یہ عمارت مثمن شکل کی ہے اور اس کے اردگرد انتہائی شاندار اور خوبصورت کلس موجود ہیں۔ اس کی اندرونی جانب مختلف رنگوں کی گلکاری سے آرائش کی گئی ہے اور وہ ابھی تک تر و تازہ اور واضح حالت میں ہے۔ چبوترہ اب جزوی طور پر شکستہ حالت میں ہے۔

اس مقبرے کے جنوب میں وسیع و عریض فرش کے ساتھ ایک پرانی مسجد ہے اور اس کے شمال میں ایک چھوٹا سا کنواں بھی ہے۔ درمیانی محراب کی اندرونی جانب اس کے اوپر بڑے بڑے عربی حروف میں کلمہ طیبہ درج ہے۔ مسجد اور مقبرہ کو بیک وقت تعمیر کیا گیا تھا اور اب اس کو گرد و نواح کے مسلمان عبادت گاہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

مزار حضرت شاہ محمد غوثؒ :۔ یہ انتہائی متبرک و پر عقیدت مزار شہر کے دہلی دروازہ کے باہر میونسپل باغ میں سرکلر روڈ کے ساتھ واقع ہے۔ چار دیواری پختہ اینٹوں کی دیواروں کی ہے اور اس میں مسافروں کے قیام کے لیے بہت سی خوبصورت عمارتیں ہیں۔ ان ہی میں غلام نبی کی تعمیر کردہ مسجد بھی ہے۔ شاہ محمد غوث ولد سید حسن پشاور، کے رہنے والے تھے اور بادشاہ محمد شاہ کے دور میں لاہور میں آباد ہوئے۔ لوگ پشاور میں ان کے والد کے مقبرے کا بہت احترام کرتے ہیں۔ انہوں نے پورے ہندوستان کا سفر کیا اور لاہور میں آباد ہونے کے بعد مریدوں کی بہت بڑی تعداد ان کے گرد جمع ہو گئی۔ حضرت غوث الاعظم پیران پیر دستگیرؒ سے سلسلہ نسب ہونے کی وجہ سے دہلی سے پشاور تک کے مسلمان اس صوفی بزرگ کی یاد بڑی عقیدت و احترام سے مناتے ہیں، جہاں اس وقت صوفی بزرگ کا مزار ہے، یہاں اورنگ زیب کے دور حکومت میں بادشاہ کے دودھ شریک بھائی فدائی خاں (جس نے قلعہ کے سامنے بادشاہی مسجد بنوائی تھی) کا وسیع و عریض گھر تھا۔

حضرت شاہ محمد غوثؒ کی تصنیف "رسالہ غوثیہ" جس میں انہوں نے حضرت میاں میرؒ اور دیگر بزرگان دین کے بارے میں ذکر کیا ہے، بہت اعلیٰ پائے کا کام ہے۔ اس ولی اللہ کی کرامت کے بارے میں لاہور کے شہری مندرجہ ذیل واقعہ بیان کرتے ہیں۔ مولوی نور احمد چشتی اور مفتی غلام سرور دونوں اپنی اپنی تصانیف میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔

یہ بیان کیا جاتا ہے کہ کنور نونہال سنگھ نے برسراقتدار آنے کے بعد یہ حکم جاری کیا کہ شہر کے گرد و نواح کو بالکل صاف کر دیا جائے۔ ایم الارڈ کو یہ فرض سونپا گیا اور شہر کی فصیل کے چاروں طرف ہر مکان اور عمارت کو ان احکامات کے تحت گرایا جانا تھا۔ صفائی کا کام انتہائی جوش و خروش سے شروع کیا گیا اور بہت سی عمارات کو مسمار کر دیا گیا۔ اختیار کیے گئے منصوبہ کے مطابق

حضرت شاہ محمد غوثؒ کے مزار کو بھی زمین کی سطح کے برابر کیا جانا تھا۔ لاہور کے شہریوں کو اس معاملے میں بڑی تشویش لاحق ہوئی لیکن سکھ دربار میں ان کی پرجوش اپیلوں پر کوئی دھیان نہیں دیا گیا۔ ہوا یوں کہ اس رات جس کی صبح مزار کو گرایا جانا تھا، کھڑک سنگھ مر گیا اور اس کا بیٹا اپنے باپ کی آخری رسومات ادا کر کے دریا کی طرف سے واپس لوٹ رہا تھا، وہ بھی حادثاتی طور پر حضوری باغ کے بھاری بھر کم دروازے کا ایک حصہ اپنے اوپر گر جانے کے باعث عبرتناک موت سے ہمکنار ہو گیا۔ اس کا ساتھی اور راجہ گلاب سنگھ کا بیٹا میاں اودھم سنگھ بھی اسی وقت اس حادثے کی وجہ سے کچل کر ہلاک ہو گیا۔ مزار کو تباہ کرنے کا ارادہ کرنے والے کی اچانک موت نے خانقاہ کو تباہی سے محفوظ رکھا اور لوگ اس حادثے کو بزرگ کی بد دعا سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق بزرگان اور اولیائے کرام ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ ان کے بارے میں قرآن پاک کی آیت کریمہ میں یوں بتایا گیا ہے:۔

ان اولیا اللہ لا یموتون بل احیاو لکن لا تشعرون

ترجمہ:۔ بے شک اللہ کے دوستوں کو موت نہیں آتی اور وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں لیکن لوگ ان کے بارے میں شعور نہیں رکھتے۔

حضرت شاہ محمد غوثؒ 1152 ہجری بمطابق 1739ء لاہور میں انتقال کر گئے اور ان کی برسی کے موقع پر ان کے مزار پر ایک بہت بڑا عرس منعقد ہوتا ہے۔

سرائے محمد سلطان:۔ یہ وسیع و عریض سرائے، دہلی دروازہ کے باہر واقع ہے۔ کشمیری ذات کا محمد سلطان سکھوں کے دور میں صابن سازی کا کام کرتا تھا۔ وہ فن پہلوانی میں بھی ماہر تھا۔ انگریزوں کے دور میں وہ سرکاری عمارات کا ٹھیکیدار بن گیا اور اس نے اس ذریعہ سے بہت کچھ حاصل کیا۔ وہ بہت مالدار شخص بن گیا اور اسے سلطان کشمیری کی بجائے محمد سلطان ٹھیکیدار کہا جانے لگا۔ اس نے بے شمار پرانی عمارات اور مقبرہ جات مسمار کر دیے اور جتنی عمارات اس نے گرائیں ان کے مقابلے میں بے شمار عمارتیں تعمیر بھی کرائیں۔ اس نے جن عمارات کو مسمار کرایا ان میں شہر کے پری محل اور رنگ محل اور دیگر عمارات کے علاوہ اس کی سرائے کی مشرقی جانب شہزادہ دارا شکوہ کی بیوی ستارہ بیگم المعروف قدسیہ بیگم کی تعمیر کردہ عالیشان مسجد بھی شامل ہے۔ یہ مسجد جو فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ تھی، دو منزلہ عمارت پر مشتمل تھی۔ زیریں منزل کے کمرے جو طلباء اور علمائے کرام کے قیام و طعام کی غرض سے تعمیر کیے گئے تھے، پختگی کے علاوہ شان و شوکت اور خوبصورتی کے لحاظ سے فقید المثال تھے۔ یہ مسجد انگریزوں کی رہائش میں تبدیل کر دی گئی

تھی اور کافی عرصہ تک یہ قدیم اخبار "لاہور کرونیکل" کے مینیجر مسٹر او ویلبی کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔ اس کے بعد یہ ریلوے کے چند ان حکام کی ملکیت میں آ گئی تھی جن سے سلطان نے اس کو خرید اتھا۔ تاہم اس نے اینٹوں کے حصول کے لیے اس کو مسمار کر دیا (79)۔ مسلمان بیان کرتے ہیں کہ اس مسجد کو یعنی خدا کے گھر کو مسمار کرنے کی پاداش میں سلطان کا زوال شروع ہو گیا اور اس کے حالات انتہائی دگرگوں ہو گئے اور وہ اس کے کچھ عرصہ بعد ہی مر گیا۔

چوک دارا شکوہ :۔ یہ مقام جہاں اس وقت سلطان کی سرائے ہے، یہاں اورنگ زیب کے دور حکومت میں دارا شکوہ کے محل اور بہت بڑا بازار موجود تھا جسے "چوک دارا" کہا جاتا تھا۔ سلطان نے ملک کے الحاق کے تھوڑی دیر بعد اس جگہ کو حکومت سے خرید کر دارا شکوہ کے محل کی بنیادیں تک کھود ڈالیں اور یہ جگہ پختہ اینٹوں کی کان ثابت ہوئی۔ ان اینٹوں سے اس نے سرائے اور لنڈا بازار کو دکانات کی قطاروں سمیت تعمیر کرایا اور انہی اینٹوں سے اس نے سرائے میں اپنے لیے ایک عالی شان مکان اور ایک مسجد تعمیر کرائی۔ اس سرائے کی وسعت اور اس سے لوگوں کو حاصل ہونے والے فوائد اور اس سے ملحقہ گلیوں اور بازاروں کی کشادگی کی وجہ سے سلطان کو لازوال شہرت حاصل ہو گئی۔ اپنی عمر کے آخری حصہ میں وہ مقروض ہو گیا اور مہاراجہ جموں نے اس کی وسیع و عریض جائیداد کو صرف سات لاکھ روپے کے عوض گروی رکھ لیا۔ یہ ابھی تک مہاراجہ کے پاس گروی پڑی ہوئی ہے۔ سلطان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔

مسجد امیر خاں :۔ یہ مسجد، شیخاں والا مقبرہ کے جنوب میں دہلی دروازہ سے میاں میرؒ کو جانے والی سڑک پر واقع ہے۔ اس مسجد کے بانی امیر خاں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اکبر کے دور میں ایک امیر تھا۔ اس کا مزار مسجد کے صحن میں واقع ہے (80)۔ اس مسجد کا ایک مستطیل نما گنبد ہے اور اس کے ساتھ دونوں جانب گول گنبد بھی بنے ہوئے ہیں۔ صحن پختہ اینٹوں کا ہے۔ اس مسجد کو موضع گڑھی شاہو کے رہنے والے اب عید گاہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

مقبرہ سید جان محمد حضوریؒ :۔ یہ موضع گڑھی شاہو کے مغرب میں میاں میرؒ کی سڑک کے کنارے پر واقع ہے۔ چار دیواری کے احاطہ میں بارہ دری کی شکل میں دو گنبد ہیں۔ ان مقبروں کے ساتھ ملحقہ ایک بہت بڑی مسجد بھی ہے۔ مشرقی دیوار کے قریب واقع گنبد میں حضرت محمود حضوریؒ اور ان کے صاحبزادے شاہ نور الدینؒ کے مزارات ہیں اور دوسرے گنبد میں سید جان محمد حضوریؒ اور ان کے صاحبزادے سید سرور دینؒ کے مزارات ہیں۔ یہ خاندان اصل میں گھور کی پہاڑیوں میں رہتا تھا۔ یہ بعد میں اوچ میں آباد ہو گئے اور شاہجہاں کے دور میں لاہور میں آباد ہوئے۔ ان کو

حضوری کہا جاتا تھا کیونکہ اس بارے میں یقین سے کہا جاتا تھا کہ ان کے مریدوں کو دربار نبویؐ میں فوری طور پر حاضری مل جاتی تھی۔ حضرت سید جان محمدؒ کے مزار کی مشرقی دیوار پر مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ درج ہے:۔

جہان معنی و جان محمد — کہ از عشق محمد گشت محمود

خرد از فضل حق تاریخ سالش — وصال عاشق و معشوق فرمود

ترجمہ:۔ جان محمد جو اپنے اندر ایک جہان معنی لیے ہوئے ہے۔ عشق محمدؐ کی وجہ سے اس کی خوب ستائش ہو رہی ہے۔ (ان کی وفات پر) حق کے فضل سے خرد نے تاریخ سال وفات نکالی۔ عاشق اور معشوق کا وصال ہو گیا ہے۔

مندرجہ بالا قطعہ تاریخ کے مطابق ان کی تاریخ وفات 1120 ہجری بمطابق 1708ء یا ورنگ زیب کے جانشین اور بیٹے بہادر شاہ کے تخت سنبھالنے کا سال ہے۔ اس مقام پر ایک سالانہ عرس (میلہ) منعقد ہوتا ہے اور اس احاطہ میں چراغاں کیا جاتا ہے۔ حضرت جان محمد حضوریؒ کی اولاد لاہور میں رہتی ہے اور لوگ ان کا بڑا احترام کرتے ہیں۔

حضرت سید جان محمد حضوریؒ کی خانقاہ کے متولیوں کے پاس ایک قدیم اور دلچسپ دستاویز ہے۔ یہ ایک سند ہے جس پر اورنگ زیب کی شاہی مہر کے تحت حضرت سید جان محمد حضوریؒ کی بیوہ مسمات نور خاتون کو لاہور کے نواحی علاقہ شاہ پور کے علاقہ بڑھی (81) میں 65 لھہ زرخیز زمین ہمیشہ کے لیے دیے جانے کا حکم صادر ہوا ہے۔ یہ دستاویز 36 انچ طویل اور 1 انچ چوڑی ہونے کی وجہ سے مخصوص شکل میں ہے۔ یہ کچھ اس طرح ہے۔

یا نافع

محی الدین اورنگ زیب بادشاہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یا فتاح

ابن میران شاہ

شاہ ابن تیمور صاحقران

ابن سلطان ابوسعید

یا ایھا الناس اطیعو اللہ و اطیعو الرسول و اولی الامر منکم

بادشاہ غازی

محمد محی الدین عالمگیر

ابوالمظفر

سنہ ۱۰۸۰ھ

سنہ ۱۲ جلوس

بادشاہ ابن عمر شیخ

بادشاہ ابن جہانگیر

بادشاہ ابن بابر

بادشاہ ابن ہمایوں

بادشاہ ابن اکبر

یا حامی

یا رافع

دربنوقت فرمان والا شان سعادت نشان شرف صدور یافت کہ موازی شصت پنج

65 بیگھہ زمین افتادہ لائق زراعت خارج از جمع از بڑہی شاہ پور مضاف صوبہ

پنجاب دار السلطنت لاہور از خریف انتائیل در وجہ معاش مسماۃ نور خاتون وغیرہ

بموجب ضمن مقرر باشد کہ حاصلات آن را فصل بفصل و سال بسال معیشت خود

بانمودہ بدعائی دولت ابد پیوند مواظبت ممیودہ باشد۔ بباید کہ احکام و عمال و

جاگیرداران و کروڑیان حال و استقبال حکم والا مستمر دانستہ زمین مذکور را پیمودہ و

چک بستہ بتصرف آنہا باز گزارند و اصلا تغیر و تبدل راد ران راہ ندہند و طلب مال

و جہات و اخراجات مثل خلعہ و پیشکش و جریبانہ و ضابطانہ و محصلانہ و مہرانہ و

پیکانہ و دستکانہ و دہ یمی و مقدی و جلاوی قانونگوئی و ضبط مرسلانہ بعد از تشخیص

چک و تکرار زراعت و کل مکالیف دیوانی و مطالبات سلطانی مزاحمت نرسانند و

درین باب ہر سال سند مجدد بطلند۔ و اگر در محلی دیگر چیزے داشتہ باشد اعتبار

سکنند۔

بتاریخ دوازدہم 12 شہر ربیع الاول 14

جلوس تحریر یافت

ترجمہ :۔ میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔

اے لوگو! اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور اس کی اطاعت کرو جو تم میں صاحب حیثیت ہو۔

مہر کا ترجمہ

(دایاں بالائی کونہ) اے فتح یارب

(بایاں بالائی کونہ) اے منافع دینے والے

(دایاں زیریں کونہ) اے سرفراز کرنے والے

(بایاں زیریں کونہ) اے مددگار

(درمیان میں) فتح یاب ، محمد محی الدین عالمگیر بادشاہ غازی 1180 ہجری ،

حکومت کا بارہواں سال۔

(حاشیہ)

شاہجہاں بادشاہ کا بیٹا
جہانگیر بادشاہ کا بیٹا
اکبر بادشاہ کا بیٹا
ہمایوں بادشاہ کا بیٹا
بابر بادشاہ کا بیٹا
عمر شیخ بادشاہ کا بیٹا
ابو سعید سلطان کا بیٹا
میراں شاہ کا بیٹا
تیمور شاہ صاحبقران کا بیٹا

اس وقت فرمان والا شان اور سعادت نشان ملا ہے کہ پنجاب کے دار السلطنت لاہور کے نواح میں بڑی شاہ پور میں واقع 65 بیگھہ زرخیز زمین یکم خریف سے مسمات نور خاتون کو اس شرط پر دے دی جائے کہ وہ فصل در فصل اور سال بہ سال اپنے گزارے کے لیے اسے کاشت کرے گی اور حکومت کی بقاء کے لیے دعا کرتی رہے گی۔ تمام حکام، دفاتر، جاگیردار، کروڑی، جو اس وقت عہدوں پر فائز ہیں یا بعد میں ان پر مقرر کیے جائیں گے یہ بات غور سے ذہن نشین کر لیں کہ اس حکم کو دوام حاصل ہے اور یہ کہ مذکورہ زمین کی پیمائش کرنے کے بعد اور اس کی حدود کا تعین کرنے کے بعد اس کو مذکورہ بالا اشخاص کے قبضہ میں دے دیا جائے اور وہ اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں کر سکتے۔ خلعہ (لباس) پیشکش (تحفہ) جریبانہ (جریب، جرمانہ) زبیتانہ (پولیس) دستکانہ (دستکاری) محصلانہ (محصول یا ڈیوٹی) مہرانہ (مہر) پیکانہ (ہتھیار) دہ نیمی (ساڑھے دس) مقدمی، قانونگوئی کا محصول، محصول ڈاک، جیسے تمام محصولات اور اخراجات معاف کر دیے گئے ہیں۔ حدود کے تعین اور زمین کی کاشت کے بعد کوئی شخص شہری محصولات یا سرکاری محصولات کا تقاضا نہیں کرے گا۔ اس کے لیے ہر سال تازہ حکم جاری کیا جائے گا اور اس میں کسی کا عمل دخل بالکل بے ... نہ ہو گا۔ یہ

12 ربیع الاول اور حکومت کے 14 ویں سال میں لکھا گیا۔"

مقبرہ حضرت میاں میرؒ ۔ حضرت میاں میرؒ کا مقبرہ اسی نام کی چھاؤنی میں لاہور سے تین میل کے فاصلے پر مشرق کی جانب واقع ہے۔ یہ بزرگ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کی اولاد میں سے تھے اور ان کے آباؤ اجداد کا اصل وطن سیستان تھا۔ دارا شکوہ اپنی تصنیف "سکینتہ الاولیاء" میں حضرت میاں میرؒ کا مندرجہ ذیل شجرہ نسب پیش کرتا ہے:۔

قاضی سائیں دتہ

قاضی قدن کی صاحبزادی فاطمہ سے شادی ہوئی

- جمل مری
- جمال خاتون
  (دو بہنیں ہمشیرگان)
  - محمد شریف
- محمد میر المعروف میاں میرؒ
- طاہر
- عثمان
- مُلتن
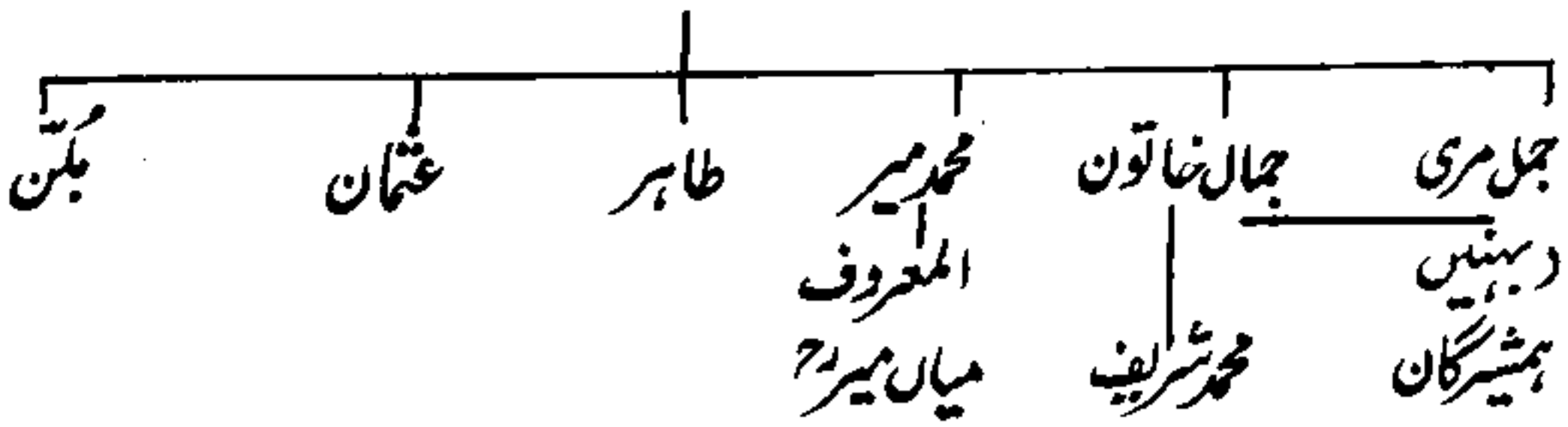
حضرت میاں میرؒ 957 ہجری بمطابق 1550ء سیستان میں پیدا ہوئے اور لاہور میں تقریباً ساٹھ برس کے عرصہ تک رہنے کے بعد 1045 ہجری بمطابق 1635ء اٹھاسی سال کی طویل عمر میں فوت ہوئے۔ آپؒ کی وفات کے بارے میں دارا شکوہ، سکینتہ الاولیاء میں کچھ اس طرح آگاہ کرتا ہے:۔

و بتاریخ ہفتم ماہ ربیع الاول سنہ 1045 ہجری بروز سہ شنبہ
بمحلہ خانی پورہ در حجرہ کہ مسکن ایشاں بود طاہر روح مطہر

ایشاں از قفس تقید و وجود ہوتی خلاص یافتہ بعالم اطلاق لاہوتی
کہ وطن آن بود شتافت و قطرہ بحر شد۔

ترجمہ :۔ اور بروز منگل 7 ربیع الاول 1045 ہجری ،
انہوں نے محلہ خافی پورہ میں موجود اس حجرہ میں آخری سانس
لیا جہاں ان کی رہائش تھی اور ان کی پاکیزہ روح وجود کے
قفس سے آزاد ہو کر عالم لاہوتی میں پہنچ گئی اور اپنے اصل مقام
پر پہنچ کر سمندر میں ایک قطرے کی مانند بن گئی۔

کہا جاتا ہے کہ ان کی طویل العمری حبس دم کا عمل کرنے کی وجہ سے تھی اور وہ اس کے عادی بن چکے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ رات کے دوران صرف ایک یا دو مرتبہ سانس لیا کرتے تھے (82)۔ جب انہوں نے برسوں کے بوجھ کو محسوس کرنا شروع کیا تو وہ رات کے دوران چار مرتبہ سانس لینے لگے۔ پاکیزگی، نیکی، خیرات اور علم و فضل کے معاملہ میں اس دور میں اس علاقہ کے اندر کوئی بھی ان کا ہمسر نہیں تھا۔ آپؒ کو حضرت عبدالقادر گیلانیؒ پیر دستگیر سے بڑی عقیدت تھی اور ان کا اسم مبارک وضو کے بغیر زبان پر نہیں لایا کرتے تھے۔

مزار کے اوپر گنبد کو ایک مربع شکل کے مینار نے سہارا دیا ہوا ہے اور یہ سنگ مرمر کے ایک بہت بڑے چبوترے پر ایستادہ ہے جس کے اوپر سنگ مرمری کے بنے ہوئے زینوں کے ذریعے پہنچا جا سکتا ہے۔ صحن وسیع و عریض ہے اور اس کے گرد سنگ سرخ کا حاشیہ لگایا گیا ہے۔ گنبد کے مغرب میں اسی صحن کے اندر ایک خوبصورت مسجد ہے اور اس کے جنوب اور مشرق میں درویشوں اور مسافروں کے قیام کے لیے کمرے بنائے گئے ہیں۔

محمد شریف اور حاجی محمد صالح :۔ سنگ مرمر کی سیڑھی کے نیچے دو الگ الگ مزارات ہیں۔ ایک سنگ مرمر اور دوسرا پختہ اینٹوں کا ہے۔ اس میں سے ایک حضرت میاں میرؒ کی ہمشیرہ جمال خاتون کے بیٹے محمد شریف کا ہے جو اس صوفی بزرگ کی وفات کے بعد پہلے سجادہ نشین بنے اور ان کا انتقال 5 رجب 1054 ہجری بمطابق 1644ء ہوا اور دوسرا مزار حاجی محمد صالح کا ہے جو حضرت میاں میرؒ کے انتقال کے ایک ماہ بعد 4 ربیع الاول 1045 ہجری بمطابق 1635ء کو فوت ہوئے۔

مُلّا شاہ :۔ شہزادہ دارا شکوہ بدخشاں کے رہنے والے اور حضرت میاں میرؒ کے مرید، شاہ محمد المعروف ملا شاہؒ کا مرید تھا۔ ملا شاہؒ انتہائی پرہیزگار شخص تھے اور اپنے وقت کے ایک عظیم مقرر اور شاعر تھے۔ دونوں بزرگوں یعنی حضرت میاں میرؒ اور مُلا شاہؒ نے دارا شکوہ کو بتا دیا تھا کہ اس کی موت

کے بارے میں بتا دیا تھا جس نے اپنے پیرؒ ملا شاہ کی قبر پر وسیع و عریض مقبرہ تعمیر کرا دیا تھا اور حضرت میاں میرؒ کے مزار پر انتہائی شاندار خانقاہ کی تعمیر کا کام شروع کرا دیا تھا کہ اسی اثناء میں اس کے چالاک بھائی اورنگ زیب نے اسے دہلی میں قتل کرا دیا۔ ملا شاہؒ کے مزار پر لگے قیمتی پتھر کو رنجیت سنگھ اتار کر لے گیا(83)۔ حضرت میاں میرؒ کے مزار کے زیریں حصے اور اس سے ملحقہ مسجد میں سنگ مرمر دارا شکوہ نے لگوایا تھا۔ بالائی حصہ جو پختہ اینٹوں سے بنایا گیا ہے اسے اورنگ زیب نے تعمیر کرایا تھا۔ اس نے دارا شکوہ کی طرف سے حضرت میاں میرؒ کے مزار اور چوک دارا سے حضرت میاں میر کے مزار تک بنائی جانے والی سڑک کے لیے اکٹھے کیے گئے پتھر سے لاہور میں اپنے نام کی بادشاہی مسجد تعمیر کرالی۔ دارا شکوہ کے مطابق صوفی بزرگ کو عالم گنج اور دارا پور کے گرد و نواح میں دفن کیا گیا جس کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ اس کا شہر سے فاصلہ ڈیڑھ کوس تھا لیکن شہری آبادی کا اب یہاں نام و نشان نہیں۔ ملا عبدالحمید لاہوری اپنی تصنیف " بادشاہ نامہ " میں لکھتا ہے:۔

قبر گرامیش در موضع غیاث پور ست نزدیک بعالم گنج دار السلطنت لاہور

ترجمہ:۔ آپ کی قبر مبارک دار السلطنت لاہور میں عالم گنج کے نواحی علاقہ موضع غیاث پور میں ہے۔

عرس کے میلے کے علاوہ موسم برسات کے دو مہینوں کے دوران ہر بدھ کو اس مقبرہ پر دیگر میلے بھی منعقد ہوتے ہیں۔ ان کو بدھ میلے کہا جاتا ہے۔

حضرت میاں میرؒ کے کمالات کے بارے میں بیان کرتے ہوئے دارا شکوہ اپنی کتاب سکینۃ الاولیاء میں لکھتا ہے: اگرچہ میرا دادا (جہانگیر) فقیروں پہ ذرا کم ہی یقین رکھتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ حضرت میاں میرؒ بالا پیر سے بڑی عقیدت رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے شیخؒ کو مدعو کیا اور بڑی عقیدت و احترام سے ان کا استقبال کیا۔ شیخ صاحبؒ نے بادشاہ سے طویل گفتگو کی۔ اس میں انہوں نے زیادہ تر دنیا کی بے ثباتی پر زور دیا۔ اس گفتگو نے بادشاہ کے ذہن پر اس قدر اثر کیا کہ اس نے شیخ صاحبؒ کا مرید ہونے اور ترک دنیا کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ تاہم انہوں نے اسے دنیا داری کے عمل کو جاری رکھنے کی نصیحت کی اور اسے یہ باور کرایا کہ بادشاہ اس لیے بنائے گئے ہیں کہ وہ خدا کے بندوں کی حفاظت کریں اور یہ کہ اسے ان پر حاکمیت عطا کی گئی ہے اور وہ خالق کائنات کی طرف سے سپرد کیے گئے اہم فرض کو ادا کرتا ہے۔ بادشاہ یہ سن کر بہت خوش ہوا اور فقیر سے کہنے لگا۔ اے شیخؒ اگر آپ کچھ لینا چاہتے ہیں تو مجھے کہیے! شیخؒ نے جواب دیا۔ میں تم سے صرف ایک چیز مانگتا

ہوں۔ کیا اسے دینے کا وعدہ کرتے ہو؟ یقیناً میں وہ چیز ضرور دوں گا۔ بادشاہ نے جواب دیا۔ اس پر صوفی بزرگ نے فرمایا۔ بادشاہ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھے دوبارہ یہاں آنے کی زحمت نہ دو۔ بادشاہ کی طرف سے اس بات کی یقین دہانی کرانے کے بعد کہ وہ دوبارہ انہیں یہاں نہیں بلائے گا، شیخؒ وہاں سے تشریف لے گئے۔

لیکن بادشاہ نے شیخؒ کی خدمت میں اپنے دستخط شدہ خطوط بھیجنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان میں سے دو کی نقول دارا شکوہ نے اپنی کتاب میں بھی شامل کی ہیں جس کا اس سے پیشتر حوالہ دیا جا چکا ہے۔ ان خطوط میں فقیر سے بادشاہ نے قندھار میں اپنی فوجوں کی کامیابی کے لیے دعا کرنے اور روحانی مدد حاصل کرنے کی استدعا کی ہے۔

" بادشاہ نامہ " کا مصنف کہتا ہے :۔ شاہجہاں بادشاہ اکثر کہا کرتا تھا کہ اس نے اپنی پوری زندگی میں صرف دو فقیروں کے پاس خدائی علم موجود پایا ہے۔ ایک حضرت میاں میرؒ اور دوسرے برہانپور کے شیخ محمد فضل اللہؒ ہیں۔ بادشاہ کو ان دونوں بزرگوں سے بہت زیادہ عقیدت تھی۔ ہم نے اس کتاب کے تاریخی باب میں ذکر کیا ہے کہ شاہجہاں نے بحیثیت شہنشاہ ہندوستان کشمیر جاتے اور واپس آتے ہوئے دو مرتبہ حضرت میاں میرؒ کے پاس حاضری دی۔

سکینتہ الاولیاء میں حضرت میاں میرؒ کے مرید ملا فتح اللہ شاہ کا مرتب کیا ہوا مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ دیا گیا ہے۔ یہ مزار کے دروازے پر بھی درج ہے:

میانمیر سر دفتر عارفان — کہ خاک درش خاک اکسیر شد

سفر جانب شہر جاوید کرد — ازین محنت آباد دیگر شد

خرد، بہر سال وفاتش نوشت — بفردوس والا میانمیر شد

ترجمہ :۔ میاں میرؒ عارفوں کے سردار ہیں۔ ان کے در کی خاک، خاک اکسیر ہے۔
وہ ہمیشہ رہنے والے شہر کی طرف سفر کر گئے ہیں۔ اس دکھوں کی دنیا سے پریشان ہو کر عقل نے ان کی تاریخ وفات کے بارے میں کہا۔
میاں میرؒ فردوس بالا میں تشریف لے گئے ہیں۔

آخری سطر سے تاریخ وفات 1045 ہجری بمطابق 1635ء کا پتہ چلتا ہے۔

بارہ دری نادرہ بیگم :۔ یہ قدیم بارہ دری حضرت میاں میرؒ کے مقبرہ کی مشرقی جانب واقع ہے اور اس کو دارا شکوہ نے اپنی منہ بولی بہن نادرہ بیگم کی یادگار کے طور پر تعمیر کرایا تھا اور وہ یہیں پر دفن ہے۔ وہ 1042 ہجری بمطابق 1632ء گیارہ سال کی عمر میں فوت ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ

وہ گیارہ سال کی عمر ہی سے حضرت میاں میرؒ کے پاس پانی کا ایک گھڑا لے کر حاضر ہو جاتی تھی تاکہ اس ولی اللہ کو نماز کی ادائیگی سے قبل وضو کرانے میں مدد دے۔ ایک مرتبہ گیارہ سال کی عمر میں جب وہ عصر کی نماز کے وقت پانی کے گھڑے سمیت پیر صاحبؒ کے پاس حاضر ہوئی تو اس صوفی بزرگ نے اس کی طرف دیکھ کر فرمایا "میری بچی اب تم جوان ہو گئی ہو اس لیے بہتر یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے نہ آیا کرو۔" اس لڑکی نے پیر صاحبؒ کے اس مشاہدے سے بہت زیادہ شرم محسوس کی اور خدا سے دعا کی کہ اب اس کے وجود کو ختم کر دیا جائے۔ اس واقعہ کے مطابق اس کی دعا قبول ہو گئی اور وہ اسی رات فوت ہو گئی۔

بارہ دری اصل میں ایک بہت بڑے تالاب میں ایستادہ تھی اور اس میں پختہ اینٹوں کے پل کے ذریعے پہنچ سکتے تھے۔ اس کو جن محرابوں نے سہارا دے رکھا تھا ان میں سے 31 آج بھی بڑی عمارت کے مشرق میں موجود ہیں۔ شمال اور جنوب میں نہایت شاندار دروازے تھے اور تالاب کے ہر کونے پر ایک بارہ دری بنائی گئی جن کے آثار ابھی تک موجود ہیں۔

مقبرہ ملا شاہؒ: ملّا شاہؒ جو خود بھی حضرت میاں میرؒ کے ایک مرید تھے۔ وہ شہزادہ دارا شکوہ کے روحانی پیشوا تھے۔ وہ ملّا احدی کے صاحبزادے تھے اور ان کا اصل نام شاہ محمد تھا۔ وہ بدخشاں کے رہنے والے تھے اور علم و فضل اور پرہیزگاری میں انہیں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ ابتدائی عمر میں انہوں نے کشمیر کی سیاحت کی اور وہاں تین سال قیام کرنے کے بعد آگرہ تشریف لے گئے۔ وہاں پر حضرت میاں میرؒ کی پاکیزگی اور ان کے عظیم کمالات کے بارے میں سننے کے بعد انہوں نے لاہور کی طرف سفر کیا اور ان کے مرید بن گئے۔ انہوں نے اپنے پیر حضرت میاں میرؒ کی طرح اور ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شادی بھی نہ کرائی اور اپنے گھر میں کبھی چراغ بھی نہ جلایا۔ انہوں نے اپنا سارا وقت نمازوں کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ وہ سوتے تھے لیکن بہت کم اور حبس دم کا عمل کرتے تھے۔ یعنی وہ اس بات کے عادی ہو گئے تھے کہ اپنے سانس کو کئی گھنٹوں تک روکے رکھتے تھے۔

ان کا مزار موجودہ موضع میاں میر کے وسط میں ملتان ریلوے لائن کے مغرب میں واقع ہے۔ دارا شکوہ نے اپنے پیر کے مزار کو سنگ مرمر اور دیگر قیمتی پتھروں سے آراستہ کیا تھا اور اس کی محرابوں میں جالیاں لگائی گئی تھیں لیکن ان سب کو رنجیت سنگھ نے امرتسر کے آرام باغ کو سجانے کے لیے اتروا لیا۔ یہ گاؤں جس کے گرد پختہ اینٹوں کی بلند چار دیواری ہے، دراصل یہ اس مزار سے ملحقہ ایک باغ تھا جس کا شمال کی طرف انتہائی شاندار دروازہ تھا جو اب بھی موجود ہے۔ اس علاقہ کو پرانے وقتوں میں عالم گنج کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس باغ کو حضرت میاں میرؒ کے سجادہ نشین مہدی

شاہ نے آج سے تقریباً 125 سال پیشتر گاؤں میں تبدیل کر دیا تھا۔

مُلّا شاہؒ 1071 ہجری بمطابق 1661ء اس سال فوت ہوئے جب اورنگ زیب نے اپنے ناخوش بھائی مراد کو قید خانے میں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا (84)۔

مقبرہ خواجہ بہاری :۔ خواجہ بہاری حضرت میاں میرؒ کے مرید تھے۔ ان کا مقبرہ حضرت میاں میرؒ کے مقبرہ سے مغرب کی جانب پختہ اینٹوں کے ایک بلند و بالا چبوترہ پر واقع ہے۔ اس مقبرے کے چاروں طرف سنگ سرخ اور دیگر پتھروں کی جالیاں اور قیمتی پتھر، رنجیت سنگھ کی فوج کے ایک فرانسیسی افسر جنرل اوی ٹیبائل نے اتروا لیا اور لاہور میں اپنی رہائش گاہ کو آراستہ کرنے کے لیے استعمال کر لیا۔ برطانوی راج کے آغاز میں محکمہ تعمیرات (پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ) کے ایک افسر نے اس کو بطور رہائش گاہ استعمال کیا لیکن اب یہ حضرت میاں میرؒ کے مزار کے سجادہ نشین کے قبضہ میں ہے۔ اس کے مغرب میں ایک قدیم مسجد ہے، جس کو گرد و نواح کے شہریوں نے حال ہی میں مرمت کرایا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی مشرقی جانب ایک پرانے حوض کے کھنڈرات بھی ہیں جو پرانے وقتوں میں زائرین کے لیے وضو کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا (85) ۔

مقبرہ مسکین شاہ امریؒ :۔ یہ مقبرہ چھاؤنی اور گرجا گھر میاں میر کے مغرب میں اور پریڈ گراؤنڈ کے مشرق میں اور میاں میر ریلوے سٹیشن سے چھاؤنی کی طرف جانے والی سڑک کے جنوب میں واقع ہے۔ مقبرے کا گنبد پختہ اینٹوں کے ایک چبوترے کے وسط میں ہے۔ دیواروں کو اصل میں خوبصورت منقش روغنی کام سے آراستہ کیا گیا تھا (86)۔ لیکن اب اس پر صرف سفیدی ہوئی ہوئی ہے۔ مزار فرش کے بالکل درمیان میں ہے۔ مسکین شاہ کا اصل نام میر عنایت اللہ تھا۔ آپؒ حضرت میاں میرؒ کے مرید تھے۔ آپ سب سے الگ تھلگ ہو کر تنہا زندگی بسر کرتے تھے اور آپؒ کے پیر نے آپ کو مسکین شاہ کا خطاب دے رکھا تھا۔ بعد میں انہیں امری کہا جانے لگا کیونکہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ اپنا گزارا کس طرح سے کرتے ہیں۔ جب لوگوں نے ان کے مرشد سے ان کے گزارا کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ میرا مرید مسکین امری ہے یعنی ایسا مسکین آدمی جس کو خدا کے حکم یا مرضی سے کھانا وغیرہ ملتا ہو اور اسے بندوں کی حاجت نہ ہو۔ وہ 1057 ہجری بمطابق 1647ء میں فوت ہوئے اور موجودہ مقبرہ آپ کی یاد میں شہزادہ دارا شکوہ نے تعمیر کروایا تھا۔

مقبرہ حضرت داتا گنج بخشؒ :۔ شہر کے بھاٹی دروازہ کے باہر مغرب کی طرف حضرت داتا گنج بخشؒ کا مشہور و معروف مقبرہ ہے۔ آپؒ کا اصل نام علی مخدوم ہجویری غزنوی ہے (87)۔ آپ

کے والد گرامی کا نام عثمان بن علی جلالی غزنوی تھا اور وہ شیخ ابوالفضل بن حسن ختلی کے مرید تھے۔ وہ سلطان محمود کے بیٹے اور جانشین مسعود کی فوجوں کے ہمراہ لاہور آگئے اور 431 ہجری بمطابق 1039ء یہاں آباد ہوگئے۔ آپ 34 سال یہاں مقیم رہے اور اس عرصہ کے دوران لوگوں نے آپ کے علم و فضل اور پرہیزگاری سے بہت فیض حاصل کیا۔ آپ کا انتقال 465 ہجری بمطابق 1072ء ہوا۔ آپ خود اپنی تعمیر کردہ مسجد کے پہلو میں دفن ہوئے۔ سلطان مسعود کے ایک جانشین سلطان ابراہیم نے آپ کا مقبرہ تعمیر کرایا۔ حضرت علی مخدومؒ ایک بلند پایہ عالم تھے۔ آپؒ نے علم الکلام اور مذہب پر بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ اجمیر کے مشہور و معروف صوفی بزرگ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے حضرت علی مخدومؒ کے مزار مبارک پر چالیس روز تک چلہ کاٹا اور جب یہ عرصہ ختم ہوگیا تو کہا جاتا ہے کہ اس مقدس مقام سے حاصل ہونے والی عنایات سے متاثر ہو کر آپ نے مزار مبارک کے پاؤں کی جانب کھڑے ہو کر اس صوفی بزرگ کی عقیدت و احترام میں مندرجہ ذیل شعر پڑھا:۔

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما

ترجمہ:۔ ہر دو عالم کو خزانہ بخشنے والے اور اللہ کے نور کے مظہر ہیں۔ کاملوں کے پیر کامل اور ناقصوں کے رہنما ہیں۔

جس تاریخ سے غزنی کے صوفی بزرگ کو گنج بخش کہا جانے لگا تھا اسی وقت سے یہ نام ان کے اصل نام کے ساتھ منسلک ہو گیا۔ مزار کی طرف جانے والی گزر گاہ کے اوپر شعر درج ہے۔ مولانا جامی اپنی تصنیف "نفحات الانس" میں اور دارا شکوہ اپنی کتاب "سکینتہ الاولیاء" میں بطور مبلغ دین، حضرت داتا گنج بخشؒ کے کمالات کو بڑے تعریفی انداز میں بیان کیا ہے۔ غزنوی بادشاہوں کے زمانہ سے لے کر آج تک عوام الناس کے سبھی طبقے آپ کی یاد بڑے احترام و عقیدت سے مناتے ہیں۔ آپؒ اپنے دور کے ایک عظیم مصنف تھے۔ دیگر تصانیف کے علاوہ آپؒ نے ایک کتاب لکھی جسے "کشف المحجوب" کہا جاتا ہے۔

مزار پر ہر جمعۃ المبارک کو ایک میلہ منعقد ہوتا ہے جس میں ہندو اور مسلمان دونوں بڑی کثیر تعداد میں شامل ہوتے ہیں۔ مسجد کی محرابوں میں سے ایک پر فارسی کی مندرجہ ذیل عبارت درج ہے جس کے بارے میں پہلے بھی بتایا جا چکا ہے، جس میں انہوں نے لاہور میں اپنی آمد کے بارے میں بتایا ہے اور یہ ابھی تک مزار کے غربی حصہ میں ایستادہ ہے۔ بعد کے ادوار میں اس مسجد

میں قابل ذکر ترامیم کی گئیں۔

خانقاہ علی ہجویری — خاک جاروب از درش بردار
طوطیا کن بدیدہ حق بین — تاشوی واقف در اسرار
چونکہ سردار ملک یعنی بود — سال وصلش برآمد از سردار

ترجمہ :۔ " خانقاہ علی ہجویری " ۔یہاں کے در کی خاک اکٹھی کرو اور سچ کی متلاشی اپنی آنکھوں کے لیے سرمہ کے طور پر استعمال کرو تاکہ تم خدا کے رازوں سے آشنا ہو سکو کیونکہ آپؒ پرہیزگاروں کے سردار ہیں۔ اس لیے آپؒ کی رحلت کا سال لفظ سردار میں ملتا ہے۔

لفظ سردار کے اعداد سے آپؒ کی تاریخ وصال 465 ہجری بمطابق 1072ء برآمد ہوتی ہے۔ جب پنجاب پر ابھی تک محمود کے جانشینوں کی حکمرانی تھی۔

مقبرے کے دروازے کا فرش اور دروازے کے حاشیہ کے علاوہ اس کے دائیں اور بائیں جانب چبوترے سنگ مرمر کے ہیں۔ اس کو شہنشاہ اکبر نے بنوایا تھا۔ دروازے کے بالائی حصہ پر سنگ مرمر کی تختی پر مشہور زمانہ شاعر مولانا عبدالرحمن جامی کے بزبان فارسی مندرجہ ذیل اشعار درج ہیں :۔

هو العزیز

لا اله الا الله محمد الرسول الله
این روضه که بانیش شده فیض است
مخدوم علی راست که باحق پیوست
از هستی هست نیست شد هستی یافت
زان سال وصالش افضل امد از هست

ترجمہ :۔ اللہ سب سے اعلیٰ ہے۔
کوئی معبود نہیں ہے مگر اللہ اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔
یہ مقبرہ جس کی بنیاد اللہ کے فضل و کرم سے رکھی گئی اور یہ حضرت مخدوم علیؒ کی تربت ہے جو حق تعالیٰ سے پیوست ہو گئے ہیں۔ اس عارضی دنیا سے رخصت ہونے کے بعد وہ ہمیشہ کی زندگی میں داخل ہو گئے ہیں۔ چنانچہ ان کے وصال کی

افضل تاریخ لفظ ہست میں دریافت ہوئی ہے۔

مزار کی شرقی جانب فارسی کے مندرجہ ذیل اشعار درج ہیں: ۔

واہ این گنبد فلک ثانی — کہ بجاروب او ملائک و حور

ایستادہ بگیسوی مشکین — از پی عطر یافتند سرور

سال این گنبد مجر نو — از چراغ جمال یافت ظہور

ترجمہ: ۔ واہ یہ کتنا شاندار گنبد ہے جو فلک ثانی ہے کہ یہاں فرشتے اور حوریں صفائی کرتے ہیں اور اپنی مشکی زلفوں کے ساتھ کھڑے ہیں۔ ان کے قلوب، خوشبو سے تر و تازہ ہیں۔ اس مزار کی مرمت کا سال لفظ چراغ جمال میں دریافت ہوا ہے۔ لفظ چراغ جمال 1278 ہجری بمطابق 1861ء کو اس کی مرمت کا سال بتاتا ہے۔

اگلی محراب کے اوپر یہ درج ہے: ۔

ہمیشہ باد خدایا کشادہ این درگاہ

بحق اشہد ان لا الہ الا اللہ

ترجمہ: ۔ خدایا! یہ درگاہ کلمہ اشہد ان لا الہ الا اللہ کی برکت سے، ہمیشہ آباد رہے۔

مزار کے شمال میں فرش پر پانی کا ایک چھوٹا سا جوف ہے۔ زائرین اس پانی کو تبرک کے طور پر اور فیوض و برکات حاصل کرنے کی غرض سے گھر لے جاتے ہیں اور روح کو تسکین پہنچانے کے لیے اس کو آنکھوں سے لگاتے ہیں۔

قدیم شیش محل کا محل وقوع: ۔اس مزار داتا گنج بخشؒ کے ساتھ ایک محلہ ہے جس کو شیش محل کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے کیونکہ مسلمان بادشاہوں کے دور میں یہاں شیشوں کا محل موجود تھا۔

یہ مقبرہ لاہور میں رہنے والے تمام طبقوں میں بہت زیادہ مقبول ہے۔ اس صوفی بزرگ کی برسی (عرس) 20 صفر کو منائی جاتی ہے اور مزار پر ایک بہت بڑا میلہ منعقد ہوتا ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ جو حضرت داتا گنج بخشؒ سے بہت زیادہ عقیدت رکھتا تھا وہ ہر عرس پر ایک ہزار روپے کا نذرانہ پیش کرتا تھا۔ مہاراجہ کھڑک سنگھ کی بیوی اور نونہال سنگھ کی والدہ مہارانی چند کور نے 1895 سمت میں اس مقبرہ میں ایک محرابی چھت والا کمرہ تعمیر کرایا۔ رنجیت سنگھ خود بھی وقتاً فوقتاً اس مزار کی مرمت کراتا رہتا تھا۔

مقبرے کی انتہائی دلچسپ اشیاء میں ہندوستان کے مختلف بادشاہوں اور نوابوں کے پیش کردہ قرآن پاک کے قدیم قیمتی نسخہ جات بھی ہیں۔ ان کو اب محفوظ کر لیا گیا ہے اور یہ مزار کے متولیوں کے قبضہ میں ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر فن خطاطی کے اعلیٰ نمونہ جات ہیں۔

مزار میر مومن خان :۔ مقبرے کے پہلے دروازے کے قریب دائیں ہاتھ ایک بلند چبوترہ ہے، جس پر پختہ اینٹوں کا ایک علیحدہ مزار ہے۔ یہ مزار نواب خان بہادر خاں کے دور حکومت کے دوران لاہور کے نائب ناظم میر مومن خان کا ہے۔ آپ بخاری سید تھے اور آپ کو بادشاہ محمد شاہ سے نواب کا خطاب ملا تھا۔ انہیں حضرت داتا گنج بخشؒ سے بہت زیادہ عقیدت تھی۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ ان کو اس جگہ دفن کیا جائے جہاں مزار کے زائرین اپنے جوتے اتارتے ہیں۔ لہٰذا ان کی خواہش کے مطابق ان کے جسد خاکی کو اسی جگہ دفن کر دیا گیا۔ میر مومن خاں کے تعمیر کردہ انتہائی شاندار مکانات میں سے چند ابھی تک شہر کے علاقہ موچی دروازہ اور کشمیری دروازہ کے جنوب میں موجود ہیں (88)۔

مقبرہ نواب امام الدین خاں :۔ یہ خوبصورت مزار حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار کے بالکل نزدیک واقع ہے۔ قبر کا تعویذ شفاف سنگ مرمر کا ہے اور مزار کا چبوترہ بھی اسی پتھر سے تعمیر کیا گیا ہے۔ شیخ امام الدین سکھوں کے زیر حکومت کشمیر کے حاکم تھے اور ملتان کی جنگ میں انگریزوں کی طرف سے لڑے۔ مزار کی جنوبی دیوار پر بلبل شیراز سعدی کے مندرجہ ذیل غم انگیز اشعار درج ہیں :۔

دریغا که بے ما بسی روزگار
بروید گل و بشگفد نو بہار

بسے تیر و دی ماه اردی (89) بہشت
بیاید که ما خاک باشیم و خشت

ترجمہ :۔ آہ! میرے بغیر اس دنیا میں بہت سے پھول کھلیں گے اور نو بہار میں کئی شگوفے پھوٹیں گے۔

تیر، دی اور اردی بہشت کے بہت سے مہینے آئیں گے۔ میں اس خاک و خشت کی دنیا میں کب لوٹ کر آؤں گا۔

تعویز کے بالائی حصہ پر مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ درج ہے :۔

چونکہ نواب شیخ امام الدین
شد ز دنیا و رو بخلد نہاد

گفت ہاتف ز سال تاریخش
احمد مجتبیٰ شفیعش باد

ترجمہ :۔ جب نواب امام الدین اس دنیا سے رخصت ہو کر خلد کی طرف عازم سفر ہوئے تو ایک غیبی آواز نے ان کی تاریخ وفات کے بارے میں کہا۔ اللہ تعالیٰ احمد کی بخشش فرمائے۔

اس کے نیچے یہ شعر درج ہے:۔

چون بخاکم بگزری دامن کشان
از سر اخلاص الحمدے بخوان

ترجمہ :۔ جب تم اپنا دامن کھینچتے ہوئے میری قبر کے پاس سے گزرو تو انتہائی اخلاص سے سورۃ الحمد کی تلاوت کرو (میری روح کے ایصال ثواب کے لیے)۔

جنوب مغربی دیوار پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

از خامہ عفوان خداوند غفور
کز صنع وجود بشر از خاک سرشت
بر تربت نواب امام الدین خان
آرام گہش بہشت تاریخ نوشت

کتبہ امام ویردی

ترجمہ :۔ خداوند غفور و رحیم کے قلم سے جس نے اپنی صناعی سے مٹی سے انسان کو تشکیل کیا۔ نواب امام الدین کی تربت پر لکھا۔ اس کی آرام گاہ بہشت ہے اور یہی اس کی تاریخ وفات ہے۔

تحریر:۔ مرزا امام ویردی (90)

مزار شیخ فیروز الدین :۔ اس مقبرے کے نزدیک نواب امام الدین کے چھوٹے بھائی اور ایک

وقت میں بہاولپور کے وزیر شیخ فیروز الدین کا مزار ہے۔ سنگ مرمر کے تعویز پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

شیخ فیروز دین چو از دنیا
رخت بربست ورد بخلد نہاد

گفت تاریخ رحلتش ہاتف
سرور انبیا شفیعش باد

اگر برسر خاک این ناتوان
بیائی باخلاص الحمد خوان

سنہ 1299 ہجری المقدس

ترجمہ:۔ جب شیخ فیروز دین اس دنیا سے رخصت ہو کر بہشت کی طرف عازم سفر ہوئے تو غیبی آواز نے ان کی تاریخ وفات کے بارے میں کہا:۔ سرور انبیاء ان کی شفاعت کریں۔ جب تم اس ناتواں شخص کی خاک پر آؤ تو خلوص دل سے سورۃ الحمد کی تلاوت کرو۔

اسی چار دیواری میں نواب امام الدین کی زوجہ کے سنگ مرمر کے مزار پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

چون مادر مشفقم از امر حی لایزل
بگذاشتہ دنیائی دون عازم سوئی عقبی شدہ
از بہر سال رحلتش محبوب باجان حزین
از حضرت روح الامین تاریخ راجو یا شدہ
جبرئیل برزد این ندا چون پاز دنیا برکشید
جائی کنیز فاطمہ در جنت الماوی شدہ

تاریخ بست و یکم شہر ذیقعدہ سنہ 1289 ہجری (91)

ترجمہ:۔ جب میری مشفق والدہ خدائے لایزل کے حکم سے اس عارضی دنیا سے

رخصت ہو کر عقبیٰ کی طرف گامزن ہوئیں تو محبوب نے نہایت مغموم ہو کر جبرائیلؑ سے ان کی تاریخ وفات کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے جواب میں کہا جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوئیں تو کنیز فاطمہ کی جگہ جنت الماویٰ ہے۔(92)

21 ذیقعدہ 1289 ہجری 1872ء

امام باڑہ :۔ یہ شاندار عمارت بھاٹی دروازہ کے باہر اور مزار حضرت داتا گنج بخشؒ سے جنوب کی طرف واقع ہے۔ اس کے گرد پختہ اینٹوں کی چار دیواری ہے۔ اس چار دیواری کے اندر ایک بلند و بالا گنبد ہے، جس کے نیچے ایک تہہ خانہ میں حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ (شہیدان) کے فرضی مزارات ہیں۔ ہر سال محرم کی دس تاریخ کو فرضی طور پر حضرت امام حسینؓ کے زخمی گھوڑے یا دلدل کو یہاں لایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ مسلمانوں، زیادہ تر شیعہ فرقے کے لوگوں کا بہت بڑا جلوس ہوتا ہے۔ دلدل کا جلوس اس جگہ پہنچنے سے پہلے شہر کی پر ہجوم گلیوں سے ماتم کرتا ہوا گزرتا ہے اور اس دن بازار ہر طبقے اور فرقے کے مرد و زن سے بھر جاتے ہیں۔

چلہ بابا فرید شکر گنجؒ :۔ یہ مقدس عبادت گاہ ضلع کچہری کے مغرب میں ایک بلند ٹیلے پر واقع ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پاک پتن کے صوفی بزرگ حضرت باوا فرید شکر گنجؒ نے چالیس روز تک چلہ کاٹا۔ ہر سال محرم کی پانچ تاریخ کو اس جگہ بہت بڑا میلہ منعقد ہوتا ہے جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوتے ہیں۔ یہاں پر مسلمانوں کا ایک وسیع و عریض قبرستان موجود تھا لیکن اس زمین کو اچھا خیال کرتے ہوئے پرانی قبروں کے اس مقام پر اب زندگی کی ریل پیل ہو گئی ہے اور اس پر انگریزوں کے خوبصورت مکانات بن گئے ہیں۔

خواجہ فریدؒ مشہور و معروف صوفی بزرگ حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ کے مرید حضرت قطب الدین دہلویؒ (جو قطب مینار کے قریب دفن ہیں) کے مرید تھے۔ مختلف جگہوں کی سیاحت کرنے کے بعد انہوں نے اپنے رہنے کے لیے اجودھن موجودہ پاک پتن کو منتخب کیا اور وفات کے بعد انہیں یہیں دفن کیا گیا۔

فارسی میں شکر گنج کا مطلب "مٹھاس کی کان" یا "میٹھے کا خزانہ" ہوتا ہے۔ روایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک مرتبہ صوفی بزرگ باوا فریدؒ نے ایک سوداگر سے تھوڑی سی شکر مانگی جو اونٹوں پر

شکر کی بوریاں لاد کر لے جا رہا تھا، اس سوداگر نے جواب دیا کہ وہ شکر نہیں بلکہ نمک لے جا رہا ہے۔ یہ سوداگر جب اپنی منزل مقصود پر پہنچا تو اس کو یہ دیکھ کر انتہائی حیرانگی ہوئی کہ بوریوں میں بند شکر نمک میں تبدیل ہو گئی ہے۔ اس کو فقیر کے ساتھ اپنے غلط رویہ پر سخت پچھتاوا ہوا۔ وہ نہایت تیزی سے واپس ہو کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور معافی کا طلبگار ہوا۔ باوا نے اس سوداگر پر مہربانی اور شفقت کرتے ہوئے فرمایا، اسے شکر بن جانے دو اور وہ فوراً شکر بن گئی۔ اسی وقت سے لوگ آپ کو فرید شکر گنجؒ یا فرید شکر کا خزانہ کہنے لگے۔

اکبر کو باوا فرید شکر گنجؒ کی خانقاہ سے بہت زیادہ عقیدت تھی اور وہ پنجاب میں اپنے قیام کے دوران ہمیشہ پاک پتن جا کر آپؒ کے مزار پر حاضری دیا کرتا تھا۔ اس کا اتالیق اور جرنیل بہرام خاں جو فارسی کا ایک بہت اچھا شاعر تھا، اس نے صوفی بزرگ کی روحانی طاقت کی شان میں مندرجہ ذیل اشعار ترتیب دیے:۔

کان نمک جہان شکر شیخ بحر و بر
ان کز شکر نمک کندوا از نمک شکر
کان نمک و گنج شکر شیخ فرید
کز گنج شکر کان نمک کرد پدید
در کان نمک کرد نظر کرد شکر
شیریں تر ازیں کرامتش کس نشنید

ترجمہ:۔ نمک کی کان اور شکر کا جہان شیخ بحر و بر، جو شکر کو نمک اور نمک کو شکر میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ نمک کی کان اور شکر کا خزانہ شیخ فرید ہیں، جو شکر کے ڈھیر سے نمک کی کان بنا سکتے ہیں۔ آپ نے نمک کے ڈھیر پر نظر ڈال کر اسے شکر میں تبدیل کر دیا۔ اس سے زیادہ شیریں کرامت آج تک کسی نے نہ سنی ہو گی۔

سلطان غیاث الدین غوری کے دور میں شیخ وہاں آباد تھے۔ اخیار الاخیار کے مطابق ایک خاص آدمی آپؒ کے پاس حاضر ہوا اور آپؒ سے التجا کی کہ وہ اپنی طرف سے سلطان کے نام ایک سفارشی خط لکھ دیں۔ حضرت نے اس کی درخواست کے مطابق سلطان کو عربی میں مندرجہ ذیل خط لکھا:۔

رفعت قصیہ الی اللہ ثم الیک و ان اعطیہ شیافا المعطی ھو اللہ و انت المشکور و ان لم تعطیہ شیافالمانع ھو اللہ و انت المعذور

ترجمہ :۔ میں اس کے کام کو اللہ اور اس کے بعد تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ کیا تم اس کی درخواست کو مانو گے؟ لیکن حقیقی طور پر قبول کرنے والا اللہ ہے اور تم اس کی مدد کا ذریعہ ہو۔ اگر جو کچھ یہ چاہتا ہے تم پورا نہ کر سکے تو اس کی ممانعت لازماً خدا کی طرف سے ہو گی اور تمہیں یقیناً معافی مانگنا پڑے گی۔

بابا فریدؒ بادشاہ شمس الدین کے دور حکومت میں 663 ہجری بمطابق 1235ء فوت ہوئے۔

مقبرہ انار کلی :۔ انار کلی جس کے نام سے سول سٹیشن کو پکارا جاتا ہے۔ یہ دراصل وہ خطاب تھا جو اکبر کے حرم سرا کی پسندیدہ نادرہ بیگم یا شرف النساء کو دیا گیا۔ ایک دن جب بادشاہ ایک ایسے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا جہاں آئینوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں اور نوجوان انار کلی اس کی خدمت پر مامور تھی۔ اس نے آئینے میں اس کا عکس دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ شہزادہ سلیم (جہانگیر) کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ اپنے بیٹے کے ساتھ اس کی مجرمانہ سازش گردانتے ہوئے، بادشاہ نے اس کو زندہ دفن کرنے کا حکم دے دیا۔ حکم کے مطابق اس کو ایک بلند جگہ پر کھڑا کر کے اس کے چاروں طرف پختہ اینٹوں کی چنائی کر دی گئی۔ سلیم کو اس کی موت پر سخت ندامت ہوئی۔ لہذا اس نے برسراقتدار آنے کے بعد اس کی تربت پر ایک بہت بڑی عمارت تعمیر کرائی۔ تعویذ جو سنگ مرمر کا بنایا گیا ہے نہایت خوبصورت اور کاریگری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ مسٹر ایسٹ وک کے مطابق یہ دنیا میں کندہ کاری کے نمونہ جات میں سے انتہائی بہترین اور اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کے بالائی حصہ پر اللہ تبارک و تعالیٰ کے 99 اسمائے مبارکہ درج ہیں اور اس کے اطراف میں جہانگیر کی طرف سے اپنی محبوبہ کے لیے لکھا گیا فارسی کا مندرجہ ذیل شعر کندہ ہے:۔

تا قیامت شکر گویم کرد گار خویش را
آہ گرمن بازبینم روی یار خویش را

ترجمہ :۔ میں قیامت تک خداوند پروردگار کا شکریہ ادا کرتا رہوں۔
آہ! اگر ایک بار پھر اپنی محبوب کا چہرہ دیکھ لوں۔

تعویذ کے شمال کی طرف اللہ تعالیٰ کے 99 اسمائے گرامی کے نیچے یہ عبارت درج ہے:
مجنون سلیم اکبر

ترجمہ :۔ اکبر کا مجنوں بیٹا سلیم۔
جہانگیر جب شہزادہ تھا تو اس کا نام سلیم تھا۔

عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ سلیم انار کلی کو کس قدر چاہتا تھا اور اس کو اس کی موت کا کس قدر دکھ ہوا۔ یہ ایک مجنونانہ ذہن کا بے ساختہ نتیجہ ہے۔ محبت بھرے دل کا ابال ہے۔ بعد میں اس عمارت کو پروٹسٹنٹ چرچ (جو سینٹ جیمز چرچ انار کلی کے نام سے مشہور تھا) کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔ جب اس کو گرجا کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا تو نعش کو نکال کر اس کی برجیوں میں سے ایک میں دفن کر دیا گیا۔ اس قبر کے تعویذ کو جو مرکزی گنبد کے نیچے تھا، اسی کے ساتھ یہاں سے ہٹا کر اس کے ایک ملحقہ کمرے میں بند کر کے تالا لگا دیا گیا۔ ہندسوں اور حروف میں بتائی گئی تاریخ 1008 ہجری بمطابق 1599ء سے انار کلی کی وفات کا پتہ چلتا ہے۔

تعویذ کی غربی جانب الفاظ " لاہور میں " ایک دوسری تاریخ 1024 ہجری بمطابق 1615ء ملتی ہے جو اس مقبرے کی تعمیر کی تاریخ کا پتہ دیتی ہے۔ اکبر 13 اکتوبر 1605ء کو فوت ہوا۔ پس یہ عمارت اس کی وفات کے دس سال بعد مکمل ہوئی۔

یہ عمارت گول شکل میں ہے اور اس پر ایک وسیع اور بلند و بالا گنبد ہے۔ اس کے اندر 12 فٹ 3 انچ موٹی آٹھ بلند و بالا محرابیں ہیں۔ یہ اولین مغلیہ دور کی بنی ہوئی پختہ اینٹوں کی ایک شاہکار عمارت ہے اور انتہائی صاف ستھری اور خوبصورت ہے۔ مشرق سے مغرب کی طرف اس کی پیمائش 75 فٹ 6 انچ ہے۔

مغل بادشاہوں کے دور میں اس جاذب نظر مقبرہ کے ارد گرد کئی وسیع و عریض باغات تھے اور اس کے ساتھ کئی خوبصورت عمارتیں بنائی گئی تھیں لیکن اب ان کا نام و نشان باقی نہیں ہے۔ اس وقت دریائے راوی اس کی دیوار کے ساتھ بہتا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں اس پر اس کے جانشین اور قائم مقام کھڑک سنگھ نے قبضہ کر لیا لیکن بعد میں اس کو سکھ حکومت کے اطالوی افسر ایم وینتورا کو دے دیا گیا، جس نے اسے نجی رہائش گاہ میں بدل دیا۔ اس کے ساتھ ایم ایلارڈ کا خوبصورت مکان تھا اور اس کے سامنے فرانسیسی افسروں (جن کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے) کے حکم کے تحت سکھ رجمنٹوں اور بٹالین کی قطاریں پریڈ گراؤنڈ میں مشقیں کرتی تھیں۔

بارہ دری نواب وزیر خاں :۔ یہ شاندار عمارت اپنی چار نمایاں گنبدیوں اور خوبصورت محرابوں کے ساتھ (جو غالباً انار کلی کے باغات کی سب سے زیادہ خوبصورت اور مخصوص طرز تعمیر کی حامل عمارت تھی) عجائب گھر اور جنرل پوسٹ آفس کے قریب ایستادہ ہے۔ یہ انتہائی خوبصورت عالی شان اور نفیس طرز تعمیر کی حامل ہے۔ اس میں اس تعمیراتی ذوق کی جھلک نظر آتی ہے جو شاہجہاں کے دور میں امراء میں پایا جاتا تھا، جس طرح نام سے ظاہر ہے اس کی بارہ محرابیں ہیں۔ یعنی مربع عمارت

کی ہر جانب تین ہیں۔ اس بارہ دری کو بادشاہ شاہجہاں کے انتہائی قابل وزیر اور شہر میں اسی نام کی شاندار مسجد کے بانی حکیم علم الدین المعروف وزیر خاں نے تعمیر کروایا تھا۔ محمد صالح لاہوری کی کتاب " شاہجہاں نامہ " کے مطابق جب شہر میں وزیر خاں اپنی مسجد کی تعمیر سے فارغ ہوا تو اس نے اس جگہ ایک خوبصورت باغ لگانے پر اپنی توجہ مرکوز کی اور اس کو ایک خوبصورت عمارت سے آراستہ کیا۔ کھجور کے بیشمار درختوں پر مشتمل ہونے کے باعث اس کو " وزیر خاں کا نخلیہ باغ " کہا جاتا تھا۔ گرد و نواح کے علاقہ میں ان درختوں میں سے کافی ابھی تک موجود ہیں اور انتہائی دلکش نظارہ پیش کرتے ہیں۔

سکھوں کے دور میں یہ چھاؤنی کا حصہ تھی۔ برطانوی دور میں حکومت کے تحت میاں میر فوجی چھاؤنی بننے سے قبل یہاں پر فوجیوں کے کوارٹر تھے اور اس عمارت کو فوجی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ یکے بعد دیگرے چھاؤنی اور تار گھر کے طور پر استعمال کرنے کے بعد اس کو عجائب گھر بنا دیا گیا۔

پنجاب پبلک لائبریری :۔ آخرکار اس سے پنجاب پبلک لائبریری کے طور پر استفادہ کیا گیا۔ یہ ایک ایسا عظیم کام تھا جو اس سے پہلے نہیں کیا گیا تھا۔ اس عمارت کا بانی خود بھی علم و فضل کا سرپرست اور مشہور عالم تھا اور اس خصوصیت اور اہمیت کے ادارے کے ساتھ اس کے نام کی نسبت پنجاب کی نئی نسل کے لیے ایک خوش کن اتفاق ہو گا۔

چوبرجی :۔ چوبرجی کے نام سے مشہور عمارت جو ملتان روڈ کے مغرب میں واقع ہے۔ یہ دراصل اورنگ زیب کی، عالم فاضل صاحبزادی زیب النساء یا زینبدہ بیگم جس کا تخلص مخفی تھا کے باغ کا دروازہ ہے۔ بیرونی دروازوں کو چمکدار روغنی ٹائلوں، نیلے اور سبز رنگ کی مینا کاری اور خوبصورت نقش و نگار سے آراستہ کیا گیا ہے اور یہ کام اڑھائی صدیاں گزر جانے کے باوجود ابھی تک تر و تازہ اور نمایاں ہے۔ یہ باغ دراصل نواں کوٹ سے شہر لاہور تک پھیلا ہوا تھا لیکن اب اس کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ اس عمارت کے بالائی حصہ پر نیلے رنگ کی روغنی ٹائلوں میں عربی حروف میں قرآن پاک کی آیت الکرسی درج ہے۔ اس کے آخر میں اس عمارت کی بنیاد کا سال لکھا گیا ہے۔ یعنی 1056 ہجری بمطابق 1646ء جس کے اگلے سال اورنگ زیب نے بلخ کے لیے فوجی مہم روانہ کی تھی لیکن پسپا ہونے پر مجبور ہو گیا تھا۔

قرآن پاک کا قطعہ جس کے بارے میں اوپر ذکر کیا جا چکا ہے مندرجہ ذیل ہے :۔

اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم لا تاخذہ سنۃ و لا نوم لہ ما فی السموت و ما فی الارض من

ذالذی یشفع عندہ الا باذنہ یعلم ما بین ایدیھم و ما خلفھم ولا یحیطون بشی ء من علمہ الا بما شاء وسع کرسیہ السموات والارض ولا یئودہ حفظھما وھو العلی العظیم۔

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ (ایسا ہے کہ) اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ زندہ ہے، سنبھالنے والا ہے (تمام عالم کا) نہ اس کو اونگھ دبا سکتی ہے اور نہ نیند۔ سب کچھ جو آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اسی کی ملکیت ہے۔ ایسا کون شخص ہے جو اس کے پاس (کسی کی) سفارش کر سکے بغیر اس کی اجازت کے، وہ جانتا ہے ان کے تمام ظاہر و پوشیدہ حالات کو اور وہ موجودات اس کی معلومات میں سے کسی چیز کو اپنے احاطہ علمی میں نہیں لا سکتے مگر جس قدر علم دینا وہی چاہے۔ اس کی کرسی نے آسمانوں اور زمین کو ڈھانپ رکھا ہے اور اللہ کو دونوں کی حفاظت کچھ گراں نہیں گزرتی اور وہ عالی شان عظیم الشان ہے۔

محراب کے اوپر فارسی کے مندرجہ ذیل اشعار درج ہیں:۔

لنا پذیر شد این باغ روضہ رضواں
بگشت مرحمت این باغ برمیان بائی
ز لطف صاحب زبیدہ بگیم دوران

ترجمہ:۔ یہ باغ جنت کے باغ کی طرز پر بنایا گیا ہے۔
(دوسری سطر مٹ گئی ہے)
یہ باغ میاں بائی کو مرحمت کر دیا گیا ہے۔
زبیدہ بگیم دوران کے لطف و کرم سے۔

اس خوبصورت عمارت کے تین مینار تو زمانے کی دست برد سے بچ گئے لیکن شمال مغرب کی جانب والا چوتھا مینار اور اسی جانب کی ایک دیوار کا حصہ گر چکے ہیں۔ درمیانی محراب کے شمال اور جنوب میں واقع محرابوں کی دونوں اطراف میں عربی کے نیلے حروف میں لفظ "اللہ" درج ہے اور یہ دائرہ کے اندر لکھا ہوا ہے۔ یہاں ایک گنبد بھی تھا لیکن اس کا زیادہ تر حصہ اب غائب ہو چکا ہے۔

میاں بائی:۔ میاں بائی زینبدہ بگیم کی پسندیدہ کنیز تھی اور جب یہ باغ مکمل ہو گیا تو شہزادی نے یہ اس کو بخش دیا۔ "شاہجہاں نامہ" کے مطابق میاں بائی کو باغ کا یہ تحفہ مندرجہ ذیل حالات کے

تحت دیا گیا تھا۔ اس باغ کو زینبدہ بیگم کے حکم سے لگایا گیا اور اس کی پسندیدہ کنیز میاں بائی نے اس کی تعمیر کی نگرانی کی تھی۔ ایک روز جب باغ اپنی تکمیل کے قریب تھا اور شہزادی اس کی طرف جا رہی تھی تو اس نے لوگوں کو کہتے سنا کہ شہزادی میاں بائی کے باغ کو دیکھنے جا رہی ہے۔ اس نے یہ دیکھتے ہوئے کہ باغ کو پہلے ہی سے اس کی کنیز کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے تو اس نے اس کو یہ تحفہ کے طور پر دینے کا ارادہ کر لیا جیسے ہی وہ باغ میں پہنچی اور دروازے میں قدم رکھا تو میاں بائی اس کے استقبال کے لیے آگے بڑھی۔ اس کی تعظیم بجا لائی۔ اسے خوش آمدید کہا اور اس کی طویل العمری کے لیے دعا کی۔ یہ دعا دراصل باغ کے تحفہ کی علامت تھی اور شہزادی جو پہلے ہی سے اس کا ارادہ کر چکی تھی اس نے فوراً میاں بائی کو تحفہ میں دے دیا۔ دروازے پر فارسی اشعار میں اس تحفے کا واقعہ درج ہے۔ اس کے بعد شہزادی نے موجودہ نواں کوٹ کے مقام پر اپنا باغ تعمیر کرانا شروع کر دیا۔ جس کو اس کے نام کی نسبت سے زینبدہ بیگم کا باغ کہا جانے لگا۔

لارڈ لارنس کی کوٹھی :۔ اسی سڑک پر سول سٹیشن کے شمال جنوبی طرف لارڈ لارنس نے 1849ء میں ایک وسیع و عریض کوٹھی تعمیر کرائی۔ بعد میں یہ پنجاب کی چیف کورٹ کے پہلے بیرسٹر جج، چارلس باؤل نوئس بہادر کی ملکیت بنی، جنہوں نے اس میں مزید اضافہ کیا اور اس کے بعد اسی عدالت کے چیف جج سر میریڈیتھ پلوڈین کی ملکیت بن گئی۔

مقبرہ و باغ زیب النساء :۔ سرغام الدولہ کی تصنیف شاہجہاں نامہ کے مطابق جب اورنگ زیب کی عالم و فاضل بیٹی زیب النساء نے چوبرجی کے مقام پر اپنا باغ اپنی پسندیدہ کنیز میاں بائی کو تحفہ میں دے دیا تو اس نے اس مقام پر جہاں اب موضع نواں کوٹ واقع ہے ایک وسیع و عریض باغ لگوایا۔ اس باغ میں اس نے خوبصورت عمارتیں اور بارہ دریاں تعمیر کرائیں۔ اس کے وسط میں اس نے خود اپنے لیے ایک مقبرہ تعمیر کرایا اور انتقال کے بعد اس کو لاہور میں اسی مقبرے میں دفن کیا گیا۔ یہ لاہور کی خوبصورت ترین عمارات میں شمار ہوتی تھی اور اس کو قیمتی پتھروں سے آراستہ کیا گیا تھا اور اس میں بارہ دریاں، فوارے اور حوض بنائے گئے تھے۔ فرش سنگ مرمر کا تھا اور کھڑکیاں بھی اسی پتھر کی جالیوں سے بنائی گئی تھیں لیکن رنجیت سنگھ نے اس عمارت کو تمام قیمتی پتھروں سے محروم کر دیا اور حضوری باغ میں تعمیر کی جانے والی بارہ دری میں استعمال کر لیا اور اب اس خوبصورت عمارت کا کچھ بھی نہیں بچا سوائے ایک ڈھانچے کے۔ جبکہ اس باغ اور اس سے ملحقہ عمارات کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ سوائے اس کی مشرقی جانب چار دیواری کے اندر آباد محلہ کے اور اس کے شمال اور جنوبی کونوں پہ موجود گنبد کی وسعت، اس کی بلند و بالا محرابیں اور مقبرے

سے ملحقہ سنگ مرمر کا فرش، اس کی سابقہ عظمت اور خوبصورت طرز تعمیر کی واضح دلیل ہے اور یہ جگہ تاریخی لحاظ سے دلچسپی کی حامل ہونے کی وجہ سے یادگار بن گئی ہے۔

زیب النساء جس کا تخلص مخفی تھا، اورنگ زیب کی سب سے بڑی بیٹی تھی۔ اس نے ساری عمر شادی نہ کرائی۔ اس کا دلکش دیوان یا نظموں کا مجموعہ شاہکار ہے۔ وہ 1080 ہجری بمطابق 1669ء فوت ہوئی۔ اس کا قطعہ تاریخ ایک شاعر نے لکھا:۔

آہ زیب النساء بحکم قضا — ناگہاں از نگاہ مخفی شد

منبع علم و فضل و حسن و جمال — ہمچو یوسف بچاہ مخفی شد

سال تاریخش از خود جستم — گفت ہاتف کہ ماہ مخفی شد

ترجمہ:۔ آہ! زیب النساء بحکم قضا، اچانک آنکھ سے اوجھل ہو گئی ہے۔ منبع علم و فضل و حسن و جمال، وہ ہم سے ایسے چھپ گئی ہے جس طرح یوسف کنویں میں تھے۔ میں نے اس کی تاریخ وفات کا سال تلاش کیا تو غیبی آواز آئی کہ: چاند چھپ گیا ہے (93)۔

نواں کوٹ میں شمال کی طرف سے ایک دروازے کے ذریعے داخل ہوا جاتا ہے جو ایک طویل بازار کی طرف کھلتا ہے لیکن باغ کا عالی شان قدیم دروازہ جس کے ساتھ محرابی چھتوں والے کمرے، غلام گردشیں اور کھڑکیاں بنی ہوئی ہیں اور ابھی تک درست حالت میں ہے، مشرقی جانب واقع ہے۔ یہ انتہائی خوبصورت دروازہ روغنی مینار کاری، پتھر میں کندہ کاری اور جدید مغلیہ دور کی تصویر کشی کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس دور میں فن تعمیر کس حد تک ترقی کر چکا تھا۔ دروازے کے چار خوبصورت مینار ہیں۔ ہر ایک کے ساتھ گنبد ہیں اور بارہ محرابی ستون اسے سہارا دیے ہوئے ہیں۔ ان کے فرش کے چاروں طرف پتھر کی جالیاں لگی ہوئی ہیں، جن کے کچھ حصے ابھی تک موجود ہیں۔ باغ کے شمال اور جنوب میں بھی ایک ایک مینار ہے اور اس پر انتہائی خوبصورت منقش روغنی کام سے تزئین کی گئی ہے۔ اب یہ سب کچھ زمینداروں کے قبضہ میں ہے، جنہوں نے ان حسین و جمیل عمارات کا بہت غلط استعمال کیا ہوا ہے (94)۔

نواں کوٹ :۔ موضع نواں کوٹ (دوسرے لفظوں میں زینبدہ بیگم کے باغ کے نام سے مشہور ہے) لاہور کی حکومت ثلاثہ یعنی تین سکھ حکمرانوں سوبھا سنگھ، لہنا سنگھ اور گوجر سنگھ بھنگیوں کے دور حکومت میں نہایت عروج پر پہنچ چکا تھا۔ 1810 سمت میں حجرہ شاہ مقیم کے موضع گھلن کے مہر عظمت اللہ کے بیٹے مہر محکم دین اپنے بھائیوں مہر شادی اور عبدالرحیم کے ساتھ یہاں آکر آباد ہو

گئے۔ ثلاثہ حکمرانوں میں لاہور کی تقسیم کے بعد نواں کوٹ سوبھا سنگھ کے حصہ میں آیا، جس کی اجازت سے مہر محکم دین نے 1820 سمت میں پختہ اینٹوں کی موجودہ دیوار گاؤں اور شمالی گزرگاہ کے ارد گرد تعمیر کرائی جو اب گزرگاہ کے طور پر استعمال ہو رہی ہے۔ دیوار کی تعمیر کے لیے خود سوبھا سنگھ نے بھی پانچ سو روپے دیے لیکن اس کو ابھی بہت زیادہ رقم درکار ہو گی۔ محکم دین، مہاراجہ رنجیت سنگھ کا بہت زیادہ حامی تھا اور اس نے لاہور پر قبضہ کرنے کے لیے اس کی مالی طور پر بھی اعانت کی تھی۔ مہاراجہ اسے " باپو " کہہ کر بلاتا تھا لیکن بعد میں اس سے دشمنی پیدا کر کے اسے تباہ کر دیا۔ اس کی اولاد ابھی تک نواں کوٹ میں آباد ہے (95) ۔

مقبرہ شاہ رستم غازی :۔ موضع نواں کوٹ کے مغرب میں مقبرہ زیب النساء سے کچھ فاصلے پر ایک بلند ٹیلہ ہے، اس پر شاہ رستم غازی کا مزار واقع ہے۔ وہ ایک بلند پایہ عالم اور زیب النساء کے استاد تھے۔ وہ 1064 ہجری بمطابق 1653ء شاہجہاں کے دور میں فوت ہوئے۔ اسی سال وزیر سعد اللہ کا انتقال ہوا۔ زیب النساء نے یہ مقبرہ سنگ سرخ سے تعمیر کرایا تھا۔ تاہم اس کا پتھر رنجیت سنگھ نے اتار لیا۔ پختہ چبوترے کے نیچے پکی اینٹوں کے دو تہہ خانے ہیں (تاہم اب یہ شکستہ حالت میں ہیں) ان تہہ خانوں میں سے ایک کو حال ہی میں زمینداروں نے مرمت کروایا ہے۔ اس میں دو مزارات ہیں۔ ایک رستم غازی کا اور دوسرا ان کے بیٹے کا ہے۔ دوسرے کمرے میں بھی دو قبریں ہیں۔ جن میں سے ایک رستم غازی کی والدہ کی اور دوسری ان کی زوجہ کی ہے۔

ان قبروں کے چبوترہ کی شرقی جانب قریب ہی ایک پرانا تالاب ہے جو اب کھنڈر بن چکا ہے۔

نیلا گنبد :۔ نیلا گنبد ایک بلند و بالا اور وسیع و عریض عمارت ہے جس پر ایک بہت بڑا گنبد سایہ فگن ہے اور اس کو منقش روغنی کام سے آراستہ کیا گیا ہے۔ یہ انار کلی سے سینٹ ہال کی طرف آنے والی سڑک کے دوراہا پر واقع ہے۔ محرابی چھت کے نیچے غزنوی صوفی بزرگ عبد الرزاق مکی سبزواری دفن ہیں۔ آپ ہمایوں کے دور میں غزنی سے تشریف لا کر لاہور میں آباد ہو گئے تھے۔ آپ کا مقبرہ یادگار کے طور پر آپ کے مریدوں نے تعمیر کرایا تھا۔ انہوں نے اس کے ساتھ ایک بہت بڑی مسجد بھی بنوائی۔ اس مسجد کے معمار جو انتہائی پرہیزگار شخص تھے۔ ان کا نام محفوظ ہے۔ سکھوں کے دور میں اس مسجد کو توپ خانہ اور اسلحہ خانہ کے طور پر استعمال کیا گیا اور برطانوی دور کے آغاز میں اسے طعام خانہ (میس) کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔ لیکن 1856ء میں اسے مسلمانوں کے سپرد کر دیا گیا اور انار کلی کے مسلمان تاجر اس کی مناسب مرمت کراتے رہے، جبکہ خود مقبرے کو یکسر

انداز کر دیا گیا۔ یہ گنبد تاجر شیخ رحیم بخش مرحوم کی سرائے میں واقع ہے۔ اس صوفی بزرگ کو ان کی خواہش کے مطابق اس حجرے میں دفن کیا گیا، جہاں آپ نماز ادا کیا کرتے اور عبادت کیا کرتے تھے۔

یہ مقبرہ کافی عرصہ تک گنبد کے بغیر رہا۔ اس سلسلہ میں ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ وہاں پر ہر جمعرات کو ایک شیر آیا کرتا تھا اور وہ اپنی دم کو جھاڑو کے طور پر استعمال کر کے اس جگہ کی صفائی کیا کرتا تھا۔ آخرکار اس خانقاہ کے متولی کو خواب میں حضرت موج دریا بخاریؒ کی زیارت ہوئی اور انہوں نے اس طرف اشارہ کیا کہ عبدالرزاق کی قبر پر ایک بہت بڑا گنبد تعمیر کیا جائے۔ لہذا ایسا ہی کیا گیا۔

مسجد بہت بڑی اور وسیع و عریض ہے۔ اس میں ایک انتہائی کشادہ صحن ہے جس میں نمازیوں کے وضو کرنے کے لیے بہت بڑا حوض ہے۔ اس کے ساتھ قرآن پاک کی تدریس کے لیے ایک مدرسہ بھی ہے۔ مدرسہ اور مسجد دونوں بہت اچھی حالت میں ہیں۔

مقبرہ شاہ چراغؒ:۔ اس مزار کا عالی شان گنبد اکاؤنٹنٹ جنرل آفس کے قریب واقع ہے۔ حضرت عبدالرزاق المعروف شاہ چراغؒ کے آباؤ اجداد اچ بہاولپور کے رہنے والے تھے اور ان کا شجرہ نسب حضرت عبدالقادر جیلانی پیر دستگیرؒ سے جا ملتا ہے۔ حضرت شاہ چراغؒ شاہجہاں کے دور حکومت میں آباد ہوئے اور ان کا انتقال 1068 ہجری بمطابق 1657ء ہوا۔ موجودہ مقبرہ ان کی یادگار کے طور پر اورنگ زیب بادشاہ کے حکم سے تعمیر ہوا۔

جس مقام پر اس وقت مزار موجود ہے، یہاں مسلمان بادشاہوں کے دور میں شہر لاہور کا ایک قدیم محلہ ہوا کرتا تھا، جسے "محلہ لنگر خاں" کہا جاتا تھا۔ لنگر خاں بلوچ تھا اور حضرت شاہ چراغ کا معتقد تھا۔ اس کے مغرب میں واقع مسجد اب اکاؤنٹنٹ جنرل آفس کے قبضہ میں ہے۔ اس کو بادشاہ محمد شاہ کے دور حکومت میں حاکم لاہور نواب خاں بہادر خاں نے تعمیر کروایا تھا۔ اس کو نواب کی والدہ کے زیورات بیچ کر اس سے حاصل ہونے والی رقم سے تعمیر کروایا گیا کیونکہ اس نے اس بات کی خواہش کی تھی۔ حضرت شاہ چراغؒ کے مزار پر ہر سال عرس کا میلہ لگتا ہے۔

مقبرہ خواجہ محمد سعیدؒ لاہوری:۔ یہ مزار ایک چار دیواری میں نیلا گنبد کی مخالف سمت مشرق کی جانب واقع ہے۔ خواجہ محمد سعید ایک عظیم سیاح اور نہایت عالم فاضل شخص تھے۔ اپنے سفر کے دوران وہ کابل پہنچے اور کچھ عرصہ تک وہاں مقیم رہے۔ بادشاہ احمد شاہ درانی کو آپ کا علم ہوا تو وہ آپ کا معتقد ہو گیا۔ وہ آپ سے بہت زیادہ عقیدت رکھتا تھا۔ جب اس بادشاہ نے پنجاب پر تیسری مرتبہ حملہ کیا تو کہا جاتا ہے کہ شیخ کے اس بادشاہ پر اثر و رسوخ کی وجہ سے لاہور تباہی و بربادی سے

محفوظ رہا۔ انہوں نے بادشاہ کو ایک مختصر خط لکھا اور اسے کہا کہ خدا کے لوگوں کو تنگ مت کرو۔ احمد شاہ شہر کو لوٹنے سے باز رہا اور فقیر کو خراج عقیدت پیش کرنے کی غرض سے بہ نفس نفیس ان کے پاس حاضر ہوا۔ آپ علی گوہر شاہ عالم ثانی کے دور میں یہاں آباد تھے۔ آپ کا انتقال 5 ربیع الاول 1181 ہجری بمطابق 1767ء کو ہوا۔ آپ نے اپنے پیچھے دو صاحبزادیاں چھوڑیں، جن کی اولاد آج تک موجود ہے۔ اس مزار پر ایک سالانہ عرس منعقد ہوتا ہے اور کابل کے سردار اسے بڑی عقیدت و احترام سے مناتے ہیں۔ اس صوفی بزرگ کے خاندان کی ایک شاخ جلال آباد (افغانستان) میں رہتی ہے اور دوسری شاخ لاہور میں آباد ہے۔ جب امیر دوست محمد خاں کا بھائی سردار سلطان محمد خاں، رنجیت سنگھ کے دور میں لاہور میں مقیم تھا تو وہ اکثر آپ کے مقبرہ پر حاضری دیا کرتا تھا۔

مقبرہ حضرت شاہ شرفؒ:۔ حضرت خواجہ محمد سعیدؒ کے مزار کے شمال میں ایک چار دیواری میں حضرت شاہ شرفؒ کا مزار واقع ہے۔ آپ انتہائی بصیرت والے اور اہل علم بزرگ تھے۔ آپ کی پرہیزگاری کی دھوم دور دراز تک پھیل گئی تھی۔ آپ عالمگیر کے دور میں یہاں آباد ہوئے اور آپ کا انتقال 1104 ہجری بمطابق 1692ء ہوا۔ آپ کا شاندار مقبرہ ٹیکسالی دروازہ کے سامنے انگریزوں کے موجودہ قبرستان کے شمال میں تعمیر کیا گیا تھا۔ مقبرہ شاہ شرف اور اس سے ملحقہ مسجد دونوں عمارتیں فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ تھیں اور عمر رسیدہ لوگ جن کے ذہنوں میں ابھی تک ان کی یاد باقی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ شان و شوکت اور خوبصورت طرز تعمیر کے لحاظ سے ان کا شمار لاہور کی انتہائی شاندار اور مکمل عمارتوں میں ہوتا تھا۔ دیواروں کو اندرونی جانب سنگ مرمر اور بیرونی جانب سنگ سرخ اور منقش روغنی کام سے آراستہ کیا گیا تھا۔

جب رنجیت سنگھ نے شہر کی فصیل کے ارد گرد خندق کھدوانی شروع کی اور اس میں مزید ایک اور دیوار کا اضافہ کیا تو مقبرہ اور مسجد دونوں اس کے احاطہ میں آگئے۔ رنجیت سنگھ کے حکم سے انہیں زمین بوس کر دیا گیا اور ان کا قیمتی پتھر سکھ گردوارہ کو آراستہ کرنے کے لیے امرتسر روانہ کر دیا گیا۔ حضرت شاہ شرفؒ کے جسد خاکی پر مشتمل تابوت کو باہر نکال کر مہاراجہ کے طبیب فقیر نورالدین کے ذریعے موجودہ مقام پر دفن کیا گیا۔

مقبرہ سید محمد شاہ موج دریا بخاریؒ:۔ یہ مزار انار کلی، پولیس کورٹ اور کڑی باغ یا سابق رہائش گاہ جنرل وینتورا، آہلو والیہ ہاؤس کے قریب واقع ہے۔ گنبد اس کا اینٹوں کا ہے اور ایک بلند چبوترہ پر واقع ہے۔ جنوب کی طرف بیرونی دروازے کے اوپر منقش روغنی کام میں مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

روضہ مقدسہ زبدۃ الواصلین قدوۃ العارفین مقبول بارگاہ ایزد باری

میران سید محمد شاہ موج دریابخاری نور اللہ مرقدہ در عہد اکبر شاہ تعمیر یافت۔

ترجمہ:۔ مزار مبارک، واصلین میں سب سے بہتر اور عارفین میں سب سے اعلیٰ

اور بارگاہ خداوندی میں مقبول میران سید محمد شاہ موج دریابخاریؒ (اللہ آپ کی

قبر کو روشن کرے) اکبر بادشاہ کے دور میں تعمیر کیا گیا۔ اس مزار کو اکبر نے ان

کی زندگی میں 1000 ہجری بمطابق 1591ء تعمیر کروایا تھا۔

سید محمد شاہ بہاولپور میں اوچ کے رہنے والے تھے۔ چتوڑ کے طویل محاصرہ کی وجہ سے اکبر کو بہت زیادہ تشویش لاحق تھی۔ لہٰذا اس کے شاہی نجومیوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اس صوفی بزرگ سے روحانی اعانت کی درخواست کرے۔ اکبر فقیر کے پاس ننگے پاؤں گیا اور کہا جاتا ہے کہ بزرگ کی دعا سے وہ ناقابل تسخیر قلعہ فتح ہو گیا۔ بادشاہ کے پرزور اصرار پر فقیر نے لاہور میں رہائش اختیار کر لی اور خود اکبر نے بھی اسی کو دارالحکومت بنا لیا۔ اکبر نے انہیں بٹالہ میں ایک لاکھ روپے کی جاگیر پیش کی اور اس آمدنی سے لاہور اور بٹالہ کے بے شمار خیرات خانوں کی بڑی فیاضی سے دیکھ بھال کی جاتی تھی۔ سید کا انتقال 1013 ہجری بمطابق 1604ء ہوا اور آپؒ موجودہ مقبرے میں دفن کیے گئے۔ مسلمان آپ کے مزار کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔ آپ کی اولاد کی لوگ آج بھی بڑی عزت و توقیر کرتے ہیں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ اس خانقاہ سے بڑی عقیدت رکھتا تھا۔ لہٰذا اس نے اس کے لیے چالیس روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر کیا اور اس کے علاوہ دیگر نذرانے بھی پیش کیے۔

مقبرہ کی دیواروں کے گرد فارسی رسم الخط میں فارسی کے مندرجہ ذیل اشعار درج ہیں:۔

زر و ضات جہان بردار دل را — ز جسم خلق دان این آب و گل را

رخ و جہسی در خدا کن — دل خود را ازین دنیا جدا کن

کہ آخر کار دنیا ناتمام است — درون خاک ہر کس را مقام است

بتوفیق خدای لطف گستر — بارواح بزرگان مظہر

بسعی سیدی رحمت شاہ بخاری — مرتب گشت اسفید اج کاری

خرد تاریخ اور در گوش ہر کس — بگفتار روضہ والا مقدس

ترجمہ:۔ تم دنیا کے معاملات سے اپنی توجہ ہٹا دو اور یہ جان لو کہ تم کو پانی اور

مٹی سے بنایا گیا ہے۔ اپنا دھیان اللہ کی طرف لگا دو اور دنیا سے اپنا ذہن ہٹا دو

کیونکہ آخرکار دنیا نے ختم ہو جانا ہے اور ہر کسی کا مقام زمین کے اندر ہے۔

خدائے پاک کے لطف و کرم اور توفیق سے اور پاک و مطہر بزرگوں کی روحوں کے طفیل سید رحمت شاہ بخاری کی کوشش سے آخرکار یہ شاندار عمارت تعمیر ہوئی۔ خرد نے اس کی تاریخ بنیاد کے بارے میں کہا: شاندار اور مقدس مقبرہ

قطعہ تاریخ میں عمارت کی تاریخ 1253 ہجری بمطابق 1837 عیسوی دی گئی ہے۔

گذشتہ پیراگراف میں بتائی گئی تاریخ کے مطابق سید رحمت شاہ بخاریؒ نے مقبرے کی مرمت کے وقت ان اشعار کو درج کرایا تھا۔

شمالی دیوار کے اوپر یہ شعر درج ہے:۔

محمد عربی کہ آبروے ہر دو سر است

کسے کہ خاک درش نیست خاک بر سر او

ترجمہ:۔ محمدؐ دونوں جہانوں کی آبرو ہیں۔

جو کوئی ان کے در کی خاک نہیں ہے اس کے سر پر خاک پڑے!

کڑی باغ یا مکان آہ لو والیہ:۔ حضرت موج دریا کے مقبرہ کے قریب مکان آہ لو والیہ یا مکان متعلقہ راجہ کپور تھلہ ہے۔ لوگ اس کو کڑی باغ یا "بیٹی کا باغ" کہتے ہیں۔ دراصل اس مکان کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت کے فرانسیسی افسر ایم ایلارڈ نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کی لڑکی فوت ہونے کے بعد اس مکان سے ملحقہ باغ میں دفن کی گئی تھی۔ جس کی وجہ سے یہ کڑی باغ کہلانے لگا۔ متوفیہ کی قبر، باغ کے شمال مغربی جانب واقع ایک ٹیلے پر موجود ہے اور فرش میں نصب ایک تختی پر مندرجہ ذیل عبارت فرانسیسی زبان میں درج ہے:۔

To Marie Charlotte, decedee le 5me Avril 1827, fille de M.Allard de st.

Topiz Chiva lier de la Legion d,Honneur General de la Cavalerie.

بیرونی دروازے کے اوپر فارسی عبارت میں متوفیہ کا نام دیا گیا ہے۔

مقبرہ شیخ عبداللہ شاہ:۔ شیخ عبداللہ شاہ بلوچؒ کا مقبرہ مزنگ کے شمال مغربی کونے میں ایک چار دیواری کے اندر واقع ہے۔ مزار کے اوپر موجودہ گنبد مزنگ کے نمبردار سردار خاں بلوچ نے 1275 ہجری بمطابق 1858ء میں تعمیر کروایا۔ اس نے اس کے قریب ایک بہت بڑی مسجد

تعمیر کرائی اور وہ اس کے اوپر عالی شان چار مینار تعمیر کرانا چاہتا تھا لیکن ان میں سے ابھی دو ہی بنائے گئے تھے کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ یہ مسجد ایک دلکش عمارت ہے اور اس کے عالی شان مینار کافی دور سے نظر آ جاتے ہیں۔ عبداللہ شاہ لاہور میں اس شہر کے تین حکمرانوں کے دور میں آباد ہوئے۔ انہوں نے مزنگ کے مغرب میں ایک نیا گاؤں آباد کیا جو ان کے نام پر کوٹ عبداللہ شاہ کہلاتا ہے۔ وہ پنجابی زبان کے شاعر تھے اور ان کے اشعار آج بھی لوگوں کو زبانی یاد ہیں۔ آپ بڑے عالم فاضل شخص تھے۔ ان کا انتقال 1212 ہجری بمطابق 1797ء کو ہوا۔

مقبرہ شاہ ابو اسحاق قادریؒ :۔ یہ مقبرہ موضع مزنگ کے مشرق میں واقع ہے۔ یہ مربع شکل کا ہے اور اس پر ایک عالی شان گنبد ہے۔ مزار کے مغرب میں ایک بہت بڑی مسجد بمعہ تین محرابوں اور حاشیہ دار فرش کے موجود ہے۔ مقبرے کی دیواروں کے اندرونی جانب قرآن پاک کی سورہ یٰسین اور سورہ ملک، عربی رسم الخط میں ابھرے ہوئے حروف میں نہایت خوب صورتی اور عمدگی سے لکھی گئی ہیں۔ غربی دروازے کے اوپر فارسی کے مندرجہ ذیل اشعار درج ہیں:۔

حضرت شیخ شاہ ابو اسحاق — بود چون از خدا خدا طلبش
موی حق رفت از سر تحقیق — کہ ہمیں وعدہ بود از لش
جست تاریخ فوت او برحان — یافت سلطان عارفان بلقش

ترجمہ:۔ حضرت شیخ شاہ ابو اسحاق کو خدا کا بندہ ہونے کے باعث خدا نے طلب کر لیا ہے۔ آپ حق کو تلاش کر کے خدا کے پاس گئے ہیں کیونکہ اس بارے میں ازل سے ان کے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا۔ برہان نے آپ کی تاریخ وفات تلاش کی تو اس کو ان کے لقب " سلطان عارفاں " میں ڈھونڈ لیا۔

شمال مغربی کونے میں 985 ہجری بمطابق 1577ء کی تاریخ دی گئی ہے۔ مسجد کی جنوب مغربی جانب اس کے مساوی ایک اور شاندار گنبد ہے لیکن اب وہ شکستہ حالت میں ہے۔ اس گنبد میں حضرت ابو اسحاق کے صاحبزادوں محمد حسین، مالک حسین اور یار حسین کے مزارات ہیں۔ گنبد کی اندرونی جانب چاروں طرف سورہ یٰسین لکھی گئی ہے۔

حضرت شاہ ابو اسحاق اکبر کے دور حکومت میں 5 محرم 985 ہجری بمطابق 1577ء کو فوت ہوئے۔ آپ انتہائی پرہیزگار اور عالم فاضل شخص تھے۔ آپ کی برسی پر ایک میلہ منعقد ہوتا ہے۔

چھٹی بادشاہی :۔ سکھوں کے مطابق یہ وہ مقام ہے جہاں ان کے چھٹے گرو، ہرگوبند (جن کو " چھٹا

بادشاہ " کہا جاتا ہے) عام طور پر رہا کرتے تھے۔ یہ موضع مزنگ کے مشرق کی طرف جیل روڈ پر واقع ہے۔ سکھ اس جگہ کو " دربار صاحب " کہتے ہیں۔ یہ عبادت گاہ ایک چھت دار مکان ہے اور پختہ اینٹوں کے چبوترے پر واقع ہے۔ اس کے ساتھ سنگ مرمر کی سیڑھیاں ہیں۔ اس کے ساتھ ملحقہ ایک باغ اور ایک سرائے کے علاوہ وسیع و عریض دیوان، حجرے اور مسافروں کے قیام کے لیے کمرے بھی موجود ہیں۔ ان کمروں میں سے ایک میں مقدس کتاب گرنتھ رکھی گئی ہے اور اس کے اوپر قیمتی ریشمی کپڑے کا شامیانہ یا چھتری لگائی گئی ہے۔ ہر ماہ کی چھ تاریخ کو سکھوں کی ایک بہت بڑی تعداد یہاں پر اپنے چھٹے بادشاہ کی یاد منانے کے لیے اکٹھی ہوتی ہے۔ تب وہاں کڑھا پرشاد (ایک طرح کی مٹھائی کی قسم) تقسیم ہوتا ہے اور رات کو عمارت پر چراغاں کیا جاتا ہے۔

تالاب لکھپت رائے :۔ لکھپت رائے کا تالاب شہر کے جنوب میں دو میل کے فاصلے پر موضع مزنگ کی مشرقی جانب نئے آباد شدہ موضع بھون کے قریب واقع ہے۔ یہ پتھر سے تعمیر کردہ بہت بڑا تالاب ہے۔ اس کے قریب اس کے بھائی جسپت رائے کا تالاب تھا لیکن اس کو مسمار کر دیا گیا ہے۔ تیسرے بھائی نرپت رائے کا تالاب، سرائے گولان والا یا سنٹرل جیل کے مشرق میں واقع ہے لیکن اب یہ قابل مرمت نہیں ہے اور کافی عرصہ سے لوگوں کے زیر استعمال بھی نہیں ہے (96)۔

روایت بیان کی جاتی ہے کہ جب یہ تینوں تالاب مکمل ہو گئے تو ایک مخصوص فقیر نے نرپت رائے کے تالاب میں اپنے گندے چیتھڑے دھونے شروع کر دیے لیکن اس کے آدمیوں نے اسے پھٹے پرانے لباس کو دھونے سے منع کر دیا۔ اس کے بعد وہ جسپت کے تالاب پر گیا اور اسی عمل کو دھرایا لیکن اس کے نوکروں نے بھی اس فقیر کو اس جگہ کپڑے دھونے سے باز رکھا۔ مایوس فقیر اس کے بعد لکھپت رائے کے تالاب یعنی تیسرے تالاب پر گیا۔ اس کے آدمیوں نے بھی اس بات پر اعتراض کیا کہ فقیر اپنے چیتھڑوں کی میل سے پانی کو آلودہ کر رہا ہے۔ تاہم لکھپت رائے جو اس وقت تالاب میں نہا رہا تھا، نے اس بات کا مشاہدہ کیا اور فقیر کے کام میں دخل اندازی کرنے سے اپنے نوکروں کو منع کیا اور فقیر کو اس جگہ کپڑے دھونے کی اجازت دے دی۔ اس سلوک سے خوش ہو کر فقیر نے پیشین گوئی کی کہ لکھپت رائے کا تالاب ہمیشہ آباد رہے گا لیکن دیگر دونوں تالاب سوکھ جائیں گے۔ اس کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی اور لکھپت رائے کے تالاب سے لوگ آج بھی استفادہ کر رہے ہیں۔

لکھپت رائے، محمد شاہ بادشاہ کے دور حکومت میں حاکم لاہور یحییٰ خاں کا دیوان یا وزیر اعظم تھا۔ اس کا بھائی جسپت رائے لاہور کے شمال میں ایمن آباد کے مقام پر سکھ باغیوں کے خلاف

ایک کارروائی کے دوران قتل ہو گیا۔ لکھپت رائے اپنے بھائی کی موت کا بدلہ لینے کے لیے لاہور سے روانہ ہوا اور بائی اس کے سامنے پسپا ہو گئے۔ لکھپت رائے کا بیٹا دلپت رائے بعد میں جموں میں مقیم ہو گیا(97)۔

تالاب کے مشرق میں ایک بارہ دری ہے جو اب ایک سنیاسی فقیر کے قبضہ میں ہے۔

مندر بھدر کالی:۔ یہ مقام جو ہندوؤں کے ایک عظیم میلے کی جگہ ہے۔ لاہور کے جنوب میں چھ کوس کے فاصلے پر موضع نیاز بیگ کے قریب واقع ہے۔ میلہ جیٹھ کے مہینے میں منعقد ہوتا ہے۔ اس میں ہندوؤں کے مرد و زن اور مسلمان بھی بڑی کثیر تعداد میں شرکت کرتے ہیں۔ عبادت کی شے ایک دیوی ہے اور اسے گنبد میں رکھا گیا ہے۔ اس کے قریب سکھوں کے دور میں ایک بہت بڑا گنبد اس مقصد کے لیے تعمیر کیا گیا تھا کہ دیوی کو یہاں سے ہٹا کر اس میں رکھ دیا جائے لیکن کہا جاتا ہے کہ دیوی نے وہاں جانے سے انکار کر دیا۔ پجاریوں نے خواب میں اسے یہ کہتے ہوئے دیکھا کہ وہ اس جگہ بہت خوش ہے جہاں اس وقت رکھی ہوئی ہے لہذا پجاریوں کو چاہیے کہ وہ اسے دوسرا گھر مہیا کرنے کی زحمت گوارا نہ کریں جو اس کے لیے مناسب نہیں ہے۔ اس کے حکم کی تعمیل کی گئی اور وہ اسی جگہ رہنے دی گئی جہاں پہلے تھی۔

میلہ بھدر کالی:۔ بڑا گنبد اب مندر اور پجاریوں کی ضروری اشیاء اور ساز و سامان رکھنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہاں منعقد ہونے والا سالانہ میلہ لاہور کے تمام میلوں سے بڑا ہوتا ہے۔ یہ سال کے سب سے زیادہ گرم موسم میں منعقد ہوتا ہے۔ نیز مندر کے کھلی جگہ پر واقع ہونے اور درختوں کا سایہ نہ ہونے اور ہزاروں لوگوں کو پناہ دینے کے لیے مناسب اور کافی عمارتیں نہ ہونے کی وجہ سے بڑی دقت محسوس ہوتی ہے۔ ان تمام خرابیوں کے باوجود اس جگہ کے ساتھ منسلک عظیم تقدس کے باعث یہ میلہ پنجاب کے مذہبی اجتماعات میں شریک ہونے والے لوگوں میں سب زیادہ مقبول ہے۔ امیر آدمی خیموں اور شامیانوں کے ساتھ لیس ہو کر وہاں جاتے ہیں جبکہ متوسط وسائل کے لوگ سورج کی جھلسا دینے والی شعاعوں سے محفوظ رہنے کے لیے اپنے لیے عارضی ذرائع حاصل کرتے ہیں۔ شہر کے حلوائیوں کی بہت بڑی تعداد مختلف اقسام کی مٹھائیوں سمیت میلے میں شریک ہوتی ہے۔ یہ میلہ ایک دن اور ایک رات کے دوران منعقد ہوتا ہے اور اس عرصہ میں بہت زیادہ خوشیاں اور جشن منائے جاتے ہیں۔

بھیرن کا تھان:۔ بھیرن کا تھان یا دیوی بھیرن کی نشست، لاہور کے جنوب میں تین میل کے فاصلے پر موضع اچھرہ کے قریب واقع ہے۔ یہ ایک بہت بڑی عبادت گاہ ہے۔ لوگ ہجوم کی شکل میں

ہر اتوار کو وہاں جاتے ہیں۔ کچھ گاڑیوں پر، کچھ یکوں پر اور دیگر پیدل جاتے ہیں تاکہ بھیرن جی کے سامنے ماتھا ٹیک سکیں اور اس سے آشیر باد حاصل کریں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی رانی موراں پر جب آسیب کا سایہ ہو گیا تو اس مقدس مندر کے مہنت اور دستی رام کے جانشین جوالا ناتھ نے اس پر منتر پڑھ کر پھونکا اور وہ تندرست ہو گئی۔ اس نے مہنت کو اینٹوں سے لدے ہوئے ایک سو چھکڑے اور رقم بھیجی تاکہ وہ اس مقام پر بہت سے خوبصورت ایوان اور کمرے تعمیر کرا سکے۔ موجودہ مندر یعنی دیوی کی نشست گاہ کو ملتان کے ناظم ساون مل کے بھائی رام چند نے تعمیر کروایا اور بہت بڑے محرابی دروازے اور دیگر عمارات کو دلیپ سنگھ کی ماں مہارانی جنداں کے عاشق راجہ لال سنگھ نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ جگہ دلکش عمارتوں سے بھرپور ہے۔ یہاں پر لنگر خانہ، پجاریوں کے کمرے فقیروں کے لیے حجرے، مہنتوں کے مکانات، مکئی پیسنے کے مکانات اور دیگر متفرق عمارات ہیں۔ بھیرن جی کے مندر میں ایک چراغ دن رات جلتا رہتا ہے اور چھت پر باہر کی طرف تانبے کی ایک گھنٹی لٹکی ہوئی ہے۔ جب کوئی پجاری دیوی کے پاس حاضری دیتا ہے تو وہ اسے بجاتا ہے۔ شیو جی کا بت جو ایک چبوترے پر رکھا گیا ہے اس کی بھی پوجا کی جاتی ہے۔ بھادوں کے مہینے میں اس جگہ ایک بہت بڑا میلہ منعقد ہوتا ہے اور اس میں ہزاروں ہندو شریک ہوتے ہیں۔ وہ ساری رات جاگتے رہتے ہیں۔ اس دوران بھجن گائے جاتے ہیں۔ نیک اور پرہیزگار اشخاص کے اقوال بیان کیے جاتے اور فوت شدہ ہیروؤں کے کارنامے بیان کیے جاتے ہیں۔ مندر کے باہر ملتان کے ناظم مولراج کا تعمیر کردہ تالاب ہے۔ ایک سیڑھی کے ذریعے اس کی تہہ تک پہنچا جا سکتا ہے۔

گولاں والی سرائے:۔ گولاں والی سرائے کے نام سے مشہور علاقہ موضع اچھرہ کے نواح میں لاہور سنٹرل جیل کے قریب واقع ہے۔ ایک بہت بڑے خطے پر محیط سرائے کی عمارت مثمن شکل کی ہے۔ اس کے دونوں جانب مسافروں کے قیام کے لیے کمرے یا حجرے بنائے گئے ہیں۔ ایک قدیم لیکن وسیع و عریض کنواں ابھی تک ارد گرد کے کھیتوں کو سیراب کرتا ہے اور بالکل درست حالت میں ہے۔ وہاں پر بڑے بڑے ایوان اور بلند و بالا محرابی دروازے تھے۔ سرائے کے مشرق میں پکا تالاب جو مکینوں کو پانی پہنچاتا تھا، اسے سکھوں نے مسمار کر دیا ہے (98)۔ ان کی چھتیں پختہ اینٹوں کی تھیں۔ اس سرائے کو جہانگیر بادشاہ کے حکم کے تحت 1025 ہجری بمطابق 1616ء میں تعمیر کیا گیا یا اس سال میں جب سر ٹامس رو نے انگلستان کے بادشاہ جیمز اول کی طرف سے بھیجے گئے سفارتی عملہ کے ہمراہ جہانگیر سے ملاقات کی۔ چغتائی دور حکومت میں اس کو جائز طور پر استعمال کیا جاتا رہا تھا لیکن رنجیت سنگھ نے اسے فوجی گودام کے طور پر استعمال کرتے ہوئے اس کے کمروں کو

گولیوں سے بھر دیا۔ تب سے اس سرائے کو گولاں والی سرائے کہا جانے لگا۔ کچھ عرصہ کے بعد جمعدار خوشحال سنگھ نے مہاراجہ کی اجازت سے اس کا قبضہ حاصل کیا اور اسی وقت سے یہ اب تک اس کے خاندان کے قبضہ میں ہے۔ اب یہ راجہ ہربنس سنگھ کے قبضہ اور ملکیت میں ہے۔ جب اس کتاب کو تحریر کیا جا رہا تھا تو اس نے محض اینٹیں حاصل کرنے کے لیے اس شاندار عمارت کو گرانا شروع کر دیا تھا۔

دمدمہ شاہ جمال :۔ حضرت شاہ جمال قادری سہروردیؒ کا مزار جو گولاں والی سرائے کے جنوب میں اور موضع اچھرہ کے مشرق میں ہے، ایک بلند ٹیلے پر توپ کی شکل میں واقع ہے اور اسی سبب اسے دمدمہ شاہ جمالؒ کہا جاتا ہے۔ اس عمارت کی دو منزلیں ہیں اور ان پر ایک سیڑھی کے ذریعے جایا جا سکتا ہے۔ بالائی منزل کے صحن کے درمیان ایک چار دیواری میں مزار واقع ہے۔ یہ بہت کشادہ ہے اور وہاں سے اردگرد کے علاقہ کا خوبصورت نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ حضرت شاہ جمالؒ 1061 ہجری بمطابق 1650ء یا شاہجہاں کے دور حکومت میں فوت ہوئے۔

حضرت شاہ جمالؒ اور حضرت شاہ کمالؒ دونوں بھائیوں کو پرہیزگاری اور پاکیزگی میں بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی اور یہ بادشاہ شاہجہاں کے دور میں یہاں آباد ہوئے۔ حضرت شاہ کمالؒ کے مزار کا گنبد اچھرہ کے قریب موضع وونا میں واقع ہے۔

چشتی بیان کرتا ہے اور میں نے بھی نواحی علاقہ کے لوگوں سے بالکل اسی طرح کی داستان سنی ہے کہ جب شاہ جمالؒ اس دمدمہ پر بیٹھا کرتے تھے جو ان کی زندگی ہی میں تعمیر کیا گیا تھا تو دمدمہ پر بیٹھنے والے لوگ جہانگیر کی گولاں والی سرائے میں غسل کرنے والی شاہی گھرانے کی خواتین کو آسانی دیکھ سکتے تھے۔ بیگمات نے اس پر اعتراض کیا۔ فقیر نے اس پر بد دعا دی کہ نہ تو ان کے محلات اور نہ تالاب کو قائم رہنا چاہیے۔ چنانچہ وجد میں آکر انہوں نے اتنی شدت سے رقص کیا (دھمال ڈالی) کہ عمارت کی پانچ منزلیں زمین میں دھنس گئیں اور دمدمہ کی بلندی اس حد تک کم ہو گئی کہ لوگ اب تالاب میں نہانے والی خواتین کو نہیں دیکھ سکتے تھے اور موجودہ دو منزلیں ہی باقی رہ گئیں۔

حضرت شاہ جمالؒ اور حضرت شاہ کمالؒ کی اولاد اب سیالکوٹ ضلع میں مقیم ہے اور موخرالذکر کی برسی پر ایک سالانہ عرس منعقد ہوتا ہے جس میں لاہور اور گرد و نواح کے لوگ بھاری اکثریت میں شریک ہوتے ہیں۔

بالائی منزل میں چار دیواری کے دروازہ کے اوپر نصب سنگ مرمر کی تختی پر درج فارسی

زبان کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ اس چار دیواری کو شیخ غلام مصطفیٰ المعروف نندا نے 1245 ہجری بمطابق 1829ء اپنے بیٹے فضل بخش کی بازیابی کے بارے میں مانی جانے والی منت کے پورا ہو جانے پر تعمیر کروایا تھا۔ یہ مندرجہ ذیل ہے:۔

چار دیواری جناب معلی القاب حضرت شیخ جمال صاحب قادری قدس اللہ سرہ العزیز حسب منت برخوردار فضل بخش طولعمرہ شیخ غلام مصطفیٰ عرف نندا تحریر بتاریخ اول جمادی الاول سنہ 1254 تعمیر یافت

ترجمہ:۔ حضرت شیخ جمال قادری (اللہ آپ پر اپنی رحمت کرے) کے مزار مبارک کی چار دیواری شیخ غلام مصطفیٰ عرف نندا نے اپنے بیٹے فضل بخش (طول عمرہ) کے بارے میں منت پوری ہونے پر یکم جمادی الاول 1254 ہجری کو تعمیر کرائی۔

مقبرہ حضرت شاہ شمس الدین قادریؒ:۔ یہ مزار گورنمنٹ ہاؤس کے جنوب مشرقی جانب اور پنجاب چیف کالج کی جنوب مغربی جانب ایک کھلے میدان میں واقع ہے۔ اس کے گرد دیوار ہے اور مربع شکل عمارت کے ہر کونے پر مینار تھا لیکن اس کے مینار گر چکے ہیں۔ شاہجہاں جب شہزادہ تھا تو وہ اس بزرگ کے پاس حاضری دیا کرتا تھا۔ انہوں نے پیشین گوئی کر دی تھی کہ جہانگیر کے انتقال کے بعد شہزادہ بادشاہ بن جائے گا۔ یہ صوفی بزرگ 1022 ہجری بمطابق 1613ء کو فوت ہوئے اور شاہجہاں نے تخت و تاج سنبھالنے کے بعد موجودہ مقبرہ تعمیر کرایا۔ شمالی دروازے پر درج مندرجہ ذیل اشعار سے ان کی تاریخ وفات کا پتہ چلتا ہے۔ یہ خط نستعلیق میں لکھے گئے ہیں:۔

چو شمس الملل زین جہان رخت بست
بیا راست ایزد بر ایش بہشت
بجستم ز پیر خرد سال او
بگفت از سر لطف جائش بہشت

ترجمہ:۔ جب دین کا آفتاب اس دنیا سے رخصت ہوا تو خدا نے اس کے استقبال کے لیے جنت کو آراستہ کیا۔ میں نے خرد سے اس کی تاریخ وفات کے بارے میں پوچھا تو اس نے پیار سے جواب دیا "اس کا گھر جنت ہے"۔

اس مقبرے کے ساتھ اب ایک چھوٹا سا باغ منسلک ہے لیکن سابقہ باغ بہت بڑا اور عالی شان تھا اور یہ جگہ اس سے آراستہ و پیراستہ تھی۔ مقبرے کے شمال میں ایک چھوٹی سی لیکن

خوبصورت مسجد ہے جس کی سامنے والی محراب پر کلمہ طیبہ کے بعد یہ درج ہے:۔

بانی این مسجد میاں گھسٹیا سنہ 1307

ترجمہ:۔اس مسجد کا بانی میاں گھسٹیا ہے۔ 1307 ہجری بمطابق 1889ء

یہ مقبرہ لاہور کے مسلمانوں میں بہت زیادہ مقبول ہے اور وہ اپنی منتیں اور مرادیں پوری ہونے کے بعد یہاں نذرانے پیش کرتے ہیں۔

مقبرہ حضرت شاہ فیروز جیلانیؒ:۔ اس مقبرے کا پرانا گنبد میو ہسپتال سے قلعہ گوجر سنگھ اور گورنمنٹ ہاؤس کو جانے والی سڑک کے بائیں طرف شمال کی جانب اور مہا سنگھ کے باغ (ڈوینٹی کالج) کے سامنے واقع ہے۔ گنبد پر دراصل نیلے رنگ کی مینار کاری کا روغنی کام کیا گیا تھا۔ اس کے آثار اب بھی دیکھے جاسکتے ہیں لیکن اب اینٹیں ننگی ہو گئی ہیں۔ گنبد چار محرابوں پر ایستادہ ہے اور ان میں سے صرف ایک کو آمد و رفت کے لیے کھلا رکھا گیا ہے۔

شاہ فیروز براہ راست یا بالواسطہ حضرت عبدالقادر جیلانی پیر دستگیرؒ کی اولاد میں سے تھے۔ آپ اپنے دور کے نہایت عالم فاضل بزرگ تھے اور آپ کی پاکیزگی اور بزرگی کی دھوم دور دراز تک پھیل گئی تھی۔ آپ کا پورا وقت تبلیغ اور رشد و ہدایت کے لیے وقف تھا۔ شروع شروع میں آپ مرید بنانے کے خلاف تھے لیکن اپنی آخری عمر میں آپ کے مریدوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔

شاہ فیروزؒ 934 ہجری بمطابق 1527ء میں بابر کے دور میں فوت ہوئے اور یہیں دفن کیے گئے۔ آپ حضرت شاہ عالمؒ کے مرید تھے۔ آپ کے مرید شیخ عبداللہ آپ کے سجادہ نشین بنے۔ دندی گروں یا خرادیوں کے نام سے مشہور اہل حرفہ کا طبقہ اس صوفی بزرگ سے بڑی عقیدت رکھتا تھا۔ اسی وجہ سے یہ محلہ تکیہ دندی گراں کے نام سے جانا جاتا ہے۔ پرانے وقتوں میں شہر کا یہ علاقہ خرادی محلہ کے نام سے مشہور تھا۔ گرد و نواح کے لوگوں کے مطابق زمین کھودنے پر کاریگروں کے اوزار ملے ہیں۔

مقبرہ حسو تیلی:۔ یہ کلب ہاؤس کے شمال میں قلعہ گوجر سنگھ کے جنوب میں اور میو ہسپتال سے گورنمنٹ ہاؤس کو جانے والی سڑک کے بائیں جانب واقع ہے۔ یہ مزار مربع شکل میں ایک خشتی صحن کے درمیان واقع ہے۔ اس کے اردگرد بلند دیواریں ہیں۔ دروازہ جنوب کی طرف ہے۔ حسو تیلی بزرگی اور پرہیزگاری کے باعث بہت شہرت رکھتے تھے اور ان کے بیشمار مرید تھے۔ سیر العارفین کے مطابق وہ صوفی بزرگ حضرت مادھو لال حسینؒ کے ہمعصر تھے۔ ان کی مکئی کی فروخت کے لیے

ایک دکان تھی، جو اب بھی شہر لاہور کے چوک جھنڈا میں موجود ہے۔ لوگ اس دکان کی بڑی تعظیم کرتے ہیں اور یہ جگہ جس میں صوفی بزرگ نے رہائش اختیار کی تھی ہر روز ایک چراغ جلایا جاتا ہے۔ آپ حضرت شاہ جمالؒ کے مرید تھے، جن کا مزار موضع اچھرہ میں واقع ہے۔ آپ 1002 ہجری بمطابق 1593ء اورنگ زیب کی وفات کے چار سال بعد فوت ہوئے۔ تیلی برادری کے تمام افراد لاہور میں اس مزار کا بہت احترام کرتے ہیں۔ یہاں ہر سال عرس منعقد ہوتا ہے جس میں ہزاروں لوگ شرکت کرتے ہیں۔

مزار حضرت شاہ ابو المعالیؒ :۔ اس مزار کا نہایت عالی شان گنبد شہر کے باہر واقع ہے۔ شاہ خیرالدین المعروف ابو المعالیؒ اکبر اور جہانگیر کے دور میں نہایت خدا رسیدہ اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ آپ ضلع شاہ پور کے علاقہ بھیرہ کے رہنے والے تھے۔ آپ نے خود اپنی زندگی میں اپنے مقبرے کا زیادہ تر حصہ تعمیر کرایا لیکن 1025 ہجری بمطابق 1616ء آپ کی وفات کے بعد بقیہ حصہ آپ کے صاحبزادے محمد باقر نے مکمل کروایا۔ آپ کی برسی کے موقع پر ایک بہت بڑا میلہ اور اس کے علاوہ عید کا تہوار بھی یہاں منایا جاتا ہے، جس میں بہت زیادہ خوشیاں اور تقریبات منائی جاتی ہیں۔

نقیباں والی مسجد :۔ یہ انتہائی قدیم مسجد قلعہ گوجر سنگھ اور شیخ موسیٰ آہن گر کے گنبد کی شمال مغربی جانب اور اس محلہ میں واقع ہے جو "ٹھٹھی مہتراں" کے نام سے مشہور ہے (99)۔ اس کے بانی اورنگ زیب کے جانشین بہادر شاہ کے ایک درباری امیر شیخ محمد واصل تھے۔ محمد واصل کی وفات کے بعد ان کے وارث حاکم لاہور کے تحت نقیب کے عہدے پر فائز ہوتے رہے۔ تب سے مسجد کو نقیباں والی مسجد کہا جانے لگا۔ اس کے تین عمدہ گنبد اور تین عالی شان محرابیں ہیں۔ درمیانی محراب کے بالائی حصہ پر قرآن پاک کی آیات درج ہیں۔ مسجد کا صحن پختہ اینٹوں کا ہے۔ اس میں ایک قدیم تالاب اور ایک کنواں ہے۔ سکھوں کے دور میں اس مسجد کو بارود خانہ کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔ برطانوی حکومت نے کمال فیاضی سے اس کو مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔

مسجد کے بانی شیخ محمد واصل کا آبائی وطن سہارنپور تھا۔ بہادر شاہ بادشاہ کے دور حکومت میں آپ لاہور آنے کے بعد لکھی محلہ میں مقیم ہو گئے، جس نام سے موجودہ محلہ مشہور تھا۔ لاہور میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد آپ سہارنپور واپس چلے گئے۔

خان بہادر کی حکومت کے دوران شیخ محمد واصل کے صاحبزادے محمد پناہ، عبدالعزیز اور محمد عارف لاہور آ گئے اور خان بہادر کے بیٹے اور اس وقت کے حاکم لاہور شاہنواز خاں کے تحت سرکاری ملازمت اختیار کر کے نقیب بن گئے۔ اس خاندان کی اولاد ابھی تک شہر لاہور میں آباد ہے۔

درمیانی محراب کو نقش و نگار سے آراستہ کیا گیا ہے۔ مسجد کی اندرونی جانب شمالی اور مشرقی محرابوں پر عربی کا مندرجہ ذیل قطعہ درج ہے:۔

قال اللہ تعالیٰ کل من علیہا فان و یبقی وجہہ ربک ذو الجلال و الاکرام

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: دنیا کی ہر شے فانی ہے۔ صرف رب ذو الجلال والاکرام باقی رہنے والا ہے۔

مغرب کی طرف قبلہ رخ محراب کے شمال اور جنوب کی جانب محرابوں پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

المومن فی المسجد کالسمک فی الماء المنافق فی المسجد کالطیر فی القفص

ترجمہ:۔ مومن مسجد میں اس طرح رہتا ہے جس طرح مچھلی پانی میں اور منافق مسجد میں اس طرح رہتا ہے جس طرح پرندہ پنجرے میں۔

مقبرہ شیخ موسیٰ:۔ یہ مقبرہ لاہور سے ایک میل کے فاصلے پر قلعہ گوجر سنگھ کے شمال میں اکبری دروازہ کی سمت واقع ہے۔ اس کا گنبد بہت عالی شان اور خوبصورت ہے۔ اس پر سبز رنگ کے منقش روغنی کام سے آرائش کی گئی ہے۔ اندرونی دیواروں پر پختہ اینٹوں پر طغریٰ رسم الخط میں ابھرواں حرفوں میں قرآن پاک کی جو آیات درج ہیں وہ آج تک صحیح حالت میں ہیں۔ مزار پختہ اینٹوں کی چار دیواری کے اندر ہے۔ یہ صوفی بزرگ افغان (سوری) بادشاہوں کے دور میں آباد ہوئے۔ دربار کے امراء آپ کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے۔ تذکرہ قطب العالم کے مصنف شیخ ابو بکر کے مطابق شیخ موسیٰ انتہائی خدا رسیدہ اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ پورے علاقے میں آپ کا احترام و تعظیم کی جاتی تھی۔ آپ لوہار کے پیشے سے منسلک تھے اور اس پیشے سے تعلق رکھنے والے لاہور کے تمام افراد اس مزار سے عقیدت رکھتے ہیں اور ہر سال آپ کا عرس بڑے جوش و خروش اور دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ تذکرہ کے مصنف نے آپ کی بہت سی کرامات کا ذکر کیا ہے لیکن مندرجہ ذیل کے بارے میں لوگ آج بھی بیان کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک ہندو عورت جو نہایت حسین و جمیل تھی آپ کے پاس سوت کاتنے والا تکلہ سیدھا کروانے کے لیے لائی۔ شیخ نے تکلہ آگ میں ڈالا اور خود اس کے حسن میں ایسے کھو گئے کہ بھٹی میں ڈالا گیا تکلہ بالکل فراموش کر بیٹھے۔ آپ نے نگاہ اس کے چہرے پر جمائی ہوئی تھی۔ عورت غضب ناک ہو کر بولی کہ اے شخص! تو کیسا آدمی ہے کہ کام کی طرف دھیان نہیں کرتا اور میرے منہ کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے؟ لگتا ہے تو اپنا کام بالکل فراموش کر بیٹھا ہے۔ شیخ نے جواب دیا: میں تو بنانے والے کی صناعی کو دیکھ رہا

ہوں جس نے تمہارے جیسا خوبصورت چہرہ تخلیق کیا ہے۔ یہ آگ کی طرح سرخ تکلہ میں اپنی آنکھوں میں پھیر لوں گا اور اگر میں نے تمہیں بد نظر سے دیکھا ہو گا تو یہ جل جائیں گی۔ یہ کہہ کر آپ نے تکلے کو سرے کی سلائی کی طرح دونوں آنکھوں میں پھیر لیا۔ انہیں کوئی گزند نہ پہنچا جبکہ لوہے کا تکلہ آپ کی آنکھوں سے مس ہوتے ہی خالص سونے کا بن گیا۔ عورت نے یہ کرامت دیکھی تو اسے شیخ کی نظر کی معصومیت کا یقین آ گیا۔ چنانچہ مسلمانوں کے عقیدہ کی سچائی سے بہت زیادہ متاثر ہونے کے بعد وہ فوری طور پر مسلمان ہو گئی۔ اس کا مزار بھی شیخ موسیٰ کے قریب ہی واقع ہے۔ شیخ موسیٰ 925 ہجری بمطابق 1519ء فوت ہوئے۔ آئین اکبری میں شیخ موسیٰ کے بارے میں مندرجہ ذیل بیان ہے:

آپ ایک آہن گر تھے اور آپ کی بہت سی کرامات تھیں۔ آپ اکبر کے دور حکومت میں فوت ہوئے اور لاہور میں دفن کیے گئے (100)۔

مزار شیخ عبدالجلیل :۔ یہ مزار حضرت شیخ موسیٰ کے مزار سے شمال کی طرف تھوڑے فاصلے پر ایک چار دیواری میں واقع ہے۔ مزار ایک تہہ خانے میں ہے اور اس میں سیڑھی کے ذریعے پہنچ سکتے ہیں۔ مزار کا نشان بیرونی چھت میں بھی دکھایا گیا ہے۔ مزار کی بائیں طرف ایک کہنہ مسجد ہے جو اس بزرگ نے اپنی زندگی ہی میں تعمیر کروائی تھی۔ حضرت عبدالجلیل کی اولاد میں سے غلام محی الدین قریشی نے 1264 ہجری بمطابق 1847ء میں مزار کی مکمل طور پر مرمت کرائی۔ تہہ خانے کے ایوان کے بیرونی دروازے پر مندرجہ ذیل اشعار درج ہیں:۔

مکان خانقاہ قطب عالم — چو از تعمیر نو زینت پذیرفت
بتاریخ بنائش ہاتف غیب — بنائے از غلام محی الدین گفت

ترجمہ:۔ جب قطب عالم کا مقبرہ نئی تعمیر سے مزین کیا جا رہا تھا تو ایک غیبی آواز نے اس کی تاریخ بنیاد کے بارے میں بتایا۔ اس عمارت کو غلام محی الدین نے تعمیر کرایا۔

شیخ عبدالجلیل المعروف شیخ چوہڑ بادشاہ اسکندر لودھی کے داماد تھے اور اس کی صاحبزادی سے آپ کے ایک فرزند شیخ ابوالفتح تھے۔ آپ 910 ہجری بمطابق 1534ء کو فوت ہوئے۔ آپ کی وفات کا سال لفظ شیخ سے برآمد ہوتا ہے۔ تذکرہ قطبیہ کے مصنف نے آپ کی بہت سی کرامات کا ذکر کیا ہے۔ آپ کی اولاد ضلع سیالکوٹ کے موضع رتہ پیراں میں آج بھی آباد ہے اور لوگ ان کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔

مسجد دائی لاڈو :۔ یہ قدیم مسجد شاہ عالمی دروازہ کے باہر دیوان رتن چند کے باغ کی مشرقی جانب واقع ہے۔ اس کا ایک واحد لیکن بہت بڑا گنبد ہے اور محرابی کمرے ہیں۔ اس کے ساتھ ملحقہ ایک پرانا تالاب اور کنواں بالکل تباہ ہو گئے ہیں۔ سکھوں کے دور حکومت میں یہ مسجد بسنت گیر نامی ایک سنیاسی فقیر کے قبضہ میں تھی۔ اس نے اس کو تیس سال تک ٹھاکر واڑا کے ایک حصہ کے طور پر استعمال کیا۔ برطانوی دور کے آغاز میں میجر میک گریگر نے اسے مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔

دائی لاڈو بادشاہ جہانگیر کی دایہ تھی۔ شاہجہان نامہ کے مطابق وہ انتہائی خدا رسیدہ اور پرہیز گار خاتون تھی اور اس کی یہ بزرگی فتح پور سیکری کے مشہور و معروف صوفی بزرگ حضرت سلیم چشتی کے طفیل تھی، جن کے نام پر اکبر نے اپنے بیٹے سلیم (بعد میں جہانگیر) کا نام رکھا تھا۔ اس نے شاہجہاں کے دور حکومت کے چوتھے سال مکہ مکرمہ میں حج ادا کیا۔ وہ عالمگیر کی حکومت کے پہلے سال بروز بدھ 5 محرم کو فوت ہوئی اور اسے اسی مسجد میں دفن کیا گیا۔ وہ قبر جو اس نے اپنی زندگی ہی میں تعمیر کروالی تھی مسجد کے صحن میں ابھی تک موجود ہے۔ اس کا شوہر محمد اسماعیل اس سے دس ماہ پیشتر فوت ہو گیا تھا۔ اس کا مزار بھی اپنی اہلیہ کے ہمراہ مسجد کے صحن میں ہے۔ یہ مقام جہاں اس وقت مسجد موجود ہے یہاں ان دنوں تلہ محلہ آباد تھا اور لاڈو کی وسیع و عریض جائیداد اور باغات یہاں موجود تھے۔ اس نے وہاں ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا اور لاہور کے ایک نہایت عالم فاضل بزرگ مولوی عصمت اللہ اس کے سربراہ تھے۔ دائی لاڈو کے صاحبزادے محمد شاکر لاولد تھے۔ لہٰذا اس کی تمام وسیع و عریض جائیداد وقف کر دی گئی۔ مدرسہ اور مسجد پنجاب میں مغلیہ حکومت کے خاتمے تک فرائض سرانجام دیتے رہے۔

مسجد کے جنوب اور مغرب میں حجرے ہیں جو امام صاحب کے قبضہ میں ہیں اور شمال کی طرف ایک سرسبز قطعہ زمین ہے۔

مندر سیتلا ماتا :۔ یہ مندر سیتلا ماتا یا چیچک کی دیوی کے لیے وقف ہے۔ یہ شہر سے باہر شاہ عالمی دروازہ اور لوہاری دروازہ کے درمیان سرکلر روڈ کے ایک طرف واقع ہے۔ یہ ہندوؤں اور خاص طور پر ان بچوں کی ماؤں کے لیے بہت بڑی عبادت گاہ ہے، جن کے بچوں کو چیچک کی بیماری لاحق ہو جاتی ہے۔ وہ دیوی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس بات کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ دیوی خوش ہو کر ان کے بچوں کو تندرست کر دے گی۔ لہٰذا اس کے نتیجہ میں سیتلا ماتا کی پوجا کی جاتی ہے۔ اس کے آگے چڑھاوے چڑھائے جاتے اور نذرانے پیش کیے جاتے ہیں۔ جب کوئی بچہ چیچک کی بیماری سے ٹھیک ہو جاتا ہے تو اس کے والدین یہاں آکر روپیہ پیسہ اور مٹھائیوں

کی صورت میں نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ مندر میں دیوی جی اور شیوجی مہاراج کے بت رکھے گئے ہیں۔ ان کی بھی پرستش ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مندر میں پیپل اور جنڈ کے درختوں کو بھی پوجا جاتا ہے۔ اس کے اردگرد ایک پکا چبوترہ تعمیر کیا گیا ہے۔ اس پر ایک شیر کا سنگی مجسمہ ہے۔ سنتوں اور سادھوؤں کے قیام کے لیے کمرے اور حجرے بھی بنائی گئے ہیں۔ لہذا مجموعی لحاظ سے یہ عمارت بڑی اچھی حالت میں ہے۔

چوبارہ ججو بھگت:۔ یہ میو ہسپتال کے قریب اور رتن چند کی سرائے کے جنوب میں واقع ہے۔ ججو شاہجہاں کے دور میں ایک خدا رسیدہ شخص گزرا ہے۔ لاہور کا رہنے والا تھا اور ذات کا بھاٹیہ تھا۔ وہ ایک صراف تھا لیکن اسے فقیروں کی صحبت سے بڑی رغبت تھی۔ آخرکار دنیا سے قطع تعلق کرنے کے بعد اس نے بقیہ زندگی کو عبادت و ریاضت کے لیے وقف کر دیا۔ اس کی موت بھی بڑی پراسرار تھی۔ کہا جاتا ہے کہ جب اس کا آخری وقت قریب آیا تو وہ ایک حجرے میں گیا اور اس کے بعد دکھائی نہیں دیا۔ وہ 1696 سمبت 1640ء میں فوت ہوا۔ یہ وہی سال تھا جب پادری میسرک ایک سفارتی کام سے شاہجہاں کے دربار میں آیا تھا کیونکہ اسے گوا کی پرتگیزی حکومت نے ہگلی کے عیسائیوں کی قید سے رہائی کے سلسلہ میں گفت و شنید کرنے کے لیے روانہ کیا تھا۔ ججو عبادت و ریاضت کے لیے ایک چوبارہ یا یک منزلہ کمرہ استعمال کرتا تھا۔ نیز جہاں اس وقت مندر ہے وہاں اس کی دکان ہوا کرتی تھی جہاں وہ اپنا کاروبار کیا کرتا تھا۔ لاہور کے ثلاثہ حکمرانوں کے دور میں باوا پریتم داس، مہنت کے طور پر فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس نے یہاں بہت بڑا مندر تعمیر کرایا۔ رنجیت سنگھ اس مقام کی بہت تعظیم کرتا تھا اور ہر پیر کو یہاں حاضری دیتا اور مندر پر روپیہ پیسہ نذرانے کے طور پر پیش کرتا تھا۔ اس نے سادھوؤں کے قیام کے لیے کشادہ ایوان اور کمرے تعمیر کرائے اور اس کی آرائش میں اضافہ کیا۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے اس نے بلالگان زمین کا عطیہ دیا۔ ہر پیر اور منگل کو مرد و زن کے ہجوم یہاں جمع ہوتے ہیں اور موسیقار مقدس بھجن گاتے ہیں۔ ججو کی سمادھ سنگ مرمر سے تعمیر کی گئی ہے۔ مندر کا مہنت دادو پنتھی ہے جو ایسے فرقے سے تعلق رکھتا ہے جس کے پیروکار شادی نہیں کراتے اور گوشت و شراب کا استعمال بھی نہیں کرتے۔ پنتھ کا بانی دادو رام تھا جو اکبر کے دور میں گزرا ہے۔ اس کے پیروکار اس کی تعظیم ایک اوتار کے طور پر کرتے ہیں۔ اس فرقے کے لوگ سر کو منڈوا کر رکھتے ہیں اور گیروے رنگ کی پگڑی باندھنے کے پابند ہیں۔ ان کی گرنتھ شاستری میں ہے اور اسے دادو رام کی بانی کہا جاتا ہے۔

مقبرہ پیر ہادی رہنما:۔ یہ انارکلی اور میاں میر سے سنٹرل جیل کو جانے والی سڑک پر مشرق کی

طرف سندھ پنجاب ریلوے ہوٹل (نیڈو کا ہوٹل) کے عقب میں واقع ہے۔ یہ ایک انتہائی قدیم اور شاندار مقبرہ ہے تاہم اب شکستہ حالت میں ہے۔ اسے راوی کے پار موجود جہانگیر کے مقبرہ کی طرز پر ایک بلند چبوترہ پر تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کو بارہ دری کی شکل میں تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کے دوہرے کمرے یا برآمدے ہیں۔ اس کی چھت کے چاروں طرف ہر ایک کی چھت کو پختہ اینٹوں سے گنبد کی شکل میں بنایا گیا ہے۔ ہر طرف پانچ محرابی کمرے ہیں۔ مقبرے کے نیچے تہہ خانے تھے لیکن اب بند کر دیئے گئے ہیں۔ فرش پر تین مزار ہیں۔ ایک پیر ہادی کا اور دوسرے دو ان کے بھائیوں اور سید شمس الدین تبریزیؒ (جن کا مزار ملتان میں مرجع خلائق ہے) کے صاحبزادے سید عبدالقادر کے بیٹوں محسن شاہ اور عبداللہ شاہ کے ہیں۔ مقبرے کے شمال میں ایک کہنہ کنواں ہے جو بالکل درست حالت میں ہے اور ابھی تک زیر استعمال ہے۔ اس کے ساتھ ملحقہ ایک شاندار مسجد کو اب انگریزوں کی رہائش کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس کو اکبر کے دربار کے ایک امیر کلا خاں نے تعمیر کرایا تھا۔ مقبرے کو بابر کے دور میں تعمیر کرایا گیا۔ اس بزرگ کا انتقال 681 ہجری بمطابق 1282ء میں ہوا۔ مقبرے کو سنگ مرمر کی انتہائی خوبصورت جالیوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ چھت پر چاروں طرف سنگ مرمر کا کٹہرا تھا اور محرابوں کو سنگ سرخ کے ستونوں نے سہارا دے رکھا تھا۔ رنجیت سنگھ کے وزیر اعظم راجہ دھیان سنگھ نے اس عمارت کو تمام قیمتی پتھر سے محروم کر دیا اور اسے جموں بھیج دیا۔ تہہ خانے کا فرش بھی سنگ مرمر کا تھا اور یہ سب اکھاڑ لیا گیا۔

پیر ہادی رہنما ایک ایسے بزرگ ہیں جن کی یاد لاہور کے کھوجے (مسلمانوں کا ایک متمول طبقہ ہے اور زیادہ تر ملکی کا کاروبار کرتے ہیں) (101)۔ بڑی عقیدت سے مناتے ہیں۔

گنبد، مزارات محمد صالح و شیخ عنایت اللہ:۔ حضرت علی رنگریزؒ کے مزار کے شمال میں اور نارتھ ویسٹرن ریلوے سٹیشن سے گورنمنٹ ہاؤس کو جانے والی سڑک کے مشرق میں نیو وکٹوریہ ہوٹل کے بالکل نزدیک ایک عالی شان گنبد ایک بلند چبوترے پر ایستادہ ہے اسے گنبد کمبوہاں والا کہا جاتا ہے۔ گنبد کے نیچے دو مزارات تھے۔ ایک محمد صالح کمبوہ کا ہے، جو شہر کے موچی دروازہ کے سامنے چینیاں والی مسجد کے نام سے مشہور مسجد کے بانی ہیں اور دوسرا مزار ان کے بڑے بھائی شیخ عنایت کا ہے جو مشہور فارسی کتاب بہار دانش کے مصنف ہیں اور یہ کتاب پورے ہندوستان میں فارسی طرز کے ایک اعلیٰ نمونہ کے طور پر جانی جاتی ہے۔ وہ ایک تاریخ کے مصنف بھی ہیں جو دلکشا کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں اسلام کے خلفاء کی حیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ انہوں نے تاریخ کی ایک اور کتاب لکھی جس میں حضرت آدمؑ سے لے کر موجودہ دور تک کی اقوام اور ہندوستان کے

مغل بادشاہوں کا بیان ہے۔ شاہجہاں کے دور حکومت میں محمد صالح لاہور میں شاہی محکمہ کے نگران تھے جبکہ عنایت اللہ حاکم لاہور کے تحت ایک وقف ادارہ کے منتظم تھے۔ یہ عمارت مسدس شکل کی ہے۔ اس کو ایک انگریز مسٹر سیمور نے نجی رہائش گاہ میں تبدیل کر لیا تھا اور اسی کے نام پر اسے " سیمور صاحب کی کوٹھی " کہا جانے لگا۔ اس کے قریب ہی ایک لمبوترا گنبد ہے جس کے نیچے محمد صالح اور عنایت اللہ کے عزیزوں کی قبور تھیں لیکن مسٹر سیمور نے اسے باورچی خانے میں تبدیل کر لیا۔ اصلی گنبد کو گیراج کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔

بغلی کمروں کو اب ایک بہت بڑے گنبد کے ساتھ ملا دیا گیا ہے جو انگریزوں کے ایک گرجا کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اسے سینٹ اینڈریو ریلوے چرچ کہا جاتا ہے۔ اس کے سربراہ ریو، اے، آر میکڈف ہیں۔ محمد صالح اور عنایت اللہ دونوں بھائیوں کے مزارات سنگ سرخ کے تھے لیکن ان کو سکھوں نے تباہ کر دیا، جنہوں نے معمول کے مطابق اس گنبد کو بارود خانہ کے طور پر استعمال کیا۔ گنبد عالی شان اور دلکش ہے۔ اس کو چار بلند و بالا محرابوں نے سہارا دے رکھا ہے۔ جنوب کی طرف ایک قدیم سیڑھی ہے۔

اس بیضوی گنبد (جس کا پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے) میں اب مزید کمروں اور ایوانوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس کو محکمہ ریلوے کے ایک انگریز نجی رہائش گاہ کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔

محمد صالح، عمل صالح یا " شاہجہاں نامہ " کے مصنف ہیں جن کا ان صفحات میں اکثر ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب نہایت اعلیٰ درجے کی فارسی میں لکھی گئی ہے اور بڑی دلچسپ ہے اور یہ مصنف کے ادبی کمالات اور فارسی زبان کی شاعری اور نثر میں ان کی مہارت کا عملی ثبوت ہے۔

اپنی کتاب میں محمد صالح ہمیں آگاہ کرتے ہیں کہ ان کے بھائی عنایت اللہ عمر کے آخری حصہ میں دنیا کے معاملات سے الگ ہو گئے تھے اور انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر کے اپنے آپ کو عبادت و ریاضت، غور و خوض اور علم الکلام کے مطالعہ کے لیے وقف کر دیا تھا۔ یہ گنبد جس میں دونوں بھائی دفن ہیں اسے عنایت اللہؒ نے اپنی زندگی ہی میں تعمیر کروایا تھا۔ وہ 1080 ہجری بمطابق 1669ء شاہجہاں کی وفات کے تین سال بعد فوت ہوئے اور یہیں دفن کیے گئے۔ محمد صالح جو اس کے پانچ سال بعد فوت ہوئے وہ بھی اسی گنبد میں اپنے بھائی کے پہلو میں اپنی آخری آرام گاہ میں دفن ہوئے۔

مزار علی رنگریزؒ:۔ دہلی دروازہ سے میاں میرؒ جانے والی سڑک کے مغرب میں اور سینٹ اینڈریو

ریلوے چرچ (جو دراصل شیخ محمد صالح اور عنایت اللہ کے مزارات کا گنبد ہے) کے بالکل نزدیک ایک چار دیواری میں حضرت علی رنگریز کا مزار ہے۔ یہ مزار ایک بلند چبوترے پر ہے اور وہاں جنوب مغربی طرف واقع سیڑھی کے ذریعے پہنچ سکتے ہیں۔ جنوب مغربی دروازے کے بالائی حصہ پر سنگ مرمر کی ایک چھوٹی سی تختی نصب ہے جو چبوترے پر موجود تین مزارات کے ناموں پر مشتمل ہے جن کا ذکر پہلے بھی کیا گیا ہے۔ یعنی وہ علی رنگریز، ولی (علی کے بھائی) اور باہو کے ہیں۔ ان کے ساتھ 1291 ہجری بمطابق 1874ء کی تاریخ درج ہے۔ جس سے موجودہ عمارت کی تعمیر کی تاریخ کا پتہ چلتا ہے۔ حالانکہ خود مزار بہت زیادہ قدیم ہے۔ لاہور شہر کے تمام رنگریز اس مزار کی بہت تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔

مسجد محمد صالح سندھی :۔ یہ قدیم اور شاندار مسجد قلعہ گوجر سنگھ کے مشرق میں اور نارتھ ویسٹرن ریلوے سٹیشن سے گورنمنٹ ہاؤس کو جانے والی سڑک کے شمال میں واقع ہے۔ اس کے بانی شاہجہاں کے دور میں حاکم لاہور کے دیوان محمد صالح سندھی تھے۔ اس کے تین بہت بڑے گنبد ہیں جن کو محرابی دروازوں نے سہارا دے رکھا ہے۔ ایک صحن ہے جس میں پختہ اینٹوں کا حاشیہ لگایا گیا ہے۔

قدیم محلہ حاجی سیوائی :۔ جس جگہ مسجد ہے یہاں پرانے وقتوں میں ایک محلہ موجود تھا جسے " حاجی سیوائی " کہا جاتا تھا۔ محمد صالح حاجی سیوائی کے بھتیجے اور دربار کے ایک امیر تھے۔ جیسا کہ اسلامی اداروں کے ساتھ سکھوں کے دور حکومت میں سلوک کیا جاتا تھا۔ وہی سلوک اس مسجد کے ساتھ بھی کیا گیا۔ یعنی اسے بارود خانہ کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔ برطانوی حکومت کے ساتھ صوبے کے الحاق کے بعد مرحوم نواب علی رضا خاں قزلباش نے اسے مرمت کروایا۔ کنویں کے قریب ایک پرانا تالاب ہوتا تھا لیکن اب اس کے آثار موجود نہیں ہیں۔ جبکہ اس مسجد کے ساتھ ملحقہ ایک باغ ہوا کرتا تھا اس کے آثار ابھی تک ہیں۔

اس مسجد کے ساتھ ملحقہ ایک مدرسہ ہے جہاں لڑکوں کو قرآن پاک کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مرحوم نواب کے صاحبزادے نواب ناصر علی خاں اس کی سرپرستی کرتے ہیں۔ اس کے قریب نواب کی جائیداد یعنی وسیع و عریض گھر ہے۔

مزار منشی محمد عظیم :۔ (102)، جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے۔ منشی محمد عظیم دہلی سے آنے کے بعد 1849ء لاہور میں آباد ہو گئے۔ وہ 27 جنوری 1885ء کو گورداسپور میں فوت ہوئے اور انہیں میانی کے گرد و نواح میں دفن کیا گیا۔ ان کا مزار پختہ اینٹوں کے ایک چبوترہ پر ہے۔ سنگ

مرمر کی ایک تختی پر مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ درج ہے جس سے تاریخ وفات کا پتہ چلتا ہے:۔

سید عالی نسب حاجی محمد عظیم
گشت دل عالمے از غم ہجرش دو نیم
بسکہ بدل داشتے عشق رسول کریم
رفت چوزین دار بست گشت بہ جنت مقیم
سال وصالش نوشت فائض غمگین چنین
سید آل نبی حاجی محمد عظیم

ترجمہ:۔ جب سید عالی نسب حاجی محمد عظیم فوت ہوئے تو لوگوں کا دل آپ کی جدائی کے غم سے دو ٹکڑے ہو گیا۔ اپنے دل میں عشق رسول کریم کے ساتھ وہ اس دنیا سے رخصت ہو کر جنت میں داخل ہو گئے۔ فائض نے انتہائی غمگین دل کے ساتھ ان کی تاریخ وفات کا سال لکھا:۔ "سید آل نبی حاجی محمد عظیم۔"

گنبد نواب بہاولپور :۔ نواب بہاولپور، نواب سعادت خاں کا گنبد، کڑی باغ یا آلو والیہ ہاؤس کے قریب، انار کلی بازار کی جنوبی سمت میں واقع ہے۔ گنبد انتہائی خوبصورت اور شاندار ہے اور یہ ایک باغ کے درمیان پختہ چار دیواری میں واقع ہے۔

سعادت خان (103) ، نواب بہاول خاں کے چھوٹے صاحبزادے تھے اور ان کے والد کی خواہش کے مطابق انہوں نے اپنے باپ کی وفات کے بعد 1851ء کے قریب حکومت کی سرداری سنبھالی۔ مرحوم نواب کے سب سے بڑے بیٹے حاجی خاں نے (جس کو داؤد پوتوں کی حمایت حاصل تھی) اپنے چھوٹے بھائی کو وہاں سے نکال کر سرداری کا منصب سنبھال لیا اور سعادت خاں کو لاہور لا کر قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ وہ قید کے دوران 1862ء میں ثمن برج میں انتقال کر گئے اور انہیں یہیں دفن کیا گیا۔ موجودہ مقبرہ ان کی یاد میں ان کے ہمراہ لاہور آنے والی بیوگان نے 1.5000 روپے کی لاگت سے تعمیر کروایا تھا۔

مزار نواب ٹانک :۔ بی بی پاک دامن کے مزار کے جنوب میں ٹانک کے سابق نواب، نواب شاہ نواز خاں کا سنگ مرمر کا مزار ہے جنہیں مہاراجہ شیر سنگھ کی بارہ دری میں شاہ بلاولؒ کی نگرانی میں رکھا گیا تھا۔ ان کا انتقال 1881ء میں لاہور میں ہوا۔ مزار کے تعویذ پر مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ درج ہے:۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

[illegible] الا اللہ وحدہ لا شریک لہ [illegible]

کو چید زین مکان چو بفرمان کرد گار

نواب ٹانک جود نشان شہنواز خان

رضوان فرید گفت پی سال رحلتش

نواب پاسبان جنان شاہنواز خان

تاریخ وفات جناب نواب محمد شہنواز خان صاحب بہادر مرحوم

والی ٹانک بستم ماہ صفر المظفر سنہ 1299 ہجری

ترجمہ: شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وہ اکیلا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔

ٹانک کے نواب شاہنواز خاں جب اللہ کے حکم سے اس دنیا سے رخصت ہوئے تو رضوان فرید نے ان کی تاریخ وفات کے بارے میں کہا:۔ شاہنواز خاں نواب، پاسبان جنت ہے۔

تاریخ وفات جناب محمد شاہنواز خاں والی ٹانگ 20 صفر المظفر 1299 ہجری بمطابق 1881ء ۔

مذکورہ بالا کے قریب نواب کی والدہ کا سنگ مرمر کا مزار ہے۔ اس پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

لا الہ اللہ محمد رسول اللہ

مزار والدہ نواب محمد شاہ نواز خاں

کٹہ خیل متوطن ٹانک نہم جمادی الاول سنہ 1270 ہجری

ترجمہ:۔ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔

مزار والدہ نواب محمد شاہ نواز خاں،

کٹہ خیل، متوطن ٹانک، 9 جمادی الاول 1270 ہجری بمطابق 1853ء -

ایک خالی مزار :- (104)۔ میاں وڈا کے مزار کے احاطہ میں ایک خوبصورت گنبد بمعہ ایک خالی قبر کے ہے۔ یہ دراصل موجودہ سجادہ نشین میاں محمد دین ولد میاں احمد دین کی جائے مدفون کے ارادہ سے بنایا گیا تھا۔ گنبد کی اندرونی جانب نقش و نگار سے آرائش کی گئی ہے اور دیواروں پر فارسی کے بیشمار اشعار اور قرآنی آیات درج ہیں۔

مندرجہ ذیل عربی اشعار دلکش ہیں :-

الا یا ساکن القصر المعلی
سند فن عن قریب فی التراب
لہ ملک ینادی کل یوم
لا والموت وانبولا خراب
قلیل عمر نافی دار دنیا
و مرجعنا الی بیت التراب
خرجت من التراب بغیر ذنب
رجعت من الذنوب الی التراب.
بلوح الخط فی الالواح دہر
و کاتبہ رمیم فی التراب

ترجمہ :- اے بلند و بالا محلوں کے رہنے والو! تم عنقریب زمین میں دفن ہو جاؤ گے۔ تمہارے لیے ایک فرشتہ ہے جو ہر روز منادی کرتا ہے۔ جو پیدا ہوا ہے اس نے آخر کار مر جانا ہے اور تم نے جو مکانات تعمیر کرائے ہیں یہ بھی فنا ہو جائیں گے۔ دنیا میں ہماری عمر قلیل ہے اور ہماری واپسی کی جگہ زمین میں (اندھیرا) گھر ہے۔ جب تمہیں مٹی سے پیدا کیا گیا تو تم ہر گناہ سے پاک تھے لیکن اب تم دنیا سے گناہوں کے بوجھ کے ساتھ واپس ہو رہے ہو۔ پتھر پر یہ تحریر دنیا میں اس وقت تک قائم رہے گی جب تک مصنف کی ہڈیاں خاک نہیں ہو جاتیں۔

میاں محمد دین :- محمد دین تقریباً پچاس سال کی عمر کے انتہائی خدا رسیدہ شخص ہیں اور لاہور کا اسلامی طبقہ ایک اہم ادارے کے سربراہ ہونے کے باعث ان کا بہت احترام کرتا ہے۔ ان کے دادا شرف الدین انتہائی پرہیزگار اور معزز بزرگ تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ جو فقیروں سے بڑی رغبت

رکھتا تھا، ان کے پاس حاضری دیتا اور نذرانہ پیش کرتا۔ محمد دین کی یہ عادت تھی کہ وہ روزانہ اپنی مجوزہ قبر میں بیٹھتے تھے، جہاں وہ اپنا وقت قرآن پاک کی تلاوت اور موت کو یاد کرنے میں گزارتے تھے۔

مسجد محمد امین :۔ مشہور و معروف مقبرہ بی بی پاک دامن کے عقب میں لاہور کی جنوب مشرق جانب ایک بہت بڑی مسجد ہے جو اب شکستہ حالت میں ہے۔ اس کے تین گنبد ہیں ایک بڑا اور دونوں جانب چھوٹے ہیں۔ محرابی دروازوں کے اوپر انتہائی خوبصورت اور شاندار زرد رنگ کے منقش روغنی کام میں نیلے رنگ کے روغنی حروف میں عربی اور فارسی کی عبارات درج ہیں۔ بالائی منزل پر شمال اور جنوب میں واقع پختہ اینٹوں کی سیڑھی کے ذریعہ پہنچ سکتے ہیں۔ مسجد کا فرش خشتی ہے لیکن اب بہت زیادہ شکستہ ہو چکا ہے۔ شمالی محراب کے اوپر یہ عبارت درج ہے :۔

کل من علیہا فان و یبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔

ترجمہ :۔ ہر چیز فانی ہے اور بقاء صرف اللہ کو حاصل ہے جو ذوالجلال والاکرام ہے۔

درمیانی محراب کے اوپر یہ عبارت درج ہے :۔

عجلو بالصلوۃ قبل الموت۔

ترجمہ :۔ موت سے قبل نماز میں جلدی کرو۔

اس کے علاوہ کلمہ طیبہ عربی رسم الخط میں لکھا گیا ہے۔ اس کے ساتھ اللہ تبارک و تعالیٰ کے 99 اسمائے مبارک میں سے ایک یافتاح (اے مشکلات کو حل کرنے والے) درج ہے۔

جنوبی محراب پر یہ عبارت درج ہے :۔

انما یعمر مساجد اللہ من امن باللہ والیوم الاخر

ترجمہ :۔ یقیناً اللہ کا گھر وہی لوگ تعمیر کرتے ہیں جن کا اللہ پہ ایمان اور روز آخرت پر یقین ہوتا ہے۔

یہ مسجد ایک مغل اور حاکم لاہور خان بہادر ذکریا خاں کے ایک درباری امیر محمد امین بیگ نے اس وقت تعمیر کرائی جب نواب نے بیگم پورہ میں اپنی مسجد تعمیر کروائی تھی۔ محمد امین بیگ کی اولاد لاہور میں موچی دروازہ کے محلہ چوہٹہ میں آباد ہے (105)۔ اس عمارت کی طرز تعمیر اور منقش روغنی کام ہوبہو بیگم پورہ میں تعمیر شدہ نواب خان بہادر کی مسجد سے ملتا ہے۔

مسجد کے مشرق میں محمد امین بیگ کا ایک باغ تھا لیکن اب وہ زیر کاشت ہے۔

مزار بی بی پاکدامن :۔ گورنمنٹ ہاؤس کے عقب میں مین روڈ سے تین سو گز کے فاصلے پر بی بی

پاک دامن کا مزار ہے۔ یہ لاہور اور اس کے گرد و نواح میں ایک انتہائی قابل احترام قدیم یادگار ہے۔ ان پاک بی بی کا نام رقیہ المعروف بی بی حاج تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے داماد اور چوتھے خلیفہ اسلام حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی قریبی رشتے دار تھیں۔ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ آپ دیگر پانچ خواتین کے ہمراہ کربلا کی جنگ کے بعد جب حضرت امام حسینؑ کو شہید کر دیا گیا، ہجرت کر کے ہندوستان تشریف لے آئیں۔ آپ کا انتقال 110 ہجری بمطابق 728ء نوے برس کی عمر میں ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک راجہ نے جو اس وقت لاہور پر حکومت کرتا تھا، ان بیبیوں کی آمد کی خبر سن کر ان کی طرف اپنے آدمی روانہ کیے لیکن کیونکہ وہ اس کے پاس کسی صورت میں بھی نہیں جانا چاہتی تھیں۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے موت کی دعا کی۔ چنانچہ زمین شق ہو گئی اور وہ اس میں دفن ہو گئیں۔ راجہ کا قائم مقام جس کو اس کے باپ نے ان خواتین کو حاصل کرنے کے لیے روانہ کیا تھا، یہ کرامت دیکھ کر مسلمان ہو گیا اور وہ خانقاہ کا پہلا مجاور تھا جو بعد میں ان کی قبر پر تعمیر کی گئی تھی۔ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ موجودہ مجاور اسی کی اولاد ہیں۔ مزار کے ارد گرد خوبصورت کمرے اور ایوان محمود غزنوی اور اس کے جانشینوں نے تعمیر کرائے تھے۔

مزار والدہ امام الدین خاں :۔ مقبرے کی چار دیواری سے باہر نواب شیخ امام الدین خاں (106)، کی والدہ کا مزار ہے۔ قبر کا تعویذ جو شفاف سنگ مرمر کا ہے اس پر فارسی کی مندرجہ ذیل عبارت درج ہے۔۔

ام نواب شیخ امام الدین
پردہ انداخت بر رخ نیکو
گفت تاریخ ہاتف غیبی
او تعالیٰ بہشت داد بدو

غرہ شہر محرم الحرام سنہ 1266 ہجری

ترجمہ :۔ جب نواب شیخ امام الدین کی والدہ نے اپنا نیک چہرہ پردے سے ڈھانپ لیا تو ایک غیبی آواز نے ان کی تاریخ وفات کے بارے میں کہا:
اللہ تعالیٰ نے ان کو بہشت عطا کر دی ہے۔
یکم محرم الحرام 1266 ہجری بمطابق 1849ء

شرقی دیوار پر مندرجہ ذیل اشعار درج ہیں:۔

نواب امام الدین بہادر

شد والدہ اش بخلد و خوش خفت
ای وائی کہ رفت مریم دہر
قیدافہ وقت روی بنهفت
تاریخ وفات ہاتف غیب
زہرا او رسول شافعش گفت
کتبہ فقیر حقیر امام ویردی

ترجمہ :۔ نواب امام الدین بہادر کی والدہ خلد بریں میں جا کر میٹھی نیند سو گئی ہیں۔
افسوس! کہ وقت کی مریمؑ گزر گئی ہیں اور وقت کی قیدافہ (ملکہ) نے اپنا چہرہ چھپا لیا ہے! ایک غیبی آواز نے ان کی تاریخ وفات کے بارے میں کہا:
حضرت رسول اکرمؐ اور حضرت زہراؑ ان کی شفاعت کریں۔
تحریر کردہ: فقیر حقیر امام ویردی

مسجد وزیر خاں :۔ مسجد وزیر خاں جو شہر لاہور کی زینت اور فقید المثال خوبصورتی اور شان و شوکت کی ایک بہترین یادگار عمارت ہے۔ اس کو مکمل طور پر گلکاری اور منقش ٹائلوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ اس کی منبت کاری کی آرائش اور دیواروں کے منقش خاشیے اسی طرح واضح، چمکدار اور تر و تازہ ہیں جس طرح پہلے تھے۔ گل بوٹوں کے خاشیے سخت چونے میں نصب کیے گئے ہیں۔ پتے، پھول، درخت اور تنے جن سے بیرونی دیواروں کو مزین کیا گیا ہے، ٹائلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں لیکن انہیں اس خوبصورتی سے مربوط و یکجا کیا گیا ہے کہ پچی کاری کا یکساں کام معلوم ہوتا ہے۔ یہ آرائش فن مصوری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اصل میں یہ منقش تصویر کشی کا حقیقی نمونہ ہیں۔ مسٹر تھارنٹن نے اس کو اطالوی فن مصوری سے تشبیہہ دی ہے۔ اس مقام پر اکثر دیکھا گیا ہے کہ فن مصوری کے طالبعلم اس کی آرائش کی نقل کر رہے ہوتے ہیں اور اس کی مشق کرتے ہیں۔ یہ ان فنکاروں کے ذوق اور مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے جنہوں نے یہ نقش و نگار تخلیق کیے تھے۔ ان نمونوں میں زندگی کی تر و تازگی، رنگوں کی بہتات اور آرائش دیکھنے والے کی داد تحسین حاصل کیے بغیر نہیں رہ سکتی (107)۔

یہ عمارت ایرانی اور مغلیہ طرز کا امتزاج ہے۔ جبکہ اس کا بانی پنجاب کا رہنے والا تھا۔ یہ مسجد ایک بلند چبوترے پر واقع ہے اور اس پر مشرق کی طرف سیڑھی کے ذریعے پہنچ سکتے ہیں۔ یہ

پانچ حصوں میں منقسم ہے۔ ہر در ایک کشادہ صحن کی طرف کھلتا ہے۔ درمیان میں اس پر ایک گنبد ہے۔ درمیان والی محراب اطراف کی دونوں محرابوں سے زیادہ بڑی ہے۔ چو گوشہ صحن کے ہر کونے پر انتہائی بلند مینار ہے اور اس کے چاروں طرف غلام گردش ہے جہاں سے شہر اور گرد و نواح کے علاقہ کا حسین نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ مسجد کے صحن کے وسط میں پانی کا حوض ہے جو نمازیوں کو وضو کے لیے پانی مہیا کرتا ہے۔

یہ مسجد ضلع جھنگ کے علاقہ چنیوٹ کے رہنے والے شیخ علم الدین انصاری بن شیخ عبد اللطیف بن شیخ حسام الدین نے 1044 ہجری بمطابق 1634ء میں تعمیر کرائی۔ شاہجہاں کے دور حکومت میں اسے وزیر کے عہدے پر فائز کیا گیا اور سات ہزاری منصب کے ساتھ وزیر خاں کا خطاب دیا گیا۔ ملا عبد الحمید لاہوری کی تصنیف " بادشاہ نامہ " کے مطابق علم الدین عربی سیکھنے کے بعد حکیم دعوی کا طب میں شاگرد ہو گیا۔ وہ شہزادہ خرم (شاہجہاں) کی ملازمت میں اس وقت داخل ہوا جب ابھی وہ شہزادہ تھا اور پھر اس کے شاہی خاندان کا دیوان مقرر ہوا۔ بعد ازاں وہ شاہی باورچی خانے کا نگران (میر سامان) مقرر ہوا اور اس کے بعد اسے شہزادہ کے تحت دیوان بنا دیا گیا۔ شہزادہ حکیم کے فرائض منصبی کی خوش اسلوبی اور اس کی اعلیٰ قابلیت سے اتنا خوش تھا کہ سریر آرائے تخت ہوتے ہی اسے حاکم پنجاب بنا دیا۔ وہ شاہی طبیب تھا اور اس نے شاہی خاندان کے افراد کا علاج اتنی کامیابی سے کیا کہ اس کے باعث وہ اپنے آقا (بادشاہ) کا منظور نظر ہو گیا(108)۔

مقبرہ سید محمد اسحاق۔ یہ مسجد حضرت سید محمد اسحاق المعروف میراں بادشاہ گازرونیؒ (ایران) کے مزار کی جگہ پر بنائی گئی تھی۔ آپ تغلق دور حکومت میں لاہور میں آباد ہوئے۔ اس صوفی بزرگ کا مزار ابھی تک موجود ہے اور مسلمانوں میں بڑا مقبول ہے۔ اس مسجد کے امام کے پاس وقف کے معاہدہ نامہ (کاغذات) بتاریخ رمضان المبارک 1051 ہجری بمطابق 1641ء سے پتہ چلتا ہے کہ اس مسجد کا بانی نواب وزیر خاں، مسجد سے دہلی دروازہ تک گلی کے دونوں اطراف کی دکانات اور مکانات کا مالک تھا، ان کی آمدنی کے علاوہ دہلی دروازہ کے قریب حماموں اور سرائے کی آمدنی بھی اس نے مستقل طور پر مسجد کی دیکھ بھال اور اس سے متعلقہ تعمیرات کے لیے وقف کر دی تھی۔ یہ سب کی سب وسیع و عریض جائیداد ماسوائے مسجد کی عمارت کی دکانات کے نجی ملکیت میں آ گئی ہے۔ سرائے اور حمام حکومت کے قبضہ میں ہیں۔ اس کے بانی کی خواہش کے مطابق دروازے کی دکانات جلد سازوں کے قبضہ میں ہیں اور اس کے اندرونی حجرے مصوروں، مصنفین اور اس مسجد سے منسلک طالبعلموں کے قبضے میں ہیں۔

مسجد کے دروازہ کی اندرونی جانب فارسی رسم الخط میں مندرجہ ذیل بہت بڑی عبارت درج ہے:-

محمد عربی کا بردی ہر دوسرا ست
کسی کہ خاک درش نیست خاک بر سر او

ترجمہ:- حضرت محمد عربیؐ دونوں جہانوں کی آبرو ہیں جو کوئی ان کے در کی خاک نہیں، اس کے سر پر خاک پڑے۔

دروازہ کی پیشانی پر کلمہ طیبہ درج ہے:-

افضل الذکر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

ترجمہ:- سب سے افضل ذکر ہے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔

عبارت کے نیچے یہ درج ہے:-

در عہد ابو المظفر صاحب قرآن ثانی شاہ جہان بادشاہ غازی اتمام یافت
بانی بیت اللہ ثانی فدوی با اخلاص مرید خاص الخاص قدیم الخدمت وزیر خان۔

ترجمہ:- اس کو صاحب قرآن ثانی شاہ جہاں بادشاہ غازی کے عہد میں تعمیر کیا گیا۔ اللہ کے اس گھر کا بانی مخلص فدوی مرید خاص الخاص پرانا خدمت گار وزیر خاں ہے۔

دروازے کی پیشانی پر قطعہ تاریخ کے مندرجہ ذیل اشعار درج ہیں جن سے مسجد کی تاریخ بنیاد کا پتہ چلتا ہے:-

این خانہ کہ ہست چون فلک مظہر فیض
دارد چو حریم کعبہ سر در سر فیض
بر چہرہ اہل قبلہ این در بمراد
تا حشر کشادہ باد ہمچون در فیض

ترجمہ:- یہ عمارت جو فلک کی طرح ہے، فیض کا مظہر ہے۔ حرم کعبہ کی طرح اس کا مقصد انسانیت کو فیض پہنچانا ہے۔ تا حشر اس کا دروازہ فیض عام کے لیے کھلا رہے۔

سال تاریخ بنائی مسجد عالی مقام

از خرد جستم بگفتا سجدہ گاہ اہل فضل

ترجمہ :۔ جب میں نے خرد سے اس عالی شان مسجد کی تاریخ بنیاد کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا: یہ اہل فضل کی سجدہ گاہ ہے۔

الفاظ " سجدہ گاہ اہل فضل " کے مادہ سے 1044 ہجری کا سال برآمد ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا عمارت کے بعد مندرجہ ذیل عبارت ہے:۔

تاریخ این بنائی چو پرسیدم از خرد
گفتا بگو کہ بانی مسجد وزیر خاں

ترجمہ :۔ جب میں نے خرد سے اس کی تاریخ بنیاد کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے جواب دیا اس مسجد کا بانی وزیر خاں ہے۔

الفاظ " بانی مسجد وزیر خاں " سے اس کی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔

دروازے پر آخری عبارت کچھ یوں ہے:۔

دہقان درود بحشر ای نیک سرشت
در مزرعہ آخرت ہر ان چیز کہ کشت
در باب عمل بنائے خیری بگداز
کاخر ہمہ را رہست زین در بہ بہشت

ترجمہ :۔ اے نیک سرشت آدمی دنیا کی کھیتی میں جو کچھ بوئے گا آخرت میں کاٹ لے گا۔ اپنے عمل میں سے دنیا میں کوئی نیک کام کی بنیاد ڈال جا کہ ہر ایک کو بہشت میں آخرکار اسی راستے سے جانا ہے۔

اس نظم کی خوبصورتی آخری قصیدہ میں ہے جو دروازے پر موجود ہونے کے باعث نجات کے راستے کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

وزیر خاں کا وصیت نامہ :۔ مجھے بہ نفس نفیس اس مسجد کے متولیوں کے پاس، اس مسجد کے بانی نواب وزیر خاں کا وصیت نامہ دیکھنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ یہ 250 سالہ قدیم کاغذ ہونے کے علاوہ اس لحاظ سے بھی دلچسپی کا حامل ہے کہ اس میں اس بات کی بالکل صحیح معلومات فراہم ہوتی ہیں کہ اس مسجد کا بانی اس کے بارے میں کتنی توجہ صرف کرتا تھا اور اس نے اس عبادت گاہ کی دیکھ بھال کے لیے کیا انتظامات کیے تھے۔ اس وصیت نامے پر شاہجہاں کے دور میں لاہور کے قاضی الصدر قاضی محمد یوسف، نواب وزیر خان وصی، مصاوی خاں صدر الصدور، مولانا محمد فاضل اور

سولانا محمد شاہ کی مہریں ثبت ہیں۔ یہ کچھ اس طرح ہے:۔

هو الله

الحمد لله الذی وفق عباده الاعزاز الباقیات الصالحات والصلوة والسلام علی رسوله محمدؐ الذی رغبت الدایا فی انفاق الطیبات و علی اله و اصحابه معدزالخیرات و منافع الحسنات مادام الارض والسموت اما بعد

این ذکریست در بیان آنکه وقف کرد و تصدق نمود نیازمند درگاه صمدی مسمی حکیم علم الدین المخاطب به وزیر خان بن شیخ عبدالطیف بن شیخ حسام الدین انصاری از خالص املاک و اطیب

اموال خود فی حال الصحة و کمال اعقل و نفاذ جمیع تصرفاته طائعا همگی مسجد جامع بجمیع توابع و رافق سید عشه آن و برائی دوام این بقعه شریفه وقف کرد بر مصالح مسجد مذکور خود تمام دکاکین دو رسته معه بالا خانها و کڑہا و سرائے کلان و حمام و دو چاه چرخ و چند قطعه زمین متفرقه که هریک ازین امکنه مذکوره معلومته الحدود ظاهر علامات است واقع اندرون دارالسلطنت لاهور وقفا صحیحا لازما بتة تبله لا یباع ولا یوهب ولا یرهن ولا یمیر لا یورث ولا ملک بوجه من الوجوه و سبب من الاسباب الی ان یرث الله الارضی و هو خیرالوارثین و جعل اخر الوقف علی الفقراء المسلمین و شرط کرد این وقف مذکور که داروغگی و تصرف در اوقاف مذکور در عزل و نصب خدمه مسجد وغیره و تقسیم و تعین مصارف و از دیاد آن و اعطاء و حرمان از ان نشست و برخاست اهل کرایه ـ دکاکین بدست خود واقف مذکور بالا ستقلال مادام حیوته باشد و بعد از و بدست ولد صلبی محمد سعید خان بعد او به میرزا محمد انور و بعد و بارشد ذکور اولاد او و اولاد او بطنا بعد بطن و نسلا بعد نسل اے ماتوالد و تناسلوا واگر احدی از اولاد او نباشد به یکی از ذکور اقارب او کذلک و شرط کرد نیز امام خطیب مسجد بذکور یک کس باشد اقرء و اعلم احکام الصلوة و مؤذن عالم وفات و نیز شرط کرد که بیست قطعه دکاکین بیرون دروازه شرقی و بالا خانهاء آنها محض برائے نشستن صحافان کتب اسلامیه بی کرایه باشد علی سبیل الدوام و نیز شرط کرد که در مسجد مذکور برائے تعلیم علوم دینیه و مدرس باشند سبیل اہل

خدمات از محصول عملہ اوقاف مذکور آنکہ ۔ امام و خطیب را یومیہ از یکروپیہ تادہ روپیہ و مؤذن را چہار آنہ یومیہ ہر یک مدرس را یکروپیہ ۔ و ہر کہ از اولاد واقف متصرف وقف مذکور باشد در ہر ماہ ششم حصہ از محصول کرایہ اوقاف گیرد و ہر کسے از اقربا باشد نہم حصہ گیرد وکذلک ۔ و مابقیہ از خرچ عمارت و اہل خدمہ و مصالح ضروریہ دیگر کالمشرف و الوقاد والفراش یصرف علے المستحقین فی المسجد و عندالتعبین یصرف علی الخدمہ کما ہوالحکم فی المذہب الحنفی کل ذلک قد شرط الواقف فمن بدلہ بعد ماسمعہ فانما اثمہ علی الذین یبدلونہ فقد حکم بلزوم الوقف المذکور و شرط القاضے

النافذ الاحکام الذی زین ھذ لوثیقۃ

بختمۃ المبارک

تحریر گرانی غرۃ رمضان المبارک الواقع فی 1051 ھ

ترجمہ

ھو اللہ

تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے اپنے غلاموں کو دینی گھر آباد کرنے کی توفیق دی اور سلام ہو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنہوں نے لوگوں کو نیک مقاصد کے لیے مال و زر صرف کرنے کی ترغیب دی۔ سلام ہو آپ کی آل پر صحابہ کرام پر جو منبع رشد و ہدایت ہیں اور وہ رہتی دنیا تک مشعل راہ ہیں۔

یہ جان لینا چاہیے کہ میں بقائمی ہوش و حواس یہ باضابطہ طور پر اعلان کرتا ہوں کہ میں خدا کا ایک ناچیز بندہ، حکیم علم الدین المعروف وزیر خاں ولد شیخ عبدالطیف ولد شیخ حسام الدین انصاری ملکیت کے اختیارات منقولہ و غیر منقولہ جائیداد، شہر لاہور میں واقع جامعہ مسجد کے لیے نیک مقاصد میں استعمال کرنے کے لیے قانونی طور پر وقف کرتا ہوں اور یہ کہ اس مقدس ادارے کو دوام بخشنے کے لیے میں نے اس کے اخراجات کے لیے سڑک کے دونوں جانب واقع دکانات بمہ بالائی منزل، آباد علاقے، عظیم سرائے، حمام رہٹ سمیت دو کنویں اور زمین

کے بیشمار قطعات اور اس جائیداد کی ہر شے جس کا ابھی ذکر کیا گیا ہے تعین کرنے اور حدود مقرر کرنے کے بعد اس کے لیے وقف کر دیے ہیں۔ یہ وراثت بالکل قابل عمل، یقینی، باقاعدہ طے شدہ اور حکمنا ہے۔ اس کو فروخت نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ہی اس کو رہن یا گروی رکھا جا سکتا ہے۔ یہ ناقابل انتقال ورثہ ہے اور یہ کسی بھی حال میں اور کسی وقت بھی کسی کی جائیداد اور ملکیت نہیں بن سکتی۔ اس روز تک جب اللہ تعالیٰ جو سب سے بڑا وراثت عطا کرنے والا ہے، تمام زمینوں کا حساب لے گا اور غریب مسلمانوں کے لیے یہ میرا آخری عطیہ ہے۔

مندرجہ بالا وراثت کے متعلق شرائط حسب ذیل ہیں:۔

اس وراثت کا انتظام و انصرام مسجد کے ملازمین وغیرہ کی تقرری و برخواستگی، اخراجات کے استعمال اور اس سے متعلق سرمایہ کاری اور رقم کی وصولی میں اضافہ وغیرہ، دکانات کے محل وقوع اور ان کے قوانین اور قواعد وضوابط تاحیات خود وصی کے پاس رہیں گے۔ اس کے بعد اختیارات اس کے جانشینوں میں سے محمد سعید خاں کے پاس ہوں گے اور اس کے بعد مرزا محمد انور کے پاس اور اس کے بعد اس کی اولاد میں سے کسی قابل مرد کے پاس اسی طرح پشت در پشت اور نسل در نسل تک اس کی اولاد کے پاس رہیں گے۔ اگر اس کی اولاد میں کوئی مرد نہ ہو تو پھر یہ اختیار اس کے کسی قریبی عزیز رشتہ دار کو مذکورہ بالا قواعد کے مطابق دے دیے جائیں گے۔

مزید برآں یہ شرط رکھی گئی ہے کہ مسجد کا ایک ہی امام اور واعظ ہو گا اور وہ نماز کے قواعد وضوابط سے واقف اور علم و فضل میں یکتائے روزگار ہو گا اور ایک سرکاری ڈھنڈورچی، نماز کے لیے ہو گا جو تمام ماتمی رسومات سے بخوبی آگاہ ہو گا۔

مزید یہ کہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ شرقی دروازے کے باہر بیس دکانیں بمعہ اپنی بالائی منزل کے مکمل طور پر بلا کرایہ اسلامی کتب فروشوں اور جلد سازوں کو استعمال کے لیے دی جاتی ہیں۔

مزید یہ کہ اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ مذکورہ مسجد میں دینیات کی تعلیم دینے کی غرض سے دو استاد رکھے جائیں۔

مندرجہ ذیل شرائط اس ترکہ کے ساتھ ملحقہ عمارات کے معاوضے کے متعلق ہیں۔ امام اور استاد ایک روپیہ سے دس روپیہ یومیہ تک حاصل کریں گے۔ سرکاری ڈھنڈورچی نمازوں کے لیے چار آنے روزانہ اور ہر استاد ایک روپیہ وصول کریں گے۔

مذکورہ بالا وراثت کا انتظام کرنے والا وصی کا کوئی بھی عزیز رشتہ دار اس وراثت کی جائیداد کی آمدنی کا 6/1 حصہ ہر ماہ وصول کرے گا۔ نیز اس کے رشتہ داروں میں سے کوئی بھی جو اس کا انتظام کرے گا اسے نواں حصہ دیا جائے گا۔ اسی طرح رشتہ داری کے حساب سے حصہ کی شرح کم ہوتی رہے گی اور عمارت کے اخراجات اور مسجد کے خادموں اور ضروری اخراجات کے بعد جو کچھ باقی بچ جائے اسے مہمانوں کی تواضع، حماموں کے لیے ایندھن کی لکڑی مہیا کرنے سرائے اور دیگر مستحقین جو اس مسجد سے متعلقہ ہوں ان پر خرچ کیا جائے اور مسجد کے ملازمین کا تقرر کرتے وقت حنفی مسلک سے رہنمائی حاصل کی جائے اور یہ کہ مندرجہ بالا قواعد وضوابط خود وصی نے وضع کیے ہیں۔ اگر کسی نے اس کو سننے کے بعد اس میں کسی قسم کا ردوبدل کرنے کی کوشش کی تو اسے گناہ گار سمجھا جائے گا۔ اس وراثت کو باقاعدہ لازمی حیثیت حاصل ہے۔ نیز جو کچھ میں نے اس پر تحریر کیا ہے اس کو وقت کے قاضی نے توثیق کرنے کے بعد اس پر اپنی مقدس مہر ثبت کی ہے۔

یہ یکم رمضان المبارک 1051 ہجری بمطابق 1641ء کو تحریر کیا گیا۔

مزار امام گاموںؒ:۔ امام غلام محمد المعروف امام گاموں کے مزار کا گنبد مسجد وزیر خاں کے جنوب میں واقع ہے۔ آپ حافظ محمد صدیق کے فرزند تھے اور اپنے علم و فضل کی وجہ سے بڑی شہرت کے حامل تھے۔ انہوں نے علم الکلام پر فارسی میں ایک نظم لکھی جس کو انہوں نے "گنج مخفی" کا نام دیا۔ آپ مسجد کے امام تھے۔ آپ 1244 ہجری بمطابق 1828ء میں فوت ہوئے۔

مزار حضرت سید صوفؒ:۔ مسجد وزیر خاں کے دروازے کے سامنے جنوب کی طرف ایک احاطہ میں ایک سفید گنبد ہے جس کے نیچے حضرت سید صوف کا مزار ہے۔ آپ حضرت سید اسحاقؒ کے ہمعصر تھے جن کی خانقاہ مسجد کے صحن میں واقع ہے۔ شمالی دیوار کے اوپر ایک سنگ مرمر کی تختی نصب ہے جس پر فارسی کی مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

بصوابدید صاحب عالی مناقب میجر جارج میکریگر صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر ضلع لاہور مقبرہ متبرکہ حضرت سید صوف قدس سرہ تعمیر کردہ شیخ سلطان ٹھیکہ دار سرکار فیض آثار کمپنی انگریز بہادر دام اقبالہ سنہ 1852 عیسوی سمت 1908 سنہ 1268 ہجری باتمام رسید۔

ترجمہ :۔ صاحب عالی مقام میجر جارج میکریگر صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر ضلع لاہور کے مشورہ سے شیخ سلطان ٹھیکیدار ایسٹ انڈیا کمپنی نے حضرت سید صوف قدس سرہ کا مزار مبارک سمت 1908 اور 1268 ہجری بمطابق 1852ء تعمیر کیا۔

چاہ راجہ دینا ناتھ :۔ اس کے سامنے شمال کی طرف ایک اور گنبد کھلی محرابوں سمیت ہے۔ اس میں پینے کے پانی کا ایک کنواں ہے جسے لوگوں کی کثیر تعداد استعمال کرتی ہے۔ اس عمارت کی جنوبی دیوار پر سنگ مرمر کی تختی نصب ہے جس پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے۔

امارت و ایالت دستگاہ خیر اندیش دولت عالیہ دیانت دار مشیر خاص مدار المہام راجہ دینا ناتھ صاحب بہادر راجہ کلانور بصوابدید صاحب عالی مناقب میجر میکریگر صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر ضلع لاہور طیاری عمارت چاہ ہذا در سمت 1908 مطابق سنہ 1851 عیسوی بصرف از خود نمود۔

ترجمہ :۔ راجہ دینا ناتھ راجہ کلانور نے صاحب بہادر میجر میکریگر صاحب ڈپٹی کمشنر ضلع لاہور کے مشورہ سے یہ کنواں 1908 سمت بمطابق 1851 ، تعمیر کرایا۔

سنہری مسجد :۔ نواب بھکاری خاں کی سنہری مسجد کشمیری بازار میں ایک منزل بلند پختہ چبوترے پر ایستادہ ہے اور دور ہی سے دکھائی دے جاتی ہے۔ یہ ایک انتہائی خوبصورت اور شاندار مسجد ہے۔ اس میں جسامت کے چھوٹا ہونے کے ساتھ ساتھ مکمل طور پر یکسانیت اور موزونیت پائی جاتی ہے۔ اس کا ڈھکا ہوا اصل راستہ جنوب کی طرف ہے اور پتھر کے زینے صحن کی طرف جاتے ہیں لیکن مشرق کی طرف مین بازار کے سامنے حال ہی میں ایک نیا دروازہ بنایا گیا ہے اور اس سے مسجد کی خوبصورتی اور شان میں دوچند اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ مسجد مکمل طور پر اینٹوں سے بنائی گئی ہے اور تین محرابی دروازوں کے اوپر تین گنبد ہیں۔ ان پر طلائی ملمع چڑھا ہوا ہے۔ درمیان والا گنبد اطراف کے دونوں گنبدوں سے کافی بڑا ہے۔ محرابی گزر گاہوں کے اوپر تنگ محرابوں کی ایک چھوٹی سی

منڈیر ہے۔ اس پر طلائی ملمع کاری سے مزین چھوٹے گنبدوں کی قطار ہے۔ صحن کے بالکل وسط میں ایک تالاب یا حوض ہے جو نمازیوں کے وضو کے لیے پانی سے بھرا رہتا ہے۔

اس مسجد کا بانی محمد شاہ کے دور حکومت میں درانی احمد شاہ کے شدید مخالف میر معین الملک المعروف میر منو کی صوبیداری کے تحت لاہور کے نائب صوبے دار اور روشن الدولہ طرہ باز خاں کا بیٹا نواب سید بھکاری خاں تھا۔ اس نے یہ مسجد 1753ء میں تعمیر کرائی۔ وہ انتہائی حسین و جمیل نوجوان تھا۔ اسلامی قوانین سے مکمل واقف اور نہایت پرہیزگار اور خدارسیدہ شخص تھا۔ میر منو کے انتقال کے بعد جب اس کی بیوہ مراد بیگم نے اپنے شیرخوار بیٹے کے نام پر حکومت سنبھالی تو بھکاری خاں کو اس کا مکمل اعتماد حاصل تھا۔ تاہم اس سے ایک ایسا جرم سرزد ہو گیا جس کو وہ نظر انداز نہیں کر سکتی تھی چنانچہ اس غضب ناک خاتون نے اپنی خواتین کے ساتھ مل کر اسے جوتے مار مار کر ہلاک کر دیا۔

سکھوں کے دور میں اس مسجد پر اکالیوں نے قبضہ کر لیا۔ انہوں نے اس کے فرش پر گائے کے گوبر سے لیپ کر کے اس میں گرنتھ رکھ دی۔ مسلمانوں نے فقیر عزیز الدین اور فقیر نورالدین سے کہا کہ وہ اپنے طور پر اس مسجد کی بازیابی کے سلسلہ میں مہاراجہ سے بات چیت کریں۔ چنانچہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اعلیٰ حیثیت کے ان فقیروں کی درخواست پر جن کو بادشاہ کے پسندیدہ ماشکی گھلو (109) کی حمایت حاصل تھی (اور جس کو رنجیت سنگھ پر ذاتی طور پر کافی اثر و رسوخ حاصل تھا) اس شرط پر مسجد مسلمانوں کے حوالے کر دی کہ وہ بلند آواز میں اذان نہیں دیں گے اور اس مسجد کے ساتھ ملحقہ دکانوں کی آمدنی دربار میں جمع کرائی جائے گی۔ برطانوی حکومت نے کمال مہربانی سے کپتان (اب کرنل) نسبٹ صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر کی سفارش پر یہ دکانیں مسلمانوں کے حوالے کر دیں۔ مسلمان نسبٹ صاحب بہادر کے اس اقدام اور عوامی فلاح و بہبود کے لیے کیے جانے والے دیگر کاموں کی وجہ سے ان کے بہت شکر گزار ہیں۔ شرقی دروازے کے اوپر نصب سنگ مرمر کی تختی پر عربی زبان کا مندرجہ ذیل قطعہ درج ہے۔

یا بھیکتہ مسجد قلبی و انت فیہ مقیم

ترجمہ: اے بھیک (110) میرا دل مسجد میں ہے اور اس میں آپ مقیم ہیں۔

درمیانی محرابوں کے بالائی حصہ پر نصب سنگ مرمر کی تختی پر قرآن پاک کی مندرجہ ذیل آیت درج ہے۔

قل یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسہم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب

جمیعا ان ھو الغفور الرحیم (111)۔

ترجمہ :۔ اے میرے لوگو! جب تم اپنی جانوں پر ظلم کر ڈالو تو اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو۔ وہ تمہارے سب گناہ بخش دے گا۔ بے شک وہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

مسجد محمد صالح: ۔شہر کے موچی دروازے میں چند قدم اندر کی طرف دیکھنے والے کی نظر سب سے پہلے جس چیز پر پڑتی ہے وہ بہار دانش کے مصنف شیخ عنایت اللہ کے بھائی محمد صالح کی انتہائی خوبصورت اور جاذب نظر مسجد ہے۔ اس پر انتہائی شاندار طرز میں منقش روغنی کام کیا گیا ہے۔ اس مسجد میں داخلہ نہایت نفیس سیڑھی کے زینوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ دروازے پر درج عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ مسجد کو 1070 ہجری بمطابق (1659ء) میں تعمیر کیا گیا۔ اس کے بانی کا نام فارسی کے مندرجہ ذیل شعر میں دیا گیا ہے:۔

بانی این مسجد زیبا بنا   بندہ آل محمد صالح است

ترجمہ :۔ اس خوبصورت عمارت کی مسجد کا بانی آل محمدؐ کا غلام صالح ہے۔

محرابوں اور دیواروں کی اندرونی جانب قرآن پاک کی آیات کے ساتھ انتہائی اعلیٰ معیار کے فارسی اشعار بھی درج ہیں۔ اگر ان عبارات کو یہاں درج کیا جائے تو یہ قارئین کے لیے اکتاہٹ کا باعث ہوں گی کیونکہ ان میں مشرقی مبالغہ آرائی کی بھرمار ہے۔

اس کے بانی کا مکان مشرق کی طرف ہے۔ اب ایک ہندو تاجر اس کا مالک ہے۔

مسجد بوکن خان :۔ یہ کشادہ مسجد موچی دروازہ کے محلہ ڈھل میں واقع ہے۔ اس کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے اصطبل کے نگران بوکن خان نے ایک قدیم مسجد کی جگہ پر 1257 ہجری بمطابق 1841ء تعمیر کرایا تھا۔ اس کے ساتھ ملحقہ ایک چھوٹا سا باغ ہے اور اس میں درویشوں کے لیے حجرے اور ایک حمام ہے۔ دروازہ پر مندرجہ ذیل تاریخ قطعہ درج ہے:۔

چون زیکن خان والا منزلت   شد بنا این مسجد ذی الاحترام

بہر تاریخش زہاتف شد ندا   کعبہ ثانی بنا شد این مقام

ترجمہ :۔ جب عالی مقام بکن خان نے اس مقدس مسجد کو تعمیر کرایا تو ایک غیبی آواز نے اس کی تاریخ بنیاد کے بارے میں کہا: اس جگہ کعبہ ثانی تعمیر ہوا ہے۔

چینیاں والی مسجد:۔ شہر میں کانسی کے کام کی یہ چوتھی مسجد ہے۔ یہ محلہ چابک سواراں میں واقع ہے۔ اس کو عالمگیر کے دور حکومت میں لاہور کے فوجدار نواب سرفراز خاں نے 1052 ہجری

بمطابق 1671ء تعمیر کرایا تھا۔ اس میں فارسی کی عبارات کثرت سے درج ہیں لیکن ان کو یہاں لکھنا ضروری نہیں ہے۔ مسجد کا دروازہ سنگ ابری اور اس دروازے کی دہلیز کا فرش سنگ مرمر کا تھا لیکن اس کو رنجیت سنگھ سے قبل لاہور کے حاکموں گوجر سنگھ اور لہنہ سنگھ نے اتروا لیا۔ مسمار کیے گئے دروازہ کے سامنے والے حصہ پر مندرجہ ذیل عبارت درج تھی:۔

طرفہ معمار خرد تاریخ سال گفت زیبا مسجد از افراز خان

ترجمہ:۔ خرد کے معمار نے اس کی کیسی عمدہ تاریخ بنیاد کہی۔

یہ افراز خاں کی خوبصورت مسجد ہے۔

مسجد موراں: یہ مسجد شاہ عالمی دروازے کے اندر پاپڑ منڈی بازار میں واقع ہے۔ اس کی بانی رنجیت سنگھ کی بیگم موراں تھی۔ اس کو اس سخت گیر حکمران پر اس قدر اثر و رسوخ حاصل تھا کہ حکومت کے معاملات کے بارے میں اس سے مشورہ کیا جاتا اور بڑے سے بڑا سردار بھی اس سے خوف کھاتا تھا۔ مہاراجہ اپنے شاہی سواروں کے دستے کے ہمراہ اس کے گھر جایا کرتا تھا اور اس کے نام پر سکے نچھاور کرتا تھا۔ موراں شاہی کے نام سے مشہور سکہ اور اس کے نام کی عبارت کے حامل روپوں کو آج کل نادر اشیاء کے طور پر رکھا گیا ہے۔ اس مسجد کو 1224 ہجری بمطابق 1809ء تعمیر کیا گیا۔ اس کو ایک منزل کی بلندی پر تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کے مشرق اور مغرب میں دکانیں ہیں، جن میں موجود کمروں میں گلی میں دیکھنے کے لیے کھڑکیاں بنائی گئی ہیں۔ اس میں درویشوں کے لیے حجرے اور حمام بنائے گئے ہیں۔ گنبدوں پر کلس سبز رنگ کے منقش روغنی کام سے آراستہ ہیں۔ جنوب کی طرف دروازے پر مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ درج ہے:۔

بفضل ایزد دارائے افلاک　　جو موراں مسجدے اراست بر خاک

بتاریخ بنایش گفت ہاتف　　شدہ تعمیر للہ مسجد پاک

ترجمہ:۔ بفضل خدا اور آسمانوں کے مالک کے کرم سے جب موراں نے زمین پر ایک مسجد تعمیر کرائی تو ایک غیبی آواز نے اس کی تاریخ بنیاد کے بارے میں کہا: اللہ کے نام پر یہ مسجد پاک تعمیر کی گئی ہے۔

نیویں مسجد:۔ یہ دلچسپ مسجد لوہاری دروازہ اور شاہ عالمی دروازہ کے درمیان چوک متی کے قریب کوچہ ڈوگراں میں واقع ہے۔ یہ ایک انتہائی پرانی عمارت ہے اور گلی کی سطح سے ایک منزل نیچی ہے۔ یہ مسجد انتہائی وسیع و عریض ہے اور اندرونی کمروں پر بڑی جسامت کے گنبد ہیں۔ اس کی محرابیں چوڑی ہیں اور انہیں انتہائی پختہ اینٹوں سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس میں حجرے، بغلی کمرے،

حمام اور ایک کنواں ہے۔ اس کا صحن بہت کشادہ اور وسیع و عریض ہے اور مسجد میں داخلہ سیڑھی کے زینوں کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ عمارت کی گہرائی کے باوجود اس کے کمرے اسی قدر روشن ہیں جس طرح زمین کی سطح کے اوپر والی عمارت ہوتی ہے۔ مسجد میں دو کنویں ہیں اور ان کے ذریعے بارش کا اور فالتو پانی نکال دیا جاتا ہے۔

اس مسجد کو لودھی خاندان کی حکومت کے ایک امیر ذوالفقار خاں نے تعمیر کرایا تھا۔ وہ حاکم لاہور ہیبت خان کے تحت ایک محکمہ کا سربراہ تھا۔ یہ مسجد مسلمانوں میں بڑی مقبول ہے۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ گلی کی سطح ایک وقت میں مسجد کے فرش کی سطح کے برابر تھی اور یہ کہ اس وقت سے اب تک آبادی اس کی موجودہ بلندی پر پہنچ گئی ہے (112)۔

کہا جاتا ہے کہ جب نواب نے اپنے محل یا دربار کی تعمیر مکمل کر لی تو اس نے اس مقام پر اپنے استعمال کے لیے یہ چھوٹی سی مسجد تعمیر کرائی۔ یہ انتہائی بے نظیر عمارت ہے اور اس جیسی مسجد بار بار تعمیر نہیں ہو سکتی۔

مقبرہ ملک ایاز:۔ یہ مقبرہ نواب سعد اللہ خاں کے محل، رنگ محل کے گرد و نواح میں ٹکسال گلی میں واقع ہے۔ ایاز، محمود غزنوی کا بہت چہیتا اور محبوب تھا اور اس مسلمان حکمران کے کارناموں اور ارشادات پر مشتمل کتابوں میں اس کے نام کا ذکر ملتا ہے۔ مسلمانوں کے طبقوں میں ابھی تک اس بات کا اظہار کیا جاتا ہے کہ اس نے لاہور کے قلعہ اور فصیل کو معجزانہ طور پر صرف ایک ہی رات میں تعمیر کرا دیا تھا۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اس نے لاہور کے راجہ اننگ پال کی شکست کے بعد (جس نے محمود کی فوجوں کا سامنا کیا تھا) شہر کو از سر نو تعمیر کرایا تھا۔ وفات کے بعد وہ لاہور میں اسی مقام پر دفن کیا گیا۔ اینٹوں اور چونا سے تعمیر کردہ مزار 9 فٹ 10 انچ اور 7 فٹ 6 انچ سے ایک چبوترے پر واقع ہے اور اس کو ہر وقت سیاہ کپڑے سے ڈھانپ کر رکھا جاتا ہے۔ اس میں داخلہ ایک دروازے کے ذریعے ہوتا ہے جو ایک چھوٹے سے صحن میں جاتا ہے۔ اس مزار کے ساتھ ملحقہ ایک بہت بڑا باغ سکھوں کی حکومت کے دوران ختم ہو گیا تھا لیکن اس سے حقیقی طور پر وابستہ چند دکانیں ابھی تک موجود ہیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں سکہ اس علاقہ میں ڈھالا جاتا تھا۔ اسی وقت سے اس گلی کو ٹکسال بازار کا نام دے دیا گیا۔

مقبرہ پیر شیرازی:۔ یہ انتہائی متبرک مزار شہر کے علاقہ "جوڑے موری محلہ" میں واقع ہے اور یہ شہر کی انتہائی قدیم عمارتوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہاں پر دفن بزرگ کا نام پیر سراج الدین ہے۔ آپ کا آبائی وطن بخارا تھا اور آپ تقریباً 723 ہجری بمطابق 1323ء محمد تغلق کے دور حکومت

میں لاہور آئے، جو اپنے دور کا انتہائی باکمال شہزادہ تھا۔ اس کے عربی اور فارسی زبان میں تحریر کردہ خطوط کو آج بھی سفارتی مراسلہ نگاری کے انتہائی نادر نمونہ جات سمجھا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ حاکم ملتان نے حضرت پیر سراج الدین کو سرکاری کام سے لاہور کے دربار میں بھیجا۔ آپ اپنے علم و فضل اور عالمانہ استعداد کے باعث بادشاہ کے منظور نظر ہوگئے۔ بادشاہ نے آپ کو یعنی پیر سراج الدین کو لاہور کا قاضی بنانے کی خواہش کا اظہار کیا لیکن آپ آزاد منش درویش تھے اس ییے آپ نے اس پیشکش کو قبول نہ کیا۔ بادشاہ آپ کے اس رویہ سے سخت ناراض ہو گیا۔ لہذا آپ نے دنیا کے معاملات ترک کر دیے اور گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی۔ آپ اپنے گھر میں فوت ہوئے اور وہاں آپ کا فقید المثال مزار تعمیر کیا گیا۔

مسجد نواب امام الدین :۔ یہ مسجد محلہ "چیلے کا حمام" میں واقع ہے۔ یہ انتہائی خوبصورت اور جاذب نظر عمارت ہے۔ اس کے بانی شیخ غلام محی الدین کے صاحبزادے شیخ امام الدین خاں تھے۔ وہ سکھوں کے دور میں حاکم کشمیر تھے۔ انگریز قارئین ان کو اس لیے بہتر طور پر جانتے ہیں کہ انہوں نے کشمیر میں اس وقت بغاوت کر دی تھی جب یہ علاقہ مہاراجہ گلاب سنگھ کے حوالے کر دیا گیا۔ بعد میں انہوں نے انگریزوں سے اتحاد کر لیا۔ انہوں نے اپنے فوجی دستوں کے ساتھ سر ہربرٹ ایڈورڈز کی مدد کی اور ملتان کے بدنام زمانہ باغی مولراج کے خلاف انگریزوں کی جانب سے لڑے۔

شیخ صاحب نہایت عالم فاضل اور ادبی کمالات کے حامل تھے۔ انہوں نے اس عالیشان مسجد کو 1266 ہجری بمطابق 1849ء تعمیر کروایا۔ یہ ایک منزل بلند ہے اور اس میں سیڑھی کے زینوں کے ذریعے داخل ہوا جاتا ہے جو ایک وسیع و عریض صحن کی طرف کھلتا ہے۔ اس کے گنبد انتہائی شاندار ہیں اور اندرونی ایوان کی طرف جانے والی محرابیں بلند و بالا اور خوبصورت ہیں۔ مرکزی محراب کے سامنے والے حصہ پر نصب سنگ مرمر کی تختی پر مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ درج ہے:۔

امام الدین خان نواب ذی جاہ عمارت کرد مسجد حسب دلخواہ چو تاریخش بجستم
ہاتف غیب بگفتا فی الحقیقت کعبۃ اللہ۔

ترجمہ۔ نواب عالی جاہ امام الدین خاں نے دلکش مسجد تعمیر کرائی۔ جب میں نے اس کی تاریخ بنیاد تلاش کی تو آسمان سے غیبی آواز نے کہا:۔
دراصل یہ کعبۃ اللہ ہے۔

مرکزی گنبد کی اندرونی جانب چاروں طرف مندرجہ ذیل اشعار درج ہیں جن سے اس کی

تاریخ بنیاد کا پتہ چلتا ہے:۔

زہے نواب عالیشان کہ از تائید یزدانی
موافق شد پئے تعمیر مسجد از خدا دانی
چہ مسجد قبلہ گاہ عارفان و معبد نیکان
مقام فیض ربانی مکان لطف سبحانی
بنام ایزد ازین تعمیر تسخیر دو عالم کرد
خریدہ دولت باقی عقبی از زر فانی
سر اعدا فگندہ گفت ہاتف سال تاریخش
بدنیا از امام الدین بنا شد کعبہ ثانی

ترجمہ:۔ نواب عالی شان کس قدر اعلیٰ رتبے کے مالک ہیں۔ انہوں نے اللہ کی تائید سے اور اس کے علم سے آشنا ہونے کے باعث یہ مسجد تعمیر کی ہے۔ کیسی عمدہ مسجد ہے! قبلہ گاہ عارفاں اور نیک لوگوں کی عبادت گاہ۔ یہ مقام فیض ربانی ہے اور اس کے لطف و کرم کا مقام ہے۔ اس مسجد کے بانی کو دو عالم کی فتح حاصل ہے۔ انہوں نے (اس دنیا کے) زر فانی سے عقبیٰ کی دولت خرید لی ہے۔ غیبی آواز نے دشمنوں کی طاقت کو زائل کرتے ہوئے اس کی تاریخ بنیاد کے سال کے بارے میں کہا:۔

اس دنیا میں امام الدین نے کعبہ ثانی تعمیر کیا ہے (113)۔

مسجد کہنہ بھاٹی دروازہ:۔ یہ مسجد بھاٹی دروازہ میں "گلی لکڑ ھارا" محلہ میں واقع ہے۔ یہ ایک بلند و بالا چبوترے پر واقع ہے اور اس پر زینوں کے ذریعے پہنچ سکتے ہیں۔ کافی بلندی پر واقع ہونے کے باعث اس کو اچی مسیت (اونچی مسجد) کہا جاتا ہے۔ اس مسجد کو اکبر کے دور کے ایک ماشکی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ مرکزی ایوان (ہال) کی ایک محراب پر طغریٰ رسم الخط کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ اس مسجد کو اکبر کے دور میں تعمیر کیا گیا۔ اس کو حال ہی میں از سر نو تعمیر کیا گیا ہے۔ بیرونی دروازے پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

چہ نو تعمیر باب مسجد ست این — کہ ساجد پیش محرابش جہانست
چو شد تعمیر معمار خرد گفت — کہ ایں باب بہشت جاوداں است

ترجمہ:۔ یہ اس مسجد کا کتنا شاندار دروازہ ہے۔ اس کی محراب کے سامنے ہر کوئی

سر جھکاتا ہے۔ جب اس کو تعمیر کیا گیا تو معمار خرد نے کہا: کہ یہ بہشت جاوداں کا دروازہ ہے۔

1299 ہجری 1881ء

مسجد ٹبی بازار:۔ یہ انتہائی وسیع و عریض، مسجد بھاٹی دروازہ کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے، تحصیل کورٹ کے مغرب میں ٹبی بازار میں واقع ہے۔ بیرونی محراب پر درج عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ اس کو شاہجہاں کے دور میں غلام مہدی خاں نے تعمیر کرایا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں اس کو بارود خانہ کے طور پر استعمال کیا گیا۔ اب مسلمان اس کو عبادت کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔

سبز گنبد:۔ کانسی کے کام والا یہ چھوٹا سا لیکن انتہائی دلکش گنبد، قلعہ کی مخالف سمت، ٹکسالی دروازہ کو جانے والی سڑک کے جنوب میں اور صدر تحصیل کورٹ کے شمال میں واقع ہے۔ بیرونی دیواروں پر ابھرے ہوئے حروف میں قرآن پاک کی آیات درج ہیں۔ اس مقبرے کو ایک بخاری سید حضرت بدالدین شاہ عالمؒ سے منسوب کیا جاتا ہے جو شاہجہاں کے دور میں فوت ہوئے۔ موجودہ مقبرہ آپ کی یادگار کے طور پر شاہجہاں کے وزیر سعد اللہ خاں نے بنوایا تھا۔ اس کے اردگرد ایک بہت بڑا باغ تھا، ماسوائے ایک پرانے کنویں کے جس کو تحصیل کی حدود میں شامل کر لیا گیا ہے، اس کے تمام نشانات مٹ گئے ہیں۔ راجہ سوچیت سنگھ نے جب اس مقبرے کے قریب اپنی حویلی تعمیر کرائی تو اس نے اس کی تمام ملحقہ زمین کو اس میں شامل کر لیا۔ لاہور کے بخاری سید یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ بزرگ ان کے آباؤ اجداد میں سے ہیں۔

مسجد عبداللہ خاں:۔ شہر میں کانسی کے منقش روغنی کام والی یہ دوسری مسجد ہے۔ یہ ٹکسالی دروازہ کے قریب واقع ہے اور اس کو یہاں پر شاہجہاں کی قائم کردہ شاہی ٹکسال کے قریب واقع ہونے کی وجہ سے ٹکسال والی مسیت (مسجد) بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا بانی بادشاہی مسجد کے بانی اورنگ زیب کے دودھ شریک بھائی فدائی خاں کا نائب عبداللہ خاں تھا۔ یہ مسجد تقریباً اسی دور میں تعمیر ہوئی، جب شاہی مسجد تعمیر ہوئی، اور یہ ہندوؤں کے قبضہ میں بھی رہی، لیکن 1868ء میں مسلمانوں کے حوالے کر دی گئی۔ سکھوں کے دور حکومت میں اس کے شمال میں توپوں کی قطاریں نصب کی گئیں لیکن وہ زمین بوس ہو چکی ہیں۔ اس کی شمال مشرقی جانب ایک بہت بڑا قدیم کنواں ہے۔ اس پر ایک وسیع و عریض بڑ کے درخت کا سایہ موجود ہے۔

نواب وزیر خاں کی چھوٹی مسجد:۔ یہ ٹھوس عمارت، جس کی محرابوں اور بیرونی دیوار پر

منقش روغنی کام کیا گیا ہے۔ ٹکسالی دروازے کے قریب، اور مشرق کی جانب، شہر کی فصیل کے بالکل نزدیک واقع ہے۔ اس کے قریب شاہجہاں کے دور حکومت میں حاکم لاہور نواب وزیر خاں کے عالی شان محل تھے لیکن اب وہ سب زمین بوس ہو چکے ہیں۔ ان کی بنیادوں کے چند نشانات ابھی تک موجود ہیں۔ یہ مسجد وزیر خاں کے حرم کی عبادت گاہ تھی اور اس کا راستہ حرم سرا کی طرف سے تھا۔ مسلمانوں کے محلہ میں واقع ہونے کی وجہ سے اس کو زیادہ تر عبادت گاہ کے طور پر ہی استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

مقبرہ شاہ رضا قادری:۔ اس بزرگ کا مزار، تحصیل کے قریب، "محلہ ٹبی" میں واقع ہے۔ یہ ایک کھلے صحن میں واقع ایک چبوترے پر قائم ہے۔ صوفیہ فرقے کے لوگ اس خانقاہ پر منعقد ہونے والے سالانہ عرس میں یہاں جمع ہوتے ہیں۔ یہاں پر خدا کی حمد و ثنا پیش کی جاتی ہے اور درویش اور دیگر سامعین وجد میں آکر جھومتے ہیں۔ یہ بزرگ شطاریہ قادریہ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ اورنگ زیب کے دور حکومت میں 1118 ہجری بمطابق 1706 عیسوی فوت ہوئے اور یہاں دفن کیے گئے۔ حضرت شاہ عنایت اللہؒ اس بزرگ کے مرید تھے۔ ان کے مرید قصور کے حضرت بابا بلھے شاہؒ تھے، جن کی پنجابی زبان میں تحریر کردہ کافیاں ہزاروں لوگوں کی زبان پر ہیں۔ ان کی بارہ ماسہ، پنجابی زبان کی ایک خوبصورت نظم ہے اور اس کو کلن وات یا موسیقار گاتے ہیں۔

مقبرہ حضرت سید مٹھا:۔ یہ ایک مسلمان صوفی بزرگ حضرت معین الدینؒ کا انتہائی مقبول عام مقبرہ ہے جن کو لوگ ان کی خوش مزاجی اور خوش گفتاری کے باعث "سید مٹھا" کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ گلی جس میں آپ کا مزار واقع ہے، اس کو آپ کے نام سے "سید مٹھا بازار" کہا جانے لگا۔ حدیقۃ الاولیاء کے مطابق آپ کے والد گرامی کا آبائی وطن خوارزم تھا۔ جب تاتاریوں نے عظیم جنگجو سردار چنگیز خاں کی سرکردگی میں خوارزم کو فتح کیا اور خوارزمی شہزادے کو شکست ہو گئی تو حضرت جمال الدینؒ نے شہزادہ جلال الدین کے ہمراہ غزنی میں پناہ حاصل کی۔ جب چنگیز خاں نے غزنی کو بھی فتح کر لیا تو جمال الدین نے اپنے سرپرست جلال الدین کے ہمراہ ہندوستان کو ہجرت کی اور لاہور میں مقیم ہو گئے۔ خدا رسیدہ اور مذہبی رجحان کے باعث جمال الدینؒ کے شہر میں بہت سے مرید بن گئے اور لوگ ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کے صاحبزادے معین الدینؒ آپ کے جانشین اور سجادہ نشین مقرر ہوئے۔ ان کو اپنے والد گرامی سے بھی زیادہ فیض کمال حاصل ہوا اور آپ کی بزرگی نیک نامی اور علم و فضل کی دھوم دور دراز تک پھیل گئی۔ آپ ایک عظیم واعظ تھے۔ آپ کا نرم رویہ اور فصاحت و بلاغت پورے علاقے میں مشہور ہو گئی۔ آپ 661 ہجری بمطابق

1262ء فوت ہوئے۔ لوگ آپ کے مزار کی بہت زیادہ تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔

مزار پیر ذکیؒ :۔ شہر کا یکی دروازہ جس کا اصل نام ذکی دروازہ تھا اس کو ذکی پیر کے نام کی وجہ سے پکارا جاتا ہے۔ اس بزرگ کا صرف سر دروازے کے غربی کمرہ میں دفن ہے جبکہ باقی دھڑ اس کے قریب ایک طویلہ میں دفن ہے۔ تب سے اس بزرگ کے دو مزارات تعمیر کیے گئے ہیں۔ " تحفتہ الواصلین " کے مطابق یہ بزرگ پنجاب پر مغلوں کے حملوں میں سے ایک حملے کے دوران، ان کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ اس وقت آپ اس دروازے میں رہتے تھے۔ جب مغلوں نے شہر کا محاصرہ کیا تو آپ کو فوجی دستوں کے ہمراہ دروازے کی حفاظت پر مامور کیا گیا۔ آپ دشمن سے انتہائی دلیری کے ساتھ لڑے لیکن آخر کار تصادم میں گھر گئے۔ مصنف کے مطابق آپ کا سر تن سے جدا ہو گیا لیکن اس کے باوجود آپ بڑی دیر تک لڑتے رہے اور تلوار سے بہت سوں کو ہلاک کیا۔ آخر کار دھڑ بھی گر گیا اور روح پرواز کر گئی۔ یہ روایت ابھی تک لوگوں میں مقبول ہے۔

شہر کے مشہور مکانات

قدیم شہر لاہور بلند و بالا، شاندار اور خوبصورت مکانات سے بھرا ہوا ہے۔ ذیل میں چند نہایت اہم عمارتوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو یا تو اپنے خوبصورت اور انتہائی اعلیٰ طرز تعمیر کی وجہ سے یا اس اہم صوبہ کی تاریخ سے متعلق نمایاں شخصیات سے تعلق رکھنے والی قدیم عمارات سے وابستہ دلچسپی کے باعث مشہور ہیں۔

حویلی میاں خاں :۔ یہ مکان جو ایک زمانے میں فقید المثال طرز تعمیر کا حامل تھا، شہر کے وسط میں واقع ہے۔ دراصل اس کو شاہجہاں کے وزیر اعظم، چنیوٹ کے نواب سعد اللہ خاں نے تعمیر کرایا تھا مگر وہ اس کی تکمیل سے پہلے ہی فوت ہو گیا۔ اس کے بیٹے اور جانشین نواب میاں خاں نے اسے مکمل کروایا۔ تب سے حویلی اسی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ شہر کا بلند ترین مکان تھا۔ اس میں دس کنویں، بیشمار ایوان، پتھر کے ستونوں والے محرابی کمرے، پانی کے حوض و فوارے، تہہ خانے، غلام گردشیں اور بالا خانے موجود تھے۔ حویلی کو تین حصوں میں منقسم کیا گیا تھا۔ محل سرائے (زنان خانہ) دربار (رنگ محل) اور قلعی خانہ، زنان خانوں کو آج کل حراسیوں کے استعمال میں لایا گیا ہے۔ اس میں تقریباً دو سو سے چار سو تک مکانات موجود ہیں۔ رنگ محل میں مشن سکول قائم ہے اور قلعی خانہ کی عمارت کو نجی مکانات میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ زیادہ تر عمارتیں یا تو تباہ ہو گئی ہیں یا ان میں رد و بدل کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا اب ان محلات کی سابقہ شان و شوکت کی کون سی ایسی

خصوصیات باقی بچی ہیں جو بیان کی جائیں۔ سکھوں کے دور میں یہ مکانات توپ خانے کے کماندار سلطان محمود اور کرنل غوث خاں کو دے دیے گئے۔ نواب میاں خاں کا باغ اور مقبرہ موضع باغبانپورہ کے مغرب میں واقع ہے۔

مبارک حویلی :۔ یہ وسیع و عریض حویلی موچی دروازہ میں واقع ہے اور اب یہ نواب ناصر علی خاں کی رہائش گاہ ہے۔ اس کو بادشاہ محمد شاہ کے دور میں دربار کے معزز امراء میر بہادر علی، میر نادر علی اور میر بابر علی نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کی تکمیل پر جب امراء نے اس میں رہائش اختیار کی تو خاندان کے سب سے بڑے فرد میر بہادر علی کو خدا نے بیٹے سے نوازا۔ اس خوش کن واقعہ کی یادگار کے طور پر وہ اس گھر کو مبارک حویلی کہنے لگے اور اسی وقت سے یہ مکان اپنے موجودہ نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ جگہ اس لیے بھی مشہور ہے کہ یہاں سخت گیر رنجیت سنگھ نے کابل کے بدقسمت شاہ شجاع الملک کو اس کے حرم کے ہمراہ نظربند کیا اور اس سے زبردستی مشہور ہیرا "کوہ نور" بھی ہتھیا لیا۔ بیشمار اذیتیں اٹھانے کے بعد آخرکار شاہ ایک سوراخ میں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا جو اس نے رات کو دیوار میں بنا لیا تھا اور لدھیانہ میں برطانوی حکام کے پاس پناہ حاصل کر لی۔ انہوں نے اس کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ موجودہ قابضین نے حویلی میں بہت سی ترامیم اور اضافے کر دیے ہیں۔

پری محل :۔ پری محل، شاہ عالمی دروازہ میں واقع ہے۔ اس کو شاہجہاں کے وزیر نواب علم الدین المعروف وزیر خاں نے بنوایا تھا اور یہ اس کی نجی رہائش گاہ تھی۔ وہ یہاں اپنا دربار بھی منعقد کرتا تھا۔ یہ شاندار ایوانوں، باغات، حماموں اور دیگر عالی شان عمارتوں سے مزین تھا لیکن لاہور کے ثلاثہ حکمرانوں اور ان کے بعد رنجیت سنگھ نے اس کا قیمتی پتھر اتار لیا۔ حویلی کے ساتھ ملحقہ دکانیں اور دیگر اہم عمارات ابھی تک موجود ہیں اور یہ ٹھوس عمارات خوبصورت طرز تعمیر کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

حویلی کلو بائی :۔ یہ کشادہ عمارت یکی دروازہ میں واقع ہے اور عام طور پر آہلو والیہ حویلی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کو حاکم لاہور نواب ذکریا خاں المعروف خان بہادر نے اپنی بیوی کلو بائی (جو پیشہ ور مغنیہ تھی) کی رہائش گاہ کے طور پر تعمیر کرایا۔ نیچ ذات ہونے کی وجہ سے اس خاتون کو نواب کے حرم میں داخلے کی اجازت نہیں مل سکتی تھی۔ لہذا اس نے اس کے لیے کثیر رقم سے ایک علیحدہ گھر بنوایا۔ نواب ذکریا خاں کے ایک وارث نواب غازی خاں نے اس کا ایک بڑا حصہ عام لوگوں میں فروخت کر دیا۔ بعد میں رنجیت سنگھ نے اس کو کپور تھلہ کے راجہ کے مورث اعلیٰ اور

میں ہوتا ہے۔ اس کو مہاراجہ کھڑک سنگھ کے بیٹے شہزادہ نونہال سنگھ نے تعمیر کرایا اور اس کو اپنی نجی رہائش گاہ کے طور پر استعمال کیا۔ یہ بیشمار کشادہ کمروں، ایوانوں اور غلام گردشوں پر مشتمل ہے۔ اس کی چھتوں کو نقش و نگار اور آئینوں سے آراستہ کیا گیا ہے اور اس میں طلائی کام بھی کیا گیا ہے۔ دیواروں کو انتہائی خوبصورتی اور مہارت سے شیشوں اور مصنوعی پھولوں سے مزین کیا گیا ہے۔ اب یہ حکومت کی ملکیت ہے اور اسے زنانہ مدرسے کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔

حویلی جمعدار خوشحال سنگھ :۔ یہ انتہائی بڑا اور وسیع و عریض مکان "چونامنڈی" میں واقع ہے۔ اس کی دیواریں اور بالائی کمرے اتنے بلند ہیں کہ یہ ایک نجی رہائش گاہ کی بجائے قلعہ نظر آتا ہے۔

حویلی راجہ دھیان سنگھ :۔ یہ ہیرامنڈی میں واقع ہے۔ یہ جمعدار خوشحال سنگھ کی حویلی سے کافی بڑی ہے۔ شہ نشینوں پر مشتمل ہے جو زنان خانوں سے علیحدہ ہیں۔ اس میں ہتہ خانے بھی ہیں اور اس کے ساتھ ملحقہ عمارات انتہائی خوبصورت اور جاذب نظر ہیں۔ دوہرے ایوان کے سامنے ایک کشادہ صحن ہے۔ اس کے وسط میں راجہ دھیان سنگھ کی سمادھ ہے۔ اس پر ایک خوبصورت گنبد بمعہ طلائی کلس موجود ہے۔ یہ محلات اپنی شان و شوکت و خوبصورتی کے لحاظ سے پنجاب کے عظیم مہاراجہ کے وزیر اعظم اور اس عمارت کے بانی کی شہرت کے شایان شان ہیں۔

حویلی راجہ دینا ناتھ :۔ یہ خوبصورت حویلی بمعہ اپنی عالی شان بالائی منزلوں، جاذب نظر کمروں اور شاہانہ دروازوں کے دہلی دروازہ میں واقع ہے۔ یہ آنجہانی راجہ کے بیٹے کنور نرنجن ناتھ کے قبضہ میں ہے۔ دینا ناتھ کی دوسری حویلی، دیوان بج ناتھ کی حویلی کے سامنے ہے اور یہ اس کے پوتے دیوان رام ناتھ حلف دیوان امر ناتھ کے قبضہ میں ہے۔ امر ناتھ عربی اور فارسی کا بہت بڑا عالم ایک سیاح اور شاعر تھا۔ اس کا تخلص اکبری تھا۔ فارسی زبان میں اس کی تحریر کردہ "تاریخ خالصہ" بہت بڑا کارنامہ ہے۔

حویلی نواب امام الدین خان :۔ یہ شاندار حویلی لوہاری دروازہ میں واقع ہے۔ اس کا بانی سکھ حکومت کے تحت حاکم کشمیر نواب امام الدین خان تھا۔ اس میں بیشمار ایوان اور کمرے ہیں جن کو نہایت خوبصورت نقش و نگار سے آراستہ کیا گیا ہے۔ اب یہ مرحوم نواب کے بیٹے نواب غلام محبوب سبحانی کے قبضہ میں ہے۔

حویلی راجہ سوچیت سنگھ :۔ یہ دراصل تین بڑی حویلیاں ہیں۔ ان میں سے دو میں تحصیل کورٹ موجود ہے۔ ایک چوتھی عمارت طویلہ یا "اصطبل سوچیت سنگھ" کے نام سے مشہور ہے اور

جس کا خاشیہ سنگ سرخ سے بنایا گیا ہے۔ اس کی سیڑھی کے زینے بھی اسی پتھر کے ہیں۔ دروازہ ایک کشادہ صحن کی طرف کھلتا ہے جس کے ارد گرد گنبدی چھتوں والے حجرے، کمرے اور ایوان بنائے گئے ہیں۔ مغرب کی طرف بیرونی ایوان میں مخصوص اوقات اور دیگر مواقع پر پوجا کے لیے لوگوں کو بلانے کی غرض سے نوبت، بگل، سنکھ اور گھنٹیاں رکھی گئی ہیں۔ صحن کے وسط میں ایک بلند پتھر کے چبوترے پر ایک مندر ہے جس میں شیوجی مہاراج کی خوبصورت مورتی رکھی گئی ہے۔ اندرونی دیواروں پر دیوی، دیوتاؤں کی تصاویر سے آرائش کی گئی ہے۔ گنبد کے اوپر چمکدار سنہری کلس، ہندوؤں کی اس نہایت مقبول عام پرستش گاہ کی دلکشی اور شان میں اضافہ کرتا ہے۔ پوجا کی رسم کے مطابق ایک سوراخ دار برتن پانی سے بھر کر مورتی کے اوپر رکھ دیا جاتا ہے اور اس میں سے پانی کے قطرے شیوجی کے اوپر گرتے ہیں۔ مندر کی اندرونی جانب اس جگہ کا فرش جہاں شیوجی ایک نمایاں جگہ پر براجمان ہیں شفاف سنگ مرمر کا ہے۔ جب پوجا کا وقت ہو جاتا ہے تو موسیقی کے آلات اس قدر زور شور سے بجنا شروع ہو جاتے ہیں کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ تاہم یہ پوجا کے لیے ناگزیر ہے۔ یہ مندر کشمیری پنڈتوں کی انتہائی پسندیدہ پرستش گاہ ہے۔ اس کا بانی راجہ دینا ناتھ بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔

شوالا بخشی بھگت رام:- یہ شہر میں ہندوؤں کی عبادت گاہوں میں سے ایک نہایت شاندار اور مقبول عام جگہ ہے۔ اس کا بانی مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوجوں کا جرنیل تھا۔ اس نے اس کو سمت 1900 بمطابق 1844ء تعمیر کرایا۔ یہ کوتوالی کے عقب میں بخشی کے نام سے مشہور کوچہ میں واقع ہے۔ یہ عمارت دو منزلہ ہے۔ پہلی منزل پر چھ زینوں کے ذریعے پہنچتے ہیں۔ بیرونی دروازے کے اوپر مقدس بیل کی دو سنگین مورتیاں، ہاتھی کی مورتی اور ایک مگرمچھ کی ہے۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی دیوتاؤں کی پتھر کی مورتیاں دکھائی دیتی ہیں۔ جو گنیش (ہاتھی) ہنومان (بندر) اور بھیروجی کی ہیں۔ فرش پتھر کا ہے۔ جگن موہن کی مورتی سنگ مرمر کے چبوتروں پر ہے اس کے گرد اسی پتھر کا جنگلا لگایا گیا ہے۔ مندر ایک بلند و بالا مینار کی صورت میں ہے، جس میں شیوجی سنگ مرمر کے ایک چبوترے پر براجمان ہیں۔ مینار کے اوپر سمتوں کے مطابق مختلف جسامت کے بے شمار طلائی کلس ہیں۔ درمیان والا سب سے بلند ہے۔ مندر خوبصورتی سے ترشی ہوئی پتھر کی مختلف جسامت کی بیشمار مورتیوں پر مشتمل ہے۔ پجاری ان کی پرستش کرتے ہیں۔ مندر میں فوارے اور جھرنے بنائے گئے ہیں اور اس کے علاوہ گرم موسم میں پجاریوں کے آرام کے لیے پرلطف تہہ خانے بھی بنائے گئے ہیں۔ سنگ مرمر کا چبوترہ جو دو گز لمبا اور دو گز چوڑا ہے، اس میں

بیٹھ کر اس عمارت کا بانی برہمنوں کو خیرات دیا کرتا تھا، ابھی تک محفوظ ہے۔

یہ شوالا نہایت دلکش عمارات پر محیط ہے اور یہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور حکومت میں حکومت کے افسروں کے پاس موجود مال و دولت کی بہتات کا بین ثبوت ہے۔

گردوارہ، گرو رام داس :۔ یہ گردوارہ "چونہ منڈی" میں گلی کے جنوبی کونے کی طرف واقع ہے۔ گرو نانک کے جانشین اور ان کے چوتھے گرو رام داس کی جائے پیدائش ہونے کے باعث سکھ طبقہ اس جگہ کا بڑا احترام کرتا ہے۔ رام داس کے والدین یہیں پر مقیم تھے وہ اسی جگہ پیدا ہوا اور یہیں پرورش پائی۔ یہاں سے اسے گووند وال لے جایا گیا، جہاں تیسرے گرو امر داس کی بیٹی سے اس کی شادی ہو گئی۔ یہ گردوارہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور حکومت کے آخر پر ایک سال کے عرصہ میں تعمیر ہوا۔ یہ دربار صاحب امرتسر کی طرز پر بنایا گیا ہے۔ اس جگہ سکھوں کی گرنتھ رکھی گئی ہے۔ یہاں پر موسیقار اپنے موسیقی کے آلات کے ہمراہ مقدس بھجن گاتے ہیں۔ ہر اتوار کو مرد و زن کا ایک عظیم اجتماع یہاں ہوتا ہے۔ نیز سنگھ سبھا کے ارکان یہاں ملاقات کرتے ہیں۔ اس میں سماجی اور اخلاقی ترقی کے معاملات پر بحث ہوتی ہے۔

دھرم شالہ باوا خدا سنگھ :۔ سکھوں کا یہ مشہور و معروف گردوارہ چونی بازار میں ہے۔ اس کے بانی جسونت سنگھ تھے۔ جنہوں نے فقیر بننے کے بعد اپنا نام بدل کر خدا سنگھ رکھ لیا۔ یعنی ایک ایسا سکھ جو ایک خدا کی عبادت کرتا ہے۔ وہ ایک عظیم سیاح تھے۔ کافی عرصہ کابل میں قیام کیا۔ وہاں امیر دوست محمد خاں نے خوب آؤ بھگت کی۔ آپ کا انتقال بیس سال پہلے ہوا ہے۔ اب ان کا چیلا پریم سنگھ ان کی گدی پر بیٹھا ہے۔ دھرم شالا اینٹوں سے بنائی گئی ہے۔ شمال کی طرف واقع دروازہ ایک بہت بڑے صحن میں کھلتا ہے، جس کے ساتھ خشتی مکانات کی قطاریں ہیں۔ شمال کی طرف لوگوں کے اجتماع کے لیے بہت بڑا ایوان (ہال) ہے۔ یہاں پر گرنتھ رکھی گئی ہے۔ ہر تیسرے روز خدا اور گروؤں کی تعریف میں بھجن عورتوں اور مردوں کے عظیم اجتماع کے سامنے گائے جاتے ہیں۔ پھر مقدس کتاب کے سامنے نذرانے پیش کیے جاتے ہیں اور فقیروں میں کھانا تقسیم کیا جاتا ہے۔

ٹھاکر دوارہ راجہ تیجا سنگھ :۔ یہ شاندار مندر موتی بازار کے آخر پر واقع ہے اور پختہ اینٹوں سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کا بانی خالصہ فوجی دستوں کا کماندار تھا جو انگریزوں سے جنگ کی خاطر اپنی فوج کو ستلج کے پار لے گیا تھا۔ یہ عمارت دو منزلہ ہے اور اس کو پچیس سال پیشتر تعمیر کیا گیا تھا۔ اس میں داخلہ شمال کی جانب زینوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ دروازہ ایک کشادہ صحن کی طرف کھلتا ہے جس کا

فرش پختہ اینٹوں کا ہے اور اس کے ساتھ محرابدار کمروں کی قطاریں ہیں۔ اس صحن کے وسط میں ایک بلند چبوترے پر مندر ہے جو بلند و بالا اور عالی شان ہے۔ دروازے کے سامنے پتھر کا ایک چھجا انتہائی خوبصورت ہے۔ دیواروں میں اندرونی جانب پتھر کی تراشیدہ مورتیوں سے آرائش کی گئی ہے۔ سنگ مرمر کے ایک طاقچے میں انتہائی خوبصورتی اور نفاست سے شری کرشنا جی مہاراج اور رادھاجی کی مورتیاں قیمتی لباس میں ملبوس اور قیمتی زیورات سے سجا کر رکھی گئی ہیں۔ مندر کا مینار بلند و بالا اور متوازی الاضلاع ہونے کے علاوہ تین منزلہ ہے۔ مینار کے آخری سرے پر سونے کا کلس لگایا گیا ہے اور مختلف مقامات پر طلائی گھنٹیاں باندھی گئی ہیں۔ یہ مندر اب اس کے بانی کے متبنیٰ بیٹے شیخوپورہ کے راجہ ہربنس سنگھ کے زیر انتظام ہے۔

شوالا گلاب رائے:۔ یہ مستی دروازہ میں حویلی جمعدار خوشحال سنگھ کے عقب میں واقع ہے۔ اس کا بانی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں جمعدار تھا۔ یہ عمارت سنگ سرخ اور پختہ اینٹوں سے تعمیر کی گئی ہے۔ سنہری گنبد بہت بڑا اور کشادہ ہے۔

دھرم شالہ کوکہ پنتھ:۔ یہ موتی بازار کی غربی جانب واقع ہے۔ یہ عمارت اگرچہ مختصر ہے لیکن جاذب نظر ہے۔ یہاں پر گرنتھ رکھی گئی ہے۔ کوکہ فرقے کے لوگ یہاں جمع ہوتے ہیں۔ گرووں کی تعریف و توصیف میں بھجن گاتے اور مقدس کتاب کو سنتے ہیں۔

ہنومان جی کا مندر:۔ یہ مندر موتی بازار میں ہے۔ اندرونی جانب کی دیواریں اور چھتیں خوبصورتی سے آراستہ کی گئی ہیں۔ مشرقی دیوار پر سرخ رنگ میں ہنومان جی کی بہت بڑی تصویر ہے۔ دوسری تصویر کرشن بھگوان جی کی ہے۔ ہر صبح و شام عورتوں اور مردوں کی بہت بڑی تعداد یہاں جمع ہو کر مذکورہ بالا دیوتاؤں کے آگے جھکتے ہیں اور گڑگڑاتے ہیں۔ یہ مندر ہندوؤں میں بہت مقبول ہے۔

شوالا ترپولیہ:۔ یہ بلند مندر سڑک کے مشرقی کونے میں ترپولیہ بازار میں واقع ہے۔ یہ بلا شک و شبہ شہر میں ہندوؤں کی نہایت قدیم عمارات میں شمار ہوتا ہے اور کچھ لوگ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ یہ اتنا پرانا ہے جتنا خود شہر ہے۔ ایک بلند چبوترے پر مندر میں شیوجی مہاراج براجمان ہیں۔ مندر کے چاروں طرف بیشمار کشادہ عمارات ہیں۔ ان میں سے چند دو منزلہ ہیں اور یہ جوگیوں اور پجاریوں کی رہائش کے لیے بنائی گئی ہیں۔ یہ ادارہ نہایت اچھی حالت میں ہے اور ہندوؤں کے تمام طبقے اس عبادت گاہ کو بڑا مقدم جانتے ہیں اور جب سے یہ قائم ہے اس وقت سے اس کی قدامت کے باعث بڑا مقدس سمجھتے ہیں۔ باوا پریم ناتھ جوگی کافی عرصہ تک اس مندر کا نگران رہا چنانچہ اس کے

نام سے اس کو پریم ناتھ کا مندر کہا جانے لگا۔

باؤلی صاحب :۔ بھکاری خاں کی سنہری مسجد کے عقب میں ایک باؤلی ہے۔ پانی کے کنارے تک نیچے کی جانب زینے ہیں۔ اس کنویں کو جہانگیر کے دور میں سکھوں کے پانچویں گرو ارجن نے کھدوایا تھا۔ اس کے ساتھ بہت بڑا خیرات خانہ بھی تھا۔ اس کے جانشین گرو ہر گو بند کے زمانہ میں لاہور کے قاضی اور گرو کے درمیان جھگڑا ہو جانے کے باعث باؤلی بمعہ تمام ملحقہ عمارات کے بحق سرکار ضبط کر لی گئی اور سمت 1890 بمطابق 1834ء لنگر خانہ کی جگہ ایک مسجد تعمیر کی گئی۔ جب مہاراجہ انتہائی خطرناک حد تک بیمار ہو گیا تو اس کے نجومیوں نے اسے مشورہ دیا کہ باؤلی کو دوبارہ کھلوا کر اس کے پانی سے غسل کرو تو تندرست ہو جاؤ گے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اس کے پانی سے غسل کرنے سے بالکل تندرست ہو گیا۔ اس نے مسجد کو مسمار کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور کمروں، ایوانوں اور غلام گردشوں پر مشتمل موجودہ عمارات اس نے پانچ سال کے عرصہ میں ستر ہزار روپے کی لاگت سے تعمیر کرائیں۔ اس کے قریب ایک تالاب بھی بنوایا گیا تھا جو باؤلی کے پانی سے بھرا جاتا تھا لیکن اب سوکھ گیا ہے۔ ہندو اس جگہ کی بہت زیادہ تعظیم کرتے ہیں اور اپنے اہم اجلاس یہاں منعقد کرتے ہیں۔ گرنتھ صاحب، نہایت قیمتی کپڑوں میں لپیٹ کر انتہائی عقیدت و احترام سے ایک بلند چبوترے پر رکھی گئی ہے اور پجاریوں کو عبادت کے لیے بلانے کے لیے ایک بہت بڑی نوبت ہر صبح اور ہر شام کو بجائی جاتی ہے۔

ٹھاکر دوارہ بیکنٹھ داس :۔ یہ تین منزلہ مندر چکلا بازار میں ہے۔ اصل عمارت بہت زیادہ قدیم تھی لیکن اس کو از سر نو تعمیر کیا گیا۔ موجودہ عمارت بارہ سال پہلے باوا پریتم داس نے لوگوں سے چندہ اکٹھا کر کے تعمیر کرائی تھی۔ درمیانی منزل میں ایک انتہائی آراستہ کمرے کے طاقچے میں زیورات اور ہیرے، جواہرات سے آراستہ کرشن بھگوان مہاراج اور رادھا جی کی پتھر کی مورتیاں رکھی گئی ہیں۔ سامنے والے ایوان میں ہنومان جی کی سرخ رنگ کی تصویر ہے۔ یہ مورتیاں پوجا کے لیے رکھی ہیں اور برہما کے پیروکار یہاں نذرانے پیش کرتے ہیں۔ ایوانوں کو انتہائی خوبصورتی اور فن سے قالینوں اور گدوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔

شوالا دیوان شنکر ناتھ :۔ یہ شوالا چکلا بازار کے مشرق میں ہے۔ اس کا بانی پنڈت شنکر ناتھ سکھوں کے دور میں دیوان تھا اور اس کا شمار شہر کے نہایت مقبول آنریری مجسٹریٹوں میں ہوتا تھا۔ شوالا صحن کے وسط میں ہے اس کے اوپر بلند و بالا مینار ہے۔ اس پر ایک کلس سے آرائش کی گئی ہے جو اس کی خوبصورتی میں دو چند اضافہ کرتا ہے۔

شوالا رگناتھ مشر:۔ یہ شوالا چکلا بازار کے مشرق میں ہے۔ اس کو چالیس سال پہلے رگناتھ مشر نے تعمیر کرایا تھا اور بطور عبادت گاہ اس کو کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے۔

ٹھاکر دوارہ ماکھو مشر:۔ یہ رگناتھ مشر کے شوالا کے جنوب میں واقع ہے۔ یہ دو منزلہ عمارت ہے۔ اس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے آئینوں سے مرصع اور خوبصورتی سے آراستہ کمرے ہیں۔ اس میں قیمتی زیورات سے آراستہ کرشن جی اور رادھاجی کی مورتیاں پوجا کے لیے رکھی گئی ہیں۔

ٹھاکر دوارہ بانکے بہاری:۔ یہ لاہور کے ٹھاکر دواروں میں سب سے زیادہ شاندار ہے اور یہ بھائی بستی رام کی حویلی کے قریب واقع ہے۔ اس کی عمارت دو منزلہ ہے۔ اس کی دیواروں اور چھتوں کو بڑی نفاست اور خوبصورتی سے آئینوں کے ٹکڑوں اور مختلف رنگوں کے نقش و نگار اور آرائشوں سے سجایا گیا ہے۔ اس میں سنہری اور چمکدار رنگ بہت زیادہ استعمال کیا گیا ہے۔ نیز دیواروں کے روشن طاقچوں کو باریک ریشمی پردوں سے اس طرح مزین کیا گیا ہے کہ جب ان کی کرنیں باہر نکلتی ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آسمان پر بیشمار ستارے جگمگا رہے ہوں۔ پوری عمارت ایک تراشیدہ محل اور خوبصورت زیور معلوم ہوتی ہے اور یہ فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے۔ اصل مندر بہت پرانا ہے اور اس کی تاریخ بنیاد کے بارے میں اندازہ نہیں لگایا جا سکتا لیکن اس کو مہاراجہ رنجیت سنگھ اور اس کے شاہی خاندان کے روحانی پیشوا بھائیوں کی اولاد بھائی نند گوپال ایک رئیس نے بھاری لاگت سے از سر نو توسیع کر کے تعمیر کرایا۔ وہ ایک عوامی شخصیت اور بلند خیالات کا حامل شخص تھا۔ ہندوؤں کے ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو یہاں ایک بہت بڑا میلہ منعقد ہوتا ہے اور بھگت اور پجاری، لوگوں کے اجتماع کو اوتاروں کے بارے میں بھجن اور ان کے قول سنا کر محظوظ کرتے ہیں۔

ویشنو دیوی کا مندر:۔ یہ مندر شہر کے بھاٹی دروازہ میں محلہ تلواڑی میں واقع ہے۔ اس کو چالیس سال پیشتر لوگوں سے چندہ اکٹھا کر کے تعمیر کیا گیا تھا۔ مندر میں مغرب کی طرف واقع دروازہ سے داخل ہوا جاتا ہے۔ دیوی جی کا پتھر کا مجسمہ دیوار میں انتہائی آراستہ طاقچے میں رکھا گیا ہے۔ اس کو قیمتی کپڑوں اور زیورات سے سجایا گیا ہے۔ دیوی جی کو اصل میں امرتسر شہر کے گوردوارہ چوک ملا سنگھ میں رکھا گیا تھا اور بھاگو بھگت اس کو لاہور لے آیا۔ پورے علاقے کے ہندو اب اس کی پوجا کرتے ہیں۔

شوالا دل باغ رائے:۔ یہ شوالا محلہ تلواڑہ میں ہے۔ اس کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وزیر اعظم راجہ دھیان سنگھ کے دیوان دل باغ رائے نے تعمیر کرایا تھا۔ مندر کے دروازے کے باہر پرانے

وقتوں کا انتہائی قدیم اور بہت بڑا کنواں ہے۔ اس کو اب شوالا ہی کی حدود میں شامل سمجھا جاتا ہے۔ دراصل شوالا کی جگہ کا تعلق کنویں سے تھا لیکن محلہ کے لوگوں میں اس کی ملکیت کے بارے میں جھگڑا ہو جانے کے باعث دل باغ رائے نے موجودہ مندر اس جگہ تعمیر کر دیا۔ مندر پتھر سے تعمیر کیا گیا ہے اور اس پر ایک بہت بڑا گنبد ہے۔ مندر کے اندر ایک بلند چبوترے پر شیو جی انتہائی شان سے براجمان ہیں اور لوگوں کی بڑی تعداد ان کی پوجا کرتی ہے۔ پجاریوں کے لیے کمرے بنائے گئے ہیں اور اس شوالا میں ہندوؤں کی کثیر تعداد مقیم ہوتی ہے۔

شوالا ٹبی والا:۔ یہ متبرک مندر ٹبی محلہ میں راجہ سوچیت سنگھ کی حویلی جو اب صدر تحصیل کے طور پر استعمال ہو رہی ہے کے مشرق میں واقع ہے۔ شاید یہ لاہور میں ہندوؤں کا انتہائی قدیم مندر ہے اور اس کو لازماً اس وقت تعمیر کیا گیا ہو گا جب ہندوؤں نے شہر لاہور کی بنیاد رکھی۔ یہ مندر خاص طور پر ڈیڑھ منزل زمین کی سطح سے نیچے ہے اور اس میں زینوں کے ذریعے پہنچا جاتا ہے۔ کنہیا لال کے مشاہدہ کے مطابق جب یہ بنایا گیا ہو گا تو زمین سے اونچا کسی قدر کرسی دے کر بنایا گیا ہو گا۔ جس طرح اسی نوعیت کی عمارات تعمیر کی جاتی ہیں۔ اب چونکہ کئی ہزار برس گزر چکے ہیں باہر زمین اونچی ہو گئی ہے۔ سکھوں کے دور حکومت میں مندر کا گنبد زمین کی سطح کے برابر تھا لیکن راجہ دینا ناتھ نے پرانے گنبد کو مسمار کر کے اس کی جگہ ایک بہت بڑا اور بلند و بالا گنبد تعمیر کرا دیا جو اس وقت موجود ہے۔ مندر کی کھوئی ہوئی عظمت و شان و شوکت دوبارہ بحال ہو گئی۔ اس میں آثار قدیمہ کے ماہرین کے لیے انتہائی دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ اندرونی جانب کا کمرہ اندھیرا ہے۔ اس میں جانے کے لیے سیڑھی کے بیس زینوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اس میں دن رات چراغ جلائے جاتے ہیں۔ مندر کے دو دروازے ہیں۔ ایک مشرق کی طرف اور دوسرا جنوب میں ہے۔ ایک بہت بڑا صحن ہے۔ اس میں بڑ کا ایک نہایت قدیم اور دیو ہیکل درخت سایہ فگن ہے۔ ہتھ خانے کے قریب مندر کا ایک پرانا کنواں ہے۔ اس میں فالتو پانی بہا دیا جاتا ہے۔ انتہائی قدیم ہونے کی وجہ سے لوگ اس مندر کی بہت تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔

ٹھاکر دوارہ چور مور:۔ یہ مندر شہر کے علاقہ "دائی بھولی" میں واقع ہے۔ اس کی عمارت دو منزلہ ہے۔ اس کو پچاس سال پہلے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں کنہیا کمبوہ کی والدہ نے تعمیر کرایا تھا۔ اس نے اس کو عظیم مذہبی شہرت کے حامل باوا مہنت بلرام داس کو دے دیا۔ مہاراجہ خود بھی اس مندر میں حاضری دیا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ مہاراجہ کی مندر میں حاضری کے موقع پر مہنت ہر کشن داس نے اسے

چور مور کی کہانی سنائی تھی۔ مہاراجہ اس کہانی سے بہت خوش ہوا اور اس نے سادھ کو چور مور کا نام دے دیا۔ اسی کی نسبت سے مندر کو بھی اسی نام سے پکارا جانے لگا۔ مندر کو ایوانوں اور بغلی کمروں سے مزین کیا گیا ہے اور اس کو کثرت سے مصوری نقش و نگار اور آئینوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ رام چندر، لچھمن، سیتا اور رگناتھ کے بت پوجا کے لیے رکھے گئے ہیں۔ ہر شام کو کتھا پڑھی جاتی ہے اور اس میں مرد و زن کی بہت بڑی تعداد شریک ہوتی ہے۔

بھدر کالی :۔ یہ مندر، پھلہ لکھپت رائے محلہ میں واقع ہے۔ اس میں پتھر کی ایک ہاتھ چوڑی مربع شکل کی قربان گاہ ہے۔ اس کی پوجا کی جاتی ہے اور نذر نیاز اور چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں۔ ایک سالانہ میلہ بیک وقت موضع نیاز بیگ کے میلہ بھدر کالی کے ساتھ منعقد ہوتا ہے۔

ٹھاکر دوارہ جوالا دیوی :۔ یہ مندر " محلہ وچھو والی " میں واقع ہے اور اسے بارہ سال پیشتر مسمات جوالا دیوی نے تعمیر کرایا تھا۔ دیواریں اور طاقچے انتہائی خوبصورتی سے آراستہ کیے گئے ہیں اور اس کے بلند و بالا مینار پر سنہری کلس آویزاں ہے۔ اس میں قیمتی لباس میں ملبوس اور زیورات و ہیرے جواہرات سے آراستہ کرشن جی اور رادھاجی کی پتھر کی مورتیاں رکھی گئی ہیں۔

رام دوارہ :۔ یہ وچھو والی کا ایک اور بہت زیادہ مقبول عام مندر ہے۔ یہاں پر ہر روز رامائن کی کتھا، سری بھگوت اور دیگر مقدس کتابیں پڑھی جاتی اور دیوی، دیوتاؤں کی شان میں بھجن گائے جاتے ہیں۔ جب کوئی پجاری مندر میں آتا ہے تو مہنت، تلسی کے ہار کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرتا ہے اور اس پر اس وقت تک منتر وغیرہ پڑھتا رہتا ہے جب تک مندر میں ٹھہرتا ہے۔ مندر سے روانہ ہونے سے قبل وہ ہار کو ایک ڈھیر پر رکھ دیتا ہے جو اسی طرح کے بیشمار ہاروں سے وجود میں آیا ہوتا ہے۔ کھانے کی صورت میں خیرات پجاریوں اور اس مندر میں ٹھہرے ہوئے نادار لوگوں میں ہر روز تقسیم کی جاتی ہے۔

استھان بھیرن جی :۔ ہندوؤں کی یہ متبرک عبادت گاہ وچھو والی میں ہے۔ مندر ایک بلند چبوترے پر واقع ہے۔ سامنے والی دیوار میں دو طاقچے ہیں۔ ایک میں دن رات چراغ جلتا رہتا ہے اور دوسرے میں لکڑی کی بہت بڑی کھونٹی ہے جس پر پھولوں کے ہاروں کا ڈھیر لگ جاتا ہے۔ یہ استھان عورتوں اور مردوں میں یکساں مقبول ہے۔

مندر باوا مہر داس :۔ یہ بہت بڑا مندر محلہ وچھو والی میں ہے اور اسے تقریباً دو سو برس پہلے باوا مہرداس نے تعمیر کروایا تھا۔ یہ بتوں کا ایک بہت بڑا گودام ہے۔ یہاں پر کرشنا، بھگوان، رادھا مائی اور دیگر دیوتاؤں کے بت دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس کے قریب شوالاؤں کا جمگھٹا ہے۔ سکھ رام،

کھتری کپور کا شوالا سمت 1930ء میں تعمیر ہوا۔ اس سے آگے بھگتن کا اسی سال تعمیر کردہ شوالا آتا ہے۔ یہ ایک ہندوستانی عورت تھی۔ سکھوں کے دور میں اس کی دکان تھی جس میں وہ پان کے پتے فروخت کرتی تھی۔ اس مندر میں دیوتاؤں کو بیدار کرنے کے لیے چونکہ ایک ڈوری کے ساتھ چوراسی گھنٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ اس لیے اس مندر کو "چوراسی گھنٹی والی دیوی" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ آخر میں چیتو مہروترا کا مندر آتا ہے۔ جیسا کہ دروازے پر درج عبارت سے ظاہر ہے اس نے اس کو فروری 1875ء میں تعمیر کرایا تھا۔ جس دیوی نے اس مندر کو رونق بخشی ہوئی ہے۔ یہ اس جگہ کو کھودنے پر برآمد ہوئی تھی۔ دیوی کے اچانک ظہور پر لوگوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ دیوی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے وہاں آتے۔ آخر کار ایک عوام دوست اور پارسا شخص چیتو نے دیوی کا مندر تعمیر کرنے کا ارادہ کیا۔ وہاں لوگوں کی کثیر تعداد دیوی کی پوجا کرتی ہے۔

شوالا پنڈت رادھا کشن :۔ یہ دلکش شوالا گمٹی بازار میں واقع ہے۔ اس کا مینار بلند و بالا ہے اور اس کے بالائی حصہ پر تانبے کے پترے پر ملمع چڑھا ہوا ہے۔ مینار کی چوٹی پر کلس کی بجائے ہنومان کا ایک سنہری بت نصب ہے، جو ایک دلفریب نظارہ پیش کرتا ہے۔ شوالا کو 1818ء میں پنڈت رادھا کشن لمبداڑھیہ نے تعمیر کروایا تھا۔

مندر کالی دیوی :۔ کالی ماتا کا مندر گمٹی بازار میں واقع ہے۔ یہ چھوٹا سا لیکن بہت خوبصورت ہے۔ یہ پتھر کے ایک چبوترے پر ایستادہ ہے۔ اس پر کالے پتھر میں تراشیدہ کالی ماتا کا بت رکھا گیا ہے۔ وہ ایک انتہائی خوبصورت گنبد کے نیچے براجمان ہے۔ یہاں پر خوبصورتی سے آراستہ کی گئی دو چھتریاں رکھی گئی ہیں۔ چھوٹی چھتری بمعہ سنہری جھالر کے بت کے اوپر سایہ فگن ہے جبکہ بڑی والی جو اسی طرح آراستہ کی گئی ہے، گنبد کو ڈھانپے ہوئے ہے۔ یہ دونوں چھتریاں مندر کے دلکش نظارہ کی خوبصورتی کو چار چاند لگائے ہوئے ہیں۔ کالی ماتا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایسا تحفہ ہے جو لوگوں کو خوش کرتا ہے۔ اس کی پوجا ہر روز مرد و زن کی کثیر تعداد کرتی ہے۔ نوراترا کے دوران ایک میلہ نو دن تک یہاں منعقد رہتا ہے اور اس میں چڑھاووں اور نذر نیاز سے بہت زیادہ آمدنی حاصل ہوتی ہے۔ ہر ہندو جو اس کے قریب سے گزرتا ہے وہ اس بات کا پابند ہے کہ اپنے سر کو اس متبرک دیوی کے آگے جھکائے۔

ٹھاکر دوارہ رادھا کرشن :۔ یہ دلکش مندر مدسودن کے بیٹے پنڈت رادھا کرشن کی حویلی میں واقع ہے، جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کا خاندانی پنڈت تھا۔ یہ سید مٹھا بازار میں واقع ہے۔ اس کا

دروازہ پتھر کا ہے۔ اندرونی دیواریں اور چھتیں سونے اور چاندی کے نقش و نگار سے آراستہ ہیں۔ مینار بلند و بالا ہے۔ اس کے اوپر سنہری کلس آویزاں ہے۔ زیورات سے سجائے گئے شری کرشن اور رادھا مائی کے بت انتہائی آراستہ و پیراستہ طاقچوں میں رکھے گئے ہیں اور پجاری ان کی پوجا کرتے ہیں۔ اس مندر کو سمت 1890 بمطابق 1834ء تعمیر کیا گیا۔

چوبارہ چھجو بھگت :۔ یہ ڈھل محلہ میں واقع ہے۔ یہاں پر ایک قدیم کنویں سے وابستہ دو حوض ہیں جن کو مقدس خیال کیا جاتا ہے۔ چھوٹے حوض کا پانی لوگ پینے کے لیے اور منہ دھونے کے لیے استعمال کرتے ہیں تاکہ فیوض و برکات حاصل ہو سکیں۔ بڑے حوض کا پانی لوگ خیر و برکت حاصل کرنے کے لیے پیتے اور آنکھوں میں چھپکے مارتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس بڑے حوض سے چھجو بھگت نے گنگا کو بہا دیا تھا۔ ایک ضعیف عورت جو بھگت کی خدمت پر مامور تھی، اس نے بیساکھی کے تہوار کے موقع پر گنگا میں اشنان کرنے کے لیے رخصت چاہی۔ اس کے آقا نے اسے کہا کہ تمہیں اس معاملہ میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ گنگا خود تمہارے پاس آجائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور وہ واقعی آگئی۔ بوڑھی عورت نے اس میں اشنان کر کے دل کی مراد پائی۔ اسی دن سے اس حوض کی معجزانہ طاقت کے باعث اس کی پوجا کی جاتی ہے۔ چھجو اسی جگہ مقیم تھا۔ اس کی دکان جو شہر کے باہر تھی اس کی پوجا بھی کی جاتی ہے اور وہ "چھجو بھگت کا چوبارہ" کے نام سے مشہور ہے۔ شہر میں اس جگہ سے ملحقہ ایک بہت بڑا مندر اپنے کشادہ کمروں سمیت موجود ہے۔

سادھو چور کا کنواں و شوالا :۔ یہ شوالا بازار مچھی ہٹہ میں واقع ہے۔ کنواں بہت قدیم ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کو مسلمان بادشاہوں کے دور میں سادھو نام کے ایک بدنام زمانہ چور نے چوری کے مال سے تعمیر کرایا تھا۔ موجودہ شوالا سکھوں کے دور میں لوگوں سے چندہ اکٹھا کر کے تعمیر کیا گیا۔ یہ مندر ہندوؤں میں بڑا مقبول ہے۔

ٹھاکر دوارہ بھائی نند گوپال :۔ یہ جاذب نظر مذہبی عمارت جس کو 1891ء کے پہلے چوتھائی حصہ میں تعمیر کیا گیا۔ شاہ عالمی دروازہ کے باہر واقع ہے اور اپنے مالک کے نام سے بہت زیادہ مشہور و مقبول عام ہے۔ یہ ایک انتہائی کشادہ اڑھائی منزلہ عمارت ہے۔ اس کو مکمل طور پر اینٹوں اور چونا سے تعمیر کیا گیا ہے۔ بڑا دیوتا جس کی عبادت کے لیے یہ عمارت وقف ہے، وہ شری کرشن ہے لیکن دوسرے دیوتاؤں کی پرستش کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ بڑا مندر دوسری منزل پر واقع ہے۔ وہاں تک جانے کے لیے پتھر کی ایک کشادہ سیڑھی ہے۔ اس کا مینارہ 80 فٹ بلند ہے اور اس کو اینٹوں اور چونے سے تعمیر کیا گیا ہے لیکن اس کی پالکی سفید سنگ مرمر کی ہے۔ اس کے

بیالیس کمرے یکساں طور پر مذہبی عبادات کے لیے وقف ہیں۔ ان میں سے 18 کمرے بشمول ایک بڑے مرکزی ہال (17 فٹ x 62 فٹ) کے اور بالائی منزل کے نمایاں طور پر دکھائی دینے والے چار کمرے بڑے دیوتا کے مندر کے ساتھ منسلک ہیں۔

دوسری منزل کا ایک حصہ جو سات کمروں پر مشتمل ہے، گرنتھ صاحب اور گرنتھیوں کے لیے مخصوص ہے۔ جس کمرے میں گرنتھ صاحب کا پاٹ ہوتا ہے اس کی پیمائش (10 فٹ x 16 فٹ) ہے۔ شیوجی کا مندر پہلی منزل پر (38 فٹ x 73 فٹ) کے ایک کشادہ صحن میں واقع ہے اور اس میں آمنے سامنے بنے ہوئے دو دروازوں کے ذریعے پہنچ سکتے ہیں۔ اس صحن میں واقع 13 کمروں میں سے تین شیوجی کے مندر سے وابستہ ہیں جبکہ باقی ماندہ دس کمرے مسافروں کے استعمال کے لیے مخصوص ہیں۔ مندر کے سامنے ایک کنواں پجاریوں اور مسافروں کے استعمال کے لیے بنایا گیا ہے۔

جوبلی گھاٹ و جوبلی تالاب :۔ بڑی عمارت کے ساتھ وابستہ ایک جوبلی گھاٹ اور ایک جوبلی تالاب غسل کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ پہلا گھاٹ مردوں کے لیے اور دوسرا خواتین کے لیے ہے۔ جوبلی گھاٹ جو 128 فٹ طویل اور 16 فٹ چوڑا ہے، اس کو پتھر سے بنایا گیا ہے۔ اشنان کرنے والوں کے آرام کے لیے اس کے ساتھ دو کمرے منسلک ہیں۔ جوبلی تالاب جو خواتین کی کثیر تعداد کا مسکن بنتا ہے، اس کے ارد گرد دیوار بنائی گئی ہے اور اس میں حمام بنائے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ گرمیوں کے موسم میں اشنان کرنے والی خواتین کے آرام کے لیے تین بڑے کمرے بنائے گئے ہیں۔ اس کے عوام دوست بانی نے اس کے نیچے واقع سات عدد دو منزلہ مکانات اور پندرہ دکانوں کی آمدنی اس مندر کی دیکھ بھال کے لیے وقف کر دی ہے۔ آمدنی کا ایک حصہ پجاریوں اور نادار لوگوں کے کھانے پر صرف ہوتا ہے۔ اس کی اوسط آمدنی 120 روپے ماہانہ ہے۔

یہ عمارات ایک لاکھ روپے سے زائد لاگت میں تعمیر کی گئیں۔ اس میں سے 15،000 روپے جوبلی گھاٹ اور جوبلی تالاب پر خرچ ہوئے۔

سمادھوں کا بیان

سمادھ راجہ تیجا سنگھ :۔ یہ سمادھ بیرون مستی دروازہ جمعدار خوشحال سنگھ کے باغ میں واقع ہے۔ یہ عمارت جو مثمن شکل کی ہے اس کو مکمل طور پر سنگ مرمر سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کے اوپر سنگ مرمری کا ایک بلند و بالا گنبد موجود ہے۔ راجہ تیجا سنگھ 1863ء میں فوت ہوا اور یہ

خوبصورت عمارت اس کی یادگار کے طور پر ایک انتہائی قابل شخص رائے مول سنگھ کی نگرانی میں تعمیر ہوئی۔

سمادھ رام سنگھ :۔ رام سنگھ خلف جمعدار خوشحال سنگھ انتہائی قابل نوجوان تھا۔ وہ عربی اور فارسی میں یکتائے روزگار تھا۔ وہ اپنے والد کی زندگی ہی میں فوت ہو گیا تھا اور اس کی یادگار کے طور پر یہ سمادھ اس کے مہربان باپ نے 1839ء میں تعمیر کروائی تھی۔ یہ سمادھ ہر لحاظ سے مکمل ہے اور نہایت کشادہ کمرے اس کے ساتھ ملحق ہیں۔ اس کا فرش سنگ مرمر کا ہے جس میں سرخ اور کالے پتھر سے گل بوٹے بنائے گئے ہیں۔ گنبد شاہانہ ہے اور اس پر ایک سنہری کلس آویزاں ہے۔ دیواروں اور طاقچوں کو آراستہ کیا گیا ہے۔ مندر کو سمادھ سے ملا دیا گیا ہے۔ اس میں شیوجی کی پوجا ہوتی ہے۔

سمادھ جمعدار خوشحال سنگھ :۔ یہ رام سنگھ کی سمادھ کے جنوب میں واقع ہے۔ خوشحال سنگھ کا انتقال 1844ء میں ہوا۔ اس کی نعش اس جگہ جلائی گئی تھی جہاں اب سمادھ موجود ہے۔ وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا حاجب (عدالتی افسر) تھا۔

سمادھ راجہ سوچیت سنگھ و اودھم سنگھ :۔ یہ دونوں سمادھیں ایک ہی احاطہ میں پریڈ گراؤنڈ کے قریب واقع ہیں۔ راجہ سوچیت سنگھ میاں وڈا کے مقبرہ میں اپنے بھتیجے راجہ ہیرا سنگھ کی سرکردگی میں آنے والی فوجوں کے خلاف دو بدو لڑتا ہوا مارا گیا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کا بڑا بھائی اودھم سنگھ، شہزادہ نونہال کے ہمراہ حضوری باغ کے دروازہ میں سے گزرتے ہوئے پختہ اینٹوں سے بنے ایک دروازے کا حصہ گر جانے کے باعث حادثاتی طور پر ہلاک ہو گیا۔ نونہال سنگھ بھی اسی حادثے میں ہلاک ہوا تھا۔

سمادھ سردار جواہر سنگھ :۔ جواہر سنگھ، سازشی عورت اور دلیپ سنگھ (جو بعد میں پنجاب کا مہاراجہ بنا) کی والدہ رانی جنداں کا منہ بولا بھائی تھا۔ اس کو غضب ناک سکھ فوجوں نے 1844ء کے اختتام پر قتل کیا۔ اس کو اپنے بھائی کی موت کا بے انتہا صدمہ ہوا۔ سمتھ اپنی تصنیف "لاہور کے حکمران خاندان کی تاریخ" میں بیان کرتا ہے: اس نے خود کو اور اپنے ننھے بیٹے کو لاش پر گرا دیا۔ وہ زار و قطار روئی اور اپنے بال نوچ ڈالے۔ اس نے مستی دروازہ کے باہر اس کا مقبرہ تعمیر کرایا۔ رانی جب تک لاہور میں مقیم رہی بھائی کے لیے اس کا ماتم کسی دن بھی نہیں رکا۔ اسی مصنف کے مطابق وہ ہر روز اپنی کنیزوں کے ہمراہ اپنے مردہ بھائی کی سمادھ پر ماتم کرنے کے لیے پیدل جایا کرتی تھی۔ ہر روز وہ اپنے لمبے بال بکھرائے شہر میں لوگوں کو اپنا آپ دکھاتے ہوئے چلتی کہ وہ جواہر سنگھ کے

مقبرے پر جاری ہے۔

سمادھ بھائی وستی رام :۔ یہ سمادھ قلعہ کی شمالی دیوار کے قریب واقع ہے۔ بھائی وستی رام، مہاراجہ رنجیت سنگھ کا روحانی پیشوا تھا۔ یہ سمادھ فن تعمیر کا ایک انتہائی خوبصورت و یادگار نمونہ ہے۔ اس سے ملحقہ بیشمار ایوان اور کمرے بالکل صحیح اور عمدہ حالت میں ہیں۔

سمادھ حقیقت رائے :۔ یہ لاہور سے دو میل کے فاصلے پر مشرقی جانب موضع کوٹ خواجہ سعید کے مشرق میں واقع ہے۔ حقیقت رائے سترہ سال کی عمر کا ایک ہندو لڑکا تھا۔ وہ حاکم لاہور نواب خان بہادر کے دور میں ایک مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ اس کا مسلمان لڑکوں سے جھگڑا ہو گیا اور اس نے ان لڑکوں کی طرف سے دیوتاؤں کے لیے ناشائستہ زبان استعمال کرنے کے رد عمل کے طور پر جواباً اسی قسم کے کلمات کہہ ڈالے۔ اس کو قاضی کے پاس لے جایا گیا۔ اس نے پیغمبر کے خلاف ناشائستہ زبان استعمال کرنے پر اس کو سزائے موت سنا دی۔ یہ معاملہ حاکم لاہور کے سامنے پیش ہوا تاہم اس نے قاضی کے فیصلے کی توثیق کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اگر یہ لڑکا اسلام قبول کر لے تو اس کی سزا معاف ہو سکتی ہے۔ حقیقت رائے اپنے آباؤ اجداد کے مذہب پر خلوص دل سے کاربند تھا۔ اس نے دین اسلام کی دعوت کو رد کر دیا اور پھانسی چڑھ گیا۔ ہندو اس کے مقبرے کی بہت زیادہ تعظیم کرتے ہیں اور کثیر تعداد میں جا کر اس کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ اس سمادھ پر بسنت یا بہار کا سالانہ میلہ منعقد ہوتا ہے۔

سمادھ مہاراجہ شیر سنگھ :۔ یہ سمادھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی تعمیر کردہ بارہ دری شاہ بلاول کے مغرب میں واقع ہے۔ (114)، اس سے کسی قسم کی تعمیراتی تصنع یا بناوٹ کا اظہار نہیں ہوتا۔ یہ پختہ اینٹوں کی ایک سادہ سی سمادھ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سندھیانوالیہ سرداروں کے ہاتھوں شیر سنگھ کے قتل کے بعد اس وقت باقاعدہ طور پر کوئی حکومت موجود نہیں تھی اور جو لوگ عظیم مہاراجہ کے مشہور و معروف بیٹے کے شایان شان اس کی یادگار تعمیر کرنے میں دلچسپی لیتے تھے، ان کو اپنے ارد گرد پھیلی سازشوں سے فرصت نہیں مل رہی تھی۔ لہٰذا وہ عمارات کی تعمیر کے بارے میں سوچ نہیں سکتے تھے۔ یہ جگہ اس لیے بھی تاریخی لحاظ سے دلچسپی کی حامل ہے کہ یہ جگہ المیہ کا مقام ہونے کے باعث کچھ لوگوں کی وجہ سے ایشیائی تاریخ کے اوراق میں سب سے سبقت لے گئی ہے اور اس کے بعد آنے والی خونریزیوں، سازشوں اور ہنگامہ آرائیوں نے پنجاب میں رنجیت سنگھ کی سوجھ بوجھ کے تحت قائم کردہ طاقتور حکومت کو اتنی تیزی سے ختم کیا کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ شیر سنگھ کی سمادھ کے گنبد کی غربی جانب اس کی بیوی رندھاوی کی سمادھ ہے۔ اس سمادھ کے دروازے پر

مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

سمادھ رانی صاحبہ رندھاوی دھرم کور مہاراجہ شیر سنگھ صاحب بہادر کی سرگباش هوی درماہ 14 مگھر سمت 1927 یوم یکشنبہ

ترجمہ :۔ سمادھ رانی صاحبہ رندھاوی دھرم کور زوجہ مہاراجہ شیر سنگھ ، یوم وفات اتوار 14 ماگھ سمت 1927ء ۔

شیر سنگھ کے گنبد کے مشرق میں اس کی بیوی رانی پرتاپ کور کی سمادھ ہے۔ اس سمادھ کے دروازے پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

رانی پرتاپ کور والدہ سردار ٹھاکر سنگھ زوجہ مہاراجہ شیر سنگھ بہادر سرگباشی د،ہم ماہ بادرو سمت 1914

ترجمہ :۔ رانی پرتاپ کور والدہ سردار ٹھاکر سنگھ زوجہ مہاراجہ شیر سنگھ بہادر ماہ بادرد کی 10 تاریخ سمت 1914 ۔

لاہور کے قدیم باغات

اسلامی دور

شالامار باغ:۔ مغلیہ دور کے باغات میں سے صرف چند ہی زمانے کی دست برد سے محفوظ رہے۔ ان مشہور باغات میں سے جو ابھی تک اپنی سابقہ شان و شوکت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں، ایک شاہجہاں کا باغ بھی ہے، جسے شالامار (115) کہا جاتا ہے۔ یہ شہر سے تین میل کے فاصلے پر امرتسر کی سڑک پر واقع ہے۔ اسی کتاب میں تعمیراتی نکتہ نگاہ سے اس پر بحث ہو چکی ہے۔ یہ امر انتہائی دلچسپ ہو گا کہ اگر جب سے ان باغات کو تعمیر کرایا گیا تھا اس وقت سے لے کر اب تک ان میں کی جانے والی بڑی بڑی تبدیلیوں کے بارے میں ضروری بیان یہاں درج کر دیا جائے۔

باغ کے نمایاں حصے:۔ باغ کی غیر معمولی خصوصیات جو اس کے نمایاں اور اہم حصوں میں پائی جاتی ہیں ان میں شاہجہاں کے دور کے فن تعمیر کے عروج کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔ پہلی تو یہ ہے کہ باغ کے مختلف چھجوں میں ان کی متفرق بلندیوں کے باوجود نہر کے پانی کی سطح کو باقاعدہ بنایا گیا ہے۔ دوسری یہ کہ باغات کی بیرونی جانب سے دکھائی دینے والی سطح میں حیران کن یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی چار دیواری میں ایک ہی سطح زمین پر موجود ہیں حالانکہ اندرونی جانب وہ تین چھجوں میں منقسم ہیں۔ ہر چھجا دوسرے کے مقابلہ میں دو آدمیوں کی بلندی پر واقع ہے۔

پہلے نقطہ نظر کے حوالے سے یہ چیز قابل غور ہے کہ اس کی سطح پورے باغ میں ایک جیسی ہے اور جس وقت پانی بالائی چھجے کے پہلے حوض میں پڑتا ہے تو وہ اسی چھجے کے آخری حوض تک پہنچتا ہے تو اس کے فوارے بیک وقت دوسرے فواروں کے ساتھ چلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہی خصوصیت دوسرے اور تیسرے چھجے کے فواروں میں بھی پائی جاتی ہے حالانکہ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ دوسرا چھجا تیسرے کے برابر بلندی پر واقع ہے۔

دوسرا نقطہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے:۔ کہا جاتا ہے کہ جہاں اس وقت باغات موجود ہیں یہاں پرانے وقتوں میں دریائے راوی بہتا تھا۔ جب محمود نے لاہور پر حملہ کیا تو باغات اور اس کے گرد و نواح کی جگہ دریا کی ہتھ کی صورت میں موجود تھی۔ باغ کی جگہ کا بالائی حصہ ماںجھا (یا بلند) زمین اور نچلا بیلہ (یا دریا کی ہتھ) پر مشتمل تھا کیونکہ یہ زمین زرخیز تھی اور اس کے چاروں طرف دلکش مناظر تھے۔ اس لیے شاہجہاں نے اس علاقہ میں شاہی باغات لگانے کا فیصلہ کر لیا۔

سیاح کو اس بات کا مشاہدہ ہو گا کہ تیسرے چھجے کے درمیان والے حوض میں شمال سے جنوب تک فواروں کی تین قطاریں ہیں جبکہ پہلے چھجے میں اسی جانب درمیان والے حوض میں صرف ایک قطار ہے۔ دوسرے چھجے کے بڑے تالاب اور تیسرے چھجے کے باقی ماندہ چار حوضوں کو بھرنے کے لیے پانی کا ایک طاقتور دھارا درکار ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے کہ پانی انتہائی زور شور کے ساتھ دوسرے اور تیسرے چھجے تک جائے، بالائی منزل پر دو بہت بڑے کنویں تعمیر کیے گئے (جن کو باراں ہتھہ) کہا جاتا تھا۔ ایک مغرب کی طرف اور دوسرا مشرق کی طرف بنایا گیا۔ مشرقی جانب والا کنواں اس وقت کام کر رہا ہے اور مشرقی جانب والا مسمار ہو چکا ہے۔ غربی جانب کے کنویں کا پانی لے جانے کے لیے اسی سمت باغ کی بالائی دیوار کے اوپر ایک محرابی نالہ تعمیر کیا گیا، جو اس کے پانی کو دوسرے اور تیسرے چھجے تک پہنچاتا تھا۔ نیز اسی طرح کا بندوبست مشرقی کنویں کے پانی کو ان چھجوں تک لے جانے کے لیے کیا گیا تھا۔ یہ محرابی نالے آج بھی باغ کی غربی اور مشرقی دیواروں پر موجود ہیں۔

جب سے ان باغات کو تعمیر کیا گیا تھا ان میں کی جانے والی بڑی تبدیلیوں میں قابل غور بات یہ ہے کہ پہلے چھجے کے شمالی کونہ میں دوسرے چھجے کی سنگ مرمر کی آبشار اور بڑے تالاب کے اوپر سے دکھائی دینے والی بارہ دری دراصل خالص سنگ مرمر کی عمارت تھی، اس کو اندرونی اور بیرونی جانب سر سے پاؤں تک اسی پتھر سے تعمیر کیا گیا تھا لیکن مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس کا پتھر اتروا کر امرتسر میں سکھوں کے گردوارہ کو آراستہ کرنے کے لیے بھیج دیا۔

درمیانے چھجے میں بڑے تالاب کے مغرب اور مشرق میں واقع بارہ دریاں بھی سنگ مرمر سے بنائی گئی تھیں۔ ان کے پتھر کو لاہور کے ثلاثہ (تین) حاکموں نے اتروا لیا اور رنجیت سنگھ کے برسراقتدار آنے سے پہلے فروخت کر دیا۔

اس عمارت کی تین بغلی دیواروں میں موجود طاقچے ساون بھادوں (116) کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ تیسرے چھجے کی انتہائی جنوب کی طرف واقع تھے۔ ان کو سنگ مرمر سے تعمیر کیا گیا تھا لیکن سکھ حکومت کے قیام کے وقت پیدا ہونے والی طوائف الملوکی کے دوران اس پتھر کو سکھ لے گئے۔ تاہم جنوب کی طرف واقع سنگ مرمر کے طاقچے ابھی تک موجود ہیں۔

شاہجہاں کی خوابگاہ فیض بخش باغ کے مغرب میں پہلے چھجے میں واقع ہے۔ اس خواب گاہ میں سبز سنگ سلیمانی کا ایک حوض تھا لیکن اس کو لاہور کے تین حاکموں نے اکھاڑ لیا اور اس کے پتھر کو لاہور کے بازاروں میں فروخت کر دیا۔ انہی تین حاکموں نے فواروں کا تانبا بھی اکھاڑ لیا اور کئی من

کے حساب سے شہر کے کسیرا بازاروں میں فروخت کر ڈالا۔

بارہ ہتھہ ایک بہت بڑا کنواں خواب گاہ کے مغرب میں باغ کی دیوار کے باہر واقع ہے۔ اس کو اس نام سے اس لیے پکارا جاتا ہے کہ اس میں بارہ رہٹ کام کر سکتے ہیں۔ یہ کنواں انتہائی غیر معمولی ہے اور اپنی اتنی بڑی جسامت کی وجہ سے اس کی مماثلت کنویں کی بجائے تالاب سے زیادہ ملتی ہے۔ اس کا قطر 200 فٹ سے زیادہ ہے اور گہرائی بہت زیادہ ہے۔ بادشاہوں کے دور میں پانی کی سطح سے کافی نیچے لوہے کا ایک جنگلا لگا دیا گیا تاکہ وہ ٹینڈوں کو (جن کے ذریعے پانی کھینچا جاتا تھا) پانی سے بھر کر باہر لا سکے۔ دوسری اشیاء کے بارے میں خیال یہی ہے کہ وہ کنویں میں گر چکی ہیں۔ یہ جنگلا (پہیہ) جو یقیناً بہت بڑا تھا اب موجود نہیں ہے لیکن وہ آہنی کنڈے جن کے ساتھ اس کو باندھا گیا تھا، انہیں اب بھی پانی کی سطح سے کچھ نیچے کنویں میں چاروں طرف لگے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔

باغ کے اصل دروازے تیسرے چھجے کے مغرب اور مشرق میں واقع تھے لیکن ان میں سے مغرب کی طرف والا دروازہ آج کل استعمال میں ہے جبکہ مشرقی جانب کے دروازے کو اینٹوں کی دیوار سے بند کر دیا گیا ہے۔ پہلے چھجے کے جنوب کی طرف واقع دروازے کو جو امرتسر کی طرف جانے والی جی ٹی روڈ پر ہے اس کو برطانوی دور حکومت کے آغاز میں ڈپٹی کمشنر میجر میکریگر صاحب نے کھلوایا تھا۔ یہ دراصل شاہی حرم کی بیگمات کی خوابگاہ تھا۔ اس خواب گاہ کے جنوب میں اس کے پار امرتسر جانے والی سڑک کے کنارے پر شاہی بیگمات کے شاندار محل موجود تھے۔ اس علاقے کو خواص پورہ کہا جاتا تھا۔ خواص پورہ سے فرح بخش باغ کے راستہ پر دو دروازے تھے۔ ایک مغرب کی طرف اور دوسرا مشرق کی طرف۔ خواص پورہ کی بنیادیں وسیع و عریض تھیں اور وہ بعد میں کافی دیر تک قائم رہیں لیکن ڈپٹی کمشنر لاہور کرنل نسبٹ کے دور میں ان کو کھود ڈالا گیا اور اس کی اینٹیں فروخت کر دی گئیں۔

فرح بخش، شاہی بیگمات کے لیے مخصوص تھا۔ وہ اسے تفریح گاہ کے طور پر استعمال کرتی تھیں۔ اس کے اور دوسرے چھجے کے درمیان سنگ مرمر کی جالی لگائی گئی تھی جس کی بلندی ایک آدمی جتنی تھی۔ یہ دیوار پردے کا کام دیتی تھی۔ سنگ مرمر کی جالی کی یہ دیوار انتہائی خوبصورت تھی اور اس کے آثار پہلے چھجے کے انتہائی شمال میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ وہاں اب صرف سنگ سرخ کا ایک جنگلا موجود رہ گیا ہے۔ اس دیوار کو پار کرنے کی سزا موت تھی۔ اس کے راستے پر آرمینیائی اور تاتاری سپاہیوں کا پہرہ ہوتا تھا۔ اس میں صرف خواجہ سرا اور خواتین جا سکتی تھیں۔ حرم کے بارے میں

مینوچی کے بیان کے مطابق ہر خاتون کے پاس اس کی اپنی کنیزوں کا ٹولہ ہوتا تھا جو گاتی بجاتیں اور رقص کرتی تھیں۔

بادشاہ عام دربار دوسرے اور تیسرے چھجے میں منعقد کرتا تھا جبکہ اس حصہ میں امراء شہزادے اور شاہی خاندان کے دیگر افراد جمع ہو کر بادشاہ کو خراج عقیدت پیش کرتے اور دن کی تقریبات میں حصہ لیتے تھے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اس باغ کو لالچی حملہ آوروں، سکھ باغیوں (ڈاکوؤں) اور حتیٰ کہ سکھ حکمرانوں کے ہاتھوں سخت نقصان پہنچا۔ یہ رنجیت سنگھ کے دور حکومت کے آغاز میں اس قدر شکستہ حال ہو گیا کہ حوض مٹی سے بھر گئے اور پوری زمین پر ہل چلا دیا گیا اور اس جگہ فصل بو دی گئی۔ اگرچہ مہاراجہ نے اس کو سنگ مرمر اور دیگر قیمتی پتھر سے محروم کر دیا تھا لیکن اس نے باغ کو از سر نو آباد کیا۔

مہاراجہ شیر سنگھ نے شاہی حماموں کی مکمل طور پر مرمت کرائی اور انہیں استعمال کے قابل بنایا

انگوری باغ:۔ شالا مار باغ کے حسن و جمال اور شان و شوکت کے بارے میں جو خیال ذہن میں آتا ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ نہایت پر تکلف اور خوبصورت باغات کے درمیان واقع تھا اور یہ درباری امراء کی ملکیت تھے۔ لہذا امرتسر کی سڑک جی ٹی روڈ کے پار جنوب کی طرف عنایت باغ تھا اور اس سے مزید جنوب کی طرف انگوری باغ موجود تھا۔ ان باغات کے آثار ابھی تک موجود ہیں۔

مہتابی باغ:۔ شمال کی طرف مہتابی باغ تھا۔ اس کو حکومت کی طرف سے نیلامی کے ذریعے فروخت کر دیا گیا اور یہ باغبانپورہ کے میاں خاندان کے میاں چنن دین کی ملکیت بن گیا ہے۔ اس باغ کی ایک بارہ دری اور ایک تالاب ابھی تک موجود ہے اور پانی کے فواروں اور روشوں کے آثار ابھی تک دکھائی دیتے ہیں۔

گلابی باغ:۔ مغرب کی طرف شاہجہاں کے داماد کے چچا زاد بھائی سلطان بیگ کی ملکیت گلابی باغ تھا۔ اس کا دروازہ ابھی تک شالا مار روڈ (117)، پر موجود ہے۔

باغ دارا:۔ باغ کے مشرق میں شہزادہ دارا شکوہ کا باغ تھا جسے "باغ دارا" کہا جاتا تھا۔ اس کو ایک بارہ دری، ایک تالاب اور پانی کے فواروں سے مزین کیا گیا تھا لیکن اب ان کے نشانات تک مٹ گئے ہیں۔ مہاراجہ شیر سنگھ نے اس باغ کو اپنے ایک درباری سردار دیال سنگھ مجیٹھیا کے حوالے کر دیا۔ اس کے بیٹے سردار دیال سنگھ نے اس کی عمارت کو گرا دیا اور اس کی اینٹیں فروخت کر ڈالیں۔

اس باغ کے دس ایکڑ رقبہ پر محیط زمین پر باغبانپورہ کے میاں خاندان کے ایک فرد اور چیف کورٹ پنجاب کے وکیل مولوی ظہور الدین کا قبضہ ہے۔

باغ دلآمیز یا دلکشا :۔ مغلیہ دور کے دیگر باغات میں خیال ہے کہ دریائے راوی کے پار نور جہاں کے اس باغ کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو جہانگیر کے دور حکومت میں باغ دلآمیز یا دلکشا کے نام سے تعمیر کیا گیا۔ اسی میں شہنشاہ کا مقبرہ بھی موجود ہے۔ دریائے راوی کے کنارے مرزا کامران کا باغ اب شکستہ حالت میں ہے۔ اس میں سے صرف ایک بارہ دری جو طور گاہ کے نام سے مشہور ہے، باقی بچی ہے۔

دیگر باغات ۔ نولکھا کے نام سے مشہور علی مردان خاں کا باغ اور مہابت خاں کے باغات، شالا مار باغ کے جنوب میں واقع تھے۔ مغلیہ دور کے بیشمار باغات میں سے بہت سے باغوں کا ذکر اس کتاب کے باب اول میں کیا گیا ہے، ان کا کوئی نشان باقی نہیں ہے۔

سکھ دور

آہلو والیہ باغ :۔ سکھوں کے دور حکومت میں لاہور کا گرد و نواح باغات کی شادابی و تر و تازگی کے لیے بہت مشہور تھا لیکن ان میں سے صرف چند باغات باقی بچے ہیں اور ان کے موجودہ مالکان ان کی مناسب دیکھ بھال کرتے ہیں۔ نولکھا کے قریب واقع آہلو والیہ باغ کی عمارت 1875ء کی زبردست بارشوں کے باعث تباہ ہو گئی اور باغ جس کو علی مردان خاں کے باغ نولکھا کا حصہ سمجھا جاتا تھا، اب بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ملحقہ زمین زیر کاشت ہے اور پھلوں کے چند درخت اب باقی بچے ہیں۔

باغ جمعدار خوشحال سنگھ :۔ جمعدار خوشحال سنگھ کا باغ انتہائی اچھی حالت میں ہے۔ اس کے بیٹے رام سنگھ کی سمادھ اسی باغ میں واقع ہے۔

باغ راجہ تیجا سنگھ :۔ راجہ تیجا سنگھ کا باغ موضع کھوئی میراں میں واقع ہے جو لاہور سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ ایک شاندار باغ ہے۔ اس میں ایک بارہ دری، پھلوں کے بیشمار درخت اور ایک نہر ہے۔ راجہ ہربنس سنگھ نے اس کی خوب دیکھ بھال کی۔

باغ راجہ دینا ناتھ :۔ راجہ دینا ناتھ کا باغ جو پرانا شالا مار روڈ پر گھوڑے شاہ کے مزار کے قریب واقع تھا یہ اپنی خوبصورتی، شادابی اور شان و شوکت کے لحاظ سے فقید المثال تھا۔ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے باغات میں جمع ہونے کی قدیم جگہ اور اپنے دوستوں کی معیت میں خوشیاں

منانے کے لیے لوگوں کے ہر طبقہ کی مقبول جگہ تھی۔ اس کو پانی کے حوضوں، تالابوں، شاندار بارہ دریوں اور مسافروں کے قیام کے لیے عمارتوں سے مزین کیا گیا تھا۔ تاہم اس کے موجودہ مالک کی لاپرواہی کے باعث لوگ اب اس جگہ اکٹھے نہیں ہوتے۔

باغ دیوان رتن چند :۔ شاہ عالمی دروازے کے باہر دیوان رتن چند کا باغ انتہائی دلچسپ مقام ہے۔ اس کو دلکش عمارات، شاندار حوضوں، پانی کے فواروں اور پرتکلف روشوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ وہاں پرپھلوں کے بیشمار درخت ہیں اور یہ باغ انتہائی اچھی حالت میں ہے۔ اس باغ کو اتنی بہتر حالت میں رکھنے کا سہرا آنجہانی دیوان کے بیٹے لالہ بھگوان داس کے سر ہے۔

باغ مہا سنگھ :۔ شہر کے باہر بھائی مہا سنگھ کا باغ سکھوں کے دور میں اپنی قسم کا ایک انتہائی پرتکلف باغ تھا۔ لوگ اس میں سیر کر کے بہت خوشی حاصل کرتے تھے اور اس کے بانی کا شکریہ ادا کرتے۔ وہ ہر آنے والے کو کمال مہربانی سے خوش آمدید کہتا۔ اس کو پانی کے فواروں سے آراستہ کیا گیا تھا جو بھرپور انداز میں چلتے تھے اور باغ کی روشوں کا سرسبز و شاداب درختوں کے ساتھ امتزاج اس کو انتہائی دلکش جگہ بنا دیتا تھا۔ مہا سنگھ کے جانشین سوایا سنگھ نے اس باغ کو عیسائی مشنریوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ انہوں نے اس کو ٹھیک کرایا اور اس میں ایک کالج قائم کیا (118)۔

بادامی باغ :۔ بادامی باغ قلعہ کے شمال میں انگریزوں کے دور کے آغاز میں سٹیشن کا ایک قدیم سرکاری باغ تھا۔ انگریز مرد اور عورتیں سہ پہر کے وقت تفریح و سیر وغیرہ کے لیے اس میں جمع ہوتے تھے۔ اس جگہ بینڈ بجایا جاتا اور دیگر تفریحی پروگرام منعقد ہوتے تھے۔ یہ باغ قدیم اخبار " لاہور کرونیکل " کے مدیر مسٹر ہنری کوپ کے زیر انتظام تھا۔ بعد کے ادوار میں یہ باغ اپنی اہمیت کھو بیٹھا اور پرانے مال پر موجود سرکاری باغات تفریح گاہ بن گئے۔ ان پر ایک مرتبہ پھر لارنس گارڈن سبقت لے گیا جو ایک سرکاری تفریح گاہ ہے۔

شہزادی گل بادام :۔ بادامی باغ کو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بنوایا تھا۔ یہ جگہ ایک مسلمان شہزادی گل بادام کے نام سے مشہور ہے جس کا مقبرہ مستی دروازہ اور شیرانوالہ دروازہ کے درمیان واقع ہے۔ بادامی باغ اب پشاور جانے والی ریلوے لائن کا پہلا سٹیشن ہے۔ اب اس باغ کے کوئی آثار باقی نہیں بچے۔

-----O-----

حوالہ جات

1۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس دروازے کو روشنائی فرقے کے لوگ جو اکبر کے دور میں افغانی نام بایزید کے مشہور تھے، منسوب کیا گیا ہے۔ لیکن باوثوق ذرائع سے پتہ چلتا ہے کہ روشنائیوں کا تعلق کوہ سلیمان اور سلسلہ خیبر کے پہاڑوں سے تھا اور انہوں نے ان پہاڑوں میں اپنا کوئی تاثر قائم نہیں کیا۔ بحوالہ ایلفن سٹون کا ہندوستان، صفحہ 253 ، جلد 2 ، اس مفروضے کا سراغ نہیں مل سکا۔

2۔ چند سال میں افریقہ اور ایشیا کے مختلف علاقوں میں کیے گئے سفر کے بارے میں بیان کیا گیا ہے اور خاص طور پر ہندوستان اور ایران کی سلطنتوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ از سینٹ ٹامس ہربرٹ بارٹ، لندن 1677ء ، صفحہ 69

3۔ آئین اکبری صفحہ 152 ، جلد دوم۔

4۔ آئین اکبری، صفحہ 168 ، جلد اول

5۔ اکبر نامہ، صفحہ 95

6۔ یہ دراصل لاہور کے بازاروں میں عام فروخت ہونے والا "کلچہ" کا بگڑا ہوا نام ہے۔

7۔ یہ لفظ روغنی ہے۔ اس کا مطلب ہے، مکھن والا یا چکناہٹ والا۔

8۔ یہ نام بازار دلکشا کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اس نام کی کوئی گلی شہر یا گرد و نواح میں موجود نہیں ہے۔

9۔ یہ چیز ٹیورنیئر کے لیے بڑی دلکش تھی۔ وہ اپنے سفر کے دوران اس کو اپنے ساتھ لایا اور اپنے دوستوں کی اس سے تواضع کر کے بڑی خوشی حاصل کرتا تھا۔ اس نے اپنی کتاب میں جابجا اس کا ذکر کیا ہے۔ ہندوستان کی سیاحت از جے بی ٹیورنیئر بیرن آف آبون فرانسیسی سے ترجمہ از وی۔ بال، لندن۔

10۔ فرانسس برنیئر کی کتاب "مغلیہ سلطنت کے سفر" فرانسیسی سے ترجمہ اروک بروک صفحہ 121 ، جلد دوئم، لندن 1826ء

11۔ "مونیسئر ڈی تھیونیاٹ کا سفرنامہ"، لندن، 1687ء

12۔ ایرسکائن کی "تاریخ بابر و ہمایوں"، صفحہ 398 ، جلد اول

13۔ اس مقبرہ کی تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیئے، باب دوئم۔

14۔ جمعدار خوشحال سنگھ کے ایک خدمت گار، ہمت نے رنجیت سنگھ کے زمانہ میں یہاں ایک باغ لگوایا تھا۔ ہمت کے پوتے حاکم نے ایک عظیم ٹھیکیدار محمد سلطان کے ہاتھ یہ باغ فروخت کر دیا جس نے لاہور کے ڈپٹی کمشنر اور بعد میں کمشنر کرنل ہال کی کوٹھی تعمیر کی تھی۔

1۔ اس مسجد کے بیان کے بارے میں دیکھیے، باب دوئم۔

1۔ اس امیر کے بارے میں جاننے کے لیے دیکھیے، باب اول۔

1۔ پنجابی زبان میں سر کا مطلب تالاب ہے۔ لہذا سید سر کا مطلب سید کا تالاب ہے۔

1۔ اصل میں سلطان کی سرائے اب کابل اور افغانستان کے پٹھانوں کے لیے گھوڑوں کی منڈی بن چکی ہے جو وہاں سے گھوڑے لاکر فروخت کرتے ہیں۔

1۔ مسٹر تھارنٹن کا خیال ہے کہ (بحوالہ ان کی کتاب صفحہ نمبر141) کہ یہ جگہ عید گاہ کے طور پر ہی تعمیر کی گئی تھی۔ ایسا نہیں ہے۔ عید گاہ مسجد کے طور پر تعمیر نہیں کی جاتی کیونکہ اس نوعیت کی دہلی، آگرہ اور ہندوستان کے دیگر علاقوں میں تعمیر شدہ عمارتوں سے بھی اس بات کی شہادت ملتی ہے۔ شہر کے آباد علاقوں میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا اور شہر سے بہت زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے یہ عمارت بعد کے ادوار میں عید گاہ کے طور پر استعمال ہونے لگی۔

2۔ ولیم مور کرافٹ کی کتاب "ہندوستان کے ہمالیائی صوبوں اور پنجاب، لداخ، کشمیر، پشاور، کابل اور بخارہ کے سفر"، صفحہ 105 ، جلد اول۔

-۔ "بخارہ وغیرہ کی سیاحت" از لفٹیننٹ الیگزینڈر برنز، صفحہ 59 - 158 ، جلد 3۔

2۔ یہاں واضح طور پر اکبر ہی مراد ہے۔

2۔ "ہندوستان میں پانچ سال کی سیاحت" از ہنری ایڈورڈ فین صفحہ 185 ، جلد اول۔

2۔ "بلوچستان، افغانستان اور پنجاب کے مختلف سفروں کا بیان" از چارلس میسن، صفحہ، 408-412 جلد اول۔

2۔ ہندوستان کے سفر بشمول سندھ اور پنجاب از کیپٹن لیوپولڈ وان اورلچ، صفحہ 211 ، جلد اول

2۔ "بابر کی سرگزشت" از ایرسکائن صفحات 333 - 315 ، لندن 1826ء ۔

2۔ لہٰذا اب ہمارا ملک اس بات پر فخر محسوس کرتا ہے کہ اب ہم اس سلسلہ میں خوش قسمت

ہیں کہ ہمیں برطانوی تہذیب سے گھوڑوں کی اچھی نسل، اچھا گوشت، اچھے پھل، برفیلا اور ٹھنڈا پانی (چاہے مصنوعی ہی سہی) مدرسے اور موم بتیاں وغیرہ عطیہ کے طور پر مل گئی ہیں۔ تاہم ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ بابر نے ہمارے ملک کے باشندوں کے بارے میں آج سے 365 سال پیشتر جس بات کا اظہار کیا تھا وہ کچھ باتوں کے سوا آج بھی بالکل سچ ہے۔

28۔ عظیم تعمیراتی ذوق اور خوبصورتی کا ایک دوسرا بہترین نمونہ آگرہ میں اعتماد الدولہ کا مقبرہ ہے۔

29۔ چند مذہبی اداروں (اسلامی اور ہندو) کے معاملہ میں اعتراض صرف مقابلتاً نئی تاریخ پر ہے۔ لہٰذا ان کی قدیم عمارتوں کے تسلسل پر غور کرنا ہوگا۔

30۔ بابر آگرہ میں فوت ہوا۔ اس کی خواہش کے مطابق اس کے جسد خاکی کو کابل پہنچایا گیا اور اس کی اپنی بنائی ہوئی جگہ پر شہر کے قریب ایک پہاڑی پر دفن کیا گیا۔ بادشاہ کے قریب اس کے بہت سے بیوی بچوں کو دفن کیا گیا۔ باغ جو بالکل چھوٹا سا ہے ایک وقت میں اس کے گرد سنگ مرمر کی دیوار ہوتی تھی۔ ایک رواں اور شفاف ندی سے ابھی تک اس قبرستان کے خوشبودار پھولوں کو سیراب کیا جاتا ہے۔ یہ جگہ لوگوں کے لیے ایک عمدہ تفریحی مقام ہے۔

31۔ مسٹر تھارنٹن لاہور کے بارے میں اپنی تصنیف میں کہتا ہے کہ مقبرہ جہانگیر، نور جہاں نے تعمیر کرایا تھا اور اصل میں وہاں ایک مرکزی گنبد اور سائبان تھے جن کو اورنگ زیب کے بیٹے بہادر شاہ نے ہٹوا دیا تھا۔ ہمعصر مصنفین اس بیان سے اتفاق نہیں کرتے۔ محمد صالح جس نے اپنی کتاب شاہجہاں کے دور حکومت میں لکھی تھی، تفصیل سے بتاتا ہے کہ اس عمارت کو شاہجہاں نے تعمیر کروایا تھا اور جہانگیر کی خواہش کے مطابق مزار کو اوپر سے کھلا رکھا گیا تھا اور چھت نہیں بنائی گئی تھی۔ تاہم یہ واضح ہے کہ مرکزی عمارت میں گنبد موجود نہیں تھا۔

32۔ فرگوسن کے مطابق امرتسر کے گوردوارہ کی شان و شوکت میں نصف حصہ اس مقبرہ کے اکھاڑے گئے سنگ مرمر کا بھی ہے۔

33۔ غالباً اس وقت اورنگ زیب شمال مشرقی افغانوں کے ساتھ جنگ میں مصروف تھا۔ خان۔

34۔ یہ بٹالہ کے قانونگو سجان رائے کا مسودہ ہے جو اس نے اورنگ زیب کے دور حکومت میں

مکمل کیا۔ اس میں مسلمانوں کی حکومت کے دور میں ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔

35۔ ان تبرکات مقدسہ کی اصلیت کے بارے میں مندرجہ ذیل بیان ہمیں آنریری ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لاہور جناب فقیر عزیز الدین کے بیٹے فقیر سید جمال الدین نے سنایا تھا۔ اس واقعہ کو اصل میں عزیز الدین کے بھائی فقیر نور الدین نے 1853ء میں لارڈ لارنس کی درخواست پر فارسی میں لکھا تھا اور اس کو انگریزی زبان میں فقیر سید جمال الدین نے ڈھالا:۔

"شرف الدین علی تزدی، اپنی کتاب "ظفر نامہ تیموری" میں لکھتا ہے کہ 23 جمادی الاول 803 ہجری کو جب تیمور گورگان نے ایشیائے کوچک ترکی پر حملہ کیا تو وہ ان تبرکات کو اپنے ساتھ لے آیا۔ وہ لکھتا ہے جب تیمور نے دمشق پر قبضہ کیا تو شہر کے تمام امراء اپنے ہمراہ قاضیوں اور سیدوں کے ساتھ اکٹھے ہو کر آئے اور انہوں نے فاتح بادشاہ کو تبرکات مقدسہ اور دوسری نایاب اشیاء تحفہ کے طور پر پیش کیں۔ یکم ربیع الاول 805 ہجری کو سلطان ایلدرم بایزید کا وفد حملہ آور کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے اپنے ساتھ بہت سی اشیاء اور تبرکات مقدسہ لے کر آیا۔ اس وقت سے یہ تبرکات تیمور کے جانشینوں کے قبضہ میں چلے آرہے تھے۔ ان کو ہندوستان میں بابر لے کر آیا۔ محمد شاہ کے انتقال کے بعد جب مغلیہ سلطنت اپنے اختتام کے کنارے پر کھڑی تھی تو احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کے دوران (فرخ سیر کی بیٹی اور اس کی بیوی ملکہ زمانی کے ذریعے) محمد شاہ کی بیٹی مغلانی بیگم کو حاصل کر لیا اور اس کے ساتھ اپنے بیٹے کی شادی کر دی۔ غالباً اسی دور میں جب ملکہ زمانی نے دہلی میں صورت حال کو مشکل محسوس کیا تو وہ اپنی اشیاء بشمول ان تبرکات کے جموں ہجرت کر گئی۔ وہاں پر وقت کی نزاکت نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ ان تبرکات کو جموں کے کسی بااعتبار تاجر کے سپرد کر دے۔ کچھ عرصہ بعد اس کی بیٹی مغلانی بیگم کابل میں فوت ہو گئی اور مرحومہ شہزادی کی لاش کو دہلی میں دفن کرنے کے لیے ہندوستان لایا گیا۔ راستے میں گجرات کے سکھ غارت گروں میں سے ایک گجر سنگھ بھنگی نے تابوت کے قیمتی ساز و سامان کو اتار لیا۔ اس کے جموں پہنچنے پر جب بیوہ ملکہ اس تابوت کے ساتھ دہلی جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس نے یہ تبرکات کسی کے حوالے کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ جموں میں رہائش پذیر چشتی کے شاہ محمد بازہ اور پیر محمد چٹھہ

نے اپنے بیٹوں شیخ سوھندا اور غلام محمد (جن کو اکثر ملکہ بلایا کرتی تھی اور ان کی کم عمری کے باعث انہیں پسند کرتی تھی) کو لالچ دینے کا موقع ڈھونڈ لیا کہ وہ ملکہ سے کہیں وہ یہ تبرکات ہمیں عنایت کر دے اور اس کے بدلے 80,000 روپے کا حقیر سا نذرانہ قبول کر لے۔ انہوں نے اس کے ساتھ یہ بھی باور کرا دیا کہ وہ اس سے زائد ادا نہیں کر سکتے۔ ملکہ نے بڑی خوشی سے ان کی درخواست قبول کر لی۔ بعد میں پیر محمد اور شاہ محمد بازہ نے اپنی رقم کے حصہ کے مطابق ان تبرکات کو آپس میں بانٹ لیا اور اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ پیر محمد تبرکات کا حصہ لے کر رسول نگر (اب رام نگر) چلا گیا اور انہیں قلعہ کی فصیل کی ایک برجی میں رکھ دیا۔

1804ء میں رنجیت سنگھ کے باپ سردار مہاسنگھ بکراماجیتی نے چٹھوں پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد رسول نگر پر ان کی تمام جائیدادوں اور بشمول تبرکات کے قبضہ کر لیا۔ سردار نے ان کو بڑی حفاظت سے حویلی کے اندر رکھ دیا اور اس کی وفات تک یہ وہیں رہے۔ 1211 ہجری میں جب شاہ زمان کی ہندوستان کی طرف چڑھائی کی خبر نے ملک میں سراسیمگی پھیلا دی تو مہاراجہ نے اپنی تمام دولت بشمول تبرکات اور توپ "چٹھیاں والی" اپنی بیوی بی بی مہتاب کور کے زیر انتظام مکیریاں کے قلعہ میں احتیاط کے ساتھ رکھنے کے لیے روانہ کر دی جو اس وقت اس کی ساس مائی سدا کور سے متعلق تھا۔ ایک دن اتفاقی طور پر قلعہ میں زبردست آگ بھڑک اٹھی اور ہر طرف پھیل گئی۔ ہر خشک و تر چیز جل کر خاک ہو گئی۔ لیکن اس عمارت کے دروازوں پر پہنچ کر جہاں بہت بڑی مقدار میں بارود جمع تھا اور اس کی بالائی منزل میں تبرکات رکھے ہوئے تھے، آگ چھاؤنی کے آدمیوں کی کوشش کے بغیر خود بخود بجھ گئی اور اس عمارت کی ہر چیز بالکل محفوظ رہی۔ وہاں مقیم تمام سکھ اور مسلمان ان تبرکات کے مافوق الادراک تاثر کے قائل ہو گئے اور ان کے بارے میں ان کا احترام اور زیادہ بڑھ گیا۔

بعد میں اس واقعہ کے چشم دید گواہ بہت سے سکھ اور مسلمان جو مذکورہ بالا واقعہ کی سچائی کی قسم کھا سکتے تھے کافی دیر تک لاہور میں موجود رہے۔ مسمات سدا کور نے اب ان تبرکات کی بہت زیادہ حفاظت کرنا شروع کر دی تھی اور شاہ زمان کے کابل واپس جانے کے بعد جب رنجیت سنگھ نے اپنی جائیداد واپس مانگنے کا مطالبہ کیا تو اس نے اسے ہر چیز لوٹا دی لیکن تبرکات اپنے پاس رکھے۔ اس کی وفات کے بعد مہاراجہ شیر سنگھ اس کی

جائیداد اور تبرکات کا وارث بنا اور اس نے انہیں یکم اسوج 1900ء یعنی اپنے قبضہ تک چونڈہ کے قلعہ میں رکھا، بعد میں اس کو سندھیانوالہ سردار اجیت سنگھ اور لہنہ سنگھ نے قتل کر دیا تھا اور جب سندھیانوالوں پر غالب آنے اور انہیں قتل کرنے کے بعد راجہ ہیرا سنگھ نے اقتدار سنبھالا تو آنجہانی مہاراجہ کی جائیداد کو حکومت میں شامل کر لیا گیا جس کا سربراہ ہیرا سنگھ تھا۔ اس نے تبرکات کو لاہور میں واقع اپنی حویلی میں رکھا۔ 1901ء میں راجہ کو قتل کر دیا گیا اور اس کی جائیداد بشمول تبرکات کے سکھ حکومت کے قبضہ میں چلی گئی۔ اس وقت کے وزیر سردار جواہر سنگھ نے انہیں اپنے با اعتماد ملازموں میں سے ایک سائیں قلی کے سپرد کر دیا جو دو سال تک ان کا نگران رہا۔ اس کے بعد مہارانی جنداں ...ر کے حکم سے تبرکات کو خوابگاہ کلاں کے توشہ خانہ میں رکھ دیا گیا۔ اس کی چابی توشہ خانہ کے مختار رسول جو اور حافظ بدر الدین کے پاس رہتی تھی جو اس میں موم بتیاں روشن کرتے اور پھول نچھاور کرتے تھے۔ پنجاب کے برطانوی حکومت کے ساتھ الحاق تک یہ اسی صورت حال میں رہے۔ تبرکات کا جو حصہ چنی کے شاہ محمد بازہ کے پاس تھا وہ اس کے وارثوں کے پاس رہا۔ حتیٰ کہ اس کو میرے چچا فقیر سید نورالدین نے خرید لیا۔ مندرجہ بالا معلومات فقیر سید نورالدین کی دستاویزات سے حاصل کی گئی ہیں۔ انہوں نے 1853ء میں لارڈ لارنس کے حکم کے تحت بڑے بوڑھے اور درست معلومات بہم پہنچانے والے افراد سے چھان بین کرنے کے بعد اس بیان کو تحریر کیا۔"

36۔ صابر شاہ کے بارے میں مزید معلومات کے لیے میری کتاب "تاریخ پنجاب" ملاحظہ کیجیئے۔

37۔ شمالی یورپ کے بادشاہ کے محافظوں میں سے ایک کیپٹن لیو پولڈوان اورلیچ جو 1843ء میں گورنر جنرل لارڈ ایلن بورو کی طرف سے روانہ کیے گئے سفارتی عملہ کے ہمراہ لاہور آیا تھا۔ اس باغ میں مہاراجہ شیر سنگھ کے ساتھ سفارتی عملہ کی ملاقات کا دلچسپ حال بیان کرتا ہے:۔

"مہاراجہ نے حضوری باغ میں ہمارا خیر مقدم کیا۔ اس کے مغرب کی طرف سفید سنگ مرمر کے کشادہ زینوں پر مشتمل سیڑھی ایک بہت بڑے اور کشادہ برآمدے کی طرف جاتی تھی۔ اس راستہ کو قالینوں اور برآمدے کو کشمیری شالوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ شیر سنگھ اپنے سینکڑوں امراء کے درمیان اس برآمدے میں براجمان تھا۔ شہزادہ پرتاب سنگھ اور دھیان سنگھ نے سفیر (حکومت کے سیکرٹری مسٹر میڈاک) کا سنگ مرمر کی

بارہ دری میں استقبال کیا اور مہاراجہ کے افسروں اور درباریوں کی قطار کے درمیان سے ہو۔ تے ہوئے ان کے رو برو حاضر ہوگئے۔ مہاراجہ نے ہم سے ہاتھ ملایا، سلام کیا اور ہمیں بیٹھنے کی دعوت دی۔ شیر سنگھ، شہزادہ اور سفیر طلائی اور ہم چاندی کی کرسیوں پر بیٹھے جبکہ ہمارے عقب میں امراء اور مہاراجہ کے پیچھے دھیان سنگھ تھا۔ مہاراجہ ایک زرد ریشمی لباس اور پگڑی میں ملبوس تھا جس کو سچے موتیوں اور جواہرات سے سجایا گیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں طلائی کنگن پہن رکھے تھے اور اس کے بائیں بازو میں ان کے درمیان "کوہ نور" موجود تھا۔

38۔ ہندو دیومالائی داستانوں کے مطابق زمین ایک بیل کے سینگوں پر ٹکی ہوئی ہے۔

39۔ مخصوص لفظ، مثمن ہے یعنی ہشت پہلو۔

40۔ کسی کام کی ابتداء کرنے کے لیے مسلمانوں کی دعا۔

41۔ حضرت علیؓ کی تلوار کو "ذوالفقار" کا نام دیا گیا۔

42۔ راسخ العقیدہ مسلمان اپنے تمام نیک کاموں کو اللہ سے منسوب کرتے ہیں۔ فنکار جو اپنے آپ کو اصفہانی کہتا ہے، انتہائی پاسداری سے اپنے کام کو اللہ کے ساتھ منسوب کرتا ہے۔

43۔ یہ 22 جنوری 1891ء کی بات ہے۔

44۔ یحییٰ خاں کے تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ کیجیئے میری کتاب "تاریخ پنجاب" حصہ دوم۔

45۔ بیگم پورہ کے ایک 80 سالہ بزرگ میاں کریم بخش نے اس بات سے مطلع کیا کہ میر نعمت خاں کی اولاد میں سے نذر محمد میرا ہم جماعت رہ چکا ہے۔ نذر محمد لاہور کے حکیم سید حاکم شاہ کے سسر تھے۔ ان کی اولاد میں دو بیٹے ہیں۔ ایک سید عباس علی جو پنجاب میں منصف ہیں اور دوسرے سید دلاور علی شاہ، ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہیں۔

46۔ اورنگ زیب کی ذہین صاحبزادی زیب النساء سنگ مرمر کی اس بارہ دری میں بیٹھ کر آبشار کے منظر سے لطف اندوز ہوا کرتی تھی۔ اس کے اس سایہ دار گوشہ تنہائی کے ارد گرد شہزادیاں اور ان کی خدمت کے لیے جوان و رعنا دوشیزائیں ہوا کرتی تھیں۔ یہاں پر وہ اپنی دلنشیں اور دلکش غزلیں لکھا کرتی، اس کے واضح تخیل اور شاعرانہ کمال میں اس خوبصورت منظر اور چاروں طرف پھیلی فطرت کی رعنائیوں کا بہت زیادہ عمل دخل تھا۔ یہاں پر بادشاہ کے حرم کی خواتین آزادانہ اور بلا روک ٹوٹ سیر کیا کرتی تھیں۔ یہاں پر پنجاب کے جنوبی علاقوں کشمیر کے پہاڑوں اور وادی کابل کے گیت کنیزوں سے سنے جاتے

اور شاہی مہمانوں کی دلچسپی کے لیے لوک ناچ منعقد کیے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ زیب النساء نے طلائی کرسی پر بیٹھے ہوئے اور آبشار کا بھرپور نظارہ کرتے ہوئے مندرجہ ذیل بے مثال رباعی مرتب کی۔

ای ابشار نوحہ گر از بہر کیستی
چین بر جبین فگندہ زاندوہ کیستی
ایاچہ درد بود کہ چون ماتمام شب
سر رابسنگ ئ زدی و می گریستی

ترجمہ: ۔ "اے آبشار! تم کس کی خاطر رو رہی ہو؟ کس کی افسردہ یاد سے تمہاری پیشانی پر شکنیں پڑ گئی ہیں۔ کس درد نے تم کو میری طرح تمام رات بے چین رکھا کہ تم اپنا سر پتھر سے ٹکرا رہی ہو اور آنسو بہا رہی ہو؟"

عبدالحمید لاہوری " بادشاہ نامہ " میں اس بات سے آگاہ کرتا ہے کہ شاہجہاں نے یہ باغات شاہی خاندان کے افراد کی تفریح اور ترو تازگی کے مقصد کے لیے لگائے تھے۔ جب کبھی سیر و تفریح کے دوران حرم کی بیگمات بادشاہ کے ہمراہ ہوتیں تو خیموں کے استعمال کو غالباً اس لیے نظر انداز کر دیا گیا تھا کہ وہ یکساں طور پر کافی جگہ گھیرتے تھے۔ شاہی خاندان کے افراد کی آمد کے موقع پر کسی مرد کو اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی اور پردے کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی۔

47۔ اس باغ کا قطعہ تاریخ بادشاہ کو اس کے دربار کے ایک شاعر نے پیش کیا۔

چون شاہ جہاں بادشاہ حامی دین
آراستہ شالہ مار با طرز متین
تاریخ بنائی این ز رضوان جستم
گفتا کہ بگو نمونہ خلد برین

ترجمہ: ۔ "جب بادشاہ حامی دین شاہ جہاں نے جدید طرز کا باغ لگوایا، میں نے رضوان سے اس کی تاریخ بنیاد کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے جواب میں کہا کہ یہ خلد بریں کا نمونہ ہے۔"

" نمونہ خلد بریں " کے اعداد 1047 بنتے ہیں جو 1637ء کی نشاندہی کرتے ہیں۔ غالباً یہ باغ کی مکمل تکمیل کی تاریخ کو ظاہر کرتی ہے۔

48۔ ملا عبدالحمید لاہوری کی تصنیف " بادشاہ نامہ "۔

49۔ چشتی اور موجودہ دور کے چند دیگر مصنفین نے ذکر کیا ہے کہ اصل میں باغ کو سات حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا جو مسلمانوں کی جنت کے سات درجوں کو ظاہر کرتے تھے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ان میں سے پانچ تباہ ہوگئے اور موجودہ جگہ میں حرف تین کو شامل کیا گیا ہے۔ پنجاب گزیٹیئر کے مولف سے بھی (صفحہ 185) اسی طرح کی غلطی سرزد ہوئی ہے۔ باغ کے سات حصے نہیں تھے اور ہمعصر تاریخی کتابوں میں بھی ان حصوں کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے۔ اس چیز کا امکان بالکل نہیں ہے کہ اس باغ کی ساتوں منزلیں مکمل طور پر غائب ہو گئیں۔ اگر ان کا حقیقی طور پر کوئی وجود تھا تو ان کے آثار تک کیوں موجود نہیں ہیں۔ اس طرح شاہدرہ میں بادشاہ کا عجیب و غریب خواب دیکھنا کہ جنت کی طرح کا ایک باغ ہے جو سونے کے پھلوں سے جگمگا رہا ہے اور اس میں سنگ مرمر کے فوارے، ٹھنڈی بارہ دریاں اور ہر قسم کا سبزہ ہے، محض من گھڑت افسانہ ہے۔ شاہجہاں کے دور کے مورخین کا اس باغ کے درختوں کی تعداد کے بارے میں بیان بڑا جامع ہے (میرے اپنے بیان میں اختصار کی وجہ سے رہ گیا تھا) اور اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ اس مشہور و معروف باغ کی اصلیت کا اس سے تعلق تھا۔ یہ امر قابل غور ہے کہ اگر ایسی بات ہوتی تو باغ کے متعلق دلچسپ معلومات مہیا کرنے والی ان کی تصانیف میں اس کا ذکر کس طرح رہ جاتا۔

50۔ اس مسجد کو رنجیت سنگھ کی مسلمان ملکہ موراں نے تعمیر کرایا تھا۔

51۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مادھو جس کو اپنے مذہب کے اصولوں سے بڑا لگاؤ تھا۔ اس نے گنگا کی زیارت کرنے کے لیے خواہش کا اظہار کیا۔ لال حسینؒ جو اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتے تھے انہوں نے کہا: ۔ "گنگا خود تمہارے پاس آجائے گی لہذا تمہیں اس قدر لمبے فاصلے کے سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے کی کیا ضرورت ہے ؟ " تب انہوں نے لڑکے کو آنکھیں بند کرنے کو کہا۔ مادھو نے آنکھیں بند کیں اور اپنے آپ کو گنگا کے کنارے پر پایا۔ اس نے اپنے والدین کے ہمراہ اشنان کیا جو پہلے سے وہاں پہنچ گئے تھے۔ دوبارہ آنکھیں کھولنے پر اس نے اپنے آپ کو گھر میں پایا۔ جب اس کے والدین گنگا کی زیارت سے واپس لوٹے تو انہوں نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ اس دن مادھو نے ان کے ہمراہ گنگا کا اشنان کیا تھا۔ مادھو اس کرامت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے فوراً کلمہ پڑھ لیا اور مسلمان ہو گیا۔ تب سے اسے شیخ مادھو کہا جاتا ہے۔

52 - تحقیقات چشتی، صفحہ 236

53 - تحقیقات چشتی، صفحہ 327 اور 328

54 - بادشاہ نامہ

55 - خان دوراں کی زیر ہدایت رانی پاربتی اور دیگر زخمی خواتین کو میدان جنگ سے اٹھا کر فیروز جنگ بھیج دیا گیا۔ جھجر سنگھ اور اس کا بیٹا بکرماجیت کو (1635ء) میں میدان جنگ میں قتل کر دیا گیا۔ خان دوراں گھوڑے پر سوار ہو کر ان کی لاشیں تلاش کرنے لگا۔ انہیں ڈھونڈنے کے بعد اس نے ان کے سر کاٹ کر بادشاہ کو بھجوا دیے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ ان سروں کو شہر کے دروازے پر لٹکا دیا جائے۔ " بادشاہ نامہ "۔

56 - وہ شاہجہاں کے درباری امراء میں سے تھا لہذا اس کو نور جہاں کے بھائی ابوالحسن آصف جاہ سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔

57 - بحوالہ، مضمون نمبر 35

58 - اس نے عوام الناس کو بے شمار عمارات اور باغات سے سرفراز فرمایا اور اپنے ذوق اور فراخدلی کی بہت سی یادیں اپنے پیچھے چھوڑیں۔ اس نے سرو کے درختوں کی گہری چھاؤں والا ایک باغ پشاور کے نواح میں لگوایا اور دوسرا کابل کی جنوب مشرقی جانب 80 میل کے فاصلہ پر واقع مقام نملہ میں لگایا۔ اس نے کابل شہر کے وسط میں ایک قطار میں چار وسیع و عریض بازار بنائے ۔ حوض کے دونوں جانب دو منزلہ کمروں کی قطاریں تھیں۔ ان قطاروں کی درمیانی جگہ کو محرابی چھت سے ڈھانپا گیا ہے۔ ہر بازار کو ایک ان ڈھکے صحن سے علیحدہ کیا گیا ہے۔ اس میں فوارے لگائے گئے ہیں۔ فارسٹر

59 - محمد صالح لاہوری کی تصنیف " شاہجہاں نامہ " ۔ اس امیر کے متعلق مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجیے شاہجہاں کے دور حکومت کا باب ۔

60 - بحوالہ میری کتاب " تاریخ پنجاب " ۔

61 - اسرار الامراء

62 - باغ کے وسط میں ایک وسیع چبوترے پر ایک قبر ہے۔ چشتی اور سرور دونوں اس کو مہابت خاں سے منسوب کرتے ہیں۔ لیکن مہابت خاں کو اپنے انتقال سے تھوڑی دیر پہلے دکن روانہ کر دیا گیا تھا۔ وہ برھان پور میں ناسور کی وجہ سے کافی دیر اذیت میں رہنے کے بعد فوت ہو گیا۔ بحوالہ سر ہنری ایلیٹ کی تصنیف " ہندوستان کے مورخین " ، صفحہ ،

45 جلد 3 اور " بادشاہ نامہ " شاہجہاں کے دور حکومت کا آٹھواں سال۔

63۔ "لاہور کرونیکل" (Lahore Chronicle) وہ پہلا انگریزی اخبار اور پریس تھا جو پنجاب میں قائم کیا گیا۔ اس کو مصنف کے والد منشی محمد عظیم نے 1849ء میں شروع کیا۔ اس مہم جو اور زندہ دل شخصیت کو پنجاب میں پریس کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے قدیم دہلی کالج میں مقبول عام پرنسپل مسٹر آر، ٹیلر کے زیر سایہ تعلیم حاصل کی۔ اس وقت فتح کیے گئے نئے صوبہ پنجاب میں انگریزی پریس کے قیام کے متعلق پہلے پہل غور کرنے کے بعد وہ آگرہ چلے گئے اور ایک بہت وسیع عملہ خاص طور پر " سکونڈرا آرفن پریس " کے عملہ سے رابطہ قائم کیا جو یورپی، یورشین اور بنگالی وغیرہ افراد پر مشتمل تھا۔ مسٹر ہنری کوپ نے نئے جریدہ کے مدیر کی حیثیت سے فرائض سنبھالے۔ لاہور کرونیکل کئی برسوں تک طاقتور ادارے کے طور پر قائم رہا۔ ملکیت بدلنے کے بعد اسے " انڈین پبلک اوپنیئن کی ملکیت رکھنے والے نئے مالکان کے پاس فروخت کر دیا گیا۔ اس موخرالذکر ادارہ کو چند سال قائم رہنے کے بعد " سول اینڈ ملٹری گزٹ " میں ضم کر دیا گیا ہے جو صحیح معنوں میں اصل طاقت حاصل کر چکا ہے اور اس کو پنجاب میں ہمیشہ کے لیے طاقت حاصل ہو گئی ہے۔

64۔ شاہ کا اصل مطلب بادشاہ ہے۔ یہ ایک خطاب ہے جو عموماً ایک سید کو یا حضرت علیؓ کی اولاد کو دیا جاتا ہے۔

65۔ یہاں اب مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بارہ دری موجود ہے جہاں سندھیانوالہ سرداروں نے شیر سنگھ کو گولی سے ہلاک کر دیا تھا۔ ہمیشہ سے اس جگہ کو شاہ بلاولؒ کہا جاتا رہا ہے اور بارہ دری کے سامنے ایک پرانے درخت کے نیچے قدیم قبر کا نشان اب بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

66۔ رائے کنہیالال کی تصنیف " تاریخ پنجاب "، صفحہ 233

67۔ ملاحظہ کیجیے " اقبال نامہ جہانگیری " اور کینے کی " تاریخ ہندوستان "، صفحہ 181

68۔ بحوالہ میری کتاب " تاریخ پنجاب " ۔ اس گنبد کو حال ہی میں حکومت کے خرچ پر مرمت کرایا گیا ہے۔

69۔ کابل کا سابق بادشاہ ایوب شاہ اس فقیر مستان کا بہت احترام کرتا تھا جن کا دایاں ہاتھ شاہ عالمی دروازہ کی بالائی منزل میں رنجیت سنگھ کے رکھے گئے شیر نے کھا لیا تھا۔

70۔ گردت سنگھ اینڈ کمپنی، جنرل مرچنٹس اینڈ رم ایجنٹس ۔

71 - اس کو شیخاں والا مقبرہ بھی کہا جاتا ہے۔

72 - مغل دور کی ان عمارتوں کی مضبوطی کا اندازہ اس . ت سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کو توڑنے والے کا ہتھوڑا اس پر کوئی اثر نہیں کر سکا اور اینٹیں چونے سے اس وقت تک علیحدہ نہیں ہو سکتیں جب تک انہیں ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دیا جائے۔

73 - نور احمد چشتی جو اپنے آپ کو مولوی نظام الدین کی اولاد میں سے بتاتے ہیں انہوں نے اس چبوترے کو 1867ء میں دیکھا تھا۔

74 - فارسی میں حجرہ کا مطلب کھلی جگہ میں واقع بغیر چھت کے ایک عمارت، مسجد یا مقبرہ ہے۔

75 ؟

76 - ان کے مقبرے کا گنبد لاہور سے شالا مار جانے والی سڑک کے جنوب میں باغبانپورہ مڈل سکول کے سامنے واقع ہے۔

77 - بھرا، کا پنجابی میں مطلب تہہ خانہ ہوتا ہے کیونکہ مزار تہہ خانے میں واقع ہے۔ اس لیے گرد و نواح کے لوگ اسے "بھرا" کہتے ہیں۔

78 - بحوالہ بدھو کا بھٹہ یا بدھو کے پڑادہ یا آوہ کا بیان۔

79 - اس مسجد کے مقام پر اب ریلوے ٹیکنیکل سکول تعمیر کیا گیا ہے۔

80 - اس مزار کے قریب مشرقی طرف کابل کے ایک مولوی کا مزار ہے جو بعد میں فوت ہوئے اور دفن کیے گئے۔

81 - لاہور کے گرد و نواح میں اس نام کی کوئی جگہ موجود نہیں ہے۔ غالباً یہ الفاظ اورنگ زیب کے دور حکومت میں ضلع لاہور میں شامل "بھیرہ شاہ پور" کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

82 - حبس دم جس کا لفظی مطلب "سانس کھینچنا" ہے۔ یہ دراصل ایسا عمل ہے جس کو فقیر ایک مذہبی عمل کے طور پر سرانجام دیتے ہیں۔ اس کو طویل العمری کے لیے اس لیے متصور کیا جاتا ہے کہ ہر آدمی کے مقدر میں بنانے کے لیے بہت سی تخلیقی تحریکات ہوتی ہیں اور ان کو جتنی آہستہ ادا کیا جائے اتنا ہی طویل عرصہ اس ں ۔ کا ہو گا۔

83 - ملا شاہ کے بارے میں مزید معلومات کے لیے ملاحظہ کیجیے۔

84 - برنیئر، خفی خان۔

85۔ خواجہ بہاری کے بارے میں مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجیئے ،بحوالہ صفحہ 60 سے قبل۔

86۔ چشتی نے 1867ء میں منقش روغنی آرائش کو اس وقت دیکھا تھا جب اپنی کتاب کی اشاعت کروائی تھی۔

87۔ ہجویر، غزنی شہر کے ایک محلہ کا نام ہے۔

88۔ لوگ ابھی تک میر مومن خاں کا نام لاہور کے آخری مسلمان نائب ناظم کے طور پر یاد رکھے ہوئے ہیں۔ وہ انتہائی حسین وجمیل ہونے کے علاوہ بہت زیادہ پرہیز گار انسان تھے۔ مسلمان اور ہندو دونوں ان کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک ہندو دوشیزہ ان پر فریفتہ ہو گئی اور جب وہ اشاروں کنایوں میں کامیاب نہ ہو سکی تو اس نے اپنے دل کا معاملہ ذاتی طور پر نواب سے بیان کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس مقصد کے لیے وہ اس راستے میں کھڑی ہو گئی جہاں نواب روزانہ گھوڑے پر سوار ہو کر گزرا کرتا تھا۔ اسی اثناء میں اس نے نواب کو نظر بھر کے دیکھنا شروع کر دیا اور گھوڑے کے گرد چلنا شروع کیا (جیسے وہ سوار کی بہتری کے لیے اپنے آپ کو قربان کر دینا چاہتی ہو) اس نے ایک طویل آہ بھر کر کہا "آہ! میں کتنی خوش قسمت عورت ہوں گی اگر مجھے تم سے تمہاری جیسی شکل کا بیٹا مل جائے۔ " نواب نے یہ سنا تو فوراً گھوڑے سے نیچے اترے اور کھترانی (ہندو عورت) کے پاؤں چھو کر کہا "تو میں موجود ہوں۔ مجھے اپنا بیٹا ہی سمجھیے اور اس طرح آپ کی خواہش بھی پوری ہو گئی ہے۔ " اس عورت نے جب نواب کے بے لچک اور پاکیزہ رویہ کو دیکھا تو مزید کچھ نہ کہا لیکن موخرالذکر بعد میں بھی اس کو ہمیشہ ماں ہی سمجھتا رہا اور اس کو والدہ جیسی توجہ دیتا رہا۔

89۔ تیر، ایرانی سال کا چوتھا شمسی مہینہ ہے۔

دی، شمسی سال کا دسواں مہینہ ہے جب سورج برج جدی میں ہوتا ہے۔

دسمبر، موسم سرما کا آغاز۔

اردی، شمسی سال کا دوسرا مہینہ جب سورج برج ثور میں ہوتا ہے۔

90۔ مرزا امام الدین ویردی جن کا آبائی وطن کشمیر تھا۔ پورے پنجاب میں اپنے فن خطاطی کے باعث بہت مشہور تھے۔ اس خطاطی کے فن میں ان کے ہمسر دہلی کے میر محمد المعروف میر پنجہ کش تھے۔ وہ غدر سے قبل یہاں آباد ہوئے تھے۔ وہ دونوں اپنے فن کے زبردست استاد

تھے اور انہوں نے سینکڑوں شاگرد اپنے پیچھے چھوڑے۔ ان کی تحریروں کا معاوضہ بہت زیادہ تھا۔ ان کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہونے کی وجہ سے انہیں بہت سراہا جاتا تھا۔ نواب امام الدین کے پاس مرزا امام ویردی (جو نواب کی ملازمت میں تھا) کی لکھی ہوئی شیخ سعدی کی گلستان بھی تھی اور یہ فارسی خطاطی کا نادر نمونہ تھا۔ اس کو لکھنے کے لیے مرزا کو کئی سال لگے اور نواب نے اس کا معاوضہ کئی ہزار روپوں میں ادا کیا۔

91۔ ان شاندار اشعار کو نواب امام الدین خاں کے بیٹے اور لاہور کے آنریری مجسٹریٹ اور رئیس نواب غلام محبوب سبحانی نے مرتب کیا تھا۔ وہ عربی اور فارسی کے جید عالم تھے۔

92۔ یعنی مرحومہ، جن کی یہاں پر حضور اکرمؐ کی صاحبزادی اور حضرت علیؓ کی زوجہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی کنیز کے طور پر تشبیہہ دی گئی ہے۔

93۔ فارسی زبان کے اصلی قطعہ تاریخ ماہ مخفی شد کو جس خوبصورتی سے تحریر کیا گیا ہے اسے انگریزی زبان میں مناسب طور پر بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں بڑی ندرت پائی جاتی ہے۔ مخفی دراصل زیب النساء کا شاعرانہ تخلص تھا اور ماہ مخفی شد کا مطلب بھی یہی ہے کہ مخفی یعنی چاند رخصت ہو چکا ہے۔ ان الفاظ کے اعداد سے 1080 ہجری بمطابق 1669ء کی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔

94۔ مغلوں کی یہ یادگار اور فن تعمیر کے اعلیٰ نمونہ جات کی حامل عمارات بلاشک و شبہ عوامی ملکیت ہیں۔ زبیدہ بیگم کے باغ کا دروازہ مغلیہ دور کی ایک شاندار یادگار ہے۔ لہٰذا اس کو مکمل تباہی سے بچانے کے لیے مؤثر اقدامات کرنے چاہئیں۔

95۔ مہر محکم دین کے بارے میں مزید معلومات کے لیے ملاحظہ کیجیئے میری کتاب "تاریخ پنجاب"۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی مسلمان رانی موراں مہاراجہ رنجیت سنگھ پر مہر کے اثر و رسوخ سے حسد کرنے لگی تھی۔ لہٰذا اس کو برباد کرنے کے لیے اسے درباری امراء کی حمایت بھی حاصل ہو گئی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حکم سے مہر کی تمام جائیداد ضبط کر کے حکومت میں شامل کر لی گئی۔ چشتی بیان کرتا ہے حتیٰ کہ اس کی خواتین رشتہ داروں کے تن پر بھی کچھ نہ چھوڑا گیا اور وہ گداگری پر مجبور ہو گیا۔ ہم یہ بڑی اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ رنجیت سنگھ اپنے عزیز دوستوں اور پگڑی بدل بھائیوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتا تھا۔

96۔ نربت والا تالاب کو لوگ مل والا بھی کہتے ہیں۔

97۔ بحوالہ میری کتاب "تاریخ پنجاب"۔

98۔ اس تالاب کے آثار ابھی تک موجود ہیں اور اب جب یہ کتاب تصنیف ہو رہی ہے تو اس کے چاروں طرف واقع چار زینے ابھی تک درست حالت میں ہیں۔

99۔ جاروب کشوں یا مہتروں کا یہ خیال اور عقیدہ ہے کہ جنت میں جانے کے صرف وہی حقدار ہیں، خدا باقی دنیا کو بعد میں جنت میں بھیجے گا، اس کی سیدھی سادی وجہ یہ ہے کہ مہتران کے گھروں کو صاف کرنے کی زحمت اٹھاتے ہیں۔

100۔ بلاچمین کی "آئین اکبری"، صفحہ 539 ، 1873ء کا کلکتہ ایڈیشن۔

101۔ اس مقبرے کی چار دیواری میں اب لکڑیوں اور کوئلے . ال ہے۔ اس مقبرے اور احاطہ کے مالک کھوجے ہیں۔ انہوں نے اس جگہ کے قبضہ کے سلسلہ میں موضع مزنگ کے لمبردار پر مقدمہ کیا ہوا تھا اور چیف کورٹ نے مقدمے کا فیصلہ کھوجوں کے حق میں کر دیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ کھوجوں کا ارادہ تھا کہ اس عمارت کی مناسب طور پر مرمت کرائی جائے۔ اگر وہ اپنے عزم پر کاربند رہتے تو انہوں نے خوش اسلوبی سے یہ کام کرنا تھا۔ یہ جگہ آثار قدیمہ والوں کے لیے دلچسپی کا مقام ہے۔

102۔ بحوالہ صفحہ 157 سے قبل، آپ کی اولاد کے بیان کے متعلق ملاحظہ کیجیے۔ باب نمبر3

103۔ نواب سعادت اللہ خاں کے بارے میں مزید معلومات کے لیے ملاحظہ کیجیے میری کتاب "تاریخ پنجاب"۔

104۔ مضمون نمبر 39 سے پہلے۔

105۔ ان میں سے مرزائی بیگ، مرحوم محمد شاہ کمانڈنٹ سردار بہادر کا داماد تھا۔

106۔ نواب امام الدین کے والد شیخ غلام محی الدین سکھوں کے دور میں یکے بعد دیگرے جالندھر اور کشمیر کے حاکم تھے۔ غلام محی الدین کے والد شیخ اجالا، ہوشیار پور کے سردار بھوپ سنگھ کی ملازمت میں تھے۔ غلام محی الدین جب بہت چھوٹے تھے یعنی صرف نوجوان تھے تو ان پر پہلے پہل مشہور و معروف دیوان محکم چند کے بیٹے دیوان موتی رام کی نظر عنایت ہوئی۔ اس کے علاوہ انہوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے پشاور کے محاذ پر افغانوں کے خلاف جنگ میں نمایاں کارنامے سرانجام دیے۔

107۔ وزیر خاں مسجد کی اندرونی آرائش مصوری، خوبصورتی، شان و شوکت اور فقید المثال مہارت کے ثبوت کے طور پر یہ بات قابل غور اور دلچسپ ہو گی کہ میو سکول آف آرٹس لاہور کے اولین طلباء کو کاغذ پر یہ ڈیزائن بنا کر سکھائے جاتے تھے۔ اس ادارے کے

پرنسپل اور مشہور و معروف شخصیت مسٹر جے ، ایل ، کپلنگ اپنی سرکاری رپورٹ میں مسجد وزیر خاں کی آرائش کے بارے میں لکھتے ہیں " یہ خوبصورت عمارت بذات خود ڈیزائن کا ایک ادارہ ہے لیکن معلوم ہوتا ہے سال با سال سے اس کی دیکھ بھال پر توجہ نہیں دی گئی ۔ چنانچہ اس کے نقش و نگار کو اس قدر نظر انداز کیا گیا ہے کہ وہ شکستہ حالت میں ہے ۔ ان حالات کے تحت اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ عجائب گھر اور سکول میں اس کی نقول کو محفوظ کر لیا جائے ۔ کیونکہ نوجوان مصوروں کی تربیت کے لیے اس سے بہتر کام اور کوئی نہیں ہو سکتا ۔ " میو سکول آف آرٹس کے بارے میں پرنسپل کی رپورٹ برائے سال 90-1889ء ۔ یہ انتہائی افسوس کا امر ہے کہ مسلمانوں کے طبقہ کو شاہجہاں کے وزیر کی طرف سے لاہور شہر کے مکینوں کے لیے عطا کیے گئے قیمتی تحفہ کو محفوظ کر لینا چاہیے تھا لیکن وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر مسمار ہو رہا ہے ۔

108 ۔ اس امیر کے بارے میں مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجیئے صفحات 51 اور 61 سے قبل ۔

109 ۔ ماشکی جس کو رنجیت سنگھ کی ملکہ مہارانی جنداں کی بھرپور حمایت حاصل تھی ۔

110 ۔ بھیک دراصل نواب بھکاری خاں کے روحانی پیشوا تھے ۔ انہوں نے یہاں اپنے پیر کو انتہائی احترام اور محبت سے مخاطب کیا ہے ۔

111 ۔ قرآن کریم کی 24 ویں سورۃ ، پہلا رکوع ۔

112 ۔ مفتی غلام سرور لاہوری ایک مختلف رائے پیش کرتے ہیں ۔ وہ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ اس کے بانی نے جان بوجھ کر اس مسجد کی بنیاد اس قدر گہری بنوائی تھی ۔ ہم اس سے اتفاق نہیں کرتے ۔ یہ اچھی طرح جانا جاتا ہے کہ مسجدوں اور شوالوں کو بلند چبوتروں پر تعمیر کیا جاتا تھا ۔ تو پھر اس نیویں مسیت کے بانی نے اپنی مسجد کو زمین سے اس قدر نیچے تعمیر کیوں کیا اور اس کو تباہ کرنے کا خطرہ کیوں مول لیا؟ اس کے نزدیک واقع کڑہ غبار چیاں بھی گلی کی سطح سے بہت نیچے ہے ۔ یہ ایک بہت قدیم کڑا ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گلیاں اپنی موجودہ بلندی تک کس قدر اونچی ہو گئی ہیں ۔ موچی دروازہ کے سامنے محمد صالح کی مسجد کی عمارات اور شہر کے دیگر قدیم مکانات کو دیکھتے ہوئے (جو گلی کی سطح سے کافی پست ہیں) یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین میں دھنس گئے ہیں ۔ یقیناً اس وقت سے لے کر جب ان کو تعمیر کیا گیا تو گلیوں کی زمین کی سطح بلند ہو گئی

ہے۔

113۔ اس کی تاریخ بنیاد کا سال (1266 ہجری) آخری شعر کے لفظ اعدا (دشمن) کے اعداد میں سے 1 کو کم کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کو فارسی شاعری کی طرز میں صفت تخرجہ کہا جاتا ہے۔

114۔ بارہ دری کی شمال مغربی جانب ایک ایوان ہے جس میں مہاراجہ شیر سنگھ براجمان تھا تو اسے اجیت سنگھ سندھیانوالہ نے گولی سے ہلاک کر دیا۔ اس کمرے کی بالائی منزل پر جنوب کی طرف سنگ مرمر کی جالی میں ابھی تک گولی کے نشان کو دیکھا جا سکتا ہے۔ بارہ دری کے سامنے صحن میں ایک کنواں ہے جس کو پتھروں سے ڈھانپا ہوا ہے اور اس میں چھوٹا سا سوراخ ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ اس کو پانی پینے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ صحن کے وسط میں ایک محرابی چھت والا کمرہ ہے جس میں بیٹھ کر شیر سنگھ گرنتھ سنا کرتا تھا۔ اس کمرے اور بارہ دری کے درمیان ایک پرانا درخت ہے جس کے نیچے ایک چبوترہ ہے اس پر شاہ بلاولؒ کی قبر تھی۔ اس قبر کے آثار ابھی تک موجود ہیں۔ کسی جگہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب اس بزرگ کے مزار کو دریائے راوی کے سیلاب سے خطرہ لاحق ہو گیا تو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ان کے جسد مبارک پر مشتمل تابوت کو اس جگہ سے نکلوایا اور اس صندوق کو راجہ دینا ناتھ کے باغ کے قریب دفن کرایا اور پھر اس پر ایک شاندار مقبرہ تعمیر کروایا۔

115۔ میری کتاب " تاریخ پنجاب " میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں لفظ " شالا مار " پر ہونے والی دلچسپ بحث کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ شالا ایک شاستری لفظ ہے جس کا مطلب " مکان " ہے۔ جیسے " دھرم شالا " سے مطلب " مذہبی مکان " یا پتھ شالا سے " درس گاہ " وغیرہ وغیرہ ہوتا ہے اور " مار " ایک ترکی لفظ ہے جس کا مطلب " خوشی " ہے۔ چنانچہ " شالا مار " جو سنسکرت اور ترکی الفاظ کا امتزاج ہے اس کا مطلب " خوشی کا گھر " بنتا ہے۔ رنجیت سنگھ نے اس کو شہلا باغ کا نام دے دیا۔ شہلا ایک فارسی لفظ ہے جس کا مطلب " محبوب " ہے اور باغ کے امتزاج کے ساتھ " شہلا باغ " کا مطلب " محبوب کا باغ " ہوا۔ مہاراجہ کے حکم کے تحت باغ کا نام تمام سرکاری خط و کتابت میں اسی طرز پر شامل ہوتا تھا۔ " تاریخ پنجاب " ۔

116۔ ایک قسم کی جالی جو ہندی مہینوں ساون اور بھادوں کی بارش کو ظاہر کرتی ہے (یہ جولائی اور اگست کے مہینوں سے متعلق ہوتے ہیں) ۔

117 - بحوالہ مضمون، شالامار باغ -

118 - ڈیوائنٹی کالج

❀❀❀

باب سوئم

لاہور

بیانی
(جدید دور)

ایک عام آدمی کے مشاہدے کے مطابق آج کا لاہور تیس سال پہلے کے لاہور سے قطعی مختلف ہے۔ 1849ء میں الحاق کے بعد کافی عرصہ تک اس کے جنوب مشرق میں کوئی بات قابل غور نہیں تھی سوائے اس کے کہ ناہموار سطح زمین کا بہت بڑا قطعہ تھا جو شکستہ حال مساجد، گنبدوں اور دروازوں پر مشتمل تھا۔ پرانے خشتی بھٹوں کے بڑے بڑے انبار اور کھنڈرات کے بے ڈول ڈھیر تھے۔ نادر شاہ اور احمد شاہ کے حملوں کے نتیجہ میں پنجاب میں مسلمانوں کی حکومت کا شیرازہ بکھر گیا۔ ہندو قومیت (خاص طور پر سکھوں) پر مقامی حکمرانوں کی ایذا رسانی اور اپنی باری پر مؤخرالذکر کی طرف سے انتقامی کارروائیوں نے پنجاب میں ہر جگہ تباہ کاریوں اور غارت گری کے عمل کو مکمل کر دیا اور یہ دارالسلطنت بھی اس کارروائی سے مستثنیٰ نہ رہ سکا(1)۔

سر (بعد میں لارڈ) جان لارنس نے 1852ء میں بطور چیف کمشنر پنجاب، لاہور کے گرد و نواح کے بارے میں لکھتے ہوئے کہا ہے: کسی بھی صوبہ میں چند ایسی نواحی آبادیاں ضرور مل سکتی ہیں جن میں لاہور کے نواحی علاقوں کی طرح حفظانی شکلات جیسی خصوصیات پائی جاتی ہوں۔ انار کلی سٹیشن اپنی ملحقہ آبادیوں کے ہمراہ کئی مربع میل علاقہ پر پھیلا ہوا ہے۔ اس پر صرف ایک نہیں ...مہ مختلف ادوار اور مختلف خاندان سلاطین کے بیشمار شہروں کے کھنڈرات موجود ہیں۔ اس غیر معمولی میدان کی سطح پر ٹیلوں، بھٹوں، اینٹوں، پتھروں، شکستہ اینٹوں کے انباروں ...حال عمارات کے ڈھانچوں، کنوؤں، خندقوں اور گزرے ہوئے زمانوں کی آبادیوں کے ملبوں سے جیب

تنوع پیدا ہو گیا ہے۔ زمین بنجر ہے اور شور زدہ ہے لیکن اس کے باوجود اس پر مختلف انواع کا سبزہ پھیلا ہوا ہے۔ اگرچہ عام طور پر بے آب و گیاہ ہے لیکن ناہموار ہونے کے باعث اس میں زیادہ تر بے موقع متعفن پانی جمع رہتا ہے (2)۔

خوش قسمتی سے ملک اور اس کے عوام کے لیے وقت اب بدل گیا ہے۔ جہاں اس سرزمین پہ تباہی و غارت گری کا دور دورہ تھا، وہاں اب شاندار سبزہ لہلہا رہا ہے۔ خوبصورت سرکاری و نجی عمارات تعمیر ہوئی ہیں۔ باغات اور میدانوں میں سے نہریں اور پکی سڑکیں گزرتی ہیں جن کے کناروں پر سایہ دار درختوں کی قطاریں آویزاں ہیں اور یہ سب ہر قدم پر ایک باقاعدہ حکومت کے منفعت بخش اثر و رسوخ اور عمدہ نظم و نسق، فنون کی ترقی و ترویج اور شہریوں کے لیے خوشحالی اور امن کی غمازی کر رہے ہیں۔ پرانی عمارات کی جگہ نئی عمارتوں نے لے لی ہے لیکن ان میں سے چند ایسی عمارتوں کو سرکاری طور پر محفوظ کر لیا گیا ہے جو اس قابل تھیں۔

ڈونالڈ ٹاؤن :۔ سٹیشن کا پورا مشرقی حصہ جو لارنس گارڈن اور گورنمنٹ ہاؤس تک تین میل کے فاصلے تک پھیلا ہوا ہے، اب اس کو پنجاب کے آنجہانی لیفٹیننٹ گورنر سر ڈونالڈ میکلوڈ کے نام سے ڈونالڈ ٹاؤن کہا جاتا ہے۔ یہاں پر یورپی بیوپاریوں اور تاجروں کی دکانیں قائم ہیں۔ اس بڑھتے ہوئے نواحی علاقہ کو انار کلی کے ساتھ ایک کشادہ سڑک سے جسے مال کہا جاتا ہے ملا دیا گیا ہے، جس کے شمال میں ایک ویران سڑک کے ذریعے علیحدہ پنجاب نارتھ ویسٹرن ریلوے سٹیشن ہے، جس کے ارد گرد مکانات کی ایک کالونی ہے اور یہ زیادہ تر ریلوے کے ملازمین سے متعلق ہیں۔ جس علاقہ میں یہ کالونی واقع ہے وہ نولکھا کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ساری آبادی اس کے علاوہ ڈونالڈ ٹاؤن، شالا مار اور میاں میر کی آبادیاں قدیم شہر کے علاقہ پر آباد ہیں اور ان سے پنجاب کے سابقہ دار الحکومت کی جسامت کا واضح تصور ملتا ہے۔ مال کے جنوب میں مزنگ کے نواحی محلے آباد ہیں جن میں یورپی باشندوں کے مکانات کافی تعداد میں ہیں۔

انار کلی :۔ شہر کے جنوب میں لاہوری دروازہ کے ساتھ ایک کشادہ گلی سے منسلک انار کلی کا سٹیشن ہے۔ اس کے نام کو ایک مزار سے منسوب کیا جاتا ہے (3)، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سابقہ ریذیڈنسی اور پنجاب گورنمنٹ سیکرٹریٹ کے قریب واقع ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں اس جگہ کو سکھ حکومت کے ملازم، فرانسیسی افسران کے احکامات کے تحت رجمنٹوں اور بٹالینوں کی قطاروں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ جب 1799ء میں رنجیت سنگھ کو پہلی مرتبہ خود کو لاہور کا مالک بننے کا خیال آیا اور وہ اسی مقصد کے لیے شہر کے نواحی علاقوں میں

ایک بہت بڑی فوج کے ہمراہ آیا تو اپنے ساتھ اپنی عالی حوصلہ ساس سدا کور کو بھی لے کر آیا۔ اس نے اپنی فوج کو انار کلی میں ٹھہرایا(4)۔ الحاق کے بعد برطانوی فوجی دستوں نے انار کلی پر قبضہ کر لیا۔ 52-1851ء میں اس جگہ کے بارے میں یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ فوجی دستوں کے لیے غیر صحت مند ہے یہاں سے چھاؤنی کو ہٹا لیا گیا۔

سول سٹیشن سے تین میل کے فاصلے پر مشرق کی طرف اور قلعہ لاہور سے سات میل کے فاصلے پر میاں میر چھاؤنی واقع ہے جو لاہور ڈویژن کا فوجی ہیڈ کوارٹر ہے۔ یہ میدان اصل میں بالکل بے آب و گیاہ اور سنسان تھا لیکن درمیان میں سے گزرنے والی نہروں اور شاہراہوں کے ساتھ لگائے گئے درختوں کی وجہ سے سرسبز و شاداب نظر آتا ہے۔ میاں میر میں دو ریلوے سٹیشن ہیں۔ ایک مشرق میں لاہور و دہلی لائن پر اور دوسرا مغرب میں ملتان و لاہور لائن پر واقع ہے۔ میاں میر چھاؤنی عام طور پر شاہی توپ خانہ، برطانوی پیدل فوج کی ایک رجمنٹ، بنگال کا ایک رسالہ اور مقامی پیدل فوج اور پنجاب کے سپاہیوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

قلعہ:۔ قلعہ لاہور کو شاہی توپ خانہ، یورپی اور مقامی پیدل فوج کے دستے میاں میر سے مہیا کیے جاتے ہیں۔

گرجا میاں میر:۔ پنجاب میں جس کیتھولک گرجا کو سب سے زیادہ خوبصورت سمجھا جاتا ہے وہ میاں میر میں ہے۔

ہسلی نہر:۔ لاہور شہر سے تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر اور شہر اور چھاؤنی کے نصف راستے پر ہسلی نہر بہتی ہے۔ اس کو بادشاہ شاہ جہاں کے حکم پر 1633ء میں مشہور انجنیئر علی مردان خاں نے تعمیر کیا تھا۔ یہ نہر پہلے شاہی تفریح گاہ، شالامار باغ کے فواروں اور باغات کو اور لاہور کے نزدیک پودوں کی تحفظ گاہوں کو پانی مہیا کرتی تھی جن امراء اور بااثر شخصیات کی زمینیں اور باغات اس کے ساتھ واقع تھے انہیں اس بات کی اجازت تھی کہ وہ اس نہر کے پانی سے انہیں سیراب کر سکتے ہیں۔ بہتے ہوئے پانی، گھنے درختوں کا سبزہ، خوبصورت و پرتکلف نباتات اور بہت سی تفریح گاہوں اور شالامار اور شاہی شہر کے درمیان واقع باغات نے مغلوں کی قدیم شان لاہور کو اس قابل کر دیا ہے کہ وہ بابر کے جانشینوں کے حسین تصورات کو قائم رکھے جو وہ اپنے ساتھ فرغانہ کی سرسبز و شاداب وادی سے لے کر آئے تھے۔ جب سکھوں نے پنجاب کی حکومت حاصل کی تو ہسلی نہر سے ایک شاخ نکال کر امرتسر لے جائی گئی تاکہ سکھوں کے مقدس تالاب کو پانی فراہم کیا جا سکے۔ اس کی چوڑائی پچاس فٹ سے پندرہ فٹ تک اور گہرائی سات فٹ سے دو فٹ تک ہے۔ نہر کو 52-1851ء

چوڑا کیا گیا اور اس کے کناروں کو مضبوط بنایا گیا۔ ہسلی اب عظیم باری دوآب نہر کو پانی فراہم کرتی ہے اور اسی انتظام کے تحت نہایت سودمند ہے۔

آبادی :۔ شہر لاہور اور اس کے مضافات کی آبادی بلدیہ کی حدود کو شامل کرتے ہوئے فروری 1891ء کی مردم شماری کے مطابق 1,59,597 ہے۔ اس میں سے 92,835 مرد اور 66,762 عورتیں ہیں۔ 1881ء میں آبادی (5)، 1,38,878 تھی اور فروری 1875ء میں (6)، 1,28,441 تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ دس سال میں 20,719 کا اضافہ اور سولہ سال میں 31,156 کا اضافہ ہوا۔ لاہور رقبہ کے لحاظ سے صوبہ کے 31 اضلاع میں گیارھویں نمبر پر اور آبادی کے لحاظ سے دوسرے (7)، نمبر پر ہے۔

میاں میر کی آبادی 17,257 ہے جس میں سے 11,875 مرد اور 5,382 عورتیں ہیں۔

لاہور اور میاں میر کی کل آبادی مندرجہ ذیل ہے:۔

بلدیہ	1,59,597
میاں میر	17,257
کل	1,76,854

آبادی کو مذہب کے لحاظ سے کچھ اس طرح مرتب کیا گیا ہے:۔

ہندو	62,077
سکھ	7,306
جین	339
مسلمان	1,02,280
عیسائی	4,697
پارسی	132
یہودی	14
دیگر	9
کل	1,76,854

آب و ہوا :۔ لاہور کی آب و ہوا کو ہندوستان کے دوسرے شہروں کی بہ نسبت اچھا خیال کیا جاتا ہے۔ یہ علاقہ شمالی افریقہ اور امریکی ریاستوں کے برابر عرض بلد پر درمیانے درجہ پر واقع ہے۔ اس میں آب و ہوا کا ہر انداز پایا جاتا ہے۔ اس میں گرم مرطوب اور معتدل آب و ہوا کے خطے بھی موجود ہیں اور ان میں ہر طرح کی پیداوار اگانے کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ سال کے چار مہینوں میں گرمی بہت زیادہ ہوتی ہے اور درجہ حرارت 105 ڈگری تک جا پہنچتا ہے۔ پنجاب کے دیگر علاقوں کی طرح سال کے موسموں میں غیر صحت مند موسم ستمبر اور اکتوبر میں ہوتا ہے۔ نومبر سے مارچ تک آب و ہوا صحت افزاء اور خوشگوار ہوتی ہے اور دسمبر، جنوری اور فروری خوشگوار حد تک سرد ہوتے ہیں۔ سکھوں کے دور حکومت کے مقابلہ میں اب بارشیں لگاتار ہوتی ہیں جس کے نتیجہ میں ہریالی میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ موسمی بارشیں جولائی اور اگست میں ہوتی ہیں لیکن موسم سرما میں بھی کافی بارشیں ہوتی ہیں۔ موسم برسات سے قبل آنے والے گرد و غبار کے طوفان اس قدر شدید نہیں ہیں جس طرح بیکانیر کی سرحد کے ساتھ لگنے والے جنوبی صحرا کے اضلاع میں ہوتے ہیں۔

ارضیات :۔ ضلع لاہور میں اگر کوئی خاص معدنی پیدازار ہوتی ہے تو وہ کنکر ہے۔ اسے سڑکیں بنانے اور چونا تیار کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ کلر، روڑی کو پرانی عمارتوں کے انبار سے اکٹھا کر کے چھکڑوں کے ذریعے کھیتوں میں ڈال دیا جاتا ہے تاکہ گندم کی فصل کے لیے بالائی تہہ تیار کی جاسکے۔ شورہ جسے تھیہہ کہا جاتا ہے، اسے پرانے دیہات سے اکٹھی کی گئی مٹی سے حاصل کیا جاتا ہے اور بڑے بڑے آہنی کڑاہوں میں ابال کر کام میں لایا جاتا ہے۔

درخت :۔ اس ضلع کے دیسی درخت یہ ہیں: ۔ کیکر یا بابل

(Acacia Orientalis or Accia Arabica) ایک سخت لکڑی کا درخت ہے۔ اسے عام طور پر کاشت کیے گئے کھیتوں کے اردگرد اگایا جاتا ہے۔ اسے زیادہ تر زراعتی کاموں اور سیاہی بنانے کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ شہتوت (Morus Indica) اور فرس۔ (Tamarix Orientalis) دونوں کم تر درجے کی لکڑی کے درخت ہیں اور ان کی لکڑی زیادہ تر چارپائیاں بنانے کے کام آتی ہے۔ سیری (Acacia Sirissa)، یہ لکڑی مکانات کی چھتوں میں شہتیر ڈالنے اور "کوہلو" بنانے کے کام آتی ہے۔ کھجور کا درخت دریا کے قریب راستوں پر اگتا ہے۔ کریل (Capharis Aphylla) ایک ہلکا سبز درخت ہوتا ہے۔ اس کے پتے بھی تھوڑے ہوتے ہیں۔ ون جنڈ (Orosopis Spicig Era)، اس کی لکڑی ایندھن کے لیے بہت اچھی سمجھی جاتی ہے۔ پھلائی: زرعی مقاصد کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ امب (آم) اس کا پھل

بہت مزیدار اور میٹھا ہوتا ہے۔ شیشم (Dalbergia Si Su) اس کی لکڑی بہت قیمتی ہوتی ہے اور زیادہ تر عمارتی مقاصد کے لیے فرنیچر، چھکڑا گاڑی کے پہیے اور ہل کا جوا بنانے کے کام آتی ہے۔ بکائن یا دھریک (Melia Sempervirens) اس کی لکڑی کو مقامی طور پر بنائے جانے والے مکانات کی چھتوں میں کڑیوں کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ اس لکڑی کو دیمک نہیں لگتی۔ برنا (Crataeva Tapia) ایک نہایت عمدہ سایہ دار درخت ہے۔ املتاس (Cathartocar Pus Fistula) اس کو جلاب کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ پیپل یا انجیر کا درخت (Ficus Roligiosa) ایک بہت بڑا سایہ دار درخت ہوتا ہے۔ بیر (Zizyphus Nummularia) اس کی لکڑی کو رہٹ بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ پیلو (Salvadora Oleoides) اور چند جھنڈ کھجور (Phaenix Dacly Lifera) کے درختوں کے ہیں۔

خود رو نباتات :۔ اس ضلع کی بڑی بڑی خود رو نباتات یہ ہیں :۔ پلچھی (Tamarix Gallicia) یہ دریائے راوی کے کناروں پر دریائی زمین پر اگتی ہے۔ زمیندار ٹال بنانے اور اپنے مٹی کے گھروں پر چھپر ڈالنے کے لیے استعمال کرتے ہیں جبکہ کمہار اور ملاح اس کی شاخوں کو ٹوکریاں بنانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ دب ایک ریشہ دار گھاس ہندوؤں کی مقدس گھاس، کشا دریاؤں کے کناروں پر اگتی ہے، اس کو کھردری چٹائیاں بنانے کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ منج (Saccharum Munj) ، یہ انتہائی مفید پودا، ریتلی زمین میں نالوں اور دریاؤں کے کناروں پر اگتا ہے۔ اس کو رسہ، چقیں، چٹائیاں، کرسیاں اور صوفہ جات بنانے کے لیے بہت زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے مختلف حصے بھوسے سے لے کر کانے تک شہروں اور دیہات کی روز مرہ زندگی کی مختلف ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ سان (Crotolaria Funcea) سانوکرا (Hibiscus Cannibinus) اور پٹوا (Hibiscus Sabdariffa) بھی ریشہ دار پودے ہیں۔ ان کو بھی زیادہ تر چارپائیاں اور چقیں وغیرہ بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

پنی یا خس (Andropogon Muricatum) ایک گھاس ہے اور یہ زیادہ تر ڈیگ کے کناروں پر اگتی ہے۔ اس کی جڑ نہایت خوشبودار ہوتی ہے اور اسے زیادہ تر ٹٹیاں (چقیں وغیرہ) بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لوگوں میں زیادہ تر مقبول عطر اسی سے حاصل کیا جاتا ہے۔ لاہنا ایک پودا ہے اور اسے کپڑے صاف کرنے کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ اسی سے سجی

تیار کی جاتی ہے۔ تونبا، نمدار زمین کی پیداوار ہے۔ اس کی بیل خربوزے کی طرح پھیلتی ہے اور اس کا پھل سنگترے سے ملتا جلتا ہے۔ پودا جسے ون کہا جاتا ہے اس کے ساتھ بیریا اودھے رنگ کا پھل لگتا ہے جسے پیلو کہا جاتا ہے۔ اس کا ذائقہ شیریں ہوتا ہے لیکن بو ناگوار ہوتی ہے۔ قحط کے دنوں میں نادار لوگ اس کا پھل، بیج اور حتیٰ کہ ہر شے کھا جاتے ہیں اور یہ ان کے لیے غذا کا کام دیتا ہے۔ ڈجبلہ یا پنجو کریل پودے کا پھل ہے۔ اس کو نمک اور پانی کے محلول میں محفوظ کر لیا جاتا ہے اور بہت زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔ کوکن بیر، جنگلی آلو بخارے کی ایک قسم ہے اور یہ پکنے کے بعد سرخ ہو جاتا ہے۔ اس کا ذائقہ بہت شیریں ہوتا ہے اور یہ چھوٹے آڑو سے ملتا جلتا ہے۔ جنڈ درخت کا پھل سنگری کے نام سے مشہور ہے اور اسے سبزی کے طور پر استعمال میں لایا جاتا ہے۔ جنڈ اور کریل کے درختوں پر ایک بیل پیدا ہوتی ہے، جسے کاکوڑا کہا جاتا ہے اور یہ سبزی کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ بہت سی اقسام کی کھمب بھی ہے اور لوگ اس کو زیادہ تر تازہ اور خشک بھی استعمال کرتے ہیں۔ تمارسک درخت کے ساتھ ایک سیاہ رنگ کا چھوٹا سا بیر پیدا ہوتا ہے جسے ملیم کہا جاتا ہے اور اسے بھورا رنگ رنگنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لک بیر کے درخت کی پیداوار ہے اور کیکر کے درخت کی چھال رنگ، کو شراب کشید کرنے سے پیشتر خمیر کے لیے اور کسی چیز کو رنگ دینے کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔

زرعی اجناس :۔ اس ضلع کی نمایاں زرعی اجناس اور یہ کن موسموں میں بوئی جاتی ہیں درج ذیل ہے:۔

۱۔ گنا (بونا اور کماد)	فروری اور مارچ
۲۔ تمباکو	جنوری اور فروری
۳۔ پوست	نومبر اور دسمبر
۴۔ سرخ مرچ	مئی اور جون
۵۔ سونف	ستمبر
۶۔ اجوائن	ستمبر اور اکتوبر
۷۔ زیرہ	ایضاً
۸۔ کپاس	مارچ اور اپریل
۹۔ خربوزہ	فروری اور مارچ
۱۰۔ آلو	اگست اور ستمبر

۱۱۔ تخم ملنگاں	نومبر اور دسمبر
۱۲۔ گندم	ستمبر اور اکتوبر
۱۳۔ جھونا (چاول)	جولائی اور اگست
۱۴۔ دھان (چاول)	اگست
۱۵۔ سویا بین	ستمبر اور اکتوبر
۱۶۔ چنا	اگست اور ستمبر
۱۷۔ دیسی مکئی	جولائی اور اگست
۱۸۔ جوار	ایضاً
۱۹۔ سرسوں	اگست اور ستمبر
۲۰۔ السی کا بیج	اکتوبر
۲۱۔ مسور	ستمبر
۲۲۔ جو	ستمبر اور اکتوبر
۲۳۔ بھنگ	جولائی
۲۴۔ مدل (ایک طرح کی دال)	جولائی اور اگست
۲۵۔ تل	ایضاً
۲۶۔ ماش	ایضاً
۲۷۔ مونگ	ایضاً
۲۸۔ موٹھ	ایضاً
۲۹۔ کنگنی	ایضاً
۳۰۔ تارامیرا	اگست اور ستمبر
۳۱۔ سانوک	جون اور جولائی
۳۲۔ چورال	ستمبر اور اکتوبر
۳۳۔ باجرا	جولائی اور اگست
۳۴۔ توریا	ستمبر اور اکتوبر
۳۵۔ مونگ پھلی	جولائی اور اگست
۳۶۔ ھالوں	اکتوبر

افیون انتہائی چھوٹے پیمانے پر اگائی جاتی ہے اور ضلع میں نیل کافی دیر بعد متعارف ہوا ہے۔ ضلع میں بہترین سبزیاں شہر لاہور کے ارد گرد واقع نشیبی زمینوں میں اگائی جاتی ہیں۔ وہاں آبپاشی اور کھاد حاصل کرنے کے لیے بہتر سہولیات میسر آسکتی ہیں۔ لاہور کے نواحی علاقوں اچھرہ اور ڈھولن وال میں بہترین گندم پیدا ہوتی ہے۔ چونیاں اور قصور کے نشیبی علاقوں کی مشہور و معروف پیداوار ودانک یا بڑی گندم لاہور کے بازاروں میں مل جاتی ہے۔ لاہور کے مضافات میں بڑی جسامت کا موٹا گنا بھی اگایا جاتا ہے جسے پونا کہا جاتا ہے۔ لاہور کے نواح میں نشیبی علاقوں میں کھاد حیران کن حد تک اپنا اثر دکھاتی ہے۔ ایک ہی سال میں دو اور بعض اوقات تین فصلیں بھی حاصل کی جاتی ہیں اور سال ہا سال تک چیزوں کی یہی حالت رہتی ہے۔ لہذا اس کے نتیجہ میں لاہور کے ارد گرد کی زمین کو نہایت قیمتی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔

خوردنی سبزیاں:۔ اروی، آرم کی ایک قسم (8)، بھنڈی، کچالو، ایک خوردنی جڑ۔ بینگن، کریلا شلجم یا شلغم، مولی، گاجر، چقندر، سلق، توری یا تورائی، کھیرے کی ایک قسم، گھیہ، گھیہ توری اور بہت سی انواع و اقسام کی پھلیاں بہت زیادہ پیمانے پر اگائی جاتی ہیں اور یہ لوگوں کی خاص خوراک بن چکی ہیں۔ آلو شہر لاہور کے پورے علاقہ میں اگائے جاتے ہیں اور لوگ بڑی تعداد میں استعمال کرتے ہیں۔ ان کو سارا سال حاصل کیا جاتا ہے لیکن اگست اور ستمبر میں ان کو پہاڑوں سے درآمد کیا جاتا ہے۔ درآمد کیے جانے والے آلو بڑے اور ان کا ذائقہ شیریں ہوتا ہے لیکن اس علاقے میں اگائے گئے آلو ہی کو زیادہ تر پسند کیا جاتا ہے۔

پھل:۔ ضلع میں اگائے جانے والے اہم پھل یہ ہیں:۔ شہتوت جو مئی میں پکتا ہے۔ آڑو، آلو بخارہ، لوکاٹھ، فالسہ (ایک نیم ترش پھل) خربوزے، آم اور چند شیریں رسدار پھل، یہ سب تقریباً جون میں پک جاتے ہیں۔ انار، امرود، سیب اور چند پکی ہوئی پھلیاں جولائی یا اگست میں پکتے ہیں۔ لیموں (کاغذی) شیریں لیموں، ستمبر میں پک جاتے ہیں۔ سنگترے نومبر میں پک جاتے ہیں اور سارا سال ان کی شجر کاری کی جاتی ہے۔ لاہور کے نواحی علاقہ ساندہ کے آڑو جسامت میں بڑے اور میٹھے ہوتے ہیں اور شالا مار باغ کے آم بازاروں میں فروخت کیے جاتے ہیں۔ کچھ استثنٰی کے ساتھ ان کا ملتان اور سہارنپور کے آموں سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

ولائتی پھول اور سبزیاں:۔ لاہور کے ارد گرد کے علاقہ کی زمین ولائتی پھولوں اور سبزیوں کے اگانے کے لیے سازگار ثابت ہوئی ہے اور ان کو سرد موسم میں یا نومبر سے مارچ اور اپریل تک اگایا جا سکتا ہے۔ بند گوبھی، پھول گوبھی، سلاد، چقندر اور مٹر کی پھلیوں کو بڑی کامیابی سے اگایا گیا ہے۔

پھلیوں کے سلسلہ میں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی لیکن دالوں اور عام اناج کو قابل برداشت حد تک کامیابی سے اگا لیا گیا ہے۔

دیسی پھول :۔ گلاب (جس سے عرق گلاب حاصل کیا جاتا ہے) کے پودے لاہور کے مضافات میں کثرت سے اگائے گئے ہیں۔ بید مشک، اس کے ساتھ جنوری اور فروری میں خوشبو دار پھول کھلتے ہیں اور مشروبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اس میں سے عرق نکالا جاتا ہے۔ چنبیلی یا یاسمین اور موتیا موسم گرما میں عام ہیں اور اپنی خوش کن خوشبو کے باعث لوگوں کے ہر طبقہ میں بہت زیادہ پسند کیے جاتے ہیں۔

جنگلی جانور اور پرندے :۔ جنگلی سور دریائے راوی کے کناروں پر پائے جاتے ہیں اور ہرن، کالا ہرن اور خرگوش بڑی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ بٹیر تقریباً سارے لاہور میں موسم بہار کی فصل پک جانے کے بعد موجود ہوتے ہیں جبکہ سلیٹی اور کالے چکور اور تیتر رکھ اور جنگلوں میں پائے جاتے ہیں۔ راوی کے شمال میں جنگلی مرغ کثرت سے پایا جاتا ہے جبکہ راج ہنس، بطخیں، کونجیں، آبی پرندے اور ماہی خور بھی مل جاتے ہیں۔ تلور یا تلیر راوی کے شمال اور پٹی نالہ میں پایا جاتا ہے۔ باری دوآب نہر کے کناروں کے ساتھ مرغابی بکثرت پائی جاتی ہے۔ خشک کنوؤں اور پرانی عمارات میں کبوتروں کی بہتات ہے۔ چھانگا مانگا کے جنگلوں میں نیل گائے اور بعض اوقات چیتا بھی مل جاتا ہے۔ ضلع کے سنسان اور غیر آباد علاقوں میں عام طور پر بھیڑیئے، گیدڑ، لومڑیاں اور جنگلی بلیاں پائی جاتی ہیں۔ جنگل طوطوں، میناؤں، بلبلوں، فاختاؤں، چڑیوں اور ہندوستان کے عام مختلف نوعیت کے پرندوں کی پرلطف چہکاروں سے گونج اٹھتے ہیں۔ بعض علاقوں میں عقاب اور شکرے بھی پائے جاتے ہیں۔ چیلیں، گدھ اور کوے بیشمار ہیں۔ شہد کی مکھیاں درختوں کی خالی کھووں میں مختلف جگہوں پر چھتے لگا لیتی ہیں اور ان کو آدمی لوٹ لیتے ہیں۔ بعض اوقات محض شور کر کے مکھیوں کو اڑا دیتے ہیں تاکہ وہ اپنے میٹھے خزانے یعنی شہد کو چھوڑ جائیں۔

حشرات الارض :۔ حشرات میں، مچھر ایک انتہائی اذیت ناک جاندار ہے۔ بھڑیں، گھروں کے کونے کھدروں میں چھپ کر تکلیف پہنچاتی ہیں اور اگر ان کا پتہ نہ چلایا جائے اور کوئی خاص ترکیب نہ برتی جائے تو وہ بہت زیادہ پریشانی اور تکلیف کا باعث بنتی ہیں۔ موسم گرما اور موسم برسات کے دوران ٹڈی دل بن بلائے مہمان ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے بادلوں کی صورت میں علاقوں پر سے گزرتے ہیں اور اگر کسی جگہ اتر آئیں تو ہر سرسبز بالکل ختم کر دیتے ہیں۔ برسات کے موسم میں نہروں کے کناروں اور سرسبز جگہوں پر جگنو بکثرت پائے جاتے ہیں۔

رینگنے والے جانور : ۔ سانپ اور بچھو عام ہیں۔ سانپوں کی اقسام میں کوبرا اور کریٹ کو انتہائی خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ راوی میں گھڑیال یا مگرمچھ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

مچھلیاں :۔ دریائے راوی میں پائی جانے والی اور لوگوں کے استعمال میں آنے والی مچھلیوں کی اقسام مندرجہ ذیل ہیں: ۔

موری	سارا سال دستیاب ہوتی ہے۔
شیر ماہی یا ماشیر	عام طور پر پائی جاتی ہے۔
قتلہ یا تھیلا	کھانے میں ذائقے دار ہے۔
سول	شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔
ڈولا	عام طور پر مل جاتا ہے۔
سنگھاڑی	بہت کم ملتی ہے اور لوگ بہت پسند کرتے ہیں لیکن یورپین زیادہ پسند نہیں کرتے ۔
گوالی (گلا) یولا گوہا	ہر وقت دستیاب ہوتی ہے۔ شیعہ لوگ پسند نہیں کرتے۔
پری	موسم سرما میں ملتی ہے۔
بچوا	کھانے میں اچھی ہے۔
کھگہ	اس کو یورپین پسند نہیں کرتے۔
بانم	سرخی مائل سیاہ رنگ کی ہوتی ہے۔

لاہور میں آباد قبائل :۔ لاہور میں بھی دریائے سندھ کے ساتھ واقع پنجاب کے دیگر قصبات میں رہنے والے قبائل آباد ہیں۔ مسلمانوں کے اہم قبائل اور ذاتوں میں سید، شیخ، مغل، پٹھان، کشمیری زیادہ نمایاں ہیں اور ہندوؤں میں برہمن، کھتری، ویسیا اور سدرا زیادہ اہم ہیں۔ سکھ بیشمار ہیں لیکن ان کا گڑھ، ہمسایہ شہر امرتسر ہے جو پنجاب کا کاروباری دارالحکومت ہے۔ زرعی اور خانہ بدوش قبائل میں گوجر اور آہیر ہیں۔ مسٹر تھارنٹن نے ان کی شناخت بطلیموس کے ابی سیرَ اور پراناؤں کے ابی ہیراسے کی ہے۔ یہ غلہ بانی کرتے اور مویشی چراتے ہیں۔ کھرل اور کاٹھیا ان کے بارے میں خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ قدیم کاتھاسی اور بلوچوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ بار دیہات میں آباد ہیں اور

خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ارائیں، مسلمان ہیں اور زرعی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ جٹ غالباً قدیم زرعی قبائل گیتائی کی یادگار ہیں جنہوں نے پنجاب پر عیسائی دور کی پہلی پانچ صدیوں کے دوران حکومت کی یہ ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں میں مشترکہ طور پر ہیں۔ ان کی گوتیں (ذاتیں) بیشمار ہیں۔

فقیر اور جوگی:۔ لاہور کے بازاروں میں بیشمار فقیر ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ آدمی کسی بھی گلی سے اس کے بغیر گزر جائے کہ دو تین فقیر بھیک نہ مانگ رہے ہوں۔ گداگروں کا ایک طبقہ جوگی کہلاتا ہے۔ یہ ہندوستان کے دور دراز علاقوں کا سفر کرتے ہیں اور پھر واپس لاہور آجاتے ہیں اور بہت سے مواقع پر کافی مال و زر لے کر لوٹتے ہیں۔ ان میں سے کسی کی بھی لاہور میں کوئی جائیداد نہیں۔ فقیروں کے طبقہ میں گداگری ایک باقاعدہ پیشہ بن چکی ہے۔ لڑکوں اور تندرست جسموں کے افراد کو گلیوں میں گھومتے اور خیرات مانگتے دیکھا گیا ہے۔ یہ ملک کے لیے انتہائی بدقسمتی ہے کہ یہ لوگ کسی باوقار پیشہ کو اپنا کر روزی نہیں کما سکتے۔

سادھو:۔ سادھو، مسلمانوں کے سفری بیوپاریوں کا ایک طبقہ ہے۔ یہ ولایتی اشیاء، دیسی ادویات، خوشبوئیات اور منشیات کا کاروبار کرتے ہیں۔ یہ دراصل کشمیر کے رہنے والے ہیں اور جوگیوں کی طرح ہندوستان اور افغانستان کے مختلف علاقوں کا سفر کرتے ہیں۔ ان کا صدر مقام، انہی کے نام سے مشہور، شہر لاہور کا ایک محلہ ہے۔ یہ بہت چاق و چوبند اور ہوشیار ہوتے ہیں اور بہت سی زبانیں بڑی اچھی طرح بول سکتے ہیں۔

نجومی، وید اور حکیم:۔ یہاں پر نجومی بھی ہیں لیکن مغربی تعلیم کی حامل نوجوان نسل کی ان کو کوئی زیادہ حمایت حاصل نہیں ہے۔ ویدک ادویہ کے طریقہ علاج پر عمل پیرا ویدوں کی بھی قلیل تعداد موجود ہے لیکن لوگ زیادہ تر حکیموں کے پاس جاتے ہیں جن کے پاس یونانی ادویات سے طریقہ علاج کا علم ہے۔ انگریزی ادویات کے طریقہ علاج کے فروغ سے قبل اسی پیشہ کے ذریعے علاج کیا جاتا رہا ہے۔ وہ بیماریوں کے علاج کے سلسلہ میں وہی پرانے طریقوں پر عمل کرتے ہیں اور نت نئے تجربات کرنے اور اپنے طریقہ علاج کو مزید فروغ دینے سے ہچکچاتے ہیں۔

فنون کی پیروی:۔ یہی طریق فنون اور صنعت کی پیروی کے لیے بھی لاگو ہوتا ہے۔ یعنی روزمرہ استعمال کی اشیاء اور گھریلو ضروریات کی چیزوں کو پرانے طریقوں کے ذریعے تیار کیا جاتا ہے۔ ایک کیسرا یا ٹھٹھیرا اپنے برتن اسی طرز پر اور بھدے اوزاروں سے تیار کرتا ہے جو اس کے آباؤ اجداد پانچ سو سال پیشتر استعمال کرتے تھے۔ ایک لوہار اپنے عجیب و غریب ہتھوڑے اور چمڑے کی دھونکنی کے

بغیر اور سنار پھونکنی کے بغیر کام نہیں کر سکتا۔ اشیاء کو علیحدہ کرنے والی ٹوکری بالکل اسی طرح ہے جس طرح قدیم شہرت کے حامل بکرماجیت کے زمانے میں تھی۔ برتن اسی طرز کا اور بڑی شمع (جس کی روشنی مدھم ہوتی ہے اور بہت زیادہ دھواں خارج کرتی ہے) اور شمع دان بھی اسی طرز کا ہے۔ آج کل بھی اسی طرز کے پلنگوں کے چوکھٹے بڑے بڑے اور موٹے پایوں سمیت استعمال ہوتے ہیں جس طرح کے پلنگوں پر اسکندر کی فوج کے سپاہی قدیم دریائے راوی کو پار کرنے کے بعد سویا کرتے تھے۔ ان دنوں بھی ایک ضعیف عورت اسی طرز کی بھدی سی کھڈی استعمال کرتی ہے جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے کئی صدیاں قبل بڑی بوڑھیاں استعمال کیا کرتی تھیں۔

قدامت پسند ہندوستانی :۔ ہندوستان کے لوگ خاص طور پر قدامت پسند ہیں۔ وہ ہر طرف جدید سائنس سے ہونے والی ترقیوں کی روشن مثالیں دیکھتے ہیں لیکن ان سے کوئی سبق حاصل نہیں کرتے۔ وہ یورپی تہذیب کے متعارف کردہ مفید فنون پر عمل پیرا ہونے کے بہت سے فوائد کا مشاہدہ کرتے ہیں لیکن ان کو اختیار کرنے کا رجحان پیدا نہیں کرتے۔ ایک ایکسپریس ٹرین کی بجائے وقت ضائع کرنے کے لیے تیس یا چالیس میل فی گھنٹہ کے حساب سے چلنے والی گاڑی پر سفر کرتے ہیں۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آج کل بھی پرانے چھکڑے کو بیل اپنی دم اٹھائے اسی طرح کھینچ رہا ہے جس طرح پورس کے زمانہ سے قبل استعمال میں لایا جاتا تھا۔ بجلی کے تار کے ذریعے آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پیغام پہنچ جاتا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہرکارہ اپنے ڈاک کے تھیلے سمیت زیادہ سے زیادہ چار میل فی گھنٹہ کے حساب سے دوڑتا ہے۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ سٹیمر کے پیچھے وہی قدیم کشتی زور لگا رہی ہے جس کو لمبے بانسوں کے ذریعے چلایا جاتا ہے۔ جس کو قدیم تاریخ کی مشہور ملکہ الیسریان نے ہندوستان میں یونانیوں کی آمد سے قبل دریائے سندھ کے اس کنارے پر اپنے مصنوعی ہاتھیوں کو لانے کے لیے استعمال کیا تھا۔

فرنیچر :۔ مکانات کی تزئین و آرائش کے لیے کسی قدر کم ذوق و شوق اور امتیاز کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ زمین پر ایک قالین یا سوتی چٹائی بچھا دی جاتی ہے اور اہل خانہ اس پر بیٹھ جاتے ہیں۔ ہمارے ملک کے لوگوں کی بہت بڑی تعداد نے ابھی تک قدیم زندگی کے خیالات کو خیرباد نہیں کہا۔ تاہم تعلیم یافتہ طبقے اس طریق سے مستثنیٰ ہیں اور وہ اپنے گھریلو انتظامات میں بہتر ذوق و شوق اور امتیازی رجحان کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

صنعتیں اور مصنوعات :۔ شیشے کی چوڑیاں لاہور میں بنائی جاتی ہیں لیکن ان کا رنگ چمکدار نہیں ہوتا۔ شیشے کی نہایت اہم اشیاء تیار کی جاتی ہیں وہ مٹی کے تیل کے چراغ اور چمنیوں پر مشتمل

ہوتی ہیں۔

تیل کے چراغ اور چمنیاں :۔ یہ تیل سے جلنے والے پیتل کے پرانے شمعدانوں اور مٹی کے چراغوں کی جگہ بنائے گئے ہیں۔ گھریلو استعمال اور ریلوے کے لیے اس کی طلب میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔

سٹیم فلور اور آئل ملز :۔ سبزیوں کے تیل، بھاپ سے چلنے والی مشینوں کے ذریعے تیار کیے جاتے ہیں۔ سٹیم فلور اور آئل ملز کو حال ہی میں قائم کیا گیا ہے۔ سٹیم ملوں میں نہایت عمدہ قسم کا السی کا تیل تیار کیا جاتا ہے۔ تارپین کے تیل کو گندا بروزہ یا دیودار کی گوند سے کشید کیا جاتا ہے۔ مصور اس سے عام طور پر رال یا وارنش تیار کرتے ہیں۔ گندھک کے تیزاب اور شورے کے تیزاب کو تیار کرنے کے لیے لیبارٹریاں ہیں۔

موم بتیاں :۔ چربی کی موم بتیوں کی تجارت میں بڑی ترقی ہوئی ہے اور یہ کاروبار خوب زوروں پر ہے۔

صابن :۔ شہر میں ایک اعلیٰ معیار کا صابن تیار کیا جاتا ہے۔ اون کو دھونے کے لیے اس کو بہت زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔

چھاپہ خانہ :۔ چھاپہ خانوں کی چھپائی کے فن میں فروغ حاصل ہو رہا ہے اور اسی طرح جلد سازی میں بھی ترقی ہو رہی ہے تاہم دونوں میں ابھی چمک دمک ذرا کم ہے۔

چمڑے کی اشیاء :۔ چمڑے کے کام میں بہت زیادہ ترقی ہوئی ہے اور اس کی شہادت اس بات سے ملتی ہے کہ ہر سال چمڑے کی اشیاء اور جوتے بہت بڑی تعداد میں تیار کیے جاتے ہیں۔ لاہور میں مقامی طور پر بہت اعلیٰ معیار کے جوتے تیار کیے جاتے ہیں اور ان پر فراخ دلی سے طلائی اور چاندی کے تاروں سے کڑھائی کی جاتی ہے۔

سوتی چھپائی :۔ سوتی کپڑے پر چھپائی، سیاہ رنگ کی ایک سخت لکڑی پر ابھرے ہوئے حروف کاٹ کر کی جاتی ہے۔ جیومیٹری کے ڈیزائن اور انسانوں، جانوروں، گھوڑوں اور پرندوں وغیرہ کے زیبائشی ڈیزائن، دیواروں کی آرائش اور فرش پر بچھانے کے لیے سوتی کپڑے کے ٹکڑوں پر کالے، بھورے اور ہلکے سبز رنگ میں چھاپے جاتے ہیں۔ آج کل لاہور میں ایک خاص فیشن کی ململ بہت عام ہے۔ اس پر باقاعدہ طور پر گہرے زرد رنگ کے ڈیزائن "پرانا سونا" کی طرز پر چھاپے گئے ہیں اور اس آرائشی کپڑے کے ٹکڑے خواتین کے ملبوسات میں استعمال ہوتے ہیں۔

سوتی و ریشمی پارچا جات :۔ سوتی پارچات میں شہر میں صرف کھدر اور بھورے رنگ کے

کھیس تیار ہوتے ہیں لیکن ریشمی مصنوعات کی تجارت بہت بڑے پیمانے پر ہے اور پھل پھول رہی ہے۔ لاہور کا دریائی کم چمک والا ریشمی کپڑا ہے۔ اس کا بر چھوٹا ہے اور لائنوں والا ایک باریک کپڑا گلبدن ہے۔ اس کا بر چوڑا ہے۔ سکھوں کے دور حکومت میں مردوں اور خواتین کے لیے زیادہ تر اسی کپڑے سے شلواریں بنائی جاتی تھیں اور سردار سے لے کر عام سپاہی تک ہر طبقے کے لوگ اس کو پہن کر خوشی محسوس کرتے تھے لیکن یہ کپڑا ابھی تک سرداروں اور خواتین کے اعلیٰ طبقوں میں زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ دھوپ چھاؤں ریشمی کپڑا، جب اس کو روشنی میں رکھا جائے تو دو رنگ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کپڑا خواتین بہت زیادہ استعمال کرتی ہیں۔

پٹولی کا کام:۔ لاہور کا پٹولی یا علاقہ بندی کا کام اگرچہ کاروباری لحاظ سے زیادہ اہمیت کا حامل نہیں لیکن پھر بھی یہ کاریگروں کے ہاتھ سے بنی ہوئی ریشم کی آرائشی اور زیبائشی چیزوں کی اختراع پسندی اور ذوق کی علامت ہیں کیونکہ ان کو کھڈی پر نہیں بنایا جاتا۔ ملبوسات کی ریشمی ڈوریاں اور کمربند جن کے سروں پر گانٹھیں ہوتی ہیں اور آرائشی پھندنے لگے ہوتے ہیں، ان کو طلائی دھاگے اور موتیوں وغیرہ سے آراستہ کیا گیا ہوتا ہے۔ بستر کی ڈوریاں ریشمی جھالریں، حاشیے اور بنی ہوئی رسیاں وغیرہ بنائی جاتی ہیں اور لوگ ان کو آرائشی اور زیبائشی مقاصد کے لیے بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ پٹولی میں مور کے پر نصب ہوتے ہیں اور یاک کی دم کے ساتھ دستے لگائے جاتے اور ان کو ایک منقش گانٹھ کے ساتھ منسلک کر کے چلوری کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سے مکھیاں اڑانے کا کام لیا جاتا ہے۔ وہ ریشم کے پھندنے بھی بناتے ہیں جن کو گھوڑے کے ساز میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ریشم کا دھاگہ گلوبند کے لیے اور گردن میں خوبصورتی کے لیے پہنا جاتا ہے۔ سر کی زیبائشی چیزوں میں سونا، چاندی اور دھاگہ استعمال ہوتا ہے اور اس کو بالوں کی چوٹیوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ چغوں اور کوٹوں کے بٹنوں اور چاکوں کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

بڑھئی اور سنار کا کام:۔ نجاری اور دھات کے کام کو ریلوے ورکشاپوں اور میو سکول آف انڈسٹریل آرٹس لاہور سے ترقی ملی ہے۔ لاہور پیتل اور تانبے کے کام کے سلسلہ میں شہرت نہیں رکھتا کیونکہ اس کی اشیاء دہلی، لکھنؤ وغیرہ سے درآمد کی جاتی ہیں۔ سنار کے کام میں بھی کوئی خصوصیت نہیں پائی جاتی۔

نقشین کندہ کاری:۔ نقشین کندہ کاری ڈبی بازار میں بڑی صفائی سے کی جاتی ہے لیکن یہ کام کشمیر اور دہلی جیسا بہترین نہیں کیونکہ وہاں اس فن کو عروج حاصل ہے۔

ظروف سازی:۔ ظروف سازی کے سلسلہ میں کوئی خاص چیز مشہور نہیں ہے سوائے مٹی کی

منقش روغنی چلمیں آبخورے اور مٹی کے بڑے بڑے مٹکے دونوں بہت اچھے ہوتے ہیں اور لوگوں میں بہت زیادہ استعمال کیے جاتے ہیں۔

ترکاشی :۔ لاہور بھی دہلی کی طرح ترکاشی (سونے کی تار سے تصویر کشی)، دھاتی دستے بنانے اور ملمع سازی اور چمکدار ورق بنانے کے مرکز کے طور پر شہرت کا حامل ہے۔ اگرچہ یہ کام کم تر درجے کا ہے لیکن پھر بھی اس کو دہلی میں کیے جانے والے کام سے بہتر خیال کیا جاتا ہے۔

دھاتی ورق اور پرت :۔ سونے اور چاندی کے ورق بھی لاہور میں اسی طرح بنائے جاتے ہیں جس طرح دوسرے شہروں میں بنتے ہیں۔ جھلیوں کی تہوں میں دھات کو خوب کوٹا پیٹا جاتا ہے۔ چمکدار پیتل کے ورق اور قلعی کی پنیاں تقریباً 8 انچ چوڑی اور 2 فٹ طویل ہوتی ہیں۔ ان کو آرائشی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے بنایا جاتا ہے۔

چھری کانٹے :۔ کٹلری کے کام میں لاہور میں منقش فولاد کے چاقو، قینچیاں، چمٹیاں، تلوار کے پھل اور خنجر بنائے جاتے ہیں۔

کوفتگری :۔ فولاد یا لوہے پر طلائی اور بعض اوقات چاندی کے جڑاؤ کو کوفتگری کہا جاتا ہے اور لاہور نے اس کام کے نہایت عمدہ نمونے تیار کیے ہیں لیکن اس کا مقابلہ کشمیر کے فن سے نہیں کیا جا سکتا۔ اس فن کو شام (دمشق) کے کاریگروں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ مسلمان بادشاہوں اور سکھوں کے دور میں اس فن کو ہتھیاروں اور جنگی اسلحہ کی آرائش کے لیے استعمال کیا گیا۔ لاہور میں یہ کام اب زوال پذیر ہے اور اب اس کو زیادہ تر سیالکوٹ اور گجرات کے اضلاع مہیا کرتے ہیں۔

مینا کاری :۔ لاہور کا مینا کاری کا کام ملتان اور بہاولپور جیسا مشہور نہیں ہے لیکن ایک خاص قسم کا سیاہ رنگ کا مینا کاری کا کام لاہور میں کیا جاتا ہے۔

سنٹرل جیل کی مصنوعات :۔ سنٹرل جیل لاہور چند نہایت عمدہ پارچات تیار کرتی ہے۔ ان میں صافوں، میز کے رومالوں (دمسک) عمدہ اور کھردرے تولیوں، کمبلوں، ترکی قالینوں، سوتی دریوں، شطرنجیوں یا بڑے قالینوں اور دوسوتی کے کام والے کپڑوں کا ذکر لازمی ہے۔

لباس :۔ لوگوں کا لباس اب تبدیل ہو گیا ہے۔ سر پر مختلف رنگوں کی دوہری پگڑیاں باندھنا سکھوں کا اپنی حکومت کے دوران ایک خاص وصف تھا اور ان کے ماتحت مسلمان بھی اپنے حکمرانوں کی نقل کرتے ہوئے اسی عمل کو دہراتے تھے۔ مسلمان اور ہندو دونوں بالائی لباس کے طور پر لمبا کوٹ پہنتے تھے۔ لوگوں میں مذہبی لحاظ سے امتیازی فرق اس طرح کیا جاتا تھا کہ ہندوؤں

کے کوٹ دائیں جانب سے کھلے ہوتے تھے اور مسلمانوں کے بائیں طرف سے۔ کوٹ کی ڈوریاں سینے پر باندھی جاتی تھیں۔ سکھ زیر جامہ کے لیے تنگ پائجامہ استعمال کرتے تھے لیکن مسلمانوں کا لباس ڈھیلا ہوتا تھا۔ زرعی پیشہ سے منسلک سکھ نہنگ اور سکھوں کے نادار طبقوں سے تعلق رکھنے والے افراد چھوٹے پائجامے پہنتے تھے، جو رانوں کے نصف حصہ تک ہوتے تھے۔ اس وقت ملک کے انتہائی قیمتی اور مہنگے ترین پارچات استعمال کیے جاتے تھے۔ مثلاً سونے اور چاندی کے کام والی بروکیڈ، نرم ریشم، مخمل اور شانذار ململ وغیرہ۔ ہندو اپنی کمر سے کپڑا باندھتے تھے جو ٹانگوں کے درمیان سے گزار کر پیچھے باندھ لیا جاتا تھا۔ مسلمان اپنی کمر سے کپڑا باندھتے تھے جو پاؤں کو چھوتا تھا۔ سکھ شرفاء گھٹی استعمال کرتے تھے۔ ایک منقش اور تنگ بنا ہوا سفید کپڑا جو سکھوں کے دور میں لاہور میں تیار کیا جاتا تھا لیکن اب اس کا رواج ختم ہو چکا ہے۔ دوشالا، ریشمی لنگیاں یا کھیسیاں جن پر مختلف رنگوں کے دمشقی طرز کے نقش و نگار اور طلائی دھاریاں ہوتی تھیں۔ کمخواب ایک قیمتی ریشمی کپڑا جس پر سونے کی تاروں سے کام کیا ہوتا تھا۔ رومال اور جامیوار ایک لمبا ٹکڑا جس پر چوڑی پٹیاں بنی ہوتی تھیں۔ شرفاء میں بہت پسند کیے جاتے تھے۔ نوجوان لاہوریوں میں (سکھوں کے سوا) ترکی ٹوپی یا دہلی کی گول ٹوپی یا بابو کیپ بہت زیادہ مقبول ہو رہی ہیں۔ انگریزی طرز کے سینہ پر سے کھلے ہوئے اور پیچھے نیچے کی طرف سے کٹے ہوئے کوٹ، ڈھیلے ڈھالے اور لمبے کوٹوں کی جگہ لے رہے ہیں جبکہ پائجاموں اور پتلونوں کا رواج یکسر تبدیل ہو گیا ہے۔ زیادہ عمر کے لوگوں کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ نئی نسل کو انگریزی طرز کی شرٹیں اور دیگر کپڑے پہننے سے باز رکھ سکیں جو پرانی سوچ کے حامل افراد کو سخت ناپسند ہیں۔ عربی ضرب المثل ہے کہ "**الناس علیٰ دین ملوکہم**"، یعنی لوگ اپنے حکمرانوں کی عادت پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اس ملک کے لوگوں پر پوری طرح منطبق ہے۔ جنہوں نے بہت سے معاشرتی نقطوں کے سلسلہ میں اپنے حکمرانوں کی عادات کو اپنا لیا ہے۔ یہ تبدیلی قطعی غیر محسوس طور پر واقع ہوئی ہے لیکن درحقیقت یہ اقوام کے قوانین کی پیروی میں ہے لیکن سماجی معاملات کے سلسلہ میں مزید کیا تبدیلیاں واقع ہوں گی، ان کے بارے میں، ہم بیس سال تک کچھ بھی توقع نہیں کر سکتے۔

تفریحات:۔ عشرت پسندی اور عیاشی کے لیے ناچ گانوں کی محفلوں کا انعقاد قدیم دور حکومت میں سکھوں کی پسندیدہ تفریح تھی اور کسی سردار کی دولت اور استعداد کا اس بات سے اندازہ لگایا جاتا تھا کہ وہ اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو کس نوعیت کی اور کس قدر دعوتیں دیتا ہے۔ غریب رعایا سے نچوڑی ہوئی ناجائز طریقے سے حاصل کی گئی دولت سے محروم ہونے کے بعد سکھوں میں سے بہت

سے پرانی عمر کے لوگ فرصت کا وقت گزارنے کے لیے نہیں بلکہ مجبوراً سکھا یا بھنگ سے حاصل کیا ہوا جوس پیتے ہیں۔ اس میں دوسرے اجزاء بھی شامل کیے جاتے ہیں۔ غالباً مشروب کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے استعمال کیے جاتے ہیں جبکہ دوسرے لوگ افیون پیتے ہیں۔

شطرنج و تاش :۔ شطرنج اور تاش بہت سے لوگ کھیلتے ہیں جبکہ نوجوان نسل نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ صبح شام کی سیر سے تفریح اور جسم کو توانا رکھنے کا دوہرا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ کو چند ایسے آدمی ملیں گے جو آپ کو دیکھ کر رک جائیں گے اور آپ کو حیرانی کے ساتھ دیکھتے ہوئے دریافت کریں گے "کیا معاملہ ہے ؟" اور کمال مہربانی سے آپ کو اپنا گھوڑا پیش کریں گے ۔ اگر اس وقت سوار ہوں تو آپ کو اس پر سوار کرنے کی ذمہ داری اٹھائیں گے اور آپ کو پیدل چلنے کی مصیبت سے بچالیں گے ۔ حقیقت یہ ہے کہ پیدل چلتے ہوئے گفتگو کرنے کی عادت سے ماضی میں ہمارے ملک کے لوگ بالکل ناآشنا تھے اور پرانے خیالات کے مطابق پیدل چلنا خلاف وقار سمجھا جاتا تھا۔ اس خیال سے حیران ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس ملک میں جہاں کافی دیر بعد تک بھی یا سکھوں کی ملوکیت کے دوران ایک سردار اپنی کمین گاہ سے بغیر کسی سواری کے باہر آنا خلاف تہذیب خیال کرتا تھا اور کوئی درباری عوام میں نظر نہیں آتا تھا جب تک کہ اس کے پیچھے بہت بڑا جلوس آکر گلیوں میں بھیڑ نہیں کر دیتا تھا۔

مطالعہ :۔ ہلکے ادب کا مطالعہ اور دوستوں کے درمیان آمد و رفت کی وجہ سے تعلیم یافتہ طبقوں میں تفریحات کا سامان پیدا ہو گیا ہے جبکہ غیر تعلیم یافتہ یا ان پڑھ لوگ دن بھر سو کر وقت گزارتے ہیں یا سگریٹ نوشی یا شراب خوری اور نشہ آور منشیات سے مدہوش ہو جاتے ہیں۔ نشہ آور اشیاء کی عادت ، ان پڑھ طبقہ میں بہت زیادہ پھیل گئی ہے۔

نشہ آور منشیات اور شراب کا استعمال :۔ کچھ لوگوں میں سونگھ کر نشہ آور دوائی استعمال کرنے کی بھی عادت ہے اور اچھی فطرت کے نشہ بازوں میں یہ بات ناشائستہ سمجھی جاتی ہے اگر سلام دعا کے بعد منعقد ہونے والی تقریب میں نہایت اخلاق سے ڈبیہ نہ پیش کی جائے جو ان کی مستقل ساتھی ہوتی ہے۔

کھیل :۔ کسرتی ورزشیں عام ہیں۔ مرد موگریوں اور ڈمبلوں سے ورزش کرتے ہیں اور ان کو وہ بڑی مہارت سے استعمال کرتے ہیں۔ وہ ڈنڈ بھی پیلتے ہیں۔ یعنی ہاتھ زمین پر ٹکا کر نیچے جھکتے ہیں اور تقریباً زمین کو چھو لیتے ہیں۔ بیرونی کھیلوں میں جٹوں (جاٹوں) میں بھاری وزن اٹھانا اور دور پھینکنا ایک مقبول عام تفریح ہے۔ جبکہ بڑے بڑے کھلے میدانوں میں کھلاڑی جمع ہو کر ایک کھیل کھیلتے

ہیں جس کو پٹ ۔ کوڈی (کبڈی) کہا جاتا ہے ۔ کھلاڑی دو دائرے بنا لیتے ہیں اور ایک آدمی دوسرے دائرے سے باہر نکل کر مخالف دائرے کے قریب آتا ہے اور دوسرے دائرے کے دو آدمی اس کا تعاقب کرتے ہیں ۔ وہ کبھی آگے اور کبھی پیچھے بھاگتا ہے اور تعاقب کرنے والوں کو دھوکہ دیتا ہے اور آخر کامیابی سے اپنے دائرے میں آ جاتا ہے اور اس کا تعاقب کرنے والے اسے جانے دیتے ہیں ۔ اگر اس کے مخالف اسے پکڑ لیں تو دوسری پارٹی کھیل جیت جاتی ہے ۔ دوڑ کے دوران تعاقب کرنے والا آدمی اپنے مخالف کے سینے پر ہاتھ مارتا ہے اور وہ پکڑے جانے سے بچنے کے لیے ان کو دھوکہ دیتا ہے۔

پتنگیں :۔ اچھلنا کودنا، لٹو چلانا اور چھوٹی گولیاں (قینچے) بائیں انگلی سے زور کے ساتھ چھوڑنا (9)، اور پتنگیں اڑانا، لڑکوں کی پسندیدہ تفریحات ہیں ۔ پتنگیں عام طور پر بیضوی شکل کی ہوتی ہیں اور ان کو نہایت ہلکے کاغذ سے بنایا جاتا ہے اور ان کے ساتھ بہت لمبی ڈور استعمال کی جاتی ہے ۔ ڈور کو تیز بنانے کے لیے اس پر لپے ہوئے شیشہ سے تیار کردہ پلستر چڑھا دیا جاتا ہے، اسے مانجھا کہا جاتا ہے ۔ پتنگ کو ہوا کے رخ اڑایا جاتا ہے اور اڑا کر بہت اونچا لے جایا جاتا ہے ۔ کلائی کے اشارہ سے بڑی مہارت کے ساتھ پتنگ کو اوپر اور نیچے کیا جاتا ہے اور مخالف کی پتنگ کے قریب پہنچا کر پیچ لڑایا جاتا ہے ۔ دونوں پتنگوں کی ڈوریں مل جاتی ہیں ۔ اگر مخالف کی پتنگ کٹ جائے تو کھیل ختم ہو جاتا ہے اور آدمی جیت جاتا ہے ۔ اگر نشانہ چوک جائے تو مخالف پارٹی کو موقع مل جاتا ہے اور وہ اس سے فائدہ اٹھا کر اپنی پتنگ کا رخ حملہ آور کی پتنگ کی طرف کر دیتی ہے اور اس کی ڈور کاٹ دیتی ہے ۔ تب دوسری پارٹی ہار جاتی ہے ۔ اگر ہوا کا رخ موافق ہو تو ماہر کھلاڑی بڑی مہارت سے پتنگ پر قابو پا لیتے ہیں ۔ لہٰذا وہ پتنگ کے ٹُنکے کو نہایت تیزی سے نیچے کی طرف لے آتے ہیں کہ وہ زمین کو چھو لیتا ہے اور پھر بڑی سرعت سے اونچا کر کے انتہائی بلندی پر لے جاتے ہیں ۔ وہ کلائی یا صرف شہادت کی انگلی کی مدد سے اس کو آگے پیچھے کرتے ہیں اور کھیل کے تقاضے کے مطابق حملوں سے بچنے کے لیے مہارت استعمال کرتے ہیں ۔

چاندنی راتوں میں جب ہوا ٹھنڈی اور خوشگوار ہوتی ہے تو نوجوان اور لڑکے " قیدی کا پاؤں " جیسا کھیل کھیلتے ہیں ۔

کرکٹ :۔ کرکٹ کو اب سکولوں میں بھی پڑھایا جاتا ہے جہاں رکاوٹوں کو عبور کرنے اور کھمبوں پر سے کودنے اور جمناسٹک کی دیگر مشقوں کے بارے میں خاص نگرانی کے تحت بتایا جاتا ہے ۔ اس سلسلہ میں انتہائی ماہر اشخاص کی خدمات سے استفادہ کیا جاتا ہے اور لڑکوں کو ان مشقوں کے بارے

میں بتایا جاتا ہے۔

کشتی ، پہلوانی :۔ نوجوان لاہوریوں میں پہلوانی ایک پسندیدہ تفریح ہے۔ انگریزی طرز کے کھیل کے برخلاف ، کمر کے اوپر والے حصوں پر حملہ نہیں کیا جاتا لیکن دونوں مخالف پہلوان بڑی آزادی سے ایک ہی وقت میں زور آزمائی کرتے ہیں۔ ایک پہلوان داؤ پیچ کے ذریعے دوسرے کے حملوں کو برداشت کرتا ہے اور اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور اسے نیچے گرا لیتا ہے تاکہ اس کی پشت زمین کے ساتھ لگ جائے اور اگر وہ جلد ہی اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ جیت جاتا ہے۔ یہ پہلوانی کا کھیل ایک کھلے میدان میں لوگوں کے بہت بڑے ہجوم کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ جب جیت ہو جاتی ہے تو ہجوم میں سے نہایت جوش و خروش سے آنے والی واہ واہ کی آوازوں اور تعریفی نعروں سے فضاء گونج اٹھتی ہے۔ فاتح کو اس کی پارٹی کے افراد کاندھوں پر اٹھا لیتے ہیں اور اس کے پیچھے موسیقی کا بینڈ چلا آتا ہے۔ وہاں جمع ہجوم کے چاروں طرف گھوم کر پہلوان دونوں ہاتھ اٹھا کر تماشائیوں کو سلام کرتا ہے اور وہ اسے اس کی بہادری کے اعتراف میں پھولوں کے ہار پہناتے ہیں اور اسے اسی مقصد کے لیے اکٹھی کی گئی رقم پیش کرتے ہیں۔ بڑودا کا مہاراجہ گائیکواڑ اس کھیل کا عظیم سرپرست تھا۔ بہت سے لوگ لاہور سے جا کر اس ریاست میں آباد ہو گئے اور اچھی خاصی تنخواہ پر پہلوان کے طور پر ملازم ہو گئے۔

کھلونے :۔ چھوٹے بچوں کے کھیلنے کے لیے مٹی اور لکڑی کے کھلونے عام ہیں لیکن یہ کھردرے اور بھدے ہوتے ہیں اور یورپ سے درآمد کردہ کھلونوں اور دہلی اور لکھنؤ میں بنائے جانے والے کھلونوں کی طرح خوبصورت اور اصلی نہیں معلوم ہوتے۔ لڑکیاں گڑیوں سے کھیل کر دل بہلاتی ہیں جبکہ فرانسیسی اور ولائتی گڑیوں کی مانند ان کی آنکھیں نیلی نہیں ہوتیں اور نہ ہی جلد ملائم ہوتی ہے اور نہ ہی اونی بال ہوتے ہیں لیکن وہ انہی بھدی گڑیوں سے کھیل کر گزارہ کر لیتی ہیں۔ گڑیوں کے ساتھ ایک پراسراریت منسلک ہے اور اپنے ننھے منے مالکوں کے ہاتھ میں وہ بہت زیادہ دلچسپی کی حامل ہوتی ہیں اور ان سے حقیقی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ ان میں صنف نازک کے بچوں کی مخصوص جبلت کی جھلک نظر آتی ہے۔ جبکہ پہلے زمانہ کے ڈراموں اور نظموں میں ان کے ذکر سے بلا شک و شبہ ان کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

جانوروں کی لڑائی :۔ جانوروں کی لڑائی ، ایک ایسا تماشہ ہے جس میں ہمارے آباؤ اجداد آزادانہ طور پر ملوث تھے اور لوگ اب بھی اپنی تفریح طبع کے لیے ان تماشوں کا انعقاد کرتے ہیں۔ مرغوں کی لڑائی ، بٹیروں کی لڑائی ، بلبلوں کی لڑائی اور مینڈھوں کی لڑائی شہر یا اس کے قرب و جوار میں واقع

کھلے میدانوں میں کرائی جاتی ہے اور اس موقع پر لوگوں کے بڑے بڑے ہجوم اکٹھے ہوتے ہیں۔ لوگ اس نظارہ سے بڑی خوشی حاصل کرتے ہیں اور ساری کارروائی کو نہایت ذوق و شوق سے دیکھتے ہیں اور جب مخالف پرندوں یا جانوروں میں لڑائی شروع ہوتی ہے تو خوب جوش و خروش کا اظہار ہوتا ہے اور جب کھیل ختم ہو جاتا ہے تو یہی جوش و خروش تعریف و توصیف میں بدل جاتا ہے اور لوگ اتنی زور سے نعرے بازی کرتے اور قہقہے لگاتے اور شور ڈال کر واہ واہ بھئی واہ! کرتے ہیں کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔

قمار بازی :۔ لوگوں کے مخصوص طبقوں میں بشمول متمول طبقہ کے لوگوں میں جواء بازی مختلف شکلوں میں بہت مقبول ہے۔ بعض اوقات پانسہ یا کوڑیوں کی صورت میں اور بعض اوقات تاش کے پتوں کے ساتھ یا زبانی طور پر شرطیں لگائی جاتی ہیں۔

میدانی شکار :۔ سکھوں کے قدیم دور حکومت میں سکھ سردار میدانی شکار کے لیے شکرا بازی کو بہت زیادہ اہم سمجھتے تھے۔ ہر نواب یا امیر کے پاس خادموں کی فوج ہوتی تھی۔ وہ تربیت یافتہ شکروں یا بازوں کو اپنے بازوؤں یا کلائیوں پر بٹھائے ہوتے تھے۔ شکار کی یہ رسم ابھی تک قائم ہے اور جو لوگ اس کی مدد سے میدانوں وغیرہ میں شکار کرتے ہیں ان کے لیے دلچسپی اور تفریح کا باعث ہے۔ ہرن کے پیچھے بھاگنے یا جنگلی سور کو پکڑ کر لانے یا خرگوش وغیرہ کو اٹھا لانے کے لیے شکاری کتے رکھے جاتے ہیں۔

لوک گیت :۔ نوجوان، گلیوں میں داستانیں اور شاعری یا ایسے گانے وغیرہ سناتے ہیں جن میں محبت اور نفرت، مشہور آدمیوں کی جنگی داستانیں، بزرگان دین کے اقوال یا بادشاہوں اور دیگر مشہور آدمیوں کی زندگیوں کے کارنامے شامل ہوتے ہیں۔ جن لوک گیتوں یا داستانوں کو سنایا جاتا ہے ان میں ضلع منٹگمری کے رہنے والے مرزا صاحباں کی عشقیہ داستان اور ضلع جھنگ میں وارث شاہ کی ہیر ہے جس میں رانجھے اور ہیر کی داستان شامل ہے۔ اس کے علاوہ سسی اور پنوں ہے۔

عوامی تفریحات :۔ یہاں پر انگریزوں کی طرح کسی خاص عوامی تفریح وغیرہ کا انعقاد نہیں کیا جاتا اور نہ ہی اس وقت موجود ہے۔ یہاں پر عوامی نمائشیں اور شو نہیں ہیں اور نہ ہی عوامی تھیٹر، موسیقی کے طائفے، فلم یا گیلریاں ہیں اور نہ ہی کسی دوڑ وغیرہ کا انعقاد کیا جاتا ہے اور جو عوامی تہوار ہیں وہ زیادہ تر مذہبی نوعیت کے ہیں اور لوگ ان میں باقاعدگی سے شریک ہوتے ہیں لیکن میلے جو اپنے مخصوص موسموں میں مقرر شدہ مقامات پر منعقد ہوتے ہیں انتہائی زرق برق نظارہ پیش کرتے ہیں۔

میلے :- ان میں مسلمان اور ہندو دونوں بھڑکیلے اور رنگ برنگے لباس پہن کر جمع ہوتے ہیں اور خوب ہنسی مذاق کیا جاتا ہے۔ لوگ خوش و خرم، اعتدال پسند اور منظم ہوتے ہیں اور اس وقت اپنے تمام اختلافات کو پس پشت ڈال کر دلی طور پر خوشیاں مناتے ہیں۔ وہاں پر مٹھائیوں، بچوں کے کھلونوں، پیتل اور تانبے کے برتنوں، تجارتی اشیاء، پھلوں اور بہت سی انواع و اقسام کی کھانے پینے کی اشیاء کی دکانیں ہوتی ہیں۔ وہاں پر جھولے ہوتے ہیں۔ مداری، کرتب باز، اچھلنے کودنے والے، اداکار، گویے، رقاص اور بڑے بڑے جھولے ہوتے ہیں۔ وہ لوگوں کے ہجوم کو اپنے کرتبوں اور ادائیگی سے محظوظ کرتے ہیں اور ہر مرتبہ لوگ ان کی مہارت کے صلے میں کچھ رقم بھی انعام کے طور پر دے جاتے ہیں۔ بندر اور ریچھ نچانے والے، سانپ کا تماشہ دکھانے والے اور دیگر کرتب دکھانے والے خانہ بدوش اپنی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جبکہ سارنگی نواز، بربط نواز، بانسری نواز، طبلہ نواز اور گٹار اور موسیقی کے دیگر آلات پر اپنے فن کا مظاہرہ کر کے لوگوں کو بہت زیادہ محظوظ کرتے ہیں۔ یہ سارے کا سارا نظارہ، زندگی اور مسرت سے بھرپور ہوتا ہے لیکن اس قسم کے میلوں سے کوئی اچھا سبق حاصل نہیں کیا جاتا۔ بالآخر یہ ہوا میں ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔

لاہور اور اس کے قرب و جوار میں منعقد ہونے والے اہم میلے مندرجہ ذیل ہیں:-

میلہ چراغاں :- جن میلوں میں لوگ سب سے زیادہ رنگ رلیاں مناتے اور زیادہ تعداد میں شریک ہوتے ہیں ان میں سے صفائی اور خوبصورت مناظر کے لحاظ سے سب سے اہم اور نمایاں چراغوں کا میلہ ہے جو مارچ کے آخری ہفتہ اور اگلے اتوار کو شالا مار میں منعقد ہوتا ہے۔ دراصل یہ میلہ اپریل کے مہینہ میں صرف ایک دن (اتوار) کے لیے منعقد ہوتا تھا لیکن اس وقت کو بڑا قلیل سمجھا گیا اور موسم بہار کے آغاز کے لیے زیادہ وقت کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ اس کے لیے موجودہ انتظامات کیے گئے۔ اتوار کو رات ہوتے ہی شالا مار باغ سے تقریباً چوتھائی میل کے فاصلہ پر باغبانپورہ میں واقع حضرت مادھو لال حسینؒ کے مزار کے احاطہ میں چراغ روشن کر دیے جاتے ہیں۔ دراصل اس میلے کا مقصد مزار پر چراغ جلانا ہے۔ لوگ اس صوفی بزرگ کی خانقاہ پر رات بھر ٹھہرتے تھے اور دوسرے دن تفریح کے لیے شالا مار باغ میں جایا کرتے تھے۔ اب چراغ تو خانقاہ پر روشن کیے جاتے ہیں اور میلہ شالا مار باغ کے اندر منعقد کیا جاتا ہے۔ اس کے اصل نام کی وجہ سے یہ "چراغوں کا میلہ" کے نام سے مشہور ہے۔ میلے کے دنوں میں باغ کا منظر نہایت دلفریب اور حسین ہوتا ہے۔ حوض اور تالاب پانی سے بھر دیے جاتے ہیں۔ فوارے چلائے جاتے ہیں۔ موسم بہار کی وجہ سے اس کے مناظر قابل دید ہوتے ہیں۔ اس منظر کی خوبصورتی میں سنگ مرمر کی آبشار

سے پانی کا دلکش بہاؤ، درختوں کا شاداب اور گہرا سبز نظارہ اور باغ کا حسن اور اس میں شامل لوگوں کے رنگ برنگے زرق برق لباس، دوستوں کی آتی اور جاتی ٹولیاں، سبزے پر بیٹھے ساتھیوں کے کچھ کھاتے، کچھ پیتے اور کچھ موسیقی سنتے یا مختلف کرتب دیکھتے ہوئے لوگ مزید اضافہ کرتے ہیں اور شاہجہاں کا یہ شاداب باغ، پریوں کا دیس معلوم ہوتا ہے اور اس میں اتنی دلکشی اور خوبصورتی پیدا ہو جاتی ہے جو صرف دیکھی جا سکتی ہے، اسے بیان کرنا محال ہے۔ لاہور کے مضافاتی اضلاع، امرتسر، گوجرانوالہ، فیروز پور اور ملتان سے لوگوں کی بڑی تعداد اس میلے میں شریک ہوتی ہے اور گھوڑوں کی نمائش کا انعقاد ہوتا ہے۔ اس میں بہترین نسل کی گھوڑی اور بچھیرے پر حکومت کی جانب سے انعامات دیے جاتے ہیں۔ تخمینہ لگایا ہے کہ میلے میں تقریباً 50,000 لوگ شریک ہوتے ہیں۔

بسنت:۔ بسنت کا میلہ جنوری میں شالامار باغ کے نزدیک حضرت مادھو لال حسینؒ کے مقبرہ کے احاطہ میں منعقد ہوتا ہے۔ اس میں شہر اور مضافاتی دیہات کے تقریباً دس ہزار افراد شریک ہوتے ہیں۔ مسلمان حضرت مادھو لال حسینؒ کی خانقاہ پر خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے حاضر ہوتے ہیں اور ہندو اس کے نزدیک حقیقت رائے کی سمادھ کی پوجا کرنے کے لیے آتے ہیں لیکن یہ میلہ بذات خود دونوں مذہبوں کے لوگوں کا امتزاج ہوتا ہے۔ اس میلہ کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں بڑے تزک و احتشام سے منایا جاتا تھا جب یہاں آئے ہوئے سبھی لوگ زرد لباس میں ملبوس ہوتے تھے اور مہاراجہ اور اس کے درباری بھی خود یہی لباس پہنے ہوتے تھے۔ شہر سے شالامار باغ تک کی سڑک کے دونوں جانب کھیتوں میں سرسوں کاشت کی ہوتی تھی اور اس کے زرد پھول میلوں تک لہراتے ہوئے نظر آتے تھے۔ جب اس منظر میں سرداروں اور فوج کے دوسرے سپاہیوں کے لباس کا زرد رنگ بھی شامل ہو جاتا تھا تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ لاہور سے شالامار باغ تک کا پورا منظر نہایت خوبصورت اور دلکش ہوتا تھا (10)۔

عید کے تہوار:۔ عید الفطر کا تہوار جو رمضان المبارک کے بعد آتا ہے اور حج کے بعد عید الاضحیٰ کا تہوار، دونوں میں خالصتاً مسلمان اکٹھے ہوتے ہیں اور یہ میلے موچی دروازے کے باہر حضرت شاہ ابو المعالیؒ کے مزار پر منعقد ہوتے ہیں۔

قدموں کا میلہ:۔ "قدموں کا میلہ" کے نام سے مشہور میلہ فروری میں نئے چاند کے بعد پہلے پیر کو انار کلی میں واقع حضرت سخی سرورؒ کے مزار پر منعقد ہوتا ہے۔ ڈھول بجانے والے لوگوں کا گروہ جنہیں شیخ کہا جاتا ہے، نہایت زور شور سے ڈھول بجاتے اور رقص کرتے ہیں۔ جن صوفی بزرگ کی یاد میں یہ میلہ منعقد ہوتا ہے ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپ چھوٹے بچوں کے سرپرست تھے

اور جنہیں اس کے نتیجہ میں یہاں پیش کر دیا جاتا تھا۔ یہاں تقریباً 7,000 لوگ جمع ہوتے ہیں اور میلہ چند گھنٹوں تک رہتا ہے۔

چھڑیوں کا میلہ :۔ " چھڑیوں کا میلہ " بیرون مستی دروازہ، گرمیوں کے موسم میں منعقد ہوتا ہے۔ یہ میلہ ایک مسلمان صوفی بزرگ حضرت شاہ مدارؒ کے احترام میں منایا جاتا ہے اور یہ پورے ہندوستان میں مشہور ہیں۔ اس میلے میں بانس کو سیدھا کھڑا کرنے کے ماہر لوگ اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ بیشمار لمبے بانسوں کے سروں کو باندھ کر ایک بہت طویل اور حیرت انگیز لمبائی کا حامل بانس بنا لیا جاتا ہے۔ اس شکل میں آنے کے بعد ماہر شخص بانس کے ساتھ کرتب پیش کرتا ہے۔ اب وہ اس کے نچلے سرے کو اپنے دائیں یا بائیں ہاتھ کی انگلی کے سرے پر اور پھر ہاتھ کی ہتھیلی اور پھر دوبارہ اپنے نچلے جبڑے کے سامنے والے دانتوں پر جما لیتا ہے اور اسے نیچے نہیں گرنے دیتا۔

شاہدرہ کا میلہ :۔ شاہدرہ کا میلہ جو پار کا میلہ بھی کہلاتا ہے۔ دریائے راوی کے پار، شہنشاہ جہانگیر کی برسی کے موقع پر منعقد ہوتا ہے۔ اس کا مقبرہ وہیں پر واقع ہے۔ یہ میلہ مقبرہ اور سرائے جہانگیر کے احاطہ میں منعقد ہوتا ہے اور اس میں تقریباً دس ہزار مختلف طبقوں کے لوگ شریک ہوتے ہیں۔ یہ موسم گرما میں منعقد ہوتا ہے اور ایک دن تک رہتا ہے۔

تعزیوں کا میلہ :۔ تعزیوں کا میلہ محرم کی 10 تاریخ کو منعقد ہوتا ہے جب حضور اکرمؐ کے داماد اور اسلام کے چوتھے خلیفہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے صاحبزادوں حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کے مقبروں کو، کربلا کے خونیں واقعات کی یاد میں بنا کر سرعام پیش کیا جاتا ہے۔ لاہور میں محرم کا تہوار نہایت شان و شوکت اور غیر معمولی جوش و خروش سے منایا جاتا ہے اور اس کے ساتھ چند ایسی خصوصیات اور وصف وابستہ ہیں جن کو دہلی اور لکھنؤ جیسے بڑے شہروں میں تلاش کرنا بے سود ہو گا جو محرم کا تہوار منانے میں ہندوستان بھر میں بہت مشہور و معروف ہیں۔ ماتمی مجالس بیشمار ہیں، جہاں مرثیے پڑھے جاتے ہیں۔ کربلا میں پیش آنے والے غمگین واقعات کو بیان کیا جاتا ہے اور قصائد کو نہایت جوش و خروش سے پڑھا جاتا ہے۔ سبیل (عموماً چھبیل کہا جاتا ہے) یا راہگیروں میں، پانی یا شربت تقسیم کرنے کے لیے لگائی گئی دکانوں کو گلی محلوں میں قائم کیا جاتا ہے اور ان کو شیشیوں، تصویروں، ہاروں اور پھولوں کے گلدستوں اور قیمتی کپڑوں سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ رات کو ان میں بڑی فراخدلی سے مختلف رنگوں کے چراغوں اور قندیلوں کو روشن کیا جاتا ہے اور ان کے مالکان سجاوٹ اور تزئین و آرائش میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہندوستان کے دیگر شہروں میں اسی طرح کی سبیلیں خوبصورتی اور شان و شوکت میں

لاہور کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

مہندی :۔ محرم کی 7 تاریخ کو مہندی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ اس رسم میں خواتین کے پہننے والے خوبصورت کپڑوں، قیمتی چادروں اور شالوں وغیرہ کو دکھایا جاتا ہے۔ انہیں اونٹوں اور گھوڑوں کی پشت پر رکھ کے گلیوں میں ایک جلوس کی صورت میں لے جایا جاتا ہے اور ان کے پیچھے ماتمین کا ہجوم ہوتا ہے جو مرثیے پڑھتا ہے اور موسیقی کا بینڈ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد ماتمی دھن بجاتا ہے (11)۔ محرم کی دس تاریخ شب شہادت کہلاتی ہے اور تعزیوں کو بڑی بڑی گلیوں میں پھرایا جاتا ہے۔ ہاتھوں میں روشن مشعلیں اور پنجے اٹھائے ہوتے ہیں۔ جلوس، مرثیہ خوانوں، موسیقی کے بینڈوں، بینتی (ایک مشعل جس کے دونوں سرے جلائے جاتے ہیں اور جب اس کو گھمایا جاتا ہے تو آگ کے دو چکر بن جاتے ہیں) چلانے والوں، بھالوں اور تلواروں وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے۔

دلدل :۔ اگلے روز صبح سویرے دلدل (حضرت امام حسینؓ کے گھوڑے کی نقل) جسے ذوالجناح بھی کہا جاتا ہے اسے بڑے تزک و احتشام سے لایا جاتا ہے۔ کربلا جاتے ہوئے اس نے جن گلیوں میں سے گزرنا ہوتا ہے ان میں اس قدر لوگوں کی بھیڑ ہو جاتی ہے کہ کوئی آدمی ان میں سے راستہ حاصل نہیں کر سکتا۔ دوپہر کے وقت کربلا یا جائے مدفون کو جانے کے لیے تعزیے دوبارہ گلیوں میں نمودار ہوتے ہیں۔ ہر ایک کے پیچھے ڈھول بجانے والے، موسیقی کے بینڈ اور مرثیہ پڑھنے اور گانے والوں کی ٹولیاں ہوتی ہیں اور لوگوں کا بہت بڑا جلوس ہوتا ہے۔ شہر کے تمام تعزیوں کو لوہاری دروازہ سے گزرنا ہوتا ہے اور وہ حضرت داتا گنج بخش کے مزار مبارک کے راستے سے کربلا جاتے ہیں۔ راستے میں انار کلی اور میاں میر کے تعزیے ان کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ لوہاری دروازہ سے کربلا تک لوگوں کی بے پناہ بھیڑ ہوتی ہے اور یہ تعزیے بڑی شان و شوکت سے اپنا سفر جاری رکھتے ہیں اور جب رات ہو جاتی ہے تو تہوار ختم ہو جاتا ہے۔

تعزیے :۔ لاہور کے تعزیے اپنی خوبصورتی اور شان و شوکت کے معاملہ میں بہت مشہور ہیں۔ ان کو لکڑی سے بنایا جاتا ہے اور ان کو تصاویر، مختلف رنگوں کے شیشوں اور دیگر آرائشوں یا بانسوں کی چھال جس کو بیرونی جانب سے منقش کاغذ یا رنگین کاغذ سے سجایا جاتا ہے، آراستہ کیا جاتا ہے۔ ان کو کئی منزلوں میں تقسیم کیا جاتا تھا لیکن عام طور پر تین سے زیادہ منزلیں نہیں بنائی جاتیں۔ محرم کا تہوار سکھوں کے دور میں بھی منایا جاتا تھا۔ اور بعد میں مہاراجہ شیر سنگھ کے دور میں بھی ہر سال تعزیہ نکالا جاتا تھا۔ یہ امر قابل غور ہے کہ قیمتی تعزیوں کو سال ہا سال تک محفوظ رکھا جاتا تھا لیکن معمولی تعزیوں کو توڑ کر کربلا کی طرز پر پرانی راوی کے کنارے دفن کر دیا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ تہوار نیا

نہیں ہے اور اس کو سکھ دور میں کم یا زیادہ مرتبہ منایا جاتا رہا ہے لیکن برطانوی دور میں اس کی شان و شوکت اور عظمت میں زیادہ اضافہ ہوا ہے۔

تعزیہ کو عام لوگ مناتے ہیں اور ہر تعزیہ کو اس کے بنانے والے کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ مثلاً تعزیہ دریائی باف یا دریائی بننے والے، موچی، رنگریز، قصائی وغیرہ وغیرہ۔

دسہرا کا میلہ:۔ دسہرا کا میلہ اکتوبر کے مہینے میں قلعہ کے شمال میں واقع پریڈ گراؤنڈ میں منعقد ہوتا ہے۔ یہ آٹھ دن تک رہتا ہے اور اس کو ہندوؤں کی دیومالائی داستانوں میں بیان کیے گئے عظیم سیاسی اہمیت کے ایک واقعہ کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ ویلمکی نے سنسکرت میں اپنی مشہور بیانی نظم جسے رامائن کہا جاتا ہے اور تلسی داس نے اپنی ہندی نظم میں اسے لازوال بنا دیا ہے۔ یہ ایک جنگ کا قصہ ہے جو اجودھیا کے راجہ رام چندر نے وسراوا کے بیٹے اور سیلون کے شہزادے راون کے خلاف کی، جو رام کی بیوی سیتا کو اٹھا کر لے گیا تھا۔ راجہ رام چندر کے پتلے کو بڑی شان و شوکت کے ساتھ مقررہ جگہ لایا جاتا ہے جہاں راون کا بت جو ایک جن معلوم ہوتا ہے اسے لوگوں کے ایک بہت بڑے ہجوم کے سامنے جلایا جاتا ہے اور اس میں سے ہوائیوں اور آتش بازی کے چلنے کا بہت زیادہ شور سنائی دیتا ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ اس موقع پر ایک بہت بڑا دربار منعقد کرتا تھا۔ اس کے امراء اسے نذر پیش کرتے اور وہ اس کے جواب میں انہیں قیمتی خلعتوں سے نوازتا۔ سکھ دارالحکومت میں بہت زیادہ پُرمسرت تقریبات منعقد ہوتی تھیں اور کئی دنوں تک خوشیوں اور جشن کا سا سماں رہتا تھا۔ حتیٰ کہ مہاراجہ بھی ان تقریبات میں حد سے بڑھ جاتا تھا۔

بھدر کالی:۔ بھدر کالی کا میلہ لاہور سے سات میل کے فاصلے پر موضع نیاز بیگ میں جون کے مہینے میں دیوی کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ یہ محض ایک مذہبی اجتماع ہوتا ہے اور تقریباً 30,000 لوگ لاہور، امرتسر اور قرب و جوار کے دیہات سے یہاں اکٹھے ہوتے ہیں۔ اس دن سخت گرمی ہوتی ہے لیکن زائرین کو ایک تالاب، ایک سایہ دار باغ اور دکانوں اور عمارتوں کی چند قطاروں سے کچھ آرام ملتا ہے۔

لاہور کی گلیاں:۔ لاہور کی گلیاں تنگ اور ٹیڑھی میڑھی ہیں۔ مکانات عام طور پر تین یا چار یا کئی منزلوں پر محیط ہوتے ہیں۔ عام طور پر پہلی منزل میں دکان ہوتی ہے۔ دوسری منزل پر مکان کی پیشانی سے باہر نکلی ہوئی اور مور کی شکل کے ستونوں پر ایستادہ رنگین اور خوبصورت چوب کاری میں کندہ نقش و نگار والی کھڑکیاں یا چھجے ہوتے ہیں۔ مکانوں کی پیشانی اور دکانوں کے اوپر سائبان کو عموماً بڑی فراخدلی سے نقش و نگار اور تزئین و آرائش سے مزین کیا جاتا ہے لیکن جدید عمارتوں کی

طرز تعمیر یکسر تبدیل ہو چکی ہے اور یہ اب زیادہ تر ہوادار اور اچھے ذوق کے مطابق تعمیر کی جاتی ہیں۔

حفظان صحت :۔ بڑی بڑی گلیوں میں پائپوں کے ذریعے صاف پانی مہیا کرنے کے منصوبہ کو متعارف کروانے سے شہر کے حفظان صحت میں بہت ترقی ہوئی ہے جبکہ حفظان صحت کے منظور شدہ اصولوں پر مبنی سیوریج اور نکاسی آب کے نظام سے اس کے حفظان صحت کی استعداد کار میں کہیں زیادہ اضافہ ہوا ہے۔

جدید عمارات اور ادارے

ذیل میں لاہور کی اہم جدید عمارات اور اداروں کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے :۔

عجائب گھر اور تکنیکی ادارہ :۔ نئے عجائب گھر اور ٹیکنیکل انسٹیٹیوٹ کو صوبے کی صنعتوں اور فنون کی ترقی و ترویج کے لیے چلائی گئی مہم سے برآمد ہونے والا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔ اس کو 1864ء میں پنجاب کی پہلی نمائش سے شروع کیا گیا تھا۔ موجودہ عجائب گھر کو اس وقت تعمیر کیا تھا اور اگرچہ اس کو عارضی طور پر بنایا گیا تھا اور اس میں ایسی تصاویر رکھی گئی تھیں جن سے صوبے اور قرب و جوار کی زرعی اور محکمہ جنگلات کی مصنوعات، کاریگروں کی نہایت مہارت سے بنائی گئی اشیاء اور صنعتوں کی دستکاریوں وغیرہ کی نشاندہی کی گئی ہوتی تھی اور ان کے بارے میں اس کے پہلے مہتمم مسٹر بی، ایچ۔ بیڈن، پوویل۔ سی، آئی، ای کی مشہور و معروف دو کتابوں "پنجاب کی مصنوعات" اور "پنجاب کی دستکاریاں" میں بھی بتایا گیا ہے۔

ان اشیاء میں علاقے کی نادر اشیاء کے اعلیٰ نمونے بھی شامل کیے گئے۔ ان میں سب سے پہلے یوسف زئی وادی کے زیادہ تعداد میں ملنے والے تاریخی اہمیت اور فنکارانہ خصوصیت کے اعلیٰ نمونوں پر مشتمل مہاتما بدھ کے مجسموں کو شامل کیا گیا۔ حالیہ دور میں کی جانے والی تحقیق اور چھان بین سے، اسلامی، جینی اور برہمنی کھنڈرات اور آثار کا پتہ چلا ہے جبکہ فنون، دستکاریوں اور زرعی مصنوعات کے ذخیرے میں بہت زیادہ اضافہ کیا گیا ہے۔

جیسے جیسے عجائب گھر کی اشیاء میں اضافہ کیا گیا ہے ویسے ہی نہایت تیزی سے اس کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہوا ہے اور ہر روز اوسطاً (تقریباً 600) افراد یہاں آتے ہیں۔ اس سے اس کے ساتھ وابستہ لوگوں کی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔

گذشتہ چند سال کے دوران لوگوں کی طرف سے جدید تکنیکی سائنس کی تعلیم دینے کے

بارے میں پرزور اصرار کیا جاتا رہا ہے۔ لہٰذا ملکہ عالیہ کی تاجپوشی کے پچاس سالانہ جشن کے موقع پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس مقصد کے لیے جمع کی گئی 1,62,000 روپے کی رقم کو ایک عمارت (جو عجائب گھر اور تکنیکی ادارے پر مشتمل ہو) کی تعمیر کے لیے وقف کر دیا جائے۔

نئی عمارت میں ایک ٹیکنیکل لیکچرہال، کمرہ ہائے جماعت اور 27,850 فٹ کے رقبہ پر محیط ایک عجائب گھر شامل ہے۔ بڑے رقبہ پر لوہے کے ستونوں پر چھت ڈالی گئی ہے اور اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ اس میں روشنی زیادہ سے زیادہ آسکے اور اشیاء کے ذخیرے کی ترتیب کے لیے گنجائش بھی پیدا کی گئی ہے۔

نئی عمارت کی تکمیل کے بعد پرانے عجائب گھر کو میونسپل کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے گا تاکہ اس کو ایک عوامی مارکیٹ بنا دیا جائے۔ اس کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کی جا رہی ہے۔ نئے عجائب گھر کی تعمیر میں بہت زیادہ دلچسپی لی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عزت مآب آنجہانی شہزادہ وکٹر نے 3 فروری 1890ء کو اس کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ زائرین کی معلومات کے لیے یہ بات قابل غور ہے کہ عجائب گھر میں ایک دکان کھولی گئی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے لوگوں کو پنجاب کی دستکاریوں کے عمدہ نمونے اور دیگر نادر اشیاء فروخت کی جائیں گی۔

میو سکول آف آرٹ : میو سکول آف آرٹ عجائب گھر اور ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کے ساتھ ملحقہ ہے۔ دراصل یہ بھی اسی عمارت کا ایک حصہ ہے۔ اس پوری عمارت کا نقشہ سکول کے پرنسپل نے بھائی رام سنگھ کے تعاون سے رائے بہادر گنگا رام۔ سی، ای ایگزیکٹو انجینئر لاہور کی نگرانی میں تیار کرایا تھا۔

اس ادارے کو دراصل 1872-1869ء میں وائسرائے اور گورنر جنرل آنجہانی لارڈ میو کے لیے جمع کیے گئے چندہ سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کو 1875ء میں اس مقصد کے تحت قائم کیا گیا تھا کہ اس میں ڈیزائن کی تعلیم خاص طور پر پنجاب کے دیسی فنون کی ترقی و ترویج کے لیے تعلیم دی جائے گی۔ اس کے پہلے پرنسپل مسٹر جے، لاک وڈ کپلنگ۔ سی، آئی، ای بنائے گئے۔ اس کے ذریعہ تعلیم کو یورپی سکولوں کے مطابق بنایا گیا ہے، سوائے اس کے کہ فن تعمیر اور آرائش وغیرہ مشرقی طرز کے مطابق ہیں اور ہندوستانی ڈیزائن کے اصولوں کو اولین اہمیت دی گئی ہے۔

اس وقت کوئی فیس وصول نہیں کی جاتی جبکہ پرنسپل صاحب کی صوابدید پر چند محدود وظائف رکھے گئے ہیں اور نمایاں طلباء کو دیے جاتے ہیں۔

اس کی تعلیم میں ابتدائی فری ہینڈ ڈرائنگ، جیومیٹری، منظر کشی، مصوری، ماڈلنگ اور

اصلی ڈیزائن شامل ہیں۔ اس کا عملہ ایک پرنسپل اور وائس پرنسپل بمعہ پانچ اسسٹنٹ ٹیچرز اور ایک رجسٹرار پر مشتمل ہے۔

پنجاب یونیورسٹی کے زیر نگرانی انجنیئرنگ کی ابتدائی تعلیم کی ایک کلاس کو بھی آرٹ سکول سے منسلک کر دیا گیا ہے۔

نیو ٹاؤن ہال:۔ وکٹوریہ جوبلی ٹاؤن ہال، جس کا عزت مآب شہزادہ البرٹ وکٹر نے 3 فروری 1890ء کو ایک بہت بڑی تقریب میں افتتاح کیا تھا، ایک عالیشان عمارت ہے۔ اس کی چھت سے اردگرد کے علاقہ کا نہایت وسیع نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ چھت پر ایک بل کھاتی ہوئی سیڑھی کے ذریعے پہنچ سکتے ہیں۔ اس ہال کا سب سے زیادہ اہم حصہ دوسری منزل پر واقع ایک بلند و بالا کمرہ ہے۔ یہ ہال جو مشرقی طرز پر تعمیر کیا گیا ہے اس کی لمبائی 80 فٹ اور چوڑائی 40 فٹ ہے۔ اس میں عام طور پر سبز اور سنجیدہ رنگ آمیزی کی گئی ہے۔ محرابوں کے درمیانی حصوں پر زرد زمین میں سفید استرکاری سے نہایت خوبصورت آرائش کی گئی ہے۔ بیل بوٹوں کی مصوری چمکدار سرخ رنگ میں کی گئی ہے۔ فرش کے ساتھ ساگوان کی تختیاں نصب کی گئی ہیں اور انہیں نہایت عمدگی سے ملائم پالش کیا گیا ہے۔ ہال میں افتتاحی تقریب کے موقع پر جناب عزت مآب کی " فصیح و بلیغ تقاریر " درج ہیں۔ اس کے شاندار اور بہترین فرش کو رقص کے لیے استعمال بھی کیا جاتا ہے۔

اس عمارت کے باہر راجہ ہربنس سنگھ کا پیش کردہ فوارہ نہایت دلکش منظر پیش کرتا ہے۔ فوارے کو کانسی کی نقل کے طور پر سبز رنگ کیا گیا ہے اور اس کے پیندے پر کیوپڈ کے چار سفید رنگ کے مجسمے ہیں، یہ عمارت کے سامنے ایک چار دیواری میں بڑی خوبصورت جگہ پر واقع ہے، اس کے اردگرد پودے ہیں، جب یہ چلتا ہے تو پانی کی دھاروں کے مختلف ڈیزائن بنتے ہیں۔

اس خوبصورت عمارت کو 1887ء میں شروع کیا گیا اور اس کا سنگ بنیاد پنجاب کے آنجہانی لیفٹیننٹ گورنر سر چارلس ایچیسن نے رکھا تھا۔ عمارت کو عزت مآب ملکہ عالیہ کے دور حکومت کے پچاس سالہ جشن کی یادگار کے طور پر وقف کر دیا گیا ہے اور اسے ٹاؤن ہال اور لوکل فنڈ آفس کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کو میونسپل انجنیئر مسٹر بل نے مدراس کے ایک ماہر تعمیرات، مسٹر پاگسن کے تیار کردہ شاندار نقشوں کی مدد سے تیار کیا اور اس کی تعمیر پر 60,000 روپے لاگت آئی۔ بہت سے پیش کردہ ڈیزائنوں میں مسٹر پاگسن کا ڈیزائن بہترین قرار پایا اور انہیں 500 روپے انعام دیا گیا۔

اورینٹل کالج:۔ لاہور اورینٹل کالج کی ابتداء سنسکرت کے ایک ہندو مدرسہ " پاٹھ شالا " سے

ہوئی۔ اس کو 1863ء میں شہر لاہور میں شکسا سبھا کے احاطہ میں قائم کیا گیا اور اس کی دیکھ بھال مقامی شرفاء کی جانب سے نجی طور پر جمع کیے گئے فنڈز سے ہوتی تھی۔ اس میں حکومت کی طرف سے ہر ماہ اچھی خاصی امداد بھی شامل ہوتی تھی۔ بعد میں سکول کا انتظام انجمن پنجاب کے حوالے کر دیا گیا۔ اس نے اس میں عربی اور فارسی شعبہ جات کا اضافہ کیا۔ پنجاب یونیورسٹی کے قیام کے بعد سینٹ نے اس کا انتظام سنبھال لیا اور اگست 1870ء میں اس کو کالج کی شکل دے دی گئی۔ اس کے لیے دوہرے مقاصد کا اعلان کیا گیا۔

1۔ واقفیت عامہ کی مختلف شاخوں میں تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کی مشرقی تعلیم دینا۔

2۔ ہر قسم کی تعلیم میں عملی تربیت دینا۔

جب سے اس کو قائم کیا گیا ہے تب سے ان مقاصد پر ایمانداری سے عمل درآمد کیا جارہا ہے اور پنجاب میں صرف یہی واحد ادارہ ہے جو طلباء کو مشرقی علوم کی ڈگریوں اور بڑے امتحانات کے لیے تیار کرتا ہے۔ اس کے مقاصد میں قدیم مشرقی علوم کا احیاء اور پنجاب کی معیاری زبانوں میں مغربی علوم اور واقفیت عامہ کی تعلیم دینا شامل ہیں۔

اس ادارے کو دو شعبہ جات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ سکول ڈیپارٹمنٹ اور کالج ڈیپارٹمنٹ۔ سکول ڈیپارٹمنٹ میں طلباء کو اردو اور ہندی میں داخلہ امتحانات کے لیے اور سنسکرت، عربی، فارسی اور گورمکھی میں استعداد کار کو بڑھانے کے لیے پڑھایا جاتا ہے۔ کالج ڈیپارٹمنٹ میں طلباء کو عربی اور سنسکرت میں ایم اے کی ڈگری، عربی میں ایم، او، ایل کی ڈگری اور اردو میں بی، او، ایل کی ڈگری۔ اردو میں انٹرمیڈیٹ کے امتحان شاستری یا سنسکرت میں آنرز، ویشا رادا یا سنسکرت میں اعلیٰ استعداد، مولوی فاضل یا عربی میں آنرز، مولوی عالم یا عربی میں اعلیٰ استعداد، منشی فاضل یا فارسی میں آنرز یا عالم یا فارسی میں اعلیٰ استعداد اور گورمکھی میں اعلیٰ استعداد اور آنرز کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔

اب تک اس کالج میں مشرقی زبانوں کی تعلیم مقامی ڈھانچے کے مطابق دی جاتی رہی ہے لیکن اس کالج کے پرنسپل اور ایک ماہر مستشرق ڈاکٹر سٹین کے مقاصد میں یہ شامل ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے یورپی لسانیات کے تاریخی طریقوں کو متعارف کرایا جائے اور یہ امید کی جاتی ہے کہ آنے والے وقت تک کالج مشرقی زبانوں کی بہترین تعلیم کے سلسلہ میں بہت زیادہ شہرت حاصل کرلے گا اور مشرقی علوم میں کی جانے والی تحقیق میں زبردست ترقی کرجانے کے قابل ہو جائے گا۔

اورینٹنل کالج لائبریری :۔ ایک وسیع و عریض لائبریری کالج سے وابستہ ہے۔ بعد میں یہ اقدامات کیے گئے ہیں کہ اس میں نہایت قیمتی کتابیں حوالہ جات کے لیے مہیا کی جائیں۔ کالج کے اساتذہ اور طلباء کو مشرقی علوم کے مختلف شعبہ جات میں مغربی تحقیق کے نتائج اور طریق کار سے بخوبی آگاہ کرنے کے لیے ادارے کو یورپ میں شائع ہونے والی مشرقی علوم اور دیگر لسانیات کی معیاری کتب اور مطبوعات فراہم کی گئی ہیں۔

کالج کا انتظام ایک خصوصی کمیٹی، پنجاب یونیورسٹی کی مجلس خصوصی کے تحت کرتی ہے۔

لاہور کی سائنسی، ادبی اور خیراتی انجمنیں

پنجاب فرامشن انسٹی ٹیوٹ قائم شدہ 27 جنوری 1872ء

مقاصد :۔ فرامشن کے فوت شدہ اور مفلس اراکین کے بچوں کو تعلیم دینا اور ان کی مدد کرنا۔

31 دسمبر 1891ء کو وقف کیے گئے فنڈ کی رقم	74,700 روپے
1891ء کے دوران وصول شدہ عطیات اور چندوں کی رقم	14,800
اراکین کی تعداد	325

اس وقت 13 لڑکے اور 23 لڑکیاں اس ادارے سے فوائد حاصل کر رہے ہیں۔

رابرٹ کا رضاکار ادارہ : قائم شدہ 1868ء ۔

مقاصد :۔ کم آمدنی کے حامل افراد کے لیے تفریح گاہ، لائبریری اور مطالعہ گاہ فراہم کرنا۔

لاہور ہائی سکول کا انتظامی بورڈ :۔ قائم شدہ 1862ء

مقاصد :۔ لاہور میں نوجوانوں کی تعلیم کے لیے قائم کردہ ادارہ، لاہور ہائی سکول کے معاملات کا انتظام اور دیکھ بھال کرنا۔

آمدنی 9,220 روپے

وائی۔ ایم۔ سی۔ اے، لاہور

انجمن برائے عیسائی نوجوانان، لاہور :۔ قائم شدہ 1876ء

مقاصد :۔ مذہبی مطالعات اور دعائی اجتماعات کا انعقاد کرنا۔

انجمن اتحاد پنجاب :۔ قائم شدہ 1865ء ۔

مقاصد :۔

1۔ ہندوستان اور ہمسایہ ممالک کے نوادرات، تاریخ، علم الانساب، لسانیات کے قدیم علوم کا

احیاء۔

2۔ لوگوں کے عام طبقوں میں ان کی اپنی زبانوں میں علم کا فروغ۔

3۔ صنعت اور تجارت کا فروغ

4۔ سماجی ، ادبی ، سائنسی اور سیاسی سوالات پر بحث مباحثہ ، حکومت کے مفید اقدامات کو مقبول عام بنانا ، ایک عام شہری کے خیالات میں وفاداری کو پروان چڑھانا۔ نیز لوگوں کی خواہشات اور ضروریات کے بارے میں عملی تجاویز حکومت کو پیش کرنا۔

5۔ عوامی فلاح و بہبود کے لیے عالم فاضل اور با اثر طبقوں کی سرکاری افسران سے ملاقات کرانا۔

پنجاب سائنس انسٹی ٹیوٹ :۔ پنجاب سائنس انسٹی ٹیوٹ کو پنجاب کے عوام میں سائنسی علم کے فروغ کے لیے قائم کیا گیا ہے اور اس کے مقاصد کبھی بھی کسی مذہبی یا سیاسی انجمن سے وابستہ نہیں رہے۔

مقاصد :۔

1۔ لاہور اور دوسرے مقامات پر انگریزی اور دیگر زبانوں میں سائنسی و تکنیکی مضامین کے بارے میں شام کے مختصر لیکن باقاعدہ کورسوں کے لیکچروں کا انتظام کرنا۔

2۔ سفری لیکچراروں کا تقرر کرنا جو مختلف مقامات پر جا کر چند اہم سائنسی مضامین پر انتہائی احتیاط سے تیار کیے گئے انگریزی یا مقامی زبان میں ایک یا دو لیکچر دے سکیں۔

3۔ لاہور اور دیگر مقامات پر سائنسی یا تکنیکی نوعیت کے مضامین پر دیے گئے لیکچروں کی کسی ماہنامہ یا سہ ماہی جریدہ میں اشاعت کرانا۔

4۔ سادہ سائنسی آلات اور مشینوں کی تیاری اور مرمت کے لیے ایک مناسب ورکشاپ قائم کرنا۔

5۔ سائنسی لائبریری اور سائنسی مطالعہ گاہ کی بتدریج ترویج و ترقی۔

6۔ سائنس میں موسمی امتحانات کا انعقاد اور سائنسی و تکنیکی استعداد کار میں اسناد ، میڈل اور انعامات تقسیم کرنا۔

7۔ ایک چھوٹی سی تکنیکی لیبارٹری کا قیام جہاں سوسائٹی کے ارکان اور دیگر اشخاص سائنسی تجربات کر سکیں۔

8۔ ہر ممکن طریقے سے تکنیکی تعلیم کی حوصلہ افزائی کرنا۔

مجلس عاملہ کے اراکین

-- ڈاکٹر سی، سی کلیب۔ ایم، بی، ایم، ایس۔ پروفیسر علم الاعضاء اور نباتیات میڈیکل کالج، لاہور۔

-- بابو ایس، بی مکرجی ایم، اے۔ پروفیسر ریاضی، گورنمنٹ کالج، لاہور۔

-- لالہ رُچی رام ایم، اے۔ اسسٹنٹ پروفیسر، قدرتی سائنس، گورنمنٹ کالج، لاہور۔

-- لالہ شیو دیال ایم، اے۔ سائنس ٹیچر، ایچی سن کالج، لاہور

-- جی کیمبیل اومن بہادر ایف، سی، ایس۔ ایف، ایل، ایس۔ پروفیسر قدرتی سائنس (نیچرل سائنس)، گورنمنٹ کالج، لاہور۔

-- اعزازی سیکرٹری۔ جی کیمپبیل اومن بہادر ایف، سی، ایس۔ ایف، ایل، ایس۔

کائستھ صدر سبھا:۔ قائم شدہ 1887ء

مقاصد:۔ کائستھوں میں تعلیم کا فروغ، ان میں یگانگت کا بیج بونا۔ سماجی اصلاحات کی ضرورت کو پورا کرنا، کاروباری اور دیگر باوقار پیشوں کو اختیار کرنے کی حوصلہ افزائی کر کے خوشحالی کے سامان میں فروغ کی کوشش کرنا۔

عطیات	2,000 روپے
سالانہ چندے کی رقم	720 روپے
اراکین	100

سبھا کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان بھر کے کائستھوں کے مفادات کی نمائندگی کی جائے۔ اس کے ساتھ "کائستھ صوبائی سبھا، پنجاب" اور مقامی کائستھ لاہور بھی منسلک ہیں۔

انجمن اسلامیہ پنجاب: قائم شدہ 1869ء

مقاصد:۔ پنجاب کے مسلمانوں کی سماجی اور ذہنی حالت کو بہتر بنانا اور مزید یہ کہ مسلمانوں کے عام مفادات کی بہتری کے لیے سوچنا۔ انجمن کے مقاصد میں یہ بھی شامل ہے کہ مسلمانوں کے طبقہ کے لیے کیے گئے حکومت کے اقدامات کو مقبول عام بنائے اور لاہور کی اہم مساجد کی دیکھ بھال کرے۔

31 دسمبر 1891ء کو انجمن کا سرمایہ	4,00,143
ماہانہ چندہ	3,000
عزت مآب نواب بہاولپور کی طرف سے ماہانہ چندہ	3,000

انجمن کی ملکیت کے مکانات کے کرایہ کی آمدنی	14,000
	20,000
اراکین	177

سرپرست — عزت مآب رکن الدولہ نصرت جنگ، مخلص الدولہ حفیظ الملک، نواب صادق محمد خاں، بہادر، ستارہ ہند، امیر بہاولپور

تاحیات صدر — نواب حاجی ناصر علی خاں قزلباش

نائب صدور — نواب شیخ غلام محبوب سبحانی، آنریری مجسٹریٹ لاہور
نواب عنایت علی خان آف، مالیر کوٹلہ

جنرل سیکرٹری — خان بہادر محمد برکت علی خان۔

تاحیات سیکرٹری — سردار محمد حیات خان، سی۔ ایس۔ آئی۔ واہ
راجہ جہانداد خاں، خان بہادر، امیر گکھڑ
سردار رشید احمد خاں، سی۔ آئی۔ ایم، ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر (12)۔

انجمن حمایت اسلام، لاہور :۔ قائم شدہ 1886ء

مقاصد :۔

اسلام کے اصولوں کی اشاعت اور ان پر بحث مباحثہ، لڑکوں اور لڑکیوں کو دین کی تعلیم اس انداز سے دینا کہ وہ دیگر مذاہب کا اثر قبول نہ کریں۔ غریب، نادار اور یتیم بچوں کی امداد کرنا۔ سماجی اور تعلیمی اصلاحات کے اقدامات کے تعارف سے مسلمانوں کی حالت کو سنوارنا۔ مسلمان برادری پر اثر انداز ہونے والے حکومتی اقدامات کی وفادارانہ انداز میں تشریح، حکومت کے اقدامات کو مقبول عام کرنا، انجمن کے مقاصد کی حمایت میں جرائد کی اشاعت کرنا اور دین اسلام کے مبلغین کو مہیا کرنا۔

	پیسہ	آنہ	روپے
۳۱ دسمبر ۱۸۹۱ء کو ملنے والے عطیات	۳	۱۱	۱۰,۰۸۲
۱۸۹۱ء کی آمدنی	۹	۷	۱۵,۹۲۷
کل =			۲۶,۰۱۰

۱۸۹۱ء کے اختتام پر اراکین کی تعداد ۱,۵۱۵

سرپرست — مدبر الملک، افتخار الامراء صاحبزادہ محمد عبید اللہ

خان صاحب بہادر، وزیر اعظم ٹانک۔

تاحیات صدور　قاضی محمد اسلم خاں، سی۔ ایم۔ جی، ڈپٹی کمشنر جھنگ

صدر　خلیفہ حمید الدین، چیف قاضی لاہور۔

انجمن ایک سکول بھی چلا رہی ہے جس میں داخلہ کے درجہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔

سکول میں 700 لڑکے زیر تعلیم ہیں۔

انجمن نعمانیہ، لاہور:۔　قائم شدہ مارچ 1888ء

مقاصد:۔

مسلمانوں کی سماجی اور اخلاقی حالت میں فروغ اور بہتری۔ قانون شریعت خاص طور پر حنفی مسلک اسلام کی تبلیغ۔ عربی ادب کا فروغ۔ اسلامی قوانین کے خلاف رسم و رواج کو روکنا۔ مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کی بہتر تعلیم و تربیت اور حکومت کو نہایت ادب سے مسلمان برادری کی ضروریات سے آگاہ کرنا۔

اراکین کی تعداد　318

سالانہ آمدنی کی رقم　1,48,696 روپے

صدر　امام بادشاہی مسجد، مولوی غلام محمد۔

سیکرٹری　مفتی سلیم اللہ

جائنٹ سیکرٹری　مولوی تاج الدین احمد

انجمن ایک سکول بھی چلا رہی ہے جو "مدرسۃ العلوم اسلامیہ لاہور" کے نام سے مشہور ہے۔ اس پر 72، 839 روپے سالانہ خرچ آتا ہے۔ یہ مدرسہ مسجد بکن خاں میں قائم کیا گیا ہے۔ اس کے مضامین میں فارسی اور عربی کی دینی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں (13)۔

انجمن نوجوانان اسلام لاہور:۔　قائم شدہ 1821ء

انجمن کے تین مقاصد ہیں:۔

1۔ عام دلچسپی کے مضامین خاص طور پر ان مضامین کے بارے میں جن میں اسلامی ثقافت اور اخلاق کے علاوہ مذہبی حوالہ جات ملتے ہوں بحث و مباحثہ کرنا۔

2۔ مسلمانوں میں ایک دوسرے کے ساتھ افہام تفہیم پیدا کرنا اور سماجی میل ملاپ کو فروغ دینا۔

3۔ لوگوں کو انگریزی زبان میں گفتگو کرنے کی ترغیب دینا اور ان کی استعداد کار میں اضافہ

کرنا۔

اس کے اراکین کی تعداد 98

سیکرٹری جناب محمد شاہ دین۔بی،اے،بیرسٹرایٹ لاء

سید خورشید انور۔بی،اے

دیوا دھرما سبھا، لاہور:۔

اس انجمن کا دستور عمل۔دیوا دھرما کی جے۔سکال پاپ کی چھائی۔دیواتوا کا پرچار۔
بھارت کا ادھار

صدر دفتر۔دیوا دھرما پرچار ہال، انار کلی۔

مقاصد:۔

1۔ دیواتوا(بزرگی) پشیاچتوا(گناہ) اور دیواجیون(لازوال زندگی) سے متعلق واضح حقائق اور اصولوں کا پرچار۔

2۔ جماعت میں اثر انداز ہونے والی دیوا شکتی کی واضح طور پر الہامی صورت کا پھیلاؤ اور روحانی زندگی میں اس کے عملی نتائج کے اثرات سے آگاہ کرنا۔

3۔ روحانی تیرگی، درندگی اور ہر قسم کے گناہ کو ختم کرنا۔

4۔ روح میں دیواتوا کی نئی زندگی اجاگر کرنا۔

5۔ روح کی نئی زندگی کی رہنمائی اور تربیت کرتے ہوئے اسے دیواتوا یا دیواجیون کی زندگی سے ہم آہنگ کرنا اور اس زمین پر اس کی بیشمار آسمانی رحمتوں کو پھیلانا۔

6۔ انسانی زندگی سے متعلقہ روحانی اور اخلاقی قوانین کا پرچار۔

7۔ انسانی زندگی کے لیے مکمل اور ہم آہنگ مقصد تلاش کرنا۔

8۔ خدا اور نیک بندوں کے درمیان تعلق کی ضرورت کو بیان کرنا اور یہ راستہ دکھانا۔

9۔ حقیقی معلمین انسانیت کے لیے تعظیم و تکریم و عظمت پیدا کرنا۔

10۔ تمام حقیقی تہذیب و تمدن، ذہنی اور اخلاقی تعلیم اور عملی اصلاح کی شکل و صورت میں قائم اداروں کی مدد کرنا۔

11۔ زندگی کے تمام انسانی معاملات اور تعلقات میں دیواتوا کو قائم کرنا۔

12۔ اس دنیا میں دیوا پریوار، دیوا سماجوں اور دیوا راج کو قائم کرنا۔

انڈین ایسوسی ایشن پنجاب:۔ قائم شدہ 1883ء

لاہور کی انڈین ایسوسی ایشن کو پنجاب اور ہندوستان کے تمام باشندوں کے لیے کسی نسل، فرقے اور مذہب میں امتیاز کیے بغیر سب کے لیے کھولا گیا ہے۔

مقاصد:۔

یہ انجمن لوگوں کی اس بارے میں نمائندگی کرنے کی تلاش میں رہتی ہے کہ ہر اہم مسئلے پر لوگوں کی صحت مند آراء کو تشکیل دے۔ پنجاب کے لوگوں میں دوسرے صوبوں کے لیے ہمدردی اور یگانگت پیدا کی جائے اور ہر جائز طریقے سے لوگوں کی سیاسی، ذہنی اور مادی ترقی کو فروغ دے۔

اراکین 90

صدر سردار دیال سنگھ مجیٹھیا

نائب صدر خان بہادر محمد برکت علی خان۔

بابو، پی۔ سی، چٹرجی، رائے بہادر، ایم۔ اے، بی۔ ایل

لالہ ایشرداس، ایم۔ اے،

جناب، ای۔ سی، جساوالا

سیکرٹری جناب گنپت رائے، بیرسٹرایٹ لاء۔

مرکزی قومی انجمن اسلامیہ پنجاب:۔

مقاصد:۔

بالکل انجمن اسلامیہ کی طرح ہیں۔

صدر فقیر سید جمال الدین، خان بہادر

سیکرٹری مولوی محرم علی چشتی

گرو سنگھ سبھا، لاہور:۔ قائم شدہ 1879ء

مقاصد:۔

سکھ طبقہ اور سکھوں کے مفادات کی نمائندگی۔

سوسائٹی کے مقاصد میں یہ شامل ہے کہ نہایت ایمانداری سے آدی گرنتھ اور سکھوں کی دیگر مقدس کتابوں کی تعلیمات کا پرچار اور جعلی فرقوں اور غیر ضروری رسم و رواج کو ختم کرنے کی کوشش کرنا۔

ست سبھا، لاہور:۔ قائم شدہ 1866ء

مقاصد:۔

پنجابی کے ذریعے علوم و فنون کا پھیلاؤ اور ہندوؤں کی اخلاقی اور سماجی حالت کی اصلاح کرنا۔

آمدنی	120 روپے
اراکین	40

سنسکرت پرجا چاری سبھا، لاہور:۔ قائم شدہ 1882ء

مقاصد:۔

ہندوؤں میں سنسکرت زبان کی تعلیم حاصل کرنے کی حوصلہ افزائی کرنا۔

آمدنی	30 روپے
اراکین	150

دیانند اینگلو ویدک کالج، لاہور:۔ قائم شدہ 1885ء

مقاصد:۔

سنسکرت کے ذریعے سائنس کی تعلیم دینا اور اعلیٰ تعلیم کو انگریزی اور سنسکرت کے ذریعہ عام کرنا۔

فیسوں کے ذریعہ آمدنی	1,489 روپے
1890-91ء میں اخراجات	3,036 روپے
طلباء کی تعداد	61
انتظامی کمیٹی کے اراکین	27

پنجاب برہمو سماج، لاہور:۔ قائم شدہ 1870ء

مقاصد:۔

تعلیم کو فروغ دینا اور کسی ذات پات کے امتیاز کے بغیر ویدک مذہب یا الوہیت کا فروغ۔ اخلاقی و سماجی اصلاحات کو لاگو کرنا اور انگریزی و مقامی زبان کے ایک سکول کو چلانا۔

آمدنی	115 روپے
اراکین	190

بنگا ساسا ہتیہ سبھا یا بنگالی سوشل ریڈنگ کلب لاہور:۔ قائم شدہ 1883ء

مقاصد:۔

بنگالی خواتین اور مردوں کے علاوہ عوام الناس کے لیے ایک لائبریری کا انتظام کرنا اور اخبارات کے مطالعہ کی سہولت پیدا کرنا۔

آمدنی 4,27,151

اخراجات 30,539

فیس چار آنے ماہانہ یا اس سے زائد ہے۔

لاہور میڈیکل کلب :۔ قائم شدہ 1885ء

مقاصد :۔

انگریزی زبان اور مقامی زبان میں طبی علوم کی ترویج و ترقی اور پھیلاؤ۔

اراکین 35

کمیٹی برائے تعلیم ہندو نسواں :۔ قائم شدہ 1887ء

مقاصد :۔

ہندو لڑکیوں کو مفید تعلیم دینا۔

آمدنی 720 روپے

اراکین 50

دیانند اینگلو ویدک کالج :۔ اس ادارے کو مکمل طور پر آریہ سماج کی طرف سے جمع کیے گئے مقامی یا نجی چندوں اور عطیات کے ذریعے چلایا جاتا ہے۔ اس کے پرنسپل لالہ ہنس راج، بی۔اے، نے اپنی بلا معاوضہ خدمات سپرد کی ہیں۔ یہ کالج طلباء کو یونیورسٹی ڈگریوں کے لیے تیار کرتا ہے۔ اس وقت ایک مناسب عمارت کی ضرورت کو محسوس کیا جا رہا ہے لیکن یہ ادارہ نہایت عمدگی سے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔ کالج میں حال ہی میں ایک اقامت گاہ (ہوسٹل) کا اضافہ کیا گیا ہے۔ فیس بہت کم ہے اور حاضری بہت زیادہ۔

لاہور مشن کالج :۔ لاہور مشن کالج کی نئی عمارت گراؤنڈ کی طرف ہے اور ٹیلی گراف آفس سے زیادہ دور نہیں ہے۔ یہ عمارت بہت خوبصورت ہے۔ اس میں اور بھی بیشمار عمارات کا اضافہ کیا گیا ہے اور لاہور کے اس حصہ میں یکساں طور پر تعمیر کی گئی ہیں۔ بحیثیت ایک کالج کے معلوم ہوتا ہے اس عمارت کے لیے خاص طور پر نہایت عمدہ ڈیزائن تیار کروایا گیا تھا۔ نومبر 1849ء میں یا 42 قبل ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے پریس بائی ٹیرین چرچ کے بورڈ برائے غیر ملکی مشن کے اراکین۔ جناب ڈاکٹر نیوٹن اور فورمین لاہور پہنچے اور " رنگ محل " کے نام سے مشہور عمارت (14) میں پہلا انگریزی سکول نئے قائم شدہ شہر میں قائم کیا۔ پہلے پہل مذہبی رجحانات کے باعث انگریزی تعلیم کی سخت مخالفت کی گئی۔ دوسرے لوگوں کو اس بارے میں کوئی خاص یقین نہیں تھا

کہ انگریزوں کا قبضہ کتنی دیر تک قائم رہے گا۔

پرانا مشن سکول:۔ غدر کے وقت سکول بالکل ختم ہونے کے برابر تھا کیونکہ لوگوں کا خیال تھا کہ اب وہ وقت آگیا ہے جب انگریزوں کو یہاں سے جانا ہی پڑے گا لیکن اس کے کفیلوں کی ثابت قدمی اور ولولہ کے شکر گزار ہیں کہ سکول کو سنبھال لیا گیا اور اس میں لڑکوں کی تعداد میں زبردست اضافہ ہو گیا۔ پنجاب کے لوگوں کو اس سے کس قدر فوائد حاصل ہوئے۔ اس کے بارے میں اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ پرانے مشن سکول سے ہزاروں نے تعلیم حاصل کی اور بعد کے برسوں میں اسے ہائی سکول کا درجہ دے دیا گیا۔ جون 1886ء میں کالج کو رنگ محل میں کھولا گیا لیکن اس کے لیے جگہ ناکافی تھی۔ موجودہ عمارت 1889ء میں 56,000 روپے کی لاگت سے مکمل ہوئی۔ حکومت پنجاب کی طرف سے موجودہ عمارت کے لیے عطیہ کے طور پر دی گئی زمین کی قیمت 20,000 روپے اور عمارت کی قیمت 20,000 روپے ہے۔

مقاصد:۔

کالج کے کفیلوں کے مقاصد یہ ہیں کہ طلباء کو مکمل طور پر ذہنی تربیت دینا اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے ذہنوں میں ان حقائق کو بٹھانا جن کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ یہ خدا کے دین پر کار بند حکومت کے قیام کے لیے مزید بہتر منصوبہ بندی کر سکتے ہیں۔

ہر دن کا ایک خاص حصہ اخلاقی اور مذہبی تعلیم کے لیے مخصوص ہے۔ کالج میں طلباء کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے اور 91-1890ء کے اختتام پر یہ 134 طلباء پر مشتمل تھی۔

کالج میں اکتوبر 1889ء میں شاندار اقامت گاہوں کا اضافہ کیا گیا۔ نیز اقامت گاہوں میں مقیم طلباء ہر روز باقاعدگی سے جمناسٹک کی مشقیں کرتے ہیں۔ ان میں سے چند نے کرکٹ کے کھیل میں بھی دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ اس کے علاوہ کالج، ریڈنگ کلبوں، تقاریر کی سوسائٹیوں، ایک لائبریری اور ایک عیسائی ڈاکٹر کے زیر انتظام ایک ڈسپنسری کا بندوبست بھی کرتا ہے۔

پنجاب چیف کورٹ:۔ اکاؤنٹنٹ جنرل آفس کے قریب اپر مال پر کیتھیڈرل کے سامنے چیف کورٹ پنجاب کی وسیع و عریض ہندی عربی طرز کی عمارت موجود ہے۔ یہ قابل تعریف حد تک لاہور کی قدیم یادگاروں، تاریخ اور ماحول سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ اس عمارت کا نقشہ ایک نہایت ماہر، ماہر تعمیرات مسٹر براسنگٹن نے تیار کیا اور اس کا کام ایگزیکٹو انجینئر مسٹر جے۔ ای بلٹن کی زیر نگرانی کیا گیا۔ یہ عمارت مارچ 1889ء میں مکمل ہوئی اور اس پر کل لاگت 3,21,837 روپے آئی۔ یہ عمارت جو مربع شکل میں ہے اس کو مکمل طور پر پختہ اینٹوں اور چونے سے تیار کیا گیا

ہے۔ اس عمارت کے سامنے والے حصے منڈیریں اور آگے بڑھے ہوئے حصے خاص طور پر بنوائی گئی مختلف ڈیزائنوں کی اینٹوں سے تیار کیے گئے ہیں اور اس کی محرابوں میں سرخی مائل بھورے رنگ کے پتھروں کی جالیاں لگائی گئی ہیں۔ اس عمارت کی تعمیر میں سب سے بڑی خوبی یہ پائی جاتی ہے کہ پوری عمارت میں کسی جگہ بھی اینٹوں کے چھوٹے ٹکڑے نہیں لگائے گئے۔

ججوں کے کمروں کے سامنے والی محرابوں، برآمدے، بیرونی ڈیوڑھی اور بڑے میناروں کے کچھ حصوں کو نوشہرہ سے منگوائے گئے سنگ مرمر سے تعمیر کیا گیا ہے اور ان میں سنگ مرمر کی جالیاں لگائی گئی ہیں۔ عدالت کے کمرے کی چھت میں الہ آباد کی دوہری ٹائلیں لگائی گئی ہیں اور باقی حصے میں سادہ ٹائلوں سے حاشیہ لگایا گیا ہے۔ مرکزی ہال کا فرش سنگ مرمر کا ہے اور باقی حصے میں مسدس ٹائلیں لگائی گئی ہیں۔ چھت کے شہتیر دیودار کی لکڑی کے اور دروازے ساگوان کے ہیں۔ ان پر اور فریموں پر خوبصورت انداز میں کندہ کاری کی گئی ہے۔ آرام گاہوں، عدالت کے کمروں اور ججوں کے کمروں میں پورٹ لینڈ سیمنٹ میں مختلف ڈیزائنوں کی منقش ٹائلوں سے آرائش کی گئی ہے۔

شمال میں کمروں کی پہلی قطار 35 x 55 فٹ کے ایک مرکزی ہال پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک ڈیوڑھی میں سے ہو کر سنگ مرمر کے زینوں پر مشتمل سیڑھی کے ذریعے پہنچا جا سکتا ہے۔ اس ہال کے دائیں اور بائیں کشادہ عدالتی کمرے ہیں۔ ہر ایک 40 x 55 فٹ کا ہے اور ان کے عقب میں چار ججوں کے لیے چار چھوٹے کمرے بمعہ آرام گاہوں، غسلخانوں کے ہیں۔ ان کمروں سے عدالت میں جانے کے لیے ایک نجی راستہ بھی ہے۔

مغرب کی جانب اکاونٹنٹ جنرل آفس کی طرف رخ والے کمرے، ججوں، وکلاء، وکلاء کی لائبریری، ڈپٹی رجسٹرار، شعبہ ترجمہ، ریڈروں اور ورنیکلر آفس کے سپرنٹنڈنٹ کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں۔

مشرق کی جانب سامنے والے حصہ میں رجسٹرار کا کمرہ، کمیٹی روم، عدالت کی لائبریری، انگلش آفس اور ہیڈ اسسٹنٹ کے علاوہ ماتحت کلرکوں کے کمرے ہیں۔

جنوب کی طرف انگریزی اور فارسی ریکارڈ رکھنے کے لیے 25 x 35 فٹ کے بڑے کمرے ہیں۔ دونوں جانب ریکارڈ کیپروں اور خزانچی کے کمرے بھی اسی میں ہیں۔ درمیان میں ایک دروازہ چھوڑ دیا گیا ہے جو اس عمارت کے اندر جانے کے لیے ایک کھلے راستے کے سامنے واقع ہے۔ اس عمارت کے چاروں طرف بیرونی اور اندرونی جانب کشادہ برآمدے ہیں اور یہ سب عدالتوں اور کمروں کو ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کیے ہوئے ہیں۔

مرکزی عمارت کے دو مینار آدھی بلندی تک چوکور ہیں اور باقی اوپر والے حصہ میں مخروطی شکل میں ہیں۔ ان کو کچھ کچھ دہلی کے قطب مینار کی طرز پر بنایا گیا ہے۔ مرکزی میناروں کی چوٹی تک بلندی 95 فٹ ہے اور آخری سرے کے میناروں کی اونچائی 72 فٹ ہے۔ آخری میناروں میں گول سیڑھیاں ہیں جو چوٹی تک جاتی ہیں۔

برآمدے اندرونی دیواروں کی مکمل اونچائی تک ہیں اور محرابوں میں دو تہائی بلندی تک روشنی کے لیے پختہ سرخ پتھر کی جالیاں لگائی گئی ہیں۔

عمارت کے سامنے والے حصہ کے برآمدوں کے چاروں طرف قدیم عربی طرز کی شہد کے چھتہ کے سوراخوں والی شکل کی جالیوں پر مشتمل منڈیر ہے۔

صحن کے درمیان میں سرسبز جھاڑیوں میں سنگ مرمر کا ایک فوارہ ہے جو اس عمارت کی خوبصورتی اور دلکشی میں بہت زیادہ اضافہ کرتا ہے۔

نیو کیتھیڈرل :- یہ شاندار اور دلکش عمارت اپر مال پر ریلوے سٹیشن کو جانے والی سڑک کے دائیں جانب واقع ہے۔ اسے 25 جنوری 1887ء کو وقف کیا گیا۔ یہ سرخ اینٹوں سے تعمیر کردہ بہت بڑی عمارت ہے اور اسے عام طور پر مشہور "انگریزوں کی اولین آرائشی عمارات" کی طرز پر بنایا گیا ہے۔ اس کا ڈیزائن آنجہانی سر گلبرت سکاٹ کے بیٹے مسٹر او۔ سکاٹ نے تیار کیا تھا۔ جنرل پولارڈ نے اس کے تخمینے پر نظرثانی کی اور اس کا کام میسرز برن اینڈ کمپنی کلکتہ کے ٹھیکیداروں نے اپنے ایجنٹ مسٹر ایٹ فیلڈ سی۔ ای کے زیر انتظام مکمل کیا۔ برن اینڈ کمپنی نے پتھر میں کندہ کاری کا کام بڑی فیاضی سے اپنے خرچ پر شروع کرایا اور اس کو اصل ڈیزائن کے مطابق رکھا۔ اس عمارت کو سرخ اینٹوں اور جہلم سے پرے ترکی کی کانوں سے حاصل شدہ سلیٹی پتھر سے بنایا گیا ہے اور اسے ایک لائبریری اور پادریوں کے گھر وغیرہ سے مزین کیا گیا ہے۔ اسے کیتھیڈرل "حشر کا گرجا" کہا جاتا ہے۔

اس عمارت کی تعمیر پر بشمول فرنیچر کے 4,08,000 روپے لاگت آئی اور یہ 18 مہینوں میں تعمیر ہوئی۔ یقیناً میسرز برن اینڈ کمپنی لائق صد تحسین ہے کہ اس نے جس اطمینان بخش طریقے سے اس دیوہیکل عمارت کا کام مکمل کیا اور ان کے انتھک نمائندے مسٹر ایٹفیلڈ بھی قابل تعریف ہیں جنہوں نے نہایت جانفشانی سے اپنے مشکل ترین فرائض کو خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔

عمارت کی اندرونی جانب کچھ ایسے انتظامات کیے گئے ہیں کہ موسم گرما میں عمارت ٹھنڈی رہتی ہے اور سارا دن اس میں کافی روشنی رہتی ہے۔ اس کی سماجی خصوصیات قابل تعریف ہیں۔

موجودہ عمارت کی تکمیل سے قبل پنجاب گورنمنٹ سیکرٹریٹ کے قریب انار کلی کے مقبرہ کو سٹیشن چرچ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا لیکن یہ عمارت اس کے لیے ناکافی تھی اور ویسے بھی یہ نامناسب جگہ پر تھا۔ پنجاب کے دارالسلطنت کے نام کے شایان شان ایک گرجا کی ضرورت کو بڑی شدت سے محسوس کیا گیا۔ بعد ازاں مذہبی اجتماع نے یہ فیصلہ کیا کہ موجودہ مقام پر ایک مناسب حجم کا گرجا تعمیر کیا جائے اور کسی حد تک اس پر کام شروع بھی کر دیا گیا کہ دسمبر 1867ء میں پنجاب کو ایک علیحدہ ضلع بنا دیا گیا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ گرجا کی اس عمارت میں توسیع کر کے اسے کیتھیڈرل بنا دیا جائے۔ موجودہ عمارت جو خوبصورتی اور دلکشی میں اپنی مثال آپ ہے، نے نہ صرف اس ضرورت کو پورا کیا بلکہ اپنے طرز تعمیر کی خوبصورتی کی وجہ سے اور عمارت کی دلکشی کے باعث یہ ثابت کیا ہے کہ سلطنت کی شمال مغربی سرحد کا عروس البلاد بیشک اس پر فخر کر سکتا ہے۔

ریلوے سٹیشن:۔ ریلوے سٹیشن دیکھنے میں ملک کے کسی ایک قلعہ کی مانند نظر آتا ہے اور درحقیقت اس کے گرد فصیل قائم کر کے اس کے لیے دفاعی ذرائع مہیا کیے گئے ہیں تاکہ ہنگامی صورت میں اس کا دفاع کیا جا سکے۔ اس لائن پر جو سرحد تک جاتی ہے تمام سٹیشنوں کو کم یا زیادہ تر ایک جیسی طرز پر تعمیر کیا گیا ہے دفاعی انتظامات میں کونوں پر برجیاں ہیں جن میں مچانیں بنائی گئی ہیں اور ان کے اوپر مینار ہیں جن کو مختلف راستوں پر دسترس حاصل ہے۔ اطراف میں حفاظت کے نقطہ نظر سے سٹیشن کے باہر ایک فصیل بنائی گئی ہے۔ اس میں بندوقوں کے لیے سوراخ رکھے گئے ہیں تاکہ اردگرد کے علاقہ پر فائرنگ کی جا سکے۔ یہ فائرنگ سٹیشن کے اردگرد اور قرب و جوار میں بنی ہوئی برجیوں اور میناروں سے زیادہ بہتر طریقے کی جا سکتی ہے۔ یہ ضروری انتظامات اس لیے کیے گئے ہیں کہ اگر سٹیشن پر اچانک حملہ ہو جائے تو چھوٹے ہتھیاروں کے ذریعہ اس کا مقابلہ کیا جا سکے اور کسی بھی خطرے کے وقت ریلوے کے عملہ اور دیگر اشخاص کو پناہ فراہم کی جا سکے۔

بعد میں افغان جنگ کے دوران 24 گھنٹوں کے قلیل عرصہ میں لاہور ریلوے سٹیشن پر 75 گاڑیاں آتی اور جاتی تھیں۔ اس عمارت کا ڈیزائن مسٹر ڈبلیو سی۔ ای، نے تیار کیا اور اس کو محکمہ تعمیرات (پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ) کے عظیم ٹھیکیدار مرحوم محمد سلطان نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کا سنگ بنیاد پنجاب کے آنجہانی لیفٹیننٹ گورنر سر (بعد میں لارڈ) جان لارنس نے 1859ء میں رکھا۔ 1860ء میں عوام کے لیے پہلی گاڑی لاہور سے امرتسر تک چلائی گئی۔ پوری عمارت کے گرد مضبوط فصیل ہے اور یہ ملک کی اینٹ سے تیار کردہ نہایت ٹھوس اور شاندار جدید عمارات میں سے ایک ہے۔ اس پر کل لاگت پانچ لاکھ روپے آئی۔

ریلوے ورکشاپیں اور کوارٹر:- لاہور میں نارتھ ویسٹرن ریلوے کا صدر دفتر ہونے کی وجہ سے وسیع و عریض ورکشاپیں ہیں اور بشمول سٹیشن کے یہ تقریباً 126 ایکڑ رقبہ پر محیط ہیں۔ ہر روز تقریباً 4،000 سے زائد ملازمین کام کرتے ہیں۔ ان میں یورپی یورشین، یورشین اور پارسی مکینک اور پنجاب کے مقامی کاریگروں کی بہت بڑی تعداد شامل ہے۔ یہ فیکٹری جو 1874ء سے استعمال میں ہے، ایک وقت میں 60 ریلوے انجنوں، مسافروں اور مال بردار بوگیوں کے 200 ڈبوں اور مشینوں کی بیشمار اقسام اور لکڑی کے کام کو مرمت کر سکتی ہے۔ ان عمارات پر 15،00،000 روپے سے زائد اور اس کے علاوہ مشینوں پر 10،000،000 روپے سے زائد لاگت آئی ہے۔ یورپ سے جدید طرز کے انجن اور مشینری درآمد کر کے اس میں مسلسل اضافہ کیا جا رہا ہے۔

کیرج شاپ :- دروازے میں داخل ہونے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں آراء مشینیں لگی ہوئی ہیں۔ ان میں گول آریاں ہیں جو صرف پانچ منٹ میں 30 فٹ لمبے اور 3 فٹ قطر کے بڑے بڑے شہتیروں کو کاٹ سکتی ہیں۔ ایک بوائلر اور سٹیشنری انجن کے ذریعے فرش کے نیچے چلنے والے دھرے کی مدد سے چلنے والی، تختے بنانے والی، سوراخ کرنے والی اور لوہے پر چھپائی کرنے والی مشینیں کام کر رہی ہیں۔

آراء مل کے جنوب میں کیرج ورکشاپ واقع ہے، جس میں ریلوے کی بوگیاں، ڈبے، عام گاڑیاں اور ہر قسم کے فرنیچر کو بنایا جاتا ہے اور ان کی مرمت کی جاتی ہے۔ اس شاپ کے مغربی کونے میں رنگ کی شاپ اور کیرج شیڈ ہے اور مشرق میں سمتھ شاپ ہے، جہاں گاڑیوں اور ڈبوں کے لیے ہر قسم کا لوہے کا کام کیا جاتا ہے۔ دائیں جانب دروازے کے قریب ٹنکر شاپ ہے جہاں ہر قسم کے لیمپ اور ٹین کا دیگر سامان تیار کیا جاتا، مرمت کی جاتی اور ملمع چڑھانے کے علاوہ الیکٹرو پلیٹنگ کی جاتی ہے۔

لوکو شاپ (انجن شاپ) :- لوکو شاپ کے دروازے میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے جس چیز پر نگاہ پڑتی ہے وہ لوکو اینڈ کیرج سپرنٹنڈنٹ کا دفتر ہے۔ اس کے درمیان میں ایک بہت بڑا گھڑیال نصب ہے۔ اس سے آگے ایک بہت بڑی عمارت ہے جس کے وسط میں چار بڑے بڑے سٹیم بوائلر اور دو انجن، مشین شاپوں کے لیے نصب کیے گئے ہیں۔ دونوں بھاری اور ہلکے خرادوں کے لیے بہت مناسب ہیں۔ اس کے شمال میں بھاری خراد مشین اور جنوب میں ہلکی خراد مشینوں کی شاپ ہے۔ بھاری خراد مشین شاپ میں انجن اور گاڑیوں کے پہیوں، ایکسلوں اور سلنڈروں کو

مرمت کیا جاتا اور ان سے متعلقہ سامان خراد پر بنایا جاتا ہے نیز وہاں ٹائر بورنگ مشین بھی دکھائی دیتی ہے جو حیران کن حد تک تیز رفتاری سے کام کرتی ہے۔ ہلکی خراد مشین شاپ میں لوہے اور پیتل کا ہر قسم کا سامان تیار کیا جاتا ہے۔ مشین شاپس میں سوراخ کرنے والی عمودی اور متوازی مشینیں کام کرتی ہیں جو پیتل اور لوہے کا ہر قسم کا سامان تیار کرتی ہیں۔ پیچ کاٹنے والی مشینیں اور خراد مشینیں بھی ہیں۔ ہموار کرنے والی مشینیں لوہے اور پیتل کی اشیاء کو ہموار اور ملائم کرتی ہیں۔ تیز کرنے والی مشینیں اوزاروں کو تیز کرنے کے لیے ہیں۔ اس کے مشرق میں اریکٹنگ شاپ ہے جس میں انجنوں کو مرمت کیا جاتا اور جوڑا جاتا ہے۔ اس میں ایک ہائیڈرالک کرین مہیا کی گئی ہے جو سوا انچ کی زنجیر کی مدد سے 20 ٹن وزن اٹھا سکتی ہے۔ یہ ورکشاپ کی بھاری بھر کم مشین ہے۔

اسی سمت میں بھاری اور ہلکی سمتھ شاپس ہیں جہاں پر لوہے کا ہر قسم کا سامان کوٹا جاتا اور تیار کیا جاتا ہے۔ بھاری سامان کے کارخانے کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں سپرنگ، انجن اور ڈبے تیار کیے جاتے ہیں۔ دوسرے حصہ میں مشینوں کے لیے چمڑے کے پٹے اور تیسرے حصہ میں لوہے کا بھاری سامان تیار کیا جاتا ہے۔ اسی جگہ ہمیں سٹیم ہیمر، وزن اٹھانے والی کرینیں اور نٹ بولٹ بنانے والی مشینیں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ بھاری اوزار تیار کرنے والی شاپس میں جوڑنے والی مشینیں اور ملمع سازی کی بھٹیاں بھی دکھائی دیتی ہیں جو نہایت تیزی سے کام کرتی ہیں۔

کارخانے میں ہمیں ایک قینچی بھی دکھائی دیتی ہے جو لوہے اور فولاد کے پرانے ٹائروں کو کاٹتی ہے اور فولاد کے دھرے کو پانچ مربع انچ میں ایک لمحے میں تقسیم کر سکتی ہے۔ نیز ہائیڈرالک ہتھوڑے ہیں جو ہر اس کام کو ایک لمحہ میں کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جس کے لیے تین کاریگروں کو پانچ منٹ درکار ہوتے ہیں۔ ہتھ گاڑیاں جن کے بارے میں ماسوائے بنگال اور بمبئی کے پورے ہندوستان میں کوئی واقف نہیں، انہیں یہاں استعمال کیا جاتا ہے۔

فولاد کا ہلکا سامان تیار کرنے والے کارخانے میں بھٹیاں، بھاپ کے ہتھوڑے اور بھاری سامان اٹھانے والی کرینیں ہیں۔ اس کے مشرق میں بوائلر شاپ ہے جس میں بوائلروں کو مرمت کیا جاتا اور جوڑا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ پیٹرن شاپ ہے جس میں دیگی لوہے اور پیتل کے پیٹرن تیار کیے جاتے ہیں۔ اس کے جنوب میں ایک فونڈری ہے جس میں سلنڈروں، دھروں، بکسوں، بلاکوں، بریکٹوں وغیرہ کو ڈھالا جاتا ہے۔ اس شاپ میں سلنڈروں کو تیار بھی کیا جاتا ہے۔ بوائلر شاپ میں قینچیاں اور برما مشینیں بھی ہیں۔

بوائلر شاپ اور اریکٹنگ شاپ کے درمیان زمین میں ایک پایاب گڑھا ہے جس میں ایک متحرک مشین نصب ہے جو انجنوں کو شاپ کے اندر لے جانے اور باہر لانے کے لیے پل کا کام دیتی ہے۔ اس میں ایک بھاپ کا انجن بھی کام کرتا ہے۔

لوکو شاپ کے جنوب مشرق میں ایک شیڈ ہے جس میں تقریباً 100 کے قریب انجن سما سکتے ہیں اور انہیں آمد و رفت کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے نزدیک پانی کے دو حوض ہیں جن میں نہر باری دوآب کے ذریعے پانی حاصل کیا جاتا ہے۔ ان میں ڈیڑھ ماہ تک پانی مہیا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔

وہاں پر ایک مرکز گریز پمپ اور ایک بوائلر ہے جس کے ذریعہ سے پانی کو پمپ کے ذریعے حوض سے بلند و بالا ٹینکی تک پہنچایا جاتا ہے جو کارخانے، شیڈ کے علاوہ مختلف شاپوں اور سٹیشن کو ریلوے کے دیگر مقاصد کے لیے پانی فراہم کرتی ہے۔

یہ فیکٹری ہندوستان کی مکمل ترین فیکٹریوں میں سے ایک ہے۔ بھاری بھرکم اور بڑے حجم والی اشیاء کی ڈھلائی سے لے کر انتہائی سرعت اور پھرتی سے ان کو جوڑنے تک ریلوے کی کوئی ایسی ضرورت نہیں ہے جو یہاں سے پوری نہ ہوتی ہو۔ مشین شاپ میں روشنی مہیا کرنے کے لیے ایک چھ برشوں والی برقی مشین کام کرتی ہے اور اس کے ذریعے دن اور رات میں نہایت آسانی سے کام کیا جا سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ ایک چھاپہ خانہ ہے جہاں بھاپ سے چلنے والے پریس کام کرتے ہیں۔ ایک آئل مل بھی ہے جو ہر روز دو سے تین ٹن انتہائی خالص اور صاف شفاف ارنڈ کا تیل تیار کرتی ہے اور بازار کے مقابلے میں اس کی قیمت کہیں کم ہوتی ہے۔ ریلوے ورکشاپوں نے عزت مآب کمانڈر انچیف، قابل احترام لیفٹیننٹ گورنر پنجاب اور شمال مغربی صوبہ جات کے واجب الاحترام لیفٹیننٹ گورنر اور ان کے متعلقہ عملہ و ملازمین کے لیے نہایت خوبصورت گاڑیاں تیار کی ہیں۔ اس کے علاوہ مینیجر نارتھ ویسٹرن ریلوے، ٹریفک مینیجر یا ٹریفک سپرنٹنڈنٹ لوکو موٹو سپرنٹنڈنٹ، سپرنٹنڈنٹ، ویز اینڈ ورکس اور لوکو موٹو اور ٹریفک ڈیپارٹمنٹ کے تمام ضلعی افسران اور فوجی افسروں کے لیے بھی تیار کی ہیں۔

مختلف انواع و اقسام کے آلات کے استعمال، کام کرنے کے طریق کار اور نظم و ضبط کے باعث یہ مصروف فیکٹری شمالی ہندوستان میں دکھائی دینے والے تیز رفتار مناظر میں سے ایک نہایت قابل فہم اور دلچسپ منظر پیش کرتی ہے اور یہ صوبے کی دستکاریوں پر نہایت سودمند اثر ڈال رہی ہے۔

ریلوے بیرکس :- سٹیشن کے قرب و جوار میں لائن کے شمال اور جنوب میں ریلوے ملازمین کے لیے کوارٹر تعمیر کیے گئے ہیں۔ نیز ان میں فورمین، فائر مین، ڈرائیور، محافظین اور مکینک اپنے اہل خانہ کے ساتھ بڑے آرام سے رہائش پذیر ہیں۔ نہانے کے لیے ایک بہترین تالاب، ریلوے انسٹی ٹیوٹ، لائبریری، بلیئرڈ روم، تفریح کے لیے گراؤنڈ، تھیٹر اور کوآپریٹو سٹور ہیں۔ تھیٹر نہایت کشادہ ہے۔ تھیٹر کی کمپنی، ریلوے کے عملہ میں سے ہر عہدہ کے اراکین پر مشتمل ہے اور یہ عوام کے لیے تفریح مہیا کرتے ہیں۔ انہیں بڑی دلچسپی اور رغبت سے دیکھا جاتا ہے۔ کوآپریٹو برانچ، آئل مین سٹور کو تیل مہیا کرنے اور اجناس بہم پہنچانے کے علاوہ انگریزی طرز کے کپڑے، اشیاء اور مصنوعات بھی فراہم کرتی ہے اور یہ اپنی روٹی اور سوڈا واٹر بھی تیار کرتی ہے (15)۔ ریلوے کے کوارٹروں کو نہر کا پانی آبپاشی کے مقاصد کے لیے اور ریلوے کے ملازمین کو میونسپل واٹر ورکس کی جانب سے بھی استعمال کے لیے پانی فراہم کیا جاتا ہے۔ ایک گرجا بھی ہے۔ اس کے ساتھ ملحقہ چرچ مشنری سوسائٹی کے پادری کے لیے مفت کوارٹر بھی مہیا کیے گئے ہیں (16)۔ یہ گرجا جو ریلوے سٹیشن سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر جنوب کی طرف واقع ہے دراصل مسلمانوں کے ایک مزار میں قائم کیا گیا ہے (17)۔ اس کے اوپر گنبد ہے اور طاقچے بھی ہیں۔ اس میں 100 آدمیوں کی گنجائش ہے۔

سٹیشن کے قطعہ زمین نے مسجد دائی انگہ (شاہجہان کی دایہ) کا احاطہ کر لیا ہے اور اس کو اب ٹریفک سپرنٹنڈنٹ نارتھ ویسٹرن ریلوے کے دفتر کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس مسجد کے بارے میں پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے (18)۔

ریلوے انسٹی ٹیوٹ کے سامنے قطعہ زمین پر چند دیگر طویل بیرکیں بھی ہیں جن میں ریلوے کے دفتر مثلاً مینیجر، نگران حسابات، کیشیئر اور سپرنٹنڈنٹ ویز اینڈ ورکس واقع ہیں۔

شہر لاہور کے اطراف میں باغات :- سال 64-1863ء کو لاہور کے مضافات اور قرب و جوار کی فقید المثال ترقی اور تزئین و آرائش کے سلسلہ میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ گذشتہ چند سال سے لاہور کے شہریوں کو دریا کے رخ بدلنے کی وجہ سے بڑی دقت اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑا حالانکہ اس سے قبل وہ اسی دریا کو نہانے کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔ ایک میونسپل کمیٹی قائم کی گئی اور اسے یہ اہم اختیارات دیے گئے کہ وہ ترقیاتی منصوبوں پر عمل پیرا ہو سکتی ہے اور شہر کی ترقی و ترویج کے لیے نئے پروگرام شروع کر سکتی ہے۔ اس کے اہم اقدامات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ چالیس ہزار روپے کی لاگت سے نہر باری دوآب سے ایک اور نہر نکالی جائے۔ یہ کام تقریباً 12 ماہ میں مکمل ہوا۔ اس کا زیادہ تر مقصد یہ تھا کہ شہر کے تمام طبقوں کو سہولت اور آرام پہنچایا

جائے۔ بعد ازیں شہر کی دیوار کے گرد موجود خندق جو قبل ازیں گرد و غبار اور غیر صحت مندی کی علامت اور باعث تھی اسے بھر دیئے جانے کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس کے بعد اس مقام پر باغات لگائے گئے۔ ان میں درخت اور پھول لگائے گئے، روشیں اور راستے بھی بنائے گئے۔ یہ باغات دو میل کے دائرہ کار تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ اب اچھے حال میں نہیں۔ یہ کبھی شہر لاہور کے لوگوں کے لیے بہترین تفریح گاہ تھی لیکن اب یا تو ان کو پارک اور یا شاہراہ کی شکل دے دی گئی ہے ان کے فوائد کو بہت زیادہ سراہا گیا ہے۔

میو ہسپتال (19) :- یہ انتہائی خوبصورت اور کشادہ عمارت، انار کلی صدر بازار کے عقب میں، رتن چند کی سرائے کے جنوب مغرب میں ایک بلند قطعہ زمین پر واقع ہے۔ یہ عمارت اطالوی طرز تعمیر کی حامل ہے۔ عمارت کو باقاعدہ منظور شدہ حفظان صحت کے اصولوں پر تعمیر کیا گیا ہے۔ اس ہسپتال کو لاہور میڈیکل سکول کے ساتھ منسلک کر دیا گیا ہے۔ یہ عمارت دو منزلہ ہے۔ اس کی پیمائش 408 فٹ طویل اور ساڑھے 51 فٹ چوڑی اور 46 فٹ بلند ہے۔ اس کے اوپر 120 فٹ بلند چار منزلہ مینار ہے جس کے اوپر گنبد موجود ہے۔ اس کے چاروں کونوں میں 60 فٹ بلند تین منزلہ مینار ہیں۔

بڑی عمارت ایک سنٹر پر مشتمل ہے۔ شمال اور جنوب کے رخ دو قطاریں یا بازو ہیں۔ ان کو سنٹر کے آمنے سامنے بنایا گیا ہے۔ ہر بازو میں دو بڑی وارڈیں ہیں۔ ایک بالائی منزل پر اور دوسری پہلی منزل پر واقع ہے۔ ہر وارڈ 24 یا 12 مریضوں کے لیے تعمیر کی گئی ہے۔ ہر وارڈ 115 فٹ 6 انچ طویل 22 فٹ 6 انچ چوڑی اور 18 فٹ بلند ہے۔ چنانچہ اس کا کل رقبہ 6,777 مربع فٹ اور بالائی رقبہ 2,598 فٹ ہے۔ اس میں ہوا کے لیے نہایت شاندار انتظامات کیے گئے ہیں۔ ہر وارڈ کی ہر جانب سات دروازے اور آخری حصہ میں ایک دروازہ ہے۔ ہر دروازہ 4 فٹ 2 انچ چوڑا اور 7 فٹ 9 انچ بلند ہے۔ چنانچہ ہر ایک میں 32 مربع فٹ 3 انچ کا ایک کھلا در ہے کیونکہ ہر بڑی وارڈ کے 16 دروازے ہیں اس لیے تازہ ہوا کے لیے 416 مربع فٹ کی جگہ دستیاب ہے۔ عمارت کی بالائی منزل پر پہنچنے کے لیے 12 فٹ چوڑی سیڑھی ہے۔ اس کو بستروں اور سٹریچرز وغیرہ کو اوپر نیچے لے جانے کے لیے بالکل سیدھا بنایا گیا ہے۔

نچلی وارڈیں مرد مریضوں کے لیے مخصوص ہیں۔ ان میں سے مغرب کی جانب والی مسلمانوں کے لیے اور مشرقی جانب والی دیگر مذاہب کے لیے ہیں۔ عمارت کی نچلی منزل پر واقع سنٹر کو ڈسپنسری اور میڈیکل سٹور روم کے علاوہ بیرونی مریضوں کے معائنہ کمروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

ان تینوں میں سے ایک میڈیکل کیسوں کے لیے ایک جراحی کے لیے اور ایک آنکھوں کی بیماریوں کے لیے مخصوص ہے۔ وہاں پر مریضوں کے نجی معائنے کے لیے اور بیماریوں کی وجوہات کے بذریعہ خورد بینی معائنے کے لیے بھی کمرے موجود ہیں۔

مرکزی عمارت کی بالائی منزل پر جنرل سٹور روم اور امراض چشم کے مریضوں کے لیے وارڈیں ہیں۔ ان کی کھڑکیوں پر نیلے رنگ کا کاغذ لگایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ریذیڈنٹ کیمیکل کلرکوں کے لیے کمرے بھی موجود ہیں۔ جبکہ شمالی برآمدہ آپریشن روم کے لیے فراہم کیا گیا ہے۔ اس کی محرابوں میں سے ایک میں 7 x 3 فٹ کا ایک شیشہ لگایا گیا ہے۔ سال کے سبھی موسموں میں اس کے ذریعہ چھت کی طرف سے روشنی آتی رہتی ہے۔

اس کے علاوہ متعدی بیماریوں کے لیے بھی ایک وارڈ موجود ہے۔ اس کو بڑے ہسپتال سے ایک دیوار کے ذریعے علیحدہ کیا گیا ہے۔ ایک بہت بڑا کمرہ بھی ہے جس کے چار دروازے ہیں۔ خوب ہوادار ہے۔ چھت کی روشنی بھی خاصی مقدار میں آتی ہے۔ اس کو چیچک اور دیگر بیماریوں کے انتہائی خطرناک کیسوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

عمارت کا ڈیزائن سپرنٹنڈنٹ انجینئر مسٹر پرڈن نے تیار کیا اور یہ رائے کنہیا لال ایگزیکٹو انجینئر کی زیر نگرانی تعمیر کی گئی۔ اس پر کل لاگت 8-3-158,941 روپے آئی اس میں سے 100,000 روپے شاہی خزانے سے اور باقی ماندہ مقامی طور پر جمع کیے گئے فنڈ سے حاصل کیے گئے۔ بلدیہ لاہور نے 26,697 روپے کا عطیہ پیش کیا۔ آنجہانی وائسرائے ایرل میو نے اکتوبر 1871ء میں ہسپتال کا دورہ کیا اور نہایت توجہ سے ہر ایک حصہ کا معائنہ کیا۔ وہ بہترین انتظامات پر بہت خوش ہوئے۔ ان کی رضامندی سے اس کو "میو ہسپتال" کہا جانے لگا۔

پرنس البرٹ وکٹر ہسپتال :۔ میو ہسپتال میں مریضوں کے لیے جگہ میں توسیع اور ترقی کی ضرورت کو کافی عرصہ سے محسوس کیا جا رہا تھا۔ ظاہر ہے پنجاب کے دارالحکومت لاہور میں یورپین اور یوریشین لوگوں کے نادار اور مفلس طبقوں کے لیے کوئی مناسب ہسپتال نہیں تھا۔ جبکہ موجودہ ہسپتال مقامی لوگوں کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ناکافی تھا۔ یہ موجودہ ہسپتال جس کو ہندوستان کے مشہور ترین وائسراؤں میں سے ایک کا نام دیا گیا ہے، یہ محض صوبے کے سبھی حصوں سے آنے والے مریضوں کے علاج کے لیے ایک مقامی ادارہ ہی نہیں ہے بلکہ شمالی ہندوستان میں طب کی تعلیم دینے کا ایک مرکز بھی ہے۔ اس کی تزئین و آرائش اور تکمیل پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر عزت مآب سر جیمز لائل کے ہاتھ سے ہوئی۔ انہوں نے 24 جنوری 1890ء میں

لارنس ہال میں منعقد ہونے والے عوامی اجلاس میں پنجاب کے شہریوں سے اپیل کی کہ لاہور میں عزت مآب پرنس البرٹ وکٹر آف ویلز کی آمد کے موقع پر وہ اس موقع کی مناسبت سے اور اس کی یادگار کے طور پر ملکہ عالیہ کو اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لیے کوئی مناسب یادگار تعمیر کرائیں۔ گورنر صاحب کے مشورے اور حاضرین کی رضامندی کے بعد یہ طے ہوا کہ شہزادہ عالم اور ملکہ عالیہ چونکہ ہر اس چیز میں دلچسپی لیتے ہیں جو بیماروں کی مدد کے لیے ہو، اس لیے وہ اس کے علاوہ کسی اور یادگار کو قبول نہیں کریں گے۔ چنانچہ یہ یادگار اس مقصد کے لیے ہونی چاہیے جس کے ذریعے غریب اور ضرورت مند لوگوں کو حقیقتاً فائدہ پہنچے۔ چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ شہزادہ عالم کی آمد کے موقع کی یادگار کے طور پر میو ہسپتال میں ان کے نام سے منسوب مزید ایک اور ہسپتال کا اضافہ کر دیا جائے۔ اس کے لیے ہسپتال سے جگہ مہیا کر دی جائے گی۔ اب اس پر یورپین کا قبضہ ہے۔ مقامی مریضوں کے لیے اچھا خاصہ انتظام ہے اور یہ اس کے ساتھ ساتھ یورپیوں اور یوریشین کے غریب طبقوں کے لیے مناسب جگہ فراہم کرتا ہے۔

پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر عزت مآب سر جیمز لائل نے 14 مئی 1890ء کو اس ہسپتال کا سنگ بنیاد رکھا۔ یہ ہسپتال تین علیحدہ عمارتوں پر مشتمل ہے۔ ان کو حکومت کی منتخب کردہ اور میو ہسپتال سے ملحقہ کھلی جگہ پر تعمیر کیا گیا۔ بڑی عمارت دو منزلہ ہے۔ اس میں 28 مریضوں کے لیے گنجائش ہے۔ یعنی دو بڑی جنرل وارڈوں میں سے ہر ایک کے لیے 10 مریضوں کا بندوبست ہے اور بالائی منزل کی وارڈ میں 8 مریضوں کے لیے گنجائش ہے۔ اس کے علاوہ یورپین یا مقامی باشندوں کے لیے کئی علیحدہ کمرے بھی موجود ہیں۔

دوسرا بلاک ایک علیحدہ دو منزلہ عمارت پر مشتمل ہے۔ اس کو اچھوت اور متعدی بیماریوں مثلاً چیچک، خسرہ وغیرہ کے انتہائی پیچیدہ مریضوں کے علاج معالجہ کے لیے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس میں 8 مریضوں کے لیے گنجائش ہے۔ اس کے کمرے کشادہ اور ہوادار ہیں۔

تیسرا بلاک ہسپتال کے نرسنگ سٹاف کے لیے علیحدہ کوارٹروں پر مشتمل ہے۔ اس عمارت پر بمعہ فرنیچر اور عام ساز و سامان کے کل 1,08,580 روپے کی لاگت آئی۔

البرٹ وکٹر میموریل ہسپتال کا رسمی افتتاح عزت مآب سر جیمز لائل نے بروز جمعہ یکم جنوری 1892ء کو ملکہ عالیہ کے "ملکہ عالم" کا خطاب اختیار کرنے کی سالگرہ کے موقع پر کیا۔ صوبے کی شاہی حکومت کے ساتھ وفاداری کی یادگار کے طور پر تعمیر کردہ ادارے کے افتتاح کے لیے اس سے بہتر دن کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ عزت مآب گورنر نے اس موقع پر فصیح و بلیغ تقریر کرتے

ہوئے شہزادہ عالم (جن کے نام سے ہسپتال منسوب ہے) کی زندگی میں رونما ہونے والے مبارک واقعہ کی طرف اشارہ کیا کیونکہ ان کی منگنی شہزادی وکٹوریہ میری آف ٹیک کے ساتھ طے ہوئی۔ حاضرین محفل نے نہایت خلوص دل سے شہزادے اور ان کی منگیتر کے لیے طویل اور خوش و خرم ازدواجی زندگی کی دعا کی(20)۔

لیڈی لائل ہوسٹل برائے میڈیکل طالبات :- لیڈی لائل کے نام سے منسوب یہ نئی عمارت لیڈی ایچی سن ہسپتال اور لاہور میڈیکل کالج کے قریب واقع ہے۔ اس کو ہندوستانی خواتین کے لیے ، عورتوں کے ذریعے طبی امداد بہم پہنچانے کے لیے کاؤنٹیس آف ڈفرن ایسوسی ایشن کی پنجاب شاخ کے سلسلہ میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس اقامت گاہ کو مستقل اچھائی اور خود مختار اداروں کی امداد کے سلسلہ میں قائم کیا گیا۔ وہاں پر دوران تربیت طالبات کو قیام کی سہولت دی جاتی ہے۔ ان کی ضروریات کو پورا کیا جاتا اور پڑھائی کی نگرانی کی جاتی ہے۔ اس ادارے نے طالبات کو بیشمار فوائد پہنچائے ہیں اور طبی پیشہ میں خواتین کی شمولیت پر ہونے والے اعتراضات کو بڑی حد تک ختم کرنے میں مدد دی ہے۔ اس عمارت کے لیے جگہ حکومت پنجاب نے دی۔ جبکہ عمارت کی تعمیر کے لیے عام طور پر جمع کیے گئے فنڈز کی رقم 10,000 روپے تھی اور اپریل 1889ء میں مہاراجہ کشمیر کی جانب سے 50,000 روپے کا عطیہ موصول ہوا۔

اس عمارت کا ڈیزائن ہندوستانی جماعت کی 16 طالبات ، اسسٹنٹ سرجن یا انگریزی جماعت کی چار طالبات کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ لیڈی سپرنٹنڈنٹ اور ملازمین کے لیے کوارٹر بھی ہیں۔

اس عمارت کا سنگ بنیاد مارچینس آف لینڈز ڈاؤن نے 25 نومبر 1889ء کو رکھا۔ اس میں نوشہرہ کا پالش کیا ہوا سنگ مرمر لگایا گیا ہے۔ اس پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:-

"لیڈی لائل ہوسٹل برائے طالبات"
یہ تختی فضیلت مآب مارچینس آف لینڈز ڈاؤن نے
بروز سوموار 25 نومبر 1889ء کو نصب کی۔
کاؤنٹیس آف ڈفرن فنڈ کی پنجاب شاخ
"عزت مآب مہاراجہ جموں و کشمیر پرتاپ سنگھ کا خصوصی عطیہ"

یہ عمارت لاہور پراونشل ڈویژن کے ایگزیکٹو انجینئر رائے بہادر گنگا رام کی زیر نگرانی 1890ء کے اختتام پر مکمل ہوئی اور اس نے طالبات کے لیے واقعتاً حقیقی اقامت گاہ کے طور پر ثابت کیا ہے (21)۔ اس کو نہایت شاندار ڈیزائن پر تعمیر کیا گیا ہے۔ نہایت کشادہ ہے اور حفظان صحت کے تمام تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ لاہور میڈیکل کالج میں خواتین کو نہایت اعلیٰ طبی تعلیم و تربیت دی جاتی ہے اور ان کی تربیت کے لیے خاص انتظامات کیے گئے ہیں۔ ہوسٹل برائے طالبات کی نزدیکی اس ادارے کے لیے (جو پنجاب کے انتہائی قابل گورنر کے نام سے منسوب ہے) سہولت اور طاقت کا سرچشمہ ہے۔

لاہور ویٹرنری سکول :۔ لاہور ویٹرنری سکول، میو ہسپتال کے نزدیک واقع ہے۔ سکول کے ساتھ وابستہ عمارات کو 1881ء سے 1889 تک کے عرصہ میں مختلف ادوار میں تعمیر کیا گیا۔ سب سے پہلے یہ ایک عارضی پناہ گاہ کے طور پر بنائی گئی تھی۔ اس کی عمارات 82-1881ء میں تعمیر کی گئیں جو ایک گھوڑا ہسپتال، ہسپتال برائے مویشیاں، ایک آپریشن شیڈ اور پوسٹ مارٹم کے کمرے پر مشتمل تھیں۔ ان عمارات کی دیواریں "جھمپ" کی اور چھتیں گھاس پھونس کی تھیں۔ حکومت کے 4,494 روپے اس پر خرچ ہوئے۔

اضافی بیرونی مکانات 83-1882ء میں 1,617 روپے کی لاگت سے اور چار دیواری دروازہ وغیرہ اسی سال کے دوران 2,469 روپے کی لاگت سے تعمیر کیے گئے۔

1888ء میں نئے کوارٹر تعمیر کیے گئے جو مستقل اصطبلوں کے چار بلاکوں پر اور (ہر بلاک میں چھ طویلے ہیں) نیم مستقل اصطبلوں کے ایک بلاک پر مشتمل ہیں۔ اس میں 12 طویلے اور ایک شہ نشین تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک نیا لوہار خانہ، پوسٹ مارٹم، چیرپھاڑ کا تھیٹر اور ملازمین کے مکانات بھی تعمیر کیے گئے۔ ان عمارات کے لیے تشکیل دی گئی کمیٹی 1887ء میں اجلاس کے لیے بلائی گئی۔ اس نے قرین مصلحت یہ مشورہ دیا کہ 12 طالبعلموں اور پاس شدہ طالبعلموں کے کوارٹروں پر مشتمل ایک بلاک تعمیر کیا جائے اور اس کو بجٹ میں پیش کر دیا گیا۔ یہ عمارات 18,629 روپے کی لاگت سے مکمل ہوئیں۔

لوہار خانے کا ڈیزائن تیار کرتے وقت گھوڑوں کے لیے چار طویلوں کی گنجائش رکھی گئی اور لوہار خانے کے لیے سہولت پیدا کی گئی۔ اس کا انتظام کچھ اس طرح کیا گیا تاکہ شمال کی طرف سے آنے والی روشنی اس وقت گھوڑے کے پاؤں پر پڑے جب نعل بندی کے لیے اس کا پاؤں اٹھایا گیا ہو۔

لاہور ویٹرنری سکول کو 1882ء میں اس لیے قائم کیا گیا تھا کہ مقامی سلوتریوں کو تعلیم و تربیت کے بعد مقامی ہسپتال اسسٹنٹوں کے معیار کے مطابق بنایا جائے۔ اس کے قیام سے قبل صرف پونا ہی میں ویٹرنری کالج موجود تھا۔ یہ ایسی غیر موزوں جگہ پر قائم تھا جہاں سے شمالی ہند کو کوئی عملی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ نہ ہی حکومت کے محکمہ فوج کے یورپی ویٹرنری سرجن اس پوزیشن میں تھے کہ وہ ملک میں انتہائی سفاکی اور لاپرواہی سے وقوع پذیر جانوروں کی شرح اموات کی تخفیف میں کوئی مدد کر سکیں۔ 1871ء میں انسداد بے رحمی حیواناں کے کمشنروں نے حکومت ہند پر زور دیا کہ ہندوستان کے مقامی باشندوں کو سلوتری کی تربیت دینے کا انتظام کیا جائے اور 1876ء میں سٹڈ کمیشن بھی اسی موضوع کو اعلیٰ حکام کے نوٹس میں لایا۔ 80-1878ء کی افغان جنگ کے دوران باربرداری کے جانوروں کی شرح اموات میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ لہٰذا ویٹرنری سرجنوں کو سلوتری عملے کے ہمراہ خیبر اور کرم کے دروں کو جانے والی پنجاب کی بڑی بڑی شاہراہوں پر مقرر کر دیا گیا۔ گھوڑوں کی نسل کشی کے محکمہ کے جنرل سپرنٹنڈنٹ نے ہسپدار میں سلوتریوں کی تربیت کے لیے ایک سکول شروع کیا لیکن 1881ء میں اسے لاہور منتقل کر دیا گیا۔
موجودہ سکول یا کالج کو 3 مئی 1882ء میں 50 طلباء کے ساتھ شروع کیا گیا۔

اس سکول میں پڑھائے جانے والے مضامین میں علم البدن (اناٹوی)، علم عضویات (فزیالوجی)، ابتدائی کیمیاء، علم الادویہ، مویشیوں کے متعلق علم الامراض اور جانوروں کی دیگر بیماریوں سے متعلق تعلیم شامل ہیں۔ اس کے علاوہ عضویاتی جراحی، ادویہ اور عملی ویٹرنری سرجری جو تمام پالتو جانوروں کے لیے ہے، جانوروں کی دیکھ بھال، چھوٹے آپریشنوں اور نعل بندی کے اصولوں اور مشق کے بارے میں کچھ تکنیکی تربیت بھی دی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں گھوڑوں کی صحت، بیماری، وضع قطع اور طرز عمل کے موضوع پر خصوصی تعلیم دی جاتی ہے۔ شہری اور فوجی محکموں میں ویٹرنری اسسٹنٹوں کی خدمات حاصل کرنے کے لیے طلب میں زبردست اضافہ ہو رہا ہے اور مقامی حکومتوں نے بھی ان کی قدر و قیمت کو محسوس کرنا شروع کر دیا ہے۔

اس ادارے سے لاہور اور اس کے قرب و جوار کو بہت سے فوائد حاصل ہو رہے ہیں اور یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ مویشیوں کے ہسپتال سے لوگ بہت زیادہ رجوع کر رہے ہیں۔ سکول نے جو شہرت حاصل کی ہے وہ صوبائی سطح سے بہت زیادہ ہے۔ پرنسپل صاحب سے شمال مغربی، مرکزی صوبہ جات اور مقامی ریاستوں کے بارے میں شرائط داخلہ کے سلسلہ میں کئی مرتبہ استفسار کیا گیا ہے۔

گورنمنٹ ہاؤس :۔ گورنمنٹ ہاؤس کو محمد قاسم خاں (اکبر کا والدہ کی طرف سے ایک عزیز) کے مزار کے ارد گرد تعمیر کیا گیا ہے۔ وہ شاہجہاں کے دور میں فوت ہوا اور یہاں دفن کیا گیا۔ قاسم خاں پہلوانوں کا بہت بڑا سرپرست تھا۔ موجودہ مزار کی غربی جانب اس نے ایک محلہ آباد کیا اور ایک وسیع و عریض مسجد تعمیر کرائی تھی۔ اس محلہ کی عمارات میں سے صرف مسجد ہی رنجیت سنگھ کے دور میں زمانے کی دست برد سے محفوظ رہی۔ رنجیت سنگھ نے اسے بارود تیار کرنے کے لیے میگزین اور سپاہیوں کے کوارٹروں میں تبدیل کر دیا تھا۔ برطانوی دور میں مسجد نزولی جائیداد بن گئی لیکن بعد ازیں مزنگ کے لمبردار سردار خاں کی درخواست پر اسے آزاد کر دیا گیا۔ اس نے مسجد کو مسمار کر کے اس کی اینٹیں بہت زیادہ منافع پر فروخت کیں۔ مسجد کے ساتھ ملحقہ بہت بڑا کنواں جس کو بارود سے بھر دیا گیا تھا حادثاتی طور پر پھٹ گیا جس کے نتیجے میں دو زمیندار اور کئی بیل موقع پر ہی ہلاک ہو گئے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور حکومت تک مزار کے نزدیک واقع زمین کو پہلوانی کے لیے استعمال کیا جاتا رہا اور مزار کو گنبد کشتی والا کہا جاتا رہا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور حکومت کے اختتام پر راجہ تیجا سنگھ کے چچا جمعدار خوشحال سنگھ نے اس کے قریب مثمن شکل کا ایک نہایت شاندار مکان تعمیر کرایا۔ اس کو وہ خود اور اس کی فوج کے افسر استعمال کرتے تھے۔ اس مکان کے ارد گرد ایک باغ تھا جس کے قریب خوشحال سنگھ کی زیر کمان فوجوں کی بیرکیں تھیں۔ پنجاب کے الحاق کے بعد اس پر سب سے پہلے میجر میکریگر ڈپٹی کمشنر اور پھر سر ہنری لارنس قابض ہوئے۔ جب سر رابرٹ منٹگمری نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو حکومت نے اس مکان کے مالکانہ حقوق حاصل کرنے کے بعد اس کے بدلے میں جمعدار خوشحال سنگھ کی جائیداد کے وارث راجہ تیجا سنگھ کو سیالکوٹ میں دیوان حاکم رائے کا ضبط شدہ مکان دے دیا اور عمارت کو گورنمنٹ ہاؤس کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ جمعدار خوشحال سنگھ کے مکان کا کوئی حصہ باقی نہیں بچا لیکن مکان کی نچلی منزل کے ایک حصہ میں پرانے مزار کو ابھی تک دیکھا جا سکتا ہے۔ گنبد کی اندرونی جانب کو اب طعام گاہ کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے اور حقیقتاً یہ بہت قابل ستائش طعام گاہ بن گیا ہے۔ اس کے چاروں طرف کی محرابیں، الماریوں کے لیے طاقچوں کا کام دیتی ہیں۔ یہ کمرہ گنبد کی درزوں سے آنے والی روشنی سے منور ہو جاتا ہے۔ دیواروں کو مینا کاری سے آراستہ کیا گیا ہے اور مرکزی ہال کی محرابوں کو خوبصورت نقش و نگار سے مزین کیا گیا ہے۔ باغات میں چند نہایت شاندار درخت اگائے گئے ہیں اور نہانے کا ایک بہت عمدہ تالاب ہے۔

ایچی سن کالج :۔ پنجاب چیف کالج کو، پنجاب کے آنجہانی لیفٹیننٹ گورنر سر چارلس ایچیسن کا نام دیا گیا۔ دراصل یہ کالج بھرت پور میں تعینات پولیٹیکل ایجنٹ کیپٹن والٹر کی 1869ء میں پیش کردہ تجویز پر شروع ہونے والی تحریک کے نتیجہ میں قائم ہوا۔ سب سے پہلے اجمیر میں میو کالج اور کاٹھیا واڑ میں راجکمار کالج کی شکل میں قائم کیا گیا لیکن اس کی اصل ابتداء اس وقت انبالہ کے ڈپٹی کمشنر کیپٹن ٹیگے کی تجویز پر 1864ء میں لیفٹیننٹ گورنر پنجاب سر ڈونالڈ میکلوڈ کے انبالہ میں قائم کردہ وارڈز سکول سے ہوئی۔ فنانشل کمشنر کرنل لیک نے انتہائی گرمجوشی سے اس کی حمایت کی اور امداد میں حصہ لیا۔ طویل بحث مباحثے کے بعد پنجاب چیف کالج کا آئین منظور ہوا۔ اجلاس میں شریک سرداروں اور شرفاء کی کمیٹی کی منظور کردہ تجاویز کے مطابق اس کے قوانین تشکیل دیے گئے۔ اس ادارے کے مقاصد میں پنجاب کے حکمران سرداروں، اعلیٰ خاندانوں کے نوجوانوں اور نابالغوں کو اگر وہ قواعد و ضوابط پر پورا اترتے ہوں، مجلس آئین (کورٹ آف وارڈز) کی سرپرستی میں تعلیم دینا بھی شامل ہے۔

کالج کی صدر عمارت دو طرز ہائے تعمیر کا امتزاج ہے (پہلی منزل کا منصوبہ جے پور کے ایگزیکٹو انجینئر کرنل جیکب نے تیار کیا اور ارتفاع کا نقشہ میو سکول آف آرٹ لاہور نے بنایا تھا)، اس عمارت میں کرہ ہائے جماعت، ایک لائبریری اور مطالعہ گاہ، ایک لیبارٹری، کھیل کا کمرہ، ایک تھیٹر یا لیکچر روم اور دفتر کے کمرے ہیں۔ طلباء کے لیے ہوسٹل، کالج سے علیحدہ ایک دوسرے بلاک میں تعمیر کیے گئے ہیں۔ اس میں گورنر کے لیے ایک کشادہ مکان اور ایک ڈسپنسری بھی موجود ہے۔ ان عمارات کی تعمیر پر کل 3,85,520 روپے لاگت آئی۔

اس عمارت کا سنگ بنیاد عزت مآب ایرل آف ڈفرن اور ایوا نے 3 نومبر 1886ء میں رکھا۔ اس موقع پر عالی جناب ڈیوک آف کوناٹ اور ڈچیس آف کوناٹ نے اپنی تشریف آوری سے محفل کو رونق بخشی۔

لیڈی ایچی سن ہسپتال برائے خواتین :۔ میو ہسپتال کے سامنے لیڈی ایچی سن ہسپتال برائے خواتین واقع ہے۔ اس کو لیڈی ڈفرن کے پروگرام ہی کے سلسلہ میں قائم کیا گیا تھا تاکہ ہندوستان کی خواتین کو عورتوں کے ذریعہ طبی امداد فراہم کی جائے۔ اس کا سنگ بنیاد 15 فروری 1887ء کو رکھا گیا۔ یہ پوری عمارت 1889ء میں 62,733 روپے کی لاگت سے تعمیر ہوئی۔ اس میں گودام اور مردہ خانہ کی تعمیر شامل نہیں ہے۔ وہ بالترتیب 809 روپے اور 651 روپے کی لاگت سے تعمیر کیے گئے۔

بڑی عمارت میں مندرجہ ذیل گنجائش موجود ہے:۔

آٹھ مریضوں کے لیے جنرل وارڈ، چار مریضوں کے لیے علیحدہ وارڈ، بیرونی مریضوں یا گاہے بگاہے آنے والے مریضوں کے لیے آٹھ بستروں کی وارڈ، انتظار گاہ، معائنے کا کمرہ، ڈسپنسری، ادویات کا سٹور، نرسوں کا کمرہ، پروفیسروں کا کمرہ بمعہ غسلخانہ، منتظمہ کا کوارٹر۔

اسی چھت کے نیچے خصوصی وارڈوں کے دو اور بلاک تعمیر کیے گئے ہیں۔ ان کو بڑی عمارت سے ایک گلی کے ذریعے منسلک کر دیا گیا ہے۔ خاص کیسوں کے چھ مریضوں کے لیے گنجائش ہے۔ عام کیسوں اور خاص کیسوں کے لیے کل 32 بستروں کا انتظام کیا گیا ہے۔ ہر خصوصی وارڈ کے ساتھ ایک طعام گاہ ہے۔ اس میں داخلہ بلاک کے عقب میں واقع دو خانساماں گھروں کے قریب ایک دروازہ کے ذریعے ہوتا ہے۔ ایک مسلمانوں کے لیے اور دوسرا ہندوؤں کے لیے ہے۔ اس عمارت کی چار دیواری کی شمال مغربی جانب، نرسوں اور طلباء کے لیے مہیا کیے گئے کوارٹروں کی قطار ہے۔ اس کے علاوہ ملازمین کے مکانات کی قطار بھی اسی کے ساتھ ہے۔

عمارت کے ارد گرد جنوب اور مغرب کی طرف ساڑھے چھ فٹ بلند دیوار تعمیر کی گئی ہے۔ صدر عمارت کے دروازے کے عین سامنے جنوب کی طرف 14 فٹ چوڑا ایک بہت بڑا دروازہ ہے اور شمال مغربی کونے میں شہر کی طرف سے آنے والے پیدل راہگیروں کے لیے 5 فٹ چوڑا ایک اور دروازہ ہے۔

لیڈی ایچی سن ہسپتال برائے خواتین کا رسمی افتتاح، فضیلت مآب مارچینز نیس آف ڈفرن اینڈ اوا نے 15 نومبر 1888ء میں کیا۔ اس ہسپتال کو اس لیے قائم کیا گیا تھا کہ دائیوں کو طب کی عملی تربیت دی جائے اور ان کے قیام و طعام کا بہتر بندوبست کیا جائے۔ یہ ادارہ ڈاکٹر بائی ایلیے کی بہترین نگرانی میں نہایت عمدہ فرائض سرانجام دے رہا ہے اور روزانہ آنے والے مریضوں کی تعداد میں بھی دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔

محکمہ آب رسانی :۔ آب رسانی کی سکیم کو متعارف کرانے سے قبل قدیم شہر لاہور کے باشندے پانی کے حصول کے سلسلہ میں شہر کے اندر موجود کنوؤں پر انحصار کرتے تھے لیکن آبادی کے گنجان ہونے کے باعث اور حفظان صحت کے انتظامات اور احتیاطی تدابیر کو بالائے طاق رکھنے کی وجہ سے مختلف ادوار کے کھنڈرات اور کوڑا کرکٹ نے زمین کو اس قدر پراگندہ کر دیا تھا کہ پانی کے کنویں استعمال کے بالکل قابل نہیں رہے اور اسی چیز کو ڈاکٹروں نے لاہور میں شرح اموات بڑھنے کا باعث قرار دیا۔ اس بڑے نقص کو دور کرنے کے لیے اور شہر کے لوگوں کو تازہ اور بالکل صاف

ستھرا پانی فراہم کرنے کے لیے یہ تجویز کیا گیا کہ دریا کی تہہ میں کنویں کھودے جائیں یا پانی سے لبریز زمین میں قائم کیے جائیں۔ کنوؤں کے لیے شہر کے شمال میں ایک میدان کا انتخاب کیا گیا۔ یہ زمین چند سال پیشتر دریا میں شامل تھی۔ یہ زمین عملی طور پر ان چھوئی تھی۔ ہر قسم کی نامیاتی آلائشوں وغیرہ سے پاک تھی۔ مزید برآں اس زمین کو عمارتی مقاصد وغیرہ کے لیے بھی استعمال کیے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ دریا کی زبردست طغیانی کے باعث اس جگہ سیلاب آگیا تھا۔ چنانچہ اس میدان میں آب رسانی کے لیے کنویں کھودنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ جگہ شہر کے بالکل قریب تھی اور اس میں زمین کی گندگی اور آلائش وغیرہ کو روکنے کے لیے احتیاطی تدابیر بھی فوری طور پر کی جا سکتی تھیں چنانچہ یکے بعد دیگرے چھ کنویں کھودے گئے۔ دریا کی زمین پر کھودے گئے کنوؤں کے پانی کو پمپوں کے ذریعے نکال کر کافی بلندی پر بنائی گئی ٹینکیوں میں پہنچایا جاتا ہے تاکہ شہر اور اس کے مضافات کو زور دار پریشر کے ذریعے پانی پہنچایا جا سکے۔ اس کی تقسیم لوہے کی نالیوں اور پائپوں کے ذریعے ہوتی ہے۔

پمپ ویل اور پمپنگ سٹیشن ایک دوسرے کے قریب، پانی مہیا کرنے والے کنوؤں کے نزدیک واقع ہیں۔ انجن ہاؤس پمپ ویل کے قریب اس کی غربی جانب واقع ہے۔ کنویں کے مرکز سے انجن ہاؤس کی بیرونی دیوار کا فاصلہ 22 فٹ ہے۔ انجن بوائلر اور سٹور روم ایک ہی چھت تلے ہیں۔ ان کو دیواروں کے ذریعے علیحدہ کیا گیا ہے۔ آنے جانے کے لیے دروازے ہیں۔ یہ اینٹوں سے تعمیر کی گئی عمارت 74 فٹ طویل اور 40 فٹ چوڑی ہے۔ اس کی چھت میں آہنی کڑیاں اور لوہے کے موٹے موٹے بالے لگائے گئے ہیں۔

دھوئیں کی چمنی انجن ہاؤس کی مشرقی جانب دیواروں سے تقریباً 20 فٹ کے فاصلے پر قائم ہے۔ اس کو کنکریٹ سے لبریز اور ایک دوسرے کے قریب واقع چار کنوؤں پر قائم کیا گیا ہے۔ یہ انجن روم کے اوپر ایک ہی انبار پر ایستادہ ہے۔ کنوؤں کے اوپر سطح آب کے مساوی پختہ اینٹوں سے مربع شکل کا 15 فٹ 2 انچ طویل اور چار فٹ موٹا چبوترہ تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کے اوپر 94 فٹ بلند دھوئیں کی چمنی ایستادہ کی گئی ہے۔ یہ مثمن شکل کی ہے۔ دھوئیں کے نکاس کے لیے آتشی اینٹوں کی جھریاں بنائی گئی ہیں۔

کنوؤں سے حاصل شدہ پانی کو جمع کرنے کے لیے شہر کے باہر 1881ء میں پختہ اینٹوں سے تعمیر کی گئی ٹینکیاں جیسے ہی ان میں پانی داخل کیا گیا، مسمار ہو گئیں اور مرمت کے قابل نہ رہیں۔ 1883ء میں اینٹوں کی ٹینکیوں کو گرا دیا گیا اور 84-1883ء میں اس جگہ لوہے کی

چار ٹینکیاں تعمیر کی گئیں۔ لوہے کی ٹینکیوں (ہر ایک میں 2,58,750 گیلن پانی کی گنجائش ہے) کو آپس میں لوہے کے تین تین پائپوں کے ذریعے منسلک کر دیا گیا ہے۔ زائد پانی کے اخراج کے لیے شمال کی طرف بھی پائپ لگا دیئے گئے جہاں سے فالتو پانی نالیوں میں بہا دیا جاتا ہے۔ ان ٹینکیوں کو بیرونی جانب سے نالیوں اور والو کے ذریعے جنوب کی طرف کنوؤں سے منسلک کر دیا گیا ہے۔ اسی طرف والو ہاؤس واقع ہے۔ ٹینکیوں کو اندرونی جانب چاکلیٹ رنگ کے سلیکیٹ پینٹ سے رنگ کیا گیا ہے اور بیرونی جانب تارکول لگائی گئی ہے۔ چھت کو تارکول کی دوہری تہہ لگائی گئی ہے۔ اس کو برتن کے ذریعے لگایا گیا ہے تاکہ پائپوں اور اس کے جوڑوں میں کوئی درز رہ گئی ہو تو وہ بھر جائے اور پانی ان میں سے نہ بہے۔

پکی ہوئی اینٹوں اور سیمنٹ سے تعمیر کردہ ایک بہت بڑی چار دیواری ان ٹینکیوں کے ارد گرد قائم کر دی گئی ہے۔ ٹینکیوں اور دیواروں کے علاوہ ٹینکیوں کے درمیان والی جگہ کو لکڑی کی چھت سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔ پانی کا سارے کا سارا ذخیرہ مکمل طور پر ڈھانپ دیا گیا ہے اور اسے موسمی اثرات سے محفوظ کر دیا گیا ہے۔

اس ذخیرے کا ڈیزائن آنجہانی مسٹر لیزلی کلارک ایم۔ ای۔ ایم۔ انسٹ، سی۔ ای نے تیار کیا تھا لیکن مسٹر جارج برکلے نے اس میں کافی رد و بدل کیا۔ اس کو کراچی کے کنٹریکٹرز میسرز کوٹر اینڈ کمپنی نے میسرز رنج فلوائٹ اینڈ بل کے تعاون سے رائے بہادر کنہیا لال کی نگرانی میں تعمیر کرایا۔ اس ذخیرے کو لوگوں کے عام استعمال کے لیے آنجہانی لیفٹیننٹ گورنر پنجاب عزت مآب سر چارلس ایچی سن نے 30 جون 1881ء میں کھولا۔ اس وقت سے لے کر اب تک آب رسانی کا سلسلہ جاری ہے۔

لاہور کو صاف پانی فراہم کرنے کا منصوبہ لاہور کے ڈپٹی کمشنر میجر (اب کرنل) نسبٹ نے بنایا تھا جبکہ بالائی کام مثلاً نئی ٹینکیاں وغیرہ تعمیر کرانے کا کام ڈپٹی کمشنر کرنل بیڈن کے دور میں مکمل کیا گیا۔ اس پر کل لاگت 17,06,500 روپے آئی۔ ہندوستان میں پہلی مرتبہ اس نوعیت کا کوئی کام شروع کیا گیا تھا۔ اس کی وجہ سے لاہور کی خوشحالی اور دیگر کاموں میں نمایاں ترقی ہوئی۔

لاہور میڈیکل کالج :۔ یہ عمارت میو ہسپتال کے جنوب میں واقع ہے۔ اس کو میو ہسپتال کی طرز پر یعنی " اطالوی " طرز تعمیر پر بنایا گیا ہے۔ یہ عمارت ایک منزلہ ہے۔ اس میں ایک سنٹر اور دائیں جانب دو پہلو ہیں۔ یہ جن آٹھ اہم کمروں پر مشتمل ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

لائبریری اور دفتر کا کمرہ سنٹر کے بڑے ہال میں ہیں۔ اناٹومی اور ہندوستانی کلاس کی تعلیم کے

لیے لیکچر روم ، میڈیکل اور سرجری کے لیے لیکچر روم ، کیمیکل لیکچر روم ، یہ سبھی سنٹر میں موجود ہیں۔ علم التشریح البدن کا میوزیم ، کیمیائی اشیاء اور علم الادویہ کا میوزیم ، لیبارٹری اور محکمہ موسمیات کے آلات کا میوزیم ، مشرقی اور غربی پہلوؤں میں واقع ہیں۔ انجکشن لگانے اور چیر پھاڑ کا عمل کرنے کے لیے کمرے ، ہسپتال اور سکول سے کچھ فاصلے پر ایک علیحدہ عمارت میں ہیں۔ عمارت کی خصوصیات میں عمدہ نقش و نگار سے مزین منڈیریں ، منڈیروں کے نیچے خوبصورت زیبائشی کام ، چھت کے اوپر خوبصورت زیبائشی جنگلا ، برآمدے کی چھت پر خوبصورت کنگورے ، ستونوں کی قطاریں ، چھت پر لکڑی کے کام پر سفید روغن ، دھنوالوں کے سبز رنگ کے نقش و نگار ، دفتر اور لائبریری کے ستونوں پر لوہے کا آرائشی کام شامل ہیں۔

یہ عمارت 1883ء میں ایک قلیل عرصہ یعنی ایک سال میں 1,15,000 روپے کی لاگت سے مکمل ہوئی۔

میڈیکل سکول کو 1860ء میں اس مقصد کے تحت قائم کیا گیا تھا کہ پنجاب کے مقامی باشندوں کو طب کی تعلیم دی جائے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا تھا کہ بنگالیوں کو ڈاکٹر کی حیثیت سے پنجاب بھیجا جاتا تو پنجاب کے باشندے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیتے۔ ان کا خیال تھا کہ ہمارے پاس خود ہمارے مقامی ڈاکٹر موجود ہیں لہٰذا بنگالی اپنے وطن واپس جانے کے لیے بے چین رہتے تھے۔

ڈاکٹر جے بی سکریون سکول کے پہلے پرنسپل تھے۔ انہوں نے سول سرجن لاہور ڈاکٹر میسرز سمتھ اور ڈاکٹر ٹی۔ ای براؤن کے ساتھ مل کر 1860ء میں کام کا آغاز کر دیا۔ سکول کو شروع میں موجودہ گورنمنٹ کالج کی جگہ پر موجود بیرکوں میں شروع کیا گیا (22)۔ اور ہسپتال کو شہر کے ٹکسالی دروازہ کے قریب ٹبی بازار میں راجہ سچیت سنگھ کے اصطبل میں قائم کیا گیا تھا۔

ٹیلیگراف آفس :۔ ٹیلیگراف آفس ، سول سٹیشن ، انار کلی کے مرکزی حصہ میں اکاؤنٹنٹ جنرل آفس کی مخالف سمت میں سڑکوں کے دوراہے پر واقع ہے۔ بیرونی کرسی اور پوری عمارت کو انگریزی طرز کی اینٹوں اور چونے سے تعمیر کیا گیا ہے۔ بڑے کمروں کی چھت پر الہ آباد کی ٹائلوں کی دوہری تہہ ہے۔ ان کو دیودار کی لکڑی کے شہتیروں نے سہارا دے رکھا ہے۔ بغلی کمرے ڈیوڑھی اور برآمدے چونے اور اینٹوں سے تعمیر کیے گئے ہیں۔ ان میں کڑیاں اور شہتیر بھی استعمال کیے گئے ہیں۔ سگنل روم کا فرش سنگین ہے۔ دوسرے کمروں کا فرش ٹائلوں کا ہے۔ ان کو 6 انچ بجری کی موٹی تہہ پر لگایا گیا ہے۔ اس لیے نہایت ٹھوس فرش ہے۔ بڑے کمروں کی چھتیں لکڑی کے تختوں سے بنائی گئی ہیں۔ لکڑی کے شہتیروں سے سہارا دیا گیا ہے اور تپش سے محفوظ رکھا گیا ہے۔ نیز چھت

کے بالائی کونے پر تختوں اور چھت کے درمیان جست کی جالی دار چادریں لگا کر ہوا کا اچھا خاصہ انتظام کیا گیا ہے۔

یہ عمارت مارچ 1881ء میں 42,216 روپے کی لاگت سے مکمل ہوئی۔ اس میں ایک سگنل آفس اور بارہ بارہ سگنلروں پر مشتمل دو بارکوں کی گنجائش ہے۔ ضلع میں دو بڑے ٹیلیگراف آفس (تار گھر) ہیں۔ صدر دفتر لاہور میں اور ذیلی دفتر میاں میر میں ہے۔ صدر دفتر کا عملہ سب اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کے تحت ہے جبکہ میاں میر ذیلی دفتر بریگیڈیئر، میجر کی نگرانی میں ہے۔ اس میں دو ملٹری سگنلرز کام کرتے ہیں۔

گورنمنٹ ٹیلیگراف آفس میں ایک ٹیلی فون ایکسچینج بھی ہے۔ اس کے علاوہ نارتھ ویسٹرن ریلوے سٹیشن میں بھی ہے جس کے ساتھ مخصوص پبلک آفس اور سرکاری افسران کی رہائش گاہوں کے ٹیلی فون منسلک ہیں۔ گورنمنٹ ایکسچینج کے ساتھ سول اینڈ ملٹری گزٹ پریس کا بھی رابطہ ہے۔

لاہور سنٹرل جیل :۔ لاہور کی سنٹرل جیل جو 33 ایکڑ رقبہ پر محیط ہے۔ اسے روشنی کے اصولوں پر تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کے گرد مربع شکل کی چونے کی چار دیواری ہے جو 1,614 فٹ طویل 84 فٹ چوڑی اور 12 فٹ بلند ہے۔ اس میں دو احاطے ہیں جو ایک ہسپتال اور گوداموں پر مشتمل ہیں۔ چار دیواری کے گرد خندق ہے۔ مثمن شکل کے دونوں احاطوں کے چاروں طرف 13 اور 12 فٹ کے وقفوں پر پختہ اینٹوں کے ستون ہیں۔ ان پر لوہے کا جنگلہ لگایا گیا ہے جو بڑی مضبوطی سے نصب کیا گیا ہے۔

یہ عمارت نگرانی کے میناروں (مچانوں) یورپین اور مقامی وارڈوں، ورکشاپوں، کال کوٹھریوں، خانساموں کے مکانات، ہسپتال کی وارڈ، مردہ خانوں، محافظوں کے کمروں، دری بنانے کے چھجوں، چھاپہ خانوں، کم عمر افراد کی وارڈوں، گوداموں، عقوبت خانوں، گھنٹی والے مینار، بڑھئی اور لوہار کی ورکشاپوں، کاغذ سازی کے کارخانوں، برتنوں کے گوداموں اور دیگر کام کرنے کی جگہ پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ اس میں سپرنٹنڈنٹ کے دفتر کے لیے کوارٹر اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ، جیلر اور مقامی ڈاکٹر کی نجی رہائش گاہ کے لیے بھی گنجائش ہے۔

بیرونی دیوار، خندق، پہلا احاطہ، ہسپتال، گودام وغیرہ اور عمارات جو دروازے کے قریب واقع ہیں، انہیں 1850ء میں شروع کیا گیا تھا اور 1854ء میں مکمل کی گئیں۔ دوسرا احاطہ 1862ء میں تعمیر کیا گیا۔ اس جیل میں 2,000 مقامی اور 10 یورپی قیدیوں کو رکھنے کی گنجائش ہے۔ اس پر 2,00,000 روپے لاگت آئی۔

قیدی جن صنعتوں کو چلا رہے ہیں ان میں کمبلوں اور مختلف اقسام کے کپڑے کی تیاری، کاغذ سازی ، ظروف سازی، روئی یا گھاس کے ریشے کی چٹائیاں اور نمدے، خیمہ سازی، ایرانی قالینوں کے ہم پلہ قالین بافی، لیتھوگرافی اور ٹائپو گرافی کی چھپائی وغیرہ شامل ہیں۔ اس جیل میں نہایت شاندار قالین تیار کیے جاتے ہیں اور بہت بڑی تعداد میں انگلستان، فرانس اور امریکہ کو برآمد کیے جاتے ہیں۔ جیل میں میناکاری سے مزین برتن، روغنی منقش چلمیں اور ڈشیں تیار کی جاتی ہیں۔ لوگ ان کو بہت زیادہ پسند کرتے ہیں۔

ریس کورس :۔ ریس کورس، لاہور سنٹرل جیل کے قریب واقع ہے۔ اس مقصد کے لیے بہت بڑی جگہ کا احاطہ کیا گیا ہے۔ گھڑدوڑ کے دوران یہاں خوب چہل پہل ہوتی ہے۔ زرق برق لباسوں میں ملبوس لوگوں کا ہجوم شہر اور اس کے قرب و جوار سے یہاں اکٹھا ہوتا ہے۔ کچھ پیدل ، کچھ سواریوں پر آتے ہیں۔ جبکہ یورپین تماشائیوں کی تعداد سب سے زیادہ ہوتی ہے۔

لاہور ڈسٹرکٹ جیل :۔ لاہور ڈسٹرکٹ جیل دراصل گولہ والی سرائے کو تبدیل کر کے بنائی گئی ہے۔ اس کو 76-1875ء میں مکمل کیا گیا۔ اس میں 694 قیدیوں کے لیے گنجائش ہے اور اس میں صرف ضلع لاہور کے مرد قیدیوں کو رکھا جاتا ہے۔ قیدی، جیل کی عمومی صنعتوں کو چلاتے ہیں۔ ان میں سے قیدیوں کی بڑی تعداد کو فاضل کاموں، مثلاً خشت سازی اور سڑکیں وغیرہ بنانے کے کاموں پر لگایا جاتا ہے۔

اصلاحی جیل برائے خواتین، لاہور :۔ یہ عمارت سنٹرل جیل لاہور کے قریب واقع ہے۔ اس کی عمارات کو روشنی کے اصولوں پر تعمیر کیا گیا ہے۔ دو احاطوں کے درمیان ایک چار دیواری ہے۔ بیرونی احاطہ 330 فٹ قطر کا ہے اور اندرونی 75 فٹ کا ہے۔ دونوں کو 18 فٹ کی ایک کھلی گلی سے منسلک کیا گیا ہے۔ اس عمارت میں 250 مقامی اور 4 یورپین مجرموں کو رکھنے کی گنجائش ہے۔ مقامی قیدیوں کی بیرکیں ایک چھوٹے احاطے کے اندر ہیں جہاں پر پانی کا ایک بڑا اور دو چھوٹے حوض 10 فٹ قطر کے ایک کنویں سمیت موجود ہیں۔ ان سب کے گرد ایک بڑا احاطہ ہے بڑے احاطے کے شمال کی طرف گودام اور ورکشاپیں ہیں۔ جنوب مغربی جانب چار یورپین قیدیوں کی کوٹھڑیاں ہیں۔ جنوب میں عقوبت خانے ، سپرنٹنڈنٹ کے دفتر کا کمرہ ، خاتون وارڈر کا کمرہ ، محافظوں کے کمرے ، محافظہ (میٹرن) کا مکان ، مقامی ڈاکٹر کا مکان ، محرر کا مکان اور دروازہ ہے۔ چار دیواری کی دیوار اینٹوں سے بنائی گئی ہے۔ یہ ڈھائی فٹ چوڑی اور چودہ فٹ بلند ہے۔ اس چار دیواری کے کونے چالیس فٹ کے قطر میں گول کر دیے گئے ہیں۔

عمارت کو 296 قیدیوں کے رکھنے کے لیے تعمیر کیا گیا۔ 1870ء میں 1,21,361 روپے کی لاگت سے اس کو رائے بہادر کنہیا لال کی نگرانی میں تعمیر کرایا گیا۔ اس میں پنجاب کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والی عورتوں کو جنہیں طویل عرصے کی قید یا عمر قید سنائی جاتی ہے یہاں رکھا جاتا ہے اور ضلع لاہور کی خاتون قیدیوں کو رکھا جاتا ہے۔ قیدی جن صنعتوں کو چلاتی ہیں ان میں سلائی کڑھائی، بنائی، اون کی دھنائی وغیرہ شامل ہیں۔

جنرل پوسٹ آفس:۔ جنرل پوسٹ آفس، عجائب گھر کے قریب انار کلی میں واقع ہے۔ اس کو 1849ء میں تعمیر کیا گیا لیکن اس کے بعد اس میں بہت سی تبدیلیاں اب تک کی جا چکی ہیں۔ شہر میں تین برانچ پوسٹ آفس ہیں۔ ایک ریلوے سٹیشن پر اور دو شہر میں۔ موتی بازار اور لاہور منڈی میں ہیں۔ مختلف مقامات پر لیٹر بکسوں کے کھمبے لگائے گئے ہیں۔ جب ڈاک جانے کا وقت ہوتا ہے تو ان کو دن میں تین مرتبہ خالی کیا جاتا ہے۔

پنجاب یونیورسٹی کا سینٹ ہال:۔ یہ عمارت انار کلی میں ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن کے دفتر اور پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کے قریب واقع ہے۔ اس کو پختہ اینٹوں اور چونے سے تعمیر کیا گیا ہے۔ ستونوں، محرابوں، گولائی کے کام اور منڈیروں کی تعمیر کے لیے اس میں 10 فیصد پتھر کے چونے کی آمیزش کی گئی ہے۔ ستونوں، محرابوں اور دیواروں کے ظاہری حصوں میں استعمال ہونے والی اینٹیں جسامت میں بڑی ہیں لیکن باقی عمارت میں عام سائز کی استعمال ہوئی ہیں۔ عمارت پر چونے کا پلستر کیا گیا ہے اور اندرونی جانب سفیدی کی گئی ہے۔ بیرونی جانب پتھر کے سرخ رنگ کو عمدگی اور مہارت سے ملائم کی گئی اینٹوں پر لگایا گیا ہے۔ سینٹ ہال لائبریری اور رجسٹرار کے کمرے کی چھتوں میں پتھر کی سلیں دیودار کی لکڑی کے شہتیروں پر لگائی گئی ہیں۔ اس کے نیچے نہایت خوبصورت اور زیبائشی چوبی چھت ہے۔ اس پر سفید روغن کیا گیا ہے اور اس کے ارد گرد نیلے رنگ کا حاشیہ ہے۔ کھڑکیوں کے تمام شیشے رنگین ہیں۔

سینٹ ہال بشمول راہداری کے 62 فٹ 10 انچ × 84 فٹ 6 انچ پیمائش کا ہے۔ اس کی چوڑائی ساڑھے نو فٹ ہے۔ اس کے اوپر محرابوں کی قطاریں ہیں۔ تین تین شمال اور جنوب کی طرف اور پانچ مشرق اور مغرب میں ہیں۔

اس عمارت کو 1876ء میں تعمیر کیا گیا۔ اس کو عزت مآب نواب بہاولپور کی طرف سے دیے گئے عطیہ 25,000 ہزار روپے کی رقم سے اور سرکاری خزانے میں جمع کرائے گئے عطیات سے تعمیر کیا گیا۔ عمارت کی پیشانی پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

سینٹ ہال

عطیہ

عزت مآب نواب بہاولپور

اس عمارت کا نقشہ اور تعمیر رائے بہادر کنہیال لال ایگزیکٹو انجینئر نے تیار کیے۔

رتن سنگھ کا فوارہ :۔ یہ خوبصورت فوارہ، ڈاک خانے کے قریب اور برف خانے کے جنوب میں واقع ہے۔ اس کا بانی وائن اینڈ جنرل مرچنٹ انار کلی، رتن سنگھ تھا۔

رتن سنگھ کا کنواں :۔ یہ کشادہ کنواں بھی رتن سنگھ نے بنوایا تھا۔ یہ انار کلی بازار میں ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب کے دفتر کے سامنے واقع ہے۔ لوگوں کی بہت بڑی تعداد اس کو استعمال کرتی ہے۔ کنویں کے گرد بنی ہوئی دیوار میں نصب سنگ مرمر کی تختی پر بانی کا نام درج ہے۔ اس کی وضع قطع نہایت شاندار اور جاذب نظر ہے۔

میو انڈسٹریل سکول آف آرٹس :۔ یہ ادارہ عجائب گھر اور ٹاؤن ہال کے درمیان انار کلی کے باغات میں واقع ہے۔ اس کو جدید مغلیہ طرز پر تعمیر کیا گیا ہے۔ اس ادارے کو موجودہ نام سے پکارنے کی وجہ یہ ہے کہ اس پر خرچ ہونے والی رقم کو پنجاب میں میو میموریل کے چندوں سے پورا کیا گیا تھا۔ عمارت کا مرکزی حصہ دو منزلہ اور باقی حصہ ایک منزلہ ہے۔ نچلی منزل میں ماڈلنگ یا مولڈنگ روم، ڈرائنگ اینڈ پینٹنگ روم، پرنسپل کے دفتر کا کمرہ، سٹور روم اور دو غسلخانے ہیں۔ بالائی منزل پر 25 x 63 فٹ کا ایک بہت بڑا ایلیمنٹری اور لیکچر روم ہے۔

عمارت کی لمبائی 155 فٹ اور درمیان میں 45 فٹ چوڑائی ہے۔ نچلی منزل کی بلندی 20 فٹ ہے اور بالائی منزل کنگرے تک سوا اٹھائیس فٹ بلند ہے۔

بیرونی مکانات میں یہ گنجائش پیدا کی گئی ہے۔

1۔ چوبی کام کی ورکشاپ، اس میں 20 کاریگروں کے کام کرنے کی گنجائش ہے۔ اس کے علاوہ خراد مشینیں اور اوزاروں وغیرہ کے لیے الماریاں بھی ہیں۔

2۔ ظروف سازی اور پلستر وغیرہ کی بھٹیاں ہیں۔

زیریں منزل اعلیٰ معیار کی ٹائلوں سے بنائی گئی ہے۔ اس کو کنکریٹ کی چار انچ موٹی تہہ کے اوپر اٹھایا گیا ہے۔ بالائی منزل میں بھی چوکور شکل کی پختہ ٹائلیں لگائی گئی ہیں۔ ان کو مسالے سے برگاہوں اور گارڈروں کی پلیٹوں پر ہموار کر کے لگایا گیا ہے۔ ٹائلوں کی درزوں میں چونا بھر دیا گیا ہے۔

ہموار چھت پر چونے کی چار انچ موٹی تہہ بچھا کر اسے خوب کوٹا پیٹا گیا ہے اور اس پر نہایت ملائم پلستر کر دیا گیا ہے۔

چبوترہ، چھت کے شہتیروں پر بڑے حجم کی ٹائلوں کو چونے سے لگا کر بنایا گیا ہے۔ بالائی کرے (ایلیمنٹری سکول) کی چھت 1/4 x 12 x 18 انچ کی سلوں پر مشتمل ہے۔ انہیں ایک دوسرے کے اوپر چڑھا کر چھ انچ کی میخیں لگائی گئی ہیں۔ ان سلوں کو ڈلہوزی کی کان سے حاصل کیا گیا۔ ان کا حجم اور رنگ ایک جیسا ہے۔

بالائی منزل کی بیرونی منڈیر کو دہلی سے حاصل شدہ سنگ سرخ سے بنایا گیا ہے۔ دروازے اور کھڑکیاں بہت خوبصورت ہیں۔ یہ دو انچ موٹی ہیں۔ فریموں کو دیوار میں آہنی قابلوں اور میخوں سے نہایت مضبوطی کے ساتھ لگایا گیا ہے۔

اس عمارت کو رائے بہادر کنہیالال ایگزیکٹو انجینئر لاہور نے تعمیر کرایا اور اس کا نقشہ بھی انہوں نے خود تیار کیا۔ یہ 1883ء میں 43،000 روپے کی کل لاگت سے مکمل ہوئی۔

اس سکول کو لارڈ میو کی یاد میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ صوبے کے صنعتی فنون کو ترقی دی جائے اور اس کی فراموش کی گئی دستکاریوں کو دوبارہ اجاگر کیا جائے۔ جب 1864ء میں لاہور میں پنجاب کی مصنوعات، فنون اور دستکاریوں کے متعلق پہلی نمائش منعقد ہوئی تو پنجاب کے لیے ایک دستکاری سکول کے قیام کے بارے میں زور دیا گیا۔ اس میں مسٹر بی۔ ایچ بیڈن ۔ پاویل نے 1872ء میں پنجاب کی دستکاریوں کے متعلق شائع کردہ اپنی کتاب میں ملک کے فنون کی ترقی و ترویج کے لیے اس جیسے سکول کے قیام کی اہمیت پر زور دیا۔ مارچ 1872ء میں منٹگمری ہال میں ایک عوامی اجلاس منعقد ہوا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ لارڈ میو کی یاد کو برقرار رکھنے کے لیے کسی مناسب یادگار کا قیام عمل میں لایا جائے۔ کیونکہ ان کے قتل نے پورے ہندوستان میں سنسنی دوڑا دی تھی۔ اس مقصد کے لیے 68،119 روپے چندے کے طور پر جمع کیے گئے۔ اسی مقام پر 24 مارچ کو سنٹرل میو میموریل کمیٹی کے منعقد ہونے والے اجلاس میں اس بات پر غور کیا گیا کہ یادگار کی بہتر شکل کیا ہونی چاہیے؟ سر لیپل گرفن نے انگریزی اور ہندوستانی زبان میں اپنی فصیح و بلیغ تقریر میں تجویز کیا کہ اس رقم کو ایک دستکاری سکول کی عمارت بمعہ ساز و سامان کی تعمیر پر خرچ کیا جائے اور اس ادارے کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے حکومت سے امداد کے لیے کہا جائے۔ اس تجویز کو متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا۔ سر رچرڈ ٹیمپل نے ان اصولوں کے بارے میں ایک طویل یادداشت تحریر کی جن پر سکول کو شروع کیا جانا تھا۔ لہذا وزیر خارجہ نے

24 ستمبر 1874ء کو اس کی منظوری دے دی۔

31 مارچ 1891ء کو حاضری کے رجسٹر میں طلباء کی تعداد 117 تھی اور حاضری 94 تھی۔
اس کے مندرجہ ذیل تین اہم شعبے ہیں:۔
پہلے میں جنرل ڈرائنگ اور آرائشی ڈیزائن ہے۔ طلباء اس جماعت میں اجسام کی ڈرائنگ، تعمیراتی ڈرائنگ اور فری ہینڈ رنگ آمیزی، لیتھو گرافی کے لیے پین ڈرائنگ، ماڈلنگ اور ڈھلائی کے بارے میں پڑھتے ہیں۔ ان سب کو عملی جیومیٹری اور تاریخ کا کورس لازماً پاس کرنا پڑتا ہے۔
دوسرے میں چوبی کندہ کاری، تعمیراتی ڈرائنگ وغیرہ ہے اس جماعت کے تمام طلباء کے لیے چوبی کندہ کاری میں مہارت پیدا کی جاتی ہے اور ان کے وقت کو یکساں طور پر چوبی کندہ کاری عمارتی ڈرائنگ، ماڈل کے ڈیزائن اور فری ہینڈ ڈرائنگ میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔
تیسرا شعبہ ماڈل بنانے اور پلاسٹر کی ڈھلائی وغیرہ کے لیے ہے۔
میو سکول میں تعلیم حاصل کرنے والے نوجوانوں کی دو اقسام ہیں۔ پہلی قسم میں وہ طلباء آتے ہیں جو اہل حرفہ کے بیٹے ہیں۔ ان کو دستکاری کا فن قدرتی طور پر ورثے میں ملا ہے لیکن انہیں ڈرائنگ وغیرہ پڑھنے کا موقع میسر نہیں آیا اور انہوں نے کسی قسم کی عام تعلیم بھی حاصل نہیں کی۔ نیز دوسری قسم میں وہ طلباء ہیں جنہوں نے عمومی تعلیم تو حاصل کی ہے لیکن انہیں زیادہ تر فنی اور دستکاری کی تعلیم میں اطمینان بخش حد تک جوہر دکھانے کا موقع نہ مل سکا۔ سکول کے سربراہ جے۔ ایل کپلنگ بہادر، سی۔ آئی۔ ای ہیں۔ (23)
ڈسٹرکٹ کورٹ (ضلع کچہری):۔ یہ عمارت انار کلی میں مال روڈ پر پریس بائی ٹیرین مشن گرجا کے سامنے ایک بلند قطعہ زمین پر واقع ہے۔ پوری عمارت میں پختہ اینٹوں کا نہایت شاندار کام کیا گیا ہے اور اس کی پیشانی پر آرائشی اینٹیں لگائی گئی ہیں۔ ستونوں، محرابوں، دروازوں اور کھڑکیوں پر کٹاؤ دار اینٹوں سے آرائش کی گئی ہے۔ صدر عمارت کا سامنے والا حصہ 233 فٹ طویل اور 61 فٹ 6 انچ چوڑا ہے۔ یہ حصہ دو منزلہ ہے۔ زیریں منزل 18 فٹ 6 انچ اور بالائی منزل 17 فٹ بلند ہے۔ اس کے دونوں پہلو جو ایک منزل پر مشتمل ہیں 51 x 166 فٹ کے ہیں اور 18 فٹ 6 انچ بلند ہیں۔

جنوبی قطار کے درمیان میں ڈپٹی کمشنر کی عدالت کا کمرہ ہے۔ اس کی اطراف میں انگریزی اور فارسی کے دفاتر ہیں۔ بائیں جانب اسسٹنٹ اور ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی کچہری کا کمرہ ہے۔ دائیں جانب خزانچی کا دفتر اور پنشن کی ادائیگی کا دفتر ہے۔ صحن کے مغرب میں محکمہ خزانے کا ضلعی دفتر ہے

اور مشرق میں ضلعی اور پولیس مال خانہ ، پولیس کا دفتر، ناظر کا دفتر، ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ آف پولیس کا دفتر اور ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنروں کی کچہریاں ہیں۔

بالائی منزل کے کمروں کو ریکارڈ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ریکارڈ کیپر کا کمرہ ڈپٹی کمشنر کی عدالت کے اوپر ہے۔ بالائی منزل تک پختہ اینٹوں کی ایک سیڑھی کے ذریعے پہنچ سکتے ہیں۔ یہ سیڑھی ڈپٹی کمشنر کی عدالت کے کمرے کے عقب میں واقع کمروں میں سے ایک میں واقع ہے۔ بیرونی چھت پر سنگ سرخ کی منڈیر ہے جو سنگ سرخ ہی کے بنے ہوئے چھجوں پر آویزاں ہے۔

یہ عمارت 5 ، 32،564 فٹ کے رقبہ پر محیط ہے اور اس پر 5-8-95،420 روپے کی لاگت آئی۔

گورنمنٹ کالج لاہور:۔ یہ حسین و جمیل عمارت گھڑیال سے مزین بہت بڑے مینار کے ساتھ ضلع کچہری کے مشرق میں اور پبلک گارڈن کے شمال میں ایک نمایاں جگہ پر واقع ہے۔ یہ عمارت ، گوتھک طرز تعمیر (یعنی نوکدار عمارت) کی حامل ہے اس میں ایک کالج، ایک بہت بڑا کمرہ امتحان اور لیکچر ہال (جو عام طور پر کانووکیشن کے لیے استعمال ہوتا ہے) اور دو بڑے کمرے ہیں۔ ایک لائبریری کے لیے اور دوسرا ماڈل وغیرہ کے لیے ہے۔

کالج 12 بڑے کمرہ ہائے جماعت اور چار چھوٹے کمروں پر مشتمل ہے۔ یعنی کل 16 ہیں۔ ان میں سے آٹھ زیریں منزل اور آٹھ بالائی منزل پر ہیں۔

مندرجہ بالا کے پہلو میں مزید چار بڑے اور چار چھوٹے کمرہ ہائے جماعت ہیں۔ یعنی کل آٹھ ہیں۔ ان میں سے چار زیریں منزل پر اور چار بالائی منزل پر ہیں۔ اس کے عقب میں دو کمرے جن کو ایک کشادہ محراب کے ذریعے منسلک کیا گیا ہے ، انہیں لائبریری اور ماڈل روم کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جبکہ ان بالائی کمروں کو پرنسپل اور نائب پرنسپل کے کمروں کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ امتحان گاہ اور لیکچر ہال 35 x 55 فٹ کا ہے۔ اس کے چاروں طرف 10 فٹ چوڑی غلام گردش ہے۔ ان میں اور بالائی کمروں اور لائبریری میں جانے کے لیے پختہ اینٹوں کی ایک سیڑھی ہے۔ کالج کے بالائی کمروں میں جانے کے لیے عمارت کے شمال مغربی کونے میں موجود مثمن شکل کے ایک مینار میں بنائی گئی کشادہ سیڑھی کے ذریعے پہنچ سکتے ہیں۔ ملحقہ ڈیوڑھیاں اور برآمدے 10 فٹ چوڑے ہیں۔ صدر عمارت کی بیرونی دیواروں، اندرونی برآمدوں کی پیشانی اور دیگر نمایاں حصوں میں خوبصورت شکل کی بڑی جسامت والی اینٹوں کو نہایت احتیاط اور مہارت سے عمدگی کے ساتھ مضبوط مسالے میں لگایا گیا ہے۔ بیرونی جانب خشتی کام بہت خوبصورت طریقے سے کیا گیا ہے۔

گولائیوں اور زیبائشی حصوں میں بڑی نفاست اور صفائی پائی جاتی ہے۔ کلاس روم کی چھتیں بڑی جسامت کی سلوں سے بنائی گئی ہیں۔ ان کو دیو دار کے شہتیروں پر آٹھ انچ تک چڑھا کر نیچے دیودار کے تختے مرکز سے مرکز تک ایک فٹ کے فاصلے پر لگائے گئے ہیں۔ برآمدوں ، غلام گردش اور راہداریوں کی چھت ہموار ہے اور دیودار کے شہتیروں پر بنائی گئی ہے۔

اس عمارت کا ڈیزائن سپرنٹنڈنٹ انجنیئر، ڈبلیو پرڈن بہادر نے تیار کیا اور رائے بہادر کنہیالال نے 3,20,537 روپے کی لاگت سے اس کو تعمیر کرایا۔ اس کی تعمیر کا آغاز 1872ء میں ہوا اور 5 سال کے عرصے میں مکمل ہوئی۔

لاہور کالج کو 1864ء میں مہاراجہ کشمیر کی اجازت سے شہر میں راجہ دھیان سنگھ کی بہت بڑی حویلی میں قائم کیا گیا اور اس کو سب سے پہلے اسی مقصد کے لیے استعمال کیا گیا۔ کالج کے پہلے پرنسپل ڈاکٹر جی۔ ڈبلیو لیٹنر تھے۔

کالج میں تعلیم کے لیے یہ مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ (1) انگریزی زبان و ادب (2) عربی ، سنسکرت اور فارسی (3) تاریخ اور سیاسی معیشت (4) ریاضی (5) ذہنی اور اخلاقی سائنس (6) جسمانی سائنس۔

پڑھائی کے لیے تین نصاب مندرجہ ذیل ہیں: ۔

1۔ انٹرمیڈیٹ کورس ، میٹرک کے بعد دو سال کے لیے ہوتا ہے اور اس میں کم از کم چار مضامین لیکن پانچ سے زیادہ نہیں ہوتے۔

2۔ بی۔اے کا کورس بھی دو سالہ ہوتا ہے اور اس میں تین یا چار مضامین ہوتے ہیں۔

3 - ایم۔اے کا کورس ایک سال کے لیے ہوتا ہے اور یہ سائنس یا ادب کی کسی ایک شاخ کے مکمل مطالعہ پر مشتمل ہوتا ہے۔

کالج سے وابستہ ایک لائبریری بھی ہے جو تقریباً 1400 کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ حکومت نے اس کے لیے مزید کتابیں خریدنے کے لیے 200 روپے سالانہ کی سہولت بھی رکھی ہے۔ اس کے علاوہ آلات ارو دیگر اشیاء کے اچھے خاصے ذخیرے پر مشتمل ایک عجائب گھر بھی ہے جس میں حکومت کے محکمہ ارضیات کی طرف سے پیش کردہ معدنیات ، چٹانوں اور حجری ڈھانچوں کا اچھا خاصا ذخیرہ بھی ہے۔

کالج کے ساتھ ملحقہ دو ہوسٹل ، ایک ہندوؤں کے لیے اور دوسرا مسلمانوں کے لیے ہے لیکن مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے قیام کے لیے بڑے پیمانے پر ایک نیا ہوسٹل زیر تعمیر ہے۔

کالج کے قریب قدیم گرجا کو حاصل کر کے اسے کالج کے لیے جمنیزیم میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ کالج کے ساتھ ملحقہ پرانے ڈاک بنگلہ کو از سر نو تعمیر کر کے پرنسپل اور وائس پرنسپل کی رہائش گاہ بنا دیا گیا ہے۔ کالج کے لئے نئے بیرونی مکانات تعمیر کیے جا رہے ہیں۔ کالج کے عقب میں نظر انداز کیا گیا قطعہ زمین ویران پڑا تھا۔ اس کو ہموار کر کے کرکٹ گراؤنڈ بنا دیا گیا ہے۔

کالج یونین کلب مباحثوں کے لیے ہفتہ وار اجلاس منعقد کرتا ہے۔ پروفیسر یا اسسٹنٹ پروفیسر صاحبان ان میں سے ہر ایک کی صدارت کرتے ہیں۔ کلب کے اراکین ایک مطالعہ گاہ کا بھی بندوبست کرتے ہیں۔ وہاں میزوں پر انگریزی اور ہندوستانی سرکردہ جرائد ہر وقت مل سکتے ہیں۔ شکسپیئر کی کتابوں کا مطالعہ شروع کرنے پر بھی غور کیا جا رہا ہے۔ یونین کلب کا بندوبست، نجی چندوں سے کیا جاتا ہے اور جمع کی گئی رقوم سے کلب اس قابل ہو گیا ہے کہ وہ مختلف کھیلوں کا انعقاد کر سکتا ہے اور مسلسل میچ کھیل سکتا ہے۔

لارنس اور منٹگمری ہال :۔ لارنس ہال اور منٹگمری ہال کے نام سے مشہور عمارات، لارنس ہال گارڈن میں واقع ہیں۔ لارنس ہال کا رخ مال روڈ کی طرف اور منٹگمری ہال باغات کے مرکزی خیابان کی طرف ہے۔

لارنس ہال کو 62-1861ء میں پنجاب میں مقیم یورپی باشندوں کی طرف سے پنجاب کے پہلے لیفٹیننٹ گورنر اور بعد میں ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل سر جان (بعد میں لارڈ) لارنس کی یادگار کے لیے اکٹھے کئے گئے چندوں کی رقم سے تعمیر کیا گیا۔ اس کا ڈیزائن مسٹر جی سٹون، سی۔ ای نے تیار کیا تھا۔

منٹگمری ہال کو 1866ء میں پنجاب کے مقامی سرداروں کی طرف سے سر رابرٹ منٹگمری کی عقیدت میں اکٹھے کئے گئے چندوں کی رقم سے تعمیر کیا گیا۔ اس کا ڈیزائن مسٹر جے۔ گرڈن سی۔ ای نے تیار کیا۔ عمارت میں سنگ مرمر کی ایک تختی پر عطیہ دینے والوں کے نام درج ہیں۔ لارنس اور منٹگمری ہالوں کو ایک ڈھکی ہوئی راہداری کے ذریعے وابستہ کیا گیا ہے منٹگمری ہال کی اصل محرابی چھت تعمیری ناکامی کی نشاندہی کرتی ہے۔ حکومت نے اس کی مرمت کا کام سنبھالنے کا ارادہ کیا۔ اس کو 1875ء میں گرا دیا گیا اور اس کی جگہ ہلکی تعمیر اور ڈیزائن کی چھت بنائی گئی۔ اس کے ساتھ ناچ وغیرہ کے لیے ساگوان کی لکڑی کا فرش تیار کیا گیا۔ نئی چھت چوبی ہے۔ اس میں قلعی شدہ فولادی چادریں لگائی گئی ہیں اور اس کے ساتھ چوبی کندہ کاری سے مزین نہایت خوبصورت چھت ہے۔ اس کو بڑی خوبصورتی سے رنگ و روغن کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ شیشے کی کھڑکیاں نصب ہیں جو نہایت

مسحور کن نظارہ پیش کرتی ہیں۔

لارنس ہال کی پیمائش اندرونی جانب 32.5 x 65 فٹ ہے اور اس کو زیادہ تر عوامی مجلسوں اور تھیٹر کی تقریبات وغیرہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ چھت پر چونے کی تہہ بچھائی گئی ہے۔ اس کو 34,000 روپے کی لاگت سے تعمیر کیا گیا۔

لارنس ہال کی اندرونی پیمائش 64 x 106 فٹ ہے اور اس کو انگریزی ناچ اور درباروں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ چھت کو ملمع شدہ فولادی چادروں سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس میں ہوا کے لیے جالیاں لگائی گئی ہیں۔ ہال کو تعمیر کرنے پر 1,74,000 روپے لاگت آئی وہ کچھ اس طرح ہے:

عمارت بمعہ محرابی چھت کی اصل لاگت	1,08,000
عام مقامی فنڈ سے بعد میں کی گئی مرمت	
اور دوبارہ چھت بنانے پر آنے والی لاگت	66,000
کل روپے	1,74,000

دونوں عمارتوں کی طرز تعمیر قدیم ہے لیکن عام تاثر شان و شوکت سے خالی نہیں ہے۔ اس کی سبھی دیواریں پکی اینٹوں سے تعمیر کی گئی ہیں جن کو چونے میں لگایا گیا ہے۔ اندرونی اور بیرونی جانب چونے کا پلستر کیا گیا ہے۔ لارنس ہال کی اندرونی اور بیرونی جانب اور منٹگمری ہال کی بیرونی جانب پالش کیا گیا نقلی پتھر لگایا گیا ہے۔ فرشوں میں ماسوائے راہداریوں اور لارنس ہال سے ملحقہ کمروں کے دیودار لکڑی کے تختے لگائے گئے ہیں۔ ان میں مسدس پکی ٹائلیں لگائی گئی ہیں۔ ان کو بڑی نفاست سے سیمنٹ میں لگایا گیا ہے۔ دروازے اور کھڑکیاں دیودار لکڑی کی ہیں۔ ان پر خوبصورت رنگ و روغن کیا گیا ہے۔ چھتوں میں شہتیریں اور نچلی جانب خوبصورت زیبائشی چوبی چھت ہے۔ لارنس ہال کی ہموار ہے اور منٹگمری ہال کی مخروطی ہے۔ اس میں سٹیشن لائبریری، ٹینس کلب، لاہور اور میاں میر انسٹی ٹیوٹ بھی ہے۔ دونوں ہالوں اور راہداری کے درمیان بعد میں ایک کشادہ مطالعہ گاہ بھی تعمیر کی گئی ہے۔ لارنس ہال کو لگاتار عوامی اجلاسوں اور تھیٹر کے پروگراموں کے اسمبلی روم کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ دونوں عمارتیں میونسپل کمیٹی کے زیر انتظام ہیں۔ جس نے حکومت کے لیے انہیں اپنی حفاظت میں لیا ہوا ہے۔

یہ عمارات مندرجہ ذیل تصاویر پر مشتمل ہیں:۔

1 ۔ کرنل سر ہنری لارنس، کے۔ سی۔ بی (53-1849) پنجاب کے معاملات کے انتظامی

بورڈ کے صدر۔ انہیں 1857ء میں لکھنؤ میں قتل کر دیا گیا۔ (مصور۔ جے، این، ڈکسی)

2 - جان لیرڈ میئر لارنس، جی - سی - بی، جی - سی - ایس - آئی پنجاب کے بیرن لارنس، 1859ء میں پنجاب کے پہلے لیفٹیننٹ گورنر (مصور۔ جے۔ این، ڈکسی)

3 - سر رابرٹ منٹگمری، کے - سی - بی، جی - سی۔ ایس۔ آئی (1859-65ء تک) پنجاب کے دوسرے لیفٹیننٹ گورنر بعد ازاں سیکرٹری آف سٹیٹ کونسل کے ممبر بنے۔ جنوری 1888ء میں انتقال ہوا۔ (اصل تصویر سے نقل سر ایف ۔گرانٹ، کے - سی - ایس۔ آئی، کے - سی - بی، نے کی)

4 - سر ڈونالڈ میکلوڈ، سی۔ بی۔ کے - سی - ایس۔ آئی، پنجاب کے تیسرے لیفٹیننٹ گورنر (1865-70ء) - 1872ء میں لندن میں زیر زمین ریلوے کے حادثے میں فوت ہوئے۔

5 - میجر جنرل سر ہنری میرئن ڈیورینڈ، آر - ای، کے - جی - ایس - آئی، پنجاب کے چوتھے لیفٹیننٹ گورنر - ٹانک میں 31 دسمبر 1870ء کو ڈیرہ اسماعیل خاں کی سرحد پر ھودے پر سے گرنے کی وجہ سے زخمی ہونے کے باعث ہلاک ہوگئے کیونکہ وہ جس ہاتھی پر سوار تھے وہ نہایت تیزی سے ایک چھوٹے دروازے میں سے گزرا۔

6 - سر ہنری ڈیویز، پنجاب کے پانچویں لیفٹیننٹ گورنر (1872-77ء)۔

7 - سر رابرٹ ایجرٹن، پنجاب کے چھٹے لیفٹیننٹ گورنر (1877-82ء)۔

8 - سر چارلس ایچی سن، کے۔ سی۔ ایس۔ آئی، سی۔ آئی۔ ای، پنجاب کے ساتویں لیفٹیننٹ گورنر (1882 - 87ء) -

9 - سر ہربرٹ ایڈورڈز، کے۔ سی۔ بی۔ 1849ء کی ملتان مہم کے میجر ایڈورڈز بعد ازاں پشاور اور انبالہ کے کمشنر۔ متنشر آئین کے دوران کئی سال کے کام کی زیادتی کے باعث طویل رخصت کے دوران 1869ء میں انتقال ہوا۔

10 - مسٹر آرتھر۔ اے رابرٹس، سی۔ بی۔ آئی، یکے بعد دیگرے کمشنر، فنانشل کمشنر، جوڈیشل کمشنر اور (1866ء) میں پنجاب چیف کورٹ کے جج اور بالآخر دکن میں حیدر آباد کے ریذیڈنٹ جہاں 1868ء میں انتقال ہوا۔ وہ لاہور میں رضاکار فوجی دستوں کے پہلے کمانڈنٹ کے طور پر مشہور ہیں جس میں انہوں نے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ اس کے

علاوہ رابرٹ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے مشہور مطالعہ گاہ کے بھی بانی ہیں۔

11 - مسٹر الیف۔ کوپر، سی۔بی، ان کو غدر کے دوران اعلیٰ خدمات انجام دینے کے صلے میں باتھ کا کمپینئن بنا دیا گیا۔ وہ دہلی انسٹی ٹیوٹ کے بانی تھے اور انہوں نے منٹگمری ہال کی تعمیر سے متعلق انتظامات میں نمایاں حصہ لیا۔ وہ 1869ء میں بحیثیت کمشنر لاہور طویل رخصت کے دوران انتقال کر گئے۔

12 - بریگیڈیر جنرل جان نکلسن، سی۔بی (24)۔

13 - کرنل سر ولیم ڈیویز، کے۔سی۔ایس۔آئی، فنانشل کمشنر پنجاب، 1887ء (25)۔

نیو ٹریننگ کالج:۔ یہ عمارت ضلعی سکول کے نزدیک اور ضلع کچہری کے شمال میں واقع ہے۔ یہ عمارت خشتی ہے اور ضلعی سکول کے ڈیزائن کو اختیار کیا گیا ہے۔ اس کی تعمیر پر 40,039 روپے لاگت آئی اور یہ 1886ء میں مکمل ہوئی۔ ٹریننگ سکول ابتداء میں حضوری باغ میں قائم کیا گیا تھا لیکن جولائی 1881ء میں گورنمنٹ کالج کی عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ موجودہ عمارت کی تکمیل کے بعد اس کو اس جگہ لے جایا گیا۔

ٹریننگ کالج 1880ء میں قائم کیا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مردوں کو تدریس اور سکول کے انتظام کے عملی فن کی تربیت دی جائے۔ یہ صوبے کے نارمن سکولوں سے وسعت کے لحاظ سے مختلف ہے جو طلباء کو صرف مقامی زبان کے پرائمری سکولوں کے انتظام کے لیے تیار کرتے ہیں۔ جبکہ ٹریننگ کالج صوبے کے مڈل اور ہائی سکولوں کے لیے انگریزی اور مقامی زبان دونوں کے تربیت یافتہ طلباء کی ذمہ داری لیتا ہے۔

کالج کے ہوسٹل میں 66 طلباء کی گنجائش ہے اور یہ اس مقصد کے لیے بہت مناسب ہے۔ اس میں مسلمان اور ہندو طلباء کے لیے علیحدہ کوارٹر، باورچی خانے، بیرونی مکانات اور پانی کا ایک شاندار کنواں فراہم کیا گیا ہے۔ ایک مطالعہ گاہ بھی ہے جس میں اخبارات، جرائد اور تربیت، قدرتی تاریخ، سائنس وغیرہ کے موضوعات پر کتابوں کا بہت اچھا ذخیرہ ہے۔ ان کو کالج کی لائبریری سے حاصل کیا جاتا ہے۔ ہفتہ میں ایک دن مطالعہ گاہ میں مباحثے منعقد کیے جاتے ہیں۔

جسمانی تربیت کی طرف خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ کالج کے سامنے کرکٹ کی ایک بہت بڑی گراؤنڈ بنائی گئی ہے۔ اس کے علاوہ طلباء ہوسٹل کی گراؤنڈز میں لان ٹینس بھی کھیلتے ہیں۔ ان کے ساتھ سایہ دار باغ بھی موجود ہے۔

پنجاب یونیورسٹی:۔ پنجاب یونیورسٹی کا قیام صوبے کے لوگوں کی کاوشوں سے عمل میں آیا۔ یہ

دراصل ان کی اس دیرینہ خواہش کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئی کہ ان کی اپنی خواہش کے مطابق ملک میں جدید ذریعہ تعلیم کو فروغ دیا جائے اور ملک کے قدیم علوم و فنون کو بروئے کار لایا جائے اور قدیم اور مقامی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ اس ادارے کو ابتداء میں "لاہور یونیورسٹی کالج" کے نام سے شروع کیا گیا لیکن بعد ازاں 1869ء میں یہ "پنجاب یونیورسٹی کالج" کہلانے لگا۔ ادارے کے قوانین میں اس کے خاص مقاصد کے بارے میں اعلان کیا گیا کہ پنجاب کی مقامی زبانوں کے ذریعے جہاں تک ممکن ہو سکے یورپین سائنس کے نفاذ کو فروغ دیا جائے گا اور عام طور پر مقامی ادب کی توسیع اور ترویج و ترقی کی جائے گی۔ قدیم مشرقی علوم اور زبان و ادب کی تعلیم کے حصول کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ مقبول عام تعلیم کی نگرانی اور ترقی و ترویج کے سلسلہ میں صوبہ کے با اثر اور عالم فاضل طبقوں کی سرکاری افسران سے ہم آہنگی و مطابقت پیدا کی جائے گی۔ اس میں مزید یہ بھی بتایا گیا ہے کہ انگریزی زبان و ادب کی تعلیم کے سلسلہ میں ہر قسم کی حوصلہ افزائی کی جائے گی اور انگریزی زبان ہی کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام مضامین کے امتحانات مقامی زبان میں مکمل طور پر نہیں لیے جاسکتے۔ اورنٹیئل کالج میں اعلیٰ اعزازات کے حصول کے لیے انگریزی زبان میں مکمل مہارت کی شرط لازمی تھی لیکن اسی دوران باضابطہ طور پر اس بات کی سہولت رکھی گئی کہ جو انگریزی زبان سے ناآشنا ہو، اعزازات کے حصول کے لیے ادب اور سائنس میں اس کی مہارت کو تسلیم کر لیا جائے گا بشرطیکہ اس کی استعداد نہایت اہم ترین یورپی مضامین تعلیم کے مطابق ہو اور یہ کہ انگریزی میں اعلیٰ مہارت کے مقابلہ میں عربی اور سنسکرت کی تعلیم مساوی تسلیم نہیں کی جائے گی۔ ان قوانین کے تحت اصل یونیورسٹی کالج امتحانات منعقد کرتا ہے اور آرٹس، عربی، سنسکرت، فارسی، قانون، طب اور انجینئرنگ میں اسناد جاری کرتا ہے۔

دستور پنجاب یونیورسٹی :- یہ ادارہ جو پنجاب یونیورسٹی کہلاتا ہے اس کے اجلاس میں عزت مآب لیفٹیننٹ گورنر پنجاب نے پنجاب کے سرداروں، امراء اور با اثر طبقوں کی بہت بڑی تعداد کی خواہش کے مطابق اس مقصد کے لیے کہ لوگ ادب، سائنس اور آرٹ کے مختلف شعبوں میں مہارت حاصل کرنے کے بعد امتحانات یا اور ذرائع سے اپنی استعداد کا پتہ چلا سکیں اور اس مقصد کے لیے کہ انہیں تعلیمی ڈگریاں، ڈپلومہ جات، مشرقی ادب کے خطابات، لائسنس اور اعزازات عطا کیے جائیں، نہایت خوشی سے اس کالج کو مکمل یونیورسٹی کا درجہ دیا۔ 14 اکتوبر 1882ء کو رسمی طور پر یونیورسٹی کو تشکیل دیا گیا۔ اس وقت اعلان کیا گیا کہ گورنر جنرل اس ادارے کے سرپرست ہوں گے۔ یونیورسٹی ایک چانسلر (جو ہمیشہ پنجاب کا لیفٹیننٹ گورنر ہوتا ہے) ایک

وائس چانسلر اور بہت سے اراکین پر مشتمل تھی۔ ان کی تقرری باضابطہ طور پر یونیورسٹی ایکٹ (1882ء کے نمبر XIX) کے مطابق ہوتی تھی۔ اس وقت پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر سر چارلس ایچی سن کو یونیورسٹی کا پہلا چانسلر، جیمز براڈوڈ (اب سر جیمزلی) لائل بہادر کو پہلا وائس چانسلر اور ڈاکٹر جی۔ ڈبلیو لیٹنر کو پہلا رجسٹرار مقرر کیا گیا۔ یونیورسٹی کے چانسلر، وائس چانسلر اور اراکین نے سینٹ کو تشکیل دیا۔ ان کو السنہ شرقیہ، آرٹس، قانون، سائنس، طب اور انجینئرنگ کے شعبہ جات قائم کرنے، سنڈیکیٹ کی تقرری اور رجسٹرار، ممتحنوں، پروفیسروں اور لیکچراروں کی تقرری کا اختیار حاصل تھا۔ سنڈیکیٹ دراصل سینٹ کی مجلس عاملہ تھی۔ اس کے پاس یہ اختیارات تھے کہ وہ ایکٹ کے تحت قواعد وضوابط اور قوانین کے مطابق سینٹ کے جملہ فرائض ادا کر سکتی ہے۔

مشرقی یونیورسٹی کا اشتراک ایک انگریزی یونیورسٹی سے تھا۔ ادارے کے بانیوں اور خیر خواہوں کی خواہش کے مطابق ملک کی مقامی اور قدیم زبانوں کی ترویج و ترقی کے سلسلہ میں حوصلہ افزائی کے لیے کئی سہولیات پیدا کی گئیں۔

لارنس گارڈن:۔ انار کلی اور لارنس و منٹگمری ہال کے درمیان مال روڈ کی دائیں جانب 112 ایکڑ رقبہ پر محیط لارنس گارڈن ہے۔ جس جگہ اب یہ باغ ہے یہ 1860ء میں اس وقت بالکل ویران تھی جب اس کے ایک حصہ میں باغ لگایا گیا۔ 1868ء میں ٹیلوں کے ساتھ والا حصہ قلعہ کے نزدیک قدیم بادامی باغ کی فروخت کے دوران خریدا گیا اور اس میں شامل کر لیا گیا۔ ان باغات کا یہ حصہ محکمہ زراعت و باغبانی کی زیر نگرانی ایک نباتاتی باغ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ایک حصہ میں چڑیا گھر قائم ہے اور باقی حصہ بلدیہ کے قبضے میں ہے اور عوامی تفریح گاہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اس باغ کو نہر باری دوآب کی لاہور برانچ سے نکالی گئی ندی سے سیراب کیا جاتا ہے۔ یہ باغ تقریباً 80,000 ہزار درختوں اور مختلف اقسام کی 600 جڑی بوٹیوں پر مشتمل ہے۔ اس میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کے عام درختوں کے علاوہ چل، آسٹریلوی گوند کا درخت اور شام و جنوبی یورپ کا کیرب درخت بھی شامل ہے۔

چڑیا گھر:۔ لاہور کے مشہور عام چڑیا گھر کو لوگوں کی دلچسپی اور تفریح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ اس میں مختلف نوع کے جانور اور پرندے ہیں جو خرگوش سے لے کر ریچھ، بندر، چیتے، شیر اور ٹائیگر تک اور الو سے لے کر کبوتروں، فاختاؤں، طوطوں، موروں، چکوروں اور مرغابیوں تک ہیں۔ بعد میں بہت سے مقامی سرداروں اور رئیسوں نے مقامی چڑیا گھر کی ترویج اور فروغ کے لیے کافی رقوم عطیہ کے طور پر دی ہیں اور سنہری مچھلی کا ایک تالاب تعمیر کرنے کی تجویز بھی پیش کی ہے۔ بلدیہ

تازہ پانی فراہم کرنے کے لیے لارنس ہال گارڈن تک نالیوں کی توسیع کرنے پر رضامند ہو گئی ہے (26)۔

گورنمنٹ ایگری، ہارٹیکلچرل گارڈن :۔ لاہور کے زرعی، گل بانی کے باغات، تبادلے میں اور حکومت کے خیراتی اداروں کو پودے اور بیج مفت مہیا کرتے ہیں۔ بعد میں، امریکی مکئی کی تین اقسام مثلاً وائٹ فیلڈ، ییلو فیلڈ اور اجیپشن سویٹ کے نئی آب و ہوا میں اگائے جانے والے بیج چند زمینداروں کو مفت جاری کیے گئے لیکن ابھی تک ان کی پیداوار کے نتائج کا پتہ نہیں چلایا جا سکا۔ امریکی مکئی کی دیگر تین اقسام مثلاً پیشپ ٹوتھ، پرائڈ آف نارتھ اینڈ سمیڈلی سے بھی نئی آب و ہوا کے لیے بیج حاصل کیے گئے ہیں لیکن ابھی یہ کہنا قبل از وقت ہو گا کہ آیا یہ اقسام کامیاب ہو جائیں گی اور ہندوستانی اقسام سے بہتر ثابت ہوں گی۔ اس باغ میں جارجیا، سی آئی لینڈ اور گیرو ہلز میں لگنے والی کپاس چھوٹے سے قطعہ زمین میں اگائی گئی ہے۔

پھولوں کا باغ :۔ موسم گرما کے سخت موسم میں لگنے والے مفید پھولدار پودوں میں ساٹھ نئی اقسام کا اضافہ کیا گیا ہے نئی اقسام کے پھول بہت بڑے، روشن اور پرانی اقسام کے مقابلہ میں مختلف رنگوں کے ہیں۔ ان میں چند نئے اور اعلیٰ اقسام کے ایک پھول والے پودوں کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔

موسم گرما کے پودے :۔ موسم گرما کی فصل میں لگنے والے پودوں میں سیمیلیا کے پھولدار پودوں کا ذکر بھی لازمی ہے۔ یہ دسمبر تک رہتے ہیں اور جاڑے کے دوران گر جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایگی میبزز ہے جس کی بیشمار اچھی اقسام ہیں اور موسم برسات میں اس کی بہار اور نکھار دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔

موسم سرما کے پودے :۔ اس میں اینٹھر ہنمس سیزر یئر یر، پنیرز، فلاکسز، پٹونیا اور دوہرے سر والے پودے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ رانسکلوس، ٹراٹونیا اور موسم سرما کے دیگر بصلہ نما پھولدار پودے بھی شامل ہیں۔ اماری لیس کا پھول بہت شاندار ہوتا ہے اور سیمیلیا کا پھول بھی خوبصورت ہوتا ہے اور باغ کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے۔ کریسینتھیم بھی بہت بھلے لگتے ہیں اور جس وقت دیگر پھول بہت کم ملتے ہیں اس وقت باغ میں کئی ہفتوں تک اپنی بہار دکھاتے رہتے ہیں۔ مختلف پھولوں کی پھلواڑیوں کا نظارہ بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ ان میں کئی اقسام کے ڈنیڈروبیئم بھی شامل ہیں۔

لاہور کی زمین سیب اور ناشپاتی کے یورپین درختوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔ یہ

دراصل خاص طور پر پہاڑی آب و ہوا کے درخت ہوتے ہیں۔ شملہ کے نزدیک مہاسو کے مقام پر ان کا ایک باغ لگایا گیا ہے۔ اس پر صوبائی محکمہ زراعت کا جزوی قبضہ ہے۔ ان کو لاہور میں کاشت کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

یورپیئن انجیر:۔ یورپیئن انجیر اگرچہ ہندوستان یا کابل کی اقسام کے مقابلے میں لگنے میں سست ہے لیکن اس کی کاشت بہت اچھی ہو رہی ہے۔

سنگترہ:۔ یہ باغ مالٹا، سنگترہ اور اطالوی و بٹاوی چکوترا کے درختوں پر مشتمل ہے۔ وہاں پر مہاگنی اور اریتھرو لیسکین کے بیشمار درخت بھی موجود ہیں۔

ہاٹ ہاؤس:۔ پھل دار درختوں کی نرسریوں میں آم کے پیوندی درخت بھی ہیں اور انہیں کہر سے محفوظ رکھنے کے لیے خاص توجہ دی جاتی ہے۔ تمام پودے جن کی حفاظت ضروری ہوتی ہے انہیں نہایت احتیاط کے ساتھ ہاٹ ہاؤس میں رکھ دیا جاتا ہے۔

متشرع پادری مشن (گرجا):۔ متشرع پادری مشن (گرجا) 1881ء میں لاہور میں قائم کیا گیا۔ یہ امریکہ (ریاست ہائے متحدہ امریکہ) کے متشرع پادری مشن (گرجا) کی "جنوبی ہند مشاورت" سے وابستہ ہے۔ یہ گرجا اپنی مدد آپ کے طور پر قائم ہے اور اس کا مقصد "انگریزی ۔۔ بول چال کے گرجا" کے ذریعے انجیل کا زبردست پرچار ہے۔ اس گرجے کی کوششیں ابھی تک تعلیم تک محدود ہیں۔ اس کے ساتھ اور کوئی سکول منسلک نہیں ہے۔

سینٹ جان ہوسٹل:۔ یہ ادارہ جو سینٹ جان ہوسٹل یا ڈیوائنٹی سکول کے نام سے مشہور ہے، میو ہسپتال کے قریب مہاسنگھ کے باغ کی چار دیواری میں واقع ہے۔ اس باغ کو چرچ مشنری سوسائٹی کے ایک عیسائی مبلغ اور بعد میں لاہور کے پہلے بشپ محترم ٹی ۔ وی فرینچ نے راولپنڈی میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ایک کاردار مہاسنگھ کے بیٹے سوایا سنگھ سے خریدا ۔ اس عمارت کی بنیاد آنجہانی بشپ نے 1870ء میں اس مقصد کے تحت رکھی کہ اس صوبہ اور دیگر صوبہ جات کے مقامی عیسائیوں کو مذہب اور انجیل کے متعلق تعلیم دی جائے (27)۔

یہ عمارات پرنسپل کے مکان، گرجا، لائبریری، کمرہ ہائے جماعت، مقامی کلرک، استاد کے مکان اور شادی شدہ اور غیر شادی شدہ 25 طلباء کے کوارٹروں پر مشتمل ہے۔ اس کے ارد گرد تین صحن ہیں۔ کالج کی عمارات میں سے سب سے زیادہ خوبصورت اور زیبائشی عمارت "گورڈن میموریل گرجا" کی ہے۔ جس کو (سکول کے استادوں میں سے ایک) محترم جی ۔ ایم گورڈن کی یادگار کے طور پر تعمیر کیا گیا۔ اس کو سرخ اینٹ سے شمالی اطالوی طرز تعمیر پر بنایا گیا ہے۔ آنجہانی پادری

نے اپنے ورثہ میں عمارت کے طور پر کالج کے لیے ایک گرجا چھوڑا ہے اور اس نے اس کے دوستوں کی طرف سے اس کی یادگار کے لیے جمع کیے گئے چندے کی رقم سے عمارت کی لاگت کو کافی حد تک پورا کر لیا ہے۔

اس ادارے کو ابتداء میں الوہیت کا پرچار کرنے والے طلباء کے لیے بنایا گیا تھا لیکن اب اس میں لاہور کے دیگر کالجوں اور سکولوں میں زیر تعلیم دیگر عیسائی نوجوان بھی شامل ہو گئے ہیں۔ ہوسٹل، چرچ، مشنری سوسائٹی کی ملکیت ہے۔ مقدس طلباء کو وظائف بھی دیے جاتے ہیں۔ جنہیں نجی چندوں سے جمع ہونے والی رقوم میں سے دیا جاتا ہے۔

ہوسٹل، چرچ مشنری سوسائٹی کے دو پادریوں محترم جی۔ ایچ۔ گرے، ایم۔ اے اور محترم ایف۔ اے۔ پی، شیریف کے زیر انتظام ہے۔ وہ مقدس طلباء کو پڑھاتے بھی ہیں۔ اس میں مذہبی کتابوں پر مشتمل ایک بہت بڑی لائبریری ہے جو کئی ہزار کتابوں کی حامل ہے۔ مقدس طلباء کے لیے مضامین تعلیم، انجیل مقدس، عیسائیت کی تعلیم، گرجے کی تاریخ، انگریزی زبان کی کتاب برائے عبادت، لازوال عبادت اور عیسائیت کی شہادتیں بمعہ مطالعہ اور تبلیغ کی عملی تربیت اور (محدود حد تک) یونانی اور عبرانی تعلیم شامل ہے۔

زنانہ مشن سکول:۔ ریلوے سٹیشن سے گورنمنٹ ہاؤس کو جانے والی سڑک پہ نولکھا کے مقام پر مقامی لڑکیوں کے اعلیٰ طبقے کے لیے سکول بمعہ اقامت گاہ ہے۔ اس کو 1873ء میں چرچ مشنری سوسائٹی سے وابستہ ایک ادارے انڈین فیمیل نارمن سکول اور انسٹرکشن سوسائٹی نے قائم کیا تھا۔ اس کے مقاصد میں مقامی عیسائی لڑکیوں کو بحیثیت استاد کے تربیت دینا اور ان لڑکیوں کو انگریزی اور مقامی زبان میں تعلیم دینا شامل ہے جن کے والدین کی تنخواہ اچھی خاصی ہو۔ یہ سکول ایک خاتون نگران کے تحت ہے۔ ان کے ساتھ عملہ میں انگلش لیڈی اسسٹنٹ، ایک یورپین میٹرن اور ایک منشی ہے۔ اس ادارے کو ملنے والی امداد وغیرہ کی جانچ پڑتال محکمہ تعلیم کے افسران کرتے ہیں۔ اس سکول کی امداد انگلستان میں سوسائٹی کے صدر دفتر سے ملنے والی گرانٹ، اس ملک میں جمع کیے جانے والے چندوں اور یہاں زیر تعلیم لڑکیوں کے والدین سے وصول کی جانے والی فیسوں کے ذریعے ہوتی ہے۔

زنانہ سکول:۔ مشن کالج کے زیر انتظام بوائز ہائی سکول اور مڈل سکولوں کے علاوہ شہر میں غیر عیسائی لڑکیوں کے لیے اٹھارہ پرائمری سکول بھی ہیں جن کو عیسائی خواتین چلاتی ہیں۔ ان میں فارسی، اردو، ہندی اور گورمکھی پڑھانے کے علاوہ کڑھائی سلائی اور مختلف اقسام کی بنائی کا کام بھی سکھایا

جاتا ہے۔ خواتین زنان خانوں میں بھی جاتی ہیں۔

پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی:۔ پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی کی نئی اور کشادہ عمارت انار کلی بازار میں واقع ہے۔ لنڈن ریلیجس ٹریکٹ سوسائٹی کی طرف سے اس کو 1863ء میں قائم کیا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو انگریزی اور مقامی زبانوں میں مذہبی کتب اور رسائل فراہم کیے جائیں۔ سوسائٹی کی کتابوں کی طلب بڑھتی جا رہی ہے۔ اس سوسائٹی کی کتابوں اور رسائل کی فروخت کے سلسلہ میں لاہور اور پنجاب کے دیگر مقامات پر بیشمار افراد مصروف ہیں۔ ان کی امداد عوامی چندوں اور عطیات سے کی جاتی ہے۔

لاہور ڈسٹرکٹ سکول:۔ گورنمنٹ کالج کے سامنے مغرب کی طرف اور ضلع کچہری کے قریب لاہور ڈسٹرکٹ سکول کا احاطہ ہے۔ سکول کو 15 اپریل 1860ء میں شہر میں موجود راجہ دھیان سنگھ کی حویلی میں قائم کیا گیا۔ اس کے پہلے ہیڈ ماسٹر مسٹر جے۔ سی۔ بیدی تھے۔ سکول کے دو شعبہ جات ہیں۔ ایک بالائی منزل پر اور دوسرا نچلی منزل پر ہے۔ بالائی شعبے میں لاہور اور اس کے مضافات کے رئیسوں کے بیٹوں کو پڑھایا جاتا ہے اور زیریں شعبے مٰیں دیگر لوگوں کے بیٹوں کو تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ وسیع و عریض حویلی اس کے مالک مہاراجہ کشمیر نے کمال مہربانی سے حکومت کی تحویل میں دے دی تھی اور 21 سال کے استعمال کے بعد مہاراجہ کی درخواست پر اسے خالی کر دیا گیا۔ جب تک موجودہ عمارت مکمل نہ ہوئی تو سکول کو عارضی طور پر شہر کے ایک اور علاقہ میں منتقل کر دیا گیا۔ سکول پرائمری، مڈل اور ہائی شعبہ جات میں منقسم ہے۔ دوسرے علاقوں سے آکر پڑھنے والے طلباء کے لیے ایک ملحقہ ہوسٹل بھی ہے۔

نارمل سکول: ۔لاہور نارمل سکول شہر میں موتی بازار کے اندر توشہ خانہ راجہ لال سنگھ کے نام سے مشہور بہت بڑی حویلی میں قائم ہے۔ اس سکول کو 1856ء میں پنجاب کے پہلے محکمہ تعلیم کے قیام کے ساتھ ہی قائم کر دیا گیا تھا۔ اس کے مقاصد مٰیں تمام درجوں کے مقامی سکولوں کے اساتذہ کی تربیت کرنا تھا لیکن 1881ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج کے قیام کے بعد اس کا کام مقامی پرائمری سکولوں کے اساتذہ کی تربیت تک محدود ہو گیا ہے۔ امتحان کے لیے مضامین مقامی زبان میں مڈل سکول کے امتحان کی طرح ہیں۔ اس میں تعلیم کے طریق کار اور سکول کے انتظام کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ یہ سکول سنٹرل ٹریننگ کالج کے پرنسپل کے زیر انتظام ہے۔ طلباء ابھی تک حضوری باغ کے کمروں میں رہائش پذیر ہیں۔ انہوں نے کئی سال سے اس پر قبضہ کیا ہوا ہے (28)۔

پاگل خانہ:۔ پنجاب کے لیے مرکزی ہسپتال برائے ذہنی مریضاں (پاگل خانہ) امرتسر کی سڑک کے

شمال میں ریلوے سٹیشن اور بیرکوں کے پہلو میں "ہنہ سنگھ کی چھاؤنی" کے نام سے مشہور احاطہ میں واقع ہے۔ اس عمارت کو ابتداء میں پٹ سن کے تجربات کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد ٹھگی جیل اور بعد ازاں گھڑ سوار پولیس کے لیے بیرکوں کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔ یہ چار دیواری کے اندر چار دالانوں پر مشتمل ہے۔ ان کے ساتھ کمرے موجود ہیں۔ ایک چار دیواری یا احاطہ مردوں کی جنرل وارڈ کے طور پر اور دوسرا زنانہ وارڈ اور ہسپتال کے طور پر اور تیسرا مرد پاگلوں کے لیے ورکشاپوں اور ایک ہسپتال کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ چوتھا انتہائی خطرناک اور مجرم پاگلوں کی جیل کے لیے اور چوتھا احاطہ باغ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ پاگل خانے کو انتظامی بورڈ کے تحت 1849ء میں قائم کیا گیا۔ اس کو ریذیڈنسی سرجن ڈاکٹر ہیتھاوے کے انتظام میں دے دیا گیا۔ ان کے بعد 1852ء میں ڈاکٹر سمتھ ان کی جگہ آئے اور 1870ء میں ڈاکٹر سکریون نے انتظام سنبھالا۔ الحاق سے قبل یا مہاراجہ دلیپ سنگھ کے دور حکومت میں لاہور میں بھی پاگل خانہ موجود تھا۔ اس کو لاہور پولیس کے ڈائریکٹر میجر میکریگر کے حکم سے اور سٹیٹ فزیشن و جرمن سیاح ڈاکٹر ہونگ برگر کی تجویز پر قائم کیا گیا۔ برطانوی دور حکومت میں پاگل خانے کو ان عمارات میں قائم کیا گیا جو اس وقت پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ اور ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن کے دفتر کے قبضے میں ہیں لیکن 1861ء میں دہلی کے پاگل خانے کے مریضوں کو لاہور منتقل کر دیا گیا اور یہ جگہ تمام مریضوں کو رکھنے کے لیے ناکافی ہو گئی۔ چنانچہ 1863ء میں انہیں موجودہ عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔

پاگل خانہ لاہور کے سول سرجن کے زیر انتظام ہے۔ وہ اس کے نگران کے طور پر فرائض سرانجام دیتے ہیں۔

سنٹرل ماڈل سکول:۔ یہ سکول سنٹرل ٹریننگ کالج کے ساتھ وابستہ ہے اور اس کے قریب اسی علاقہ میں واقع ہے۔ اس کو 1883ء میں اس مقصد کے ساتھ قائم کیا گیا تھا کہ طلبہ کو فن تدریس کی عملی تربیت کے ذرائع سے آگاہ کیا جائے۔ یہ پرائمری اور مڈل اینگلو، ورنیکلر سکول کے تمام درجات پر مشتمل ہے۔ سنٹرل ٹریننگ کالج کے طلبہ کے لیے یہ لازمی ہے کہ وہ ہر روز ایک مخصوص وقت میں ماڈل سکول کی جماعتوں کو پڑھائیں۔ ان کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ہفتہ میں ایک مرتبہ ان میں ضرور حاضر ہوں تاکہ وہ اساتذہ کو اپنی کلاسیں پڑھاتے ہوئے دیکھ سکیں۔

لاء سکول:۔ لاء سکول کو اصل میں 1868ء میں انجمن پنجاب لاہور نے قائم کیا تھا۔ 1874ء تک یونیورسٹی کی طرف سے قانون کا کوئی امتحان منعقد نہیں ہوتا تھا اور بطور وکلاء کے داخلہ کے

لیے امیدواروں کا امتحان لیگل پریکٹشنرز ایکٹ کے تحت چیف کورٹ کے ججوں کے تشکیل کردہ قواعد وضوابط کی پیروی میں لیا جاتا تھا۔ اس سال پنجاب یونیورسٹی کالج کو امتحانات کے انعقاد کا اختیار دے دیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ لاء سکول کی حیثیت کو عملی اور اثر آفریں طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ اب قانون کے ابتدائی امتحان کا انعقاد کیا جاتا ہے اور قانون کے ابتدائی اور آخری امتحانات کے لیے اسناد جاری کی جاتی ہیں۔ سال 91-1890ء کے لیے حاضری کے رجسٹر پر طلباء کی حاضری 65 تھی۔ یونیورسٹی کے مطلوبہ کامیابی کے نمبروں کی بہت زیادہ شرح کے پیش نظر گذشتہ برسوں کے دوران امتحانات کے نتائج اطمینان بخش تھے۔

لارڈ لارنس کا یادگاری مجسمہ :۔ چیف کورٹ کے سامنے مال روڈ کی نئی سڑک پر نصب لارڈ لارنس کا مجسمہ کانسی کا ہے۔ ان کو کھڑے ہوئے اس حالت میں دکھایا گیا ہے کہ ایک ہاتھ میں قلم اور دوسرے میں تلوار ہے۔ اس کو نوشہرہ پتھر کے چوکور چبوترہ پر نصب کیا گیا ہے۔ اس کے اطراف کی جگہ میں جدید دور کی عمارتی یادگاریں موجود ہیں اور اس حسین یادگار کی موجودگی حقیقی معنوں میں اس منظر کی دلکشی میں اضافہ کرتی ہے۔

سر ڈونالڈ میکلوڈ کا یادگاری مجسمہ :۔ یہ خوبصورت یادگاری مجسمہ گورنمنٹ سیکرٹریٹ آفس کے مشرق میں پرانے مال روڈ پر ایستادہ ہے۔ یہ سنگ مرمر کا ہے اور اسے سنگ سرخ کے ایک چوکور چبوترہ پر نصب کیا گیا ہے۔ اس کے چاروں طرف لوہے کا جنگلا ہے۔ اس میں مشرق کی طرف سے داخل ہوا جا سکتا ہے۔ مجسمہ پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

"اس کی یاد میں جو ہمیں بہت پیارا تھا"۔

ڈونالڈ فریل میکلوڈ کے سی۔ ایس۔ آئی

لیفٹیننٹ گورنر پنجاب تاریخ پیدائش 6 مئی 1800ء ، تاریخ وفات 28 نومبر 1872ء

"خدا ہی انہیں بہتر سمجھتا ہے جو اس کے اپنے ہیں۔"

مسجد کریم بخش :۔ پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کے ٹھیکیدار لاہور کے انتہائی عوامی و زندہ دل شخص میاں کریم بخش کی تعمیر کردہ یہ خوبصورت اور دلکش مسجد پانی کی نئی ٹینکی (ذخیرے) کے قریب واقع ہے۔ جنوب میں اس کے بیرونی دروازے پر سنگ مرمر کی تختی پر مندرجہ ذیل قطعات اور اشعار درج ہیں:۔

بیرونی دروازہ

کرد است کریم بخش ز الطاف کریم

لا الہ چنین مسجد عالی تعمیر

سرور بہ بنائی سجدہ گاہ والا

دل گفت شد این مسجد عالی تعمیر

ترجمہ :۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کریم بخش نے خدا کے نام پر اس شاندار مسجد کو تعمیر کرایا۔ سرور کے دل نے اس عالی شان سجدہ گاہ کی تاریخ بنیاد کے بارے میں کہا "یہ عالی شان مسجد تعمیر کی گئی ہے"۔

اندرونی دروازہ

افضل الذکر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

این بیت حق کہ کرد بنائش کریم بخش

روز جزا وسیلہ غفران او بس است

سال بنائش جستم و آمد ندا ز غیب

کاین بقعہ کریم مکان مقدس است

ترجمہ :۔ افضل الذکر کلمہ ہے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔

اللہ کا یہ گھر جو کریم بخش نے تعمیر کرایا ہے روز جزاء کو اس کی بخشش کا وسیلہ ثابت ہو گا۔ میں نے اس کی تاریخ بنیاد کے بارے میں دریافت کیا اور غیبی آواز آئی۔ "کریم بخش کی تعمیر کردہ یہ عمارت مقدس ہے"۔

1303 ہجری بمطابق 1885ء

مسجد سردار خاں :۔ سردار خاں کی یہ خوبصورت مسجد لاہور کے نواحی علاقہ مزنگ میں واقع ہے۔ وہاں پر یورپی باشندوں کے بہت سے رہائشی مکانات ہیں۔ سردار خاں اس گاؤں کا لمبردار تھا لیکن مسجد ابھی زیر تعمیر تھی کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ مسجد کا بڑا حصہ مکمل ہو چکا ہے اور اس کی طرز تعمیر کو لاہور کے شایان شان ایک زیور سمجھا جا سکتا ہے۔

باغ چھوٹے لعل :۔ پختہ اینٹوں کی چار دیواری سے مزین یہ چھوٹا سا خوبصورت باغ گورنمنٹ ہاؤس سے میاں میر کو جانے والی سڑک کے جنوب میں واقع ہے۔ دروازے کے اوپر ایک نہایت

دلکش اور صاف ستھری بارہ دری ہے۔ اس کے برآمدے سنگین پشتوں پر ایستادہ ہیں۔ باغ کے مغرب میں ایک نہایت عالی شان بارہ دری ہے۔ اس کی چھت کو نہایت خوبصورت اور شاندار سنگی ستونوں نے سہارا دے رکھا ہے۔ اس بارہ دری کے سامنے پانی سے لبریز ایک حوض ہے جو اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگائے ہوئے ہے۔ جنوب کی طرف شیشے کی کھڑکیوں اور دروازوں سے مزین اور خوبصورت گدوں اور آرائشی اشیاء سے مزین ایک مکان ہے۔ اس باغ میں خوشبودار پھول، درخت اور سبزہ کثرت سے ہیں اور یہ لاہور کے اسی طرز کے دیگر جدید تفریحی مقامات میں دلکشی اور خوبصورتی کے لحاظ سے بے مثال ہے۔ دروازے کے اوپر ابھرے ہوئے بڑے بڑے حروف میں درج ہے:-

"چھوٹے لعل کا باغ" (29)

ایچی سن گنج :- ایچی سن گنج دراصل لاہور کے اکبری دروازے کے نام کو تبدیل کر کے پنجاب کے سابق لیفٹیننٹ گورنر کے نام پر رکھا گیا۔ بادشاہوں کے دور میں یہ شہر میں غلے کی بہت بڑی اور اہم ترین منڈی تھی۔

رائے میلہ رام کا تالاب :- یہ انتہائی شاندار اور جاذب نظر عمارت نارتھ ویسٹرن ریلوے سٹیشن کے قریب واقع ہے۔ پوری عمارت کو پختہ اینٹوں سے تعمیر کیا گیا ہے۔ تالاب تک جانے کے لیے سیڑھی کے زینے ہیں۔ اس میں شمالی دیوار کے ساتھ بہنے والی نہر سے پانی فراہم کیا جاتا ہے۔ تالاب کے چاروں طرف محرابی کمرے ہیں۔ ان کی چھتیں مضبوطی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہیں کیونکہ ان میں انتہائی پختہ اینٹیں استعمال کی گئی ہیں۔ یہ کمرے زائرین اور مسافروں کے لیے بنائے گئے ہیں۔ تالاب کے شمال مشرق اور مغرب میں تین عظیم الشان محرابی دروازے ہیں۔ دروازوں کے اوپر بالائی منزلیں کمروں اور ایوانوں سے مزین ہیں۔ ایک قطعہ کو چار دیواری کے ذریعے علیحدہ کر کے خواتین کے استعمال کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ اس عمارت کے ریلوے سٹیشن کے قریب واقع ہونے کی وجہ سے لوگ اس سے بہت زیادہ استفادہ کرتے ہیں۔ سڑک اور ریلوے کے ذریعے سفر کرنے والے مسافر دھوپ اور بارش سے بچنے کے لیے اس جگہ پناہ حاصل کرتے ہیں۔ یہ تالاب اور سرائے دونوں مقاصد کو پورا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ملحقہ ایک چھوٹے سے باغ کی وجہ سے اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ اس کا بانی میلہ رام پبلک سروس ڈیپارٹمنٹ کا ایک ٹھیکیدار تھا، لوگوں کی بھلائی اور فلاح و بہبود کے کاموں میں دلچسپی لینے کے باعث اسے رائے اور بعد میں رائے بہادر کے خطابات سے نوازا گیا۔

تالاب و شوالا رتن چند :- یہ شہر کے شاہ عالمی دروازہ کے باہر واقع ہیں۔ ان کا بانی رتن چند ڈاڑھی والا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس کو یہ خطاب اس لیے دیا تھا تاکہ دربار میں اسی نام سے موجود ایک اور سردار جس کو رتن چند دگل کہا جاتا تھا، اس سے امتیازی فرق معلوم کیا جاسکے۔ رتن چند ایک عوامی شخصیت تھا۔ بلدیہ کے رکن کی حیثیت سے شہر کے لیے کی جانے والی بہتر خدمات کے صلے میں برطانوی حکومت نے دیوان کا خطاب دیا اور آنریری مجسٹریٹ بنا دیا۔ رتن چند کے تعمیر کردہ تالاب اور شوالا کو شہر لاہور اور اس کے مضافات کے زیورات میں شامل کرنا بے جا نہ ہو گا اور یہ حقیقی معنوں میں عوامی تفریح گاہوں میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ احاطہ بیشمار عمارات، باغات، دکانات اور مسافر خانوں پر مشتمل ہے۔ اس جگہ پر غلہ، گھی، تیل اور روزمرہ استعمال کی اشیاء کی منڈی بھی لگتی ہے۔ یہ مقام لوگوں کی دلچسپی کا باعث ہے۔ ہر روز یہاں لوگوں کے مختلف طبقے مثلاً تاجر، کاریگر اور ہنرمند اشخاص بڑی تعداد میں جمع ہوتے ہیں کیونکہ یہ ایک دوراہے پر واقع ہے اس لیے ہر قسم کی سواری کرایہ پر بڑی آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہے۔ اس کے مضافات میں رام لیلہ کا میلہ ہر سال بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ یہاں پر رتن چند کی سمادھ بھی ہے۔ اس کے بیٹے بھگوان داس نے اپنے باپ کے مفید اداروں کو بڑی اچھی حالت میں قائم رکھا ہوا ہے۔

راوی ریلوے پل :- دریائے راوی پر انتہائی شاندار وضع کا حامل ریلوے کا پل 3,300 فٹ طویل ہے۔ اس کو 35 خشتی ستونوں نے سہارا دے رکھا ہے، ان کو دریا کی تہ میں، انتہائی گہری بنیادوں پر تعمیر کیا گیا ہے، اس کے 33 در ہیں، ہر ایک کا دوسرے سے فاصلہ 100 فٹ ہے۔ پل کے نیچے پیدل مسافروں کے لئے 6 فٹ چوڑا راستہ ہے۔ اس کے اوپر والی چھت لوہے کی ہے، اس کو آہنی قینچیوں نے سہارا دے رکھا ہے۔ نیچے والے پل سے پیدل مسافروں کے علاوہ، بیل اور گھوڑے وغیرہ بھی گزر سکتے ہیں لیکن یہاں سے اونٹ اور گھوڑے بمعہ سواروں کے نہیں گزر سکتے کیونکہ چھت کافی نیچی ہے۔

پنجاب پبلک لائبریری :- پنجاب پبلک لائبریری کا دارالمطالعہ عوام کے لئے بلا معاوضہ کھلا ہوتا ہے اس کے روزمرہ اوقات موسم سرما میں صبح 8 بجے سے دوپہر تک اور 3 بجے سے رات 8 بجے تک اور موسم گرما میں صبح 7 بجے سے 11 بجے اور 4 بجے سے رات 8 بجے تک ہیں، اتوار کو 2 سے 5 بجے شام تک ہوتے ہیں۔

کمیٹی 100 روپے یا زائد رقم یا لائبریری میں پہلے سے نہ موجود کتابوں کا عطیہ قبول کر لیتی ہے اور ان کی مالیت 100 روپے گردانتی ہے، اسکے صلے میں، عطیہ گزار کو لائبریری کی تاحیات،

رکنیت دے دی جاتی ہے۔ہر کوئی عطیہ گزار، عطیہ دیتے وقت اس بات کی شرط عائد کر سکتا ہے کہ اس کی دی ہوئی کتابوں میں سے کوئی کتاب سوائے اس کے کسی کو جاری نہ کی جائے۔ تاحیات رکنیت کے حامل تمام افراد، قواعد کے مطابق وصول کیے جانے والی زر ضمانت چندوں اور دیگر فیسوں کی ادائیگی سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔

صدر --- عزت مآب ڈبلیو، ایچ ریٹیگن بہادر، ایل۔ ایل۔ ڈی، بیرسٹریٹ لاء

سیکرٹری --- الیف، میٹلینڈ بہادر۔

پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی :- پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کا اندراج رسمی طور پر 14 فروری 1890ء میں ایک انجمن کے طور پر کیا گیا تھا۔ سوسائٹی کے مقاصد یہ ہیں:۔

(الف) جن سرکاری اور بورڈ کے سکولوں اور کالجوں میں، مختلف درجات کے امتحانات کے لئے حکومت کے خصوصی حکم کے تحت انتخاب نہیں کیا جاتا اور جہاں پنجاب یونیورسٹی کے وضع کردہ نصاب لاگو نہیں ہوتے، وہاں پڑھائے جانے والے مضامین کے لئے مناسب کتب کی سفارش کرنا۔

(ب) ایسے کالج اور سکول، جہاں مضامین کی تعلیم کے لئے مناسب کتب دستیاب نہ ہوں ان کے لئے تمام مضامین کی نصابی کتب کی اشاعت، ترجمہ اور تیاری کے لئے اقدامات کرنا۔

(ج) سکولوں کی مختلف جماعتوں کی لائبریریوں کے لئے مناسب کتب کی فہرست تیار کرنا۔

(د) مقامی زبان کے ادب کے فروغ اور ترویج کے لئے مندرجہ ذیل اقدامات کے تحت خاص طور پر حوصلہ افزائی کرنا:۔

(i) مقامی زبان میں ترجمے کے لئے مفید اور حسب خواہش کتب کی فہرست تیار کی جائے گی۔

(ii) مشرقی زبانوں میں تصنیف شدہ نئی کتب کی نوعیت اور وسعت پر مشتمل فہرست تیار کر کے کمیٹی کی رائے کے مطابق ان کی اشاعت کی حوصلہ افزائی کی جائے گی

(iii) صوبے کے حکمران سرداروں، امراء اور شرفاء کے علاوہ ایسے لوگوں میں اس جیسی فہرستیں تقسیم کی جائیں گی جو سوسائٹی کے فنڈ میں چندے جمع کرا کر اس کے ذریعے مشرقی ادب کو فروغ دینا چاہتے ہوں۔

(iv) خاص معاملات میں منظور شدہ کتب کی اشاعت کا انتظام کیا جائے گا۔

(ه) نصابی کتب کی لائبریریوں اور عجائب گھر کا انتظام کرنا جو مندرجہ ذیل پر مشتمل ہوں گے:۔

(i) سرکاری اور بورڈ کے سکولوں اور کالجوں کے لئے منظور کردہ نصابی کتب کے نسخہ جات۔

(ii) دوسرے صوبوں کے لئے مجوزہ نصابی کتب کی نقول، ماسوائے ان زبانوں کے جو پنجاب میں بولی نہ جاتی ہوں۔

(iii) سرکاری اور بورڈ کے تعلیمی اداروں کے لئے نصابی کتب کے علاوہ، ایسی تعلیمی کتب کے نمونے جن کے عام طور پر طلبہ کے لئے مفید ہونے کا امکان ہو اور جو یورپی اور مقامی سکولوں کی نصابی کتب کے مطابق ہوں۔

(iv) تمام سکولوں کی جملہ جماعتوں کے استعمال کے لئے مناسب آلات، ڈایاگراموں اور نقشہ جات کے نمونے۔

(و) دوسرے صوبہ جات میں اس جیسی کمیٹیوں سے رابطہ قائم کرنا اور ان کے کام کی چھان بین کرنا۔

حال ہی میں تشکیل دی گئی مجلس عاملہ، جس کو سوسائٹی کے معاملات کا انتظام سونپا گیا ہے، اس کے اراکین کے نام، پتہ جات اور عہدے مندرجہ ذیل ہیں:۔

(الف) حکومت کے مقرر کردہ اراکین :۔

(i) جے، سائم بہادر ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن، پنجاب، بہ لحاظ منصب، صدر۔

دیگر اراکین۔

(ii) ٹی، سی، لیوپس بہادر، ایم اے، انسپکٹر آف سکولز، لاہور سرکل۔

(iii) محترم ڈاکٹر جے سی، آر، ایوینگ، ڈی۔ ڈی، پرنسپل، مشن کالج لاہور۔

(iv) جے۔ ایل۔ کپلنگ بہادر، سی۔ آئی۔ ای، پرنسپل میو سکول آف انڈسٹریل آرٹس، لاہور۔

(v) پنڈت بھانو دتہ، سنسکرت ٹیچر، میونسپل بورڈ سکول، لاہور۔

(vi) بھائی گورمکھ سنگھ، الیگزینڈر، ریڈر، اورینٹل کالج، لاہور۔

(vii) ڈاکٹر، ایم۔ اے، سٹین، رجسٹرار، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔

(viii) دیوان، نریندر اناتھ، اسسٹنٹ کمشنر، فیروز پور۔

(ix) جے۔ سی، اومن بہادر، پروفیسر نیچرل سائنس، گورنمنٹ کالج، لاہور۔

(x) ڈبلیو، بیل بہادر، ایم۔اے، پروفیسر گورنمنٹ کالج، لاہور۔

(xi) ای۔ایس، رابرٹسن بہادر، ایم۔اے، پروفیسر گورنمنٹ کالج، لاہور۔

(xii) پرنسپل، ٹریننگ کالج، لاہور (ایف، ہیڈن، کوپ بہادر، ایم۔اے) بہ لحاظ عہدہ۔

(xiii) رجسٹرار، ایجوکیشنل ڈیپارٹمنٹ لاہور، (لالہ رام کشن) بالحاظ عہدہ۔

(xiv) ای۔بی، فرانسیس، بہادر، کلکٹر بندوبست، فیروز پور۔

(xv) مولوی محمد دین، ایم۔او۔ایل، پروفیسر اورئینٹل کالج، لاہور۔

(ب) پنجاب یونیورسٹی کے مقرر کردہ ارکان:۔

(i) ڈاکٹر، ڈبلیو، پی، ڈکسن، سپرنٹنڈنٹ، سنٹرل جیل لاہور۔

(ii) ایف۔سی، کیننگ، بہادر، ڈویژنل جج، امرتسر۔

(iii) فقیر سید جمال الدین، خان بہادر، اعزازی، ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر، لاہور۔

(iv) ڈاکٹر رحیم خان، خان بہادر، اعزازی سرجن، لاہور۔

(v) ڈاکٹر محمد حسین خان، خان بہادر، اعزازی مجسٹریٹ لاہور۔

(vi) پنڈت گورو پرشاد، مہاماھو پدھایہ، ہیڈ ماسٹر، اورنٹیئل کالج، لاہور۔

(vii) سردار اتر سنگھ، کے۔سی۔آئی۔ای، مہاماھو پدھایہ، سردار، باجوڑ۔

(viii) جے۔سی، راجرز بہادر، سابق سربراہ محکمہ آثار قدیمہ پنجاب، امرتسر۔

(ix) محترم، ایس۔ایس آلنٹ، ایم اے، پرنسپل سینٹ سٹیفن کالج، دہلی۔

(x) بابو چندر ا ناتھ مترا، اسسٹنٹ رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔

(xi) لالہ پیارے لعل، انسپکٹر آف سکولز، جالندھر سرکل۔

(xii) سردار دھرم سنگھ، سوئین، اسسٹنٹ انجنئیر، لاہور۔

ریلوے ٹیکنیکل سکول:۔ ریلوے ٹیکنیکل سکول کو 1889ء میں نارتھ ویسٹرن ریلوے کے لئے لاہور میں قائم کیا گیا تھا۔ اس سکول کی نئی عمارت، نارتھ سیرٹن ریلوے سٹیشن کے بالکل قریب واقع ہے۔ اسکو تقریباً 45,000 روپے کی لاگت سے تعمیر کیا گیا۔ اس سکول کو نارتھ ویسٹرن ریلوے کی ورکشاپوں میں ملازم اہل حرفہ اور دستکاروں کے بیٹوں اور قریبی رشتہ داروں کے لئے، نظری و عملی تعلیم و تربیت کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ اس کے دو شعبہ جات ایک عام اور دوسرا خاص ہیں۔ پہلے میں سکول کی عام اور سادہ تعلیم دی جاتی ہے۔ اور دوسرے میں آنکھ اور ہاتھ کو ڈرائنگ

اور دستکاری کی تربیت دی جاتی ہے۔ ابھی تک صرف ایک دستکاری یعنی چوب کاری بمعہ ابتدائی چوبی کندہ کاری پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ لیکن اب یہ بھی تجویز کیا گیا ہے کہ اس میں آہنی کام اور دیگر دستکاریوں کی تربیت کا بھی اضافہ کر دیا جائے۔ لڑکے اوزاروں کے استعمال کے بارے میں سیکھتے ہیں اور ڈرائنگ کرنے اور پڑھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ پس 16 اور 17 سال کی عمر میں یہ اصلی ورکشاپوں میں بصری و دستی مہارت حاصل کر کے چلے جانے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ مقامی زبان اور عملی انگریزی میں تعلیم بھی حاصل کرتے ہیں۔

ریلوے ٹیکنیکل سکول اور اسی نوعیت کے دیگر اداروں کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ ملک کے عام سکولوں میں زیر تعلیم طلبہ میں، اپنے موروثی پیشے سے روگردانی اور سرکاری ملازمت کے متمنی افراد کے طبقہ میں اضافہ کرنے کے بڑھتے ہوئے رجحان کا پتہ چلایا جاسکے۔

سکول کے بندوبست پر 3,600 روپے سالانہ رقم خرچ ہوتی ہے۔

سکول کے ہیڈ ماسٹر لالہ چرنجی لعل، بی۔ اے ہیں۔

لاہور کے سرکردہ خاندان:۔ (30) ، ضلع لاہور کے لئے پنجاب گزیٹیئر، مندرجہ ذیل رئیسوں اور درباریوں کی فہرست پر مشتمل ہے، جن کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ ضلع لاہور کے بااثر اور صاحب جائداد اشخاص ہیں۔ (31)

ذیل میں ہر خاندان کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا جاتا ہے:۔

راجہ ہربنس سنگھ:۔ راجہ ہربنس سنگھ 1846ء میں پیدا ہوا۔ وہ راجہ تیجا سنگھ کا بھائی اور متبنی بیٹا، جمعدار خوشحال سنگھ کا ضلع میرٹھ کے پرگنہ سردھانہ میں اکری کا برہمن تھا۔ وہ سترہ سال کی کم عمری میں، ذریعہ معاش کی تلاش میں لاہور آیا اور دھونکل سنگھ والا رجمنٹ میں 5 روپے ماہانہ پر سپاہی کی حیثیت سے ملازمت اختیار کرلی، 1811ء میں اسے حاجب کے عہدہ پر مقرر کیا گیا۔ اس نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں جلوسوں اور دربار کو باقاعدہ بنایا، اس کی وجہ سے اس کا شمار انتہائی اہم افسران میں ہونے لگا۔ راجہ تیجا سنگھ، سکھ حکومت کے تحت، مختلف بااعتماد عہدوں پر فائز رہا۔ اور جب، سکھوں کی پہلی جنگ کے بعد 16 دسمبر 1846ء کو لاہور میں، قائم مقام، کونسل مقرر کی گئی تو راجہ کو اس کا صدر منتخب کرلیا گیا اس کے پاس فوج کا بھی اعلیٰ عہدہ تھا۔

راجہ ہربنس سنگھ کے پاس، لاہور اور امرتسر کے اضلاع میں 47,677 روپے کی جاگیر ہے اور ضلع گوجرانوالہ میں شیخوپورہ کے دیہات میں اپنی جاگیر میں مجسٹریٹ درجہ دوئم کا عہدہ بھی اس کے پاس ہے۔

نواب سرنوازش علی خان :۔ نواب سرنوازش علی خان ، کابل کے قزلباش ، نواب علی رضا خاں کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے ۔ انہوں نے 1839ء میں برطانوی حکومت کے تحت پہلی افغان جنگ میں گراں بہا خدمات سر انجام دیں ۔ کابل میں ان کی خدمات کے صلے میں ، ان کو برطانوی حکومت سے 800 روپے ماہانہ کی پنشن ملی ۔ 1857ء کے دور میں ، انہوں نے اپنے خرچ پر ، ایک گھڑ سوار دستہ تیار کیا ، اور ہوڈسن کے جاں باز گھڑ سوار دستے میں شامل ہو کر دھلی کے محاصرہ میں شاندار خدمات سر انجام دیں ۔ ان خدمات کے اعتراف میں ، اودھ میں ضلع بہڑائچ میں 147 دیہات کی تعلق داری انہیں بخش دی گئی ، جبکہ ان کے بھتیجوں کو بھی ، بڑی فیاضی سے نوازا گیا جنہیں محاذ جنگ پہ روانہ کیا گیا تھا ۔ 1866ء میں ، علی رضا خاں کی وفات کے بعد ، نواب کا خطاب ان کے بڑے لڑکے نوازش علی خاں کو عطا کر دیا گیا ۔ ان کو 1877ء میں آنریری اسسٹنٹ کمشنر مقرر کیا گیا اور 1885ء میں ہندوستانی سلطنت کا ہم نشین بنایا گیا اور تین سال بعد ، اسی حیثیت میں ، نواب کا خطاب ملا ۔

1886ء میں حکومت نے ضلع لاہور کے رکھ ہنگو کے مالکانہ حقوق انہیں تفویض کر دیئے وہاں انہوں نے دیہات آباد کیے ۔ 1887ء میں دستور ساز مجلس کے اضافی رکن نامزد ہوئے اور تین سال تک لاہور میونسپل کمیٹی کے صدر کے عہدہ پر فائز رہے ۔ مستحق طور پر ہر دلعزیز اور ہر جگہ ، باعث احترام ، نواب سر نوازش علی خاں ، 1890ء میں انگلستان کے بحری سفر کے بعد ، ایران کے ایک علاقے ، کربلا میں فوت ہو گئے (32) ۔

نواب سر نوازش علی خاں انتہائی با اصول اور اعلیٰ اوصاف کے مالک تھے ، معاملات زندگی میں انتہائی معاملہ فہم اور ٹھوس ثابت قدمی پر کاربند رہتے تھے ۔ انہوں نے اپنی خوش گفتاری اور دلآویز میلان کے باعث ، سب کے دل جیت لیے تھے ۔ اپنے ضعیف اور نیک باپ کی طرح انہوں نے بھی اپنی زندگی حقیقی طور پر ایک مشرقی نواب کی طرح بسر کی ۔ دور دراز علاقوں سے ان کے پاس آنے والے لوگوں سے مہمان نوازی اور نادار لوگوں سے عام طور پر کی جانے والی فیاضی نے انہیں لازوال شہرت سے ہمکنار کر دیا ۔ ان کی موت پنجاب کے لئے ایک زبردست دھچکا اور سلطنت کا عظیم نقصان ثابت ہوئی ۔ انہوں نے اپنے پیچھے ایک کم سن لڑکا هدایت علی خاں چھوڑا جو 1878ء میں پیدا ہوا ۔

نواب ناصر علی خاں :۔ اس وقت مرحوم کے چھوٹے بھائی نواب ناصر علی خان ریٹائرڈ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ، خاندان کے سربراہ ہیں ۔ انہوں نے یکم جنوری 1892ء کو نواب کا خطاب

حاصل کیا، اب یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے انتہائی قابل بھائی کے شایان شان، جانشین ثابت کریں گے۔

دیوان رام ناتھ :۔ دیوان رام ناتھ، دیوان امرناتھ کے بیٹے اور راجہ دیناناتھ کے پوتے ہیں۔

راجہ، سکھ ملوکیت کے آخری دنوں میں، اقتدار میں آیا، اور اپنے دور کا انتہائی قابل ذکر شخص بن گیا ملک کی تاریخ میں اس کے کردار کی مماثلت، مشہور زمانہ آدینہ بیگ سے بہت زیادہ ملتی ہے، جس نے اٹھارویں صدی کے وسط میں، پنجاب کی سیاست، میں نمایاں کردار ادا کیا (33)۔ وہ بھی اس کی طرح غیر معمولی ابتری اور مشکلات کا شکار رہا، جب جماعتوں کے درمیان، کشمکش جاری تھی اور گروہوں میں شرمناک حد تک سازشیں ہو رہی تھیں ان میں سے ہر کوئی سیاسی بالاتری اور آزادی کا خواہاں تھا تو وہ بھی قدرتی طور پر ایسی حالت سے دوچار ہوا۔ انقلاب، خونریزی اور طوائف الملوکی کے دوران، جب قرقی اور عدالتی ڈاکہ زنی ہر روز کا معمول بن گئی ہوئی تھی تو، راجہ دینا ناتھ اپنی حیثیت کو مضبوط کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ سر لیپل گریفین، اپنی تصنیف " سرداران پنجاب " میں لکھتے ہیں کہ اس کی فراست اور دور اندیشی اس قدر تھی، کہ جب دوسروں کی نظر میں سیاسی آسمان بالکل صاف تھا اس نے آنے والے طوفان کے آثار کو دیکھ لیا جس نے اسے کمزور پارٹی کو چھوڑنے یا زوال پذیر دوست کے بارے میں پیشگی اطلاع دے دی تھی۔ وہ ہندوستانی حکمت عملی کے فنون کا ماہر تھا۔ مہارانی جنداں کے عیاش بھائی جواہر سنگھ کے قتل کے بعد جب خالصہ فوجیں مکمل طور پر عروس البلاد پنجاب میں برسر اقتدار آگئیں تو راجہ دینا ناتھ نے راجہ لال سنگھ اور بیوہ مہارانی کے ساتھ مل کر جو کافی عرصہ سے اپنے بھائی کی موت کا انتقام لینے کی آرزو مند تھی، انگریزوں کے ساتھ لڑائی شروع کرنے کے لئے فوج کی حوصلہ افزائی کی۔ غیر محتاط فوج دھلی اور بنارس کو فتح کرنے کے خیالات سے مدہوش تھی اور ان دونوں قدیم شہروں کو لوٹ کر بے شمار دولت جمع کرنے کے بارے میں پر امید تھی، اس نے ہندوستان کے حکمران انگریزوں کی طاقت کو للکارا اور لاہور کی گلیاں اس پر جوش نعرہ سے گونج اٹھیں۔

کڑ ٹوٹے جمنا مرے کرے بہ چنگی باج

ترجمہ :۔ رکاوٹ کو توڑنا ہے، جمنا کو پار کرنا ہے اور خالصہ کو فتح کرنا ہے۔

جب فوج بہت زیادہ مشتعل ہو گئی تو نومبر کے آغاز میں، 1846ء میں شالامار باغ میں ایک عظیم مجلس کا اجلاس طلب کر لیا گیا۔ یہاں پر دیوان دینا ناتھ نے انتہائی اشتعال انگیز تقریر کی

اور انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ۔ فقیر عزیزالدین جو ضعیف العمری کے باعث ضعف بصارت میں مبتلا تھے اور ان کی صحت بھی کمزور تھی ۔ انہوں نے سپاہیوں کی خود کشی کے مترادف حکمت عملی کے خلاف ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے آواز بلند کی ۔ انہوں نے کہ " تم ایک ہرن کا تعاقب کرنے جا رہے ہو لیکن خود ایک غضب ناک شیر کا شکار بن جاؤ گے ۔ یہ اس طاقت کے خلاف ہتھیار استعمال کرنے کی حماقت ہے جس نے مرہٹوں کی نو لاکھ سپاہیوں پر مشتمل فوج کو تباہ کر دیا اور مشہور زمانہ ٹیپو سلطان کی طاقت کو کچل دیا ۔ " لیکن عمر رسیدہ فقیر کی نصیحت پر توجہ نہ دی گئی اور اسی پر عمل درآمد کیا گیا جس کی ضرورت محسوس کی گئی ۔

دیوان دینا ناتھ کا منصب بڑھا کر کلانور کا راجہ بنا دیا گیا ، جہاں 1847ء میں اس کے پاس ، اعزازی خطاب کے ہمراہ 20,000 روپے مالیت کی جاگیر بھی تھی ۔

امارت و ایالت دستگاہ خیر اندیش دولت عالیہ دیانت دار مشیر خاص مدار المہام ۔

ترجمہ :۔ اے عالی شان اور سرفراز منصب ، خیر اندیش دولت عالیہ ، دیانت دار اور مشیر خاص اور معاملات کے وزیر ۔

راجہ دینا ناتھ 1857ء میں فوت ہوا ، اس نے اپنے پیچھے دو بیٹے دیوان امر ناتھ اور کنور نرنجن ناتھ چھوڑے ۔ دیوان امر ناتھ عربی کا نہایت شاندار عالم فاضل اور نہایت صاحب ذوق اور عمدہ شاعر تھا ۔ وہ اکبری کے تخلص کے ساتھ شاعری کرتا تھا ۔ اس کے فارسی اور اردو اشعار میں شستگی اور شائستگی پائی جاتی ہے اور وہ اعلیٰ ثقافت اور بصیرت کے حامل ہیں ۔ وہ فارسی زبان میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور حکومت کی تاریخ پر مبنی کتاب " تاریخ خالصہ " کا بھی مصنف ہے ۔ حالانکہ اس کتاب میں مبالغہ آرائی کی گئی ہے لیکن اس حکمران کے دور حکومت کی تاریخ کے معاملہ میں اس کو نہایت قیمتی اضافہ خیال کیا جاتا ہے ۔ اس کے دیوان (مجموعہ شاعری) کو اس کی وفات کے بعد ، اس کے بڑے لڑکے نے شائع کروایا ۔ وہ 1867ء میں فوت ہوا اور پسماندگان میں دو لڑکے دیوان رام ناتھ اور پنڈت مان ناتھ چھوڑے ۔

دیوان رام ناتھ 1844ء میں پیدا ہوئے اور 1863ء میں سرکاری نوکری میں شمولیت اختیار کی ۔ ان کے باپ کی تمام پنشن ، یعنی 4000 روپے ابھی تک انہیں مل رہے ہیں ۔ انہیں 1869ء میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدہ پر ترقی دے دی گئی اور اس کے بعد 1882ء میں ایکسٹرا جوڈیشل اسسٹنٹ مقرر کیے گئے ۔ 1884ء میں پنجاب میں عدالتی منصوبہ بندی کی تنظیم نو کی گئی تو اس سر چارلس ایچی سن نے انہیں ڈسٹرکٹ جج کے عدہ کے لئے منتخب کر لیا

اور یہ عدہ ابھی تک ان کے پاس ہے۔ وہ پنجاب یونیورسٹی کے رکن ہیں اور ان کو بشمول، مشاہرہ اور خاندانی پنشن کے 16000 روپے سالانہ کی آمدنی حاصل ہوتی ہے۔ بحیثیت ڈسٹرکٹ جج اس وقت ان کی تقرری ہوشیار پور میں کی گئی ہے۔

سردار نریندر سنگھ :۔ سردار نریندر سنگھ (1860ء میں پیدا ہوئے) راجہ تیجا سنگھ کے صاحبزادے ہیں۔ ان کے پاس 4004 روپے کی جاگیر ہے اور وہ لاہور میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہیں، ان کو دیوانی اور فوجداری دونوں اختیارات حاصل ہیں، یہ ان کو 1885ء میں عطا کیے گئے بطور ایک عدالتی افسر کے انہوں نے اپنے فرائض کو احسن طریقے سے نبھایا ہے اور اسی کے باعث انہیں لوگوں کا اعتماد اور احترام و عقیدت حاصل ہے۔ میونسپل کمیٹی کے نائب صدر اور ڈسٹرکٹ بورڈ لاہور کے رکن ہونے کی حیثیت سے انہوں نے بہت قابل ذکر رویہ پیش کیا ہے۔

کنور نرنجن ناتھ :۔ کنور نرنجن ناتھ، نمبر3 ، راجہ دینا ناتھ کے چھوٹے بھائی ہیں، اپنے بڑے لڑکے، امرناتھ کے ساتھ ناراضگی اور اچھے معاملات نہ ہونے کے باعث انہوں نے اپنی تمام جائیداد، اپنے چہیتے بیٹے نرنجن سنگھ کے نام کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ لاہور میں رہائش پذیر ہیں۔

شیخ غلام محبوب سبحانی :۔ شیخ غلام محبوب سبحانی (پیدائش1841ء) نواب امام الدین خان کے صاحبزادے اور شیخ غلام محی الدین کے پوتے ہیں۔ جب شیخ غلام محی الدین نے، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں، مشہور زمانہ جنرل محکم چند کے تحت ملازمت کر لی تو یہ خاندان ہوشیار پور سے آکر لاہور میں آباد ہو گیا۔ وہاں ان کے پاس زمین کی صورت میں جائیداد تھی۔ ان کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے تحت 1839ء میں جالندھر دوآب کا حاکم اور 1841ء میں حاکم کشمیر مقرر کیا گیا۔ وہ 1845ء میں فوت ہوئے اور بعد میں ان کے صاحبزادے شیخ امام الدین خاں ان کے عہدے پر فائز کیے گئے۔ جب 16 مارچ 1846ء کے معاہدے کے تحت، مہاراجہ گلاب سنگھ نے اس صوبے کو لاہور کے دربار میں شامل کر لیا تو موخر الذکر اس وقت حاکم کشمیر تھے۔ شیخ صاحب نے، لاہور کے وزیر، راجہ لال سنگھ کی زیر ہدایت، جو ہمیشہ سے جموں کے ڈوگرہ خاندان کی طاقت سے حسد کرتا آیا تھا، ملک پر گلاب سنگھ کے قبضہ کی مخالفت کی۔ اور حتیٰ کہ جب، کرنل لارنس، ایک بہت بڑی فوج کی قیادت کرتا ہوا کشمیر کی سرحد کی طرف بڑھا تو شیخ صاحب نے خیال کیا کہ اب مزید مخالفت کا کوئی فائدہ نہیں چنانچہ ہتھیار پھینک دیے۔ انہیں معافی دے دی گئی اور برطانوی حکومت نے ان کے ساتھ بڑا فیاضانہ سلوک روا رکھا۔ انہوں نے اس کے بعد، ہمیشہ ان کی وفاداری کی۔ انہوں نے سرہربرٹ ایڈورڈز کی زیر قیادت 1848ء کی ملتان مہم میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے اور ان

کی خدمات کے صلے میں حکومت نے انہیں "نواب" کے خطاب سے نوازا اور نقد پنشن 11,600 روپے بھی عنایت کی۔ جبکہ انکی 8400 روپے کی جاگیر کی توثیق کردی گئی۔ 1857ء کے دور میں، انہوں نے حکومت کے حکم کے تحت، دہلی میں خدمات سرانجام دینے کے لئے دو گھڑ سوار دستے تیار کیے۔ وہ 1859ء میں 40 سال کی عمر میں فوت ہوئے اور اپنے پیچھے ایک صاحبزادے شیخ غلام محبوب سبحانی کو چھوڑا جو اس وقت خاندان کے موجودہ سربراہ ہیں۔

نواب امام الدین خان میں، ایک انتہائی کامل جرنیل اور بہترین منتظم کی اعلیٰ خصوصیات مشترکہ طور پر پائی جاتی تھیں۔ حاکم کشمیر کی تقرری سے پیشتر ان کے پاس کانگڑہ کی پہاڑیوں اور جالندھر دوآب کا انتظام تھا جو انہوں نے خوش اسلوبی سے نبھایا۔ عربی اور فارسی کے باکمال فاضل ہونے کے باعث وہ علماء و فضلاء کے سرپرست تھے۔ اعلیٰ خصوصیات کے مالک بے شمار عالم اور شعراء ان کے پاس ملازمت کرتے تھے اور ان کو بہت اچھی تنخواہ اور دیگر وظائف دیے جاتے تھے۔(34)

نواب غلام محبوب سبحانی کے پاس اپنے والد کی 5,600 روپے کی جاگیر کو دوام حاصل ہے اور 2,800 روپے تاحیات کے لئے ہیں۔ وہ عربی اور فارسی زبان کے باکمال عالم اور فاضل ہیں اور حال ہی میں، حکومت نے انہیں شہر میں آنریری مجسٹریٹ مقرر کیا ہے۔

شیخ فیروز الدین:۔ نواب امام الدین کے چھوٹے بھائی شیخ فیروز الدین 1866ء میں بطور تحصیلدار سرکاری نوکری میں شامل ہوئے۔ پانچ سال کے بعد ان کی خدمات کو ریاست بہاولپور میں منتقل کر دیا گیا اور منچن آباد کا کلکٹر مقرر کیا گیا۔ 1878ء میں ان کو وزیر بنا دیا گیا اور بہاولپور میں ان کی نمایاں خدمات کے صلے میں، حکومت پنجاب نے انہیں آنریری ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کا خطاب تفویض کیا، اس کے دو سال بعد ان کا انتقال ہوگیا۔

شیخ فیروز الدین اعلیٰ قابلیت اور بہت زیادہ علم و فضل کے حامل شخص تھے۔ قدرتی طور پر ان میں سیاسی بصیرت، دانشمندی اور قوت موجود تھی۔ انہوں نے ریاست بہاولپور میں اپنے آپ کو نہایت قابل قدر وزیر ثابت کیا۔ ان کے صاحبزادے، شیخ ناصرالدین (پیدائش 1853ء) پنجاب میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہیں انہوں نے کچھ عرصہ تک ریاست میں قائم مقام وزیراعظم کے خدمات سرانجام دیں لیکن 1892ء کے اوائل میں ریٹائرڈ ہوئے اور دوبارہ سرکاری نوکری میں شمولیت اختیار کرلی ہے۔

بھائی نند گوپال:۔ بھائی نند گوپال 1841ء میں پیدا ہوئے۔ وہ بھائی گوند رام کے بیٹے، بھائی

ہر بھاج رائے کے پوتے ، مشہور زمانہ اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے پیشوا ، بھائی بستی رام کے بھتیجے ہیں۔ سر لیپل گریفین " پنجاب کے سردار " میں لکھتے ہیں ۔ " کہا جاتا ہے کہ ان کی پیش گوئیاں ہمیشہ پوری ہوتی تھیں اور ان کی دعاؤں کا جواب ملتا تھا نیز ان کے پاس ایک حیرت انگیز تھیلا تھا جو خود بخود بھر جاتا تھا اور اس کا خالی ہونا ناممکن تھا۔ " وہ شہر کی فصیل کے باہر ثمن برج کے نیچے رہتے تھے اس وقت دریائے راوی فصیل کے ساتھ بہتا تھا اور ہر سال شہر میں زبردست تباہی پھیلاتا تھا۔ بھائی نے اپنا ڈیرا وہاں لگا لیا اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد دریا نے شہر کا رخ نہیں کیا (35)۔ خاندان کے سربراہ بھائی نند گوپال کے پاس 6564 روپے کی جاگیر ہے اور وہ لاہور کے صاحب جائیداد ، با اثر اور ہر دلعزیز شخص ہیں ۔

بھائی میاں سنگھ :- بھائی میاں سنگھ رائے بہادر (پیدائش 1841ء) بھائی کشن سنگھ کے بیٹے ، بھائی ندھان سنگھ کے صاحبزادے ، بھائی بستی رام کے پوتے ، بھائی گووند رام کے منہ بولے بھائی ہیں وہ لاہور کے آنریری مجسٹریٹ اور میونسپل کمیٹی کے رکن ہیں ، ان کو 1,225 روپے سالانہ کی جاگیر حاصل ہے۔

دیوان نریندرا ناتھ :- دیوان نریندرا ناتھ (پیدائش 1864ء) وہ ، دیوان بج ناتھ کے بیٹے اور ، پنڈت کشن داس کے بیٹے پنڈت گنگا رام کے صاحبزادے دیوان اجودھیا پرشاد کے پوتے ہیں۔ جب 1752ء میں احمد شاہ ابدالی نے کشمیر کو فتح کر لیا تو ہندوؤں کو مسلسل اذیتیں دی جانے لگیں بہت سے حفاظت کی خاطر پنجاب کو ہجرت کر گئے۔ ان میں دیوان اجودھیا پرشاد کا دادا پنڈت کشن داس بھی شامل تھا۔ اس نے دھلی کے بادشاہوں کے پاس ملازمت حاصل کر لی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جب پنڈت گنگا رام کی صلاحیتوں اور کمالات کے بارے میں سنا تو اس نے مارچ 1813ء میں ان کو لاہور آنے کی دعوت دی ۔ ان کو فوج کے حسابات کا سربراہ بنا دیا گیا اور ریاست کی مہر بھی سپرد کر دی گئی ۔ انہوں نے ہندوستان سے اپنے بہت سے عزیز رشتہ داروں اور دوستوں کو بلوا لیا، ان میں پنڈت (بعد میں راجہ) دینا ناتھ اور دیوان شنکر ناتھ (لاہور کے ایک سابق آنریری مجسٹریٹ) کے والد ، پنڈت ہری رام بھی شامل تھے۔ گنگا رام اپنی صلاحیت اور قوت کارکردگی کے باعث جلد ہی لاہور کے حکمران کے منظور نظر بن گئے اور 1821ء میں انہیں گجرات کا حاکم مقرر کیا گیا۔ وہ 1826ء میں فوت ہوئے۔

اجودھیا پرشاد خاص فوج کے خزانچی تھے ، انہوں نے سکھ حکومت کے تحت کارہائے نمایاں سرانجام دیئے اور جواہر سنگھ کی وزارت کے تحت ، ان کے مشاہرہ میں 3,000 روپے سالانہ کا

اضافہ کیا گیا - اور ان کی جاگیروں میں بھی خاطر خواہ اضافہ کیا گیا- جب 16 مارچ 1856ء کے معاہدہ کے تحت ، دریائے راوی اور سندھ کے درمیان کا پہاڑی علاقہ مہاراجہ گلاب سنگھ کے حوالے کیا گیا تو دیوان کو کیپٹن ایبٹ کے ساتھ کمشنر مقرر کیا گیا تا کہ لاہور اور جموں کے درمیانی علاقوں کی نشاندہی کی جاسکے- 26 نومبر 1847ء کو انہیں " ممتاز الدولہ " کا اعزازی خطاب عطا کیا گیا اور اپریل 1849ء میں انہیں ڈاکٹر لوجن کے ساتھ، مہاراجہ دلیپ سنگھ کے ہمراہ فتح گڑھ جانے کے لئے منتخب کر لیا گیا- اور وہ ستمبر 1851ء تک اس کی خدمت پر مامور رہے - دیوان 1870ء میں بطور آنریری مجسٹریٹ لاہور فوت ہوئے - ان کے صاحبزادے دیوان بج ناتھ 18 اگست 1875ء کو فوت ہوئے-

دیوان بج ناتھ کے صاحبزادے دیوان نریندر ناتھ کو 625 روپے سالانہ کی تاحیات پنشن کے علاوہ ضلع لاہور میں رکھ ہنجروال میں ان کے والد کے آباد کردہ گاؤں اجودھیاپور سے آمدنی بھی موصول ہوتی تھی- بعد ازاں اس کے مالکانہ حقوق لیفٹیننٹ گورنر سر رابرٹ منٹگمری نے جنوری 1864ء میں ان کے حوالے کر دیئے- دیوان نے 1886ء میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور 1888ء میں مجوزہ سول سروس رولز کے تحت انہیں پنجاب میں اسسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے ان کی تقرری ضلع فیروز پور میں کی گئی ہے- دیوان اعلیٰ خصوصیات کے حامل انسان ہیں اور انتہائی با کردار شخص ہیں- ابتدائی عمر میں انہوں نے اعلیٰ ذہانت اور بہترین میلان کا مظاہرہ کیا ہے- انگریزی زبان کے ایک انتہائی باکمال عالم فاضل ہونے کے علاوہ، ان کے پاس عربی، فارسی اور سنسکرت کا مکمل علم اور شاعرانہ ذوق بھی ہے - سول جج کی حیثیت سے ان کے فیصلوں کی درستگی سے عوام مطمئن رہتے ہیں اور اسی کی وجہ سے انہیں اپنے اعلیٰ حکام اور عوام دونوں کا اعتماد حاصل ہے- حکومت کے لئے فرائض سرانجام دینے کے آرزو مند اپنے ہم وطنوں کے ملنسار اور اخلاقی لحاظ سے خوش گفتار اور مہربان دیوان نریندر اناتھ، ہندوستانی تعلیم یافتہ شرفاء کی ایک مکمل مثال ہیں - ان سے نہایت مفید اور روشن پیشے کی توقع کی جاسکتی ہے - 1887ء میں انہوں نے آزادی کے موضوع پر لکھے گئے جان سٹوارٹ مل کے مضامین کا انتہائی قابل تعریف اردو ترجمہ شائع کروایا-

سردار رنجودھ سنگھ بھیروالیہ :- سردار رنجودھ سنگھ، سردار کاہنہ سنگھ نکائی کے پوتے ہیں اور بڑی سڑک سے پرے ایک چھوٹے سے گاؤں بھیروال میں رہتے ہیں- انہیں خاندان کی سرداری عطا کی گئی ہے اور ان کے پاس 2,000 روپے سالانہ کی جاگیر دوام بھی ہے-

نواب عبدالمجید خاں :- نواب عبدالمجید خاں ، شاہنواز خاں کے صاحبزادے اور ملتان کے

سدوزئی نواب، نواب شجاع خاں کے بیٹے، نواب مظفر خاں کے پوتے تھے۔ وہ 1813ء میں پیدا ہوئے اور 1818ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ملتان کو فتح کرنے کے بعد، ان کا خاندان لاہور میں آباد ہو گیا۔ وہ عربی اور فارسی کے بہترین عالم تھے، اس کی علاوہ تاریخ اور شاعری میں ذوق رکھنے کے ساتھ ساتھ طب میں بھی صاحب کمال تھے وہ انتہائی خوش معیار طبعیت کے مالک تھے۔ ان کی موجودگی سے محفل زعفران زار بن جاتی تھی۔ ان کو غیر معمولی یادداشت اور ذہانت سے مستفیذ کیا گیا تھا۔ انہیں اردو کے عظیم شعراء سودا، میر، انشاء، غالب، ذوق اور ظفر کے سینکڑوں منتخب شعر زبانی یاد تھے اور وہ اپنے سامعین اور حاضرین محفل کو گھنٹوں تک نظمیں پڑھ کر اور اپنی بزلہ سنجی اور مزاحیہ گفتگو سے محظوظ کرتے تھے۔ ان کی خوش اخلاقی، ملنساری اور خوش گفتاری کی وجہ سے ان کی بہت عزت و تکریم کی جاتی تھی۔ انہوں نے اپنی طویل پیشہ ورانہ زندگی میں اپنے آپ کو ہر دم اور مکمل طور پر شاہی اقتدار کا وفادار ثابت کیا۔ اور اس کے باعث انہیں اعلیٰ سرکاری حکام سے بے شمار تعریفی اسناد بھی ملیں۔ بے شک یہ سب ان کے اعلیٰ کردار کا ثبوت ہیں۔ بطور آنریری مجسٹریٹ اور رکن میونسپل کمیٹی، وہ بہت زیادہ مقبول تھے اور لاہور کے عوام کی بہتری کے لئے ان کے جوش و خروش، اور عوام کی فلاح و بہبود کے لئے کیے جانے والے اقدامات نے انہیں نہایت قابل قدر شہری بنادیا۔ شاہی حکومت نے ان کی خوبیوں اور خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے جنوری 1865ء میں انہیں نواب کا خطاب عطا کیا۔ 1869ء میں انہیں پنجاب یونیورسٹی کا رکن بنایا گیا اور وہ کافی عرصہ تک لاہور میونسپل کمیٹی کے نائب صدر بھی رہے۔ 1887ء میں دہلی میں منعقدہ شاہی اجلاس میں انہیں اسسٹنٹ کمشنر کے اعزاز سے نوازا گیا اور اسی سال " ستارہ ہند " کے اعزاز سے بھی مستفیض کیا گیا۔ انہیں 3,000 روپے سالانہ کی پنشن ملتی تھی وہ لاہور میں، 26 فروری 1890ء کو 77 سال کی عمر میں لاولد فوت ہوئے۔

سردار سروپ سنگھ ملوائی :۔ سردار سروپ سنگھ ملوائی (پیدائش 1850ء) وہ سردار کرپل سنگھ کے بیٹے اور سردار دھنہ سنگھ ملوائی کے پوتے تھے، جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے انتہائی چہیتے سرداروں میں سے ایک تھے۔ کرپل سنگھ نے میجر (بعد میں سر) ہربرٹ ایڈورڈز کے تحت بنوں میں اور پھر 1848ء میں، ملتان کی مہم میں خدمات سر انجام دیں۔ انہوں نے 1857ء میں سپاہیوں کو بھرتی کیا اور خود کو حکومت کا وفادار ثابت کیا، اس کے صلے میں انہیں 500 روپے کی خلعت اور تعریفی سند سے نوازا گیا۔ وہ 1859ء میں فوت ہوئے۔

سردار سروپ سنگھ جو سردار کرپل سنگھ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ انہوں نے لاہور گورنمنٹ

سکول سے تعلیم حاصل کی جہاں ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن میجر، اے، آر، فلر کے دور میں سکول کے ہیڈ ماسٹر مسٹر جے۔ سی، بیدی کے تحت رئیسوں کے بیٹوں کی تربیت کے لئے ایک اعلیٰ درجے کی کلاس کھولی گئی تھی۔ ان کے پاس ضلع لاہور میں 6,797 روپے سالانہ کی جاگیر تھی، یہ جاگیر اور اس کے علاوہ لاہور اور فیروز پور اضلاع کے دیہات بھی ان کے بچوں کے پاس ہیں۔

سردار فتح سنگھ تھیپوریہ :۔ ضلع لاہور کے ایک دیہات، تھیپور کے سردار فتح سنگھ کے پاس 3,000 روپے کی جاگیر تھی۔ 1886ء میں ان کی وفات کے بعد، ان کی جاگیر کا ایک چوتھائی حصہ ان کے ان تین بیٹوں کو دیا جاتا ہے جن کی دربار میں نمائندگی نہیں ہے۔

فقیر سید ظہور الدین بخاری :۔ فقیر سید ظہور الدین (پیدائش 1824ء) مہاراجہ رنجیت سنگھ کے شاہی طبیب فقیر نورالدین کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے اور جو مہاراجہ کے وزیر فقیر عزیزالدین کے چھوٹے بھائی تھے۔ فقیر ظہور الدین سید غلام شاہ کے بیٹے، سید غلام محی الدین کے پوتے تھے۔ دونوں بھائیوں کو مہاراجہ کا مکمل اعتماد حاصل تھا اور اس نے انہیں خوب عزت بخشی تھی۔ نورالدین برطانوی حکومت اور سکھ دربار کے درمیان دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کے سلسلہ میں اپنے بھائی عزیز الدین کے دست راست تھے۔ دونوں بھائیوں کو انگریزوں سے والہانہ محبت تھی اور ان کی یہ شدید خواہش تھی کہ دونوں طاقتوں میں دوستانہ تعلقات استوار ہو جائیں۔ نورالدین کا شمار سکھ دربار کے ان سرداروں میں ہوتا ہے جنہوں نے راجہ گلاب سنگھ اور دیوان دینا ناتھ کے ہمراہ قصور کے مقام پر (36)، سکھوں کی پہلی جنگ کے بعد، امن کی بات چیت کے لئے گورنر جنرل لارڈ ہرڈنج کا انتظار کیا تھا۔ مزید برآں انہوں نے ریاست لاہور کی جانب سے 9 مارچ 1846ء کو ہونے والے معاہدہ پر دستخط کیے اور جب دسمبر 1846ء میں وزیر راجہ لال سنگھ کی بغاوت کے باعث اسے معزول کر دیا گیا تو انہیں قائم مقام مجلس کا رکن مقرر کیا گیا کہ جب تک کمسن مہاراجہ دلیپ سنگھ بلوغت کی عمر کو نہیں پہنچتا اس وقت تک ملک کا انتظام سنبھالے گی۔ فقیر سید نورالدین 1852ء میں فوت ہوئے اور اپنے پیچھے چار بیٹے سید ظہور الدین، سید شمس الدین، سید قمرالدین اور سید حفیظ الدین چھوڑے۔ شمس الدین عربی کے باکمال عالم فاضل شخص تھے۔ وہ ایک آزاد خیال اور صاحب قوت انسان تھے۔ اپنے ہم وطنوں کے ذہنوں میں اعلیٰ خیالات کو روشن کرنے میں کوشاں رہتے اور ملک کی فلاح و بہبود میں ترویج کے متمنی رہتے تھے۔ 1862ء میں انہیں لاہور میں آنریری مجسٹریٹ مقرر کیا گیا اور 1872ء میں اپنی وفات تک بڑی شان سے اس عہدے پر کام کرتے رہے۔

فقیر سید حفیظ الدین پنجاب میں کافی عرصہ تک تحصیلدار کے طور پر خدمات سرانجام دیتے رہے ہیں۔ 1886ء میں پنشن پر ریٹائر ہونے کے کچھ عرصہ بعد فوت ہوگئے۔ فقیر سید قمر الدین خان بہادر شہر میں آنریری مجسٹریٹ ہیں۔

فقیر سید ظہور الدین کو 1,200 روپے سالانہ کی خاندانی پنشن حاصل ہے۔ پنجاب کے الحاق کے بعد انہیں کمسن مہاراجہ دلیپ سنگھ کا اتالیق مقرر کیا گیا۔ وہ مہاراجہ کے ہمراہ فتح گڑھ گئے اور 1851ء کے آخر پر واپس پنجاب آگئے۔ 1855ء میں انہیں پنجاب میں تحصیلدار مقرر کیا گیا اور 1863ء میں انہیں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ 1883ء میں، برطانوی حکومت کے تحت 27 سال تک خدمات سرانجام دینے کے بعد وہ 315 روپے ماہانہ کی پنشن پر ریٹائر ہوئے۔ اس کے علاوہ انہیں 1,200 روپے سالانہ خاندانی پنشن بھی حاصل ہوتی ہے۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں حکومت نے 1877ء میں انہیں گوجرانوالہ میں پانچ سو ایکڑ زمین بھی عنایت کی ہے۔ اس وقت وہ ضلع گورداسپور، بٹالہ کے سب۔ رجسٹرار ہیں۔ وہ ایک انتہائی خوش اخلاق عمر رسیدہ شخص ہیں۔ ان کی گفتگو میں حلم اور شائستگی نظر آتی ہے جو فقیر خاندان کو ورثے میں ملی ہے۔ قدرتی طور پر حلیم الطبع اور ملنسار ہیں۔ ان کے مزاج میں سخاوت موجود ہے اور جو کوئی بھی انہیں جانتا ہے۔ وہ ان کی طرف انتہائی عقیدت و احترام کے ساتھ دیکھتا ہے اور یہ بات قابل غور ہے کہ وہ انتہائی عاجز آدمیوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔

لالہ بھگوان داس :۔ لالہ بھگوان داس (پیدائش 1838ء) وہ دیوان رتن چند ڈاڑھی والا کے بیٹے ہیں وہ لاہور کے ایک آنریری مجسٹریٹ ہیں اور انہیں 2,585 روپے مالیت کی جاگیر ملی ہوئی ہے۔ وہ ایک عوامی اور ہر دلعزیز شخص ہیں اور ہر اس کام میں دلچسپی لیتے ہیں جو شہر کی فلاح و بہبود کے لئے ہو۔ انہوں نے بے شمار عمارات تعمیر کرائیں، جن میں، شاہ عالمی دروازہ کے باہر ان کے والد کے تعمیر کردہ تالاب کے کنارے پر بنا ہوا شاندار ٹھاکر دوارہ بھی شامل ہے۔

فقیر برہان الدین :۔ فقیر شمس الدین کے بیٹے فقیر برہان الدین پنجاب میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے اور ریاست بھوپال میں بحیثیت نائب وزیر مال کے ان کی فقیر المثال خدمات کے اعتراف میں 1888ء میں انہیں خان بہادر کا خطاب ملا۔ وہ 1890ء میں لاہور میں لاولد انتقال کر گئے۔

فقیر جمال الدین :۔ فقیر عزیز الدین کے واحد زندہ بچ جانے والے فرزند فقیر سید جمال الدین (پیدائش 1833ء) لاہور کے ایک آنریری ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہیں۔ انہیں مجسٹریٹ کے مکمل

اختیارات حاصل ہیں۔ لاہور کے مشہور و معروف اور انتہائی با اثر فقیر خاندان کے بارے میں یہاں مختصر بیان دلچسپی سے خالی نہیں ہو گا۔

فقیر عزیز الدین کے دادا سید غلام شاہ کے پاس بادشاہ محمد شاہ کے دور حکومت میں حاکم لاہور نواب عبدالصمد خاں ، دلر جنگ اور اس کے بیٹے نواب ذکریا خاں ، خان بہادر کے ماتحت عہدہ تھا۔ سید غلام شاہ کے صاحبزادے غلام محی الدین نے لاہور میں طبیب کے طور پر کام شروع کیا اور پنجاب کے بہت سے علاقوں کی سیاحت کی۔ وہ ایک مذہبی ذہن کے شخص تھے اور فقیر امانت شاہ قادریؒ کے مرید بننے کے بعد سب سے پہلے فقیر کا لقب اختیار کیا (37)۔

غلام محی الدین کے تین بیٹے عزیزالدین ، امام الدین اور نور الدین تھے۔ فقیر نور الدین کے بارے میں پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں امام الدین کے زیر انتظام امرتسر میں گووند گڑھ کا مشہور و معروف قلعہ تھا اور وہ کچھ ہی عرصہ بعد اس کے ارد گرد کے علاقہ کے حاکم بنا دیئے گئے۔ انہوں نے کنہیوں کے خلاف جنگ کی اور ان کا شمار ان افسروں میں ہوتا ہے جن کو مہاراجہ نے اپنی ساس ، سدا کور کی فوجوں کو شکست دینے کے لئے روانہ کیا تھا۔ وہ 1844ء میں فوت ہوئے اور اپنے پیچھے ایک فرزند تاج الدین چھوڑا۔

غلام محی الدین کے پہلے صاحبزادے ، عزیزالدین اپنے وقت کے انتہائی غیر معمولی شخص تھے۔ ان کے کردار کے بارے میں سکھ دربار کا دورہ کرنے والے یورپی سیاحوں نے بڑا واضح نقشہ کھینچا ہے۔

سب سے پہلے فقیر کا ذکر ہمیں ولیم مور کرافٹ کے سفرناموں میں ملتا ہے جنہوں نے 1820ء میں رنجیت سنگھ کے دربار کا دورہ کیا ، وہ لکھتے ہیں۔ " شام کو رنجیت سنگھ کے وزیر حکیم عزیزالدین تشریف لائے اور کچھ دیر تک مجھ سے محو گفتگو رہے۔ وہ تقریباً 35 سال کی عمر کے آدمی ہیں اور خوشگوار اطوار کے مالک ہیں " (38)۔ فقیر انگریزوں کے زبردست حامی تھے اور ابتدائی دور میں ، جب ان کے آقا نے موت کی وقت انہیں اپنے اعتماد میں لیا تو انگریزوں کے ساتھ ان کی دوستی میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ یہ سب کچھ ان کی دور اندیشی ، مقصد پر ایمانداری اور سختی سے قائم رہنے ، عمل کی سچائی اور اپنے حکمران کی وفاداری پر ثابت قدمی سے قائم رہنے کی وجہ سے تھا جبکہ دوسرے لوگ اس اہم نازک مرحلہ پر عظیم مہاراجہ کی چاپلوسی کر رہے تھے اور اس کے ذہن میں غلط خیالات کو پروان چڑھا کر انگریزوں کے خلاف تلوار استعمال کرنے کی وکالت کر رہے تھے تو اس موقع پر زیرک فقیر نے مہاراجہ کو معاملہ فہمی پر مبنی مشورہ دیا اور اس عظیم طاقت کے

خلاف ہتھیار آزمانے سے منع کیا۔ پس جب 1808ء میں برطانوی حکومت کی طرف سے مسٹر میٹکافے کو تجاویز دے کر لاہور روانہ کیا گیا اور مہاراجہ نے تقریباً اس طاقت کے خلاف جنگ کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا اور برطانوی دستے بھی واقعتاً دریائے ستلج سے روانہ ہو گئے تھے تو عزیز الدین نے بڑی سختی سے جنگ کی مخالفت کی مسٹر مور کرافٹ لکھتے ہیں " ماسوائے حکیم اور ایک دوسرے شخص پربھ دیال کے جس نے برطانوی طاقت سے ٹکر لینے سے منع کیا تھا اس کے تمام درباریوں اور مشیروں نے اس کے اس فیصلہ کی تائید کی۔ راجہ نے کچھ دیر کی ہچکچاہٹ کے بعد ان کے مشورہ کی دانشمندی کا اعتراف کر لیا اور ان دونوں اشخاص پر مکمل بھروسہ کرنے لگا۔ پربھ دیال کا انتقال ہو گیا لیکن عزیز الدین کو طبیب کے اضافی عہدے کے علاوہ وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ "

سر الیگزینڈر برنز، جنہوں نے عزیزالدین کو جنوری 1832ء میں دیکھا تھا۔ اپنے سفر نامے میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔ خیمے میں اپنے سیاحوں کے درمیان میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے طبیب اور وزیر دانشمند عزیزالدین کا ذکر کرنا نہیں بھولا۔ مشرقی خیالات کے مطابق وہ انتہائی عالم فاضل شخص ہیں۔ علم الکلام مابعد الطبعیات اور طبیعات کے گہرے علم کی بصیرت رکھنے والے، جس کے بارے میں انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ وہ انہوں نے یونانی مصنفین سے حاصل کیے ہیں۔ انہوں نے اپنے کسب کمال کا ذکر اپنی طویل مباحث میں اکثر جگہ کیا ہے (39)۔

آک لینڈ کے نواب (ارل) کے ملٹری سیکرٹری، عزت مآب ڈبلیو، جی، آسیورن جنہوں نے عزیزالدین کو 1838ء میں دیکھا تھا لکھتے ہیں۔ " خیال ہے کہ عزیز الدین کا دھیان سنگھ کے ہمراہ، دوسرے سکھ سرداروں کی بہ نسبت، رنجیت سنگھ پر زیادہ اثر و رسوخ ہے۔ وہ تقریباً چالیس پینتالیس سال کے انتہائی دلکش شخص ہیں۔ " مصنف مزید لکھتا ہے " ان کے انداز و اطوار بہت اچھے ہیں اور وہ اس قدر حلیم الطبع ہیں کہ یہ ناممکن ہے کہ انہیں پسند نہ کیا جائے۔ " (40)

جرمن سیاح، کیپٹن لیو پولڈ وان آرلچ، جنہوں نے جنوری 1843ء میں دربار لاہور کا دورہ کیا ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔ " رنجیت سنگھ کے سیاسی مشیر اور شاہی طبیب فقیر عزیز الدین سے زیادہ اہم اور غیر معمولی کوئی اور شخص نہیں ہے۔ ان کے لئے سب سے زیادہ قابل تعریف بات یہ ہے کہ انہوں نے تیس سال تک اپنی اعلیٰ حیثیت کو قائم رکھا۔ برطانوی حکومت تک ہر پیغام عزیزالدین کے ذریعے پہنچایا جاتا ہے۔ ان کے بغیر کوئی رابطہ استوار نہیں ہوتا اور ہر فریق ان کے مشورہ اور اعانت کا خواہاں ہے " (41)۔

مہاراجہ کو فقیر عزیزالدین پر پورا پورا بھروسہ تھا۔ جب وہ طویل فوجی مہمات پر روانہ ہوا

تو اس نے اپنے دار السلطنت کا انتظام چند اردلیوں کے ہمراہ فقیر عزیز الدین کے سپرد کر دیا ۔ وہ اپنے دور کے انتہائی پرجوش شخص تھے اور عربی و فارسی کے نمایاں عالم فاضل تھے ۔ بحیثیت شاعر کے انہوں نے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے اور ان کے تخلیق کردہ اشعار اپنی سادگی اور شان و شوکت کے لحاظ سے منفرد مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے لاہور میں اپنے خرچ سے ، عربی کی تعلیم کے لئے ایک کالج قائم کیا، اس ادارے نے بہت اچھے عالم پیدا کیے ۔ وہ صوفی مسلک سے تعلق رکھتے تھے جو مسلمانوں کے دین فطرت او تصوفانہ زہد و ریاضت کی نمائندگی کرتا ہے ۔ فقیر عزیز الدین 3 دسمبر 1845ء کو فوت ہوئے (42)۔

فقیر عزیز الدین کے چھ بیٹوں میں سے باقی بچ جانے والے صاحبزادے ، فقیر سید جمال الدین ، برطانوی حکومت کی ملازمت میں بطور تحصیلدار ، شامل ہوئے۔ 1864ء میں انہیں پنجاب گورنمنٹ سیکرٹریٹ کا میر منشی مقرر کیا گیا اور 1870ء میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ 1883ء میں انہوں نے گرتی ہوئی صحت کے باعث نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور 100 روپے ماہانہ پنشن حاصل کرنے کے علاوہ انہیں 1,000 روپے سالانہ اضافی سیاسی وظیفہ بھی ملتا ہے ۔ وہ لاہور کے سب ۔ رجسٹرار ہیں اور انہیں 2,000 روپے سالانہ کا مشاہرہ ملتا ہے۔ 1881ء میں انہیں آنریری ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر مقرر کیا گیا اور انہیں مجسٹریٹ کے مکمل اختیارات حاصل ہیں ۔ وہ عربی اور فارسی کے نہایت عمدہ عالم فاضل ہیں۔ انہیں انگریزی زبان پر بھی عبور حاصل ہے اور وہ پنجاب یونیورسٹی کے رکن ہیں۔ یکم جنوری 1892ء کو انہیں خان بہادر کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔

پنڈت رکھی کیش :۔ سردار پنڈت رادھا کشن کے بیٹے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے درباری پنڈت ، پنڈت مدھو سودھن کے پوتے ، پنڈت رکھی کیش 1888ء میں فوت ہوئے ۔ ان کے بیٹے پنڈت بنسی لال نائب شاہی درباری ہیں ۔

رضا علی خاں :۔ رضا علی خاں ، نواب نوازش علی خاں کے والد نواب علی رضا خاں کے بھتیجے ہیں انہیں 200 روپے ماہانہ پنشن ملتی ہے لیکن وہ اودھ میں اپنی خاندانی جائیداد میں رہتے ہیں۔

پنڈت جوالا پرشاد :۔ پنڈت جوالا پرشاد پنڈت رکھی کیش کے چچازاد بھائی ہیں۔

مسر رام داس :۔ مسر رام داس (پیدائش 1814ء) مسر بیلی رام کے بیٹے اور مسر دیوان چند کے پوتے ہیں۔ انہیں 2,000 روپے سالانہ کی نقد پنشن ملتی ہے ۔ انہیں فارسی شاعری میں مہارت حاصل ہے اور ان کا تخلص کابلی ہے۔

احمد یار خاں :۔ احمد یار خاں (تاریخ پیدائش 1840ء) ذوالفقار خاں کے صاحبزادے اور ملتان کے نواب مظفر خاں کے پوتے ہیں۔ وہ لاہور ڈویژن میں نائب تحصیلدار ہیں اور انہیں 1,440 روپے سالانہ کی خاندانی پنشن ملتی ہے۔

مسر سندر داس :۔ مسر سندر داس (تاریخ پیدائش 1828ء) مسر رام کشن کے بیٹے اور مسر دیوان چند کے پوتے ہیں۔ وہ مسر رام داس کے چچازاد بھائی ہیں۔

فقیر سید قمر الدین :۔ فقیر سید قمر الدین خان بہادر (پیدائش 1827ء) فقیر نور الدین کے تیسرے صاحبزادے ہیں۔ وہ لاہور کے آنریری مجسٹریٹ ہیں۔ وہ عربی اور فارسی کے باکمال عالم ہونے کے علاوہ، انگریزی زبان سے بھی خوب آشنا ہیں۔ ان میں راست بازی پائی جاتی ہے اور میلان میں ملنساری اور شرافت موجود ہے۔ انہیں لاہور کے سبھی طبقوں کے افراد بہت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ انہوں نے اصلاحی کاموں کو متعارف کرانے کے لئے ہمیشہ، اعلیٰ حکام کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ اور عوامی فلاح و بہبود کے کاموں کی ترویج کے لیے ہر موقع پر پوری دلچسپی سے حصہ لیا ہے۔ لیفٹیننٹ گورنر سر رابرٹ ایجرٹن نے ان کی بطور آنریری مجسٹریٹ لاہور خدمات اور دیگر صلاحیتوں کے اعتراف میں 1882ء میں انہیں 500 روپے کی خلعت سے نوازا اور اسی سال انہیں حکومت کی جانب سے ضلع لاہور میں سات سو گھماؤں بنجر زمین کے مالکانہ حقوق تفویض کیے گئے جہاں انہوں نے اپنے دوسرے بیٹے، جلال الدین کے نام پر ایک گاؤں، " جلال آباد " آباد کیا۔

1887ء میں حکومت نے انہیں اس گاؤں میں جاگیر کے حقوق دے دیئے اور ساتھ ان کے بیٹے جلال الدین کی جانشینی کا حق بھی بخش دیا۔ 1887ء میں ملکہ عالیہ کے پچاس سالہ جشن تاجپوشی کے موقع پر، حکومت نے انہیں خان بہادر کا خطاب دیا۔ فقیر قمر الدین پنجاب یونیورسٹی کے رکن، میونسپل کمیٹی لاہور اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے بھی رکن ہیں۔ ان کے بڑے صاحبزادے، سید ظفر الدین، محکمہ ریلوے میں پولیس انسپکٹر ہیں۔

فقیر معراج الدین :۔ فقیر معراج الدین (پیدائش 1842ء) فقیر تاج الدین کے صاحبزادے اور فقیر عزیز الدین کے چھوٹے بھائی فقیر امام الدین کے پوتے ہیں۔ انہیں 500 روپے سالانہ کا خاندانی وظیفہ ملتا ہے اور وہ خود نائب السلطنت درباری ہیں۔

کنور بخشش سنگھ :۔ کنور بخشش سنگھ، مہاراجہ شیر سنگھ کی رانی کے متبنیٰ بیٹے ہیں۔ انہیں 164 روپے ماہانہ پنشن ملتی ہے۔

کنور ٹھاکر سنگھ:۔ کنور ٹھاکر سنگھ، مہاراجہ شیر سنگھ کی بیوی رانی پرتاب کور کے متبنیٰ بیٹے ہیں۔ وہ رانی کے چچازاد بھائی، گجا سنگھ کے بیٹے ہیں، رانی کی وفات کے بعد انہیں 1,800 روپے سالانہ کی پنشن عطا کی گئی جو وہ ابھی تک حاصل کر رہے ہیں۔

کنور نارائن سنگھ:۔ کنور نارائن سنگھ، مہاراجہ شیر سنگھ کی بیوی، رانی پریم کور کے متبنیٰ بیٹے ہیں، انہیں 200 روپے ماہانہ کی پنشن ملتی ہے اور وہ خود 200 روپے ماہانہ پر منصف ہیں۔

کنور بھوپ سنگھ:۔ کنور بھوپ سنگھ، مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ایک بیوہ رانی بھری کے متبنیٰ بیٹے تھے۔ وہ لاولد فوت ہوئے۔

شیخ سندھے خان:۔ شیخ سندھے خان، شیخ غلام محبوب سبحانی کے ماموں اور نواب امام الدین خاں کے عزیز تھے۔ انہوں نے ملتان کی مہم میں نواب کے نائب کے طور پر فرائض انجام دیئے اور حکومت نے ان کی شاندار خدمات کا اعتراف کیا۔ 1873ء میں انہیں لاہور کا آنریری مجسٹریٹ مقرر کیا گیا اور نہایت فرض شناسی اور ایمانداری سے اپنے فرائض پندرہ سال تک انجام دیتے ہوئے وہ 1888ء میں فوت ہوگئے۔ حکومت نے ضلع منٹگمری کی تحصیل پاکپتن میں انہیں 2,000 ایکڑ زمین عنایت کر دی۔ جسے اب کاشت کے قابل بنایا جا رہا ہے۔ انہوں نے اپنے پیچھے، ایک صاحبزادہ، شیخ محمد حسین چھوڑا جو 1866ء میں پیدا ہوا۔

اتم سنگھ:۔ اتم سنگھ، سردار اشر سنگھ سد کے بیٹے ہیں، اس خاندان کو سکھ دور میں عروج حاصل ہوا۔

فتح جنگ خان:۔ فتح جنگ خان، بہادر گڑھ، دادری کے نواب بہادر جنگ خاں کے بیٹے ہیں، وہ غدر کے بعد لاہور آئے، ان کو حکومت کی طرف سے پنشن ملتی ہے۔

کشن سنگھ:۔ کشن سنگھ پاؤنڈر اپنا جانشین ایک بیٹا سوچیت سنگھ چھوڑ کر فوت ہوئے۔

رائے بہادر سیٹھ رام رتن:۔ وہ بیکانیر کے رہنے والے ہیں اور بنسی لال ابیر چند اور بنسی لال رام تن جیسی مشہور و معروف بینکاری کی فرموں کے مالک ہیں۔ موخرالذکر فرم کا صدر دفتر میاں میر میں ہے اور اس کے پاس لاہور، گوجرانوالہ، امرتسر اور گورداسپور کے سرکاری خزانوں کا انتظام ہے اس خاندان کے پاس ضلع لاہور میں اور مرکزی صوبہ جات میں وسیع و عریض جائیداد زمین کی صورت میں اور مکانات کی شکل میں ہے۔ سیٹھ رام رتن نے کشمیر کے سابقہ قحط کو کم کرنے کے لئے اور 1880ء کی کابل مہم کے لئے، غلہ اور دیگر اشیاء کی فراہمی کی شکل میں بھرپور امداد کی۔ وہ نہایت ہر دلعزیز اور آزاد خیال شخص ہیں۔ انہوں نے میاں میر میں لوگوں کے لئے ایک وسیع و

عریض تالاب تعمیر کرایا ہے۔

رائے بہادر میلہ رام :۔ رائے بہادر میلہ رام، محکمہ ریلوے کے مشہور زمانہ ٹھیکیدار تھے ان کے پاس بہت سے نجی ذرائع تھے وہ 1890ء میں فوت ہوئے۔

حسین بخش :۔ حسین بخش پہلے پہل ضلع لاہور میں رہائش پذیر تھے لیکن اب ضلع سیالکوٹ میں کاروبار کرتے ہیں۔

کرنل سکندر خاں :۔ کرنل سکندر خان سکھ پیدل فوج کے جنرل، جنرل الٰہی بخش کے فرزند ہیں جنہوں نے پنجاب کے الحاق کے دوران قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔

پنڈت پریم ناتھ :۔ پنڈت پریم ناتھ: دیوان شنکر ناتھ کے متبنیٰ بیٹے تھے، کچھ عرصہ قبل فوت ہوئے ہیں۔

ہر کشن داس :۔ ہر کشن داس، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں خاندانی پیشوا تھے۔

منشی ہر سکھ رائے :۔ منشی ہر سکھ رائے کائتھ تھے اور شمال مغربی صوبہ جات کے علاقہ سکندر آباد کے رہنے والے تھے۔ وہ انتہائی ہر دلعزیز اور عوامی شخص تھے۔ انہوں نے الحاق کے وقت پنجاب میں ایک مقامی زبان کا اخبار "کوہ نور" نکالا۔ وہ کافی عرصہ تک میونسپل کمیٹی لاہور کے رکن رہے ان کا انتقال 1890ء میں ہوا۔

منشی سید محمد عظیم :۔ منشی محمد عظیم بن حافظ محمد صالح بن محمد عظیم بن محمد ماہ بن محمد اکرم بن عبدالرحیم بن مولانا محمد عرب دہلی کے رہنے والے تھے۔ خاندان کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جب بادشاہ شاہجہان نے مولانا محمد عرب کی انتہائی مذہبی بزرگی اور تقدس و خدا رسیدگی کے بارے میں سنا تو انہیں مکہ عرب میں ان کی رہائش گاہ سے بلوا بھیجا اور ریاست میں انہیں اعلیٰ مذہبی منصب عطا کیا ان کی اولاد کے سبھی افراد کو پیرزادہ کہا جاتا تھا۔ محمد عظیم ابتدائی دور میں پرانے دہلی کالج میں، کالج کے مقبول پرنسپل مسٹر جے۔ ایچ ٹیلر کے تحت اس وقت داخل ہوئے جب لوگوں کے ذہنوں میں انگریزی تعلیم کے بارے میں شدید نفرت پائی جاتی تھی۔ انہوں نے 1830ء میں "اہلیت اور اچھے برتاؤ" کے سلسلہ میں وظیفہ لیا اور 20 سال کی عمر میں دہلی گزٹ پریس میں بطور کمپوزیٹر، شمولیت اختیار کر لی۔ انہیں جلد ہی فورمین مقرر کر دیا گیا اور وہ ایک ماہر طابع بن گئے۔ دہلی میں ایک کمپنی قائم کرنے اور طباعت کا سامان خریدنے کے بعد وہ 1849ء میں ایک بہت بڑے ادارتی عملہ کے ہمراہ لاہور آگئے اور "لاہور کرونیکل" کے نام سے مشہور پہلا انگریزی اخبار نکالا۔ 1856ء میں انہوں نے لاہور سے انگریزی زبان میں "پنجابی" کے نام سے سہ ہفتہ اخبار شروع

کیا، جو برطانوی عوام کے لئے مشکل دور میں، محاذ جنگ سے موصول ہونے والے ٹیلیگرام (تاریں) ہر روز شائع کر کے، ان کے لئے گراں قدر خدمات سرانجام دیتا تھا۔ سال باسال تک مفید خدمات سر انجام دینے کے بعد، انگریزی اخبار "پنجابی" ختم ہو گیا لیکن مقامی زبان کا اخبار "پنجابی" 1890ء تک قائم رہا لیکن اس کے بعد بند ہو گیا۔ بطور ایک صحافی کے منشی محمد عظیم کا پیشہ طویل اور کامیاب تھا۔ سرجان (بعد میں لارڈ) لارنس، سر رچرڈ ٹمپل اور اس دور کے دیگر اعماء ان کا بہت احترام کرتے تھے (43)۔ انہوں نے سر رابرٹ منٹگمری کے مشورہ پر "پنجابی" شروع کیا جو ان کی بہبودی میں خصوصی دلچسپی لیتے تھے۔ ان کو پنجاب میں صحافت کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ بطور ایک شہری کے وہ بہت زیادہ مقبول تھے اور شہر کی فلاح و بہبود کے لئے خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ تمام اصلاحی اقدامات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ 1864ء میں سر رابرٹ منٹگمری نے تعلیم نسواں کے لئے ان کی خدمات کے صلے میں، انہیں خلعت سے نوازا۔ اس غیر معمولی شخص کی ساری زندگی اپنے ملک اور حکومت کی خدمت میں گزری۔ وہ جنوری 1885ء میں 70 سال کی عمر میں رحلت فرما گئے (44)۔ اپنے پیچھے تین لڑکے مصنفؔ سید محمد شمس الدین (سیکشن ہیڈ ٹرانسلیٹر، چیف کورٹ پنجاب) اور سید محمد سراج الدین چھوڑے۔

شیو رام داس :۔ شیو رام داس سکھ حکومت کے ریکارڈ کیپر مسدی مل کے بیٹے ہیں۔ ان کے چچا زاد بھائی رائے گوپال داس رائے بہادر ریٹائرڈ سب۔ جج اور آنریری اسسٹنٹ کمشنر ہیں۔

شیخ رحیم بخش :۔ شیخ رحیم بخش، لاہور کے ایک متمول تاجر ہیں۔ وہ الحاق کے وقت شمال مغربی صوبہ جات سے آکر لاہور میں آباد ہو گئے۔ وہ اپنا جانشین ایک فرزند محمد رفیع چھوڑ کر فوت ہوئے۔ ان کے پاس اپنے والد کا وسیع و عریض گھر اور دوسری جائیداد ہے۔ وہ انار کلی میں محمد رفیع اینڈ برادرز کے نام سے مشہور ایک فرم کے مالک ہیں۔

رائے بہاری لعل :۔ رائے بہاری لعل ایک ریٹائرڈ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہیں۔ وہ اپنے پیچھے جو لڑکے چھوڑ کر فوت ہوئے، ان میں سے کوئی بھی لاہور میں نہیں رہتا۔

دیوان داس مل :۔ دیوان داس مل رائے بہادر کا تعلق پشاوریہ کھتریوں کے خاندان سے تھا۔ وہ سکھ حکومت کے تحت ایک باوقار عہدے پر فائز تھے۔ ملک کے الحاق کے موقع پر مسٹر بیچر جنہیں پنشن کے دعویٰ جات کے متعلق چھان بین کرنے کے۔ لئے خصوصی فرض سونپ گیا تھا، انہوں نے ان کو سرکاری ملازمت میں سررشتہ دار کی حیثیت سے لے لیا۔ اس کے بعد انہیں چیف کمشنر کا میر منشی اور بعد میں تحصیلدار مقرر کیا گیا وہ 1874ء تک اس عہدے پر فائز رہے اور پنشن پر

ریٹائر ہوئے ۔ وہ 1892ء میں آنریری مجسٹریٹ لاہور کی ملازمت کے دوران فوت ہوئے۔ ان کی اولاد نہیں تھی۔

سردار بولا کا سنگھ :۔ وہ تحصیل چونیاں میں قلعہ دھرم سنگھ کے آنریری مجسٹریٹ ہیں ۔ وہ مویشیوں اور گھوڑوں کی نسل کشی میں بہت زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔

میاں کریم بخش :۔ وہ پبلک ورکس کے ٹھیکیدار اور میونسپل کمیٹی لاہور کے رکن ہیں۔ وہ پراعتماد شخصیت کے حامل ہیں اور نہایت ہردلعزیز اور عوامی انسان ہیں ۔ انہوں نے شہر میں پانی کی ٹینکی کے قریب ایک شاندار مسجد تعمیر کروائی جو انہیں کے نام سے مشہور ہے۔

درگا پرشاد :۔ درگا پرشاد انار کلی میں چھوٹا لعل فرم کے مالک تھے۔ وہ فوت ہو چکے ہیں اور فرم کا انتظام اب ان کے بھتیجے چلاتے ہیں۔

شیخ نانک بخش :۔ شیخ نانک بخش چیف کورٹ کے وکیل اور شہر میں بہت بڑی جائیداد کے مالک ہیں ۔ وہ اپنی قسمت خود بنانے والے اور نہایت باصلاحیت اور ہردلعزیز ہیں ۔ میونسپل کمیٹی کے نائب صدر بھی رہ چکے ہیں۔ جنوری 1891ء میں انہیں خان بہادر کا خطاب دیا گیا۔

میاں جلال الدین :۔ (45)، میاں جلال الدین باغبانپورہ کے ضلعدار اور مشہور و معروف شالامار باغ کے محافظ ہیں۔ اس عہدے پر ان کے آباؤ اجداد مغل بادشاہوں کے دور سے چلے آرہے ہیں۔ یہاں پر راس سرکردہ خاندان کی تاریخ کے بارے میں مختصر سا بیان دلچسپی کا حامل ہوگا۔ اس خاندان کے جد امجد ، محمد اسحاق تھے ، جو شالامار باغ کے مقام پر موضع اسحاق پور کے بانی تھے۔ محمد اسحاق کی چوتھی پشت میں محمد یوسف المعروف میاں منگو نے اپنے آباؤ اجداد کے گاؤں کی جگہ شاہجہاں کو دے دی ، کیونکہ اس کے شاہی انجنیئروں کی خواہش تھی اور انہوں نے بھی یہی مشورہ دیا کہ اس آباد گاؤں کی جگہ پر ، باغ لگایا جائے ۔ بادشاہ نے اس گاؤں کے عوض ، محمد یوسف کو موجودہ باغبانپورہ کی جگہ عنایت کر دی جو خاندان کا صدر مقام ہے۔

محمد یوسف کے بیٹے محمد فاضل نے دکن میں خدمات سرانجام دینے کے عوض ، اورنگ زیب بادشاہ سے نواب کا خطاب حاصل کیا۔ ان کے بیٹے محمد لطف اللہ کے دو صاجزادے عظیم اللہ اور حفیظ اللہ تھے ۔ دونوں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں سرکردہ زمیندار تھے اور وہ گل بانی کے معاملات میں ان کے مشوروں کی قدر کرتا تھا۔

میاں عظیم اللہ کے بڑے صاجزادے رحیم اللہ انتہائی قابل اور ذہین و فطین شخص تھے ۔ اسی وجہ سے مہاراجہ رنجیت سنگھ انہیں پنجاب کا نواب دانا بیگ خاں کہا کرتا تھا۔

میاں رحیم اللہ کے چھوٹے لڑکے میاں رحیم بخش کے دو بیٹے مولوی قادر بخش اور میاں کریم بخش تھے۔ قادر بخش نہایت عالم فاضل شخص تھے۔ انہیں شاعری میں بھی طبع آزمائی کرنے کا شوق تھا۔ نادر تخلص کرتے تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی خواہش کے مطابق انہوں نے سکھ حکومت کے ملازم فرانسیسی افسر جنرل کورٹ لینڈ سے یورپی توپ خانے اور بندوق سازی کا فن سیکھا۔ انہوں نے فارسی زبان میں توپ خانے کی سائنس پر ایک کتاب لکھی جسے "مفتح القلعہ" کہا جاتا تھا۔ اور طب جس میں انہیں بڑی دسترس تھی، اس کے علم پر بھی کتاب تحریر کی۔ ان کے چھوٹے بھائی میاں کریم بخش بقید حیات ہیں اور ایک بہترین طبیب کی شہرت کے حامل ہیں۔

قادر بخش کے صاحبزادے نظام الدین کے تین بیٹے تھے۔ مولوی ظہور الدین، میاں شاہ دین اور محمد تارج الدین۔ مولوی ظہور الدین درجہ اول کے وکیل ہیں اور ڈیرہ اسماعیل خاں اور دیگر ڈیرہ جات میں ان کی پریکٹس خوب چلتی ہے۔ میاں شاہ دین نے لندن میں (مڈل ٹمپل) بار میں داخلہ لیا۔ انہیں ادبی ذوق قدرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے اور انگریزی زبان پر انہیں زبردست عبور حاصل ہے۔ ایک عوامی مقرر کی حیثیت سے ان کی تقاریر کو ہر جگہ سراہا جاتا ہے اور بطور مصنف قابل ذکر میلان کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ ابھی بالکل نوجوان ہیں لیکن ان کے طور اطوار روشن اور باوقار ہیں۔ ان کا رویہ بہت نرم اور دلکش ہے اور اسی وجہ سے ان کے ہم وطن ان کا بہت احترام کرتے ہیں۔

محمد لطف اللہ کے چھوٹے صاحبزادے میاں حفیظ محمد کے چھ بیٹے تھے جن میں بڑے لڑکے، محمد بخش علاقہ دار اور زمیندار تھے۔ ان کے دو بیٹے میاں چنن دین اور میاں بدرالدین بہت بڑے زمیندار ہیں۔

میاں چنن دین کے دو بیٹے میاں نظام الدین ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر اور میاں دین محمد جن کی تقرری انسپکٹر جنرل آف رجسٹریشن پنجاب کے دفتر میں ہوئی ہے۔ میاں نظام الدین کو یارکند مہم میں خدمات سرانجام دینے کے عوض سرٹی۔ ڈی فورسیتھ کی جانب سے خلعت فاخرہ تفویض کی گئی۔ میاں دین محمد کے صاحبزادے، میاں محمد شفیع اس وقت انگلستان میں قانون کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

میاں بدرالدین کے تین بیٹے ہیں۔ میاں غلام محی الدین عزت مآب لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کے کیمپ کلرک میاں علم الدین، ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر اور میاں سراج الدین پنجاب میں تحصیلدار ہیں۔

میاں حفیظ محمد کے چھوٹے بیٹے میاں نبی بخش کے پاس شالامار باغ کا انتظام و انصرام ہے۔

غدر کے دوران، بہترین خدمات کے صلے میں حکومت نے انہیں بڑی فیاضی سے نوازا۔ انہوں نے پسماندگان میں ایک بیٹا چھوڑا جن کا نام میاں جلال الدین ہے اور وہ اس وقت خاندان کے سربراہ ہیں۔

لاہور کے دیگر قابل ذکر خاندان

لاہور کے مندرجہ ذیل مشہور خاندان بھی ذکر کیے جانے کے مستحق ہیں۔

محمد برکت علی خان، خان بہادر:۔ محمد برکت علی خاں، خان بہادر کے آباؤ اجداد، خلیل پٹھان تھے۔ ان کا شجرہ نسب، حسب ذیل ہے:۔

صاحب خاں

عبدالنبی خاں

محمد وارث خان

بہادر خان

محمد عارف خاں

محمد برکت علی خان

پیدائش 21 نومبر 1821ء

محمد بشیر علی خاں

پیدائش 1857ء

سعادت علی خاں

خاندان کے جد امجد، صاحب خان، افغانستان سے ہجرت کر کے شمال مغربی صوبہ جات میں شاہجہاں پور میں آباد ہوگئے اور شاہجہاں کے پاس ایک فوجی افسر کے طور پر ملازم ہوگئے۔ وہ دہلی دربار میں اودھ کے نواب ناظم کے وکیل مطلق کے طور پر خدمات سرانجام دیتے تھے۔ برکت علی خاں کے والد محمد عارف خاں پہلے پہل اودھ کے بادشاہ کے پاس نہایت باوقار عہدے پر مقرر تھے لیکن بعد ازاں مرہٹہ سردار جسونت راؤ ہولکر کے پاس ملازمت اختیار کرلی۔ اس نے انہیں 500 گھڑ سوار دستے کی کمان سونپ دی۔ بھرت پور پر قبضہ ہو جانے کے بعد، کرنل گارڈنر نے انہیں برطانوی گھڑ سوار دستے کا رسالدار مقرر کیا۔ جب المورہ کے خلاف ایک مہم روانہ کی گئی تو انہوں نے گھڑ سوار سپاہی بھرتی کر کے اس کی اعانت کی۔ وہ 1815ء میں ریٹائرڈ ہوئے اور ان کی

خدمات کے اعتراف میں برطانوی حکومت نے انہیں ایک قطعہ زمین سے نوازا۔

برکت علی خاں نے پنجاب میں اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز، پولیس افسر کے طور پر کیا اور انہیں 1847ء میں ضلع ہوشیار پور موکیریاں کا تھانیدار مقرر کیا گیا۔ اس حیثیت میں انہوں نے نہایت جوش و خروش اور حوصلے کا ثبوت دیا اور اپنے اعلیٰ حکام کی پسندیدگی سے مستفیذ ہوئے۔ جب شاہ پور کے قلعہ پر میجر فشر نے حملہ کیا تو وہ برطانوی دستوں کے ہمراہ تھے جن افسروں کی ماتحتی میں وہ فرائض سر انجام دے رہے تھے انہوں نے گولہ باری کے دوران، ان کی بلند حوصلگی اور تحمل مزاجی کا اعتراف کیا۔

1848ء میں جبکہ وہ حاجی پور کے تھانیدار تھے۔ امب کے راجہ جسونت پر حملہ کے دوران وہ فوجی دستوں کے ہمراہ تھے اور اس کی نگرانی کر رہے تھے، جب نہایت دلیری سے ہلہ بولا گیا تو وہ زخمی ہوگئے۔ مسٹر (بعد میں لارڈ) جان لارنس، جو دریائے ستلج کے پار کی ریاستوں کے کمشنر اور نگران تھے، وہ، ان کی عالی حوصلگی اور جوش خروش کے چشم دید گواہ تھے، انہوں نے ان کی بہادری کے صلہ میں 500 روپے کا انعام دیا۔

الحاق کے بعد، برکت علی خاں کو پنجاب ملٹری پولیس فورس کے رسالدار کے طور پر ترقی دے دی گئی اور مسٹر ساؤنڈرز کے تحت، ڈاکوؤں اور دیگر بدنام زمانہ مجرموں کو پکڑنے اور ان کا تعاقب کرنے کے سلسلہ میں خدمات انجام دیں، ان خدمات کے عوض کئی موقعوں پر انہیں بہت زیادہ انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ 1857ء میں انہوں نے امرتسر کے ڈپٹی کمشنر مسٹر فریڈرک کوپر کی ماتحتی میں 26 ویں ایل۔ آئی کے غداروں کو پکڑنے کے لئے فرائض سر انجام دیئے اور ساحل سمندر تک ان کے دستے کا ایک کشتی میں تعاقب کیا۔

امرتسر میں رسالے کی فوج کے رسالدار کے طور پر نو سال تک خدمات سر انجام دینے کے بعد جنوری 1860ء میں برکت علی خاں کو ضلع لاہور میں، چونیاں کا تحصیلدار مقرر کیا گیا۔ اپنے نئے فرائض میں انہوں نے اپنی سابقہ شہرت میں اضافہ کیا اور اپنے اعلیٰ حکام جن کے تحت وہ خدمات انجام دے رہے تھے، ان کے منظور نظر ہوگئے۔ لاہور کے ڈپٹی کمشنر۔ مسٹر (بعد میں سر رابرٹ) ایجرٹن 1861ء میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جن لوگوں پر انہیں مقرر کیا گیا ہے، ان کے انتظام و بندوبست کے لئے ان میں بہترین صلاحیت پائی جاتی ہے۔ 1868ء میں ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل لارڈ لارنس نے حکومت کے لئے ان کی بہترین خدمات اور خاص طور پر 1848ء میں انکی پیش کردہ فقید المثال خدمات اور اسبے سینیا کی جنگ کے دوران خچروں اور خچر

بانوں کی روانگی کے انتظامات میں بہترین صلاحیت کا مظاہرہ کرنے کے اعتراف میں انہیں خان بہادر کے خطاب سے سرفراز کیا۔

1872ء میں بخارہ کے بادشاہ کے سفارتی نمائندے کے ساتھ ان کو خصوصی کام تفویض کر کے بھیجا گیا اور اگلے سال ان کو یارکند کے سفارتی نمائندہ کے عملہ وابستہ کر دیا گیا۔

ان کے ذمہ مکمل طور پر یہ کام لگایا کہ وہ مقامی شہزادوں اور لاہور آنے والے غیر ملکی سفارتکاروں کے آرام اور سہولت کا خیال رکھیں۔ وہ اس بات کے بھی ذمہ دار تھے کہ لاہور میں آباد افغانستان کے پنشن داروں اور سیاسی پناہ گزینوں کی دیکھ بھال کریں۔ 1873ء میں لاہور میں مذہبی اختلافات اور جھگڑوں کا تصفیہ کرانے کے سلسلہ میں انہیں حکومت کی طرف سے شاباش ملی نیز 1881ء میں لاہور میں اسلامی عقائد کو بدنام کرنے لئے پمفلٹوں (کتابچوں) کی اشاعت اور تقسیم کے باعث، اٹھنے والی احتجاجی تحاریک زور پکڑ گئیں تو محمد برکت علی خان نے اپنے ہم مذہبوں کو مطمئن کرنے کے لئے نمایاں کردار ادا کیا اور یہ ان کے اثر و رسوخ اور عمل کا نتیجہ تھا کہ دوبارہ یگانگت کی فضا پیدا ہو گئی۔

لاہور کے ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہونے کی حیثیت میں انہیں بے شمار سرکاری اور انتظامی فرائض تفویض کیے گئے۔ اپنے بہترین طور طریقوں اور صلاحیتوں کو احسن طریقے سے بروئے کار لانے کے باعث انہیں حکومت اور اعلیٰ حکام کی طرف سے کئی موقعوں پر داد و تحسین ملتی رہتی تھی۔ وہ جنوری 1882ء میں سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔

محمد برکت علی خان نے عوامی فلاح و بہبود، تعلیمی، سماجی یا صفائی کے لیے کیے جانے والے ہر کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور لاہور کے عوام ان کی ہوشمندی اور فراخدلانہ اطوار کے شکرگزار ہیں جن میں وہ اپنا اثر و رسوخ بروئے کار لائے۔ چند آدمیوں نے عوامی معاملات میں زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ کیا ہے۔ اپنے ہم وطنوں کی حالت کو بہتر بنانے میں صرف ہونے والی ان کی توانائی اور قابلیت لوگوں کی طرف سے گرمجوشی کے ساتھ تسلیم کیے جانے کی مستحق ہے۔ وہ انجمن اسلامیہ لاہور کے سیکرٹری اور پنجاب یونیورسٹی کے رکن ہیں۔ ان کے صاحبزادے محمد بشیر علی خاں سبی کے تحصیلدار ہیں۔

ڈاکٹر رحیم خاں، خان بہادر :۔ اس خاندان کے بانی مولانا عظیم اللہ خاں، قندھار کے رہنے والے تھے۔ تقریباً 1560ء میں اکبر کے دور حکومت میں ان کے بیٹے شمس اللہ خاں نے اپنے آبائی وطن کو خیر باد کہا اور ہندوستان ہجرت کر گئے اور لکھنو میں آباد ہو گئے۔ وہ عربی زبان کے ایک

زبردست عالم تھے، اور لکھنو میں آباد ہونے کے بعد انہوں نے اس زبان کی تعلیم کے لئے ایک کالج قائم کیا - یہ کالج پورے علاقے میں مشہور ہو گیا اور بعد کے ادوار میں دور دراز کے علاقوں سے آنے والے طالب علموں کی توجہ کا مرکز بنا - تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہیں ڈپلوے اور دستار فاخرہ سے نوازا جاتا تھا- صوبے کے گورنر نے اس کی دیکھ بھال کے لئے ایک جاگیر الاٹ کر دی تھی جو 1765ء تک جاری رہی- اس کے بعد اسے ریاست کی بگڑی ہوئی حالت اور مغل حکومت کی کمزوری کے باعث ضبط کر لیا گیا- کالج جو اب تک انتہائی اچھی حالت میں اور آ تھا، ختم ہو گیا اور اس کے پروفیسروں کو اذیتیں دے کر یہ جگہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا- چنانچہ انہوں نے لکھنؤ کو خیر باد کہا اور کانپور میں آباد ہو گئے - وہاں ڈاکٹر رحیم خاں کے دادا محمد دلاور خاں خاموشی سے نہیں بیٹھ سکتے تھے - یہاں پر انہوں نے ایک عربی مدرسہ کھولا اور عربی قانون اور زبان پر لیکچر دیئے -

دلاور خاں کے ایک صاحبزادے محمد یوسف خاں تھے جو ڈاکٹر رحیم خاں کے والد گرامی تھے -

وہ نہایت دور اندیش اور با صلاحیت انسان تھے - اپنی قوم کی نفرت کے باوجود انہوں نے (1829ء میں کانپور میں پیدا ہونے والے) اپنے بیٹے کو انگریزی تعلیم دینے کا ارادہ کر لیا- تاہم اپنے ہم مذہبوں کے لعن طعن کے ڈر سے انہوں نے رحیم خاں کو ہمراہ لیا جو ابھی محض لڑکے تھے اور بنگال میں ڈھاکہ چلے گئے اور انہیں ایک کالج میں داخل کروا دیا- جبکہ نوجوان رحیم خاں ابھی اپنی انگریزی تعلیم حاصل کر رہے تھے تو 1849ء میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا - اس کے بعد ان کی والدہ نے ان کو اپنی مستقل نگرانی میں لے لیا- وہ ایک بلند حوصلہ اور باہمت خاتون تھیں، انہوں نے اس قدر نامساعد حالات میں یہ تہیہ کر لیا کہ ان کا بیٹا نہ صرف اپنی تعلیم مکمل کرے گا بلکہ ایک باوقار پیشہ اختیار کرے گا - ڈھاکہ سے روانہ ہونے کے بعد وہ انہیں کلکتہ لے آئیں جہاں رحیم خاں ایک میڈیکل کالج میں داخل ہو گئے اور پانچ سال تک میڈیکل کی تعلیم حاصل کی- 1858ء میں انہوں نے گریجویشن کی-

اپریل 1860ء میں انہیں پنجاب، شاہ پور میں سول سرجن مقرر کیا گیا- تقریباً اسی دور میں (اکتوبر 1860ء) لاہور میں ایک میڈیکل کالج قائم کیا گیا- رحیم خاں نے بحیثیت نگران ہندوستانی کلاس اس میں شمولیت اختیار کر لی اور اب تک وہ اسی عہدے پر فائز ہیں -

ڈاکٹر رحیم خان نے اپنے ہم وطنوں کے لئے ایک عظیم مثال قائم کی ہے کہ کس طرح ایک انسان ایمانداری، دانشمندی، ہمت اور حوصلے کے ذریعے اپنی زندگی میں اعلیٰ مقام حاصل کر سکتا ہے

سر ڈونالڈ میکلوڈ 1870ء میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں: -

" میں اب تک جن مقامی افسران اور مقامی شرفاء سے مل چکا ہوں (سب اسسٹنٹ سرجن، رحیم خاں) ان سب میں سے منفرد اور بہترین انسان ہیں۔ اپنی طبی مہارت اور مریضوں پر خصوصی توجہ دینے کی وجہ سے انہیں لاہور کے عوام کی بہت زیادہ حمایت اور ہمدردی حاصل ہے۔ انہوں نے یورپین میڈیکل اور سائنس کی مہارت میں اعتماد اور برتری قائم کی ہے۔ مزید برآں انہوں نے یورپ کے طبی نظام پر لکھی گئی بے شمار مفید تصانیف کو اردو زبان میں شائع کر کے پنجاب میں مقامی زبان و ادب کے لئے گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ "

ڈاکٹر رحیم خاں کا شمار انجمن پنجاب کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی بھی اسی کی ایک شاخ ہے۔ ان کا شمار یونیورسٹیوں کے اولین ارکان میں ہوتا ہے۔ حکیموں اور ویدوں کے لئے ان کے لکھے گئے اور زبانی لیکچروں میں طب کی مغربی سائنس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور پنجاب یونیورسٹی میں وہ سولہ سال تک میڈیکل فیلو کے عہدے پر فائز رہے۔ وہ انڈین انسٹی ٹیوٹ کے رکن ہیں۔ اس کے علاوہ پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی اور ایجوکیشنل کانگریس کے بھی رکن ہیں۔ میڈیکل سائنس کے لئے کی گئی کوششوں اور حکومت کے لئے پیش کردہ خدمات کے صلے میں فروری 1872ء میں انہیں خان بہادر کے خطاب سے نوازا گیا۔ یکم جنوری 1877ء کو دہلی کے شاہی اجلاس میں انہیں "آنریری سرجن" کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ لارڈ لارنس نے 1864ء میں منعقدہ شاہی دربار میں انہیں خلعت عطا کی اور اگلے سال سر رابرٹ منٹگمری نے لاہور کے عوام میں انگریزی طب کے طریقہ علاج کو متعارف کرانے کے لئے کی گئی خدمات کے اعتراف میں بھی انہیں خلعت سے نوازا۔

ڈاکٹر رحیم خاں نے طبی مضامین کے بارے میں مندرجہ ذیل کتب تحریر کی ہیں اور یہ ہندوستان کے تمام میڈیکل سکولوں میں نصابی کتب کے طور پر استعمال ہو رہی ہیں:۔

1 ۔ طب رحیمی یا طب کے اصول اور مشق ۔یہ بیماریوں، ان کی علامات اور علاج کے بارے میں ہے۔

2 ۔ کرابادینی رحیمی، یا علم الادویہ ۔یہ غیر ملکی اور دیسی دونوں طرح کی ادویات کے بارے میں ہے۔

3 ۔ خواتین کی بیماریوں، زچگی اور ایام ولادت کے موضوع پر۔

4 ۔ بچوں کی بیماریوں پر

5 ۔ طب شرعی پر

6 - دایہ گیری کے علاوہ ہیضے، چیچک وغیرہ کے بارے میں بے شمار کتابچے اور چارٹ بنائے ہیں۔

ڈاکٹر رحیم بخش کی زندگی ہمارے ملک کے ان تمام ہم وطنوں کے لئے مثال ہے جو اپنی حکومت کے علاوہ اپنے ہم وطنوں سے مخلص ہیں اور ان کی بہترین خدمت کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ وہ انتہائی قابل اور عالم فاضل شخص ہیں۔ ان کے ادبی کمالات بہت زیادہ ہیں۔ ان کی پوری زندگی اپنے ملک اور حکومت کی خدمت کے لئے وقف ہے۔ مزاج کے نرم اور با اخلاق، خوش گفتار اور اپنے فرض سے مخلص ہیں۔ جو بھی ان سے واقف ہے وہ بجا طور پر ان کا احترام کرتا ہے۔

اگر ہم اس غیر معمولی انسان کی زندگی کی عظیم نیکیوں کے بارے میں یہاں لکھنا بھول جائیں تو ان کی مکمل زندگی ہمارے سامنے نہیں آسکے گی، اور ان سب میں نمایاں ہے ان کی اپنی والدہ کے لئے عزت و احترام، راجہ رام موہن رائے نے کہا ہے "اپنی والدہ کے لئے احترام، ان کا بچپن کا عقیدہ، لڑکپن کا مذہب اور عظیم و مقدس عقیدہ ہے جو انہوں نے مکمل مرد بن کر اور اپنی ضعیف العمری میں پایا۔" ڈاکٹر رحیم خاں نے ایک عظیم بنگالی رہنما کی حیثیت سے اپنی والدہ کے لئے ایک فرض شناس بیٹے کی طرح اپنا فرض احسن طریقے سے پورا کیا۔ وہ اپنی والدہ کا بہت زیادہ اور سب سے بڑھ کر احترام کرتے تھے۔ انہی کی وجہ سے انہوں نے اپنی تعلیم حاصل کی اور انہوں نے انتہائی کسمپرسی کی حالت میں اور مشکل وقت میں ان کی دیکھ بھال کی۔

ڈاکٹر رحیم خاں کے پانچ بیٹے ہیں جن میں سب سے بڑے صدر الدین خاں (پیدائش 1862ء) نے یورپ سے ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے اور وہ بیرسٹرایٹ لاء ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسین خاں:- ایک یوسف زئی پٹھان یعقوب خاں کے بیٹے ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد ہزارہ کی سرحد پر واقع سوات کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے نامعلوم وجوہات کے باعث اپنا آبائی وطن چھوڑا اور مغل بادشاہوں کے دور میں دہلی آگئے اور کچھ عرصہ بعد بنگال ہجرت کر گئے اور پٹنہ جو عام طور پر عظیم آباد کے نام سے مشہور تھا، اس میں آباد ہوگئے۔ دریائے گنگا کے قریب واقع ایک چھوٹے سے قصبہ "حاجی پور" میں یعقوب خاں نے وہاں کے ایک زمیندار کی بیٹی سے شادی کرلی اور وہیں پر 1830ء میں محمد حسین خاں پیدا ہوئے۔ عظیم آباد میں پرورش پانے کے بعد وہ کلکتہ چلے گئے اور وہاں میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا۔ انہوں نے اپریل 1849ء میں ایک مقامی ڈاکٹر کی حیثیت سے ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت کرلی۔ اس کے بعد ان کی تقرری لاہور کر دی گئی۔ اسی سال نومبر میں ان کی خدمات کو ضلع شاہ پور منتقل کر دیا گیا اور وہاں دس سال تک اس سے وابستہ

رہے ۔ دسمبر 1860ء میں لاہور میں میڈکل کالج کے قیام کے بعد ڈاکٹر محمد حسین خاں کو اس کے عملہ کے لئے منتخب کر لیا گیا اور ان کی تقرری انگریزی کلاس کے لئے علم التشریح بدن کا جراح اور ہندوستانی کلاس کے لئے علم التشریح بدن (اناٹومی) کے لیکچرار کے طور پر ہوئی ۔ اگست 1860ء میں انہوں نے اسسٹنٹ سرجن کا مقررہ امتحان پاس کیا اور مئی 1868ء سے اپریل 1870ء تک انہوں نے میڈیکل کالج میں اناٹومی کے پروفیسر کی حیثیت سے فرائض سرانجام دیئے۔

36 سال کے طویل عرصہ تک حکومت کی خدمت کرنے کے بعد، جس کے دوران اپنے فرائض کو خوش اسلوبی سے نبھانے کے عوض انہیں کئی موقعوں پر داد و تحسین پیش کی گئی وہ یکم جنوری 1885ء میں ریٹائر ہوگئے ۔ ان کی قابل تعریف خدمات کے اعتراف میں حکومت نے 1885ء میں انہیں خان بہادر کا خطاب عطا کیا اور 1889ء میں انہیں لاہور کا آنریری مجسٹریٹ مقرر کیا گیا ۔ ان کی اشاعت شدہ کتابوں میں، اردو زبان میں تحریر کردہ کتاب "تشریح انسانی" بھی ہے جس میں علم التشریح بدن کو تصاویر کی مدد سے سمجھایا گیا ہے ۔ وہ پنجاب یونیورسٹی کے فیلو اور پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے رکن ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسین کے چھ بیٹے ہیں۔ بڑے صاحبزادے آمد حسین خان 1867ء میں پیدا ہوئے۔

بطور ایک طبیب کے ڈاکٹر محمد حسین خاں کی کامیابی بہت عظیم ہے ۔ ان کی پریکٹس بہت وسیع ہے۔ انہیں لوگوں کا بھرپور اعتماد حاصل ہے اور یقیناً وہ اس کے مستحق بھی ہیں۔ سچے اور مخلص، ملنسار اور منکسر المزاج، مصیبت زدہ پر مہربان، غریبوں کے ہمدرد، ڈاکٹر محمد حسین خان صحیح معنوں میں ایک شریف انسان کی مکمل مثال ہیں۔ لوگوں کے درمیان ثالث اور ایک آنریری مجسٹریٹ کی حیثیت سے ان کا کردار نمایاں ہے۔ ان کے لیے سب سے زیادہ قابل تعریف بات یہ ہے کہ بہت زیادہ مصروف ہونے کے باوجود انہوں نے کچھ وقت مخصوص کر دیا تھا۔ یعنی ہر صبح 6 سے 8 بجے تک وہ غریب اور نادار مریضوں کو مفت طبی مشورے دیتے اور ان کا علاج کرتے تھے۔

ڈاکٹر برج لعل گھوش، رائے بہادر:۔ ڈاکٹر برج لعل گھوش، رائے بہادر بہت کامیاب ڈاکٹر ہیں اور ان کی پریکٹس بھی خوب چلتی ہے۔ وہ انتہائی باکمال شخص ہیں، نہایت ہردلعزیز ہیں اور ملک کی تعلیم و ترقی کے سلسلہ میں انتہائی سرگرم ہیں۔

مرزا عظیم بیگ:۔ مرزا عظیم بیگ ایک ریٹائرڈ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر اور آنریری اسسٹنٹ کمشنر ہیں

رائے بہادر گوپال داس:۔ رائے بہادر گوپال داس، ریٹائرڈ جوڈیشل اسسٹنٹ اور آنریری

اسسٹنٹ کمشنر ہیں۔

مولوی انعام علی، بی۔ اے :۔ مولوی انعام علی بی۔ اے پنجاب میں قانونی اسسٹنٹ کمشنر ہیں اور انتہائی باصلاحیت و تعلیم یافتہ شریف نوجوان ہیں۔

سید عالم شاہ :۔ سید عالم شاہ ریٹائرڈ اسسٹنٹ کمشنر اور لاہور کے آنریری مجسٹریٹ ہیں۔ انہوں نے حکومت کے لئے بہترین خدمات پیش کی ہیں۔

سردار چندا سنگھ :۔ سردار چندا سنگھ ایک ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر اور لاہور کے آنریری مجسٹریٹ ہیں۔

حکیم حسام الدین :۔ حکیم گل محمد کے صاحزادے حکیم حسام الدین کی لاہور اور امرتسر میں پریکٹس بہت زیادہ ہے اور بطور ایک انتہائی کامیاب طبیب کے ان کی شہرت بہت زیادہ ہے۔ ان کے بیٹے امیرالدین انگلستان میں سول سروس کے امتحان کے لئے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ان کے بھائی حکیم شجاع الدین کا لاہور کے انتہائی عالم فاضل اشخاص میں شمار ہوتا ہے۔

------- O -------

حوالہ جات

1 ۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے سات سو پچاس سالہ دور حکومت میں اس وقت تک دوبارہ آزادی حاصل نہیں کی جب تک کہ سکھوں کی مثلیں پنجاب میں اچھی طرح پنپ نہیں گئیں۔ لاہور پر عموماً حاکموں اور ناظموں نے حکمرانی کی ہے اور ان کو مکمل اختیار حاصل ہوتا تھا۔

2 ۔ حکومت ہند (محکمہ خارجہ) کی دستاویزات برائے سال 52-1851ء اور 53-1852ء کا انتخاب، پنجاب کے علاقوں کے انتظام سے متعلق ہے۔ سر جان کے تذکرہ کے مطابق مسلسل کئی شہروں کے کھنڈرات شہر لاہور کے قدیم آباد علاقوں کا بالکل واضح حوالہ پیش کرتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے باب دوئم میں بتایا ہے کہ پنجاب میں مسلمانوں کی حکومت کے خاتمے اور سکھوں کی مثلیں قائم ہونے کے بعد وہ بالکل تباہ ہو گئے تھے۔

3 ۔ اس مزار کے بارے میں تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجیئے باب دوئم۔

4 ۔ میری کتاب "تاریخ پنجاب" ملاحظہ کیجیئے۔

5 ۔ شہر 97,208 ، مضافات 41,670 کل = 1,38,878

6 ۔ شہر 92,035 ، مضافات 36,406 کل = 1,28,441

7 ۔ 1881ء کی مردم شماری کے مطابق، دہلی کی آبادی 1,93,000 ہے۔ لاہور آبادی کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر ہوا۔ امرتسر 1,36,000 تیسرے نمبر پر، پشاور 83,000 چوتھے نمبر پر، انبالہ 79,000 پانچویں نمبر پر اور ملتان 74,000 چھٹے نمبر پر ہے۔

8 ۔ اس کو گھویاں بھی کہا جاتا ہے۔

9 ۔ یہ کھیل اس طرح کھیلا جاتا ہے کہ بائیں شہادت کی انگلی کے آگے پتھر کی گولی رکھ لی جاتی ہے اسے واپس کھینچ کر اچانک ڈھیلا چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ وہ گولی سے زور کے ساتھ ٹکرا کر اسے آگے پھینکے۔ نشانہ بالکل درست ہونا چاہیے اگر خطا ہو جائے تو ہار ہو جاتی ہے۔

10 ۔ لیفٹیننٹ الیگزینڈر برنز جنہوں نے 1832ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں لاہور کی سیاحت کی تھی انہوں نے بسنت کے میلے کا واضح طور پر ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "

6 فروری کو بسنت کا تہوار بڑی شان و شوکت سے منایا گیا۔ اس کا مطلب عام طور پر موسم بہار ہوتا ہے۔ رنجیت سنگھ نے اس موقع پر ہمیں مدعو کیا۔ ہم اس کے ہمراہ ہاتھیوں پر سوار ہو کر خوشیوں کا مظاہرہ دیکھنے گئے جو دیگر علاقوں کی طرح موسم بہار کی آمد پر منائی جاتی ہیں۔ پنجاب کے فوجی دستے قطاروں کی صورت میں کھڑے تھے اور انہوں نے دو میل طویل ایک گلی کی شکل بنا لی تھی اور اس کے آخری سرے تک جانے کے لیے تیس منٹ درکار ہوتے تھے۔ فوج، باقاعدہ فوجی دستوں، سواروں، پیدل فوج اور توپ خانے پر مشتمل تھی۔ پوری فوج نے پیلے رنگ کا لباس یکساں طور پر پہنا ہوا تھا۔ یہ اس تہوار کا مخصوص لباس تھا۔ مہاراجہ قطار کے قریب سے گزرا اور اپنی فوجوں کی سلامی لی۔ ہمارا راستہ مکمل طور پر ناہموار سطح زمین پر واقع پرانے لاہور کے کھنڈرات میں سے ہو کر جاتا تھا۔ لہٰذا اس وجہ سے قطار میں لہر کی سی شکل پیدا ہو گئی تھی اور اس چیز نے منظر کی خوبصورتی میں بھی اضافہ کر دیا تھا۔ اس شاندار قطار کے آخر پر زرد حاشیوں سے مزین شاہی خیمے نصب تھے۔ ان کے درمیان ایک لاکھ روپے مالیت کا چھپر کٹ تھا۔ اس کو سچے موتیوں سے آراستہ کیا گیا تھا اور قیمتی پتھروں کا حاشیہ لگایا گیا تھا۔ اس سے بڑی کوئی چیز تصور میں نہیں آسکتی تھی۔ اس کے ایک کونے میں رنجیت سنگھ بیٹھ گیا اور گرنتھ سننے لگا۔ یہ تقریباً دس منٹ تک پڑھی گئی۔ اس نے مہنت کو نذرانہ پیش کیا اور مقدس کتاب کو دس مختلف رنگوں کے غلافوں میں لپیٹ کر رکھ دیا گیا۔ بالائی غلاف تہوار کی مناسبت سے پیلے رنگ کی مخمل کا تھا۔ بادشاہ کے سامنے پھل اور پھول رکھے گئے اور زرد پھول پیدا کرنے والی ہر جھاڑی اور درخت کو اس کی خوبصورتی سے محروم کر دیا گیا۔ مجھے اس کی کوئی وجہ معلوم نہ ہو سکی کہ اس قدر سادہ رنگ کیوں منتخب کیا گیا ہے لیکن شاید یہ ایک حکمران کی من مانی تھی۔ اس کے بعد زرد لباس میں ملبوس اس کی فوج کے کماندار اور امراء مال و زر کی صورت میں نذرانے پیش کرنے کے لیے آئے۔ کابل کے معزول بادشاہوں، شاہ زماں اور شاہ ایوب کے دو بیٹے داخل ہوئے اور کچھ دیر تک گفت و شنید کی۔ اس کے بعد ملتان کا نواب بھی زرد لباس میں ملبوس اپنے پانچ بیٹوں کے ہمراہ خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے آیا۔ اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ یہ وہی شخص تھا جو کابل کی مہم میں خوفزدہ ہو گیا تھا اور اب مہاراجہ رنجیت سنگھ کا وفادار غلام ہے۔ اس کا نام سرفراز خاں ہے۔ بہاولپور اور سندھ کے نمائندے اپنی باری پر حاضر ہوئے۔ رقص کرتی ہوئی لڑکیوں نے اس تہوار کے

عشقیہ گیت بڑی خوبصورتی سے سنائے اور مہاراجہ نے ان کو بڑی فیاضی سے تحائف دیے۔ "بخارہ وغیرہ میں برنز کے سفر"، صفحہ 26 سے 28 جلد ا

11۔ اصل میں مہندی ایک ایسی رسم ہے جس میں شادی کے موقع پر دلہا اور دلہن کے ہاتھوں کو مہندی (حنا) سے رنگ دیا جاتا ہے۔ جس وقت کربلا کا سانحہ پیش آیا تو حضرت علیؓ کے ایک وارث حضرت امام قاسمؓ کی شادی ہونے والی تھی اور دشمنوں نے اسی موقع پر انہیں شہید کر دیا تھا۔ مہندی کی رسم اس واقعہ کے افسوس کی یادگار کے طور پر منائی جاتی ہے۔

12۔ انجمن نے اپنے معاونین کے تحت نہایت شاندار کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ ذیل میں ان کی خدمات کا ایک مختصر سا بیان ہے:۔

1 - ایک لاکھ روپے کی لاگت سے (جس میں ایک حصہ حکومت کا بھی تھا) بادشاہی مسجد لاہور کی بازیابی۔

2 - حکومت کی طرف سے سنہری مسجد لاہور کے ساتھ ملحقہ دکانات کی واگزاری اور مسجد کی مرمت

3 - حکومت کی جانب سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تبرکات جو پہلے قلعہ میں رکھے گئے تھے ان کی بازیابی اور اب یہ انجمن کے قبضہ میں ہیں، بحوالہ پارس، صفحات 6 سے 115 ۔

4 - مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں حکومت کو یادداشت پیش کی۔ اس یادداشت کے نتیجہ میں حکومت نے نہایت خوشی سے مسلمانوں کے لیے پانچ سال تک کے لیے جوبلی وظائف کی امداد کا اعلان کیا۔ 1891ء میں انجمن نے دوبارہ اسی سلسلہ میں حکومت کو یادداشت پیش کی اور حکومت نے کمال مہربانی سے مزید پانچ سال تک کے لیے وظائف میں توسیع کر دی۔

5 - 1887ء سے انجمن بھی مسلمان طلباء کو 40 روپے ماہانہ کے حساب سے جوبلی وظائف دے رہی ہے۔

13۔ اس انجمن کی کوششوں کے نتیجہ میں مستی دروازہ لاہور کے قریب واقع مسجد مریم زمانی کو واگزار کرا لیا گیا تھا۔

14۔ یہ بادشاہ شاہجہاں کے وزیر سعد اللہ خاں کے بیٹے نواب میاں خاں کا محل تھا۔

15۔ یہ جگہ جہاں ریلوے کوآپریٹو سٹورز کے لیے روٹی اور سوڈا واٹر تیار کیا جاتا ہے دراصل شیخ

محترم کا مقبرہ ہے ، بحوالہ باب دوئم

16۔ یہ ایک اسلامی مقبرہ ہے اس کو انگریزوں کی رہائش کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔

17۔ یہ " عمل صالح " کے مصنف محمد صالح لاہوری کا مزار ہے۔ اس کتاب میں اکثر ان کے بارے میں حوالہ جات دیے گئے ہیں۔

18۔ بحوالہ باب دوئم

19۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور حکومت میں دونوں بھائیوں فقیر عزیز الدین اور نور الدین کی زیر ہدایت لاہور میں دارالشفاء کے نام سے مشہور ایک ہسپتال قائم کیا گیا۔ دواؤں کی قیمت حکومت ادا کرتی تھی۔ لاہور کے دربار کے فزیشن اور بارود کی تیاری کے نگران ڈاکٹر جان مارٹن ہونگ برجر کو ذہنی مریضوں کی دیکھ بھال اور علاج کی ذمہ داری سونپی گئی۔ مریضوں کے لیے مرہم ، پلستر وغیرہ تیار کرنے کے لیے دربار نے جراحوں کی تقرری کی۔ ہسپتال میں مریض بڑی تعداد میں آتے تھے۔ ڈاکٹر ہونگ برجر کے مطابق صبح سے لے کر شام تک میلے کا سماں ہوتا تھا۔

20۔ جس وقت یہ کتاب زیر طبع تھی تو اسی دوران 14 جنوری 1892ء یا ان کے نام سے منسوب نئے ہسپتال کے افتتاح کے پندرہ روز بعد شہزادے کی موت کی افسوسناک خبر شائع ہوئی۔ اس ہمہ گیر شخصیت کے مالک شہزادے کی بے وقت موت کی وجہ سے ملکہ عالیہ کی رعایا کے سبھی طبقوں کو بہت زیادہ رنج ہوا اور اسے ایک قومی نقصان قرار دیا گیا۔

21۔ اپریل 1890ء میں پانچ طالبات نے امتحان پاس کیا۔ چار نے ہسپتال اسسٹنٹ کا ڈپلومہ حاصل کیا اور ایک مس امیلیا کونر نے پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے میڈیسن میں لائسنس حاصل کیا۔ انہوں نے سبھی طالبات سے زیادہ نمبر حاصل کیے اور میڈیسن میں برٹن براؤن میموریل میڈل اور مڈوائفری میں سنٹر میڈل حاصل کیا

22۔ میڈیکل سکول کھلنے سے پیشتر ان بارکوں کو لاہور نارمل سکول کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا (اب شہر میں راجہ لال سنگھ کے توشہ خانہ میں ہے)

23۔ آپ گورنمنٹ آرٹ سکول بمبئی میں پروفیسر تھے۔ وزیر خارجہ نے 1874ء میں ان کی تقرری کی منظوری دی اور وہ اپریل 1875ء میں لاہور پہنچے۔

24۔ اس تصویر کی نقاب کشائی پنجاب کے آنجہانی لیفٹیننٹ گورنر عزت مآب سر جیمز لائل نے یکم

جنوری 1892ء میں کی۔

25۔ یہ تصویر 1887ء میں ضلع شاہ پور میں ان کے دوستوں کے لیے بنائی گئی۔

26۔ مہاراجہ پٹیالہ نے حال ہی میں لاہور چڑیا گھر کے لیے جوان شتر مرغوں کا ایک جوڑا عطیہ کے طور پر دیا ہے جو اس میں ایک نہایت قیمتی اضافہ ہے۔ اس پرندے کو قدیم زمانے سے جانا جاتا ہے اور قدیم ترین کتابوں میں اس کا ذکر ہے۔ اس کے گوشت کو غذا میں شامل رکھا جاتا تھا حتیٰ کہ حضرت موسیٰ کے زمانے میں بھی کھایا جاتا تھا۔ نواب بہاولپور نے ایک شیر اور شیرنی کا تحفہ بھی دیا ہے اور یہ نہایت بہتر حالت میں ہیں۔

27۔ مہا سنگھ کے باغ کے نام سے مشہور قطعہ زمین کو 5 نومبر 1870ء میں خریدا گیا اور ڈیوانٹنی سکول کا آغاز 21 نومبر 1870ء میں کیا گیا۔

28۔ جب ماڈل سکول کی کلاسوں کو میونسپل بورڈ سکول کے ساتھ ملا دیا جائے گا تو لاہور نارمل سکول کو سنٹرل ٹریننگ کالج کی عمارت میں منتقل کر دیا جائے گا۔

29۔ چھوٹے لعل خود تو فوت ہو چکا ہے لیکن اس کے بھتیجے ابھی زندہ ہیں اور انار کلی میں کپڑے کا کاروبار کرتے ہیں۔

30۔ ضلع لاہور کا گزیٹیئر (فرہنگ جغرافیہ) 84-1883ء ، صفحہ 69

31۔ جن کے بارے میں ترچھے حروف سے نشاندہی کی گئی ہے وہ پنجاب گزیٹیئر کی اشاعت تک فوت ہو چکے ہیں۔

32۔ اس خاندان کا کربلا میں اپنا مکان اور زمین ہے۔ وہاں پر مرحوم نواب نے مسافروں کے قیام کے لیے ایک بہت بڑی سرائے تعمیر کرائی۔ نواب اپنے اہل خانہ اور بیٹے کے ہمراہ کربلا میں رہائش پذیر تھے کہ وہاں انہیں ایک انتہائی مہلک بخار نے آلیا اور وہی ان کی موت کا باعث بنا۔

33۔ بحوالہ میری کتاب "تاریخ پنجاب"۔

34۔ ان میں بٹالہ کے شاعر مفتی امام بخش اور کابل کے مرزا امام ویردی کا ذکر بھی کیا جانا لازمی ہے جو پورے ہندوستان میں فارسی خطاطی کے فن کے لیے مشہور ہیں۔

35۔ ثمن برج کے نیچے ڈیرے کے مقام پر سفید سنگ مرمر سے تعمیر کردہ ان کی سمادھ اب بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

36۔ بحوالہ میری کتاب "تاریخ پنجاب"۔

37- فقیر ایک عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کا ماخذ فقر ہے، جن کا مطلب غریب یا مفلس ہونا ہے۔

38- مور کرافٹ کا سفرنامہ جلد اول، صفحہ 94

39- برنز کے سفر بخارہ وغیرہ میں، صفحہ 22 ، جلد اول۔

40- عزت مآب ، ڈبلیو جے آسبورن کی تصنیف " رنجیت سنگھ کا دربار اور پڑاؤ " ، صفحہ 69

41- کیپٹن لیو پولڈ وان آرلچ کی کتاب " ہندوستان بشمول سندھ اور پنجاب کا سفرنامہ " جرمن زبان سے ترجمہ ایچ ایونز، ایل لائیڈ، صفحہ 174 ، جلد اول۔

42- فقیر عزیز الدین اور نور الدین دونوں بھائیوں کے مزارات بھاٹی دروازہ میں بازار حکیماں کے فقیر خانہ میں ہیں۔

43- پنجاب کے سابق لیفٹیننٹ گورنر سرچارلس ایچی سن 1885ء میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں " بطور صحافی کے ان کا پیشہ 40 سال کے ایک طویل عرصہ پر محیط ہے۔ انہوں نے 1849ء میں قدیم اخبار " لاہور کرونیکل " اور بعد میں اردو اخبار " پنجابی " نکالا۔ یہ مقامی زبان کا اولین اخبار تھا۔ پنجاب میں صحافت کا بانی ہونے کے باعث اور حکومت کے محرکات اور مقاصد کے بارے میں ان کی معقول قدردانی نے صوبہ سے وابستہ سرکردہ شخصیات کے دل میں ان کے لیے عزت و احترام میں اضافہ کر دیا۔

44- سر لیپل گریفین ، ان کی وفات کے موقع پر لکھتے ہیں " وہ انتہائی طاقتور شخص تھے۔ ان کی موت لاہور کے معاشرہ کے لیے ایک بہت بڑا نقصان ہے۔ "

45- جب کتاب ہذا زیر طبع تھی تو میاں جلال الدین کا انتقال ہو گیا۔

باب چہارم

لاہور کے آثار قدیمہ

شہر کا قدیم دور:۔ شہر لاہور کے زمانہ سلف کا موضوع مکمل طور پر اس کتاب کے تاریخی حصہ سے متعلق ہے۔ (باب اول) جس میں اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ غالباً لاہور کو مغربی ہندوستان کے راجپوتوں کے ایک قبیلہ نے آباد کیا تھا۔ لاہور 1002ء میں غزنی کی اسلامی سلطنت کا حصہ بنا (1)۔

تلواڑہ اور رڑا:۔ جب محمود نے حملہ کیا تو قدیم لاہور بالکل شکستہ حالت میں تھا۔ اس وقت شہر کو دو حصوں مین تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک تلواڑہ کہلاتا تھا اور دوسرا رڑا۔ شہر کا حصہ تلواڑہ تقریباً ٹکسالی دروازہ کے علاقہ میں موجود تھا جو محمود کی فتح سے قبل کئی صوبوں کے کھنڈرات کی وجہ سے بلند ہونے والی ایک جگہ پر واقع ہونے کے باعث اب ٹبی کے نام سے مشہور ہے۔ رڑا شہر کا وہ حصہ تھا جہاں اب مسجد وزیر خاں موجود ہے۔ قدیم دستاویزات اور معاہدات میں ٹکسالی دروازے کے علاقہ کو گزر تلواڑہ لکھا گیا ہے اور دہلی دروازہ سے مسجد وزیر خاں تک کے علاقہ کو رڑا کہا گیا ہے۔

خلاصۃ التواریخ کے مطابق محمود کے حملہ کے وقت پنجاب میں زبردست قحط پڑا۔ محمود نے شہر کو از سر نو تعمیر کرایا لیکن شہر کی آبادی مختلف علاقوں میں منتشر ہو گئی تھی جنہیں گزر کہا جاتا تھا اور شہر بھی فصیل کے بغیر تھا۔ شہر کے گرد فصیل اکبر نے تعمیر کرائی تھی۔ محمود کے مورخین نے فاتح کی جانب سے شہر کی تاریخ بنیاد کا مندرجہ ذیل قطعہ پیش کیا ہے:۔

محمود بنا کرد چو لاہور لہانور — در هند یکی کعبہ مقصود بنا کرد

اندیشہ چو کردم پی تاریخ بنایش — فی الفور خرد گفت کہ محمود بنا کرد

ترجمہ :۔ جب محمود نے لاہور ۔۔ لہانور کی بنیاد رکھی تو اس نے دراصل کعبہ کی بنیاد رکھی جو اس کے دل کی خواہش تھی۔ جب میں نے سال بنیاد کی تاریخ پر غور کیا تو اسی وقت خرد نے کہا" محمود اس کا بانی ہے۔"

محمود بنا کرد (محمود اس کا بانی ہے) ان الفاظ کے اعداد 375 اور جب ک کے اعداد جو 20 بنتے ہیں اس میں شامل کیے جائیں تو اعداد 395 ہجری حاصل ہوتے ہیں جو 1004ء کے برابر ہیں۔ لہٰذا محمود کی طرف سے اسلامی لاہور کی تاریخ بنیاد حاصل ہو جاتی ہے۔

مرکزی عجائب گھر

عمارت کی تاریخ :۔ مرکزی عجائب گھر یا میوزیم لوگوں میں " عجائب گھر " کے نام سے مشہور ہے۔ یہ جنرل پوسٹ آفس اور پنجاب پبلک لائبریری کے قریب واقع ہے۔ اس عمارت کو پنجاب کی قدرتی اشیاء، فنون اور دستکاریوں کے بارے میں 20 جنوری 1864ء میں شروع ہونے والی اور اپریل کے پہلے ہفتہ میں بند ہونے والی نمائش کے لیے جمع کیے گئے مقامی، صوبائی اور شاہی چندوں کی رقم سے تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ عمارت مستقل بنیادوں پر نہیں بنائی گئی۔ نمائش کی اشیاء کو اس سے ملحقہ ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کی عمارت میں منتقل کر دیا جائے گا۔ وہ ابھی زیر تعمیر ہے لیکن جلد مکمل ہو جائے گی۔

عجائب گھر کی اشیاء کے ذخیرے کو دو شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک داخلی کمرے کے بائیں جانب ہے جو نادر اشیاء فنون اور صوبے کی دستکاریوں پر مشتمل ہے اور دائیں جانب خام مصنوعات معدنیات، جانوروں اور سبزیوں پر مشتمل ہے۔ دونوں شعبوں میں وہی اشیاء ہیں جو 1864ء کی نمائش میں رکھی گئی تھیں لیکن اس کے بعد عجائب گھر کی جملہ شاخوں میں اشیاء کافی تعداد میں بڑھائی گئی ہیں۔

عجائب گھر بہت زیادہ مقبول ہے اور مخصوص اوقات میں ہر ایک کو اندر آنے کی اجازت ہے۔ زائرین جب اس میں داخل ہوتے ہیں تو ان میں سے ہر ایک کو چکر دار دروازے میں سے گزرنا پڑتا ہے اور وہ ان کی تعداد کو درج کر لیتا ہے۔

منقش دروازے :۔ مرکزی ہال میں دائیں جانب قلعہ لاہور سے حاصل کیا گیا ایک منقش

دروازہ ہے۔ چنیوٹ ضلع جھنگ اور بھیرہ ضلع شاہ پور کی شیشم اور دیودار کی لکڑی کی کندہ کاری سے مزین کھڑکیاں ہیں۔ نیز شہر لاہور کے ایک پرانے مکان سے حاصل شدہ کندہ کاری سے مزین ایک بالکونی ہے۔ بائیں جانب شالا مار باغ سے حاصل شدہ ایک منقش دروازہ ہے۔ میونسپل کمیٹی کی طرف سے پیش کردہ شہر لاہور میں واقع مہاراجہ کھڑک سنگھ کی حویلی (جو اب گرادی گئی ہے) کا ایک کندہ کاری سے آراستہ دروازہ بمعہ حاشیے کے ہے امرتسر سے منگوایا گیا ایک کندہ کاری سے مزین دروازہ، لکڑی کی ایک جالی جو جوہر سنگھ مستری کا شاہکار ہے (2) ، اور بھوانی سے منگوایا گیا چوبی کندہ کاری اور پیتل کے نقش و نگار سے مزین دروازہ بھی ہے۔

پنجاب میں چوبی کندہ کاری :۔ پنجاب میں چوبی کندہ کاری کا کام خالصتاً روایتی ہے لیکن یہ فن ابھی تک زندگی اور شان و شوکت سے بھرپور ہے۔ یہ کام زیادہ تر مقامی گھروں کے دروازوں اور کھڑکیوں وغیرہ پر کیا جاتا ہے لیکن یورپی باشندوں کی طرف سے اس کی مانگ بڑھنے کے باعث اس کو شاہ پور، جھنگ اور ہوشیار پور کے اضلاع میں اب فرنیچر اور ڈرائنگ روم کی آرائشی اشیاء کے لیے بھی بنایا جا رہا ہے۔ پنجاب میں کندہ کاری اسلامی طرز کی ہے۔ ان میں سب سے زیادہ خوبصورت اور خصوصی آرائشی کام جیومیٹری کے ڈیزائنوں مثلاً مسدس، تکون وغیرہ کی شکل میں بنائی گئی چوبی جالیاں ہیں اور یہ مکمل طور پر عربی طرز کی ہیں۔

قدیم توپیں :۔ داخلی کمرے میں دیگر اشیاء جو دلچسپی کی حامل ہیں ان میں غالباً 18 ویں صدی کی مسلمانوں کے دور کی پیتل کی توپ ہے۔ ضلع ہوشیار پور میں آنند پور سے ملنے والی سکھوں کے قدیم دور کی دو توپیں بھی ہیں اور غالباً یہ گورو گوبند سنگھ کے دور کی ہیں۔ اس کے علاوہ امرتسر سے حاصل شدہ پلاسٹر اور بھرت سے مزین چھت کی آرائش کے نمونہ جات بھی ہیں۔

آرائشی چھت کا کام :۔ محدب آئینوں سے مزین آرائشی چھت کا فن قاہرہ اور ایران میں بہت مشہور اور جانا پہچانا ہے اور یہ پنجاب کے مقابلے میں اعلیٰ نمونہ جات پیش کرتا ہے۔ یہ سفید پلستر اور ہاتھ سے لگائے گئے اندرونی جانب سے چاندی کی ملمع سازی سے مزین آئینوں پر مشتمل ہے۔ ان کے ارد گرد نہایت مہارت اور صفائی سے منقش ڈیزائن بنائے گئے ہیں۔ اکثر اس کا تاثر متاثر کن اور جاذب نظر ہوتا ہے۔ مسلمان فاتحین نے یہ فن پنجاب میں متعارف کرایا۔

انبیالہ کے جھنڈے :۔ اسی کمرے میں 23 ویں دستے کی کمان کرنے والے میجر چیمبر لین کی طرف سے 1863ء کی انبیالہ مہم میں پکڑے گئے چار پرچم بھی موجود ہیں۔

قدیم برہمنی مجسمے :۔ یہاں پر داخلی کمرے میں موجود چند خوبصورت قدیم مجسموں کا ذکر ضروری

ہے۔ یہ سرسہ کی میونسپل کمیٹی کی طرف سے پیش کردہ سنگ مرمر کے مجسموں پر مشتمل ہیں۔ ایک برہمنی مجسمہ ہے جس میں شیو اور پاربتی کو ایک بیل پر سوار دکھایا گیا ہے۔ سرسہ میونسپل کمیٹی کی طرف سے پیش کردہ ایک اور برہمنی مجسمہ چتر بھوج دیوی کا ہے۔ چار فٹ بلند مہاتما بدھ کا مجسمہ امرتسر سے 10 میل کے فاصلے پر چائنہ سے حاصل کیا گیا ہے (خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ ہیون سانگ کی چائنہ پتی کو کنشکا کے بادشاہوں نے ہیون سانگ کے لیے موسم سرما کی رہائش گاہ بنا دیا تھا) ضلع جہلم کی پہاڑیوں میں چوا سیدن شاہ کے قرب و جوار سے ملنے والے دو برہمنی مجسمے جہلم کے ڈپٹی کمشنر نے پیش کیے ہیں۔ اس کے علاوہ میجر جنرل کننگھم کی طرف سے پیش کردہ متھرا سے ملنے والی سنگ سرخ کی ایک قربان گاہ ہے۔ اس کے سامنے والے حصہ میں عورتوں کے دو مجسمے اور عقب میں تین مجسمے ہیں۔

پنجاب کے زیورات کے نمونے:۔ دائیں جانب شیشے کے ایک شوکیس میں پنجاب کے زیورات کے نمونہ جات بڑے قرینے سے رکھے گئے ہیں۔ ان میں کانگڑہ کے جھومر، چاندی کے آویزے، چاندی کے گلو بند جن میں نقلی سکے لگائے گئے ہیں۔ دہلی کے نقرئی کڑے، بازو بند، پیش بند اور پترے ہیں۔ بہاولپور کے منقش روغنی پازیب اور اس کے علاوہ ملتان کے منقش روغنی کڑے، گلو بند اور پازیب وغیرہ ہیں۔ اس میں سرسہ کے بگری جاٹوں کو طلائی زیورات پہنے دکھایا گیا ہے۔ ان میں ماتا کی طلائی مورتی بھی شامل ہے۔ یوسف زئی وادی سے بھی کچھ قدیم زیورات ملے ہیں جن کے بارے میں خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ مہاتما بدھ کے مجسموں کے دور کے ہیں۔ دہلی زیورات کی اشیاء بنانے میں مشہور ہے۔ یہ زیورات ڈیزائن میں منفرد اور خوبصورت ہونے کے علاوہ بڑی صفائی اور مہارت سے تیار کیے جاتے ہیں۔ نقرئی کام میں یکسانیت اور اعلیٰ ذوق ملتا ہے۔ اس میں دھات اور روغن سے قیمتی پتھروں کو یکجا کیا جاتا ہے۔ کانگڑہ میں چاندی کی اشیاء سبز، نیلے اور زرد رنگ کے روغن میں بنائی جاتی ہیں۔ ملتان چاندی کے زیورات کے لیے مشہور ہے جنہیں سرخ، سیاہ، گہرے اور ہلکے نیلے اور ہلکے زرد روغن میں بنایا جاتا ہے۔

مہاتما بدھ کے قدیم مجسمے:۔ جنوبی دروازے کے قریب مہاتما بدھ کے قدیم مجسموں کا خوبصورت ذخیرہ ہے۔ ان میں عبارات سے مزین دو پتھر ہیں۔ ان میں سے ایک کو گونڈو فیرس سے منسوب کیا جاتا ہے۔ روائیتی طور پر نشاندہی کی گئی ہے کہ یہ وہی گوڈو فورس بادشاہ تھا جس نے سینٹ ٹامس کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس ذخیرے میں زیادہ دلچسپ مجسمے حسب ذیل ہیں:۔

ستون کے پینڈے:۔ ضلع راولپنڈی میں قدیم شہر ٹیکسلا (شاہ کی ڈھیری) کے کھنڈرات میں

ایک ٹیلے پر موہرہ ملیار میں ایک یونانی مندر کے ستون کا بہت گول پینڈا ملا ہے اور یہ پنجاب میں دریافت ہونے والے یونانی آثار کا پہلا خالص نمونہ ہے۔ یہ خالص یونانی طرز کے ستون کا پینڈا ہے۔ اس کا قطر 2 فٹ پونے پانچ انچ ہے۔ اس میں فرق صرف یہ ہے کہ بالائی نیم مدور حاشیے کے ساتھ ہی ذرا نچلی جانب ستون کا حصہ آگے بڑھا ہوا ہے۔ جنرل کننگھم اس کو اپولونیس کے بیان کردہ مندر کے ساتھ منسوب کرتے ہیں جس کی پیمائش تقریباً 100 فٹ تھی اور اس کو سنگ سماق سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اسی میں ایک مندر کی جسامت کا چھوٹا سا گرجا بھی تھا۔ یہ بہت بڑے اور کشادہ تھے۔ ان کے چاروں طرف ستون موجود تھے۔

قدیم ستون:۔ جہلم سے دریافت ہونے والے ستون غالباً وہی ہیں جن کو جنرل کننگھم 600ء سے 800ء تک تعمیر کیے گئے مندر سے منسوب کرتے ہیں۔ اس ستون کو محکمہ ریلوے کی طرف سے کی جانے والی کھدائی کے دوران دریافت کیا گیا۔ اسی دوران اسی نوعیت کے ستون کی طرح کے 23 ستونوں کے پینڈے بھی دریافت کیے گئے۔ اسی ٹیلے سے جنرل ایبٹ نے دروازے کی ایک محراب بھی دریافت کی اور اسے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے جریدے کی جلد 14 میں شائع کیا۔ جنرل کننگھم کا خیال ہے کہ یہ حصہ دراصل اسی مندر کے ایک ستون کا حصہ ہے۔

کانگڑا کے مجسمے:۔ کرنل ایچ ینگ نے کانگڑا کے قلعہ سے ملنے والے مجسموں کو قلعہ کی شہر پناہ کے ساتھ بہنے والے دریا بونر کی تہہ سے نکالا تھا۔

پشاور سے دریافت ہونے والے مجسمے:۔ ٹوٹے پھوٹے مجسموں کے ٹکڑے چارسدہ پہاڑ سے ملے ہیں جو پشاور کے قریب ہے۔ جنرل کننگھم کا خیال ہے کہ یہ قدیم گندھارا کا دارالخلافہ، پنچیولوٹس سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کی کھدائی لیفٹیننٹ مارٹن آر۔ ای نے کروائی تھی۔

کلانور:۔ جمیل بیگ کے مزار واقع کلانور (ضلع گورداسپور) کی سنگ مرمر کی آرائشی چھتری (چھپر کٹ) پنجاب کے آرکیالوجیکل سرویئر نے عطیہ کے طور پر دی ہے۔

یوسف زئی:۔ یوسف زئی موضع محمد ناری کے قریب واقع ٹیلے سے ملنے والے مجسمے مسٹر ڈیمپسر سی۔ ای، ایگزیکٹو انجینئر، نہر سوات نے دریافت کیے اور عطیہ کے طور پر پیش کیے۔

مندرجہ بالا مجسموں میں سے ایک میں مہاتما بدھ کو کنول کے پھول پر بیٹھے دکھایا گیا ہے اور دونوں اطراف میں شاہی افراد ہیں۔ اس کے اوپر ایک شکستہ محراب پر بنی ہوئی شبیہہ میں دکھایا گیا ہے کہ وہ رات کے وقت اپنے محل سے روانہ ہو کر اپنے گھوڑے چندا پر سوار ہو رہے ہیں جبکہ دوسری تصویر میں انہیں اپنے گوشہ عافیت سے اٹھتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس کے نیچے مہاتما بدھ کی

آٹھ تصویروں کی قطار ہے۔

مہاتما بدھ کی عبادت :۔ یہ مجسمہ اپنی مکمل حالت کی وجہ سے قابل ذکر ہے۔ اس کی مماثلت اور مہارت بڑی حد تک عیسائیوں کے بیشمار کاموں کے فن سے ملتی جلتی ہے۔ مہاتما بدھ پانی سے باہر نکلے کنول کے ایک پھول پر بیٹھے ہیں۔ ان کے سر کے اوپر پروں والے فرشتوں نے ہار پکڑا ہوا ہے۔ اس کے اوپر ایک چھتری ہے اور مرکزی بت کے چاروں طرف فرشتے ہیں۔

ہندوستانی ہتھیار :۔ بائیں جانب فن اور دستکاری کے شعبے میں داخل ہونے پر دیکھنے والے کو مرکزی راستے کی مغربی دیوار کے سامنے ہندوستانی ہتھیاروں کے نمونے لٹکے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ دلچسپ ان ہتھیاروں کا مجموعہ ہے جو امرتسر میں کولسار تالاب کو صاف کرنے پر دستیاب ہوئے تھے۔ ان کو میونسپل کمیٹی امرتسر نے سیکرٹری مسٹر ای نکول کے ذریعے عطیہ کے طور پر پیش کیا تھا۔

پنجاب کی تصاویر :۔ ہال کے شمال اور جنوب میں مقامی فنکاروں کی بنائی گئی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں پنجاب کے شہزادوں اور سرداروں کی تصاویر محرابوں کے درمیان لٹکائی گئی ہیں اور کپورتھلہ، جموں اور کمالیہ کے منقش کپڑوں کی بڑی بڑی چادریں بھی لٹکائی گئی ہیں۔ مؤخرالذکر جگہ پنجاب میں شاندار منقش کام کے کپڑے کے لیے مشہور ہے۔

نقشین کام کا کپڑا :۔ نقش ونگار یا چھپائی، چوبی بلاکوں کے ذریعے کی جاتی ہے۔ زیادہ تر معاملات میں یہ ڈیزائن دیسی ہوتے ہیں۔

تانبے کے برتن :۔ داخلی ہال کے قریب شیشے کی ایک الماری میں پشاور سے منگوائے گئے کندہ کاری سے مزین اور ملمع شدہ تانبے کے برتنوں کے نمونہ جات بڑے قرینے سے سجائے گئے ہیں۔

کشمیر کے تانبے کے برتن روغنی اور ملمع شدہ ہیں۔ بہاولپور کا منقش روغنی کام، کانگڑا طرز کے تانبے کا ٹی سیٹ کشمیر میں تیار کیا جاتا ہے لیکن برقی ملمع سازی انگلستان میں کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ امرتسر کا ایک گول تانبے کا چراغ بھی ہے۔ یہ چراغ ایک ایسے انوکھے انداز میں بنایا گیا ہے کہ تیل کا ذخیرہ ہر وقت بلند رہتا ہے۔ اس کے علاوہ جھنگ، روپڑ اور انبالہ کی پیتل کی رکابیں ہیں اور ضلع ہوشیار پور میں ٹانڈا سے حاصل کردہ ہاتھی کی شکل کا پیتل کا ایک گنگا ساگر بھی ہے۔

ہندوستانی اور وسطی ایشیاء کے ہتھیار :۔ مندرجہ بالا کے قریب ایک دوسری الماری میں ہتھیاروں کے ذخیرے کو سجایا گیا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ دلچسپ ایک ترکش بمعہ بازو بند کے ہے۔ پہلے پہل اس کو پنجاب میں استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ عطیہ حکومت پنجاب نے دیا ہے۔ چترال کے

مہتر کی طرف سے سیاہ پوش کافروں کے خنجر، پشاور کے سابق کمشنر کرنل واٹر فیلڈ نے پیش کیے ہیں۔ گھڑ سوار دستے کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے سکھوں کے استعمال میں رہنے والے "گوکھڑو" سے پتہ چلایا گیا ہے کہ یورپ کی قرون وسطیٰ کی لڑائیوں میں انہیں استعمال کیا جاتا تھا اور ایک بچوا ہے۔ مؤخرالذکر ہتھیار کی زبردست خوبی یہ ہے کہ ایک پھل میں چھوٹے چھوٹے سچے موتیوں کو ڈھیلے ڈھالے انداز میں لگایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سیدھی تلواریں، شکاری پیٹیاں بمعہ تھیلوں، گولیوں اور بارود کی بوتلوں کے ڈیرہ غازی خاں کے فولاد اور چقماق کے ہتھیار، تھل کی لڑائی کے بعد ملنے والے سکھوں یعنی اکالیوں یا نہنگوں کے خود اور ایک پستول، یہ عطیہ مسٹر ایس۔ لیمن نے پیش کیا۔

پیتل کے برتن :۔ کشمیر، امرتسر، پشاور، بہاولپور، کرنال، کانگڑا اور دہلی سے حاصل شدہ پیتل کے جالی دار کندہ کاری سے مزین اور پالش شدہ برتنوں کے کئی اقسام کے نمونے موجود ہیں۔

مذکورہ بالا الماری کے آگے ایک اور الماری ہندوؤں کی عبادت سے وابستہ پیتل کی قدیم اشیاء پر مشتمل ہے۔ یہ عطیہ جے۔ ایل۔ کپلنگ۔ بہادر سی۔ آئی۔ ای، کی طرف سے ہے۔

ہاتھی دانت کا کام :۔ شیشے کے ایک گول شوکیس میں نقلی زیورات کے نمونے موجود ہیں۔ ایک سیدھے صندوق میں جڑاؤ اور ہاتھی دانت میں کندہ کاری سے مزین صندوق اور چین سے حاصل کردہ ہاتھی دانت کا نہایت شاندار صندوقچہ ہے۔ ہوشیار پور میں سیاہ لکڑی میں ہاتھی دانت کے جڑاؤ کا کام کیا جاتا ہے جو اٹلی کے سرٹوسینا کام سے ملتا جلتا ہے۔ سہارنپور اور شملہ میں یورپی ڈیزائنوں کی نقل پر سفید لکڑی میں کندہ کاری کا کام کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ امرتسر اور پٹیالہ سے حاصل شدہ ہاتھی دانت میں کندہ کاری کے بہترین نمونے موجود ہیں۔

ہاتھی دانت پر چھوٹی تصاویر :۔ ہاتھی دانت پر دہلی کے بادشاہوں، بیگمات، تاریخی تصاویر اور مناظر کی اشیاء کا اچھا خاصہ ذخیرہ موجود ہے۔ دہلی کا چھوٹی تصاویر بنانے کا کام دراصل ایرانیوں کی آبی رنگوں سے تیار کردہ تصاویر کی نشاۃ ثانیہ ہے۔ دہلی کے فنکار ان کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مغل حکمرانوں نے ایرانی تصویر کشی کی حوصلہ افزائی کی اور یورپی سیاحوں نے بھی اکثر ان کا ذکر کیا ہے۔

ناخن کی کندہ کاری :۔ اس کے علاوہ کاغذ پر کندہ کاری کے آرائشی کام کے نمونہ جات بھی ہیں جن کو انگلی کے ناخن سے تیار کیا جاتا ہے۔

لاکھ کا کام اور چوبی کندہ کاری :۔ ایک چوکور شوکیس میں ہوشیار پور، ڈیرہ اسماعیل خان،

پاکپتن، قصور اور فیروز پور کی لاکھ سے مزین اشیاء بڑے قرینے سے سجائی گئی ہیں۔ اسی شو کیس میں سہارنپور، پٹیالہ اور انبالہ کی چوب کاری سے آراستہ اشیاء کے نمونے بھی موجود ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ بہترین چیز قدیم کندہ کاری کا نمونہ ہے اور اس کو بادشاہ ہمایوں کے دور سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس میں شیشم کی لکڑی پر قرآنی آیات کندہ کی گئی ہیں۔ مرحوم نور احمد چشتی اس کو لاہور لائے۔ بالائی شیلف پر جڑاؤ کے کام سے آراستہ ایک صندوقچہ ہے۔ یہ عطیہ کے طور پر لاہور کے سابق ایگزیکٹو انجینئر رائے کنہیا لال نے دیا تھا۔ دیوار میں موجود الماری میں صوبے کی ہاتھی دانت میں کندہ کاری سے مزین اشیاء کے نمونے عمدگی سے سجائے گئے ہیں۔ ان اشیاء میں قابل ذکر دہلی سے منگوایا گیا ہاتھی دانت کا حقہ اور نیچا ہے۔ یہ رنگدار ہے اور امرتسر سے حاصل کردہ کنگھیاں، کاغذ تراش اور جیومیٹریکل ڈیزائنوں سے مزین تاش رکھنے کے آرائشی صندوقچے بھی ہیں۔ اس کام سے کاریگری اور فن کی صفائی اور ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ غالباً اس کام کی ابتداء سکھوں کے دور سے شروع ہوئی اور یہ لاہور، امرتسر، دہلی اور پنجاب کے دیگر علاقوں میں شروع کیا گیا۔

کاغذ کے آرائشی ڈیزائن اور منقش چوبی کام :۔ مندرجہ بالا کے آگے کاغذ کے آرائشی ڈیزائن قلمدان اور کشمیر میں بنائی گئی چھوٹی اشیاء کے نمونے ہیں اور اس کے علاوہ آبی رنگوں سے مزین اشیاء بھی ہیں جن کو بعد ازاں وارنش سے محفوظ کر لیا گیا ہے۔

درازی عمر کا عصا :۔ شیشے کے ایک بہت بڑے بکس میں قیمتی پتھر کے زیورات، پیالوں وغیرہ کے نمونے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم چیز ہے۔ اسے جوئی، عصائے درازی عمر (لغوی معنوں میں "خدا کرے") ہے۔ عام طور پر چین میں شادیوں پر دوست خیرسگالی کے طور پر درازی عمر کی خواہش کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

صنوبر کے درخت کی چھال پر لکھائی :۔ دیگر اشیاء پر مشتمل کیس میں پتوں پر لکھائی کا ایک نادر نمونہ بھی ہے۔ یہ کشمیر سے حاصل کی گئی صنوبر کے درخت کی چھال پر مشتمل کتاب ہے جو رگھو بان اور کمار سمبھو کی پشتک ہے اور کاغذ کی ایجاد سے قبل کے زمانے کا نادر نمونہ ہے۔ قدیم اور قرون وسطیٰ کے ہندوستان میں کھجور کا پتہ لکھنے کے لیے بہت زیادہ استعمال کیا جاتا تھا۔ کشمیر میں صنوبر کے درخت کی چھال بہت زیادہ استعمال ہوتی تھی اور آج کل بھی شملہ میں ہندو تاجر اسے اپنے حسابات کی کتابوں کے لیے استعمال کرتے ہیں (3)۔

دستکاریوں کے نمونے :۔ صوبے کی دستکاریوں کے نمونے مختلف اقسام پیش کرتے ہیں۔ بہاولپور اور ملتان کی ریشمی لنگیوں اور چار خانہ کپڑوں کے نمونے اس کے علاوہ مختلف قسم کے حقے،

افیم کے پائپ اور نسوار کی ڈبیہ وغیرہ، پتو کام کے نمونے، چھڑیوں اور ڈنگوریوں کی مختلف اقسام، حصار اور چنبہ کی کشیدہ کاری کے کام کے نمونے، ململ پر کشیدہ کاری کا عمدہ کام، سلوٹ کے بغیر دہلی کا جال کے انداز میں کشیدہ کاری کا کام، سنہری حاشیوں سے مزین ریشمی اور سوتی لنگیاں۔ کشیدہ کاری سے مزین چوکور شالیں، پھلکاری کا کام، پنجاب کے سوتی پرنٹ، ضلع بنوں سے حاصل شدہ لاکھ اور رنگ کے چھاپے دار ڈیزائنوں سے مزین خواتین کے ملبوسات نیز پشاور سے حاصل کردہ لاکھ کے نقش و نگار والے پردے۔

پھلکاری کا کام:۔ پھلکاری، سادہ کپڑے یا چادر پر ریشمی پھول بوٹے بنانے کا کام ہے۔ یہ کام تقریباً عورتوں کے سبھی طبقے کرتے ہیں اور پھول بوٹے مختلف شیڈوں اور رنگوں مثلاً لاکھ، سرخ، نارنجی، سبز، سنہری، سیاہ اور زرد رنگ سے رنگے گئے دیسی سوتی کپڑے پر بنائے جاتے ہیں۔ وہاں پر پھلکاری کا ایک ایسا کام بھی موجود ہے جس میں گہرے رنگ کے کپڑے پر چھوٹے چھوٹے گول آئینوں کے ٹکڑے بڑی مہارت سے سیئے گئے ہیں اور یہ اس ڈیزائن میں زبردست تاثر پیش کرتے ہیں۔ یہ آرائشی کام جامدانی، آڑھے ترچھے، مچھلی کی ہڈیوں اور چوکور ڈبوں کے ڈیزائن پر مشتمل ہے۔ کپڑے پر پھلکاری کا کام زیادہ تر زمینداروں کی خواتین پہنتی تھیں۔ وہ اپنا فارغ وقت اس کام میں گزارتی تھیں اور اس کو اپنے ملبوسات، زیر جاموں، پشوازوں اور چولیوں پر بناتی تھیں۔

تبت کے نوادرات:۔ تبت کے نوادرات کا بھی اچھا خاصہ ذخیرہ ہے۔ ان میں عبادت کے تھیلے، عبادت کی گھنٹی، کپڑے اور عبادت کی چھپائی کے لیے بلاک، بدھ مت کے پیروکار، لامہ کا قلمدان، فوت شدہ لامہ کی راکھ کا نشان، ایک لامہ کی کھڑائیں اور جھانجھ جن کو جوگی خود شناسی کے لیے استعمال کرتے تھے۔ یہ عطیہ ڈاکٹر جی ڈبلیو لیٹنر نے دیا۔

مشہور عمارات کے چوبی ماڈل:۔ ایک بہت بڑی میز پر کپور تھلہ کے ہندو مندر کے ماڈل بڑی خوبصورتی سے سجائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ بادشاہی مسجد لاہور، ڈیڑھ انچ سے ایک فٹ تک لمبائی کا پشاور کے ایڈروڈز گیٹ، امرتسر کے گھنٹہ گھر اور گوجرانوالہ کی بارہ دری کے ماڈل بھی بڑی خوبصورتی سے سجائے گئے ہیں۔

دستکاریاں برائے فروخت:۔ جنوبی راستے میں پنجاب کی دستکاریاں برائے فروخت ہیں۔ یہ عام طور پر بازار میں نہیں ملتیں۔ یہ زیادہ تر کشمیر اور پشاور کے تانبے کے برتنوں اور اشیاء، پنڈ داد خاں کی پتھر کی اشیاء، کشمیر کی کاغذی اشیاء، لیہ کے کھیسوں، ہوشیار پور کے ہاتھی دانت، جڑاؤ کے کام، لاہور کے برتنوں، بھیرہ کے خنجروں اور ہر قسم کے منقش سوتی کپڑوں وغیرہ پر مشتمل ہیں۔

موسیقی کے آلات :۔ موسیقی کے آلات کو انتہائی خوبصورتی سے اور مکمل طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ مختلف شکلوں اور جسامت کے ہیں اور مختلف ڈیزائن اور طرز پیش کرتے ہیں۔ ان میں بہت سے اپنے جدید اور انوکھے انداز اور آرائش کی شان و شوکت کے باعث توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔ مثال کے طور پر طاؤس کو مور کی طرز پر بنایا گیا اور اس پر نقش و نگار بھی اسی طرح بنائے گئے ہیں۔ مختلف اقسام کے ستار، آہنی اور پیتل کی تاروں سمیت ہیں۔ ستار نواز ان کو راگ کے مطابق آگے پیچھے کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بین ہے جس کو انگلی کے ذریعے بجایا جاتا ہے۔ رباب، آلہ موسیقی، قانون تار والا آلہ موسیقی ہے۔ سارنگی، تنبورہ یا مشرقی گٹار، طبلہ، نوبت اور مختلف اقسام کے سنکھ اور گھونگھے وغیرہ ہیں۔ پنجاب کے تمام آلات موسیقی قدیم روایتی طرز کے ہیں اور ہندوستانی، موسیقی کے جس فن سے واقف تھے وہ پنجاب میں زوال پذیر ہے اور یہی حال ہندوستان میں ہر جگہ ہے۔

سوتی دستکاریاں :۔ سوتی دستکاریاں بھی ہیں۔ لدھیانہ اور شاہ پور کی لنگیاں، پٹھانوں کے پہننے والے کھیس، الوان یا سلوس، عیسیٰ خیل کا رنگین گانٹھ دار کپڑا۔ پشاور کا السی کے تیل اور رنگ سے نقش و نگار سے مزین کپڑا جو عام طور پر آفریدی لاکھ دار کپڑے کے نام سے مشہور ہے اور ریشمی حاشیوں والے کھیس اور سوسی۔

اونی مصنوعات :۔ پنجاب کی اونی مصنوعات میں کشمیر کے پشم کا دھاگہ، امرتسر کی دہاب شاہی اون، رام پور کی اون، ہر قسم کے کمبلوں کے ڈیزائن، کابلی پشم کا دھاگہ، پشمینہ پر کشیدہ کاری، حاشیوں پر کشیدہ کاری سے مزین شالیں، پٹو، لوئیاں، کمبل اور قالین وغیرہ۔

ریشمی مصنوعات :۔ ایک دوسری دیوار پر پنجاب کی ریشمی مصنوعات کے نمونے ہیں۔ یعنی لنگیاں، رومال، سوسیاں، گلبدن، کنی، دوپٹے، دریائی، خام ریشم، کویا ریشم، باغ ککری، ساون بھادوں (حکوال) قندی باغ، گلاب پھلکاری اور دل کا کام ہے۔

ظروف سازی :۔ ظروف سازی کو نہایت عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ دہلی، ملتان اور بمبئی کے برتنوں کے نمونے موجود ہیں۔ اسی ذخیرے میں ایرانی طرز کی روغنی ٹائل کا نمونہ ہے۔ اس کے بارے میں خیال ہے کہ اس کا تعلق سترھویں صدی سے ہے۔ یہ عطیہ کرنل سر اولیور سینٹ جان، آر۔ ای۔ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی، نے دیا۔ پشاور کے روغنی برتن اور دیگر اشیاء بھی ہیں۔

روغنی ٹائلیں :۔ مظفر گڑھ، ملتان اور سندھ کی روغنی ٹائلیں ہیں۔ گوجرانوالہ کے کاغذی پیالے اور صراحیاں اور ہوشیار پور وغیرہ کے کوری مٹی کے برتن ہیں۔

پکی ہوئی سرخ مٹی کے مجسمے :۔ برتنوں کی الماری کے قریب ایک چبوترے پر سرخ مٹی سے

بنے جواہر سنگھ مستری، عجائب گھر لاہور اور بہادر کے مجسمے اور ضلع منٹگمری، پاکپتن کا لاکھ کا بنا ہوا لوٹن کبوتر۔ یہ جے۔ ایل۔ کپلنگ بہادر نے پیش کیے ہیں۔ اس کے علاوہ بی۔ ایچ۔ بی پوویل بہادر کی طرف سے پیش کردہ ڈنمارک کے برتن ہیں۔

غیر ملکی تجارت کی اشیاء :۔ غیر ملکی تجارتی اشیاء میں بخارہ اور سمرقند کے بازاروں میں فروخت ہونے والی روسی کمخواب اور ریشمی مصنوعات کے نمونے بھی موجود ہیں۔

مہاتما بدھ کے مجسمے :۔ شمال کی طرف والے راستے کی طرف آنے کے بعد ہمیں مہاتما بدھ کے قدیم مجسموں کا ذخیرہ دکھائی دیتا ہے جو حقیقی معنوں میں عجائب گھر کا اصل خزانہ ہے (4)۔

ڈائیونیسوس کے جلوس کی شبیہہ :۔ شیشے کی ایک الماری میں چاندی کی تھالی پر کھربائی طرز کی ملمع شدہ تصویر ہے۔ پہلے یہ بدخشاں کے میروں کی وراثت میں شامل تھی جو اپنے آپ کو سکندر اعظم کی اولاد بتاتے تھے۔ انہوں نے اس کو قندوز کے میر مراد بیگ کے دیوان بگی آتمام رام کو فروخت کر دیا۔ اس میں شراب اور عیش و نشاط کے دیوتا تبکیس کے جلوس کی تصویر بنائی گئی ہے۔

مہاتما بدھ کے تبرک کی تصویر :۔ اس کے علاوہ مہاتما بدھ کے تبرک پر مشتمل کھربائی طرز کی تصویر پر مبنی ٹھوس سونے کا ایک صندوقچہ ہے۔ اس پر لعل جڑے ہوئے ہیں۔ مسٹر میسن نے 1839ء میں اسے وادی کابل میں بیماران کے ٹوپا نمبر2 سے دریافت کیا۔ اس کا ذکر اور تصویر ولسن کی تصنیف 1841ء میں (Asiana Antiqua) ، (ایشیاء کے آثار قدیمہ) 1856ء میں " قدیم ہندوستان میں مسز سپائر کے شب و روز " اور برڈوڈ کی 1880ء کی تصنیف ، " ہندوستان کی دستکاریاں " میں ملتی ہے۔ اس کے بارے میں اصل کتاب انڈیا آفس لائبریری لندن میں ہے۔

شاہری بہلول کے آثار قدیمہ :۔ مندرجہ بالا کے قریب شیشے کے ایک چبوترے پر شاہری بہلول خانقاہ کے کمروں کے فرش سے دریافت ہونے والے مٹی کے کھلونے ہیں۔ بہلول کے شہر کی صفائی کے دوران اسی جگہ سے پتھر کے دو چراغ بھی ملے ہیں۔ ضلع ہزارہ میں سمل خند کے قریب گنڈ گڑھ پہاڑ سے ملنے والے پیتل کے برتن بھی ہیں۔

روکڑی کے کھریا مٹی کے مجسمے :۔ اسی درمیانی راستے میں ضلع بنوں کے پرگنہ میانوالی میں روکڑی سے دریافت شدہ کھریا مٹی کے مجسموں کا ذخیرہ ہے۔ ان میں مہاتما بدھ کے آٹھ سر، دنیا دار آدمیوں کے دس سر، اکینتھس دار السلطنت کا ایک بہت بڑا مرکز، بڑے دار الخلافہ کا ایک مرغول، دو دندانے، ایک کے سوراخوں میں شنگرفی رنگ ہے، شیر کے پانچ سر، چار چھوٹے بت اور چار

ہاتھوں والا لڑکا ایک تھال پکڑے ہوئے ہے۔

1868ء کے سیلابوں کے دوران دریائے سندھ نے مشرق کی جانب رخ کیا اور میانوالی سے چند میل آگے ایک قدیم بلند کنارے کو بہا کر لے گیا جس پر روکڑی کا چھوٹا سا قصبہ آباد ہے۔ جب دریا نے رخ موڑا تو وہاں دو ہم مرکز مدور دیواروں کی بنیادیں ننگی ہو گئیں اور ان میں سے بیشمار مٹی کی مورتیاں اور سانچے دریافت ہوئے (5)۔ ان آثار قدیمہ کو مسٹر پریسٹلی نے بڑی احتیاط سے جمع کیا اور لاہور کے عجائب گھر کو عطیہ کے طور پر دے دیئے۔ اس کے قریب والے ٹیلے اور شہر کے مکانوں کی کھدائی کرنے کے بعد کنکر اور بجری کے بیشمار سانچے دریافت ہوئے۔ ان کے ہمراہ بہت سی پرانی اینٹیں اور ویما، کیڈفائیسس، کنشکا، سمانتا دیوا اور واسو دیوا کے سکے بھی ملے۔ ان کے بارے میں جنرل کننگھم کی رائے ہے کہ ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ جگہ انڈوسکا تھیئن دور سے مسلسل باقبضہ چلی آ رہی ہے۔

یہاں پر ضلع راولپنڈی میں کالا سرائے کے قریب شاہ کی ڈھیری سے کھریا مٹی کے ٹکڑے دریافت ہوئے ہیں۔ زمین پر کسی قسم کی عمارت موجود نہیں ہے لیکن آثار قدیمہ کی کھدائی کے بعد اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہاں پر کسی زمانے میں بہت بڑا شہر تھا۔ ہو سکتا ہے قدیم ٹیکسلا ہی ہو۔ مٹی کی مورتیاں وادی سندھ میں کوکری سے ملنے والے بتوں سے بڑی حد تک مماثلت رکھتی ہیں۔ اصل میں ان پر رنگ کیا گیا تھا۔

زمانہ قبل از تاریخ کے کھنڈرات :۔ عجائب گھر میں اب زمانہ قبل از تاریخ کے کھنڈرات میں سے اشیاء کا جو ذخیرہ ہے وہ قدیم پتھر کے دور کے اوزاروں، زیادہ تر وسطی ہندوستان کے اوزاروں پر مشتمل ہے۔ یہ جنرل کننگھم نے پیش کیے ہیں۔ باندہ کے قریب واقع مقام سے کھاڑیاں، پتھر کا پاؤڈر، پتھر کی تختیاں، سلوں کے باریک ٹکڑے، کھرپیاں، ملائم سلیں، باندا، ہمیر پور، ریواہہ، جودھ پور وغیرہ سے دستیاب ہونے والی گول سلیں، پتھر کے ہتھوڑے، سوات سے ملنے والی سنگ سماق کی ملائم اور چمکدار سلیں۔ زمانہ قبل از تاریخ کے یہ ٹکڑے کاریگری اور شکل و صورت میں بڑی حد تک یورپ اور انگلستان کے اسی قسم کے کھنڈرات سے ملنے والی اشیاء سے مماثلت رکھتے ہیں اور اس بات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انسانیت حالانکہ دنیا میں ہر جگہ اپنی اپنی حیثیت میں جدا ہو گئی لیکن ان میں ایک ہی جبلت پائی جاتی ہے مثلاً خوراک اور زندگی کی دیگر ضروریات کو حاصل کرنے کے لیے ان میں ایک جیسا رویہ نظر آتا ہے اور ان کی زندگی میں عادات کی یکسانیت پائی جاتی ہے۔

خام پیداوار :۔ داخلی کمرے کے دائیں جانب ملک کی خام پیداوار مثلاً سبزیاں، معدنیات اور

جانوروں کا ذخیرہ ہے۔ یہ زیادہ تر پشاور کے شمال میں باجوڑ کے فولاد، سرمہ، پہاڑیوں کے مختلف مقامات کے سیسہ، گڑگاؤں اور حصار کے اضلاع کی کانوں میں پائے جانے والے تانبے، کوہ سلیمان میں کالا باغ کے قریب ڈیرہ غازی خاں کے مغرب میں اور پنڈ دادنخاں میں کوہ نمک سے دستیاب ہونے والے مختلف اقسام کے کوئلے، جہلم، سندھ اور اس کے ساتھ ملحقہ پہاڑیوں کے درمیان کوہ نمک سے چٹانی نمک بڑی مقدار میں دستیاب ہوتا ہے۔ شورہ، کالا باغ اور کالکی میں پھٹکڑی کی مصنوعات، عمارتی پتھروں کے نمونہ جات پر مشتمل ہے۔ جپسم کوہ ہمالیہ اور کوہ نمک سے دستیاب ہوتا ہے۔ اس کو مہاتما بدھ کے زمانے میں پلاسٹک کے فن میں بہت زیادہ استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ پنجاب میں لگنے والی مختلف اقسام کی لکڑی کے بہت سے نمونہ جات ہیں۔

کوبرا اور رینگنے والے جانور:۔ رینگنے والے جانوروں کے ذخیرہ میں سانپوں، بچھوؤں، کچھوؤں چھپکلیوں، گھڑیالوں اور مگرمچھوں کی بہت سی اقسام شامل ہیں۔

پرندے:۔ شیشے کی الماریوں میں خوبصورت پرندوں اور تتلیوں کا بہت بڑا اور خوبصورت اقسام کے پودوں سے مختلف اقسام کے ریشہ جات کے نمونے بھی پیش کیے گئے ہیں (6)

جین مت کے مجسمے:۔ درمیانی ہال کے وسط میں انتہائی دلچسپی کے حامل قدیم یادگاری مجسمے ہیں۔ ان میں حصار سے اٹھارہ میل کے فاصلے پر شمال مشرقی جانب بار والا کی مسجد کی دیواروں میں قدیم جین مت کی مٹی کی مجسمہ سازی کا ایک حصہ بھی ہے۔ اس کی پشت پر سلطان غیاث الدین بلبن 680 ہجری (1281ء) کی طرف سے عبارت درج ہے۔ بعد ازاں مسجد کو مسمار کر دیا گیا اور ستون کو سابق آرکیالوجیکل سرویئر (آثار قدیمہ کے سرویئر) سی۔ جے۔ راجرز بہادر نے ایک کنویں سے دریافت کیا۔

اسی طرف میز پر ضلع جہلم میں چواء سیدن شاہ کے مضافات میں مرتی کے علاقہ سے ملنے والے جین مت کے مجسموں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔

ہندو دور کا ستون:۔ اس ہال کے مجسموں میں سب سے نمایاں چیز جہلم کے قریب پانی کے ایک قدیم حوض کے قرب و جوار میں کھدائی کے دوران ملنے والا قدیم ہندو دور کا ایک ستون ہے۔ یہ عطیہ کے طور پر جہلم کے سابق ڈپٹی کمشنر لیفٹیننٹ کرنل برسٹو نے پیش کیا تھا۔ اس کے علاوہ ہنسی کے قلعہ میں سید نعمت اللہ کے مزار کے مہمان خانے کی دیوار میں تعمیر کردہ قدیم جین مت کا ایک مجسمہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ جین مت کے چند دیگر نوادرات ہیں۔ پشاور کے قریب تخت بھائی سے ملنے والا ایک پتھر ہے جس پر مغربی ایشیاء کی زبان پالی کی عبارت درج ہے۔ پروفیسر ڈاسن نے اس

کا ترجمہ یوں کیا ہے:۔

"عظیم بادشاہ گونڈا فیرس کے 26 ویں سال (اور) سمو اتسارہ کے سو سال کے مہینہ دیسا کھا کا تیسرا دن" (اگر بکرماجیت کا سموت ہی مطلب ہے تو تاریخ 14 اپریل 56ء بنتی ہے)۔

ہندوستانی پھلوں اور سبزیوں کے نمونے:۔ شیشے کی ایک بلند الماری میں مقامی فنکاروں کے تیار کردہ ہندوستانی پھلوں اور سبزیوں کے مٹی کے نمونے ہیں۔ اس کے علاوہ بھوانی، انبالہ چھاؤنی کے بنے ہوئے بھی موجود ہیں۔ اس سے آگے انہی نمونوں کا ایک اور ذخیرہ ہے جو انگریزی طرز کے نمونوں پر مشتمل ہے اور اس کو سٹن اینڈ کمپنی لندن نے عطیہ کے طور پر پیش کیا ہے۔

پنجاب کی زراعت کا نمونہ:۔ عجائب گھر میں دلچسپ اور قابل ذکر اشیاء میں پنجاب کی زراعت کی عکاسی کرنے والے نمونے ہیں جن میں جٹ زمینداروں کو کھیتوں میں اپنے بیلوں کے ہمراہ ہل چلاتے اور دیگر زراعتی کام کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ان مورتیوں کو قد آدم کی جسامت پر لاہور میو سکول آف آرٹس کے پرنسپل جے۔ ایل۔ کپلنگ بہادر کی زیر نگرانی تیار کیا گیا ہے۔

سینگ اور جانوروں کے سر:۔ ملک کے مختلف علاقوں کے جانوروں کے سینگوں اور سروں کا ذخیرہ مغربی دروازے کی آخری دیوار پر آویزاں کیا گیا ہے۔ ہر ایک کے نیچے کاغذ کی پٹی پر اس کے بارے میں انگریزی اور مقامی نام اور وضاحت درج ہے۔

عجائب گھر میں قدیم دور کی مندرجہ ذیل اشیاء بھی قابل ذکر ہیں:۔

رومن دور کے نوادرات:۔ پشاور کے قریب کارامار پہاڑی سے دریافت ہونے والے مجسمے بلاشک و شبہ انتہائی قدیم اور اعلیٰ طرز کے ہیں۔ غالباً ان کا تعلق قدیم رومن دور سے ہے۔

اپرٹوپا احیب کے مجسمے:۔ جلال آباد میں اپرٹوپا احیب، سے ملنے والے مجسموں کے ٹکڑے جو زیادہ تر کھریا مٹی کے ہیں۔ ان کو عطیہ کے طور پر مسٹر سمپسن نے دیا تھا جو شمالی افغانستان میں فوجی کارروائی کے دوران "السٹریٹڈ لنڈن نیوز" کے نامہ نگار تھے۔

ساسانی چاندی کے سکے: ساسانی چاندی کے سکے ضلع کانگڑا سے ملے ہیں اور یونانی ستونوں کے ٹکڑے، شاہ کی ڈھیری سے کھدائی کے بعد دریافت ہوئے ہیں۔

ہندو دور کے سکے:۔ نصف درہم کے اپولوڈوٹس کے ہمراہ عجیب و غریب اقسام کے چاندی کے سکے ضلع کانگڑا میں جوالا مکھی کے میدان میں سے دریافت ہوئے ہیں۔ ایمینٹاس، اینٹیالکوڈز، مندر اور دیگر نصف درہم کے سکے ضلع دہلی میں سون پت سے ملے ہیں۔ نیز مندر اور اپولوڈوٹس کے سکے راولپنڈی کے قریب ایک ندی سے ملے ہیں۔

پتھر کے ٹکڑے :۔ ضلع بنوں کے اکرا کھنڈرات میں سے 72-1871ء میں کندہ کاری سے مزین دو سنگین ٹکڑے ملے ہیں۔ ایک عقیق کا ہے اور اس پر نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔ دوسرے پر عبارت درج ہے اور یہ ایک چٹانی پتھر کا چھوٹا سا ٹکڑا ہے۔

مہاتما بدھ کے چند یونانی مجسمے :۔ محافظ دستے کے کیپٹن ہنٹر نے 72-1871ء میں یوسف زئی میں موضع سوالوا کے بقریب ایک خانقاہ کے کھنڈرات میں مہاتما بدھ کے چند یونانی مجسمے دریافت کیے۔ یہ مجسمے ٹکڑوں کی شکل میں ہیں۔ ان میں سے چند آرائشی تعمیرات کے نمونے ہیں اور دیگر اشیاء پر دیو مالائی واقعات اور مذہبی تاریخ کی عکاسی کی گئی ہے اور ان میں سے چند علیحدہ اور منفرد طرز کے بت ہیں۔

ہندوؤں اور مغربی ایشیاء کے دور کے سکے :۔ ہندوؤں کے سکے غالباً ساون آشترا دور کے ہیں۔ یہ ضلع پشاور میں بلند پور کے قریب ایک میدان کی کھدائی کے بعد ملے ہیں۔ اس کے علاوہ بیکٹرین اور انڈو سکا تھین دور کے سکے سیالکوٹ شہر کے قریب دریافت ہوئے ہیں۔

شاہ کی ڈھیری سے ملنے والے مجسمے :۔ ضلع راولپنڈی میں شاہ کی ڈھیری سے مجسموں اور مورتیوں کے سترہ دلچسپ حصوں کے علاوہ گروہ کی شاندار تصویر بھی ملی ہے۔ وہاں پر پرانے شہر (کننگھم کا خیال ہے یہ قدیم ٹیکسلا تھا) کے وسیع کھنڈرات ہیں۔ اس کے علاوہ مہاتما بدھ کے دو سنگین مجسمے ہیں۔ ایک کھڑی حالت میں اور دوسرے میں بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ پشاور کے مجسموں کی طرح دونوں ایک ہی رنگ اور سلیٹ پتھر کے ہیں۔

انڈو۔ سکا تھیئن دور کے طلائی سکے :۔ انڈو۔ سکا تھیئن دور کے سکے پٹیالہ کے قریب 69-1868ء کی کھدائی کے دوران دریافت ہوئے اور یہ مہاراجہ نے عطیہ کے طور پر پیش کیے۔

چاندی کے ٹوٹے پھوٹے سکے :۔ سوفائٹس کا ایک نقرئی سکہ یوکریٹائیڈز کا ایک تمغہ، یہ دونوں نہایت نادر اور اچھوتے نمونوں کے حامل ہیں۔ ان کی پشت پر ہیلی او کولز اور لاؤڈائس کے چہروں کی تصاویر ہیں۔ اس کے علاوہ "سلیوکوس" کے نام سے مزین چاندی کا ایک سکہ ہے جس کے بارے میں خیال ہے یہ نادر اور انوکھا ہے۔

پتھر کا ایک قدیم ستون :۔ پتھر کا ایک ستون جس کے اوپر ایک بہت بڑا انسانی سر آویزاں ہے۔ اس کو 67-1866ء میں ضلع راولپنڈی میں شاہ کی ڈھیری کے قریب کھدائی کے بعد دریافت کیا گیا۔

امب اور تھانیسر کے مجسمے :۔ ضلع شاہ پور میں امب سے ملنے والے انتہائی دلچسپ مجسمے اور کیتھل تھانیسر اور اگروہا کے مضافات سے ملنے والے ہندو دور کے مجسموں کے چند ٹکڑوں کو 89-1988ء میں عجائب گھر کے ذخیرے میں شامل کیا گیا۔

مہاتما بدھ کے مجسمے :۔ 1889ء کے لگ بھگ مردان کے اسسٹنٹ کمشنر نے سکری کے مقام پر جو موضع سوال دھار سے زیادہ فاصلے پر نہیں اور جہاں پہاڑی کی وادی میں جمال گڑھی کے کھنڈرات موجود ہیں، مہاتما بدھ کے چند دلچسپ آثار دریافت کیے۔ لاہور کے عجائب گھر میں جو سب سے زیادہ دلچسپ مجسمہ بھیجا گیا ہے وہ مہاتما بدھ کا بیٹھی ہوئی حالت میں بنایا گیا ہے جو ان کے گیان کو ظاہر کر رہا ہے۔ یہ انتہائی نفیس نمونے کا مجسمہ ہے اور اپنی طرز کے لحاظ سے کافی قدیم معلوم ہوتا ہے۔

ضلع کرنال میں پیہووا سے ملنے والی، پتھر کی قدیم تختی :۔ اسی سال ضلع کرنال میں پیہووا کے مقام پر "سدھیر کی حویلی" سے عجائب گھر کے لیے پتھر کی ایک تختی بھیجی گئی۔ پتھر پر درج عبارت جو ابھی بالکل صحیح حالت میں ہے اس سے سر اچ کننگھم اندازہ لگاتے ہیں کہ اس کا تعلق 11 ویں صدی عیسوی سے ہے۔

عجائب گھر لاہور میں مہاتما بدھ کے مجسمے

عجائب گھر میں موجود سب سے زیادہ قیمتی اشیاء اور زائرین کے لیے سب سے زیادہ دلچسپی اور دلکشی کا سامان ضلع پشاور میں یوسف زئی سے ملنے والے نوادرات اور آثار قدیمہ ہیں جن کو بائیں جانب کے درمیانی راستہ میں بڑے قرینے سے سجایا گیا ہے۔ ہندوستان کی اس قدیم تاریخ کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے جس کے ساتھ ان نوادرات اور آثار کا تعلق ہے، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ابتداء کے علاقے پنجاب کی اولین تاریخ کا ایک مختصر خاکہ پیش کر دیا جائے۔

آریاؤں کی نقل مکانی :۔ جب قدیم زمانے میں اس عظیم قوم آریہ نے وسطی ایشیاء میں اپنے مشترکہ پڑاؤ سے مشرقی اور مغربی ملکوں کی طرف نقل مکانی شروع کر دی۔ شہر آباد کرتے اور بادشاہتیں قائم کرتے ہوئے اس نسل کی مشرقی شاخوں میں سے ایک کابل میں خیبر کے تنگ درے کی طرف بڑھی۔ رگ ویدا کے اولین بھجنوں میں ان دروں کے شمال میں ہندوستانی شاخ کا پتہ چلتا ہے۔ وہ سب سے پہلے جن علاقوں میں آباد ہوئے ان میں سے ایک برہماورتہ بھی ہے جو ضلع انبالہ میں گھگر اور تھانیسر میں سرسوتی کے مقدس دریاؤں کے درمیان ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی

آبادی پنجاب کے پانچ دریاؤں تک پھیلتی گئی۔ ویدک کے بھجنوں میں دریائے سندھ کی بہت زیادہ تعریف و توصیف ملتی ہے (دولت عطا کرنے والا بہت مشہور ہے) انہوں نے دریائے سندھ کے ساتھ اپنی آبادیوں اور اپنے ملک سے مشرق کے پانچ دریاؤں کی طرف ہجرت کے دوران بھجن تیار کیے۔ ان کی عظیم ہجرت کے زمانہ کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا لیکن یورپی عالم فلکیاتی زائچہ کے مطابق اندازہ لگاتے ہیں کہ یہ لازماً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے تقریباً 2200 سال قبل کی گئی۔

وقت گزرنے کے ساتھ مذہبی خاندانوں کو تشکیل کیا گیا اور ہندوؤں کی چار مذہبی ذاتیں پروان چڑھیں۔ مثلاً برہمن (رشیوں کے خاندان سے ایسے پیشوا پیدا ہوئے جنہوں نے ویدک کے بھجن لکھے یا عظیم قبائلی قربانیاں پیش کیں) شتریہ (جنگجو یا بادشاہ کے ساتھی) ویسیاس (کسان یا کاشتکار) اور شودر (حقیر یا غلام قوم، قدیم مفتوح قوموں کی باقیات)۔

برہمنوں کی بالادستی:۔ اس کے بعد مذہبی اور جنگجو قوموں کے درمیان زبردست مقابلہ ہوا اور نتیجتاً برہمنوں کی بالادستی قائم ہو گئی۔ برہمن اس بات کا دعویٰ کرتے تھے کہ انہیں لازوال خدائی علم حاصل ہے۔ ان کی خصوصی عمل داری مذہب، علم الکلام اور فلسفہ میں تھی۔ ان کے ادب کی ایک شاخ منو کی شاستر تھی جسے راجاؤں کی رہنمائی کے لیے وضع کیا گیا تھا۔

چھٹی صدی کے آخر میں آریہ قبائل، پنجاب کے قدیم دریاؤں کے پار تک کے علاقوں میں پھیل گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فلسفی، واعظ، قواعد دان اور شاعر اس ادب سے پروان چڑھے۔ نئے دیوتاؤں کی عبادت شروع کی گئی۔ حالانکہ برہمنوں میں مذہبی قربانی کی سخت پابندی تھی لیکن وہ لادینیت کے بلاشرکت غیرے وارث نہیں تھے۔ جوگیوں میں پاکیزگی کا رجحان بڑھا اور یہی چیز دوسری قوموں میں بھی پروان چڑھی لیکن ان میں سے سفری منطق دان، گوشہ نشین راہب، بیراگی اور سنیاسی زیادہ ابھر کر سامنے آئے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنی باری پر زندگی کے اسرار کو حل کرنے کی کوشش کی۔

مہاتما بدھ کی پیدائش:۔ تقریباً یہ وہی دور تھا جب کپلوستو کے راجہ سدھودانہ کے ہاں گوتم بدھ جن کو بعد میں مہاتما بدھ کہا جاتا تھا کی پیدائش ہوئی۔ یہ جگہ دراصل آریاؤں کے ایک قبیلے سکیاس کا بنارس شہر سے 100 میل کے فاصلے پر شمال مشرقی جانب دریائے کوہانہ کے کنارے پر آباد کردہ علاقہ تھا۔ وہ (مہاتما بدھ) 622 قبل مسیح میں پیدا ہوئے اور اس مذہب کی بنیاد رکھی جس کو نسل انسانی کے 500 ملین افراد نے اختیار کیا یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کی ایک تہائی آبادی

نے اس مذہب کی پیروی کی۔ مہاتما بدھ نے اپنے مذہب میں ذات پات کے نظام کو ختم کر دیا۔ ان کے مذہب کی الہامی تعلیم یہ تھی کہ نروان (انتہائی مسرت کا مرحلہ) نیچ سے نیچ ذات کے افراد کو بھی حاصل ہو سکتا ہے اور دوبارہ زندگی (تناسخ) قابل فخر ہے اور یہ کہ ہر آدمی میں حقیقی مسرت کو حاصل کر کے نجات کے راستے کی طرف چلنے کی گنجائش ہوتی ہے۔

درانتی بردار (سکا تھیئن) قوم کا حملہ :۔ سکندر کے حملہ سے کافی عرصہ قبل درانتی بردار قوم کے گروہوں نے جن کے بارے میں جنرل کننگھم کا خیال ہے کہ وہ تورانیوں کی نسل سے تھے، وسطی ایشیاء سے ہجرت کی اور ہمالیہ کے شمال مغربی دروں کے راستے پنجاب میں داخل ہو گئے۔ ڈاکٹر ہنٹر کے مطابق اس بات کے کافی اشارے ملتے ہیں کہ اس قوم کی ایک شاخ نے 625 قبل مسیح میں ایشیا کو تخت و تاراج کیا اور بٹالہ کی طرف بڑھے۔ اس کے بعد دریائے سندھ کے راستے سندھ کے دارالحکومت حیدر آباد پہنچ گئے۔

پنجاب کی جٹ قوم کی اصل :۔ موجودہ دور کے جاٹوں کو جٹیائی قوم سے منسوب کیا جاتا ہے اور یہ پنجاب کی 1/5 آبادی پر محیط ہیں۔ ان کے بارے میں خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ قدیم درانتی بردار قوم (سکا تھیئن) کی اولاد ہیں۔ انہوں نے مشہور شہر ٹیکسلا آباد کیا جس کے بارے میں جنرل کننگھم نے دریائے سندھ کے مشرق میں شاہ کی ڈھیری میں پتہ چلایا ہے۔

سکندر 327 قبل مسیح :۔ جب سکندر اعظم 327 قبل مسیح کے اوائل میں پنجاب میں داخل ہوا تو اس نے ایک گنجان آباد اور متمول شہر کی بنیاد رکھی جو ٹیکسلا کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ شہر دریائے سندھ اور دریائے جہلم کے درمیان سب سے بڑا شہر تھا۔ یہ فاتح جب بیاس کے قریب پہنچا تو اس کے فوجی دستوں کے غل غپاڑہ نے اسے واپس اپنے وطن لوٹ جانے کے لیے مجبور کر دیا۔ اس کی وفات کے بعد سلطنت تقسیم کرنے پر مغربی ایشیا (بیکٹریا) اور پنجاب، اس کے جنرل سلیوکس نیکیسٹر کے حصہ میں آئے۔ تقریباً اسی زمانے میں ہندوستان میں ایک نئی طاقت ابھر کر سامنے آئی۔

چندرا گپتا :۔ چندر گپت کو وادی گنگا سے جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ وہ پنجاب میں اسکندر کے پڑاؤ کے ساتھ ایک مہم جو کی حیثیت سے شامل ہو گیا لیکن اپنی بے باکی کی وجہ سے مقدونیہ کے حکمران کے ساتھ اس کی ذاتی رنجش ہو گئی۔ اس بناء پر اسے وہاں سے بھاگنا پڑا۔ اس کا خمیازہ بعد میں اسے جلد ہی بھگتنا پڑا تھا۔ اپنے ارد گرد پنجاب کے قبائل کو جمع کرنے کے بعد اس نے مگادھا (بہار) کی حکومت پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ اس نے یونانی فوجوں کو پنجاب سے باہر نکال دیا اور باقی حکومتوں، یونانیوں

اور مقامی حکمرانوں کو اپنی حکومت تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا۔ سیلیوکس نے دریائے ستلج کو عبور کر لیا اور اپنے ہندوستانی مد مقابل پر کئی فتوحات کیں لیکن اپنے علاقوں کا دفاع کرنے کے لیے اس کو واپس بلا لیا گیا تو اس نے ہندوستانی حکمران کے ساتھ صلح کر لی اور پنجاب سے پشاور تک کا علاقہ اس کے حوالے کر دیا۔ نہ تو چندر گپت اور نہ ہی اس کا بیٹا بندوسار مہاتما بدھ کے پیروکار تھے لیکن ان کی تیسری نسل میں پیاداس جو پالی میں، اشوک کے نام سے زیادہ مشہور ہے، وہ اس مذہب کا زبردست حامی بن گیا۔ اس نے خانقاہیں اور پگوڈے بنوائے اور راہبوں کو زندگی کی ضروریات بہم پہنچائیں۔ اس نے عوام کی تفریح اور ذوق طبع کے لیے باغات لگوائے۔ جانوروں اور انسانوں کے لیے ہسپتال قائم کیے۔ اس نے اپنی سلطنت کے تمام امور سے متعلقہ اور ایک پاکیزہ اور مفید زندگی بسر کرنے کی ضرورت کے بارے میں فرمان شائع کروائے۔ پراکرت زبان میں لکھے گئے اسی کے فرمان پشاور سے دہلی، الہ آباد، بہار اور اوڑیسہ کی حدود میں واقع ستونوں اور چٹانوں پر درج نظر آتے ہیں اور آج کل بھی درست حالت میں دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بلند حوصلہ، برداشت اور نیکی کی عظیم یادگار ہیں۔

پنجاب پر تورانیوں کا آخری حملہ:۔ اس کے بعد ہندوستانی سورماؤں کا دور شروع ہوتا ہے جنہوں نے پہلی صدی عیسوی کے بعد اور قبل سکا تھیئن کا زبردست حملہ پسپا کر دیا تھا۔ جنرل کننگھم نے اسے تورانیوں کا آخری حملہ کہا ہے۔ ان سب میں نمایاں اجین کا مشہور بادشاہ وکرما جیت تھا جس نے شمالی فوجوں کا بڑی کامیابی سے مقابلہ کیا۔ اس نے سکا تھیئن شہزادوں کو پنجاب سے باہر نکال دیا اور وحشیوں پر زبردست فتح حاصل ہونے کے بعد اس کے عہد (56 قبل مسیح) کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کے ساتھ ہی پورے جزیرہ نما ہندوستان پر اس کو فتح حاصل ہو گئی۔ تاہم اس کے مرنے کے بعد پوری سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ اس کے بعد سکا تھیئن کا ایک تازہ گروہ 20 قبل مسیح میں دوبارہ پنجاب کی طرف بڑھا، اس کو تخت و تاراج کرنے کے بعد انہوں نے نئی بادشاہت کی بنیاد رکھی اور اس کو کیڈفائسس کا نام دیا۔ پہلی صدی عیسوی تک حکومت کرنے کے بعد اس خاندان کو سکا تھیئن کے نئے گروہ نے کانیکری بادشاہوں کی سرکردگی میں نکال باہر کیا۔

ساسانی بادشاہ:۔ ان کے بعد تیسری اور چوتھی صدی عیسوی میں ساسانی بادشاہوں کا دور شروع ہوتا ہے۔ ان کو سفید ہنوں اور چھوٹے اچی (جنہوں نے بڑی کامیابی سے وادی کابل پر قبضہ کر لیا تھا) نے منتشر کر دیا تھا۔ یہ دور 700 عیسوی تک یا سندھ اور ملتان پر 711 عیسوی میں مسلمانوں کی فتح سے کچھ عرصہ پہلے تک پھیلا ہوا ہے۔ کابل میں ساسانی خاندان کے جانشین ہندو

بادشاہ بنے جنہیں تاتاری سبکتگین نے نیست و نابو کر دیا تھا۔ جب چینی سیاح فاہیان نے پندرہویں صدی کے اوائل میں پنجاب کا دورہ کیا تو اس نے دیکھا کہ ملک میں بدھ مت عروج پر ہے اور بعد میں (640ء - 630ء) جب ایک دوسرے چینی زائر ہیون سانگ نے اس علاقے کا دورہ کیا تو حالانکہ برہمن بکثرت تھے لیکن اس کے باوجود بدھ مت سرکاری مذہب تھا۔

خلاصہ :۔ مندرجہ بالا خلاصہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس ملک پر مسلمانوں کی فتح سے قبل یکے بعد دیگرے کئی خاندانوں اور قوموں کا قبضہ مندرجہ ذیل ترتیب سے ہوتا رہا ہے۔

1 - سکا تھیئن یا تورانیوں کا ابتدائی دور 625 ق ۔م سے 250 ق ۔م

2 - انڈو ۔ گریشیئن دور 250 ق ۔م سے 57 ق ۔م

3 - انڈو ۔ سکا تھیئن یا تورانیوں کا آخری دور 57 ق ۔م سے 220ء

4 - ہند ۔ ساسانی دور 320 ۔ سے 700ء

5 - قرون وسطیٰ کے برہمنوں کا دور 700ء سے 1200ء

6 - برہمنوں کا جدید دور 1200ء سے 1750ء

پہلے کو چند عالم حضرات مغربی ایشیا کے یونانیوں کا دور کہتے ہیں۔ وادی کابل میں یونانیوں کی خود مختار بادشاہت کے قیام کے بعد ختم ہو گیا۔ اس دور میں ہندوستان کے ناتراشیدہ کاریگروں کو یونان کے اہل حرفہ سے پہلی مرتبہ رابطہ پیدا کرنے کا موقع میسر آیا۔

دوسرے دور میں شمال مغربی ہندوستان کے فن مجسمہ سازی پر یونانیوں کا شدید اثر پڑا اور اس سے عمارتی ضرورتوں میں پہلی مرتبہ زبردست تحریک پیدا ہوئی۔ شیر کے سر والے ستونوں کا بمعہ بیل بوٹوں کے حاشیوں، موتی دار سانچوں کا تعلق تیسرے دور سے ہے اور یہ یونانی ڈیزائن کی نقل اور ہندوستانی فن کے شاندار نمونے ہیں۔

جنرل کننگھم کے مطابق ضلع پشاور کی سب ڈویژن یوسف زئی میں کھنڈر شہروں کی کھدائی کے بعد ملنے والے بدھ مت اور جین مت کے مجسموں اور ستونوں کا تعلق تیسرے یا ہند سکا تھیئن دور سے ہے۔ یہ آثار قدیمہ آج کل لاہور کے عجائب گھر کی زینت ہیں۔ ابرق دار بھربھرے پتھر میں تراشیدہ چہرے اور یک رخی تصاویر اگرچہ یونانی فنکاروں ہی کا شاہکار نہیں ہیں بلکہ اپنی تفصیل اور طرز کے لحاظ سے خالصتاً یونانی ہیں۔ ان سب میں مہاتما بدھ کے بارے میں عکاسی کی گئی ہے۔ انہیں ایک عالم فاضل بادشاہ، راہب، گوشہ نشین، معلم اور جوگی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی زندگی کے مختلف واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ انسانی شکل کو جس سادگی اور دیانتداری

کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور ڈیزائن میں ظاہر ہونے والا جذبہ، آزادی خیال اور انوکھا پن ہندوستان کے عام مجسمہ سازی کے اسلوب سے زبردست تضاد پیش کرتا ہے۔ ایک خاص فرق، اس کی طرز کی صفائی اور نازکی میں ملتا ہے۔ اس کی یکسانیت اور سچائی میں جس کے ذریعے تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ حقیقی زندگی کے مناظر اور حرکات و سکنات، فطرت کے مطابق پیش کیے گئے ہیں۔ اس میں فنکار کی ڈرامائی قوت کارفرما نظر نہیں آتی ہے۔

یونانی طرز یا اسلوب جس کے بارے میں پنجاب اور کابل کی مجسمہ سازی میں پتہ چلتا ہے اور جہاں یونانی بڑے زور شور کے ساتھ آباد ہوئے تھے، جوں جوں ہم مشرق کی طرف بڑھیں اس کا تاثر کم ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ ساسانیوں کے اسلوب کے تاثر کے سامنے بالکل ختم ہو جاتا ہے۔

چوتھا یا ہند ساسانی دور شمالی ہندوستان میں عظیم سیاسی تبدیلیوں کے لیے مشہور ہے۔ اسی دور کے اختتام پر کابل کے برہمن خاندان نے آخری ہند۔ سکاتھیئن حکمرانوں کو یکسر اکھاڑ پھینکا۔

پانچواں دور اس زمانہ سے متعلق ہے جب اٹھارہویں صدی کے آغاز پر برہمنوں کی حکومت کا ہندوستان میں احیاء ہوا۔ جنرل کننگھم اس کو برہمنوں کا جدید دور کہنا پسند کرتے ہیں کیونکہ اس دور میں مہاتما بدھ کا مذہب ہندوستان میں ابھی تک قائم و دائم تھا لیکن اس مین زوال کے اشارے بھی پہلے ہی سے دکھائی دے گئے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ سکوں میں بھی اچھی خاصی تبدیلی نظر آتی ہے۔ ان کو برہمن شہزادوں کی حکومت میں خاص شکل میں بنایا جاتا تھا۔ ان میں نمایاں نقوش میں کوہان دار بیل اور چار بازوؤں والی دیوی ہے۔ اس دور کے مندروں، مجسموں اور عمارتی آثاروں میں برہمنوں کی دیو مالا کی زبردست عکاسی کی گئی ہے۔

چھٹا یا برہمنوں کا جدید دور اس لیے مشہور ہے کہ اس میں اسلام کے متعارف ہونے کے بعد ہندوؤں کی طاقت بالکل ختم ہو گئی۔ چند نہایت شاندار مندر جن کا مقابلہ مسلمانوں کی فتح سے قبل ہندوؤں کے خوشحال دور میں بننے والی خوبصورت عمارات سے نہیں کیا جا سکتا، اس دور میں تعمیر کیے گئے لیکن مسلمانوں نے ان سب کو مسمار کر دیا اور انہیں پائمال کیا۔ گیلری کے بائیں جانب مجسموں کے بارے میں تفصیلی بیان پر مشتمل جنرل کننگھم کا ایک نوٹ کھلی حالت میں رکھا گیا ہے۔ ذیل میں اس نوٹ کے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

" ان تمام مجسموں کو دریائے سندھ کے مغرب میں قدیم گندھارا پشاور کے صوبہ سے دریافت کیا گیا ہے۔ ان نمونہ جات میں سب سے زیادہ دلچسپ ایک بت ہے جس میں ایک بادشاہ کو بیٹھے ہوئے اور ہاتھ میں شاہی عصا تھامے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس کو پشاور کے مغرب میں تقریباً

5 میل کے فاصلے پر تکل کے مقام پر کھدائی کے بعد حاصل کیا گیا تھا لیکن ان کو زیادہ تعداد میں پشاور کے شمال مشرق میں ضلع یوسف زئی میں مختلف مقامات سے دریافت کیا گیا اور خاص طور پر تخت بائی، جمال گڑھی، شاہبر بہلول اور نوگرام کے مقامات سے بھی خاصی مقدار میں ملے ہیں۔"

یہ مجسمے زیادہ تر اس اسلوب سے تعلق رکھتے ہیں جنہیں ابھری ہوئی تصویروں کا فن کہا جاتا ہے۔ عام طور پر تصاویر مکمل ہیں ماسوائے پس منظر کے گروہ کے حتیٰ کہ مہاتما بدھ کی علیحدہ تصاویر بھی ابھری ہوئی شکل میں ہیں۔ مجسمے کے عقب میں سر کے ارد گرد گول چکر ہے جس کو دیوار کے ساتھ یا ایک علیحدہ مندر میں یا ایک سٹوپا کے تہہ خانے میں دو دیواری ستونوں کے درمیان بنایا گیا ہے۔ کھنڈرات کے جن دو اہم مجموعوں کی کھدائی کی گئی ہے ان میں تخت بائی اور جمال گڑھی نمایاں ہیں۔ اول الذکر ایک سٹوپا پر مشتمل ہے۔ اس کے ارد گرد چوکور صحن ہے جس میں بیشمار چھوٹے مندر بنائے گئے۔ اس کے باہر ایک دوسرا صحن ہے جس کے ارد گرد بہت سے بلند و بالا مندر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں مہاتما بدھ کے دیوہیکل مجسمے دیواروں میں بنائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ درمیان میں آگے بڑھے ہوئے چھجے ہیں، جن کو مہنتوں اور پنچایت کے راہبوں کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ سٹوپا کے سامنے حجروں کے ہمراہ ایک خانقاہ ہے۔ نیز اس کے علاوہ اور بیشمار عمارات ہیں جن کے استعمال کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے درمیان چند محرابی چھتوں والے تہہ خانے ہیں غالباً غلہ جمع کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ ایک چوکور صحن ہے جس کے ارد گرد بلند و بالا دیوار ہے اور صرف چھوٹا سا ایک دروازہ ہے۔ یہ رائے پیش کی گئی ہے کہ یہ کریا کرم کے لیے مخصوص تھی لیکن میرے اپنے خیال کے مطابق یہ جگہ منحرف راہبوں کے قید خانے کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ کم از کم برما میں فوت شدہ راہبوں کو عوام میں جلایا جاتا ہے۔ چند بڑے کھنڈرات سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا تعلق خود مختار دھاروں سے تھا۔

جمال گڑھی کے کھنڈرات ایک سٹوپا پر مشتمل ہیں جس کے ارد گرد ایک چوکور صحن ہے۔ اس میں مختلف جسامت کے بیشمار چھوٹے چھوٹے مندر بنائے گئے ہیں۔ ان میں روشندانوں کی طرح جھریاں ہیں۔

ایک سیڑھی بہت بڑی کھلی جگہ تک جاتی ہے جو بیشمار چھوٹے چھوٹے سٹوپوں اور حجروں پر مشتمل ہے۔ اس کے عقب میں ایک خانقاہ اور دیگر عمارات ہیں جن کے استعمال کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

خستہ حال مندروں کی قطاروں کے سامنے سٹوپوں کے صحنوں میں مجسمے بڑی تعداد میں

دریافت ہوئے ہیں۔ ان کی پوجا کی جاتی تھی۔ میں نے اسی قسم کی ترتیب کا پتہ، نوگرام، شاہبر بہلول اور ٹیکسلا میں بھی چلایا ہے۔ میں نے اشوک کی بڑی عبارت کے قریب شہباز گڑھی میں بیشمار خانقاہیں اور دھارائیں تلاش کی ہیں۔ جن میں پانچ یونانی بادشاہوں کے ناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں سے آخری ایلیکسنڈرا یا ایری پس کا اسکندر ہے۔

ان قدیم مقامات میں سے میں نے شہباز گڑھی کو سدھاتا کے شہر سے منسوب کیا ہے۔ اس کی غار بمعہ دو کمروں کے اور اس کے سامنے چوکور سنگین چبوترے کے، میں نے ان کو شمال مشرق میں تقریباً 2 میل کے فاصلے پر دریافت کیا ہے۔ یہ ہیون سانگ کی پالوشاہ ہے اور یہ پہاڑی جس میں غار واقع ہے یہ چینی زائر کا پہاڑ داد تاتک اور جسٹینس کا دادلے موتیس ہے۔

نوگرام کو میں نے ارناس سے منسوب کیا ہے کیونکہ اس میں وہ سبھی خصوصیات پائی جاتی ہیں جن کی نشاندہی یونانیوں نے کی ہے۔

تخت بائی کے بارے میں خیال ہے کہ یہ پالوشاہ کے شمال مغرب میں 17 میل یا 100 لائی کے فاصلے پر بہت بڑا پہاڑ تھا اور اس کے جنوب میں ڈھائی میل کے فاصلے پر شاہبر بہلول کو میں رشی ایکا سارینگا کی خانقاہ کے مقام سے منسوب کرتا ہوں جس کے ایک کنیز کے ساتھ عشق نے اسے اپنی محبوبہ کو اپنے کاندھوں پر بٹھا کر شہر کے پار لے جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"ان عمارات کی تاریخ کو غالباً آریاؤں کے حروف تہجی استعمال کرنے سے متعین کیا جا سکتا ہے جن کو میں نے بہت سے مجسموں پر معمار کے نشان کے طور پر جدا طرز میں پایا ہے اور دو معاملات میں چھوٹی عبارات کی شکل میں بھی دیکھا ہے۔ اب یہ محسوس ہوتا ہے کہ دوسری صدی عیسوی میں اس طرز خط کا استعمال یکسر ختم ہو گیا کیونکہ ان کی جگہ گپتا دور کے خالص ہندوستانی طرز خط نے لے لی تھی۔ چنانچہ میں مہاتما بدھ کے دور کی گندھارا عمارات اور مجسموں کو کنشکا سے تبدیل شدہ ہند سکا تھیئن دور کے خوشحال زمانہ سے منسوب کروں گا جو قبل مسیح کی صدی کے وسط کے کچھ عرصہ بعد سے دوسری صدی عیسوی کے وسط کے بعد تک کے عرصہ پر محیط تھا۔"

ذیل میں جنرل کننگھم کی عجائب گھر لاہور میں مہاتما بدھ سے متعلقہ اہم یادگاروں کی تفصیلی فہرست سے اقتباسات دیے گئے ہیں۔ نمبر شمار فہرست کے مطابق ہیں:۔

1۔ ایک بادشاہ کا دیو ہیکل بت کھڑی حالت میں ہے۔ اس کے لمبے بال اور مونچھیں ہیں۔ اس کے علاوہ تاج کو مختلف آرائشی اشیاء سے مزین کیا گیا ہے۔ پاؤں غائب اور دونوں بازو ٹوٹے ہوئے ہیں لیکن دوسرے معنوں میں بت نہایت اچھی حالت میں ہے۔ اس کو ڈاکٹر

بیلیو نے شہر بہلول میں ایک بہت بڑی خانقاہ میں دریافت کیا تھا۔

3۔ ایک بت میں بادشاہ کو تخت پر بیٹھے اور بائیں ہاتھ میں نیزا تھامے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ بایاں پاؤں پائیدان پر رکھا ہوا ہے۔ جسم کا بالائی حصہ عریاں ہے۔ دایاں بازوں غائب ہے لیکن دوسرے معنوں میں مجسمہ نہایت اچھی حالت میں ہے۔ پگڑی یا تاج کو بہت زیادہ سجایا گیا ہے۔ آنکھیں جو قابل ذکر حد تک نمایاں ہیں، چوکور شکل میں تراشی گئی ہیں۔ غالباً یہ عجائب گھر لاہور کا سب سے زیادہ متاثر کن مجسمہ ہے۔ اس کے نقشے میں دلیری، انداز میں آزادی اور تاثر میں وقار پایا جاتا ہے۔

6۔ ایک کھڑے ہوئے بادشاہ کا بت ہے۔ اس کے ساتھ شاہی لباس کا پلو بائیں جانب لہرا رہا ہے۔ بایاں ہاتھ کولہے پر رکھا ہوا ہے۔ نچلا دایاں ہاتھ غائب ہے لیکن واضح طور پر ہاتھ کو آگے کی طرف اس انداز میں اٹھایا ہوا تھا جیسے مجمع کے سامنے تقریر کی جارہی ہو۔

21۔ ایک بت میں یونانی دیوی ایتھین کو سر پہ خود پہنے اور بائیں ہاتھ میں نیزا تھامے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ زیریں دایاں ہاتھ جس میں غالباً میڈوسہ کے سر پر مشتمل ابجز (تھال) کو تھاما ہوا تھا۔ وہ بھی غائب ہے۔ دیوی کا انداز بالکل اسی طرح ہے جیسا کہ ہند۔ سکائتھین آزا سکوں پر ہے۔

30۔ مہاتما بدھ کے پاس بارلیش دیوادتہ حاضری دے رہا ہے۔ اس نے تلوار کے علاوہ اپنا عصا اٹھا رکھا ہے۔ وہ اپنے کشکول سے سانپ باہر نکال رہا ہے۔ غالباً یہ وہی زہریلا ناگ ہے جس کو مہاتما بدھ نے "اروویلوا کاسیاپا" کے طعام خانہ میں قابو کیا تھا۔

31۔ مہاتما بدھ کو بیٹھے ہوئے لوگوں کے ایک بہت بڑے اجتماع سے خطاب کرتے دکھایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دائیں جانب ایک شاہی فرد کو کھڑے ہوئے دکھایا گیا ہے جو اپنے آقا کو کوئی لمبی چیز پیش کر رہا ہے۔

56۔ آرائشی حاشیے کے ایک ٹکڑے پر دو مختلف مناظر کی عکاسی کی گئی ہے اور انہیں ایک چوکور ستون سے علیحدہ کیا گیا ہے۔ بائیں جانب دیوادتہ تقریباً برہنہ مہاتما بدھ کے پاس حاضری دے رہا ہے اور ناگ بادشاہ سے خطاب کر رہا ہے جس کی نوکدار دم ایک قسم کی قربان گاہ کے نیچے چھپی ہوئی ہے۔ دائیں جانب دوبارہ دیوادتہ مہاتما بدھ کے پاس حاضر ہو رہا ہے جو ڈنڈا پنی (لٹھ بردار) یا نرگرنتھ پیشوا سے خطاب کر رہا ہے۔ غالباً وہ " اورو ویلوا کاسیاپا " ہے۔

58۔ پروں والے ایک بت کو آلتی پالتی مارے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ان دریافت ہونے والے مجسموں میں سے زیادہ تر 4 انچ سے 16 انچ تک بلندی کے ہیں۔ ان کو عمارت کے سب سے نچلے خاشیے کو سہارا دینے کے لیے قطار میں ترتیب کے ساتھ لگایا گیا تھا۔ بتوں کو عام طور پر چوکور ستونوں سے علیحدہ کیا گیا تھا۔

63۔ چھوٹا چوکھٹا۔ مہاتما بدھ بائیں جانب ایک جھکے ہوئے بت سے خطاب کر رہے ہیں۔ دائیں طرف ایک عورت اپنے بائیں بازو کے نیچے پانی کا برتن تھامے دروازے میں سے آ رہی ہے۔

74۔ بالائی خاشیہ۔ مہاتما بدھ بیٹھے ہوئے عبادت میں مصروف ہیں اور چھ پجاری انہیں نذرانے پیش کر رہے ہیں۔ دونوں طرف تین تین ہیں۔

زیریں خاشیہ۔ چھوٹے طاقچوں کی قطار کو تین تین گروہوں میں ترتیب سے بنایا گیا ہے۔ درمیانی طاقچے میں مہاتما بدھ کا بت ہے اور دائیں بائیں اطراف کے طاقچوں میں پجاری ہیں۔

77۔ ایک عورت شیر پر سوار ہے اور تین تاروں والا طنبورہ بجا رہی ہے۔

87۔ مجسّے کا ٹکڑا۔ مہاتما بدھ ایک درخت کے نیچے ناگ بادشاہ کو کوئی ٹوٹی ہوئی چیز پیش کر رہے ہیں۔ ناگ کی دم حسب معمول ایک قربان گاہ کے نیچے چھپی ہوئی ہے۔ اس پر انسانی جسم بلند ہوا ہے۔

90۔ مہاتما بدھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ دونوں اطراف میں مورتیاں پیالے پیش کر رہی ہیں۔ جنرل کننگھم کا خیال ہے کہ یہ منظر "چار بادشاہوں" کی عکاسی کر رہا ہے جو مہاتما بدھ کے مہاتما بننے پر انہیں قیمتی پیالے پیش کر رہے ہیں۔

93۔ مہاتما بدھ بیٹھے ہوئے تعلیم دے رہے ہیں۔ بائیں جانب ایک عورت ایک طویل برتن نذرانے کے طور پر پیش کرنے کے لیے آگے بڑھ رہی ہے۔

97۔ مہاتما بدھ بیٹھ کر دو کھڑے ہوئے بتوں کو خطاب کر رہے ہیں۔ ہر مورتی کے سر کے گرد حلقہ ہے۔

101۔ ایک بادشاہ دو ملکاؤں کے ہمراہ ایک طویل پلنگ پر بیٹھا ہے۔ بائیں جانب ایک راہب شیر خوار بچے کو اپنے گھٹنے پر رکھے ہوئے ہے۔ جنرل کننگھم کا خیال ہے یہ مجسمہ بادشاہ سدو دھانہ اور اس کی دو بیویوں مایا دیوی اور پرجاپتی کو ظاہر کر رہا ہے جو پلنگ پر بیٹھی ہوئی

ہیں جبکہ مقدس راہب اسیتا ننھے مہاتما بدھ کو اپنے گھٹنے پر بٹھائے ہوئے ہے۔

105۔ شہزادہ سدھارتھ بودھ گایا میں بودھی درخت تلے گیان میں بیٹھا ہے۔ دائیں جانب ایک ننگے سر کی مورتی ہے جس کا دایاں کندھا برہنہ ہے۔ بائیں طرف ایک مورتی کھڑی ہوئی ہے اس کے سر پر شاندار آرائشی مخروطی ٹوپی ہے۔ یہ منظر بڑا دلکش ہے۔

116۔ ایک چھوٹا مجسمہ شہزادے سدھارتھ کے سائیس چندا کی عکاسی کر رہا ہے جو اپنے بہترین اور مشہور گھوڑے کنتھیکا کو لا رہا ہے۔ اسی پر بیٹھ کر شہزادہ رات کے وقت اپنے خاندان کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

119۔ یہ چھوٹا خاشیہ عجائب گھر لاہور کے انتہائی جاذب نظر مجسموں میں سے ایک پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک بدھ راہب پر تشدد کے منظر کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کو ایک ستون کے ساتھ دونوں ہاتھ اس کے پیچھے کر کے باندھا گیا ہے اور اس کی گردن میں طوق ہے۔ اس کا سر منڈا ہوا ہے اور اس کا لباس صرف گھگری یا سنگھٹی پر مشتمل ہے۔ دائیں جانب دو آدمی اس کے سامنے جھک کر ہاتھ جوڑے ہوئے ہیں۔ راہب کے عقب میں بیٹھا ہوا ایک شخص واضح طور پر اس کی دائیں ٹانگ کی پنڈلی کو کاٹ رہا ہے جبکہ اس کے عقب میں کھڑا ہوا ایک بت اس ستم رسیدہ پر ایک بڑا پتھر پھینکتا ہوا معلوم ہو رہا ہے۔

120۔ ایک چھوٹے آرائشی فیتے کے دو خاشیے ہیں۔ دائیں جانب ایک آتشی قربان گاہ ہے۔ دو خادم شعلوں کو بھڑکانے کے لیے تیل پھینک رہے ہیں۔ بائیں جانب ایک داڑھی والا آگ کا پجاری ہے جو ایک تخت پر بیٹھا ہوا ہے اور ایک خادم چند پھل نذرانے کے طور پر پیش کر رہا ہے جو اناس یا شریفہ ہے۔

121۔ دو شاہی افراد اکٹھے ایک طویل پلنگ یا تخت پر بیٹھے ہیں۔ خادموں کی ایک فوج ان کے ہمراہ ہے۔ ہر بادشاہ کے عقب میں ایک خادم ہیرے کی شکل کا پنکھا جھل رہا ہے۔ دونوں اطراف میں دو منصب دار بیٹھے ہیں لیکن انتہائی بائیں جانب والے بت کے سر کے گرد حلقہ ہے اور غالباً یہ مقدس شخص ہے۔

135۔ ایک شاہی بت غالباً شہزادے سدھارتھ کا ہے۔ ہاتھ اور پاؤں دونوں غائب ہیں۔ اس شاندار مورتی کو ڈاکٹر بیلیو نے تخت بائی کے قریب شہر بہلول کے ایک سٹوپا سے دریافت کیا تھا۔ جب اس کو تلاش کیا گیا تو درست حالت میں نہیں تھا۔

137۔ ایک مندر کے آخری کونے کا حصہ ہے۔ شاہی افراد کا ایک گروہ مہاتما بدھ کے پاس

نذرانے لے کر آیا ہے۔ ایک بت دونوں ہاتھ جوڑے ہوئے چوکور ستون کے تختے پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے ستون نے مندر کے زیریں کمرے کی بغل کی شکل بنائی ہوئی ہے۔

139۔ بارش بت ایک تخت پر براجمان ہے۔ اس کے ساتھ پائیدان پر آتشی قربان گاہ ہے۔ دونوں جانب دو مورتیاں نذرانوں کے ہمراہ ہیں۔ مورتی کے سامنے پانچ پھل ہیں جو شریفہ معلوم ہوتے ہیں۔ سب سے نمایاں بت بدھ مت کے مخالفوں میں سے ایک آتش پرست کا معلوم ہوتا ہے۔

144۔ سب سے زیادہ مکمل عکاسی چار کمروں پر مشتمل ایک مندر کے سامنے والے کونے کی ہے۔ سب سے اوپر مہاتما بدھ کا کشکول ایک چھتری کے نیچے ہے۔ اگلے حاشیے میں مہاتما بدھ کو گوشہ نشینی میں بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ نیز دو زیریں حاشیوں میں وہ اپنے پیروکاروں سے خطاب کر رہے ہیں۔

184۔ خاتون محافظ ایک نیزا اٹھائے ہوئے ہے۔ اسی طرح کی مورتیاں شہزادہ سدھارتھ کے محل میں بھی دکھائی دے رہی ہیں۔ میجر جنرل کننگھم نے اس مجسمے کو 1847ء میں رانی گھاٹ کے پرانے قلعہ سے حاصل کیا تھا۔

197۔ چھوٹا آرائشی حاشیہ۔ مہاتما بدھ درمیان میں کھڑے ہوئے ہیں۔ ان کے بائیں جانب دیوا دتہ اور عقب میں سر منڈا راہب کھڑا ہوا ہے۔ مہاتما بدھ کے دائیں ہاتھ تین خواتین ہیں اور سامنے ایک مرد ہے جو مہاتما بدھ کے قدموں میں جھکا ہوا ہے۔

209 ۔زیریں حاشیے میں شہزادے سدھارتھ کو پیش کیا گیا ہے جو کپل وستو کی گلیوں میں گھوڑے پر سوار پھر رہا ہے جب اس کا سامنا چار پیش گوئیوں کی ایک علامت سے ہوتا ہے۔

210 ۔ چھوٹا آرائشی حاشیہ۔ مہاتما بدھ کی پیدائش۔ مایا دیوی سل کے ایک درخت کے نیچے کھڑی ہو کر اس کی شاخ پکڑے ہوئے ہے۔ اس کی بائیں جانب اس کی سوتیلی بہن پرجا پتی کھڑی ہے جس پر وہ سہارے کی خاطر جھکی ہوئی ہے۔ اس کی دائیں جانب برہما نوزائیدہ بچے کو حاصل کر رہا ہے جو اپنی ماں کے پہلو سے عیاں ہو رہا ہے۔

220 ۔مہاتما بدھ کی پیدائش۔ مایا دیوی حسب معمول سل کے درخت تلے کھڑی ہے۔ بائیں جانب پرجا پتی اس کو سہارا دیے کھڑی ہے اور برہما دیوتا اس کے دائیں پہلو سے

نوزائیدہ شہزادے کو حاصل کر رہا ہے۔ برہما کے سر کے گرد حلقہ ہے۔ اس کے عقب میں موجود بت کے گرد بھی اس قسم کا حلقہ ہے۔ اس کے بارے میں غالب خیال یہی ہے کہ وہ اندرا ہے۔

348 ۔ مجسمے کا ٹکڑا۔ مرد اور عورت دونوں کے سر غائب ہیں۔ عورت ایک مختصر کوٹی لمبے جمپر اور بہت بڑی پازیبوں میں ملبوس ہے۔

376 ۔ چھوٹا آرائشی حاشیہ۔ مہاتما بدھ کا نروان یا رحلت۔ ان کو معمول کی حالت میں دائیں کروٹ لیٹے ہوئے اور سر کے نیچے دایاں ہاتھ رکھے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ عقب میں سل کے تین درخت جنگل کی نشان دہی کر رہے ہیں۔ بیشمار پجاری حاضر ہیں۔

384 ۔ حاشیے پر دو مناظر کو چوکور ستونوں کے ذریعے تقسیم کیا گیا ہے۔ بائیں جانب دیوادتہ مہاتما بدھ کے پاس حاضری دے رہا ہے جو ناگ سے خطاب کر رہا ہے جس کی نوکدار دم ایک قسم کی قربان گاہ کے نیچے چھپی ہوئی ہے جس پر انسانی جسم بلند ہوا ہے۔ دائیں جانب دیوادتہ مہاتما بدھ کے پاس حاضر ہو رہا ہے جو ایک نامعلوم مرد بت سے خطاب کر رہا ہے۔ یہ اعلیٰ اور مکمل مجسمہ ہے۔

463 ۔ یہ مجسمے تین قطاروں میں شہزادہ سدھارتھ کی زندگی کے مناظر کی عکاسی کر رہے ہیں۔ بالائی قطار میں شہزادہ ور اس کی بیوی یشودھرا درمیان میں اکٹھے بیٹھے ہیں۔ بغلی طاقچوں میں دو لڑکیاں ناچ رہی ہیں۔ درمیانی قطار میں شہزادہ درمیان والے طاقچہ میں اکیلا بیٹھا ہوا ہے۔ بائیں طرف والے طاقچہ میں اس کا نیا گھوڑا اس کا انتظار کر رہا ہے۔ دائیں جانب والے طاقچہ میں ایک خاتون محافظ ہاتھ میں بھالا پکڑے کھڑی ہے۔ زیریں طاقچے میں شہزادہ سوار ہو کر باہر کی طرف جا رہا ہے۔ ایک تیر انداز اس کی خدمت پر مامور ہے اور ایک آدمی ایک چھتری اٹھائے ہوئے ہے۔

464 ۔ بالائی منظر مہاتما بدھ کی مشہور کرامات میں سے ایک کی نشاندہی کر رہا ہے۔ محض مہاتما بدھ کی مرضی کے مطابق داڑھی والے تمام آتش پرستوں کو اپنی آتشی قربان گاہوں میں آگ روشن کرنے سے منع کر دیا گیا۔ اس کے بعد مہاتما بدھ کی مرضی کے مطابق آگ خود بخود روشن ہو گئی اور اس کے بعد آگ کو اس وقت تک بجھایا نہیں جا سکا جب تک مہاتما بدھ کی مرضی نہیں ہوئی۔ اس میں آخری منظر میں یہ دکھایا گیا ہے کہ آتش پرست قربان گاہ پر پانی کے برتن بھر کر انڈیل رہے ہیں تاکہ آگ بجھ جائے۔

نچلا منظر نامکمل ہے۔ مہاتما بدھ کا بت غائب ہے لیکن دیوادتہ اپنے دلکش عصا کے ساتھ حاضر ہے۔

534۔ مندر کا کونہ جس کا زیریں حصہ غائب ہے ماسوائے دونوں جانب چوکور ستونوں کے بالائی تختوں کے۔

درمیانی منظر میں مہاتما بدھ کو سر منڈے راہبوں کے ایک گروہ سے خطاب کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس کے اوپر مہاتما بدھ کو اپنے عقید تمندوں کے ہمراہ کھڑے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ سب سے اوپر مہاتما بدھ کا کشکول ایک تخت پر رکھا ہوا ہے اور اس کی پوجا کی جارہی ہے۔ عقید تمند دونوں جانب کھڑے ہیں۔

538 ۔ایک بہت بڑے مجسمے کا حصہ گیارہ مورتیوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے تین زیریں مورتیاں سپاہیوں کی نشاندہی کر رہی ہیں جو اپنے ہتھیاروں، بھالوں اور ڈھالوں کے ہمراہ کھڑے ہیں لیکن باقی ماندہ اپنے جانوروں کے سر بڑے بڑے منہ اور تیز دانتوں کے ساتھ غالباً بھوت پریت بنا کر پیش کیے گئے ہیں۔ جنرل کننگھم کے مطابق ہو سکتا ہے یہ مارا کی اس فوج کا ایک حصہ ہوں جس کو وہ بودھی درخت تلے گیان میں بیٹھے مہاتما بدھ کو ہراساں کرنے کے لیے لایا تھا۔

545۔ مجسمہ نمبر 538 کا حصہ چھ مورتیوں پر مشتمل ہے۔ نچلی مورتی ایک سپاہی کے روپ میں بمعہ اپنے ہتھیاروں اور تلوار کے ہے لیکن بالائی چار مورتیاں جانوروں کے سروں سمیت غالباً بھوت پریتوں کی عکاسی کر رہی ہیں۔

565 -پانچ خاشیے ہیں۔ ہر ایک میں مہاتما بدھ کو بیٹھے ہوئے دو عقید تمندوں کو تعلیم دیتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

566 ہند ۔یونانی (انڈو ۔کورینتھیئن) طرز کے ستون کی چوٹی کا بالائی حصہ بمعہ مرغولوں اور اکینتھس کے پتوں کے تقریباً درست حالت میں ہے۔ اکینتھس کے پتوں کے درمیان کھڑی حالت میں مہاتما بدھ کے ایک چھوٹے سے بت کو تبلیغ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ یہ بہت شاندار نمونہ ہے۔ نچلی طرف کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا جس میں مہاتما بدھ کے بت کو بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہے اس کا تعلق ایک دوسرے ستون کے بالائی حصہ سے ہے۔ بالائی کنگروں کی قطاریں ایک آرائشی خاشیہ سے متعلق ہیں۔

567۔ دو مناظر میں شہزادے سدھارتھ کی طرف سے مذہبی زندگی کو اختیار کرنے کی کہانی

بیان کی گئی ہے۔

بالائی منظر۔ شہزادہ ایک پلنگ پر آرام کر رہا ہے اور اس کی بیوی لیشودھرا اس کے پاس بیٹھی ہوئی ہے۔ خاتون موسیقارائیں خدمت پر مامور ہیں۔

زیریں منظر۔ شہزادہ اور شہزادی نے اپنی جگہیں تبدیل کر دی ہیں۔ وہ پلنگ پر سو رہی ہے اور شہزادہ اس کے قریب بیٹھا ہوا ہے۔ خاتون موسیقارائیں سو گئی ہیں۔ محافظ خواتین نیزوں سے مسلح ہو کر بغلی راہداریوں میں کھڑی ہیں۔ (شہزادہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وہاں سے فرار ہو جاتا ہے اور اپنی بیوی کو بھی ساتھ نہیں لے کر جاتا)

یہ مجسمہ بہت شاندار ہے اور نہایت اچھی حالت میں ہے۔

572 ۔یہ مجسمہ تقریباً اچھی حالت میں ہے۔ اس میں مہاتما بدھ کو ایک بہت بڑے مجمع کو تعلیم دیتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ان میں سے دو پروں والے دیوتا اس کے سر پر پھولوں کا ہار رکھ رہے ہیں۔ یہ مجسمہ بہت شاندار ہے اور ماسوائے زیریں بائیں کونے کے نہایت اچھی حالت میں ہے۔

586 ۔دیوادتہ اور ایک پیالہ اٹھائے ہوئے نوجوان راہب مہاتما بدھ کے پاس حاضری دے رہے ہیں۔ اس کے سامنے لمبے بالوں والا ایک بت جھک کر اس کے پاؤں پکڑے ہوئے ہے جبکہ لمبے بالوں والا ایک اور بت اسے پھولوں کا گلدستہ پیش کر رہا ہے۔ دائیں جانب لمبے بالوں والا ایک تیسرا بت ہے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں تونبا ہے اور وہ دروازے کے سامنے ایک عورت سے پھولوں کا گلدستہ وصول کر رہا ہے۔

859 ۔خاشیے کا حصہ دو قطاروں میں ہے۔ بالائی قطار میں دو طاقچے ہیں۔ ان میں سے ایک میں مہاتما بدھ کے بت کو گوشہ نشینی میں دکھایا گیا ہے۔ دوسرے میں ایک عقیدت مند کو عبادت کے لیے جھکے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ دوسری قطار میں ایک آدمی کو مہاتما بدھ کے قدموں پر جھکے ہوئے دکھایا گیا ہے اور دیوادتہ حسب معمول حاضری پیش کر رہا ہے۔

590 ۔ایک مندر جس کو بہت زیادہ سجایا گیا ہے۔ زیریں حصہ غائب ہے لیکن بغلی چوکور ستونوں کے بالائی حصے اور ہموار گنبد جس پر ایک بالائی طویل گنبد ہے ابھی تک موجود ہیں۔

600 ۔مہاتما بدھ اپنا دایاں ہاتھ ایک ہاتھی کے سر پر رکھ رہے ہیں اور ان کے عقب سے دیوادتہ جھانک رہا ہے۔ یہ منظر غالباً مالاگیری ہاتھی کی کہانی کو پیش کر رہا ہے جس کو دیوا

دتہ نے مہاتما بدھ کو ہلاک کرنے کے لیے مست کر دیا تھا۔ مہاتما بدھ سے ملاقات کرنے کے بعد ہاتھی رام ہو گیا اور اپنا سر ان کے سامنے جھکا دیا۔

611 - ایک سٹوپا کی گول عمارت کا حصہ جس کو مجسموں کی تین قطاروں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ بالائی قطار مورتیوں کی ایک صف پر مشتمل ہے جن کو جلوس کی شکل میں ہاتھوں میں نذرانے اٹھائے دکھایا گیا ہے۔ درمیانی صف سادہ نقش و نگار پر مشتمل ہے۔ زیریں صف کو چوکور ستونوں کے ذریعے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ بائیں طرف کا حاشیہ ایک سٹوپا اور دو عقیدت مندوں پر مشتمل ہے۔ درمیانی حاشیے میں ایک بارِیش مورتی کو میز پر بیٹھے دکھایا گیا ہے اور چار خادم اسے پھل پیش کر رہے ہیں۔ دائیں طرف کا حاشیہ ایک آتشی قربان گاہ پر مشتمل ہے اور دو خدمت گزار آگ بھڑکانے کے لیے اس پہ تیل ڈال رہے ہیں۔

952 - مہاتما بدھ تخت پر بیٹھ کر ایک منصب دار سے خطاب کر رہے ہیں جو بائیں طرف کھڑا ہے۔ بیشمار خادمین عقب میں کھڑے ہیں۔ دونوں طرف سر منڈے راہب گوشہ نشین ہیں۔

کوہ نور ہیرے کی تاریخ

عجائب گھر کے بائیں جانب جس ہال میں صوبے کی دستکاریوں اور مصنوعات کے نمونہ جات رکھے گئے ہیں اس میں بے نظیر ہیرے "کوہ نور" کا شیشے کا نمونہ موجود ہے جس نے ایک زمانے میں مغلوں اور سکھوں کے عصائے شاہی کی شان میں اضافہ کیا تھا۔ یہ وہ مشہور زمانہ ہیرا ہے جس نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بازو کو زینت بخشی اور جسے میسرز اوسلر نے 1851ء کی عظیم ہائیڈ پارک نمائش میں پیش کیا۔ بعد ازیں اس کو بنانے والوں نے یہ نمونہ "نمائش پنجاب" کو پیش کر دیا۔

اس مشہور ہیرے کی تاریخ قصہ کہانیوں میں گم ہو چکی ہے۔ ہندو داستانوں کے مطابق اس کا تعلق مہابھارت کے سورماؤں میں سے ایک، انگہ کے بادشاہ کامہ سے ہے جو تقریباً 3000 سال قبل مسیح میں گزرا ہے۔ ایرانیوں کے مطابق اس کا تعلق اس کے ہمشکل ہیرے "دریائے نور" سے ہے جس کو ان کا بادشاہ افراسیاب پہنا کرتا تھا۔ "دریائے نور" ایک ہموار پتھر ہے اس کا وزن 186 قیراط ہے اور یہ اب تہران میں شاہ ایران کے خزانے میں موجود ہے جو دنیا کے نہایت

شاندار جواہرات پر مشتمل ہے(7)۔

کوہ نور ایک طویل دور کی گمنامی کے بعد گوالیار کے ایک ہندو راجہ بکرماجیت کی ملکیت بن گیا جس کو سلطان ابراہیم لودھی نے پانی پت کی لڑائی میں خدمات سرانجام دینے کے لیے بلایا تو وہ سلطان کی طرف سے (1526ء کی) کی اس یادگار جنگ میں بڑی جوانمردی سے لڑا۔ آنجہانی راجہ کے اہل خانہ اور اس کے قبیلے کے سردار اس وقت آگرہ میں تھے جو اس وقت ابراہیم کے نام سے مشہور تھا۔ ہمایوں کو فتح کے بعد آگرہ شہر پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیا گیا۔ اس نے نہایت بردباری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس قدیم خاندان کو لوٹنے سے گریز کیا اور ان سے بہت مشفقانہ سلوک کیا۔ انہوں نے ردعمل کے طور پر اپنی طرف سے خاصی تعداد میں ہیرے جواہرات اور قیمتی پتھر پیش کر کے عقیدت کا اظہار کیا۔ سلطان بابر لکھتا ہے "ان میں وہ مشہور ہیرا بھی تھا جو سلطان علاء الدین نے حاصل کیا تھا۔" بادشاہ مزید بیان کرتا ہے "یہ اس قدر قیمتی ہے کہ ہیروں کی جانچ کرنے والا جوہری اس کی مالیت کو پوری دنیا کے روزمرہ اخراجات کے نصف کے برابر بتاتا ہے۔ اس کا وزن تقریباً آٹھ مثقال (یا 320 رتی) ہے۔ میرے یہاں پہنچنے پر ہمایوں نے یہ مجھے نذرانے کے طور پر پیش کیا اور میں نے یہ تحفہ کے طور پر دوبارہ اسے دے دیا۔"(8)

چنانچہ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جب یہ ہیرا راجہ بکرماجیت کے خاندان نے ہمایوں کے حوالے کیا تو اس وقت تاریخ میں درج تھا کہ 1304ء میں علاء الدین خلجی نے اسے مالوہ کے راجہ سے حاصل کیا تھا اور یہ گوالیار کے ہندو بادشاہوں کے قبضہ سے دوبارہ اپنے مسلمان مالکوں کے پاس کیسے پہنچا اس کے بارے میں کوئی بات واضح نہیں ہے لیکن اس بارے میں ہم بابر کی اس ہیرے کے متعلق رائے کو سند گردانتے ہیں جو اس کے بیٹے نے حاصل کیا تھا کہ تقریباً دو صدی پیشتر خلجی حکمران نے اسے ہندو مالکان سے حاصل کیا تھا۔

یہ ہیرا جس کو برنیئر نے "فقید المثال" کہا ہے اس کو گولکنڈہ کے عبداللہ قطب شاہ کے وزیر میر جملہ نے شاہجہان کو تحفے کے طور پر پیش کیا۔ وہ دراصل ہیروں کا سوداگر تھا۔ شاہجہاں کو اس پر فتح حاصل ہوئی تھی۔ میر نے 1656ء یا 1657ء میں گولکنڈہ کی فتح کے لیے ایک فوج کی کمان حاصل ہونے پر یہ تحفہ پیش کیا(9)۔

اورنگ زیب نے 1665ء میں فرانسیسی سوداگر اور جوہری ٹیورنیئر کو اپنے سرکاری جواہرات دکھائے۔ اس سیاح نے ان میں وہ ہیرا بھی دیکھا جو اس کے اپنے اندازے کے مطابق 1/2-319 رتی (9/16 - 279 قیراط) وزن کا تھا(10)۔ اس ہیرے کو ٹیورنیئر "مغلوں

کا عظیم ہیرا" کہتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ برنیئر کا "فقید المثال" اور وہ ہیرا ہے جس کا ذکر بابر نے "تذکرہ بابری" (تزک بابری) میں کیا ہے۔ ٹیورنیئر نے یہ معلوم کیا ہے کہ اس کا وزن حیران کن حد تک اس وزن کے عین مطابق ہے جو بابر نے درج کیا ہے۔ ٹیورنیئر لکھتا ہے "مغلوں کا یہ عظیم ہیرا جس کا وزن 9/16 - 279 قیراط ہے۔ یہ پانی کی طرف صاف شفاف اور نہایت خوبصورت شکل کا ہے لیکن یہ پتھر پیندے کی طرف سے تھوڑا سا تڑخا ہوا ہے بس یہی ایک معمولی سا نقص اس میں ہے"۔ اس نے اس کی مالیت کا اندازہ لگایا ہے کہ یہ 723، 11، 278 لیور مالیت کا ہے جو 1/2-1 - 18 - 245، 879 پاؤنڈ کے برابر ہے(11)۔

جب 1739ء میں نادر شاہ نے دہلی کو تاخت و تاراج کیا اور اس نے اورنگ زیب کے کمزور جانشین محمد شاہ سے اس کا تخت و تاج اور جواہرات چھین لیے تو اس نے ان میں اس مشہور ہیرے کو بھی دیکھا اور اسے "کوہ نور" کا خطاب عطا کیا۔ یہ اس ہیرے کے لیے بہت مناسب نام تھا جس کا ذکر بابر اور ٹیورنیئر نے کیا تھا۔ یہ تاریخ میں پہلا موقع تھا جب اس ہیرے کو کسی خاص نام سے پکارا گیا(12)۔

1747ء میں خراسان میں فتح آباد کے مقام پر نادر شاہ کے قتل کے بعد یہ ہیرا تخت و تاج کے ہمراہ اس کے بھتیجے علی قلی خاں المعروف علی شاہ کے پاس چلا گیا۔ سر ولیم جونز کے الفاظ میں "وہ اپنے چچا کے خزانے کو حاصل کرنے کا خواہش مند اور تخت شاہی و حکومت کی خوشیوں کو حاصل کرنے کا زبردست متمنی تھا اس نے اسے قتل کروا دیا۔ علی شاہ کو معزول اور اندھا کرنے کے بعد یہ ہیرا اس کے جانشین اور نادر شاہ کے پوتے شاہ رخ کے قبضہ میں آگیا۔ وہ مشہد میں اپنے قلعہ میں گوشہ نشین تھا جہاں آغا محمود نے اسے قیدی بنایا ہوا تھا اور اس پر محض اس لیے بے سود تشدد کرتا تھا کہ وہ قیمتی ہیرا اس کے حوالے کر دے۔ شاہ رخ نے 1751ء میں یہ ہیرا احمد شاہ درانی کو بہترین خدمات کے صلے میں عنایت کر دیا۔ احمد شاہ کے انتقال کے بعد یہ اس کے بیٹے اور جانشین تیمور شاہ کو وراثت میں ملا۔ 1793ء میں اس نے اپنے انتقال کے وقت دیگر اہم جواہرات کے ہمراہ یہ اپنے بڑے لڑکے شاہ زمان کے حوالے کر دیا۔ مؤخرالذکر کو بعد ازاں اس کے بھائی شاہ محمود نے معزول کرنے کے بعد اندھا کر دیا لیکن جب یہ ہیرا اس کے تیسرے بھائی شاہ شجاع کے قبضہ میں آگیا تو وہ اسے حاصل کرنے کے لیے جتن کرنے لگا۔" ایلفن سٹون کے مطابق اس کو اس دیوار میں دوسرے جواہرات کے ساتھ چھپا کے رکھا ہوا پایا گیا جو شاہ زمان نے اپنی قید کے دوران اپنے قبضہ میں کر لی تھی۔ جب مسٹر ایلفن سٹون نے پشاور میں شاہ شجاع سے ملاقات کی تو اس نے اسے اس

کڑے میں جڑا ہوا دیکھا جو شاہ نے اپنے بازو میں پہنا ہوا تھا اور اس نے اسے وہی ہیرا قرار دیا جس کا ذکر ٹیورنیئر نے کیا تھا۔

مارچ 1813ء میں شاہ شجاع اپنی چہیتی بیوی وفا بیگم کے ہمراہ لاہور آیا تو یہاں وہ رنجیت سنگھ کے نصف مہمان اور نصف قیدی بن گئے۔ یہ حکمران اس قدر لالچی تھا کہ بعد کے دور میں اس کو ہر وقت خزانہ جمع کرنے کا خبط سوار رہتا تھا (13)۔ اس نے شاہ شجاع کو اس شرط پر "کوہ نور" (14) حوالے کرنے پر مجبور کر دیا کہ وہ اس کو تین لاکھ روپے نقد اور 50,000 روپے سالانہ کی جاگیر عطا کرنے کے علاوہ کابل کو بازیاب کرانے میں مدد بھی کرے گا۔ اس سکھ حکمران نے شاہ شجاع سے جس طرح ہیرا ہتھیایا اس دردناک منظر کے عینی شاہد افراد نے اس کے بارے میں بیان کیا ہے:۔

"یکم جون 1813ء کو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے فقیر عزیز الدین، بھائی گوربخش سنگھ اور جمعدار خوشحال سنگھ کو شاہ شجاع کے پاس ہیرے کا تقاضا کرنے کے لیے بھیجا۔ شاہ نے انہیں یہ جواب دے کر واپس بھیج دیا کہ مہاراجہ کو ہیرا حاصل کرنے کے لیے خود آنا چاہیے۔ رنجیت سنگھ نے یہ سنا تو وہ خوشی خوشی اپنے گھوڑے پر سوار ہوا دائیں بائیں حفاظتی دستہ اپنے ساتھ لیا اور 1000 روپیہ نقد ہمراہ لے کر شاہ شجاع کی رہائش گاہ مبارک حویلی کی طرف روانہ ہوا۔ افغان بادشاہ نے مہاراجہ کا بڑی شان سے استقبال کیا۔ اس کے بعد دونوں بیٹھ گئے۔ ان کے درمیان تقریباً ایک گھنٹہ تک گہری خاموشی برقرار رہی۔ آخرکار رنجیت سنگھ کی قوت برداشت جواب دے گئی اور اس نے اپنے خدمت گزاروں میں سے ایک کے کان میں سرگوشی کی۔ اس نے شاہ کو ملاقات کا مقصد یاد دلایا۔ شاہ نے کوئی جواب نہ دیا لیکن اپنے ایک ملازم کو آنکھ سے کچھ اشارہ کیا۔ وہ چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد ایک چھوٹے سے تھان کو لا کر دونوں سرداروں کے درمیان برابر فاصلے پر رکھ دیا۔ دو طرفہ دوستی کا اعلان کیا گیا اور دونوں کے درمیان لازوال دوستی کی نشانی کے طور پر دستاروں کا تبادلہ کیا گیا (15)۔ اس کے بعد تھان کو کھولا گیا تو رنجیت سنگھ نے ہیرے کو پہچان لیا اور شاہ سے اس کی قیمت دریافت کی تو دلگیر شاہ نے جواب دیا "اس کی قیمت لاٹھی ہے۔ میرے آباؤ اجداد نے بھی اسے اسی طرح حاصل کیا تھا۔ تم نے بھی کافی حملوں کے بعد اس کو مجھ سے حاصل کر لیا ہے۔ تمہارے بعد ایک زبردست قوت ابھرے گی اور یہی ذرائع استعمال کرتے ہوئے اسے تم سے چھین لے گی"۔ مہاراجہ ان باتوں سے پریشان نہیں ہوا لیکن خاموشی سے اس کو (ہیرے کو) جیب میں ڈالا اور فوراً اپنے انعام کے ہمراہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔

اپنے محل میں واپس آنے کے بعد مہاراجہ نے ایک بہت بڑا دربار منعقد کیا اور اس موقع کی مناسبت سے شہر میں چراغاں کیا گیا لیکن جلاوطن بدقسمت شاہ شجاع کی تاریک رہائش گاہ مبارک حویلی میں ایک چراغ بھی روشن نہیں کیا گیا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ صاف ظاہر ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے شاہ شجاع سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا نہیں ہوا۔ رنجیت سنگھ نے ہیرے کو اس کے نصف حجم کے دو ہیروں میں نصب کر دیا تھا۔ وہ اس کو سرکاری مواقع پر پہنتا تھا۔ اس کا حوالہ لاہور کا دورہ کرنے والے بہت سے یورپی سیاحوں نے دیا ہے کہ وہ دنیا کے سبھی ہیروں سے زیادہ چمکدار اور شاندار تھا(16)۔

رنجیت سنگھ نے اپنی موت سے دو گھنٹے قبل اپنے تمام ہیرے جواہرات پاس منگوا لیے اور اگلے جہان میں سکون حاصل کرنے کی غرض سے ہدایت جاری کی کہ دیگر ترکے کے ہمراہ کوہ نور کو جنوبی بنگال میں جگن ناتھ کے مندر میں اسی نام کے بت کو آراستہ کرنے کے لیے بھیج دیا جائے اور وراثت کی علامت کے طور پر اپنے ہاتھوں سے اس پر پانی پھینکنے کی خواہش کا اظہار کیا لیکن مصر بیلی رام جو توشہ خانے کا نگران تھا، اس نے اس بات کے پیش نظر اس کو وہاں بھیجنے سے انکار کر دیا کہ یہ بادشاہت کی ملکیت تھا لہٰذا اس کو اپنے جائز وارث کے پاس جانا چاہیے۔

جب کھڑک سنگھ اور نونہال کے مرنے کے بعد شیر سنگھ نے کھڑک سنگھ کی بیوہ مائی چند کور کے تمام حقوق غصب کرنے کے بعد پنجاب کا حکمران ہونے کا اعلان کر دیا تو گلاب سنگھ نئے مہاراجہ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے گیا اس کو اس نے خراج عقیدت اور تحفہ کے طور پر عظیم الشان ہیرا جس کو "کوہ نور" کہا جاتا تھا پیش کیا، جس کو حاصل کرنے کے لیے اس نے بڑے جتن کیے تھے (17)۔

پنجاب پر انگریزوں کی فتح اور 1849ء میں مہاراجہ دلیپ سنگھ کی دستبرداری کے بعد اس ہیرے کو انتظامی بورڈ برائے معاملات پنجاب کے اولین اجلاس میں اس کے حوالے کر دیا گیا اور اس کو خاص طور پر سر (بعد میں لارڈ) جان لارنس کی ذاتی نگرانی میں دے دیا گیا۔ اس ہیرے کی تاریخ میں عجیب و غریب واقعہ رونما ہوا جس کو بوسورتھ سمتھ نے اپنی تصنیف "لارڈ لارنس کی حیات" میں بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ "وہ زندگی کے رسم و رواج سے قطعی بے نیاز تھے اور کبھی بھی انعام میں حاصل کیے گئے جواہرات (نشانات، تمغات) نہیں پہنتے تھے اور جب ان کو اس معاملہ میں خاص طور پر مجبور کیا جاتا تو وہ انہیں غلط مقام پر لگا لیتے تھے۔ بورڈ کے جن ساتھیوں نے انہیں اس قیمتی ہیرے کی حفاظت سونپ دی تھی وہ نہیں جانتے تھے کہ سر جان اس کے لیے مناسب

آدمی نہیں ہیں۔ لہٰذا کسی نہ کسی طرح نیم لاپرواہی کی حالت میں انہوں نے ہیرے پر مشتمل جست کی چھوٹی سی ڈبیہ کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا اور تقریباً اسے فراموش کر بیٹھے۔ انہوں نے لباس تبدیل کیا اور ردی کی ٹوکری کو پرے پھینک دیا۔ وہ یہ قطعی طور پر فراموش کر بیٹھے تھے کہ اس میں کس قدر بے بہا مالیت کا خزانہ پڑا ہوا ہے۔ تقریباً چھ ہفتے بعد لارڈ ڈلہوزی کی طرف سے ایک پیغام موصول ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ اس ہیرے کو ملکہ عالیہ کے پاس روانہ کر دیا جائے۔ واقعات کو اپنے ذہن میں یاد کرتے ہوئے سرجان جلدی جلدی اپنے گھر پہنچے اور اس حالت میں کہ کلیجہ منہ کو آیا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے ایک پرانے خدمت گزار کو بلوا بھیجا اور اس سے مخاطب ہوئے: کیا تم نے ایک چھوٹے سے بکسے (ڈبیہ) کو دیکھا ہے جو کچھ عرصہ پہلے میری ردی کی ٹوکری میں تھا؟" اس آدمی نے جواب دیا ہاں صاحب! وہ ڈبیہ میں نے پڑی ہوئی دیکھی اور اسے آپ کے صندوق میں رکھ دیا ہے۔ اس پر وہ بوڑھا مقامی آدمی ایک ٹوٹے پھوٹے ٹین کے صندوق کے پاس گیا اور اس کو وہاں سے نکال لایا۔ سرجان لارنس نے کہا: "اسے کھولو اور دیکھو اس میں کیا ہے؟" انہوں نے بڑی بے چینی سے اس شخص کی طرف دیکھا اور جب چھوٹی چھوٹی دھجیوں کی تہوں کو کھولنے کے بعد قیمتی پتھر اس میں سے برآمد ہوا تو انہیں اطمینان ہو گیا۔ وہ ملازم اس بات سے قطعی لاعلم تھا کہ اس کے پاس کس قدر قیمتی خزانہ موجود ہے۔ اس نے کہا: صاحب! اس میں سوائے ایک چھوٹے سے شیشے کے ٹکڑے کے کچھ بھی نہیں ہے" (18)۔

مسٹر بوسورتھ نے مستند طور پر بتایا ہے کہ برطانوی تاج میں حفاظت کے ساتھ لگائے جانے سے قبل اس ہیرے کو ایک یا دو نشیب و فراز سے گزرنا پڑا ہے۔

گورنر جنرل مارکوئیس آف ڈلہوزی 1850ء میں اس کو بمبئی لے گئے اور اسے لیفٹیننٹ کرنل میکسن سی۔ بی اور کیپٹن ریمسے کے حوالے کر دیا۔ وہ بحری جہاز کے ذریعے اسے یورپ لے گئے۔ انہوں نے یہ ہیرا ڈائریکٹرز کے بورڈ کے حوالے کر دیا۔ نیز 3 جولائی 1850ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈپٹی چیئرمین نے رسمی طور پر اس کو ملکہ عالیہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس سے پیشتر درج کیا جا چکا ہے کہ اس ہیرے کو 1851ء میں لندن کی پہلی عظیم نمائش میں پیش کیا گیا تھا۔ 1852ء میں اس کو میسرز گیراڈ نے لندن میں 8,000 پاؤنڈ کی لاگت سے از سر نو تراشا تھا۔ انہوں نے ایم کونسٹرز ایٹلیسر ایمسٹرڈیم کے ایک ہیرا تراش وور سینگر کو ملازم رکھ لیا تھا۔ اس کی تراش 38 دنوں میں مکمل ہوئی اور اس کو کم کر کے 16 /1 -106 قیراط کا ہیرا بنا دیا گیا۔

گزشتہ بیان کے مطابق یہ بات عیاں ہے کہ رنجیت سنگھ نے یہ ہیرا شرمناک طریقے سے

حاصل کیا۔ بیرونی ہمسایہ ملک کا مفتوح بادشاہ شاہ شجاع پناہ گزیں کے طور پر سکھ دربار میں آیا اور اس کا مہمان کے طور پر خیر مقدم کیا گیا۔ قدیم زمانے سے قائم مشرقی ممالک کی رسم کے مطابق وہ پناہ اور مدد کا حقدار تھا اور یہ اس بادشاہ کے لیے قابل فخر بات تھی کہ وہ مدد مانگنے والے کی حقیقی معنوں میں مدد کرے لیکن یہ صرف رنجیت سنگھ کے لیے ہی مخصوص تھا کہ وہ بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کرے اور قدیم رسم کو پس پشت ڈال دے۔ اس نے اپنے معصوم مہمان کو لوٹا۔ اس کے ساتھ برا سلوک کیا۔ اسے بھوکا پیاسا رکھا اور اس کی بے عزتی کی اور اپنے مہمان کو جو اس پر بھروسہ کرتا تھا ہیرے سے محروم کرنے کے بعد ڈاکو مہمان کے نام سے رسوا کیا۔

لیکن قدرت الہٰی نے اس عظیم ہیرے کو آخرکار برطانوی تاج کی ملکیت کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ چنانچہ اس بات سے زیادہ مناسب اور کیا ہو سکتا تھا کہ اس کو لوٹنے والے اور اس کے جانشینوں سے اسے لے لیا جائے اور بادشاہت کی ملکیت کے طور پر (جو عظیم مغلوں کے تاج کا نہایت، چمکدار ہیرا تھا) اسے اس علاقے کے جائز حکمران کو واپس دے دیا جائے۔ عظیم برطانیہ کے تاج کی ملکیت ہونے سے اس کی چکاچوند نے ہندوستان میں برطانوی شہنشاہیت کی چمک دمک میں اضافہ کیا۔ اس کی شان و شوکت، امن کی فتح، قانون اور نظم و نسق کی بحالی پر مبنی ہے اور کوئی چیز اسے اس چمک دمک سے جدا نہیں کر سکتی لیکن اس ہیرے کی سب سے بڑی شان یہ ہے کہ اس کو اس ملکہ نے پہنا جس کی سیرت پاکیزگی اور سخاوت کے برابر دنیا نے آج تک کسی کو نہ دیکھا جس کے کان اپنی رعایا کے عاجز ترین فرد کی شکایت سننے کے لیے کھلے رہتے ہیں۔ نہ تو عظیم مغلوں کے شاندار تخت طاؤس میں نہ ہی افغانوں کی چمکدار بلند تلوار میں یا درانی کے چمکدار بازو بند میں یا سکھوں کے جنگی سامان میں یہ قدیم ہیرا اس قدر چمکا جتنا ہندوستان کی عظیم ملکہ عالیہ کے تاج میں چمکدار ثابت ہوا ہے۔

زمزمہ توپ

عجائب گھر کے دروازے کی مخالف سمت میں اور انار کلی صدر بازار کے سامنے ایک بلند چبوترے پر مشہور زمانہ زمزمہ توپ رکھی ہوئی ہے (19) جسے بھنگیوں والی توپ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کو فروری 1870ء میں لاہور میں عالی جاہ ڈیوک آف ایڈنبرگ کی آمد کے موقع پر اس حالت میں رکھا گیا تھا۔ یہ اسلحہ کی ایک قدیم قسم ہے۔ اس کا شمار ہندوستان میں ڈھالی جانے والی بڑی توپوں میں ہوتا ہے جن کو ابدالی بادشاہ احمد شاہ درانی کے وزیر اعظم شاہ ولی خاں کی زیر ہدایت شاہ

نذیر نے 1757ء میں اسی حجم کی ایک اور توپ کے ہمراہ لاہور میں ڈھالا تھا۔ اس کو جزیہ کے طور پر لاہور کے ہر ہندو گھر سے دھات کا ایک ایک برتن حاصل کر کے تانبے اور پیتل کے آمیزے سے تیار کیا گیا۔ احمد شاہ نے 1761ء میں اسے پانی پت کی مشہور لڑائی میں استعمال کیا۔ جنگ کے بعد اس نے کابل جاتے ہوئے اس کو لاہور میں اپنے گورنر خواجہ عبید کے پاس چھوڑا کیونکہ اس کو لے جانے کے لیے کوئی سواری تیار نہیں تھی۔ دوسری توپ کو وہ اپنے ہمراہ لے گیا لیکن دریائے چناب کے راستے میں وہ گم ہو گئی۔ 1762ء میں ہری سنگھ بھنگی نے خواجہ عبید پر جنگ مسلط کر دی اور لاہور سے دو میل کے فاصلے پر واقع موضع خواجہ سعید پر حملہ کر دیا جہاں مغل گورنر نے اپنا اسلحہ رکھا ہوا تھا۔ اس نے اپنا توپ خانہ ہتھیار اور اسلحہ پھینک دیا۔ اس موقع پر پکڑی جانے والی توپوں میں زمزمہ توپ بھی تھی جس کو اس قابض کے نام پر بعد میں " بھنگی توپ " کہا جانے لگا۔ یہ 1764ء تک شاہ برج لاہور میں بے یار و مددگار پڑی رہی۔ اس کے بعد لہنہ سنگھ اور گوجر سنگھ بھنگیوں نے لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد ان کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ دونوں کے بعد چرت سنگھ سکرچاکیہ، بھنگی سرداروں کو لاہور کا قبضہ ہونے پر مبارکباد دینے آیا اور ان کی لوٹ مار میں اپنے حصہ کا مطالبہ کیا۔ بھنگی سرداروں نے فتح کیے گئے علاقے میں اس کو حصے دار بنانے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور حکمت عملی سے اسے مات کرنے کے لیے اسے زمزمہ توپ کی پیشکش کر دی اس امید پر کہ اس کا بھاری بھرکم حجم اسے یہاں سے لے جانے سے باز رکھے گا لیکن سکرچاکیہ سردار نے اپنے آدمیوں کو بلا کر اکٹھا کیا۔ پہلے اسے اپنے پڑاؤ پر اور بعد میں گوجرانوالہ میں اپنے قلعہ میں لے گیا۔ بعد میں اس کو چٹھوں نے پکڑ لیا۔ وہ اسے احمد نگر لے گئے۔ احمد خاں اور پیر محمد دونوں بھائی دو مخالف چٹھہ سردار تھے۔ وہ اس کے قبضہ کو حاصل کرنے کے لیے جھگڑ پڑے اور اس لڑائی میں اول الذکر کے دو بیٹے اور مؤخر الذکر کا ایک بیٹا ہلاک ہو گیا۔ گوجر سنگھ بھنگی پیر محمد خاں کی مدد کو آیا اور احمد خاں کو تنگ گھاٹیوں کی طرف دھکیل دیا۔ اسے ایک دن اور رات تک پانی کے بغیر رکھا۔ آخر کار چٹھہ سردار نے توپ کو گوجر سنگھ کے حوالے کر دیا۔ اس نے اپنے حلیف کو دھوکہ دیا اور خود اس پر قبضہ کر کے اسے اپنے صدر مقام گجرات لے گیا۔ یہ دو سال تک بھنگیوں کے پاس رہی۔ حتیٰ کہ سکرچاکیوں اور ان کے درمیان ایک معاہدے کے بعد چرت سنگھ سکرچاکیہ نے اسے ہتھیا لیا۔ چٹھے جو ہر وقت سکرچاکیوں سے لڑتے رہتے تھے 1772ء میں اسے بازیاب کرا لیا اور اسے رسول نگر لے گئے جو اس وقت رام نگر کے نام سے مشہور تھا۔ اگلے سال سردار جھنڈا سنگھ بھنگی نے ملتان سے لوٹتے وقت اس پر قبضہ کر لیا اور اس کو امرتسر لے گیا جہاں وہ 1802ء تک بھنگیوں کے قلعہ

میں رہی۔ اس کے بعد رنجیت سنگھ نے بھنگیوں کو امرتسر سے نکال کر اس کا قبضہ حاصل کر لیا۔ اس کو برتری کی علامت یا ٹوٹکہ سمجھا جانے لگا۔ چنانچہ رنجیت سنگھ نے اسے ڈسکہ، قصور، سوجان پور، وزیر آباد اور ملتان کی مہموں میں استعمال کیا۔ 1818ء میں ملتان کے محاصرے کے دوران اسے بری طرح نقصان پہنچا۔ چنانچہ اس کو مزید استعمال کے لیے ناکارہ سمجھ کر لاہور بھیج دیا گیا اور اس کو 1870ء تک شہر کے دہلی دروازہ پر رکھا گیا۔ پھر اس کو موجودہ جگہ پر رکھ دیا گیا۔ اس کے بارے میں پہلے بھی لکھا جا چکا ہے۔ بہت سے لوگ اس کو ہندوؤں کے دیوتاؤں میں سے سب سے نمایاں دیوتا، مہادیو کا اوتار سمجھ کر اس کا بڑا احترام کرتے ہیں۔

توپ کے منہ یا تھوتھنی کے اردگرد فارسی کی مندرجہ ذیل عبارت کندہ ہے:۔

بامر در دوران شہ ولی خان وزیر

ساخت توپ زمزمہ نام قلعہ گیر

عمل شاہ نظیر

ترجمہ:۔ شہنشاہ در دوراں شاہ ولی خاں کے حکم سے وزیر نے یہ توپ بنام زمزمہ بنائی جو قلعہ گیر ہے۔ عمل۔ شاہ نظیر

توپ کی پشت پر درمیان میں مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

در زمان شہ فریدون فر — داور داد بخش عدل شعار

در دوران عصر احمد شاہ — خسرو تخت گیر جم مقدار

شد بدستور اشرف انور را — امر از سدہ سپہر مدار

کہ بریزد باہتمام تمام — توپ شعبان شکوہ کوہ وقار

خانہ زاد شہ سپہر سریر — شہ ولی خان وزیر اکثر کار

بہر تقدیم آن مہم سترک — کرد استاد چند را احضار

تا بسعی، تمام ریختہ شد — زمزمہ نام توپ نادر کار

قلعہ کوٹ حصار چرخ دوم — شد با اقبال شاہ روبرکار

سال تاریخش از خرد جستم — کرد با وحشت ان چنان اظہار

کہ اگر نقد جان کنی تسلیم — راز پنہان بتو کنم تکرار

بعد تسلیم او بگفتا توپ — پیکری اژدھائی آتشباز

ترجمہ:۔ اس بادشاہ کے دور حکومت میں جو فریدوں کی شان و شوکت رکھتا ہے،

تعریف و توصیف کا حقدار اور عدل کرنے والا ہے۔ زمانے کا موتی احمد شاہ ، بادشاہ تخت کو تسخیر کرنے والا اور جمشید جیسی شان و شوکت کا مالک ہے۔ بادشاہ کے دربار سے بڑے وزیر کو یہ حکم ملا کہ ہر ممکنہ ہنر کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک ایسی توپ بنائی جائے جو اژدھے کی طرح خوفناک اور پہاڑ کی طرح بڑی ہو۔ چنانچہ خانہ زاد سپہر سریر شاہ ولی خاں وزیر معاملات نے اس حکم کی تعمیل میں نہایت بہترین کاریگروں کو جمع کیا اور اس کام کو مکمل کیا۔ لہذا یہ عجیب و غریب زمزمہ توپ تیار ہو گئی۔ اتنی تباہ کن کہ آسمان کے در و دیوار کو ہلا دینے والی۔ آخر کار اس کو بادشاہ کے حوالے کر دیا گیا۔ میں نے خرد سے اس توپ کی تاریخ کے بارے میں دریافت کیا تو خرد نے خوف سے کانپتے ہوئے جواب دیا: "اگر تم اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتے ہو تو میں تم پر ایک راز آشکار کرتی ہوں۔" میں رضامند ہو گیا اور اس نے جواب میں کہا: "کیسی عجیب توپ ہے ایک ہتھیار آگ اگلتے اژدھے کی طرح ہے۔"

یہ توپ شگاف کے علاوہ 14 فٹ ساڑھے چار انچ لمبی ہے۔ دھانے کا قطر ساڑھے نو انچ ہے۔

سکھوں کی توپوں پر درج عبارات

سکھوں کی پہلی جنگ کے خاتمے پر 6 مارچ 1846ء کو برطانوی حکومت اور سکھ ریاست کے درمیان لاہور میں ایک تائیدی معاہدے پر دستخط کیے گئے۔ اس کے مطابق عزت مآب گورنر جنرل نے سکھ دربار کی پرزور استدعا پر لاہور کی چھاؤنی میں اس وقت تک برطانوی فوج کو چھوڑنے پر رضامندی کا اظہار کر دیا جب تک کہ سکھ فوج از سر نو منظم نہیں ہو جاتی۔ فوج کو بغیر کسی وجہ کے سال کے آخر تک ایک لمبے عرصہ تک چھاؤنی میں رہنا تھا۔ میجر (بعد میں سر) ہنری لارنس کو معاملات کا انتظام سپرد کر کے روانہ کیا گیا۔ اس وقت 250 توپیں جن کو برطانوی دستوں نے آخری جنگوں میں قبضہ میں لیا تھا کلکتہ کے لیے روانہ کی گئیں۔ ان کو برطانوی علاقوں میں سے گزرنے پر فوجی دستوں نے ہر چوکی پر جہاں وہ رکتی تھیں، سلامی دی اور اپنی منزل مقصود پر پہنچنے کے بعد ان کا سرعام بڑے تزک و احتشام سے استقبال کیا گیا۔ یہ فتوحات کچھ اس قدر بعید القیاس مختصر وقت میں حاصل کی گئی تھیں اور لوگوں میں خالصہ فوج کی طاقت کا خیال جڑ پکڑ چکا تھا

لہذا اس سے بے خبر لوگوں کو فتوحات کی حقیقت سے آگاہ کرنے کے لیے اس بات پر صلاح مشورے کے بعد غور کیا گیا کہ ان کی نمائش کی جائے۔ پکڑی گئی ان توپوں میں سے 38 پر فارسی اور ہندی زبان کی عبارات درج ہیں۔ ہم یہاں پر تحفۃ الحباب یا مرزا عبدالکریم کی فارسی زبان میں سرگذشت میں درج چند عبارات کی نقول پیش کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک توپ پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

قوی طالع شاہ رنجیت سنگھ — ہم ملک را زیر کردہ چو خنگ

کھڑک سنگھ شہزادہ عالی مکان — کہ دانائی کوران بود مادران

فتح جنگ شد در زمانی تیار — کہ بجدہ صد و بود ہتشاد و چار

جمعدار این توپ شد رائے سنگھ — کہ در جان منشا نیست او بید رنگ

بموجب صلاح لالہ جئے سنگھ یار — غلام نبی گفت تاریخ دار

دستخط گرو تارا گیر بتاریخ پنجم ماہ ماگھ سمت 1884

ترجمہ:۔ عالی حشمت رنجیت سنگھ نے پورے ملک کو گھوڑے کی پشت پر بیٹھ کر زیر کر لیا ہے۔ شہزادہ کھڑک سنگھ جس کی والدہ تمام شہزادیوں سے زیادہ دانا ہے اس کے پاس ایک عالی شان مکان ہے۔ توپ "فتح جنگ" کو سال سمت) 1884 میں بنایا گیا۔ اس توپ کا محافظ رائے سنگھ ہے جو اپنی جان قربان کرنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتا۔ اپنے دوست جئے سنگھ کے مشورے کے مطابق غلام نبی نے توپ کی تاریخ درج کی ہے۔ دستخط گورو تارا گیر 5 ماگھ 1884ء

ایک دیگر عبارت حسب ذیل ہے:۔

چو اژدر ہا بجان و دل لبے داغ کہن دارم

حذر کن ای رقیب از من کہ آتش درحن دارم

قطعہ

ای راست روے توپ ز نواب نامدار

در راستی و پیروی خودیگانہ

اژدردی و شیر نژادی و جنگ جو

ماری و مہرہ داری و صاحب خزانہ

سرکار نواب محمد شجاع خان بہادر صفدر جنگ سنہ 1182 ہجری النبوی اسمش

کوہ شکن بوزن یکصد و دہ من گولہ بمقدار دھن و باروت نصف از گولہ در وزن

ترجمہ :۔ ایک اژدھے کی مانند میرے ذہن اور دل پر بہت سے پرانے داغ ہیں۔
اے دشمن! مجھ سے دور رہو۔ میرے منہ میں آگ ہے۔

قطعہ

اے راست باز توپ تم مشہور نواب کی ملکیت ہو
بڑائی اور راست بازی میں تمہارا کوئی ثانی نہیں
اژدھے کے سانس والی شیر کے حوصلے والی اور جنگجو
تمہارے پاس سانپ کی طرح مہرہ اور حکومت کا خزانہ ہے

" حکومت نواب محمد شجاع خاں بہادر صفدر جنگ 1182 ہجری، اس اتوپ کا نام کوہ شکن ہے۔ اس کا وزن 110 من ہے۔ اس کا گولہ دہانے کے مطابق اور بارود گولے سے نصف مقدار میں ہوتا ہے"۔

نوٹ :۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس توپ کو سکھوں نے ملتان میں نواب شجاع خاں کے ساتھ جنگ میں پکڑا تھا۔

ایک دوسری توپ پر درج عبارت :۔

سری اکال سہائی

ھست این توپ مصر بیلی رام	ھاتفش گفت فتح و نصرت نام
ضرب آتش فشاں و برق شرار	صبح اعدا ز دود او چون شام

سمت 1840

ترجمہ :۔ سری اکال شاہی

اس توپ کا تعلق مصر بیلی رام سے ہے۔ ایک غیبی آواز نے اس کو "فتح و نصرت" کا نام دیا۔ یہ آگ اگلتی اور شرارے پھینکتی ہے۔ اس کے دھویں سے دشمن کی صبح شام میں تبدیل ہو جاتی ہے۔" سمت 1840ء "

ایک اور توپ پر سیدھی سادی عبارت درج ہے :۔

بفضل اکال سہائی از حکم بادشاہ رنجیت سنگھ بہادر بلند اقبال، توپ جنگ بجلی باھتمام جواہر مل بکار خانہ صوبہ سنگھ ساخت دار السلطنت لاہور قسمت 1898 در تحت سردار فتح سنگھ۔

ترجمہ :۔ اکال شاہی کے فضل سے اور بادشاہ رنجیت سنگھ بہادر بلند اقبال کے حکم سے توپ "جنگ بجلی" کو جواہر مل کی نگرانی میں دارالسلطنت لاہور میں واقع صوبہ سنگھ کے کارخانے میں سمت 1898 میں زیر نگرانی سردار فتح سنگھ بنایا گیا۔

لاہور کے قلعہ میں ڈھالی جانے والی توپ پر درج عبارت :۔

بموجب حکم حضور فیض گنجور سنگھ صاحب سرتاج خالصہ بادشاہ رنجیت سنگھ جیو دام اقبالہ باھتمام میاں قادر بخش در قلعہ مبارک لاہور توپ دیوان لالہ موتی رام و رام دیال تیار شد سمت 1881 اسم توپ فتح جنگ عمل محمد حیات۔

ترجمہ :۔ حضور فیض گنجور، سنگھ صاحب سرتاج خالصہ رنجیت سنگھ بادشاہ جیو کے حکم کے تحت یہ توپ جو دیوان لالہ موتی رام اور رام دیال سے متعلقہ ہے اس کو لاہور کے مبارک قلعہ میں میاں قادر بخش (20) کی زیر نگرانی 1881 سمت میں تیار کیا گیا۔

اس توپ کا نام "فتح جنگ" ہے۔ عمل :۔ محمد حیات۔

بہت سی توپوں پر جنرل کورٹ صاحب کا نام درج ہے۔

مندرجہ ذیل عبارت ان میں سے ایک کے اوپر درج ہے :۔

بفضل سری اکال پور کہ جی مہاراجہ رنجیت سنگھ بہادر دام ملکہ و سلطنتہ سری مہاراجہ صاحب ادھیراج در سمت 1887 از راجہ بکر ماجیت ھذا اضرب موسومہ لیلان حسب الامرا شرف اقدس اعلیٰ حضور انور باھتمام صاحب اڑسطو فطرت فلاطون زمن مشیر شوالیر جنرل کورٹ صاحب بہادر در عید گاہ بحسن خدمت فضل علی کمیدان شاگرد صاحب ممدوح بہادر ریختہ شد۔

ترجمہ :۔ بفضل سری اکال پور مہاراجہ رنجیت سنگھ بہادر (اس کی حکومت اور سلطنت ہمیشہ قائم رہے) کے دور حکومت میں بادشاہ کے حکم سے لیلاں نام کی یہ توپ سمت 1887 بکر ماجیت کے سال میں اعلیٰ حضور صاحب بہادر ارسطو فطرت، افلاطون زمانہ جنرل کورٹ صاحب بہادر کے مقدس اور اعلیٰ حکم کی زیر نگرانی عید گاہ کے کارخانے میں صاحب ممدوح کے شاگرد فضل علی کمیدان کی زیر ہدایت تیار کی گئی۔

ان میں سے ایک توپ پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

ھست این توپ اژدھائی دھان　　از دم خود شرار برق افشاں

بیک آواز خود کنز ناگاہ　　بخت دشمن چو دود خویش سیاہ

پئی تفتح قلعہ سخت چو خنگ زین سبب نام گشت نصرت جنگ در عہد بادشاہ رنجیت سنگھ بہادر توپ سردار جوالا سنگھ بہرانیہ باھتمام منشی دلباغ رائے سمت 1870 عمل رائے سنگھ توپ ساز در سال یکھزار وھشت صد وھشتاد و ھفت اتمام یافت۔

ترجمہ:۔ اس توپ کا منہ اژدھے کی طرح ہے جب یہ سانس لیتی ہے تو اس میں سے بجلی کے شرارے نکلتے ہیں اور یہ ایک ہی آواز میں دشمن کی قسمت میں اپنے دھویں کی طرح اندھیرا کر سکتی ہے۔ جب سے اس نے ناقابل تسخیر قلعے فتح کرنے شروع کیے ہیں اس کا نام نصرت جنگ رکھ دیا گیا ہے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ بہادر کے دور حکومت میں اس توپ کو جو سردار جوالا سنگھ بہرانیہ سے متعلق ہے۔ اس کو سمت 1887 میں منشی دلباغ رائے کی نگرانی میں بنایا گیا۔

عمل رائے سنگھ توپ ساز

چند توپوں پر شاہی خاندان کے شہزادگان کے نام درج ہیں۔ ان میں سے ایک پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

از فضل گورو نانک و لطف گوبند سنگھ

وز حکم شہزادہ نونہال سنگھ

شد توپ نو تیار ظفر جنگ شرپسند

منصوب توپ خانہ جرنیل تیج سنگھ

ضرب سورج مکھی ساخت لاہور سمت 1897۔

ترجمہ:۔ گورو نانک کے فضل و کرم اور گوبند سنگھ کی عنایت سے شہزادہ کنور نونہال سنگھ کے حکم کے تحت یہ نئی توپ بنام ظفر جنگ و شاہ پسند ڈھالی گئی۔ یہ جرنیل تیج سنگھ کے توپ خانہ سے تعلق رکھتی ہے۔

سورج مکھی کے سلسلہ میں۔ تیار شدہ لاہور سمت 1897۔

نواب علی مردان خاں کے آباؤ اجداد

لاہور کے آثار قدیمہ میں سے مشہور زمانہ (نہروں کے انجینئر) نواب علی مردان خاں کا شجرہ نسب اور اس وقت لاہور میں رہائش پذیر علی مردان خاں کے جانشین اور کابل کے جاگیردار نواب امیر محمد خاں کے قبضہ میں بیشمار قدیم شاہی اسناد اپنے ساتھ منسلکہ دلچسپی اور قدیم دستاویزات کے طور پر اور ایک ایسے خاندان کی تاریخ کا پتہ چلانے کی اہمیت کے لحاظ سے ذکر کیے جانے کی مستحق ہے جو ایک زمانہ میں اس ملک کی داستانوں میں بہت نامور تھے۔ ان کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

شجرہ نسب درج ذیل ہے:۔

مظفر الدین جہاندار شاہ

فرخ شاہ بادشاہ

شاہ رخ مرزا

شہزادہ علی قلی خاں

سردار حلاج علی خان

سردار گنج علی خاں

نواب علی مردان خاں

سردار بہرام علی خاں

سردار محمد حسین خاں

سردار علی خاں

نواب شاہ بادل خاں

نواب فریدون خاں

نواب امیر محمّد خاں

سردار شاہ پسند خاں

مظفر الدین جہاندار شاہ، مغل بادشاہ ظہیر الدین محمد بابر (جس نے ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی) کے والد عمر شیخ مرزا کے دور حکومت میں توران، آذر بائیجان کا گورنر تھا۔ اس کا پڑپوتا شہزادہ علی قلی خاں 33 سال تک شیروانہ کا حاکم رہا اور موخرالذکر کا پوتا گنج علی خاں

پندرہ سال تک گرجستان کا حاکم رہا۔ نواب علی مردان ایرانی بادشاہ شاہ صفی کے تحت ہرات اور قندھار کا حاکم تھا۔ اس نے اپنے آقا کی ظالمانہ کارروائیوں کے نتیجہ میں بغاوت کر دی اور 1637ء میں لاہور پہنچ کر شاہ جہاں کے ساتھ مل گیا۔ اس کا بیٹا سردار بہرام خاں شیروانہ کا حاکم اور اس کا پوتا سردار علی خاں ترکستان کا حاکم تھا۔ نواب شاہ بادل خاں 47 سال تک شکار پور (سندھ) کا حکمران رہا۔

قدیم مہریں

نواب علی مردان خاں کے پوتے سردار علی خاں کے حق میں ملتان کے صوبہ میں بتاریخ 18 شعبان یعنی بادشاہ احمد شاہ کی بادشاہت کے پہلے سال 1,61,000 روپے مالیت کی جاگیر کے کاغذات پر وزیر صفدر جنگ کی مندرجہ ذیل مہر درج ہے:۔

احمد شاہ بہادر ہے
فدوی بادشاہ غاز
ہے
ابوالمنصور خان بہادر صفدر
جنگ
وزیر الممالک برہان الملک
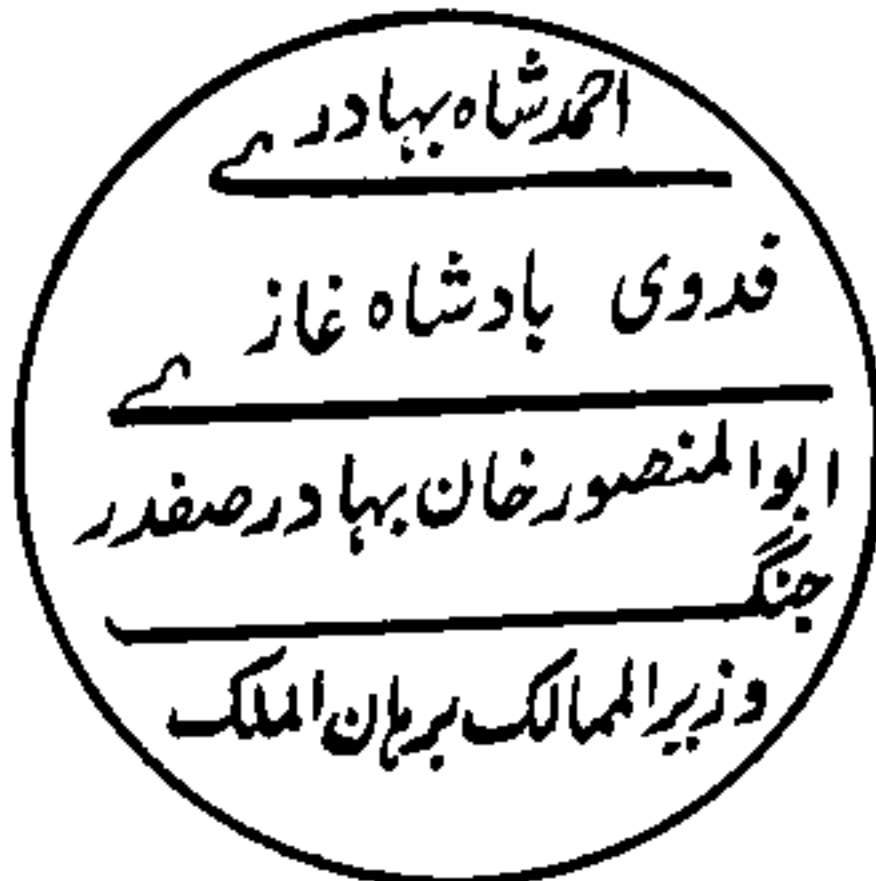
ترجمہ:۔ وزیر الممالک برہان الملک، عبدالمنصور، بہادر، صفدر جنگ، فدوی احمد شاہ بادشاہ بہادر غازی (21)۔

3 شعبان، بادشاہ محمد شاہ کی بادشاہت کے تیسرے سال سردار علی خاں کے حق میں اسی طرح کی جاگیر کے پروانہ پر وزیر قمرالدین خاں کی مندرجہ ذیل مہر درج ہے۔ یہ صفدر جنگ کی مہر سے چھوٹی ہے:۔

محمد شاہ بادشاہ غاز ہے
سنہ محمد شاہی فدو ہے
نصرت جنگ اعتماد الدولہ
وزیر الممالک قمرالدین خان بہادر
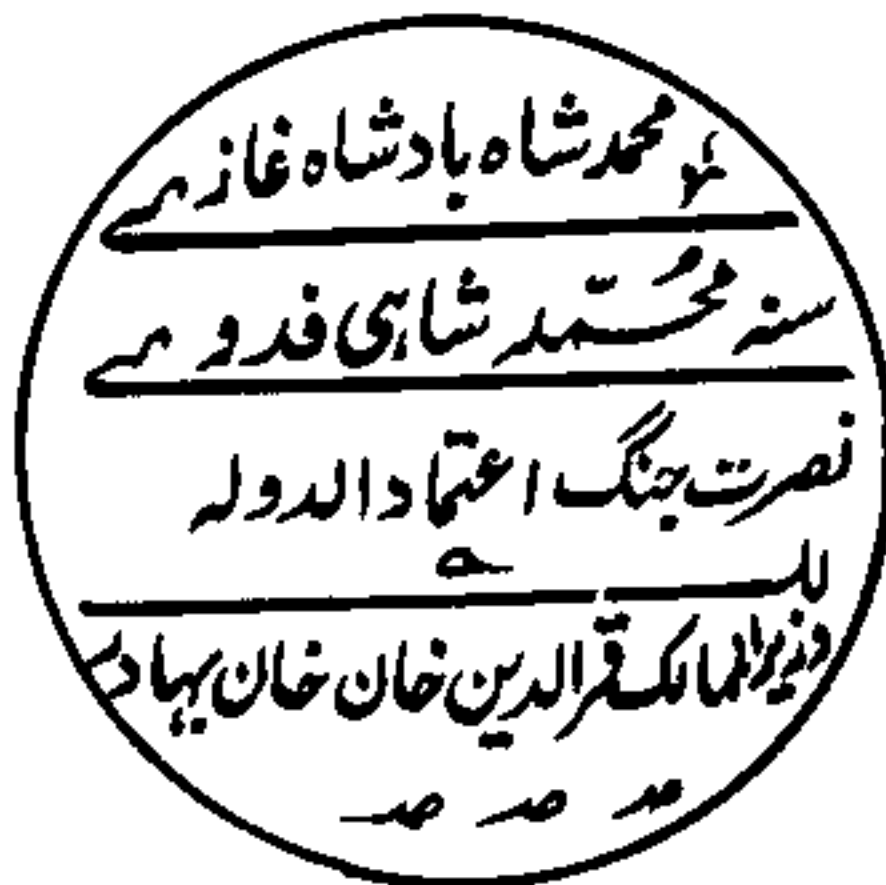
ترجمہ :۔ اعتماد الدولہ ، وزیر الممالک ، قمر الدین خاں ، خان بہادر ، نصرت جنگ ، فدوی محمد شاہ ، بادشاہ ، غازی ، سنہ محمد شاہی۔

12 ذوالحجہ 1165 ہجری کو بادشاہ احمد شاہ کی طرف سے جاری کردہ ایک شاہی سند جس میں نواب علی مردان خاں کے پاس ہندوستان ، پنجاب اور کابل کی جاگیروں کو ترکستان کے والی سردار علی خاں جوان شیر کے سپرد کیا گیا ہے۔ اس پر وزیر معین الدین خاں کی مندرجہ ذیل مہر کا عکس ہے :۔

احمد شاہ بہادر غازی
جنگ فدوی بادشاہ
بہادر
معین الملک اقتدار الدولہ
دلیر
معین الدین خان
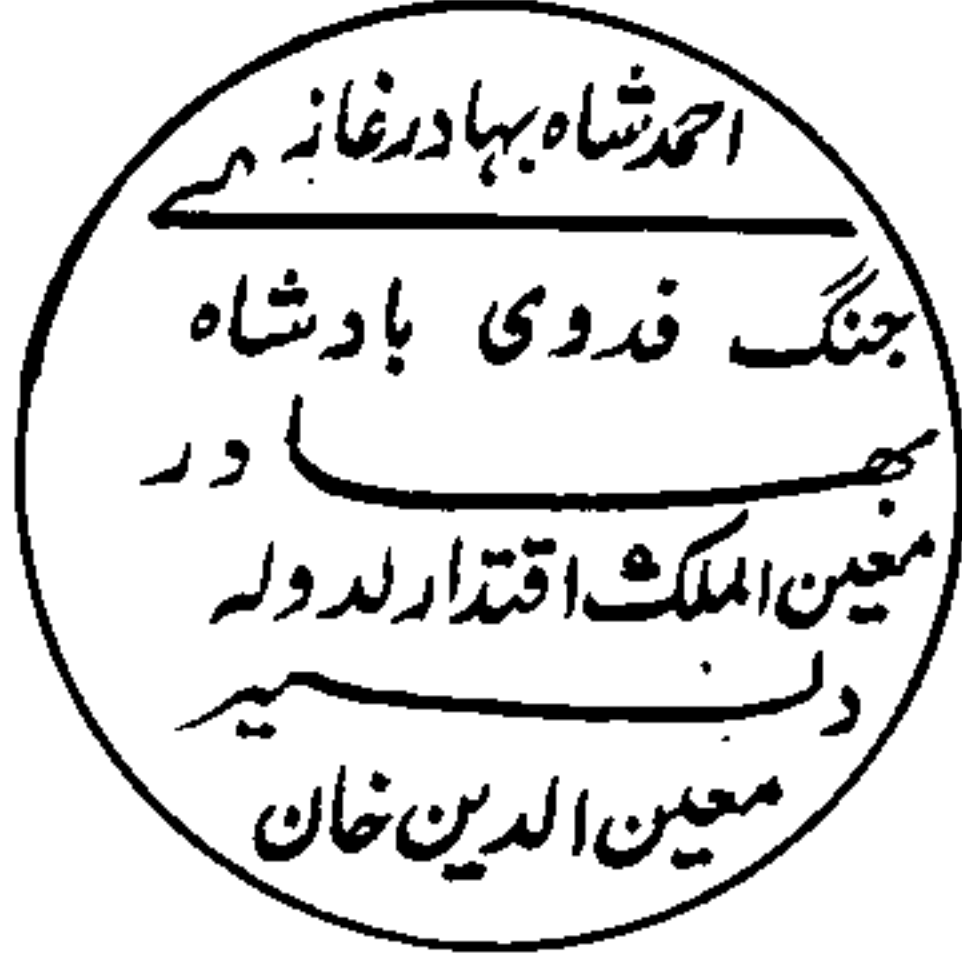
ترجمہ :۔ معین الملک ، اقتدار الدولہ ، معین الدین خاں ، دلر جنگ ، فدوی ، احمد شاہ بہادر بادشاہ غازی۔

چند کاغذات پر شاہ شجاع کی مندرجہ ذیل مہر ثبت ہے :۔

اللہ
الملک
سنہ یاھو الہی
شد از عین عنایا ہے
مسلم بر شجاع الملک شاہ

الملک للہ

یاھو
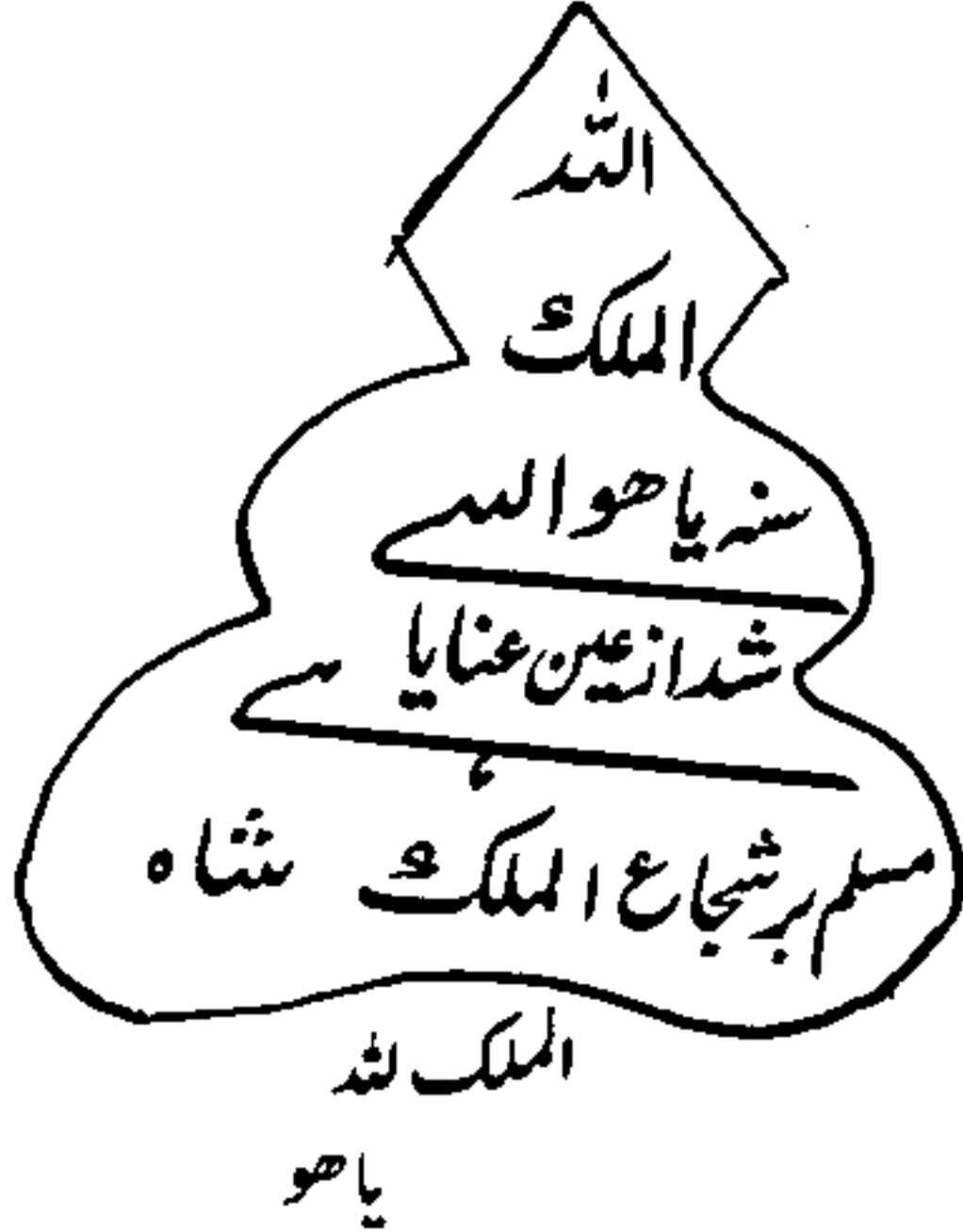
شد از عین عنایات الھی مسلم بر شجاع الملک شاھی

سنہ 1207

ترجمہ :۔ حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے۔

یاھو۔

اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت سے شجاع الملک اس ملک کا تسلیم شدہ حکمران بن گیا ہے۔

1207 ہجری

نواب امیر محمد خاں اور ان کے بیٹے شاہ پسند خاں کے قبضہ میں بیشمار شاہی اسناد پر شاہ زمان کی مندرجہ ذیل مہر ثبت ہے:۔
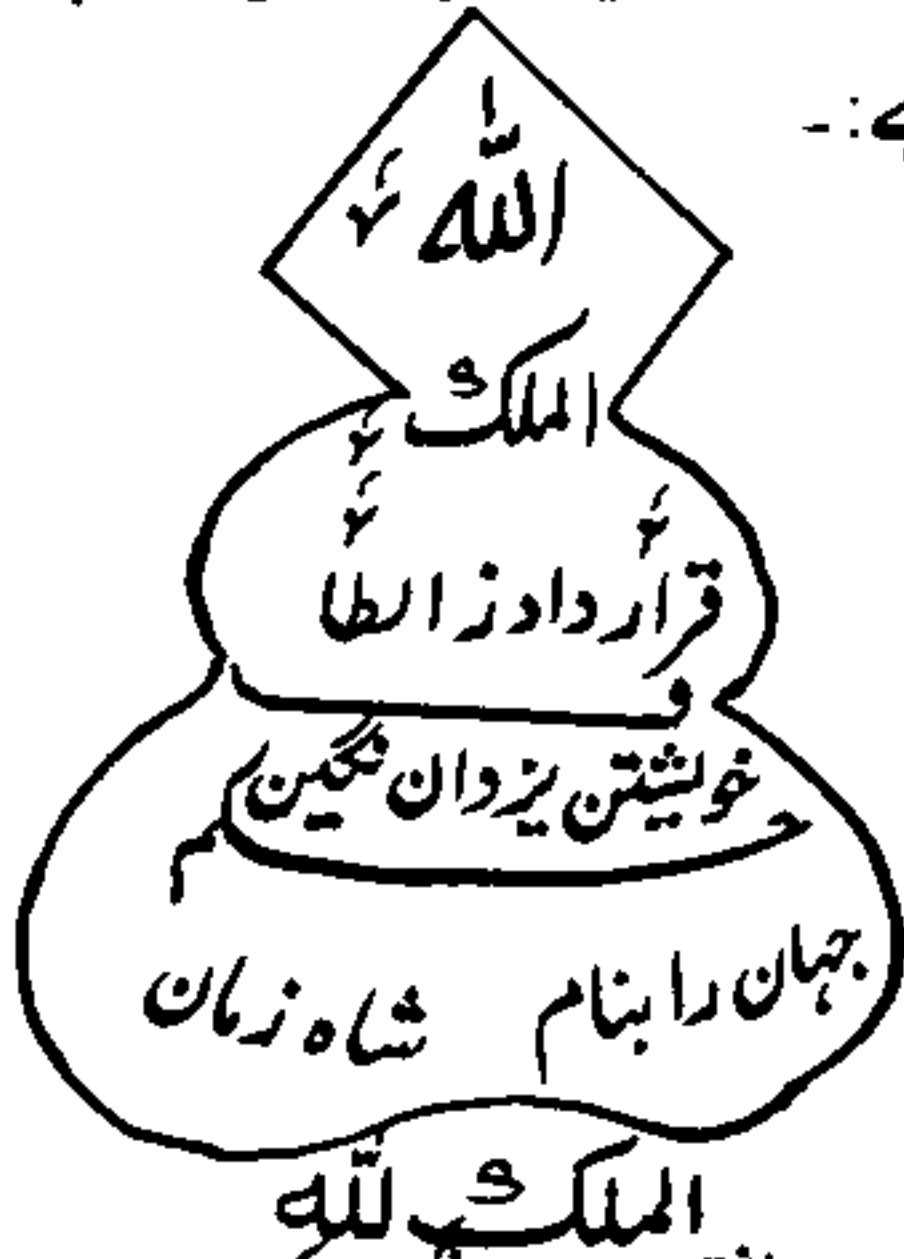
الملک لله

قرار داد ز الطاف خویشتن یزدان نگین حکم جہاں را بنام شاہ زمان

ترجمہ:۔ حاکمیت اللہ کی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے دنیا کی بادشاہت پر شاہ زمان کے نام کی مہر ثبت کر دی ہے۔

فرمانوں پر شاہ زمان کے وزیر نظام الدولہ وفادار خاں کے دستخط موجود ہیں۔ نواب کے پاس مرحوم امیر دوست محمد خاں کے کئی خطوط ہیں جو افغان تاریخ میں بہت مشہور ہے۔ ان پر امیر نے خود دستخط کیے ہیں۔ امیر اپنے نام کے دستخط مندرجہ ذیل انداز میں کیا کرتے تھے۔

دوست محمد

ان کی مہر کا عکس مندرجہ ذیل ہے:۔
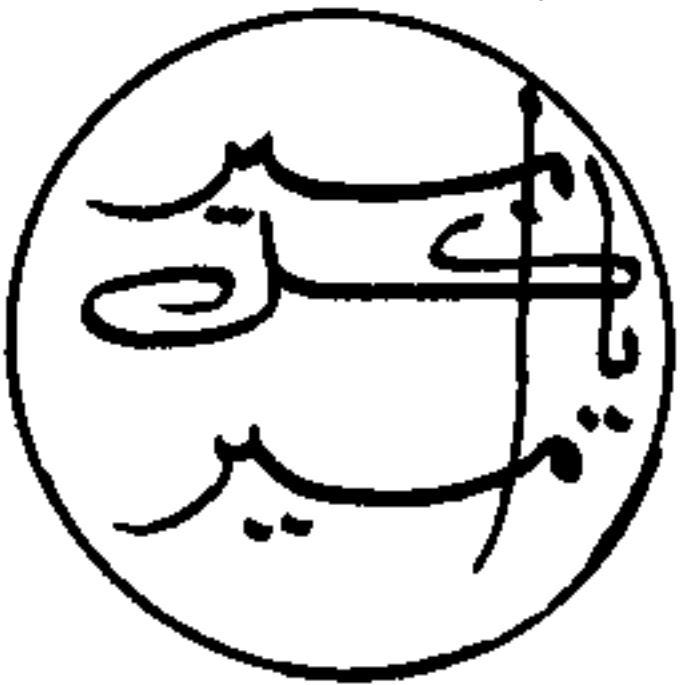
یاامیرالکل امیر

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔

کاشی کا کام

پنجاب میں عمارتوں کو روغنی یا منقش ٹائلوں سے سجانے کا فن جو، کاشی یا چینی کے کام سے مشہور ہے اس کی ابتداء عربوں سے ہوئی۔ نویں صدی کے اختتام پر عرب ہی اسے یورپ لے کر آئے۔ 14 ویں صدی میں مٹی کے برتن بنانے کے لیے اطالویوں نے اس میجولیکا کے نام سے اختیار کیا۔ یورپ میں متعارف ہونے کے بعد اس کو زبردست فروغ حاصل ہوا اور وقت گزرنے کے ساتھ لیموگیسس، ڈریسڈن، سیوروز اور پلیسی جیسے چینی کے برتنوں کو جنم دیا۔

یہ ایران میں مغلوں کے ذریعے چین سے ہندوستان تک 13 ویں صدی کے آخر میں متعارف ہوا اور ایک روایت کے مطابق تیمور لنگ کی چینی نژاد بیوی کے اثر و رسوخ نے اس کو مشرقی ممالک میں متعارف کرانے میں بڑی مدد دی۔ چودھویں صدی میں یہ سامی اقوام میں بھی دوسری اقسام میں موجود ملتا ہے۔

میجر کولے آر۔ ای نے پتہ چلایا ہے کہ رامسیس دوئم (1452 قبل مسیح) کے زمانہ میں بھی روغنی ٹائلوں کو زرعی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ ابتدائی زمانہ سے چینی باشندے اپنی عمارتوں میں چینی کی رنگین ٹائلیں استعمال کرتے آئے ہیں میجر کولے لکھتے ہیں " لیکن ابھی تک میں نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ مسلمانوں کی پہلی عمارت جس میں روغنی ٹائلوں کو استعمال کیا گیا ہے وہ اسپین میں مسجد قرطبہ ہے جس کو پرلیے 965ء اور فرگوسن 1200ء کے زمانہ سے منسوب کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں فرگوسن ایران میں تبریز کی مشہور زمانہ مسجد کو جو 13 ویں صدی کے اختتام پر تعمیر کی گئی، روغنی منقش ٹائلوں کے استعمال کے لیے پہلی مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

اس کو ایران پر مغلوں کی فتح کے کچھ عرصہ بعد تعمیر کیا گیا۔ اس سلسلہ میں دوسری مثال سلطانیہ میں محمد خدا بندہ کے مقبرہ کی دی جاتی ہے جس کو تبریز کی مسجد کے بانی اور غازن خان کے جانشین نے تعمیر کرایا تھا(22)۔

لاہور میں سب سے پہلے جس عمارت میں بیرونی آرائش کے لیے روغنی منقش ٹائلیں

استعمال کی گئیں۔ اس کے لیے شاہ موسیٰ کے مقبرے کی مثال پیش کی جاتی ہے جس کو (1519ء) میں ابراہیم لودھی کے دور میں یا ہندوستان پر بابر کے حملہ سے کچھ عرصہ پیشتر تعمیر کیا گیا لیکن مغلیہ دور تک اس فن کا عام استعمال شروع نہیں ہوا۔ شاہجہاں کے دور میں اس کو نئی شکل دی گئی۔ اس دور میں منقش ٹائلوں کا استعمال بڑی حد تک ختم ہو گیا تھا اور آرائشی کام کو ایک سخت قسم کے سیمنٹ میں بنایا جاتا تھا۔ غالباً یہ طریقہ نسبتاً سستا تھا۔ شاہ جہاں کے دور میں کاشی کاری کے ڈیزائنوں کو ہر جگہ اپنایا گیا تھا۔ ہم کو اس زمانے میں بمشکل کوئی ایسی مسجد، مقبرہ یا دروازہ نظر آتا ہے جس کو کاشی کاری سے آراستہ نہ کیا گیا ہو۔ مسٹر تھارنٹن لکھتے ہیں۔ حیران کن بات یہ ہے کہ شاہجہاں کے دور کے بعد کاشی کاری کے ڈیزائن جو عمارت کی زینت ہوتے ہیں ان کے استعمال کو تقریباً ترک کر دیا گیا اور یہ فن پنجاب میں بالکل ختم ہو کر رہ گیا (23)۔ لیکن یہ فن جس کو عمارات کی تزئین و آرائش کے لیے بہت زیادہ استعمال کیا گیا تھا ہندوستان اور ایران میں تقریباً ختم ہو گیا ہے اور یہ مشرقی ممالک سے غائب ہو گیا ہے لیکن اب اس کا گھر اور جائے پیدائش مغربی ممالک ہیں جو اس کو اپنی روزمرہ استعمال کی اشیاء میں بھی استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے اس نے وہاں بہت ترقی کر لی ہے۔

لاہور میں کاشی کاری کے کام سے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ 1876ء میں اس شہر میں اسی کام کے ایک فنکار محمد بخش رہتے تھے وہ اس وقت 97 سال کی عمر کے تھے اور ان کے ساتھ ہی غالباً کاشی کاری کے فن کا راز بھی ختم ہو گیا کیونکہ انہوں نے شاگرد بنانے سے انکار کر دیا تھا۔

سنگ مرمر کی ایک تختی پر درج فارسی عبارت :۔ لاہور کے عجائب گھر میں سنگ مرمر کی ایک تختی پر فارسی کی مندرجہ ذیل عبارت درج ہے :۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم و بہ نستعین ۔ در عہد سعادت مہد حضرت اورنگ زیب بادشاہ عالمگیر سنہ دوازدہ جلوس والا مطابق سنہ 1080 ہجری بندہ درگاہ معین شمشیر خاں ترین بعنایت الہیٰ و اقبال شاہنشاہی ملک مندر را بتصرف اولیای دولت قاہرہ در اورده این قلعہ و عمارت و چاہ را ساخت

ترجمہ :۔ اللہ کے نام سے جس کی مدد چاہتا ہوں۔ بادشاہ عالمگیر حضرت اورنگ زیب کے عہد سعادت میں بادشاہت کے 12 ویں سال بمطابق 1080 ہجری شاہی دربار کے خادم شمشیر خاں ترین نے اللہ کے فضل و کرم سے اور اقبال شہنشاہی سے مندر کا ملک فتح کیا اور فاتح ملک کے خادموں کے لیے قلعہ عمارت

اور کنواں تعمیر کرایا۔

عجائب گھر لاہور میں سکے

عجائب گھر لاہور میں ماہرین آثار قدیمہ کی دلچسپی کے لیے سب سے زیادہ قیمتی خزانہ یونانیوں کے حملہ سے لے کر موجودہ دور تک کے مختلف ادوار کے قدیم سکوں کا ذخیرہ ہے۔

ولسن، پرنیسپ، ایڈورڈ تھامس، جنرل کننگھم اور بہت سے علماء کے "علم سکوکات" (سکوں کا علم) کے مطالعہ اور تحقیق نے ہندوستان کی تاریخ میں یونانی آبادکاریوں کے دور اور مسلمانوں کے حملوں کے زمانہ کے درمیان موجود خلاء کو بڑی حد تک پر کیا ہے اور ان کے مشاہدہ سے ہم اپنے علم میں اضافہ کرتے ہیں۔ تاہم یونانیوں، ہند۔ سکا تھیئن، برہمن اور ہندو بادشاہوں کی بیشمار سلطنتیں جو کابل، جلال آباد اور درہ خیبر سے قدیم ہسپودرا تک پھیلی ہوئی تھیں ان کے بارے میں مکمل آگہی حاصل نہیں ہے۔ اس ملک پر مسلمانوں کے حملہ سے پہلے بادشاہتیں اور خاندان صدیوں کے وقفوں میں ابھرتے رہے، آباد ہوتے رہے اور ختم ہوتے رہے۔ ان کے مکمل ناموں کو محفوظ نہیں کیا جا سکا۔ قصبات اور شہر بستے اور اجڑتے رہے اور ان میں سے کسی کے بارے میں بھی ریکارڈ موجود نہیں ہے جبکہ ان کے اصل محل وقوع کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ سکوں کی شہادت سے، کافی عرصہ سے فراموش کی گئی بادشاہتوں اور خاندانوں کی تاریخ کے نقطہ آغاز کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ماہرین آثار قدیمہ کو اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ قدیم تاریخ میں ان کے مٹے ہوئے یا روایتُ اور داستان کی خلیج میں گم شدہ نقوش کی نشاندہی کر سکیں۔ یقیناً یہ ان تشریحی نقشوں کی مانند ہیں جن میں تفصیلات کو بڑے صبر و تحمل اور احتیاطی تحقیق سے پر کرنا پڑتا ہے۔

اس قیمتی خزانے کو جمع کرنے کا سہرا حکومت پنجاب کے سر ہے جس نے حال ہی میں مسٹر سی۔ جے راجرز کی طرف سے ان سکوں کے بارے میں تیار کردہ ایک کتابچہ شائع کرایا ہے۔ یہ سکے بڑی دلچسپی کے حامل ہیں اور مستقبل کے مورخین کو اپنا کام مکمل کرنے میں بڑی مدد دے سکتے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے ابھی بہت سے ایسے ہیں جن کے متعلق تحقیق کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ماضی کی تاریخ سے ان کے تعلق کو جوڑنے کے لیے مزید نمونہ جات حاصل کیے جا سکیں۔

سکندر کے دور کا نقرئی سکہ:۔ حکومت پنجاب کے عطیہ کے ذریعے حاصل ہونے والے یونانی دور کے سکوں میں اول الذکر سکندر اعظم سے متعلقہ چاندی کا سکہ ہے۔ اس سکے کی پیشانی پر ایک سر کی تصویر ہے۔ سر کے دائیں جانب شیر کے سر کی کھال صافے کے طور پر دکھائی گئی ہے۔ پشت کی

طرف مشتری کو تخت پر بیٹھے اور دائیں ہاتھ میں شکرے کو تھامے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

یونانی بادشاہوں کے سکے:۔ وہاں پر یونانی بادشاہوں مثلاً اینٹیوکسن، سوفائٹس، ڈائیوڈوٹس، یوتھائی ڈیمس اول، ڈیمٹیر رئیس، یوتھائی ڈیمس دوئم، اینٹی میکس، تھیوس، یوکریٹائیڈز، ہیلیوکلر، اینٹیئل کائیڈکس، لائسیاس، ڈائیو میڈیس، آرکیبی ایئس، اپولو ڈوٹس، سٹریٹو، اگیتھو کلیاس، مینندر، اپینڈر، زوئیس، اینٹی سیکس، نائیک فورس، فلو کسینس، نیکیاس، ہپو سٹریٹس، ر مینتھس ہرمائیوس، کیلیوپ کے سکے موجود ہیں۔

ان میں سے زیادہ تر سکوں پر خود پہنے بادشاہ کو دائیں جانب اور بائیں جانب ہرکولیس کو دائیں ہاتھ میں نیزا پکڑے چٹان پر بیٹھے ہوئے یا مشتری کو تخت پر بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ان میں سے چند سکوں پر دائیں جانب ایک بادشاہ کے بالائی دھڑ کی تصویر ہے۔ اس نے ہاتھی کے سر کو تاج کی طرح پہنا ہوا۔ دوسروں پر اپولو کا سر یا شیر، ہاتھی، ہندوستانی بھینسے، بیل، الو وغیرہ کے سر ہیں۔ اس کے علاوہ تصاویر میں ایتھین کو سامنے کھڑے ہوئے اپولو کو بائیں ہاتھ میں کمان اور دائیں میں تیر پکڑے ہوئے دائیں جانب پیلاس کو دائیں ہاتھ بجلی پکڑے اور بائیں ہاتھ میں ڈھال اٹھائے ہوئے دائیں جانب وکٹری کو دائیں ہاتھ میں ہار پکڑے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

ان میں سے بہت سے سکے سرحدی اضلاع اور افغانستان سے حاصل کیے گئے ہیں۔ ان سکوں پر عکس زیادہ تر یونانی دیو مالاؤں کے مناظر پیش کرتے ہیں۔ تمام یونانی بادشاہ مختلف ناموں، اوزان اور حجم کے سکوں کو چاندی، سونے اور تانبے سے تیار کرواتے تھے۔

ہند۔ سکاتھیئن بادشاہوں کے سکے:۔ پنجاب کے ہند۔ سکاتھین بادشاہوں میں سے ماؤئیس، ایذیس، ایزیلائسز، وونونز، سپالیھورس، گونوڈوفیرس، ساسان، اور تھاگیز، ایبڈاگیسز، پیکورز، زئیونائسس، ہائیرکوڈز، ہیڈ میسز اول، کیڈفیسز دوئم اور سوٹر میگاس کے سکے بھی موجود ہیں۔

ان سکوں پر درج عبارات:۔ یہ عبارات نشاندہی کرتی ہیں کہ بادشاہ گھوڑے کی پشت پر سوار اپنے دائیں ہاتھ میں ہار یا نیزہ پکڑے ہوئے زیوئیس اپنے بائیں کندھے پر نیزہ رکھے ہوئے پیلاس، دائیں ہاتھ میں بجلی پکڑے ہوئے ایک بادشاہ آلتی مارے ہوئے ایک گدی پر بیٹھا ہے۔ دایاں بازو پھیلا ہوا ہے اور بائیں ہاتھ میں نیزہ پکڑے ہوئے ہے۔ ایک عورت کی شبیہہ ہے۔ اس کے بائیں کندھے پر کھجور کی ٹہنی ہے۔ ہرکولیس بائیں کندھے پر نیزہ رکھے ہوئے۔ ایک کھڑی ہوئی مورتی ہے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں نیزہ ہے۔ داڑھی والے بادشاہ کا چہرہ، گھوڑا سرپٹ بھاگ رہا ہے۔ شیر

بیل کی شبیہیں، جتا ہوا گھوڑا۔ ان میں سے بہت سی تصاویر دلکش ہیں۔ تانبے کے ایک سکے پر کیڈ فیز بادشاہ کو باغ کی کرسی پر بیٹھے اور دایاں ہاتھ پھیلائے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ کیڈفیزس دوئم کو طلائی سکے پر تخت پر بیٹھے اس حالت میں دکھایا گیا ہے کہ اس کا چہرہ دائیں طرف ہے اور اس نے دائیں ہاتھ میں ایک پھول پکڑا ہوا ہے جبکہ بایاں ہاتھ بائیں گھٹنے پر رکھا ہوا ہے۔ اس کے کوٹ نے اس کے گھٹنے اور تخت کا ایک حصہ ڈھانپ رکھا ہے جبکہ اس کے سر اور دائیں کندھے سے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔

ساسانی سکے:۔ ساسانی بادشاہوں کے سکے بھی ہیں جن پر پہالوی زبان کی عبارات کے علاوہ بادشاہ کا بالائی دھڑ بنا ہوا ہے۔ سکوں پر آتش کدوں میں سے شعلے بلند ہوتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔

گپتا سکے:۔ گپتا دور کے سکوں میں چندر گپتا، لکشمی اور سمندر گپتا کو مختلف انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ چندر گپتا کو لمبے کوٹ میں ملبوس دائیں ہاتھ میں کمان پکڑے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس کے دائیں بازو کے عقب میں پرندے کا نشان موجود ہے۔ لکشمی کو آلتی پالتی مارے کنول کے پھول پر بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس نے دائیں ہاتھ میں پھولوں کا مکٹ اور بائیں ہاتھ میں کنول کا پھول پکڑا ہوا ہے۔

مہاتما بدھ کے دور کے سکے:۔ مہاتما بدھ کے دور کے سکے بھی ہیں جن پر ہندوستان کی پالی زبان کی عبارات درج ہونے کے علاوہ عورتوں، ہرن، سانپ وغیرہ کی شبیہیں بنی ہوئی ہیں۔

خلفاء کے سکے:۔ بغداد کے خلفاء المنصور (150 ہجری) ہارون الرشید (173 ہجری) المامون (200 ہجری) کے دور کے چاندی کے سکے اور سندھ کے اولین مسلمان بادشاہوں عبدالرحمن، محمد امیر عبداللہ، امیر احمد اور علی کے چاندی کے سکے بھی ہیں۔

اسلامی سکے:۔ عجائب گھر میں مسلمانوں کے مختلف ادوار کے سکے بہت زیادہ تعداد میں موجود ہیں۔ مختلف بادشاہوں کے سکوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر ایک کی زندگی سے متعلق دلچسپ حالات بھی درج کیے گئے ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کے متعلق لکھی جانے والی کتابوں کے لیے مفید حوالے کا کام دیں گے۔

غزنوی خاندان

غزنی کے بادشاہوں کا شجرہ نسب

سبکتگین

محمود — اسماعیل

(محمود:) محمد — مسعود اوّل — عبدالرشید

فرخ زاد — مودود — ابراہیم

مسعود دوئم — مسعود سوئم

بہرام شاہ — سلطان ارسلان

خسرو شاہ

خسرو ملک
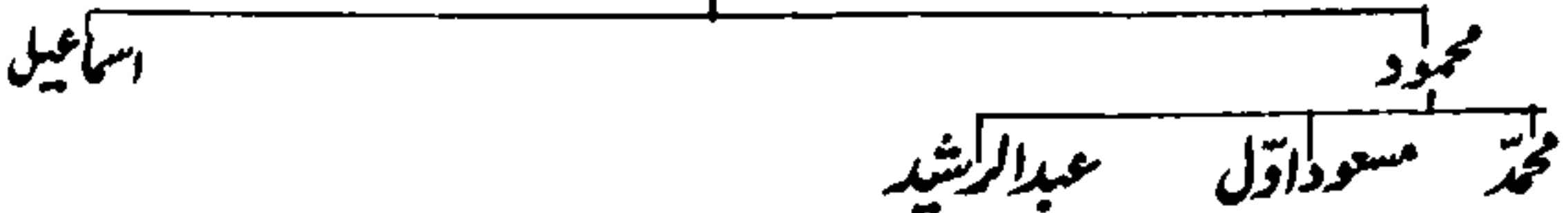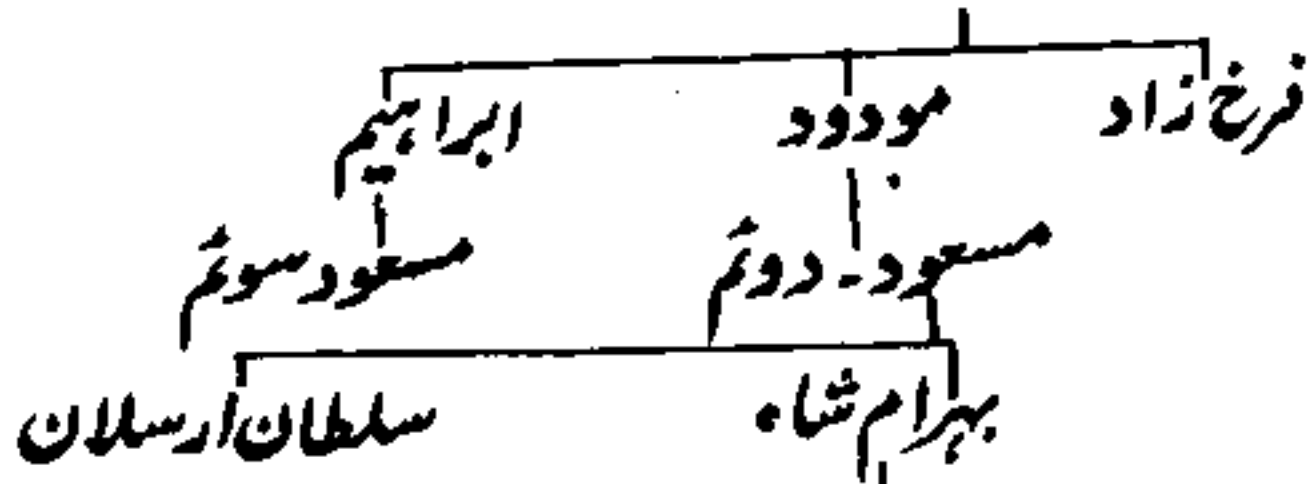
ناصر الدین سبکتگین :۔ امیر ناصر الدین سبکتگین، اصل میں الپتگین کی ملازمت میں شہسوار تھا اور پیدائشی طور پر تاتاری تھا۔ بلخ میں ترموز کے مقام پر اگست 997ء میں 56 سال کی عمر میں اس کا انتقال ہوا۔ غزنی میں دفن ہوا۔ یہ بغداد کے خلیفہ المواتی کے دور میں گزرا ہے۔

سکہ :۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ وحدہ لا شریک لہ نوح بن منصور سبکتگین الطائع للہ

ترجمہ :۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں جو واحد ہے۔

اس کا کوئی شریک نہیں۔ اللہ کا اطاعت گزار نوح المعروف سبکتگین بن منصور۔

امیر اسماعیل :۔ سبکتگین کی وفات کے بعد اس کا سب سے بڑا بیٹا محمود ایک مہم پر جانے کے باعث غیر حاضر تھا۔ چنانچہ اس کے دوسرے بیٹے اسماعیل کو تاج پہنا کر بلخ کا بادشاہ بنا دیا گیا۔ عجائب گھر میں اسماعیل کے ایک نقرئی سکے پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے :۔

لا الہ اللہ وحدہ لا شریک لہ الطائع للہ محمد الرسول اللہ منصور بن نوح اسماعیل

ترجمہ :۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ خدا ایک ہے

اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ اللہ کا اطاعت گزار منصور بن نوح اسماعیل۔

سلطان محمود :۔ سلطان محمود المعروف امین الملت یمین الدولہ جو بت شکن کے نام سے بھی مشہور ہے، سبکتگین کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ لوح مزار کے مطابق اس کا انتقال 29 اپریل 1030ء میں 63 برس کی عمر میں اپنے دور حکومت کے 33 ویں سال میں ہوا۔ اس کو غزنی میں مشعل کی روشنی میں قصر فیروزی میں دفن کیا گیا۔ اس کی حکومت بغداد کے عباسی خلیفہ القادر باللہ کے دور میں تھی۔

سکہ :۔ کلمہ طیبہ کے بعد :۔ القادر باللہ یمین الدولہ و امین الملک محمود

ترجمہ :۔ القادر باللہ، یمین الدولہ، امین الملک محمود۔

اس نے 419 ہجری میں لاہور میں جس کو وہ یہاں محمود پور کہتا ہے مندرجہ ذیل سکہ مضروب کروایا تھا۔

بسم اللہ ضرب ہذا الدرہم بہ محمود پور

سنہ تسع عشرہ و اربع مایہ

ترجمہ :۔ اللہ کے نام سے شروع ہے۔ اس سکے کو 419 ہجری میں محمود پور میں مضروب کیا گیا۔

سکے پر خلیفہ کا نام اور محمود کا نام بمعہ خطابات کے درج ہے۔ اس کی پشت اور حاشیے میں ہندی رسم الخط میں عبارات درج ہیں۔

محمد:۔ محمود کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا محمد غزنی کے تخت پر بیٹھا لیکن اس نے ابھی صرف پانچ ماہ حکومت کی تھی کہ اس کے جڑواں بھائی مسعود اول نے اسے معزول کرنے کے علاوہ اندھا کر دیا۔

عجائب گھر میں محمد کے دور کا ایک بے مثال نقرئی سکہ ہے جس پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے :۔

لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ وحدہ لا شریک لہ القادر باللہ ظفر

جلال الدولہ جمال الملت محمد بن محمود اندراب

ترجمہ :۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ خدا ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں ۔ جلال الدولہ جمال الملت محمد بن محمود نے اسے اندراب میں مضروب کرایا۔

مسعود ۔ اول :۔ محمود کے بیٹے مسعود اول نے اپنے بھائی محمد کو معزول کرنے کے بعد 1031ء میں تخت و تاج سنبھال لیا۔ 1042ء کو فوج نے اسے معزول کر کے کری کے قلعہ میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ وہ بغداد کے خلیفہ القادر باللہ کا ہمعصر تھا۔

سکہ :۔ کلمہ طیبہ کے بعد :۔

القائم بامر اللہ ناصر الدین اللہ مسعود

ترجمہ : اللہ تعالیٰ کے حکم کا طابع اور اس کے دین کا مددگار مسعود ۔

مودود:۔ مسعود کے بیٹے مودود کو 1042ء میں غزنی کے مقام پر بادشاہ بنا دیا گیا۔ وہ 24 دسمبر 1049ء میں فوت ہوا۔ اس کی حکومت بغداد کے خلیفہ القائم کے دور میں تھی۔

سکہ :۔ القائم بامر اللہ شہاب الدولہ

و قطب الملہ مودود بن مسعود

ترجمہ :۔ اللہ کے حکم کا طابع شہاب الدولہ اور قطب الملہ مودود بن مسعود ۔

پشت پر ہندی الفاظ سری سمانتا دیوا کے ہمراہ ایک بیل کی تصویر ہے۔ ان میں سے چند

سکوں پر خود کو مودود نے ابوالفتح لکھوایا ہے۔ اس کے سکوں پر لاہور کا تلفظ لوہور ہے۔

عبدالرشید :۔ محمود کے بیٹے عبدالرشید نے 1051ء میں تخت و تاج سنبھالا لیکن ابھی اس کو حکومت کرتے ایک سال ہوا تھا کہ ایک غاصب طغرل نے اسے معزول کر دیا۔ اس کے خطابات یہ تھے۔

عزالدولہ و زین الملۃ

ترجمہ :۔ حکومت کا وقار اور ملت کی زینت۔

فرخ زاد :۔ مسعود کا بیٹا فرخ زاد چھ سال حکومت کرنے کے بعد 1058ء میں فوت ہوا۔ وہ اس وقت حکمران تھا جب اقلیم ابھی تک خلافت پر متمکن تھا۔ طغرل بیگ بادشاہ ایران اس کی روحانی طور پر مدد کرتا تھا۔ اس نے اس لقب کے تحت سکے مضروب کرائے۔

جمال الدولہ و کمال الملۃ فرخ زاد

ترجمہ :۔ حکومت کی شان و شوکت اور ملت کا کمال فرخ زاد۔

اس کے چند سکوں پر یہ عبارت درج ہے :۔

جمال الدولہ ابو شجاع فرخ زاد

ترجمہ :۔ حکومت کی خوبصورتی اور بہادر کا باپ فرخ زاد۔

اس کی پشت پر ایک بیل کی شبیہہ ہے جس کے اوپر ہندی میں سری سمانتا دیوی کے الفاظ درج ہیں۔

ابراہیم :۔ مسعود کے بیٹے اور فرخ زاد کے بھائی ابراہیم نے اپنے بھائی کے انتقال کے بعد حکومت سنبھالی اور 42 سال حکومت کرنے کے بعد 1098ء میں فوت ہوا۔

سکہ :۔ کلمہ طیبہ کے بعد :۔

وحدہ لاشریک لہ

ترجمہ :۔ خدا ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔

اس کے بعد بادشاہ کا نام اور لقب ہے :۔

القائم بامر اللہ ظہیر الدولہ ابو المظفر ابراہیم بن مسعود۔

ترجمہ :۔ اللہ کے حکم کا طابع ظہیر الدولہ ابو المظفر ابراہیم بن مسعود۔

چند سکوں پر یہ عبارت درج ہے :۔

السلطان الاعظم قاھر الملوک سید السلاطین ابراہیم

ترجمہ :۔ عظیم سلطان بادشاہوں میں سب سے زیادہ طاقتور، سلطانوں کا بادشاہ،

ابراہیم

ایک دوسرے سکہ پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے :۔

پیشانی :۔ عدل السلطان الاعظم قاہر الملوک سید السلاطین ابو المظفر ابراہیم ۔

ترجمہ :۔ عظیم و عادل سلطان بادشاہوں میں طاقتور حکمرانوں کا بادشاہ فتح کا باپ

ابراہیم

پشت :۔ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ القائم بامراللہ ملک الاسلام

ترجمہ :۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ کے حکم کا

طابع اسلام کا بادشاہ ۔

لاہور کے ایک نقرئی سکے کی پیشانی پر یہ درج ہے :۔

عدل السلطان المعظم ابو المظفر ابراہیم الدرھم بہ لہور ۔

ترجمہ :۔ عظیم و عادل سلطان فتح کا باپ ابراہیم یہ درھم لہور میں مضروب ہوا۔

اس کی پشت پر ہندی رسم الخط میں سری سمانتا دیوا کے ہمراہ ایک بیل کی تصویر ہے۔

مسعود ۔ سوئم :۔ ابراہیم کا بیٹا مسعود سوئم اپنے باپ کے انتقال کے بعد تخت پر بیٹھا۔ اس نے 1098ء سے 1114ء تک حکومت کی۔

سکہ :۔ پیشانی :۔ للہ سنا للہ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ

المستظہر باللہ الملک الاسلام ابو سعید

پشت :۔ السلطان الاعظم علاء الدولہ و ثنا الملۃ ظہیر الامام مسعود ۔

ترجمہ :۔ پیشانی :۔ ہر تعریف صرف اللہ کے لیے ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں

اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ مکمل بھروسہ اللہ پر کرنے والا، اسلام کا بادشاہ،

خوشحالی کا منبع ۔

پشت :۔ عظیم سلطان حکومت کی شان دین کی پناہ، پر جلال امام مسعود ۔

تانبے کے سکوں پر بیل کی تصویر کے ہمراہ ہندی الفاظ میں سری سمانتا دیوا درج ہے۔ عبارت کچھ اس طرح ہے :۔

عدل السلطان العادل ابو سعید مسعود

ترجمہ :۔ عادل سلطان خوشحالی کا منبع مسعود ۔

سلطان ارسلان :۔ مسعود سوئم کا بیٹا سلطان ارسلان جو غزنی کی حکومت پر اپنے باپ کا جانشین مقرر ہوا۔ اسے حکومت کرتے ہوئے تین سال ہوئے تھے کہ 27 سال کی عمر میں اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

سکہ :۔ السلطان الاعظم ملک ارسلان

ترجمہ :۔ عظیم سلطان ملک ارسلان۔

بہرام شاہ :۔ مسعود سوئم کا بیٹا بہرام شاہ ارسلان کا جانشین بنا اور 35 سال تک سکون کے ساتھ حکومت کرنے کے بعد 1152ء میں فوت ہوا۔

سکہ :۔ کلمہ طیبہ کے بعد :۔

پیشانی :۔ المسترشد باللہ عصد الدولہ سنجر

پشت :۔ یمین الدولہ بہرام شاہ۔

ترجمہ :۔ پیشانی :۔ اللہ کی رہنمائی کا حامل، حکومت کی طاقت، سنجر

پشت :۔ حکومت کا دایاں ہاتھ، بہرام شاہ۔

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ بغداد کا خلیفہ جس کی حکومت زوال پذیر تھی اس کے نام کی بجائے سکے پر ایران کے بادشاہ سنجر کا نام درج ہے کیونکہ غزنی کا سلطان اب اس کا اطاعت گزار تھا۔

خسرو شاہ :۔ بادشاہ بہرام شاہ کے بیٹے خسرو شاہ نے اپنے والد کی وفات کے بعد غزنی کی بادشاہت سنبھالی۔ سات سال تک امن و امان کے ساتھ حکومت کرنے کے بعد وہ 1160ء میں لاہور میں فوت ہوا۔

سکہ :۔ کلمہ طیبہ کے بعد :۔

پیشانی :۔ المتقی لامر اللہ عصد الدولہ سنجر۔

ترجمہ :۔ اللہ کے حکم کا طابع حکومت کی طاقت سنجر۔

پشت :۔ السلطان الاعظم معز الدولہ خسرو شاہ۔

ترجمہ :۔ عظیم سلطان حکومت کی شان، خسرو شاہ۔

خسرو ملک :۔ خسرو شاہ کے بعد اس کا بیٹا تخت پر بیٹھا۔ وہ غزنی کے بادشاہوں میں آخری بادشاہ تھا جنہوں نے 962ء سے 1186ء تک 224 سال حکومت کی۔ 1186ء میں سلطان محمد غوری نے لاہور پر قبضہ کر لیا اور سلطنت غزنی سے غور منتقل ہو گئی۔

سکہ :۔ السلطان الاعظم سراج الدولہ خسرو ملک

ترجمہ:۔ عظیم سلطان حکومت کا چراغ خسرو ملک۔
ان میں سے چند سکوں پر سلطان نے "تاج الدولہ" درج کرایا ہے۔

غوری اور تاتار خاندان غلاماں

تاتار غوری سلاطین کا شجرہ نسب

شہاب الدین محمد غوری

اس کے بعد اس کا غلام اور جرنیل اس کا جانشین بنا۔

قطب الدین ایبک

بیٹی
قطب الدین ایبک کے متبنیٰ بیٹے اور داماد
شمس الدین التمش کے ساتھ بیاہی گئی۔

آرام شاہ

بیٹی
غیاث الدین بلبن کے ساتھ
شادی ہوئی۔
معزالدین کیراخاں
کیقباد

ناصرالدین محمود شاہ

معزالدین بہرام شاہ

سلطانہ رضیہ

رکن الدین فیروز شاہ
علاؤ الدین مسعود شاہ
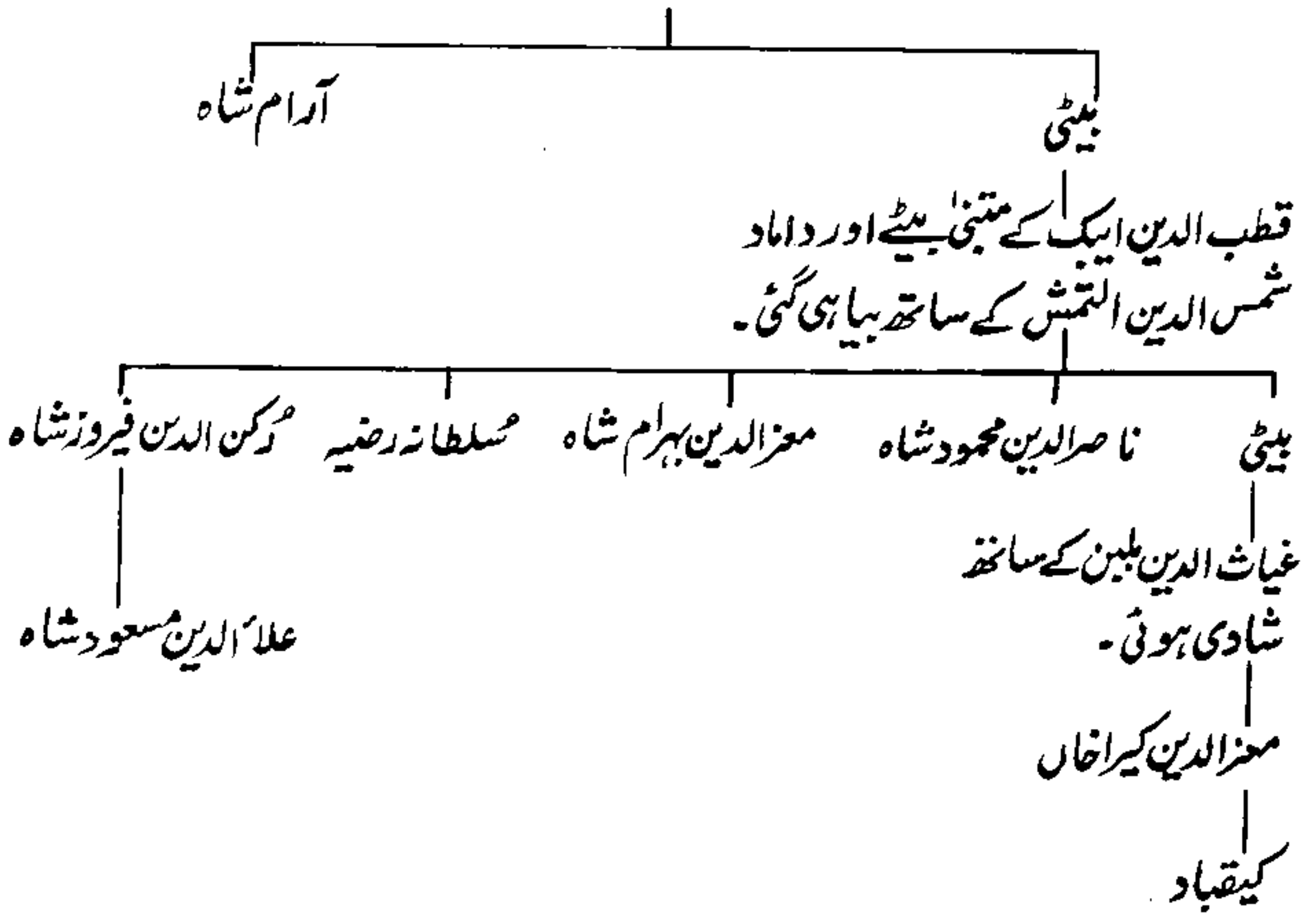
سلطان شہاب الدین محمد غوری :۔ سلطان شہاب الدین المعروف محمد غوری بن سام جس نے صحیح معنوں میں ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ وہ مغربی صوبہ جات کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا کہ 14 مارچ 1206ء کو گکھڑوں نے اسے دریائے سندھ ایک کنارے قتل کر دیا۔ اس کی میت کو بڑے تزک و احتشام سے غزنی لے جایا گیا اور وہیں دفن کر دیا گیا۔ اس نے غزنی میں حکومت کے آغاز سے لے کر 32 سال تک حکمرانی کی۔

سکہ :۔ پیشانی :۔ السلطان الاعظم معزالدنیا والدین ابو المظفر محمد بن سام

ترجمہ :۔ عظیم سلطان دین اور دنیا کی عزت فاتح کا باپ، محمد بن سام۔

پشت :۔ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ

الناصر الدین اللہ امیر المومنین

ترجمہ :۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ کے دین کا فاتح امیر المومنین

پیشانی کا حاشیہ :۔ ضرب ھد الدنیا و بلدۃ غزنیۃ فی مشھور سنہ ستہ مایۃ

پشت کا حاشیہ :۔ ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی و دین الحق لیظھر علی الدین کلہ ۔(24)

ترجمہ :۔ وہ اللہ جس نے اپنے رسولؐ کو ایک سچے دین کے ساتھ ہدایت کے لیے بھیجا اور وہ اس دین کو دوسرے تمام ادیان پر غالب کر دے گا۔

تاج الدین یلدز :۔ عجائب گھر میں محمد غوری کے جانشین قطب الدین ایبک کے سکے موجود نہیں ہیں لیکن تاج الدین یلدز کے سکے ہیں جس نے 1206ء میں قطب الدین کے حکومت سنبھالنے کے تھوڑی دیر بعد پنجاب پر عارضی طور پر قبضہ کر لیا۔ عجائب گھر میں موجود یلدز کے سکوں پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے۔

پیشانی :۔ السلطان المعظم ابو الفتح یلدز سلطان

ترجمہ :۔ عظیم سلطان فتح کا باپ، یلدز، بادشاہ۔

پشت :۔ گھڑ سوار کے نیچے ستارہ اور ایک ہندی عبارت ہے۔

ایک نمونے پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے :۔

پیشانی :۔ السلطان الاعظم معزالدنیا والدین

ترجمہ :۔ عظیم سلطان دین اور دنیا کی عزت والا

پشت :۔ عبدالملک المعظم تاج الدنیا والدین یلدز

ترجمہ :۔ عبدالملک دین و دنیا کا تاج ، یلدز

ایک دوسرے نمونے پر یہ عبارت درج ہے :۔

معزالدنیا والدین عبدہ یلدز

ترجمہ :۔ دین و دنیا کا عزت دار ، بندہ خدا ، یلدز ۔

پرتھوی راج کے سکے :۔ اس کے علاوہ اجمیر کے راجہ پرتھوی راج کے سکے بھی ہیں جس کو محمد غوری نے نارائن کی مشہور لڑائی میں قیدی بنالیا تھا۔ ان کی پیشانی پر گھڑسوار کے ہمراہ ہندی میں سری پرتھوی دیوا درج ہے اور پشت پر ایک بیل کی تصویر کے ساتھ ہندی الفاظ میں سری اساوار ی سمانتا دیوا درج ہے۔

شمس الدین التمش :۔ 1210ء میں اپنے باپ قطب الدین کے انتقال کے بعد اس کا اکلوتا بیٹا آرام شاہ تخت پر بیٹھا لیکن اسی سال شمس الدین التمش نے اسے معزول کر دیا۔ 1235ء تک حکومت کرنے کے بعد اس کا انتقال ہوا۔ اس کو دہلی میں دفن کیا گیا (25)۔

سکہ :۔ پیشانی :۔ السلطان المعظم شمس الدنیا والدین ابو المظفر ایلمتش السلطان ناصر امیر المومنین ۔

ترجمہ :۔ عظیم سلطان دین و دنیا کا آفتاب فاتح کا باپ ، التمش بادشاہ ، امیرالمومنین۔

پشت :۔ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ المستنصر باللہ امیر المومنین ۔

ترجمہ :۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ المنتصر باللہ ، امیرالمومنین ۔

اس بادشاہ نے مندرجہ ذیل سکے لاہور میں مضروب کرائے :۔

پیشانی :۔ عدل

السلطان المعظم

ایلمتش السلطان

ترجمہ :۔ عادل اور عظیم بادشاہ ، سلطان التمش

پشت :۔ دائرے میں :۔ ضرب بلاہور

ترجمہ :۔ لاہور میں مضروب کرایا گیا۔

رکن الدین فیروز:۔ دہلی میں اپنے والد کی وفات کے بعد رکن الدین فیروز کو بادشاہ بنا دیا گیا۔ اس کو اس کی بہن سلطانہ رضیہ بیگم نے اس کے تخت و تاج سنبھالنے کے سال کے دوران (نومبر 1236ء) شکست دے کر معزول کر دیا (26)۔

سکہ:۔ السلطان الاعظم رکن الدنیا والدین فیروز شاہ

ترجمہ:۔ عظیم سلطان دین و دنیا کا ستون، فیروز شاہ۔

ایک دوسرے سکہ پر بیل کی تصویر کے ہمراہ ہندی کے الفاظ میں درج ہے:۔

سریتان سری رکن الدین

اور ایک گھڑ سوار کی شبیہہ ہے۔

سلطانہ رضیہ:۔ سلطانہ رضیہ، جس نے اپنے بھائی رکن الدین فیروز کو معزول کر کے 1239ء تک تخت و تاج سنبھالے رکھا، اسے قتل کر دیا گیا۔ وہ دہلی میں دفن ہوئی (27)۔

سکہ:۔ السلطان المعظم رضیۃ الدنیا والدین السلطان

ترجمہ:۔ عظیم سلطان، اس دنیا اور آخرت میں مطمئن، سلطان

چند سکوں پر صرف لفظ "رضیہ" درج ہے۔

معزالدین بہرام شاہ:۔ التمش کا بیٹا معزالدین بہرام شاہ جو رضیہ سلطانہ کا جانشین بنا تھا اس کو 1241ء میں معزول کر کے قتل کر دیا گیا (28)۔

سکہ:۔ پیشانی:۔

ایک بیل کی تصویر کے اوپر ہندی میں "موئج" درج ہے۔

پشت:۔ گھڑ سوار

علاء الدین مسعود:۔ معزالدین بہرام شاہ کا جانشین، علاء الدین مسعود، رکن الدین فیروز کا بیٹا تھا۔ 1246ء میں اس کے چچا ناصر الدین محمود نے اسے معزول کر کے قید میں ڈال دیا۔

سکہ:۔ السلطان الاعظم علاء الدنیا والدین ابو المظفر

مسعود شاہ السلطان

فی عہد الامام المستعصم امیرالمومنین

ترجمہ:۔ عظیم سلطان، دین و دنیا میں بلند، فاتح کا باپ، مسعود شاہ بادشاہ۔

امیرالمومنین المستعصم کے دور میں مضروب کیا گیا۔

ناصر الدین محمود :۔ شمس الدین التمش کا بیٹا ناصر الدین محمود جو علاء الدین مسعود کا جانشین بنا اس نے 20 سال تک حکومت کرنے کے بعد 1266ء میں انتقال کیا۔

سکہ :۔ السلطان الاعظم ناصر الدنیا والدین ابو المظفر محمود بن السلطان
فی عہد الامام المستعصم امیر المومنین

ترجمہ :۔ عظیم سلطان ، فتح مند دین و دنیا ، فاتح کا باپ ، محمود بن سلطان ، امیر المومنین المستعصم کے دور میں مضروب کیا گیا۔

غیاث الدین بلبن :۔ التمش کے داماد غیاث الدین بلبن کے پاس تخت و تاج 1286ء میں اس کی وفات تک رہا (29)۔

سکہ :۔ پیشانی :۔ السلطان الاعظم غیاث الدنیا والدین
ابو المظفر بلبن السلطان

ترجمہ :۔ عظیم سلطان دین و دنیا کی پناہ ، فاتح کا باپ سلطان بلبن

پشت :۔ الامام المستعصم امیر المومنین

ترجمہ :۔ امام امیر المومنین المستعصم

حاشیہ :۔ ضرب ہذا القضہ بحضرۃ دہلی

ترجمہ :۔ اس سکے کو عروس البلاد دہلی میں مضروب کیا گیا۔

معز الدین کیقباد :۔ غیاث الدین بلبن کا پوتا اس کا جانشین بنا اور اس نے 1288ء تک حکومت کی۔ جب جلال الدین فیروز خلجی نے اسے قتل کرا دیا۔

سکہ :۔ پیشانی :۔ السلطان الاعظم معز الدنیا والدین
ابو المظفر کیقباد السلطان
الامام المستعصم امیر المومنین

ترجمہ :۔ عظیم سلطان دین و دنیا کی عزت ، فاتح کا باپ ، بادشاہ کیقباد الامام المستعصم امیر المومنین۔

قطب الدین کے سریر آرائے تخت ہونے سے لے کر کیقباد کی موت تک تاتاری غلام غوری بادشاہوں نے 1205ء سے 1288ء تک 83 سال حکومت کی۔

خلجی خاندان

تاتاری خلجی سلاطین کا شجرہ نسب

جلال الدین خلجی — گوگرش خان

گوگرش خان: الماس بیگ المعروف الف خان — علاء الدین خلجی

الماس بیگ المعروف الف خان: قطب الدین مبارک شاہ خلجی

علاء الدین خلجی: شہاب الدین عمر خلجی
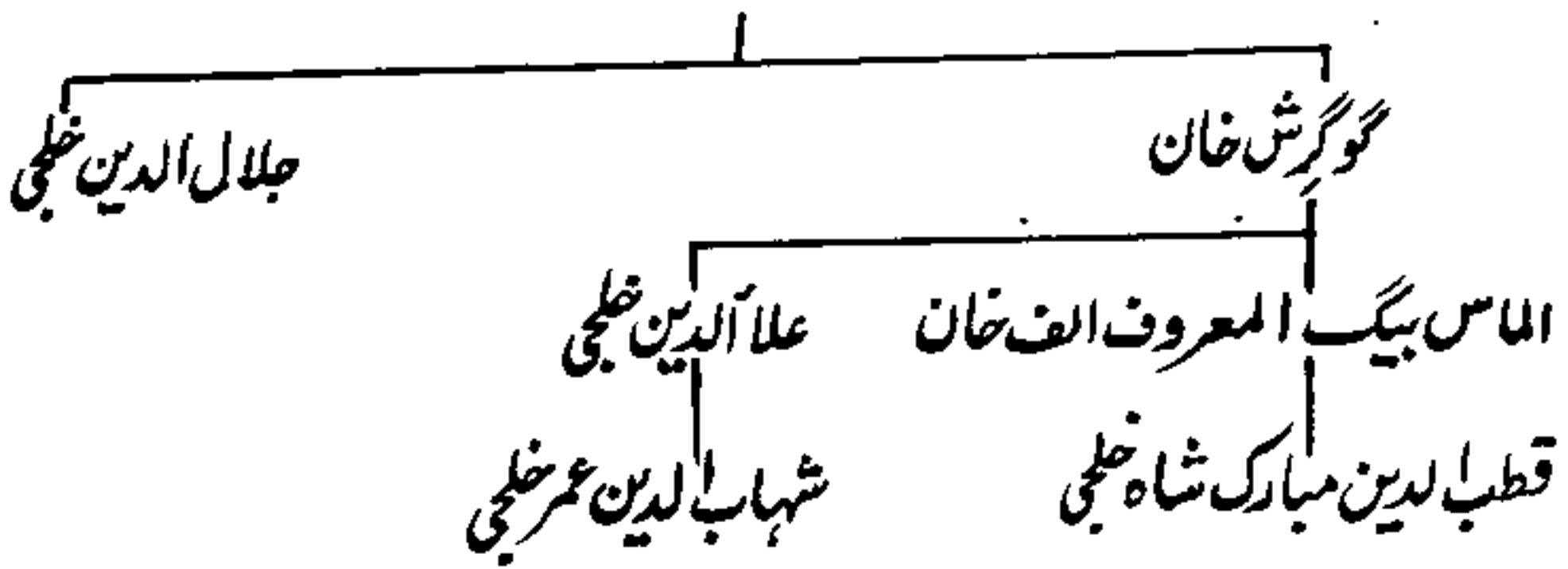
جلال الدین فیروز شاہ :- خلجی قبیلے کے سردار جلال الدین فیروز شاہ نے 70 سال کی عمر میں ہندوستان کا تخت و تاج کیقباد سے حاصل کیا۔ اس نے سات سال تک حکومت کی۔ اس کے بعد اس کے بھتیجے علاء الدین نے 1295ء میں اسے قتل کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔

سکہ :- السلطان الاعظم جلال الدنیا والدین ابو المظفر
فیروز شاہ السلطان الامام المستعصم امیر المومنین

ترجمہ :- عظیم سلطان دین و دنیا کی شان، فاتح کا باپ سلطان فیروز شاہ امیر المومنین امام المستعصم

علاء الدین خلجی :- علاء الدین خلجی کو 1296ء کے آخر پر بادشاہ بنایا گیا اور وہ 20 سال حکومت کرنے کے بعد 1316ء میں فوت ہوا (30)۔

سکہ :- پیشانی :- السلطان الاعظم علاء الدنیا والدین ابو المظفر محمد شاہ السلطان

ترجمہ :- عظیم سلطان دین و دنیا میں سرفراز، فاتح کا باپ بادشاہ محمد شاہ۔

پشت :- اندرونی جانب :- سکندر الثانی یمین الخلافت ناصر امیر المومنین

ترجمہ :- سکندر ثانی خلافت کا دایاں ہاتھ، فتح مند، امیر المومنین

حاشیہ :- ضرب ھذہ السکۃ بحضرۃ دہلی فی سنہ احدی وسبع مائیۃ

ترجمہ :- اس سکہ کو دار السلطنت دہلی میں 701 میں مضروب کیا گیا۔

قطب الدین مبارک شاہ :۔ قطب الدین مبارک شاہ نے 1317ء میں حکومت سنبھالی اور 1329ء میں اسے قتل کر دیا گیا۔

سکہ :۔ پیشانی :۔ الامام الاعظم خلیفتہ رب العلمین قطب الدنیا والدین ابو المظفر

ترجمہ :۔ عظیم امام، خلیفتہ اللہ، قطب دین و دنیا فاتح کا باپ۔

پشت :۔ مبارک شاہ السلطان ابن السلطان

الواثق باللہ امیر المومنین

ترجمہ :۔ مبارک شاہ بادشاہ، ابن بادشاہ، اللہ کی مہربانی سے مضبوط، امیر المومنین۔

حاشیہ :۔ ضرب ھذا السکتہ بدار الاسلام فی سنہ سبع عشرہ سبع ماتیہ

ترجمہ :۔ اس سکے کو سال 717 میں دار الاسلام میں مضروب کیا گیا۔

خلجی حکومت 1288ء سے 1321ء تک قائم رہی۔

تغلق خاندان

تاتاری تغلق سلاطین کا شجرہ نسب

- غیاث الدین تغلق۔ اوّل
  - محمد تغلق۔ اوّل
- بہن جس کی شادی سالار رجب سے ہوئی
  - فیروز شاہ
    - ظفر شاہ
      - ابو بکر
    - ناصر الدین محمد تغلق، دوئم
      - محمد تغلق
      - ہمایوں المعروف اسکندر شاہ
    - فتح خان
      - غیاث الدین۔ دوئم
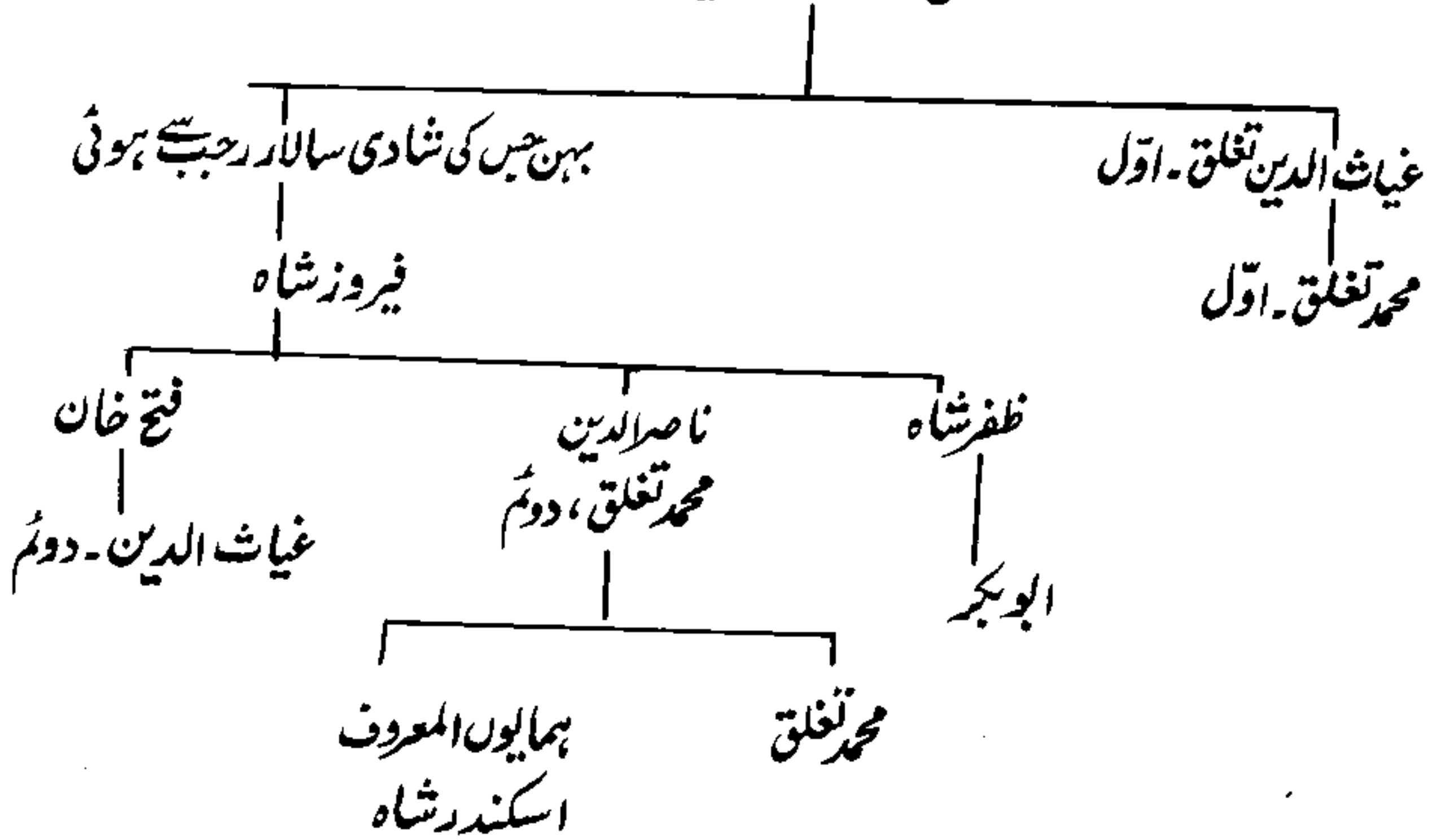
غیاث الدین تغلق :۔ غیاث الدین بلبن کے ایک ترک غلام اور ہندوستانی ماں کا بیٹا غیاث الدین تغلق، اسے لوگوں نے متفقہ طور پر بادشاہ منتخب کیا۔ 1325ء میں ایک شہ نشین کے گرنے سے ہلاک ہوا (31)۔

سکہ :۔ السلطان الغازی غیاث الدنیا والدین تغلق شاہ السلطان ناصر امیر المومنین

ضرب ھذا السکۃ بحضرت دہلی فی سنہ اثنی و عشرین و سبع مایتہ

ترجمہ :۔ غازی سلطان دین و دنیا کی پناہ، تغلق شاہ السلطان ناصر امیر المومنین ۔

اس سکے کو 722 میں دار الحکومت دہلی میں مضروب کیا گیا۔

اس کے چند سکوں پر ہندی میں سری سلطان غیاث الدین درج ہے ۔

محمد تغلق :۔ غیاث الدین تغلق کا بڑا بیٹا محمد تغلق اپنے والد کا جانشین مقرر ہوا۔ وہ 27 سال تک حکومت کرنے کے بعد 1351ء میں فوت ہوا۔

سکہ :۔ المجاہد فی سبیل اللہ محمد بن تغلق شاہ

ابو بکر عمر عثمان علی

ترجمہ :۔ اللہ کی راہ کا مجاہد محمد بن تغلق شاہ

حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ ۔

اس کے چند سکوں پر مندرجہ ذیل عبارت ہے :۔

ضرب فی زمن العبد الراجی رحمۃ اللہ محمد تغلق

ترجمہ :۔ اللہ کے غلام اور اس کی رحمت کے طلبگار محمد تغلق کے دور میں مضروب ہوا۔

ایک دوسرے سکے پر یہ عبارت درج ہے :۔

ضرب فی زمن العبد الراجی رحمۃ اللہ محمد بن السلطان السعید الشہید تغلق شاہ سنہ سبع و اربعین سبع مایتہ

ترجمہ :۔ اس کو 747 میں شہید سلطان عظیم کے بیٹے خدا کے غلام اور اس کی رحمت کے طلبگار محمد تغلق کے دور میں مضروب کیا گیا۔

ایک سکے پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے :۔

مہر شد سکہ رائج در روزگار بندہ امیدوار محمد تغلق

من اطاع السلطان فقد اطاع الرحمن

در تخت گاہ دہلی سال بہ ہفتصد سی ویک

ترجمہ :۔ یہ سکہ اللہ کے غلام اور اس کی رحمت کے طلبگار محمد تغلق کے دور میں

ایک دوسرے نمونے پر یہ عبارت ہے:۔

اطیعو اللہ و اطیعو الرسول و اولی الامر منکم محمد 735

لا یو لا السلطان کل الناس بعضہم بعضا تغلق

ترجمہ:۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور جو تم میں صاحب حکومت ہوں۔ محمد 735 -

سلطان، رعایا میں سے کسی کے ساتھ بھی انصاف سے روگردانی نہیں کر سکتا۔

ایک نمونے پر یہ عبارت ہے:۔

عبد الراجی محمد تغلق 738 الملک والعظمتہ اللہ

ترجمہ:۔ اللہ کا غلام اور اس کی رحمت کا طلبگار محمد تغلق 738

ملک اور عظمت اللہ ہی کی ہے۔

فیروز شاہ تغلق:۔ فیروز شاہ تغلق، محمد تغلق کا چچا زاد بھائی تھا۔ وہ مرحوم بادشاہ کا جانشین مقرر ہوا اور 38 برس تک حکومت کرنے کے بعد 1388ء میں فوت ہوا (32) -

سکہ:۔ السلطان الاعظم سیف امیر المومنین ابو المظفر

فیروز شاہ السلطان خلدۃ ملکہ

ضرب ھذا السکتہ فی زمن الامام امیر المومنین ابی الفتح المستعصد باللہ خلد خلافتہ ۔

ترجمہ:۔ عظیم سلطان، دین کی تلوار، امیر المومنین، فاتح کا باپ، سلطان فیروز شاہ

اس کی حکومت ہمیشہ قائم رہے۔

یہ سکہ وقت کے امام امیر المومنین، فتح کے باپ، المستعصد باللہ (ان کی حکومت سدا قائم رہے) کے دور میں مضروب کیا گیا۔

وہاں پہ ایک سکہ فیروز شاہ کے بیٹے فتح خاں (33) ، کا بھی ہے جس پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

فتح خاں فیروز شاہ جل اللہ جل جلالہ

فی زمن الامام امیر المومنین ابو الفتح المستعصد خلد خلافتہ

ترجمہ:۔ فیروز شاہ کا بیٹا فتح خاں اللہ کے فضل و کرم سے اس کی شان ہمیشہ قائم رہے۔ وقت کے امام فتح کے باپ، امیر المومنین المستعصد خلد (ان کی خلافت ہمیشہ قائم رہے) کے دور میں مضروب کیا گیا۔

ابو بکر شاہ :۔ فیروز شاہ تغلق کا پوتا ابو بکر شاہ، غیاث الدین ۔ دوئم کا جانشین بنا۔ اس نے ایک سال اور چھ ماہ تک حکومت کی (1389ء)۔ یہ مندرجہ ذیل سکے سے عیاں ہے۔

پیشانی: ۔ ابو بکر شاہ ظفر بن فیروز شاہ سلطان

پشت: ۔ الخلیفہ ابو عبدالہ خلدۃ خلافتہ 792

ترجمہ: ۔ سلطان، ابو بکر شاہ، بن ظفر بن فیروز شاہ نے اس کو خلیفہ ابو عبداللہ کے دور میں 792 میں مضروب کرایا (ان کی خلافت ہمیشہ قائم رہے)

ناصر الدین محمد تغلق دوئم :۔ ابو بکر کے بعد 1390ء میں ناصر الدین محمد تغلق اس کا جانشین بنا اور چھ سال تک برسراقتدار رہا (34) ۔ اس کے بارے میں سکوں کی مندرجہ ذیل عبارت میں بتایا گیا ہے: ۔

سلطانی ضربت بحضرت دہلی

محمد شاہ نائب امیر المومنین 793

ترجمہ: ۔ امیر المومنین (35) ، کے نائب سلطان محمد شاہ نے 793 میں دارالحکومت دہلی میں مضروب کرایا۔

اس کے چند سکوں پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے: ۔

سلطانی فیروز شاہ محمد شاہ

الخلیفہ امیر المومنین خلدۃ خلافتہ

ترجمہ: ۔ فیروز شاہ سلطان کا بیٹا محمد شاہ (خلیفہ کے دور میں) جو امیر المومنین ہیں ان کی خلافت ہمیشہ قائم رہے۔

ہمایوں ۔ محمود تغلق :۔ ناصرالدین محمد تغلق دوئم کے بعد اس کا بڑا بیٹا ہمایوں المعروف سکندر شاہ اس کا جانشین مقرر ہوا لیکن وہ 45 روز کی حکومت کے بعد فوت ہو گیا۔ اس کے بعد محمود تغلق نے حکومت سنبھالی جس کے دور حکومت میں تیمور نے (1398ء) میں ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ بیس سال کی کمزور حکومت کے بعد 1412ء میں محمود فوت ہو گیا۔ ایک طلائی سکے کی مندرجہ ذیل عبارت کے ذریعے اس کا پتہ چلتا ہے: ۔

السلطان الاعظم ابو المظفر محمود شاہ محمد شاہ فیروز شاہ سلطان فی زمن الامام امیر المومنین خلدۃ خلافتہ ۔

ترجمہ: ۔ عظیم سلطان فاتح کا باپ محمود شاہ بن محمد شاہ بن فیروز شاہ سلطان ۔ اس

کو وقت کے امام امیر المومنین ، ان کی خلافت ہمیشہ قائم رہے، کے دور میں مضروب کیا گیا۔

تغلق دور حکومت1321ء سے1398ء تک یا تیمور کے حملے کے عرصہ کو شامل کرتے ہوئے1412ء تک محیط ہے۔

سید خاندان

سید حضر خاں

سید مبارک شاہ

سید محمد شاہ

سید علاء الدین

سید حضر خاں :۔ سید خاندان کی سلطنت کا بانی حضر خاں اصل میں حاکم لاہور تھا۔ سریر آرائے تخت ہونے کے بعد اس نے اپنے نام کا کوئی سکہ مضروب نہیں کرایا بلکہ اس نے ہندوستان پر تیمور کے نام کے لیے حکومت کی جس کو وہ زبردست خراج عقیدت پیش کرتا تھا اور اسی کا نام خطبہ میں بھی پڑھا جاتا تھا۔

سید مبارک شاہ :۔ مبارک شاہ1421ء میں اپنے والد حضر خاں کا جانشین بنا۔1435ء میں جب وہ دہلی میں ایک مسجد میں عبادت میں مصروف تھا تو سازشیوں نے اسے قتل کر دیا (36)۔

اس کے سکہ پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

مبارک شاہ سلطان نائب امیرالمومنین

ضربت بحضرۃ دہلی 835

ترجمہ:۔ امیرالمومنین کے نائب سلطان مبارک شاہ نے 835 میں دار الخلافہ دہلی میں مضروب کرایا۔

سید محمد شاہ :۔ سید محمد شاہ اپنے والد کا جانشین بنا اور 12 سال حکومت کرنے کے بعد 1445ء میں فوت ہوا(37)۔ اس کے سکہ پر مندرجہ ذیل عبارت ہے۔

سلطان محمد شاہ بن فرید شاہ

الخلیفہ امیر المومنین خلد خلافتہ بحضرت دہلی 847

ترجمہ:۔ سلطان محمد شاہ بن فرید شاہ نے 847 میں امیرالمومنین (ان کی خلافت ہمیشہ قائم رہے) کے دور میں مضروب کرایا۔

اس بادشاہ کے ایک تانبے کے سکے پر مندرجہ ذیل عبارت ہے۔

سلطان محمد شاہ فرید شاہ خضر شاہ

خلیفہ امیر المومنین خلد خلافتہ بحضرت دہلی 846

ترجمہ:۔ سلطان محمد شاہ بن فرید شاہ بن خضر شاہ نے 846 میں خلیفہ امیر المومنین (ان کی خلافت ہمیشہ قائم رہے) کے دور میں مضروب کرایا۔

لودھی خاندان

بہلول لودھی

علاء الدین

سکندر

ابراہیم

بہلول لودھی :۔ بہلول نے 38 برس تک حکومت کی وہ 1488ء میں فوت ہوا (38)۔
اس کے سکے پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

المتوکل علی الرحمن بہلول شاہ سلطان

فی زمن امیر المومنین خلدۃ خلافتہ بحضرت دہلی 858

ترجمہ:۔ رحمن پر توکل کرنے والا سلطان بہلول شاہ، اس نے یہ سکہ 858 میں دارالخلافہ دہلی میں امیر المومنین (ان کی خلافت ہمیشہ قائم رہے) کے دور میں مضروب کرایا۔

سکندر لودھی :۔ سکندر جو اپنے والد بہلول کا جانشین بنا اس نے 28 سال 5 ماہ تک حکومت کی اور 1517ء میں فوت ہوا (39)۔ اس کے سکہ پر یہ عبارت درج ہے:۔

المتوکل علی الرحمن سکندر شاہ بہلول شاہ سلطان

فی زمن امیر المومنین خلدۃ خلافتہ حضرت دہلی 898

ترجمہ:۔ اللہ پر توکل رکھنے والا سکندر شاہ بن بہلول شاہ سلطان نے یہ سکہ 898 میں دارالخلافہ دہلی میں امیر المومنین (ان کی خلافت سدا قائم رہے) کے دور میں مضروب کرایا۔

ابراہیم لودھی :۔ ابراہیم لودھی جو اپنے والد کے بعد 1517ء میں تخت پر بیٹھا۔ وہ پانی پت

کے مقام پر 1526ء میں ہندوستانیوں اور مغلوں کے درمیان ہونے والی لڑائی میں قتل ہوا، جس کے بعد عظیم رہنما بابر کی سربراہی میں مغلوں کی بالادستی قائم ہو گئی۔

سکہ :۔ المتوکل علی الرحمن ابراہیم شاہ سکندر شاہ سلطان

فی زمن امیر المومنین خلدۃ خلافتہ

ترجمہ :۔ اللہ پر بھروسہ کرنے والا سلطان اسکندر شاہ کا بیٹا، ابراہیم شاہ نے یہ سکہ امیر المومنین (ان کی خلافت سدا قائم رہے) کے دور میں مضروب کرایا۔

خاندان سور

حسن خاں سوری

شیر شاہ سوری — نظام خان

عادل شاہ سوری — سلیم شاہ سوری — بیٹی جو محمد شاہ سوری عادلی سے بیاہی گئی

سکندر شاہ سوری — فیروز شاہ سوری
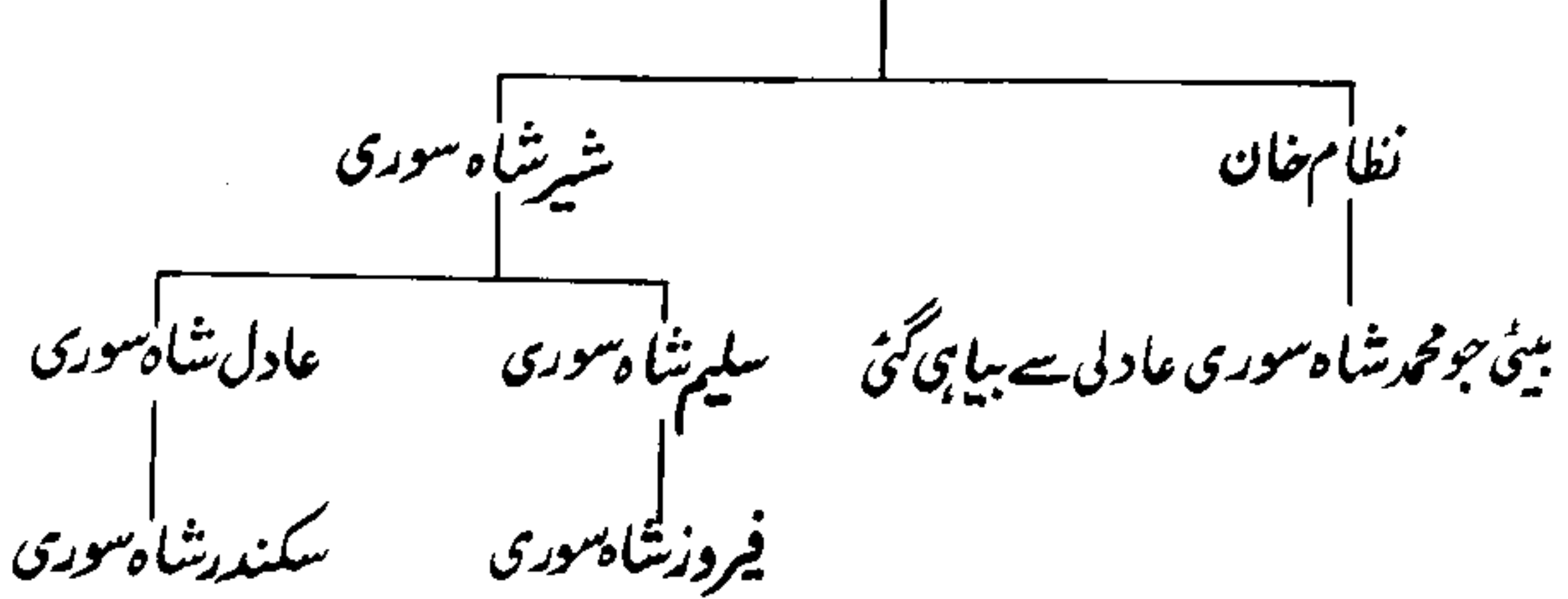
شیر شاہ سوری :۔ شیر شاہ 1539ء میں بنگال کا بادشاہ بن گیا اور ہمایوں کے کابل فرار ہو جانے کے بعد اس نے اگلے سال آگرہ کے مقام پر عصائے شاہی کو حاصل کر لیا۔ وہ 1545ء میں کالنجر کے مقام پر گولہ پھٹنے سے ہلاک ہو گیا۔ اس کے سکہ پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے :۔

پیشانی :۔ شیر شاہ السلطان خلد الہ ملکہ و سلطانہ

پشت :۔ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ ۔ ابو بکر ۔ عمر ۔ عثمان ۔ علی

ترجمہ :۔ شیر شاہ سلطان، خدا اس کی سلطنت اور ملک کو قائم رکھے۔ دین و دنیا کا دوست فتح کا باپ، عادل سلطان ۔۔۔ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ۔

سلیم شاہ سوری :۔ جلال خاں کو 1545ء میں اسلام شاہ کا لقب دے کر کالنجر کے قلعہ میں

بادشاہ بنادیا ۔ حالانکہ وہ سلیم شاہ کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے مندرجہ ذیل عبارت کا حامل سکہ مضروب کرایا۔

ابو المظفر اسلام شاہ ابن شیر شاہ سلطان خلد اللہ ملکہ فی عہد الامیر الحامی جلال الدنیا والدین ۔

ترجمہ :۔ فاتح کا باپ ، سلطان شیر شاہ کا بیٹا اسلام شاہ ، خدا اس کی سلطنت کو قائم رکھے ۔ امیر المومنین دین و دنیا کے جلال کی حکومت میں مضروب ہوا۔

محمد شاہ سوری :۔ نظام خاں کے بیٹے محمد شاہ سوری عادلی نے 1553ء میں سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی۔ اس کے سکوں پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے

المجاہد بتائید الرحمن محمد شاہ السلطان خلد الہ ملکہ

ترجمہ :۔ اللہ کے فضل و کرم سے دین کا مجاہد محمد شاہ سلطان ، اللہ تعالیٰ اس کی بادشاہت کو قائم رکھے۔

ابراہیم شاہ سوری :۔ محمد شاہ کے برادر نسبتی ابراہیم شاہ سوری نے حکومت پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ اس کے تانبے کے ایک سکہ پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے :۔

ابو المظفر السلطان ابراہیم شاہ خلد ملکہ فی عہد الامیر الحامی 922

ترجمہ :۔ دین پناہ امیر فاتح کا باپ سلطان ابراہیم شاہ کے دور میں مضروب ہوا (خدا ان کی بادشاہت کو قائم رکھے) 962 ۔

سکندر شاہ سوری :۔ ابراہیم شاہ کو نکال باہر کرنے کے بعد سکندر شاہ نے حکومت پر قبضہ کر لیا لیکن مختصر حکومت کے بعد بنگال میں فوت ہو گیا۔ اس کے سکوں پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے

المتوکل علی الرحمن سکندر شاہ السلطان فی عہد الامیر الحامی 962

ترجمہ :۔ امیر الحامی (دین کا) اللہ پر بھروسہ رکھنے والا سلطان سکندر شاہ کے دور میں 962 میں مضروب ہوا۔

مغلیہ خاندان کا شجرۂ نسب

(1) قطب الدین امیر تیمور گورگان

(2) جلال الدین میراں شاہ

(3) سلطان محمد مرزا

(4) سلطان ابو سعید مرزا

(5) عمر شیخ مرزا

(6) ظہیر الدین محمد بابر

مرزا ہندال — مرزا عسکری — کامران مرزا — ۷۔ نصیر الدین محمد ہمایوں

مرزا محمد حکیم — ۸۔ عبدالفتح جلال الدین اکبر

سلطان دانیال — سلطان مراد — ۹۔ نورالدین محمد جہانگیر

شہریار — جہاندار — ۱۰۔ شہاب الدین محمد شاہ جہاں — سلطان پرویز — سلطان خسرو

مراد بخش — اُمید بخش — ۱۱۔ محمد محی الدین اورنگ زیب عالمگیر — سلطان شجاع — دارا شکوہ

محمد کام بخش — محمد اکبر — محمد عظیم شاہ — ۱۲۔ محمد معظم شاہ عالم بہادر شاہ — محمد سلطان

محمد ہمایوں — محمد خجستہ اختر جہاں شاہ — رفیع الشان — دولت افزا — محمد عظیم الشان — اعزالدین — ۱۳۔ معزالدین جہاندار شاہ

محمد شاہ — ۱۷۔ روشن اختر — ۱۵۔ رفیع الدرجہ — ۱۶۔ رفیع الدولہ — ۱۴۔ محمد فرخ سیر — ۱۹۔ عزیز الدین عالمگیر دوئم — اعزالدین

۱۸۔ احمد شاہ

۲۰۔ علی گوہر شاہ عالم

۲۱۔ معین الدین اکبر شاہ دوئم — مرزا جواں بخت

۲۲۔ سراج الدین محمد بہادر شاہ — مرزا جہانگیر

امیر تیمور :۔ قطب الدین تیمور گورگان المعروف صاحبقران عظیم جس کو تیمور بیگ اور لنگڑے پن کی بناء پر تیمور لنگ بھی کہا جاتا تھا۔ 6 اپریل 1336ء کو کیش کے نزدیک (شہر سبز) میں پیدا ہوا۔ وہ چنگیز خاں کے رشتہ دار اور شیر کراچر میاں کی پانچویں نسل سے تھا۔ وہ سمرقند سے 74 فرہنگ کے فاصلے پر اترار کے مقام پر 8 فروری 1405ء کو 70 سال کی عمر میں فوت ہوا۔ وہ سمرقند میں اسی مقصد کے لیے اپنے بنائے ہوئے مقبرہ میں دفن ہوا۔ عجائب گھر میں ایک نقرئی سکے پر درج مندرجہ ذیل عبارت میں اس کا نام ملتا ہے۔

پیشانی: ۔ سلطان محمود یریغی امیر تیمور گورگان

پشت: ۔ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ 781

ترجمہ: ۔ سلطان محمود یریغی امیر تیمور گورگان

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ 781

بابر :۔ ظہیر الدین محمد بابر 1483ء میں پیدا ہوا۔ اس کی ماں قتلق نگار خانم مغلوں کے لشکر کے خاقان اعظم یونی خاں کی بیٹی تھی۔ وہ 26 دسمبر 1530ء کو 47 سال کی عمر میں آگرہ کے قریب چار باغ کے محل میں فوت ہوا۔ اس کے جسد خاکی کو اس کی اپنی خواہش کے مطابق کابل لے جایا گیا اور شہر کے قریب ایک پہاڑی پر اس کی نشاندہی کی ہوئی خوبصورت جگہ پر دفن کر دیا گیا۔ اس کو وفات کے بعد گیتی سیتانی، فردوس مکانی کا خطاب دیا گیا۔ اس کے سکہ پر کلمہ طیبہ اسلام کے چاروں خلفاء اور بادشاہ کا نام درج ہے۔

ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ غازی

ہمایوں :۔ نصیر الدین محمد ہمایوں 6 مارچ 1508ء کو کابل کے قلعہ میں پیدا ہوا۔ اس نے

29 دسمبر 1530ء کو آگرہ کے مقام پر تخت و تاج سنبھالا۔ اس کی والدہ ماہم بیگم خراسان کے سلطان حسین مرزا کی رشتہ دار تھی۔ وہ دہلی کے دین پناہ قلعہ میں اپنی مطالعہ گاہ کی سنگ مرمر کی سیڑھیوں سے گرنے کے بعد 24 جنوری 1556ء کو تقریباً 25 سال کی حکومت کے بعد 48 سال کی عمر میں فوت ہوا۔ اس کو دہلی میں دفن کیا گیا۔ بعد از مرگ خطاب جنت آشیانی ملا۔ اس کے سکہ پر کلمہ کے بعد مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

السلطان الاعظم و الخاقان المکرم محمد ہمایوں غازی

خلد اللہ تعالیٰ ملکہ و سلطانہ ضرب قندھار 95

ترجمہ:۔ عظیم سلطان خاقان مکرم، محمد ہمایوں غازی، اللہ تعالیٰ اس کی سلطنت اور حکومت کو قائم و دائم رکھے۔ قندھار میں 95 میں مضروب کیا گیا۔

کامران مرزا:۔ ہمایوں کا بھائی کامران مرزا جو کچھ عرصہ تک پنجاب کا حاکم بھی رہ چکا تھا۔ اس کے ایک نقرئی سکہ پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

السلطان المعظم و الخاقان المکرم محمد کامران بادشاہ غازی

خلد الہ تعالیٰ ملکہ و سلطانہ ضرب قندھار 951

ترجمہ:۔ عظیم سلطان خاقان مکرم محمد کامران غازی، خدا تعالیٰ اس کی بادشاہت اور ملک کو قائم و دائم رکھے۔ 951 میں قندھار میں مضروب کیا گیا۔

پشت:۔ کلمہ طیبہ

حاشیہ:۔ ابوبکر الصدیق۔ عمر الفاروق۔ عثمان الغفار۔ علی المرتضیٰ

اکبر:۔ حمیدہ بانو بیگم کا فرزند ارجمند ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر 15 اکتوبر 1542ء بروز اتوار زیریں سندھ میں عمر کوٹ کے قلعہ میں پیدا ہوا۔ ضلع گورداسپور میں کلانور کے مقام پر 15 فروری 1556ء کو اس کی تاجپوشی ہوئی۔ وہ 51 سال اور چند ماہ حکومت کرنے کے بعد 63 برس کی عمر میں 13 اکتوبر 1605ء کو آگرہ میں فوت ہوا۔ اس کو آگرہ کے قریب سکندرا میں دفن کیا گیا۔ بعد از مرگ خطاب عرش آشیانی ملا۔ عجائب گھر میں اکبر کے دور کے بیشمار سکوں کے نمونہ جات ہیں جن کو لاہور کی ٹکسال میں مضروب کیا گیا تھا۔ ان کے اوپر یہ عبارت درج ہے:۔

اللہ اکبر جل جلالہ

ترجمہ:۔ اللہ (اکبر) ہے، اس کی شان سب سے بلند ہے۔

اکبر کا ایک طلائی سکہ جس کو آگرہ میں مضروب کیا گیا تھا اس پر مندرجہ ذیل عبارت درج

ہے:-

السلطان الاعظم جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی

خلد اللہ تعالیٰ ملکہ و سلطانہ ضرب آگرہ 971

ترجمہ :- عظیم سلطان جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی ، خدا اس کی حکومت اور ملک کو سدا قائم رکھے -971 میں آگرہ میں مضروب کیا گیا۔

لاہور کی ٹکسال میں مضروب کیا گیا ایک طلائی سکہ جس پر یہ عبارت درج ہے:-

جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ تعالیٰ ملکہ ضرب دار الخلافہ لاہور 976

ترجمہ :- جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی اللہ تعالیٰ اس کی سلطنت اور ملک کو سدا قائم رکھے۔ یہ سکہ دار الخلافہ لاہور میں 976 میں مضروب کیا گیا۔

چند دیگر سکوں میں لاہور کو دار السلطنت کہا گیا ہے۔ اکبر کے بہت سے سکوں پر کلمہ چوکور انداز میں لکھا گیا ہے اور ساتھ پیغمبر اکرمؐ کے چاروں صحابہ کرامؓ کے نام بھی درج ہیں۔ ان میں سے چند پر یہ عبارت درج ہے:-

اللہ اکبر جلالہ

ترجمہ :- اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے اور اس کی شان سب سے زیادہ بلند ہے۔

جہانگیر :- نورالدین محمد جہانگیر 2 ستمبر 1569ء کو فتح پور سیکری میں پیدا ہوا۔ اس کی والدہ جودھ پور کی شہزادی ، جودھا بائی تھی ، جس کو مریم زمانی کہا جاتا تھا (40)۔ وہ اپنی حکومت کے بائیسویں برس ، کشمیر کی سرحد پر بھمبر کے مقام پر 28 نومبر کی صبح 1628ء میں 59 سال کی عمر میں فوت ہوا۔ اس کی خواہش کے مطابق اس کے جسد خاکی کو دریائے راوی کے پار نور جہاں کے باغ میں دفن کیا گیا۔ بعد از مرگ خطاب جنت مکانی ہے۔

عجائب گھر میں جہانگیر اور نور جہاں کی مکمل نمائندگی کرنے والے سکے ، بڑی دلچسپی کے حامل ہیں۔ ان میں سے چند پر فارسی کے اشعار درج ہیں جو نہایت خوبصوت و عالی شان ہیں۔

جہانگیر کا ایک طلائی سکہ جس کو لاہور میں مضروب کیا گیا تھا ، اس پر امیر الامراء آصف جاہ کا وضع کردہ شعر ہے ، جس کا مقبرہ جہانگیر کے مقبرے کے قریب ایستادہ ہے۔

روی زر را ساخت نورانی برنگ مہر و ماہ

شاہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ ضرب لاہور

(1015)

ترجمہ :۔ " بادشاہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ نے سونے کے چہرے کو سورج اور چاند کی طرح چمکدار بنایا۔"

"اسکو لاہور میں 1015 میں مرضروب کیا گیا۔"

لاہور میں مضروب کیے گئے چاندی کے سکوں پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے :۔

زر لاہور شد در ماہ بہمن چون مہ انور

بدور شاہ نورالدین جہانگیر ابن شاہ اکبر

(1019)

ترجمہ :۔ " بہمن کے مہینے میں ، لاہور کا سونا چاند کی طرح روشن ہو گیا۔ اکبر بادشاہ کے بیٹے بادشاہ نورالدین جہانگیر کے دور میں 1019 ۔ "

لاہور کی ٹکسال میں مضروب کیے گئے ایک اور نقرئی سکے پر عبارت درج ہے :۔

زنام شاہ جہانگیر شاہ اکبر نور ہمیشہ بادا برروی سکہ لاہور

سنہ 1026

ترجمہ :۔ اکبر بادشاہ کے فرزند بادشاہ جہانگیر کے نام سے ، لاہور کا سکہ ہمیشہ جگمگاتا رہے۔"

(1026)

لاہور میں مضروب کیے گئے ایک روپے پر مندرجہ ذیل شعر درج ہے :۔

بدھر باد روان تا فلک بود در دور

بنام شاہ جہانگیر سکہ لاہور (1017)

ترجمہ :۔ جب تک آسمان گردش میں ہے ، تب تک بادشاہ جہانگیر کے نام کا سکہ دنیا میں رائج رہے! 1017 ۔ (41)۔

عجائب گھر میں آگرہ کی ٹیکسال کا مندرجہ ذیل نقرئی سکہ دلچسپی کا حامل ہے :۔

سکہ زر در شہر اگرہ خسرو گیتی پناہ

شاہ نور الدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

ترجمہ :۔ بادشاہ اکبر کے فرزند ، عالم پناہ ، بادشاہ نورالدین جہانگیر نے یہ سکہ شہر آگرہ میں مضروب کرایا" ۔

آگرہ کی ٹکسال کے اور سکے پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے :۔

سکہ اگرہ داد زینت زر 14 از جہانگیر شاہ شاہ اکبر 1028

ترجمہ : - " اکبر بادشاہ کے بیٹے بادشاہ جہانگیر نے آگرہ کے سکے کو طلائی زینت دی - (14) (1028)

لاہور کی ٹکسال کے مندرجہ ذیل نقرئی سکوں کو بادشاہ کی چہیتی بیوی نورجہاں کے نام پر مضروب کیا گیا۔

بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور بنام نورجہاں بادشاہ بیگم زر

سنہ جلوس 20 ضرب لاہور 1035

ترجمہ: - " بادشاہ جہانگیر کے حکم سے بادشاہ بیگم نور جہاں کے نام سے سونے کی قدر و قیمت میں سوگنا اضافہ ہو گیا۔ " حکومت کا 20 واں سال لاہور میں 1035 میں مضروب ہوا

قندھار کی ٹکسال کے ایک روپے پر مندرجہ ذیل عبارت ہے: -

سکہ قندھار شد دلخواہ از جہانگیر شاہ اکبر شاہ 1026

ترجمہ : - اکبر بادشاہ کے بیٹے بادشاہ جہانگیر کے ذریعے قندھار کا سکہ دلکش بن گیا۔ " (1026)

شاہ جہاں : - شہاب الدین محمد شاہجہاں المعروف صاحب قران ثانی، 30 ربیع الاول، 1000 ہجری (5 جنوری 1592ء) کو مارواڑ کے رانا راجہ مالدیو المعروف، جگت گو سائن کے بیٹے اودھے سنگھ کی صاجزادی کے بطن سے لاہور میں پیدا ہوا۔ وہ 21 جنوری 1666ء کو آگرہ کے محل میں فوت ہوا اور اپنی چہیتی بیوی ممتاز محل (جو مشہور زمانہ نورجہاں کی بھتیجی اور آصف جاہ کی بیٹی تھی) کے پہلو میں اس مقبرے میں دفن ہوا جو اب تاج محل آگرہ کہلاتا ہے وہ 30 سال کی حکومت کے بعد 74 سال کی عمر میں فوت ہوا۔ بعد از مرگ خطاب " فردوس آشیانی اعلیٰ حضرت " دیا گیا۔

عجائب گھر میں شاہجہاں کے لاہور کی ٹکسال میں مضروب کیے گئے بے شمار نقرئی سکے موجود ہیں۔ ان میں سے چند پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے: -

صاحب قران ثانی شہاب الدین محمد شاہ جہان بادشاہ غازی

ضرب دار السلطنت لاہور

ترجمہ : - " صاحب قران ثانی شہاب الدین محمد شاہجہاں بادشاہ غازی "

دار السلطنت لاہور میں مضروب ہوا۔ پشت پر کلمہ طیبہ ہے اور حاشیے میں چاروں خلفاء کے اسمائے گرامی ہیں۔

بصدق ابی بکر و عدل عمر باشرم عثمان و علم علی

ترجمہ :۔ " حضرت ابو بکرؓ کے صدق، حضرت عمرؓ کے عدل، حضرت عثمانؓ کی حیاء اور حضرت علیؓ کے علم و فضل کے ساتھ ۔ "(42)

عجائب گھر لاہور میں شاہجہاں کے ، دہلی ، آگرہ ، پٹنہ ، برھان پور ، احمد آباد اور ملتان کی ٹکسالوں میں مضروب شدہ بے شمار سکے ہیں ۔ اس کے علاوہ شاہجہان کے چند " نثار " سکے بھی ہیں جن کو 1066 ہجری میں مضروب کیا گیا۔

اورنگ زیب عالمگیر :۔ ممتاز محل کا فرزند ارجمند، محمد محی الدین اورنگ زیب عالمگیر، 22 اکتوبر 1618ء میں گجرات (دکن) کے قریب پیدا ہوا۔ وہ پچاس برس کی حکومت کے بعد، 21 فروری 1707ء کو بروز جمعتہ المبارک، دولت آباد کے قریب احمد نگر کے مقام پر اپنے پڑاؤ میں نوے سال اور چودہ روز کی عمر میں فوت ہوا، اور اسے خواہش کے مطابق، دولت آباد سے تین کوس کے فاصلے پر شاہ زین الدین کے مقبرہ کے احاطے مین دفن کیا گیا(43)۔

بعد از مرگ خطاب، اعلیٰ حقانی، خلد مکانی، ملا۔

صہبائی کے تخلص سے مشہور شاعر میر ابوالباقی کا وضع کردہ مندرجہ ذیل شعر، عجائب گھر میں اورنگ زیب کے طلائی سکے کے چند نمونوں پر کندہ ہے:۔

سکہ زرد در جہان چو بدر منیر   شاہ اورنگ زیب عالمگیر

ترجمہ :۔ " بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے سونے کا سکہ روشن سورج کی طرح مضروب کرایا ہے ۔ "

نقرئی سکوں کے لئے لفظ بدر (سورج) مہر (چاند) میں تبدیل کر دیا گیا، لیکن باقی عبارت وہی رہی۔

عجائب گھر میں اورنگ زیب کے نقرئی سکے بھی ہیں جن کو حکومت کے چوتھے سال لاہور میں مضروب کیا گیا۔

ملتان مین مرضروب کیے گئے چند سکوں پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

ابو المظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی

1069

ضرب دار الامان ملتان جلوس میمنت مانوس احد

ترجمہ :۔ " ابو المظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی (1069)۔ حکومت کے پہلے مبارک سال میں دار الخلافہ، ملتان میں مضروب کیا گیا۔ "

شاہ عالم :۔ قطب الدین محمد معظم شاہ عالم بہادر شاہ، 1643ء میں دکن میں پیدا ہوا۔ پانچ سال حکومت کرنے کے بعد 71 برس کی عمر میں، 19 فروری 1712ء میں لاہور میں فوت ہوا۔ اس کے جسد خاکی کو دہلی پہنچایا گیا جہاں صوفی بزرگ حضرت قطب الدین کے مقبرہ کے احاطہ میں دفن کیا گیا۔ وفات کے بعد خاور منزل کا خطاب ملا۔

لاہور میں مضروب کیے گئے اس کے سکہ پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے :۔

سکہ شاہ عالم بادشاہ غازی ۔ (119)

ضرب دار السلطنت لاہور سنہ احد جلوس میمنت مانوس

ترجمہ :۔ " شاہ عالم بادشاہ غازی کا سکہ میں دار السلطنت لاہور میں مبارک دور حکومت کے پہلے سال مضروب کیا گیا۔ "

دہلی، ملتان، لکھنؤ، سرھند، عظیم آباد، پشاور اور سورت کے سکے بھی ہیں

جہاندار شاہ :۔ محمد معزالدین جہاندار شاہ 1660ء میں دکن میں پیدا ہوا۔ 1713ء میں انتقال ہوا اور ہمایوں کے مقبرہ کے احاطہ میں دفن ہوا۔ بعد از مرگ خطاب، خلد آرام گاہ پایا۔

عجائب گھر میں اس بادشاہ کے مندرجہ ذیل سکے موجود ہیں :۔

(1) در افاق زد سکہ بر مہر و ماہ ابو الفتح غازی جہاندار شاہ

1124

ضرب دار الخلافہ شاہجہان آباد سنہ احد جلوس ممنت مانوس

ترجمہ :۔ " ابو الفتح غازی جہاندار شاہ، نے پوری دنیا میں چاند اور سورج پر اپنی مہر لگا دی ہے ۔ اس کو مبارک حکومت کے پہلے سال دار الخلافہ شاہجہان آباد میں مضروب کیا گیا۔ "

(2) در آفاق زد سکہ چون مہر و ماہ ابو الفتح غازی جہاندار شاہ

1124

ضرب دار السلطنت لاہور سنہ احد جلوس میمنت مانوس

ترجمہ :۔ ابو الفتح بادشاہ جہاندار شاہ غازی نے اپنا سکہ سورج اور چاند کی طرح مضروب کرایا۔ 1124

اس کو مبارک حکومت کے پہلے سال دار السلطنت لاہور میں مضروب کیا گیا۔

(3) بزد سکہ بر زر چو صاحب قران جہاندار شاہ بادشاہ جہاں

1124

ضرب دار الخلافہ شاہجہان اباد سنہ احد جلوس مبارک

ترجمہ :۔ دنیا کے بادشاہ جہاندار شاہ نے صاحبقران کی طرح سونے پر سکہ مضروب کرایا۔ 1124

مبارک حکومت کے پہلے سال دار السلطنت شاہجہاں آباد میں مضروب کیا گیا۔

فرخ سیر :۔ محمد فرخ سیر 1686ء میں پیدا ہوا اور چھ سال چار ماہ حکومت کرنے کے بعد 1719ء میں فوت ہوا۔ ہمایوں کے مقبرہ میں دفن ہوا۔ بعد از مرگ خطاب "شہیدی محرم" پایا۔

لاہور میں مضروب کیے گئے اس کے سکوں پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے :۔

سکہ زد از فضل حق بر سیم و زر بادشاہ بحرو بر فرخ سیر

1125

ضرب دار السلطنت لاہور سنہ 2 جلوس سیمنت مانوس

ترجمہ :۔ بحر و بر کے بادشاہ فرخ سیر نے سونے اور چاندی پر اللہ کے فضل و کرم سے مہر لگائی۔ 1125

مبارک حکومت کے دوسرے سال اسے دار السلطنت لاہور میں مضروب کیا گیا۔

کشمیر میں مضروب کیے گئے سکوں پر مرشد آباد کو خجشہ بنیاد ، شاہجہان آباد کو دار الخلافہ ، اکبر آباد کو مستقر الملک یا مستقر الخلافہ ، برہانپور کو دار السرور ، عظیم آباد بریلی اور ملتان کو دار الامان کہا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ارکوٹ اور ایٹاوا کے سکے بھی ہیں۔

رفیع الدرجات :۔ شمس الدین ابو برکات رفیع الدرجات کا انتقال 1718ء میں ہوا۔ اس کو ہمایوں کے مقبرہ میں دفن کیا گیا۔ عجائب گھر میں اس بادشاہ کا لاہور میں مضروب کیا گیا سکہ مندرجہ ذیل ہے :۔

زد سکہ بہند باہزاران برکات شاھفشہ بحرو بر رفیع الدرجات

1131

ضرب دار السلطنت لاہور سنہ احد جلوس

بحر و بر کے بادشاہ رفیع الدرجات نے ہندوستان میں ہزاروں برکات کے ساتھ
سکہ مضروب کرایا۔1131
دار السلطنت لاہور میں حکومت کے پہلے سال مضروب کیا گیا۔

اس بادشاہ کے ملتان اور شاہجہاں آباد میں مضروب کیے گئے سکے بھی موجود ہیں۔

رفیع الدولہ :۔ رفیع الدولہ شاہجہاں ثانی 1718ء میں فوت ہوا اور ہمایوں کے مقبرہ میں دفن کیا گیا۔ لاہور میں مضروب کیے گئے سکہ پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے :۔

سکہ مبارک شاہجہاں بادشاہ غازی ---1131
ضرب دار السلطنت لاہور احد جلوس

شاہجہاں بادشاہ غازی کا مبارک سکہ 1131 (1718ء) دار السلطنت لاہور میں حکومت کے پہلے سال مضروب کیا گیا۔

محمد شاہ :۔ مریم مکانی کا بیٹا ابو الفتح، روشن اختر، ناصر الدین 5 اگست 1702ء کو غزنی کے مضافات میں پیدا ہوا۔ 31 سال حکومت کرنے کے بعد وہ 46 سال کی عمر میں 14 اپریل کی صبح کو 1748ء میں دہلی میں فوت ہوا۔ دہلی میں حضرت نظام الدینؒ کے مقبرہ کے احاطے میں دفن کیا گیا۔ بعد از مرگ خطاب فردوس آرام گاہ پایا۔ اس بادشاہ کے لاہور کی ٹکسال میں مضروب کرائے گئے سکوں پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے :۔

سکہ مبارک محمد شاہ بادشاہ غازی ---1132
ضرب دار السلطنت لاہور سنہ احد جلوس میمنت

ترجمہ :۔ محمد شاہ بادشاہ غازی کا مبارک سکہ 1132 میں دار السلطنت لاہور میں
مبارک حکومت کے پہلے سال مضروب کیا گیا۔

اس بادشاہ کے ملتان، اکبر آباد، شاہجہاں آباد، پشاور، سورت، اختر نگر (اودھ) ارکوٹ، مرشد آباد، بریلی، فرخ آباد، بنارس (جس کو محمد آباد کہا جاتا تھا) ایٹاوا اور برہانپور (جس کو دار السرور کہا گیا ہے) کی ٹکسالوں میں مضروب کیے گئے کئی سکے بھی موجود ہیں۔

احمد شاہ :۔ مجاہد الدین ابو الناصر احمد شاہ 1727ء میں پیدا ہوا اور 1775ء میں فوت ہوا۔ دہلی کے مضافات میں قدم رسولؐ میں دفن کیا گیا۔ اس کے لاہور میں مضروب کردہ سکوں پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے :۔

سکہ مبارک احمد شاہ بہادر بادشاہ غازی 1162

ضرب دار السلطنت لاہور سنہ احد جلوس میمنت مانوس

ترجمہ :۔ احمد شاہ بہادر بادشاہ غازی کا مبارک سکہ 1162 ہجری میں حکومت مبارک کے پہلے سال دار السلطنت لاہور میں مضروب کیا گیا۔

عالمگیر ثانی :۔ ابو العدل عزالدین محمد عالمگیر ثانی 1687ء میں پیدا ہوا اور 73 سال کی عمر میں 11 نومبر 1759ء کو فوت ہوا۔ اسے ہمایوں کے مقبرہ میں دفن کیا گیا۔ اس کے مضروب کرائے گئے سکوں پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے :۔

سکہ زد بر ہفت کشور ہمچو تاباں مہر و ماہ

شہ عزیز الدین عالمگیر غازی بادشاہ 1170

ترجمہ :۔ بادشاہ عزیز الدین نے روشن سورج اور چاند کی طرح 1170 ھ میں ہفت کشور کی طرح سکہ مضروب کرایا۔

مندرجہ ذیل چوکور طلائی سکے کو دہلی میں مضروب کیا گیا :۔

پیشانی :۔ سکہ مبارک ابو العدل عزیز الدین محمد عالمگیر بادشاہ غازی ضرب دار الخلافہ شاہجہاں اباد سنہ 2

پشت :۔ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ ۔

حاشیہ :۔ بصدق ابو بکر و عدل عمر باشرم عثمان و علم علی ۔

ترجمہ :۔ پیشانی :۔ ابو العدل عزیز الدین محمد عالمگیر بادشاہ غازی کا مبارک سکہ شاہجہاں آباد دار الخلافہ میں حکومت کے دوسرے سال مضروب ہوا۔

پشت :۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔

حاشیہ :۔ حضرت ابو بکرؓ کے صدق، حضرت عمرؓ کے عدل، حضرت عثمانؓ کی حیاء اور حضرت علیؓ کے علم کے ساتھ ۔

مندرجہ ذیل سکے کو لاہور میں مضروب کیا گیا :۔

سکہ مبارک عالمگیر بادشاہ غازی ۔۔۔ 1100

ضرب دار السلطنت لاہور سنہ احد جلوس میمنت مانوس

ترجمہ :۔ عالمگیر بادشاہ غازی کے مبارک سکہ کو دار السلطنت لاہور میں 1100 ھ میں مبارک عہد کے پہلے سال مضروب کیا گیا۔

شاہ عالم ثانی :۔ علی گوہر شاہ عالم ثانی الہ آباد میں 1727ء میں پیدا ہوا اور 81 برس کی عمر میں 1807ء میں فوت ہوا۔ اسے قطب دہلی میں دفن کیا گیا۔ بعد از مرگ خطاب " فردوس منزل " پایا۔ اس کے مضروب کرائے گئے سکوں پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے :۔

سکہ زد بر ہفت کشور سایہ فضل اللہ

حامی دین محمد شاہ عالم بادشاہ

ترجمہ :۔ اللہ کے فضل کا سایہ حامی دین محمد، شاہ عالم بادشاہ نے ہفت کشور پر مہر لگا دی ہے۔

ایک دوسرے سکے پر مندرجہ ذیل عبارت ہے :۔

سکہ صاحب قرانی زد زتائید الہ

حامی دین محمد شاہ عالم بادشاہ

ترجمہ :۔ حامی دین محمد، شاہ عالم بادشاہ نے اللہ کے فضل سے صاحب قران کی طرح سکہ مضروب کرایا۔

اکبر شاہ :۔ ابو النصر معین الدین اکبر شاہ ثانی 1759ء میں پیدا ہوا اور 1821ء میں 62 برس کی عمر میں وفات پائی۔ قطب الدین کے مقبرے کے احاطہ میں دفن کیا گیا۔ بعد از مرگ خطاب " عرش آرام گاہ " ہے۔ اس نے مندرجہ ذیل عبارت کا حامل سکہ مضروب کرایا۔

سکہ مبارک صاحب قران ثانی محمد اکبر بادشاہ غازی

ضرب دار الخلافہ شاہجہاں اباد سنہ احد جلوس میمنت مانوس

ترجمہ :۔ صاحب قران ثانی محمد اکبر بادشاہ غازی کا مبارک سکہ، مبارک عہد کے پہلے سال دار الخلافہ شاہجہاں آباد میں مضروب کیا گیا۔

نادر شاہ اور اس کے جانشینوں کے سکے

عجائب گھر میں افغان بادشاہوں کے چند نہایت دلچسپ سکے موجود ہیں۔ ان میں سے قابل ذکر سکے نادر شاہ اور اس کے جانشینوں کے ہیں۔

نادر شاہ :۔ نادر شاہ کے طلائی سکوں پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے۔ اس نے کرنال کی لڑائی کے بعد اپنے سکے مضروب کرائے۔

ہست سلطان بر سلاطین جہان شاہ شاہان نادر صاحب قران خلد اللہ ملکہ ضرب

بھکر 1158

ترجمہ :۔ بادشاہوں کے بادشاہ صاحبقران نادر شاہ اللہ اس کی حکومت کو طویل کرے۔ 1158 میں بھکر میں مضروب کرایا۔

ایک دوسرے سکہ پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے :۔

سکہ بر زد کرد نام سلطنت اندر جہان

نادر ایران زمین و خسر و گیتی ستان

الخیرفی ماوقع

ترجمہ :۔ عالم پناہ نادر ایران نے پوری دنیا میں بادشاہت کا اعلان کر دیا ہے۔

جو گزر چکا ہے وہ بہتر ہے

اس بادشاہ کے دہلی، پشاور، اصفہان اور تبریز میں مضروب کیے گئے سکے بھی موجود ہیں۔

احمد شاہ درانی :۔ احمد شاہ درانی نے مندرجہ ذیل عبارت کے حامل سکوں کو لاہور میں مضروب کرایا:۔

حکم شد از قادر بیچون باحمد بادشاہ

سکہ زن بر سیم و زر از اوج ماہی تا بماہ

ضرب دار السلطنت لاہور سنہ احد میمنت مانوس

در دوران احمد شاہ بادشاہ

ترجمہ :۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مخفی بادشاہ احمد نے سمندر کی تہہ سے چاند کی بلندی تک سونے اور چاندی پر سکہ مضروب کرایا۔ اس کو مبارک عہد کے پہلے سال دار السلطنت لاہور میں مضروب کرایا گیا۔ زمانے کا موتی احمد شاہ بادشاہ۔

اس بادشاہ کے ملتان، دہلی، سرہند، کشمیر، بھکر، بریلی اور ڈیرا میں مضروب کرائے گئے سکے بھی موجود ہیں۔

تیمور شاہ :۔ احمد شاہ درانی کے بیٹے اور جانشین تیمور شاہ کے مندرجہ ذیل سکے عجائب گھر میں موجود ہیں:۔

بحکم خدا و رسول انام بعالم یافت سکہ تیمور شاہ نظام

ضرب دار السلطنت لاہور سنہ احد میمنت مانوس

ترجمہ :۔ خدا اور رسول کریمؐ کے حکم سے تیمور شاہ کا سکہ دنیا میں رائج ہوا۔

مبارک عہد کے پہلے سال اس کو دارالسلطنت لاہور میں مضروب کیا گیا۔

ایک دوسرے سکے پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

چرخ می ارد طلا و نقرہ از خورشید و ماہ

تا زند بر چہرہ نقش سکہ تیمور شاہ 1205

ترجمہ:۔ آسمان نے سورج اور چاند سے سونا اور چاندی حاصل کیے اور تیمور شاہ کے سکہ کی پیشانی کو 1205 میں مضروب کیا گیا (44)

تیمور شاہ کے سکوں میں قندھار کو " اشرف البلاد احمد شاہی " ، مطلب احمد شاہ کا افضل ترین شہر کہا گیا ہے۔

شاہ زمان :۔ تیمور شاہ کے بیٹے اور جانشین شاہ زمان کے پشاور میں مضروب کرائے گئے سکوں پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

قرار یافت بحکم خدائے ہر دو جہان

رواج سکہ دولت بنام شاہ زمان

ضرب پشاور جلوس میمنت مانوس

ترجمہ:۔ بحکم خدائے ہر دو جہاں، شاہ زمان کے نام سے مملکت میں سکہ رائج ہوا مبارک عہد کے آٹھویں سال پشاور میں مضروب ہوا۔ 8

ہرات میں مضروب کیے گئے سکے پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:۔

بزد سکہ بر زر بحکم الٰہی زمان شاہ شاہان یمین و لسیاری

ضرب دارالسلطنت ہرات 1214

ترجمہ:۔ اللہ کے حکم سے بادشاہوں کے بادشاہ زمان شاہ نے سونے پر سکے کو ہر طرف سے مضروب کرایا۔

1214 میں دارالسلطنت، ہرات میں مضروب کیا گیا۔

محمود شاہ :۔ شاہ زمان کے بڑے بھائی محمود شاہ نے کابل کے تخت و تاج سنبھالنے کے بعد سکے مضروب کرائے ان میں سے ہرات میں مضروب کیا گیا۔ مندرجہ ذیل سکہ عجائب گھر میں موجود ہے

سکہ زد بر زر بتوفیق الہ خسرو گیتی ستان محمود شاہ

ضرب دارالسلطنت ہرات 1217

ترجمہ:۔ فاتح عالم بادشاہ محمود شاہ نے اللہ کے حکم سے سونے پر سکہ مضروب کرایا۔

1217 میں دارالسلطنت ہرات میں مضروب کیا گیا۔

شجاع الملک :۔ شاہ زمان کے بھائی، شجاع الملک (ان کی والدہ یوسف زئی خاتون تھی) نے حکومت سنبھالنے کے بعد مندرجہ ذیل عبارت کا حامل سکہ مضروب کرایا:۔

سکہ زد بر سیم و زر ہمچو تاباں مہر و ماہ

شاہ دین پرورده شجاع الملک شاہ

ضرب سنہ 3 جلوس پشاور

ترجمہ:۔ شاہ دین بادشاہ شجاع الملک نے یہ سکہ روشن سورج اور چاند کی طرح سونے اور چاندی پر مضروب کرایا۔ اس کو حکومت کے تیسرے سال پشاور میں مضروب کیا گیا۔

شاہ شجاع کے کشمیر میں مضروب کردہ سکے پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے۔

سکہ زد از فضل حق بر سیم و زر

شاہ شجاع الملک شاہ بحر و بر۔۔۔1219

ضرب خطہ کشمیر سنہ 2

ترجمہ:۔ اللہ کے فضل و کرم سے بادشاہ بحر و بر شاہ شجاع الملک نے سونے اور چاندی پر سکہ مضروب کرایا۔ اس کو کشمیر میں 1219 ہجری اور حکومت کے دوسرے سال مضروب کرایا گیا۔

ایوب شاہ :۔ شجاع الملک کا ایک چھوٹا بھائی ایوب شاہ جس کو کابل کی حکومت، برق زئی سردار محمد عظیم خاں نے دلوائی تھی۔ اس کے سکوں میں سے پشاور میں مضروب کرائے گئے سکہ کا مندرجہ ذیل نمونہ عجائب گھر میں موجود ہے۔

در جہان روشن از خورشید و ماہ شد از شعاع سک ایوب شاہ

ضرب جلوس پشاور سنہ 7

ترجمہ:۔ ایوب شاہ کے سکے کی کرنوں سے سورج اور چاند نے دنیا میں شان و شوکت حاصل کی ہے حکومت کے ساتویں سال میں پشاور میں مضروب کرایا گیا

دیگر سکے :۔ عجائب گھر میں دیگر سکوں کا خزانہ بھی موجودہ ہے۔ مثلاً سکھ دور کے سکے، ایرانی سکے،

وسطی ایشیا کے سکے ، روسی سکے ، مقامی ریاستوں یعنی نیپال ، پٹیالہ ، نابھہ ، الور ، بہاولپور ، چمبہ ، جھنڈ ، مالیر کوٹلہ ، جے پور کے سکوں کے علاوہ لکھنؤ کے بادشاہون کے سکے ، انگریزی سکے ، اطالوی سکے ، فرانسیسی سکے ، یورپی سکے ، امریکی سکے ، پارتھی سکے ، برمی سکے اور چینی سکے بھی ہیں۔

ختم شد

حوالہ جات

1۔ "تحفۃ الواصلین" کے مصنف شیخ احمد زنجانی کے مطابق لاہور کو ایک پانڈو بادشاہ راجہ پریچت نے آباد کیا تھا لیکن پانڈوؤں کا دور حکومت 1200 قبل مسیح تھا اور ہمیں سکندر جس نے 327 قبل مسیح میں پنجاب پر حملہ کیا تھا اس کے یونانی مورخوں کی کتابوں میں کہیں بھی لاہور کا ذکر نہیں ملتا۔ ہو سکتا ہے کہ پانڈوؤں نے لاہور شہر کے نام سے مماثلت رکھنے والا کوئی شہر اس کے قرب و جوار میں آباد کیا ہو جس زمانے کا حوالہ دیا گیا ہے لیکن اگر اس امر کو مان بھی لیا جائے تو یہ سکندر کے حملہ کے وقت بالکل غیر اہم جگہ ہو گی کیونکہ اس شہر یا اس سے مماثلت رکھنے والے کسی اور علاقے کا ذکر یونانی مورخین کی تصانیف میں بالکل نہیں ملتا۔

شیخ احمد نے اپنی کتاب 435 ہجری یا 1043ء میں اس وقت مکمل کی جب پنجاب پر سلطان مسعود کے بیٹے سلطان مودود کی حکومت تھی۔ ان کی کتاب میں اس لیے کچھ وزن نظر آتا ہے کہ یہ تاریخ پنجاب میں ہندوؤں کی ملوکیت ختم ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد لکھی گئی۔ انہوں نے کم سے کم بلاشک و شبہ قدیم شہر لاہور کو آباد کیا۔ مصنف کے مطابق امتداد زمانہ کی وجہ سے شہر بالکل ویران ہو گیا تھا اس کو راجہ بکرماجیت نے از سر نو آباد کیا وہ کچھ عرصہ بعد فوت ہو گیا تو اس کے بیٹے سمند پال نے شہر کو آباد کرنے پر توجہ دی۔ اس نے شہر کو سمند پال نگری کا نام دیا۔ جب راجہ دیپ چند سریر آرائے تخت ہوا اور دہلی کی حکومت سنبھالی تو اس نے پنجاب کو اپنے بھتیجے لاہور چند کے حوالے کر دیا۔ اس نے اس صوبہ میں حکومت کو مجتمع کرنے کے بعد اپنی بادشاہت کا دارالخلافہ لاہور قائم کیا اور اسے لوہار پور کا نام دے دیا۔ یہ امر پہلے سے درج رائے کے مطابق طے شدہ ہے کہ دیگر ناموں کے درمیان لاہور کو بھی لوہار پور کہا جاتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ شہر کو لاہور

کہا جانے لگا۔

2۔ یہ فنکار جو لاہور میو سکول آف آرٹ میں اسسٹنٹ ماسٹر ہے کچھ عرصہ پیشتر لاہور سے وائٹ کے جزیرے اوسبورن کے لیے اس مقصد کے لیے روانہ ہوا ہے تاکہ وہاں شاہی محل کے طعام خانے (ڈائننگ روم) کی نئی عمارت کے لیے آرائشی ڈیزائن تیار کرسکے۔ مسٹر جے۔ ایل کپلنگ نے حال ہی میں انہیں اپنے ہمراہ لے جاکر ملکہ عالیہ سے متعارف کروایا۔ انہوں نے ان کے ساتھ اچھی خاصی ہندوستانی زبان میں بات چیت کی۔ وہ ہر روز ان سے ملاقات کرتی ہیں اور اسی زبان میں ان کی چند مہربان اور شاندار الفاظ میں تعریف کرتی ہیں۔

3۔ چٹانوں، ستونوں اور تانبے کے پتروں پر درج عبارات سے پتہ چلایا گیا ہے کہ ہندوستانی حروف تہجی تیسری صدی قبل مسیح میں موجود تھے۔ اس میں شک و شبہ پایا جاتا ہے کہ آیا کبھی ہندوستان کی آزاد حروف تہجی موجود تھی جبکہ اشوک کے دور (250ء) میں یہ عبارت دو طرز کے خطوط میں درج کی گئی ہیں یعنی آریانو، پالی یا شمالی خاص بولی، پتہ چلایا گیا ہے اس کا تعلق فونیشین سے ہے جبکہ انڈو۔ پالی یا جنوبی قسم کی بولی کے متعلق اندازہ ہے کہ اس کی ابتداء مغرب سے ہوئی۔

4۔ مہاتما بدھ کے اہم مجسموں کے بارے میں اس باب کے آخر پر بیان کیا گیا ہے۔

5۔ یہ مقام جس کو دریائے سندھ بالکل بہا کر لے گیا ہے اس کے آثار کے بارے میں بیان، پنجاب گزٹ برائے 69-1868ء میں شائع ہوا تھا۔

6۔ اس موضوع کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنے کے لیے قاری کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ مسٹر بیڈن پاویل کی کتاب "پنجاب کی مصنوعات کا کتابچہ" ملاحظہ فرمائیں۔

7۔ 1834ء میں جیمز فوربز کی تصنیف "مشرقی سرگزشت" جلد۔ دوئم، صفحہ 175 بحجن کی "فارس"، صفحہ 74

8۔ ایرکسائن کی تصنیف "بابر کے حالات"، صفحہ 308

9۔ ایلفنسٹائن کی "تاریخ ہندوستان" صفحات 357 اور 373

10۔ سیاح لکھتا ہے: ۔ یہ ہیرا اس عظیم مغل سے تعلق رکھتا ہے جس نے مجھے یہ ہیرا اپنے دیگر جواہرات کے ہمراہ دکھا کر عزت بخشی اور اس کا وزن کرنے کی بھی اجازت دے دی۔ اندازاً اس کا وزن 907 رتی یا 793 قیراط تھا۔ "ٹیورنیئر کے سفرنامے"، صفحہ 23

11۔ "ٹیورنیئر کا سفرنامہ"، صفحہ 97 ۔ ایرکسائین پروفیسر میسکیلائن اور جنرل کننگھم سب

اس بات پر متفق ہیں کہ ٹیور نیئر نے مغلوں کے جس عظیم ہیرے کی نشاندہی کی ہے یہ وہی ہے جس کا ذکر بابر نے کیا ہے۔ مسٹر وی بال نے "ٹیو نیئر کا سفرنامہ" کے ۔۔ب تعریف ترجمے کے بعد اپنے ایک طویل مضمون کے ضمیمہ نمبر1 میں اس بنا پر شک پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ بابر کے دور کی رتیاں شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے دور کی رتیوں سے مختلف تھیں لیکن رتی (جنگلی بیر) جو ہندوستان کی پیداوار ہے اور اس کو ہندوؤں کے دور سے وزن کی ایک اکائی کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس کے وزن میں کسی قسم کی غلطی کی گئی ہو۔ یہ پورے ہندوستان میں جو کے آٹھ دانوں کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ مختلف قومیتوں کے مصنفین نے یکے بعد دیگرے تاریخ کے مختلف ادوار میں دنیا میں کسی اور ہیرے کی اس قدر تعریف و توصیف نہیں کی جتنی اس کی، کی ہے۔ قطع و برید کے بعد بھی بابر کے ہیرے اور مغلوں کے عظیم ہیرے کے وزن سے سب میں اس قدر اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ اس بے نظیر ہیرے کو دیگر ہیروں کے ساتھ خلط ملط کرنے کی کوشش کو مہذب دنیا کے دیگر ہیروں میں سب سے زیادہ شان و شوکت کے حامل اور شہرت یافتہ ہیرے کے ساتھ سخت ناانصافی سمجھا جائے گا۔ قاری کو دنیا کے دیگر درجنوں مشہور و معروف ہیروں کے نام بتانا بے سود ہو گا۔ مثلاً ان میں ڈیوک آف ٹسکینی کا ہیرا جو دوسرے لفظوں میں آسٹرین ییلو یا فلورنٹائن کہلاتا ہے اس کا وزن 3/4-123 قیراط ہے یا روس کے بادشاہ کا ہیرا جو دراصل سرنگھم میں ایک بت کی آنکھ میں لگا ہوا تھا یا دریائے نور جو اصفہان کے شاہی خزانے میں شامل ہے۔ ان سب کے بارے میں اتفاق رائے یہی ہے کہ ان کا وزن کوہ نور ہیرے کی شکستہ حالت کے باوجود اس سے بہت کم اور چمک دمک بھی کم تر ہے۔

اس تعلق سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ہیرا کس طرح مغلوں کے ہاتھوں سے ہوتا ہوا، میر جملہ تک پہنچا۔ لیکن غالب خیال یہ ہے کہ تباہ حال ہمایوں کے ایران کی طرف فرار کے بعد پیدا ہونے والی غلط فہمی کا تعلق بڑی حد تک اس سے ہے اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ اس آدمی کی ملکیت بن گیا جو دکن کی سیاست میں نمایاں مقام حاصل کرنے سے پیشتر اس وقت ہندوستان میں ہیروں کے سوداگر کے طور پر مشہور تھا۔

ٹیورنیئر اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ اسے گولکنڈا کی کانوں سے دریافت کیا گیا تھا لیکن اس کو اس بارے میں صریحاً غلط اطلاع دی گئی کہ اس کان کو صرف ایک سو سال پہلے

کھولا گیا تھا۔ اگرچہ ٹیورنیئر کی رائے کو جواہرات کے موضوع پر مستند سمجھا جاتا ہے لیکن وہ اچھا جغرافیہ دان نہیں تھا اور اس ملک کی زبان کے متعلق بھی کم علم رکھتا تھا اور اس وجہ سے اسے مترجمین کی خدمات حاصل کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ مسٹر بال کی طرف سے بطور ایک سیاح کے اس کی کمزوریوں کے بارے میں بیان بڑا واضح ہے لیکن ان سب کے باوجود تمام اس بات سے اتفاق رکھتے ہیں کہ وہ بہترین جوہر شناس تھا اور اس عظیم ہیرے کے وزن، چمک دمک، بہت زیادہ خوبصورتی اور حجم کے بارے میں اس کے بیان کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

12۔ بوسورتھ سمتھ (لارڈ لارنس کے سوانح نگار) اور دوسروں کی بیان کردہ اس کہانی میں کوئی صداقت نہیں ہے کہ نادر شاہ نے محمد شاہ سے اپنی پگڑی بدل لی تھی اور اس نے پگڑی کو ہیرے سمیت حاصل کر لیا تھا۔

13۔ رنجیت سنگھ کے انتقال کے وقت اس کے خزانے میں تقریباً آٹھ کروڑ روپے نقد یا اسی قدر کئی ملین سٹرلنگ پاؤنڈ کے علاوہ کئی ملین سے بھی زائد مالیت کے جواہرات، شالیں، گھوڑے اور ہاتھی وغیرہ بھی تھے۔ بحوالہ "سکھوں کے ملک کا بیان" از لیفٹیننٹ کرنل سٹین بیک، صفحہ 16، لندن۔ 1846ء۔

14۔ اپنے منصوبہ کی تکمیل کے لیے ایک آنکھ والے حکمران نے جس قسم کے ذرائع اختیار کیے۔ انہوں نے اس کو اس قدر رسوا کیا کہ رنجیت سنگھ کا نام مشرقی تاریخ میں ایک خود غرض اور گھٹیا حکمران کے طور پر مشہور ہو گیا۔ شاہ کا خاندان دو دنوں میں اپنی ہر چیز سے محروم ہو گیا اور شاہ کو اپنی بیوی اور بچوں کے ہمراہ سخت بے چارگی کا شکار ہونا پڑا۔ ملاحظہ کیجیے مرے کی تصنیف "مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حیات" تدوین کردہ ہنری ٹی پرینسپ، صفحات 96 اور 97، کلکتہ 1834ء۔

15۔ ملاحظہ کیجیے شاہ شجاع کی سوانح عمری، باب 25
ہیرے کو ہتھیانے کے طریقہ کے بارے میں شاہ شجاع کا بیان کیپٹن مرے کے بیان سے زیادہ قابل قبول ہے۔

16۔ ہندوستان کے گورنر جنرل ارل آف آک لینڈ کے ملٹری سیکرٹری عزت مآب ایچ، ڈبلیو، جی، اوسبرن جن کو 1838ء میں دوستانہ مشن پر لاہور روانہ کیا گیا۔ وہ لکھتے ہیں "مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ مختلف موضوعات پر ڈیڑھ گھنٹہ تک بات چیت کرنے کے بعد میں

نے اسے "عظیم کوہ نور" دکھانے کا وعدہ یاد دلایا۔ اس نے وہ فوراً منگوا بھیجا۔ یہ یقیناً بہت شاندار ہیرا ہے۔ یہ تقریباً ڈیڑھ انچ لمبا اور اوپر سے ایک انچ چوڑا ہے اور آدھ انچ کے جڑاؤ میں سے باہر نکلا ہوا ہے۔ یہ انڈے کی شکل کا ہے اور ایک گجرے میں اپنے سے نصف حجم کے دو ہیروں کے درمیان جڑا ہوا ہے۔ اس کی مالیت 3 ملین سٹرلنگ پاؤنڈ ہے۔ بہت شاندار ہے اور اس میں کسی قسم کا کوئی نقص نہیں ہے۔ (مہاراجہ رنجیت سنگھ کا دربار اور پڑاؤ)، صفحہ 202

17۔ سمتھ کی تصنیف "لاہور کا حکمران خاندان" صفحہ 63

18۔ "لارڈ لارنس کی حیات" صفحات 86-285

19۔ لغوی طور پر "گرج" یا "شاباش دینے والی" ہے لیکن اس کا مطلب شیر کی چنگھاڑ بھی ہے۔

20۔ میاں قادر بخش باغبانپورہ کے میاں خا۔ ان سے تعلق رکھنے والے افراد مولوی ظہور الدین اور جناب محمد شاہ دین، بیرسٹرایٹ لاء کے دادا تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے انہیں توپ سازی کا فن سیکھنے کے لیے لدھیانہ روانہ کیا۔ انہوں نے واپس آنے کے بعد توپ سازی پر ایک کتاب بھی لکھی۔

21۔ عبدالمنصور خاں جو صفدر جنگ کے لقب سے زیادہ مشہور ہے وہ اودھ کے حاکم سعادت علی خاں کا بھتیجا اور جانشین تھا جس کی بیٹی سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ وہ ایرانی النسل تھا اور اپنے چچا کی دعوت پر ہندوستان آیا۔ نادر شاہ کی روانگی کے بعد منصور خاں کو وزیر کے عہدے پر فائز کر کے صفدر جنگ کا خطاب دیا گیا۔ وہ 1753ء میں فوت ہوا اور اس مقبرے میں دفن ہوا جو دہلی سے پانچ میل کے فاصلے پر قطب مینار کو جانے والی سڑک پر موجود ہے۔ اس امیر کے بارے میں مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجیے میری کتاب "تاریخ پنجاب"۔

22۔ مسٹر کولے، آر۔ ای، کے مطابق مندرجہ ذیل مشرقی عمارات ابتدائی طور پر ان ٹائلوں کے استعمال کے سلسلہ میں بہترین مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں۔

1۔ جامع مسجد، بدایوں، 1223ء

2۔ حضرت بہاء الحق کا مقبرہ ملتان 1250ء

3۔ تبریز کی مسجد، ایران 1294ء

4۔ مسجد بے قوم قاہرہ (قاہرہ میں ابتدائی طور پر روغنی ٹائلوں کا استعمال اسی میں کیا گیا)

1354ء ۔

5۔ تیمور لنگ کے والد کا مقبرہ، سمرقند، پچی کاری کی ٹائلیں لگائی گئی ہیں۔ 1404ء

6۔ تیمور لنگ کا مزار سمرقند، 1404ء

7۔ مان سنگھ کا محل، گوالیار، پچی کاری کی ٹائلیں لگائی گئی ہیں 1507ء

8۔ جمالی کمالی مقبرہ، دہلی، پچی کاری کی ٹائلیں لگائی گئی ہیں 1528ء

9۔ محمد مومن کا مقبرہ، نکودر نزد جالندھر، 1612ء

10۔ مقبرہ جہانگیر لاہور، پچی کاری کی ٹائلیں لگائی گئی ہیں 1627ء

11۔ مسجد وزیر خاں، لاہور، پچی کاری کی ٹائلیں لگائی گئی ہیں 1623ء

23۔ تھارنٹن کی تصنیف "لاہور"، صفحہ 148

24۔ القرآن، سورۃ فتح۔

25۔ شمس الدین التمش کا مقبرہ قطب مینار دہلی کے قریب مسجد قوت الاسلام کے شمال مغربی کونے کے باہر موجود ہے۔

26۔ اس کا مزار دہلی کے قریب ملک پور میں واقع ہے۔

27۔ رضیہ سلطانہ نئی دہلی میں ترکمان دروازہ کے قریب دفن ہے۔ کیر سٹیفن۔

28۔ اس کا مزار دہلی کے قریب ملک پور میں واقع ہے۔

29۔ وہ قطب مینار دہلی کے احاطہ میں دار الامان میں دفن ہے۔ کیر سٹیفن، صفحہ 79

30۔ اس کو دہلی میں قطب مینار کے احاطہ میں دفن کیا گیا۔ آثار الصنادید۔

31۔ اس کا مزار دہلی کے مضافات میں واقع ہے۔

32۔ فیروز شاہ کا مقبرہ، دہلی میں حوض خاص گاؤں میں واقع ہے۔ کیر سٹیفن، 157

33۔ فتح خاں اپنے والد کی زندگی میں 1374ء میں فوت ہو گیا اور اسے نئی دہلی کے لاہوری دروازہ کے جنوب میں تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر "قدم شریف" میں دفن کیا گیا۔ اس کی قبر پر ایک پاؤں کی نشان والی سنگ مرمر کی تختی رکھی ہوئی ہے جس کے بارے میں خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ اس پر حضور اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاؤں مبارک کا نشان ہے۔ اسی وقت سے اس جگہ کو قدم شریف کہا جانے لگا۔

34۔ دہلی میں اس کا مزار اپنے والد کے قریب واقع ہے۔

35۔ مسلمان بادشاہ اپنے آپ کو بغداد کے خلیفہ کا نائب کہنے پر فخر محسوس کرتے تھے۔ لفظ امیر

المومنین وقت کے خلیفہ کی نشاندہی کرتا ہے۔

36۔ اس کا مزار، جدید دہلی کے جنوب میں تقریباً 5 میل کے فاصلے پر صفدر جنگ کے مقبرہ کے قریب موضع مبارک پور میں واقع ہے۔ کیر سٹیفن، صفحہ 160

37۔ سید محمد شاہ کا مزار (دہلی کے قریب) موضع خیرپور میں اپنے جد امجد مبارک شاہ کے مزار کے قریب ہے۔

38۔ بہلول لودھی کا مزار ایک باغ جو جودھ باغ کے نام سے مشہور ہے اس میں واقع ناصر الدین چراغ دہلی کی خانقاہ کے احاطہ کی مغربی دیوار کے باہر واقع ہے۔ آثار الصنادید۔

39۔ اس کا مزار قطب مینار دہلی میں واقع ہے۔

40۔ اکبر کی والدہ کا خطاب مریم مکانی تھا۔

41۔ مسٹر راجرز نے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے جریدے میں لاہور کی ٹکسال میں مضروب کیے گئے جہانگیر کے مندرجہ ذیل سکوں کا ذکر کیا ہے لیکن یہ عجائب گھر میں موجود نہیں ہیں۔

در اسفندار مز این سکہ در لاہور زر بر زر
شہنشاہ امم شاہ جہانگیر ابن شاہ اکبر

ترجمہ:۔ اکبر بادشاہ کے بیٹے امتوں کے بادشاہ جہانگیر نے اسفندار مز کے مہینے میں اس سکے کو سونے پر لاہور میں مضروب کرایا۔

بماہ تیر در لاہور زد این سکہ را بر زر
پناہ دین ملک شاہ جہانگیر ابن شہ اکبر

ترجمہ:۔ اکبر بادشاہ کے بیٹے بادشاہ جہانگیر نے اس سکے کو سونے پر لاہور میں تیر کے مہینے میں مضروب کرایا۔

مہ اردی بہشت این سکہ در لاہور زد بر زر
شہنشاہ امم شاہ جہانگیر ابن شہ اکبر

ترجمہ:۔ اکبر بادشاہ کے بیٹے، امتوں کے شہنشاہ، بادشاہ جہانگیر نے اردی بہشت کے مہینے میں اس سکے کو لاہور میں سونے پر مضروب کرایا۔

بفرور دین زر لاہور شد رشک مہ نور
ز نور سکہ شاہ جہانگیر ابن شہ اکبر

ترجمہ:۔ اکبر بادشاہ کے بیٹے جہانگیر بادشاہ کے سکے کی روشنی سے فروردین کے مہینے میں لاہور کا سونا

مہینے میں لاہور کا سونا روشن چاند سے رشک کرنے لگا۔

42۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چاروں خلفاء میں سے ہر ایک کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔

43۔ مآثر عالمگیری، صفحہ 522

44۔ تیمور شاہ کی مہر پر مندرجہ ذیل عبارت درج تھی: ۔

علم شد از عنایات الٰہی بعالم دولت تیمور شاہی

ترجمہ: ۔ اللہ کے فضل و کرم سے تیمور شاہ کی حکومت دنیا میں مشہور ہوئی۔

بحوالہ میری کتاب "تاریخ پنجاب"۔

مصنف: سید محمد لطیف

تخلیقات

علی پلازہ 3- مزنگ روڈ لاہور فون: 7238014

اس کو منصف کی عدالت کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

حویلی کابلی مل:۔ کابلی مل، جو لاہور کے ثلاثہ حکمرانوں کے دور میں حاکم لاہور تھا، اس کی حویلی شہر کے علاقہ ڈبی بازار میں واقع ہے۔ یہ ایک نہایت کشادہ مکان ہے لیکن اس وقت اسے بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے اور یہ جائیداد مختلف لوگوں کے تصرف میں رہی ہے جو ذرائع کی کمی کے باعث اس قابل نہیں کہ اس کی مناسب طور پر مرمت کرا سکیں۔

شوالا یا ہندوؤں کے مندر

شہر میں ہندوؤں کے شوالا یا مندر بیشمار ہیں لیکن ذیل میں ان میں سے نہایت اہم کا ذکر کیا جا رہا ہے:۔

شوالا باوا ٹھاکر گیر:۔ یہ ایک عالی شان شوالا مسجد وزیر خاں کے شمال میں واقع ہے۔ جنوب کی طرف کا دروازہ ایک کشادہ صحن کی طرف کھلتا ہے۔ اس کے وسط میں پختہ اینٹوں کا ایک عالیشان مندر ہے جس پر گنبد نما چھت موجود ہے۔ گنبد کے اوپر ایک سنہری کلس ہے جو مندر کا انتہائی جاذب نظر نظارہ پیش کرتا ہے۔ مندر کا دروازہ مغرب کی طرف ہے۔ اندرونی فرش میں سنگ مرمر کا حاشیہ لگایا گیا ہے اور اس کے درمیان میں ایک بلند چبوترے پر شیوجی مہاراج کی مورتی پوجا کے لیے رکھی ہے۔ اس کے قریب جگہ کو پاک صاف کرنے کے لیے تانبے کا ایک بہت بڑا برتن پانی سے بھرا ہوتا ہے۔ دیواروں میں اندرونی جانب آرائش کی گئی ہے۔ صحن کے ساتھ مسافروں کے قیام کے لیے کمروں اور سادھوؤں اور پجاریوں کے حجروں کی قطاریں ہیں۔

شوالا کی جگہ دراصل مسجد وزیر خاں سے متعلق تھی لیکن لاہور کے ثلاثہ حکمرانوں کے دور میں ایک باوا ٹھاکر گیر نے یہاں پر ایک کچا لیکن چھوٹا سا مندر تعمیر کیا جس کو سکھ حکومت کے محکمہ تعمیرات کے سربراہ راجہ دینا ناتھ نے پختہ اینٹوں کے ساتھ از سر نو تعمیر کیا اور اس کو وسیع کر کے چار دیواری بنوا دی۔

شوالا راجہ دینا ناتھ:۔ یہ دلکش عمارت کوتوالی یا پولیس کورٹ کے احاطہ کے شمال میں واقع ہے۔ یہ ایک دو منزلہ عمارت ہے۔ اس میں گلی کی طرف خوبصورت کھڑکیاں اور غلام گردشیں بنی ہیں۔ یہ شہر کا انتہائی اہم حصہ ہے۔ اس جگہ بہت گنجان آبادی ہے۔ نچلی دکانیں کرایہ پر دی گئی ہیں اور کرایہ داروں میں زیادہ تر تاجر اور اہل حرفہ ہیں۔ گلی کی طرف والی دیواروں پر دیوتاؤں اور اوتاروں کی تصاویر سے آرائش کی گئی ہے۔ مندر میں مشرقی دروازے کے ذریعے داخل ہوا جاتا ہے،